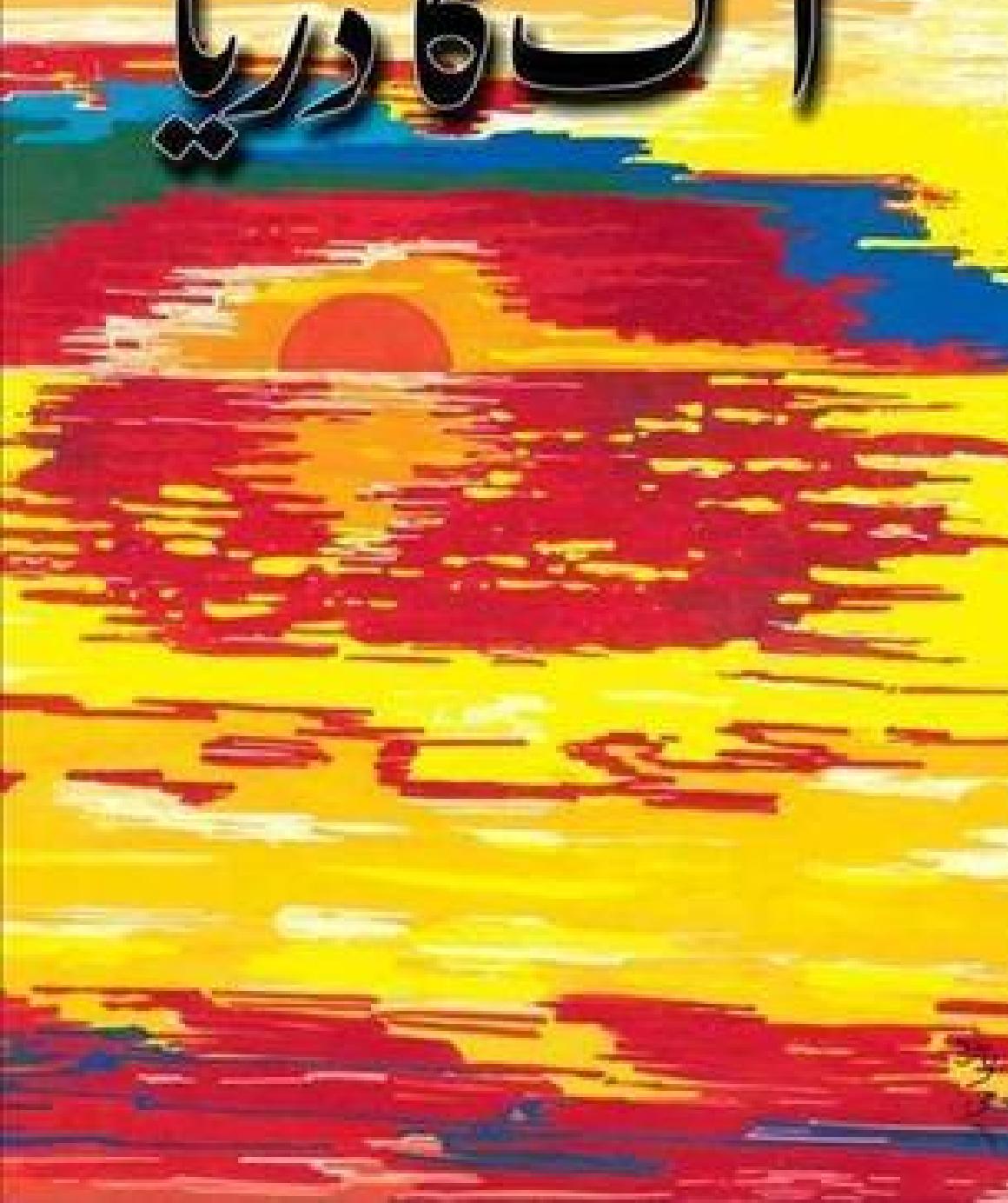


قرۃ العین حیدر

آگ بکاریا



انساب

زہرا حیدر کے نام

ادبی ذوق

Biggest Urdu Literature Books Library

www.AdabiZouq.com

میں دیوتاؤں کے متعلق زیادہ نہیں جانتا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دریا
ایک طاقتور نیالا دیوتا ہے، تند مزاج اور غصیلہ
اپنے موسموں اور اپنے غنیض و غصب کا مالک
تباہ کن..

وہ ان چیزوں کی یا دولاتا رہتا ہے جنہیں انسان بھول جانا چاہتے ہیں
وہ منتظر ہے اور دیکھتا ہے اور منتظر ہے

دریا ہمارے اندر ہے۔ سمندر نے ہمیں گھیرا کر کھا ہے

خاتمه کھاں ہے..... بے آواز چیزوں کا

خرزاں میں خاموشی سے مر جھاتے چھولوں کا

جو چپ چاپ اپنی پنکھڑیاں گراتے ہیں

جہاز کے بہتے ہوئے شکستہ نکڑوں کا خاتمه کھاں ہے.....

خاتمه کھیں نہیں ہے۔ صرف اضافہ ہے

مزید دنوں اور گھنٹوں کا گھشتا ہوا تسلسل

ہم نے کرب کے لمحوں کو ڈھونڈ نکالا

سوال یہ نہیں کہ یہ کرب غلط فہمی کا نتیجہ تھا.....

یا غلط چیزوں کی تمنا کا..... یا غلط چیزوں کے خوف کا

یہ لمحہ مستقل ہیں.... جس طرح وقت مستقل ہے

ہم اس بات کو نہ س بت اپنے کرب کے دوسروں کے کرب میں
بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں
کیونکہ ہمارا اپنا ماضی کرم کی دھاراوں میں چھپا ہے
لیکن دوسروں کی ازیت ایک غیر مشروط تحریج ہے
جو کبھی فرسودہ نہیں ہوتا

لوگ بدل جاتے ہیں۔ مسکراتے بھی ہیں مگر کرب موجود رہتا ہے
الاشوں اور خس و خاشاک کو اپنی موجودگی میں بھاتے ہوئے دریا کی مانند
وقت جو تباہ کن ہے قائم بھی رکھتا ہے
میں اکثر سوچتا ہوں کہ کیا کرشن کا یہی مطلب تھا
کہ مستقبل ایک مدد حمّیت ہے
اور ناکے واسطے جو بھی پچھتائے کے لے پیدا نہیں ہوئے
پچھتاوے کا گل سرخ

جو ایک ایسی کاتب کے پیلے اوراق میں رکھا ہے
جو کبھی کھولی نہیں گئی

آگے بڑھو سافروں ماضی سے بھاگ کر
تم مختلف النواع زندگیاں یا کسی قسم کے مستقبل کی طرف
روال نہیں ہو

آگے بڑھو تم جو سمجھتے ہو کہ سفر میں ہو
تم وہ نہیں جنہوں نے بندرگاہ کو پیچھے بٹتے دیکھا

یا جو دہرے ساصل پر اتروگے
اس لمحے کہ... دنوں کناروں کے درمیان وقت معطل ہے
مستقبل اور ماضی پر یکساں وصیان کرو
یہ لمحہ کرم یا نہ کرم کا نہیں... جانو
کہ موت کے سے انسان کا دماغ وجود کے جس نقطے پر
بھی مر کو ز ہو... [اور موت کا سے ہر لحظہ ہے]
وہ محض ایک کرم ہے
جو دوسروں کی زندگیوں میں بار آور ہو گا
کرم کے پھل کا خیال نہ کرو آگے چلو
اور مسافروں اور ملاحو۔
تم جو گھاٹ پر اتروگے اور
تم جن کے جسم سمندر کے فیصلے کہیں گے
یا جو کچھ بھی تم پر بیتے گی یہ تمہاری منزل ہے
کرشن نے ارجن سے میدان جنگ میں کہا۔
الوداع نہیں بلکہ آگے بڑھو۔
مسافرو.....

[ئی... ایس... ایلیٹ]

گوتم نیلبر نے چلتے چلتے پیچھے ٹھہر کر دیکھا، راستے کی دھول بارش کی وجہ

سے کم ہو گئی تھی، گوکہ اس کے اپنے پاؤں مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔ بر سات کی وجہ سے گھاس اور درخت زمرد کے رنگ کے دھکلائی پڑ رہے تھے، اسونکے نارنجی اور سرخ پھول گہری ہریاں میں تیزی سے جملاتے تھے اور ہیرے کے ایسی جگہ گاتی پانی کی لڑیاں گھاس پر ٹوٹ کر بکھر گئی تھیں۔ ندی کے پار پہنچتے پہنچتے بہت رات ہو جائے گی۔ گوتم کو خیال آیا گھاث پر کشتیاں کھڑی تھیں۔ اور بر گد کے نیچے کسی مکن چلے ملاجھے زور زور سے ساون الابنا شروع کر دیا تھا، آئے جھٹرمٹ میں ایک اکیلا مور پر پھیلائے کھڑا تھا، شراویتی یہاں سے پورے پچیس کوں دور تھا اور گوتم نیلمہ کو ندی تیر کر پر کرنی تھی گھاث پر تین لڑکیاں ایک طرف پیٹھی با تیں کر رہی تھیں، ان کے ہٹنے کی آوازیں یہاں تک آری تھیں، لڑکیاں کتنی باتوں ہو تی ہیں، گوتم نے سوچا، انہیں بھاکونے منے حل کرنے ہیں، اس کا دل چاہا کہ نظر بھر کر انہیں دیکھ لے۔۔۔ خصوصاً اس کیسری سازی و ای کو جس نے بالوں میں چمپا کا پھول اڑس رکھا تھا۔ اسکے ساتھ پھلی سیر ہی پر جو لڑکی آلتی پالتی مارے پیٹھی تھی۔۔۔ اسکے گھنٹھریا لے بال تھے اور کتابی چہرہ اور جڑی ہوئی سیاہ ہننوں۔ قریب پہنچ کر گوتم نے ان دونوں کو لختہ بھر کے لیے دھیان سے دیکھا اور پھر جلدی سے نظریں جھکا لیں گھاث کی آخری سیر ہی پر پہنچ کر اس نے تیزی سے چھلانگ لگادی اور دوسرے کنارے کی طرف تیرنے میں مصروف ہو گیا

لڑکیوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا کوئی ودیارتی تھا جان پڑتا ہے، ان میں سے ایک نے کہا۔ ملاج اپنی اپنی ڈونگیوں میں بیٹھے ہوئے مسافروں کا انتظار کرتے رہے، کشتیاں جو بر گد کے سامنے میں بندھی تھیں ان میں چو لہے روشن کیے جا چکے

تھے اور رات کا کھانا بننا شروع ہو چکا تھا

ٹپ سے بارش کا ایک قطرہ چمپا کے بالوں پر آن کر گرا، اس نے ندی کی اور دیکھا جدھروہ انجینی طالب علم نہروں کے خلاف ہاتھ پاؤں مارتا کسی انجانی سمت جا رہا تھا

بڑی کٹھن زندگی ان بے چاروں کی ہوتی ہو گی۔ بزرگا کو اپنے بھائی کا خیال آگیا جو کہ اس طرح کی ان گنت ندیاں چھیل میدان اور دشوار آن پھاڑیاں عبور کر کے بہت دور تک شلا گیا ہوا تھا اور ابھی تک نہیں لوٹا تھا جب یہ لوگ اتنا پڑھ جاتے ہیں تو کیا ہوتا ہے۔ تیسری لڑکی نے بے دصیانی میں پوچھا۔ اس لڑکی کا نام سرو جنی تھا

ہوتا کیا ہے جھک مارتے ہیں۔ کسی نئے دھرم کا اوشنکار کر لیتے ہیں۔ کسی نئے فلسفے کا پر چار شروع کر دیتے ہیں۔ بزرگانے جل کر جواب دیا۔ اس کا اکلوتا بھائی شکشلا میں ریاضی اور صرف و نحو سے سر کھپانے کی بجائے یہاں ہوتا تو کیا جمپک اس سے بیاہنے کر لیتی

باہم بچارے بھی کیا کریں، پڑھیں نہیں تو کہاں جائیں پڑھا تو نا کے بھاگیے میں لکھا ہے سرو جنی نے منہ لٹکا کر کہا

ندی کے وسط میں پہنچا۔ تو بارش کی دوسری بوندگو تم کے سر پر آن گری بر سات کی وجہ سے سر جو کا پاٹ بے حد چوڑا ہو گیا تھا، ہون ندی کے پاٹ سے بھی زیادہ جسے پاٹلی پیر جاتے ہوئے گوتم نے ایک مرتبہ پیر کر عبور کیا تھا، اس نے پیرتے، پیرتے پہنچ کت ایک بار دیکھا، گھاٹ پر لڑکیاں اب تک بیٹھی تھیں اور وہ بھی مو

جو تھی جس کے بالوں میں جمپ کا پھول تھا ان لوگوں کو مینہ میں بھینٹنے کا بھی ڈر نہیں۔ گوتم نے دل میں کہا اور پھر جلدی جلدی لہروں کا مقابلہ کرنے میں منہک ہو گیا سامنے دوسرے کنارے پر دریائی گھاس اور نیلے پھولوں کی گھنی بیلیں پانی کی سطح پر جھک آئی تھیں بر گد کے سائے تاریک ہو چکے تھے سارے اور مور سمنے سمٹا نے اوس کھڑے تھے، چار پانچ آدمی انگو چھٹے کندھے پر ڈالے جلدی جلدی گاوں کی اور قدم بڑھا رہے تھے کنارے پر پہنچ کر گوتم نے اپنے کپڑے نچوڑے اور ناتراشیدہ پتھروں سے بنے ہوئے مندر میں گیا جس کے ایک کونے میں وہ اپنا زادراہ چنڈی دیوی کو سونپ کر ایودھیا گیا تھا، ایک چھوٹی سی پوٹلی میں اس کے موقلم تھے اور سفید ریشم کے چند فکڑے، اس کا کمبل تھا، ایک سفید رنگ کی دھوتی اور چڑے کے چپل۔ اس نے بے پرواہی سے اپنی پوٹلی اٹھائی۔ پیر صفا کر کے چپل پہنے اور مندر سے باہر نکل آیا چاروں اوڑ بڑا ستانہ تھا اور مندر کے آنکن میں تھا اسے بڑا ڈر لگتا تھا۔ کیسی خوفناک بات ہے۔ فی شکل برہما جب شکل میں ظاہر ہوتا تو سامنے گھبراہٹ کیوں ہوتی ہے؟ کیا انسان کو دوسرے کے وجود پر اعتماد نہیں؟ گوتم نیلمبر نے خوف کے جز بے کا اکثر تجربہ کرنا چاہا تھا، زندگی کا خوف۔ موت کا خوف۔ زندہ رہنے کا خوف۔ رگوید میں لکھا تاہ کہا بتدا میں خودی تھی جو کہ پرش کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اس نے چاروں اور دیکھا اور سوائے اپنے اسے کوئی نظر نہ آیا۔ اس نے کہا کہ یہ میں ہوں۔ چنانچہ وہ اپنے آپ کو میں سمجھنے لگا۔ اسے ڈر لگتا تھا چو نکہ وہ تنہا تھا اسلیے جو اکیلا ہوتا ہے اس سے ڈر لگتا ہے۔ پھر اس نے سوچا کہ میرے سوا کوئی موجود نہیں پھر مجھے کا ہے کا ڈر ہے؟ لہذا اس نے خوفزدہ ہونا چھوڑ دیا مگر

اے مررت حاصل نہ تھی

کیونکہ تہائی میں اداسی ہوتی ہے

اور اداسی سے ڈرگلتا ہے۔ مجھے اپنے روح کی تہائی سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ گوتم
نے اپنے آپ سے کہا۔

مندر بہت پرانا تھا، آس پاس گوتم کو کوئی پروہت یا پیجاری بھی نظر نہیں آیا تھا
جس سے وہ پوچھتا کہ شراویتی جانے کے لیے کوناں راستہ اختیار کرے۔ یہاں
سے کھیت ختم ہوتے تھے اور آگے شیشم کے گھنے جنگل تھے اور ڈھاک کے جھنڈ اور
بیڑا اور ان گنت ندی نالے اور ان سب کو عبور کر کے اسے اپنے آشرم واپس پہنچنا تھا
ہندو کی سیڑھیاں اتر کر وہ گاؤں کی سمت بڑھا۔ سر جو کے پار ایودھیا کی روشنیاں
جنگنوں کی ایسی جھلکیاں تھیں۔ بارش کی وہنہ میں سر امنظر نیلا اور اودھا ساد کھالی
و تاتھا جس میں نارنجی رنگ کی دھاریاں ایسی پھیل گئی تھیں۔ گوتم نے آبادی میں پہنچ
کر دو تین دروز اوس پر دستک دی۔ رات کے کھانے کے لیے اسے صرف دال
درکار تھی۔ ایک لپے پتے کچے مکان کے دوار پر روشنی جل رہی تھی۔۔۔۔۔ ادھیر عمر کا
گرہست اس روشنی میں بیٹھا کچھ پڑ رہا تھا۔۔۔۔۔ برآمدے کے باہر گھپ اندھیرا تھا
۔۔۔ گوتم کی آواز سن کر وہ اسے شاکریہ منو کا کوئی بھسلکو سمجھا۔۔۔ پھر وہ چراغ اٹھا کر باہر لایا
۔۔۔ اور اس کے اجائے میں اسے گوتم کے سفید کپڑے نظر آئے

آج کل یہاں شاکریہ منی کے بھکشوں کی ایک ٹولی آئی ہوئی ہے میں سمجھا کہ تم
انہی میں سے ہو اس نے رسان سے کہا۔۔۔ جسے یہ ہوا چلی ہے اڑ کے تو اڑ کے
لڑکیاں بھی گھر بارچھوڑ کر جنگل بساری ہیں

مجھے تھوڑی سی دال دے دو

گرہست نے چراغ براہمے کی منڈ پر رکھا اور اپنی بی بی کو آواز دی اس کے بعد پھر سے باتوں کا سلسہ چل لگا۔ رکنی۔۔۔ ایک براہمن برہمچاری ہمراۓ دوارے پر آئے ہیں۔۔۔

پھر وہ گوم سے مخاطب ہوا۔۔۔ سامنے نگر میں ایک بیٹا ہیں۔۔۔ رانی رینو کا ایسی روپ داں۔۔۔ کل میری بی بی جب بات کے لیے نگر گئی تو راج نواس کی داسیوں سے ناکہ وہ بیٹا بھی کسی ویہار میں جانے والی ہیں۔۔۔ یہ اندر چکھو۔۔۔ اتنے میں اس کی بی بی آنا دال لے آئی۔۔۔ جو گوم نے اپنی چادر پھیل کر اس سے لے لیا اور اسے دعا دی گرہنی نے جھک کر اسے پڑام کیا اور اندر چلی گئی اس کامیاب کوش دلی سے ہبتا رہا۔۔۔ اچھی ہوا چلی ہے۔۔۔ میں تو کہتا ہوں کہ ماں باپ۔۔۔ اب اپنی لڑکیوں کی شادی بیاہ کی فکر سے بھی نہ چنت ہو گئے۔۔۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی

ماج کی پوٹلی باندھنے کے بعد گوم ذرا کی ذرا براہمے کے کھمبے سے نکلا۔۔۔ یہ گرہست بڑا خوش مزاج معلوم ہوتا تھا گوم کا جی چاہا کہ کچھ دیرک کر اس سے بات چیت کرئے مگر اس کا مطلب تھا کہ وہ عیش و آسانیش کی طرف راغب ہو رہا ہے۔۔۔ چنانچہ اس نے فواراں خیال کو دل سے نکال کر پھینکا۔۔۔ گویہ جان کرائے خوشی ہوئی کہ بودھ طالب علموں کا گروہ ادھر آیا ہوا ہے۔۔۔ اگر کہیں مل گئے تو رات اچھی گزر جائے گی اسے بودھ طالب علموں اور فلسفیوں سے بحث مباحثہ کرنا اچھا لگتا تھا

وہ لوگ کدھر گئے ہیں۔۔۔ اس نے گرہست سے پوچھا۔۔۔ یہ تو مجھے پتا نہیں

...باہمں تم اندر کیوں نہیں آ جاتے...اویسیو. تمہاری سیوا تو میرا دھرم ہے
نہیں اب میں چل ہی دوں... گوتم نے جواب دیا... وہ اپنی اس عزت و تکریم کا
عادی تھا۔ چلتے پھرتے ہر سے اس کا ادب کیا جاتا۔ سڑک پر سے گزر رہا ہوتا تو راہ
گیر اس کے لیے راستہ چھوڑ دیتے۔ بڑے بڑے شہزادے اس کی خاطریں کرتے
غیریب کسان اسے آنکھوں پر بھلا تے۔ مجھن اس لیے کہ وہ طالب علم تھا اور علم کا
محافظ

گربست نے چراغِ منڈیر پر سے اٹھایا اور اندر جا کر پھر پڑھنے میں مصروف
ہو گیا گوتم چند لمحوں تک اندر ہرے میں کھڑا یہ منظر دیکھتا رہا۔ اندر بچے کھیل رہے
تھے۔ گربست کی پیوی سانوی دلی سی لڑکی جس نے اسے آٹالا کر دیا تھا۔ چو لہے
کے آگے بیٹھی تھی۔ دروازے کی چوکھت پر پیاری بینا کا پنجھرہ لٹک رہا تھا۔ کس قدر
پر سکون منظر تھا، اس سے بھی اسے ڈر لگا۔ گرسہ ہاگنی کے مدھم اجائے میں جگمگاتی
ہوئی لڑکی، جو کہ اس معمولی صاف سترے پکے مکان کی مالکن تھی۔ برآمدے پر
جھکے ہوئے کیلے کے تھنڈے کے پتے۔ پروں میں چونچ دے کر سوتی ہوئی بینا۔ گریہہ
اگنی یونہی جلتی رہتی ہے اور ایک دن چتا کے شعلوں میں تبدیل ہو جاتی ہے اور چتا
کی آگ کے انگاروں سے ایک اور گھر کے چو لہے کی بنیاد پڑتی ہے، یہی آگ
ون پوستہ گھر سے لے کر نکلتا ہے۔ یہ سارے دور ہر انسان پر گزرتے ہیں۔ اس پر
بھی گزریں گے۔ مناظر کاے ہوتے ہیں۔ وہ کبھی سمجھہ ہی نہ پایا۔ شراوتی میں اس کا
سر منزلہ مکان تھا جس کے برآمدے کے چوبی کھمبوں پر نکلیں نقشوں گار بنے ہوئے
تھے۔ اس سڑک پر اس کا مکان سب سے اوپر تھا۔ اس کا باپ بہت دولت مند

آدمی تھا.. اور اس کی بہن کا بیان حکومت کے ایک اعلیٰ عہدے دار سے ہوا تھا یہ اس کی تعلیم کا آخری سال تھا.. فارغ التحصیل ہونے کے بعد اب ساری دنیا اس کے قدموں میں بکھری پڑی ہو گی وقت اس کا اپنا تھا۔ فراخ دلیاء کے ساتھ وہ فلاسفوں کو پر کھتا اور سوچتا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ کیا تھا کہ وہ چیزوں سے خوفزدہ تھا۔ بارش میں بھیکتی لڑ کیاں جو کہ اس پارگھاٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں... بر گد کا یہ جنگل جس میں نارنجی رنگ کالباس پہنے بھکشوں کی ٹولی کہیں مکوم رہی ہو گی اس ادھیز عمر کے گرجست کی بیوی جس کا نام رکنی تھا یہ سب چیزوں کیوں تھیں

آبادی سے لوٹ کر وہ مندر کی طرف واپس آیا۔ آنکن میں پہنچ کر اس نے زمین میں ایک چھوٹا سا گڑھا کھود کر چو لہا بنایا۔ اور مٹی کی ہانڈی میں چاول ابلنے کے لیے چڑھا دیے

کچھی کمپی دال بجھات کھانے کے بعد وہ مندر کی دیوار سے پیٹھنے کا کر پیٹھنے گیا۔ سامنے دریا پر تاریکی گہری ہو چکی تھی۔ چاند بہت مدھم تھا اور کہیں با ولوں میں چھپا ہوا تھا۔ ہوا میں تازہ پھولوں کی مہک تھی۔ سرا جنگل اندھیرے میں سائیں سائیں کر رہا تھا۔ صبح سوریے اٹھ کر اسے اپنا سفر جاری رکھنا ہے۔ اس نے سوچا۔ اسی وقت دفترا سے پیروں کی آہٹ اور کسی کی مدھم ہنسی سنائی دی اور پھر خاموشی چھاگئی چند لمحے منتظر ہے کے بعد وہ سرک کر فرش پر لیٹ گیا۔۔۔ نیچے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر مندر کی دیوار پر سے کسی نے جھانکا۔ اندھیرے میں گوتم کو اس کی صورت نظر نہیں آئی۔

تم کون ہو بھائی؟۔۔۔ نیچے سے کسی نے پوچھا

میں ہوں.. گوتم نے لیئے لیئے جواب دیا

تمہارا کیا نام ہے؟

میں کا کوئی نام نہیں ہوتا؟

تفریق کے لیے نام ضروری ہے.....

شراؤتی کے جن پنڈتوں کے ہاں پیدا ہوا وہاں کے پنڈتوں سے پوچھ کر میرا
نام گوتم رکھا گیا تھا

بھائی گوتم نیچے آ جاو

تم خودا و پر کیوں نہیں آتے

اوپر نچالی اور نیچالی محض ذہنوں کے فرق سے ہوتی ہے

ہوں.....

تمہیں کیا معلوم ہے تم اوپر نچالی سمجھ رہے ہو وہ پاتال سے بھی گہری ہو

بھائی.... اسی طرح دیوار سے نیچے جھانکے بغیر سوال کیا، کیا تم بھگوت ہو؟

نہیں مگر تم مندر سے نیچے نہیں اڑو گے

نیچے سانپ ہونگے اور کیڑے مکوڑے... اور کیڑوں مکوڑوں سے دوستی کرنا

ابھی میں نے شروع نہیں کیا... اتنا کہہ کر گوتم دل میں ہنسا... ممکن ہے کہ یہ آوز اسی

جیسی سنیاسی کی ہو... پاٹلی پتہ کے شاہی خاندان نے جیسی عالموں کو بہت سرچڑھا

رکھا تھا... اور باضابطہ ان کے سدھانت کا مطالعہ کرتے تھے میں یہاں پتھر کے فرش

پر لیٹا ہوں... تم بھی یہیں آ جاو... اس نے با آواز بلند پھر کہا... سو فسطائی... شک

پرست... دہریے... منطقی... جنگلوں جنگلوں بحثیں کرتے مل جاتے تھے... یہ بھی ان

میں سے کوئی دل جلا ہے..... گوتم نے سوچا..... ان گنت منطقی اگنگا کی ودای میں گھو مت پھرتے تھے۔ ماہرین کلام روایتی مذہب پر حملہ کرتے..... آراء اور راشیاء کی ضیافت کو ثابت کرنے میں مصروف رہتے۔ ان میں سے بہت سے ما بعد الطیعاتی نظریات کے حامل تھے۔ اکثر مادہ پرست تھے۔ جین اور بودھ فلسفی بیک وقت یوگی بھی تھے اور سو فرطائی بھی۔ انہی گھنے گھنے جنگلوں میں بڑے بڑے باڈشاہ اور شہزادے جمائے بڑھائے سادھوں کی سی زندگی گزار رہے تھے۔ اور چھپلی صدی میں کپڑوں کے شہزادے نے بھی جنگل کا راستہ اختیار کر کے ملک کی اس روایت کو بھایا تھا۔ ان کی آمد کے وقت باسٹھ مدرسہ ہائے فکر اپنی مختلف شاخوں سمیت پہاڑ سے موجود تھے۔ خیالات کی اس سلطنت میں انہوں نے بھی جو شاکریہ منی سدھاو تے کھلائے۔ فلسفہ کی ایک اور نوآبادی قائم، کردی تھی

باسٹھ مختلف نظریات..... اور زندگی ایک ہے۔۔۔ انسان تنہا ہے۔۔۔ گوتم نے آنکھیں بند کر لیں اور اسی طرح لیٹا رہا۔۔۔۔۔

تم کون ہو بھائی۔۔۔ کچھ دری کے بعد گھبار کراس نے دوبارہ آواز دی۔۔۔ اب یہ سوال میں تم سے کرتا ہوں۔۔۔ گوتم اگر تم اپنی اصلاحیت مجھ سے چھپانا چاہتے ہو تو مجھے کوئی آپی نہیں۔۔۔۔۔

نام آوازوں کی ایک سُٹھی ہے بھائی گوتم۔۔۔ اور ہری شنکر کی آواز پر میں چونک اٹھتا ہوں۔۔۔ کیونکہ یہی میرا نام ہے۔۔۔

بھائی ہری شنکر کیا تم کرشن واسودیو کے بھگلت ہو؟

نہیں میں اس سے اتر پچھتم کی اور سے آ رہا ہوں۔۔۔ جہاں شیوا کی ارادھنا کی

جاتی ہے۔ گوتم میں نے کاشمیرا کی برف میں بڑی بڑی خوبصورت جگہیں دیکھی ہیں۔ بعض دفعہ خیال آتا ہے کہ زندہ رہنا بڑی نعمت ہے میں نے زیادہ سیاحت نہیں کی مجھے اس کا بڑا دکھ ہے صرف اسی کا دکھ ہے تم نے دکھ کے فلسفہ پر کتنا غور کیا ہے بھائی گوتم؟ آجکل میں اسی پر غور کر رہا ہوں

جہاں میں پڑھتا تھا وہاں ہم لوگ فلسفہ اور سماجیت کی بجائے گنت و دیا اور قانون اور طبیعت پر زیادہ وصیان دیا کرتا تھا۔ لیکن رنج سے میرا بڑا اگہرا سنبھال ہے گوتم نیلمہ
کیا تم اجینی سے آرہے ہو.....
خیں..... اس سے بھی بہت آگے سے
نکشلا؟

دلبی ذوق

ہاں.....

میرا وہاں جانے کو بہت جی چاہتا ہے تم نے اپنی تعلیم ختم کر لی؟
ہاں پھر میں بہت بڑے سفر پر نکل گیا۔ اپار سمندر کے کنارے میں نے دوار کا
کے درشن کیے۔ میں متھرا گیا۔ بر حرم و رتح میں استھا کے کھنڈر میں نے دیکھے۔ گوتم
میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وقت بہت خوفناک چیز ہے۔ کیا تم کبھی وقت کے خوف
سے لرزے ہو

ہاں گوتم نے آنکھیں بند کیے ہوئے جواب دیا، انہیں مندر کے پر آمدے
پر جھکے ہوئے چیپل کے پتے سرخ نظر آرہے تھے

کیا تم بودھو ہو

ہاں تمہیں کیسے معلوم ہوا

شام جب میں بھیک مانگنے کے لیے گاؤں میں گیا تھا تو ایک گرجست نے
مجھے بتایا تھا کہ تم لوگوں کی ایک نولی ادھر آئی ہوئی ہے
تم..... بھی.... ہو؟

میں نے اپنے زہن کا دروازہ ابھی کھلار کھچھوڑا ہے
اور دل کا.....؟ دل اور زہن کا کیا سمبندھ؟

میں تم کو ایک بات بتلوں.....؟ اتنا کہتے کہتے دوسرا نوجوان منڈ بیو کو دکر مندر
کے برآمدے میں آگیا۔ بحث کے جوش میں اس نے اپنے کھڑاوے اتر کر ایک
طرف پھینک دیے اور چنڈی کے سامنے سے دیوار شکن کر کے اس کی روشنی میں گوت
کو دیکھنے لگا، گوتم اٹھ کر دیوار کے سہارے بیٹھ گیا۔ اس نے بھی وچھپی سے نوار دکو
دیکھا جو کہ بہت دور سے آ رہا تھا

تم یہاں کہیں آس پاس میں کاشی واشی میں پڑھتے ہو...؟ دوسرا لڑکے نے
گوتم کے قریب پاؤں پھیلا کر بیٹھتے ہوئے پوچھا
میں شراوی میں پڑھتا ہوں، کاشی کی پاٹ شالہ تو خالی مہما پنڈت تیار کرتی ہے

اور تم کیا بننا چاہتے ہو؟

یہی تو سمجھ میں نہیں آتا۔

تمہاری زندگی کا مقصد کیا ہے گوتم نیلمبر۔

تم بھی اس اندھیا رے میں سے نمودار ہو کر مجھ سے یہی سوال کرنے آئے ہو ..؟ گوتم نے چڑھ کر کہا۔ اب ہوا میں خنکی آچالی تھی۔ جنگل کی بھیگی ہوئی ہوا۔ جو سو جر پر سے بہتی ہوئی آرہی تھی۔ اس کی جھونکوں میں چراغ کی لو جھلما لٹھی۔ گوتم نے اپنے نئے ساتھی کو غور سے دیکھا۔ اس کا ذہین اور خوبصورت چہرہ گوتم کو مانوس سانظر آیا۔ گہری سایہ جڑی ہوئی بھنوئیں۔ کتابی چہرہ اور گھنٹھریا لے بال۔ یہ شکل میں نے پہلے کہاں دیکھی ہے؟ ابھی ابھی دیکھی ہے۔ گوتم نے ہڑ بڑا کر سوچا۔ اگر یہ گھنٹھریا لے بال منڈوادے تو شاید کچھ مختلف معلوم ہو۔ ورنہ یہ تو جانا پہچانا سا چہرہ ہے۔

تم نے اپنا سر نہیں گھوایا۔ کیسے بھکشو ہو۔ گوتم نے ذرا بیٹھا شست سے سوال کیا
میں نے بھی اپنے ذہن کا دروازہ ابھی کھلا رکھ چوڑا ہے
اور تمہارا سنگھ؟

میرا سنگھ اور میں دو مختلف چیزیں ہیں۔۔۔ میں آزاد ہوں۔ اور مزید آزادی کی تلا
ش میں مصروف

تم کہاں کے رہنے والے ہو؟

نوجوان نے دریا کی سمت اشارہ کیا اس پار کا

اچھا۔ گوتم ذرا چونک کراٹھ بیٹھا

تمہیں اتنا اچنچا کا ہے کے لیے ہوا؟ ہم سب کو کہیں نہ کہیں تو پیدا ہونا ہی ہے۔
ممکن تھا کہ میں ممکن س میں پیدا ہوا ہوتا اور تم یا وادیپ میں؟۔۔۔ ہری شنگر نے قبسم
کے ساتھ گوتم کو دیکھا

تم نہیں کے رہنے والے ہو اور اب بھکشو بنے اجنبیوں کی طرح گھوم رہے ہو
ہم سب ایک دھرے کے لیے ازملی اور ابدی اجنبی ہیں
گوتنم خاموش ہو گیا۔ ہری شنکر۔ اس نے اپنے دل میں کہا۔ تم بحث میں مجھے ہرا
نہیں سکو گے۔ شاکر یہ منی بھی آخر اسی کوشل دلیں کی رہنے والے تھے۔ وہ شراویتی میں
آکر برسوں رہے۔ انہیں پروان نری حاصل کیے ابھی زیادہ مدت نہیں گزری تھی،
مگر سارا ملک ایک نئے نارنگی رنگ میں رنگتا جا رہا تھا۔ اس کی تیوری پر بل آگئے
اس نارنجی ساری والی لڑکی کی یاد اس کے ذہن میں کوندی اور اسے بڑی کوفت ہو
لی۔ جب سے یہ ہوا چلی ہے لڑکیاں بھی گھر بار تھ کر جنگل بسارتی ہیں۔ تمہیں
ویدوں پر یقین نہیں رہا جو تم نے یہ حیہ بنایا ہے؟ اس نے زرا جھوٹ کر کہا۔ بھکش کا
فلسفہ اور تمہاری ساری پری بھاشا اپشندوں میں موجود ہے۔ شاکر یہ منی شروع سے
آخر تک کپل کے نظریوں سے متاثر تھے۔ خود بدھ کا لفظ وید سے اکا ہے۔ کوئی چیز
خیالات کی دنیا میں نہ کوں اور غیر متعلق نہیں ہے۔ تم کا پریوگ کیوں کرتے ہو؟
ہری شنکر چپکا بیٹھا رہا۔ پھر اس نے زرما سکرا کر پوچھا۔ تم کو لڑکیوں کی کیا فکر
ہے۔ کوئی خاص لڑکی ویہاڑ میں جانے والی ہے.....؟
تم لوگ اس طرح ہستے کیوں ہو۔ دیکھو تمہارے آئند پر کیا بنتی تھی۔ گوتنم نے
اور زیادہ چپ کر کہا
گوتنم نیلمبر میں اس سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ ہری شنکر نے ٹانگیں اور پھیلا کر
آرام سے لیٹے ہوئے جواب دیا
تم کا ہے سے بھاگ رہے ہو۔ گوتنم نے غصے میں پوچھا

تم کا ہے کی تلاش میں ہو۔۔۔ ہری شنکر نے کہا۔۔۔ میرے بیہاں تو ساری تلاش ختم
ہو چکی ہے
اگر میری درسگاہ میں اعلیٰ اخلاق برتنے کا اپدیش نہ دیا جاتا تو میں یہی
کھڑا ووں تمہراۓ ناک پر لگاتا۔۔۔
ہری شنکر نے قہقہہ لگایا۔۔۔ اگر مجھے دوستوں کی ضرورت نہ رہی ہوتی تو میں
تمہیں اپنا دوست بنالیتا
تم خود پرست ہو
اور تم ذہن کے غرور میں بتا ہو
تمہیں ناٹک سے دچپی ہے؟ گوتم نے موضوع بدلنا
تحمی۔۔۔ مختصر جواب ملا

اچھا۔۔۔ مگر الفاظ کا ناٹک تو تم ہر سے کھلیتے ہو۔۔۔ ہری شنکر خاموش رہا۔۔۔ اس نے
اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے گوتم جوش میں آ کر بولتا رہا۔۔۔ تین سو سال ہوئے
تمہاری تکشلا میں ایک شخص گزر رہے جس کا نام پانی تھا۔۔۔ اس نے الفاظ کے اسرار
کی ایک نئی کائنات دریافت کی تھی جب تلاش ختم ہو چکی ہے تو الفاظ کا استعمال
کیوں کرتے ہو۔۔۔ الفاظ کو بھی مانتوی کر کے دیکھو
ہری شنکر کروٹ بدل کر کہنیوں کے بل لیٹ گیا۔۔۔ گوتم میں نے پائی کی آٹھوں
کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔۔۔ میں کاشمیرا کے مدرسون میں گیا ہوں۔۔۔ جہاں سنسکرت کو
مکمل بنایا جا رہا ہے۔۔۔ میں نے یادوں کی بولی بھی سیکھی ہے اور پارسیکاون کی بھی
۔۔۔ لیکن اب میں الفاظ ختم کرنا چاہتا ہوں

کیونکہ... ہری شنکر کہتا رہا۔ زبان... الفاظ وعدے کرتے ہیں جو کہ بھائے نہیں
جاتے۔ خیالات کا اظہار کرتے ہیں جن کا کوئی مطلب نہیں۔ ان کے معنی کی کھوج
میں بھاگنا شروع کیا تو بھنک کر میں کہاں سے کہاں جا لگا۔ اسی وجہ سے گوم
سدھارتھ نے کہا تھا کہ...

لیکن گوم نیلمبر نے ہری شنکر کی بات کائی۔ لیکن اوام کے تین حروف اور
ساپاساکے تین سروں کے درمیان... تو کائنات کا سارا وجود بندھا ہوا ہے
... آواز آ کا ش کا ایک گن ہے
کہے جاو۔ ہری شنکر بولا

برہمنی ما وہ پرست آ کا ش کو نہیں مانتے۔ تم تو مانتے ہو
مگر تمہارے ہنام... گوم... نے تو کہا تھا کہ اگر آوازابدی ہے تو زبان سے
پہلے ہی لفظ سنائی دے جانا چاہئے۔ کیونکہ آ کا ش اور ہمارے کانوں کے درمیان کو
لی روک نہیں ہے۔ ہری شنکر نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا

لفظ بھی ابدی ہے۔ گوم نے جواب دیا۔ جرف مہیش سے موجود ہے یا حرف
ن اس کو جب بھی ادا کیا گیا ہوگا اس کی آواز یہی رہی ہوگی۔ جیمنی کہتا ہے کہ
آواز اس کے لیے ابدی ہے کہ سننے کے بعد دماغ کو یاد رہتی ہے اور بیک وقت ہر
جلد موجود ہے اور کبھی ختم نہیں کی جاسکتی

اور اسی لیے ویدوں کو۔ کیونکہ وہ الفاظ ہیں۔۔۔ کبھی روشنیں کیا جاستا
؟... ہری شنکر نے نظریں اٹھا کر پوچھا

تم کیسے فلسفی ہو جو کہ الفاظ پر یقین نہیں رکھتے۔ گوم نے جھنجھلا کر جواب دیا

.. پانی تمہارے تکشل کے استاد کہا تھا اپنے یادوں کے خیالات کے مظاہر صرف الفاظ ہی ہو سکتے ہیں۔ ان کی ماہیت کا مطالعہ کرنا کس قدر ضروری ہے۔ الفاظ کے راستے کے بننا خالص خیال تک کس طرح پہنچ پاؤ گے؟ آواز الفاظ کا پر اکتنگ گن ہے۔ اور مادہ ابدی ہے۔ وید زبان کی شکل میں بہ رہا ہے۔ اور مادہ بہ رہا ہے وقت کو ابدیت سمجھ کر تم لوگوں نے بہت گز بڑا پھیلا رکھی ہے۔ ہری شنکر نے دو بارہ فرش پر لیٹتے ہوئے اظہار خیال کیا

معنی اصل چیز ہے۔ گوتم نے جواب دیا۔ پانی کا کہنا ہے کہ سارے الفاظ کا ماحصل خالص وجود ہے۔ سرت۔ اصلیت اور مختلف چیزوں کے لیے بہ رہا کے الگ الگ نام ہیں۔ وہ سامنے سے گزرتا ہوا بھورا سور۔ گھاث پر پیٹھی ہوئی ایودھیا کی لڑکیاں۔ تم۔ ہری شنکر یہ سب مہمان آتھا ہیں۔ تم تعجب ہے اب تک ویدانت سے آگے نہیں بڑھے۔ انت کے آگے اور کیا ہو ستا ہے

تم ہی بتاؤ

پرم آتما اور جیو آتما میں اودیا کی وجہ سے دوئی قائم ہے۔ لہر لفظ اور غیر لفظ دو بہ رہا ہیں اور لفظ پر دھیان کر کے غیر لفظ کا انکشاف ہو ستا ہے۔ وہ غیر لفظ میں خود ہوں۔ ہری شنکر نے کہا۔ گوتم خاموش ہو گیا۔ علیت کا قانون بجا یے خود مکمل ہے۔ کوئی چیز دوسری چیز کے مانند نہیں ہے۔ صرف اپنے لمحاتی وجود کے علاوہ کسی شے کا کسی شے سے کوئی تعلق نہیں، سمجھے۔ سب وقت ہے اور مصیبت ہے۔ سر دکھم دکھم؛؛؛ ہری شنکر نے کہا۔ جسم اور آتما دونوں فانی

ہیں.. دونوں کے اکتحا ہو جانے سے بھی کوئی مستقل وجود پیدا نہیں ہوتا... آنما ابدی نہیں ہے.. انسان چراغ کی طرح بجھ جاتا ہے۔ محض واقعات اور احساسات کا دور تسلسل قائم رہتا ہے۔ ایک لڑکی تھی... سور ہے ہو بھائی گوتم؟

نہیں کہے جاوے

ایک لڑکی تھی.. اس نے بھی مجھے ابدیت کا قائل کرنا چاہا تھا.. وہ بھی ساپا سامیں زمانہ و مکان کو محیط کر لیا کرتی تھی... وینا پروہ صبح صبح بھیروا اور میگھ بجا تی... دوپہری کو جب ساری دنیا سونے کے رنگ میں رنگ جاتی... تب میں اس سے دیپک اور شری راگ سنتا... رات پڑئے وہ ہندوں گاتی.. اس لڑکی کو نگیت کا جنون تھا تم نے گیت اور الفاظ ماتوی کر دیے مگر سرر ہیں گے... سرائل ہیں... گوتم بولا کچھ دیر کے بعد ہری شنگر نے پھر کہنا شروع کیا۔ میں جب اتر کوشل کی سرحد پر پہنچا تو فلم استھان کے پہرے دار نے لکار کر مجھ سے پوچھا تم کہاں سے آرہے ہو؟ میں یہیں سے گیا تھا اور یہیں لوٹ کر آیا ہوں۔ میں نے جواب دیا اور یہی تم سب کا حشر ہوگا... اچکر سے بچنے کی کوشش کرو

تم اس کا مطلب سمجھے... پہرے دار نے اپنے ساتھی سے کہا۔ یہ بھی کوئی فلسفی جان پڑتا ہے اور پھر دونوں کوڑیاں کھیلنے میں مصروف ہو گئے۔ مگر میں جب ایو ڈھیا میں داخل ہوا تو مجھے پتا چلا کہ سرا بھی باقی ہیں۔ گوتم زندگی کا پھیلا و بہت زبردست ہے۔ ملک۔ یستیاں۔ نئے نئے لوگ۔ بھانت بھانت کی بولیاں۔ میں نے پاٹلی پتڑ سے لے کر پشکروتی تک سرا راستہ یہی کھڑا وہ پہن کر طے کیا ہے۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر گوتنی کے کنارے لکھش ناوتی آباد ہے۔ جسے سری چھمن نے بسایا تھا

.. سکھم پر پریاگ ہے .. پھر کانیا کجع .. ہستاپور اور تکشلا .. اس کے آگے سرحد کا شہر پشکروتی .. اس لمبی شاہراہ پر میں نے بہت طویل سفر طے کیا .. مگر ہندوؤں کے سربراہ میر اپنچھا کرتے رہے .. تم کئی سال میں تکشل میں رہا اور انہیں بھلانے رکھا .. یہاں لوٹ کر پھر وہ آوازیں میرے کانوں میں آ رہی ہیں .. تم مجھ سے لفظ اور آواز کی ابدیت کی بات کرتے ہو .. مجھ سے پوچھو .. مجھ سے معلوم ہے یہ سب جگہوں کے حرکا اڑ ہے اصلیت کچھ نہیں .. سردم دھرم دھرم

سنا ہے وہ پر اچھیں ایو دھیا کی رانی رینو کا ایسی خوبصورت ہے

کس کا ذکر کرتے ہو .. ہری شنکر نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا پتا نہیں گو تم نے جواب دیا .. پھر وہ بھی آنکھیں بند کر کے فرش پر لیٹ رہا مقدس سر جو .. رُگ وید میں بہنے والی ندی .. میری ماں .. نہ جانتے کب تک اسی طرح بہتی رہے گی .. سامنے میرا شہر ہے .. ہری شنکر کی خوبصورت مدھم آواز اس کے کانوں میں آتی رہی .. خوبصورت .. شامدار ایو دھیا .. کتنے زمانے سے اسی جگہ پر راتوں کو یونہی جگہ گاتا رہا ہے .. کتنے جگ بیتے جب منو کا بیٹا اس کا پہا با دشاہ بنا تھا .. اور شیو بھگت بھاگیرت اور ڈگ وجہ فاتح عالم .. رام چندر ایو دھیا .. اجکا .. برہم کا شہر .. جسے کوئی جیت نہیں سستا .. تم نے کبھی اس نگری کے رقصوں اور سنگیت کاروں کو دیکھا ہے؟ یہاں کے ناچوں میں شامل ہوئے ہو؟ راج محل میں بست کا تھوا ر منایا ہے؟ یہیں پر جمپک رہتی ہے اور یہیں پر میرے گھروالے اور میری بہن میرے منتظر ہیں .. جس طرح سی کرشن کو اپنی بہن سبھ درابڑی پیاری تھی ویسے ہی میں اپنی بہن کو عزیز رکھتا تھا .. مگر میں نے اس کی محبت کو دوسرا محبتوں اور

وفاداریوں کے ساتھ دل سے نکال پھینکا اور پھر اوپر جن لوٹ آیا..... رام نے چودہ برس کے بن واس کے بعد لوٹنے کا وجہ دیا تھا۔ میں بھی آیا ہوں۔ مگر سدھارتھ نے مجھے وعدوں کے بندھن سے آزاد کر دیا ہے۔۔۔ میری بہن۔۔۔ رام چندر کی بہن شانتا کے جیسی خوبصورت اور معصوم ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ اسی ایودھیا میں جس طرح ڈیڑھ ہزار سال قبل شانتا اور سیتا کی جوڑی تھی۔۔۔ ایسے ہی ز ملا اور جمپک چاند اور سورج کی مانند جگمگاتی ہیں۔۔۔ دیکھو الفاظ نے پھر میرے ساتھ غداری کی ہے۔۔۔ اس نے اداکی سے بات ختم کی

گوتم نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔۔۔ باہر درختوں پر بارش برنا شروع ہو گئی تھی۔۔۔ برسات کا موسم ہے۔۔۔ یہ موسم سارے بھکشوؤ پیہاروں میں بس رکرتے ہیں۔۔۔ گوتم کو خیال آیا۔۔۔ اس نے کروٹ بدل کر ہری شنکر سے پوچھا تم شرون کا زمانہ کہاں گزراؤ گے؟

پتا نہیں

تمہارے باقی دوست کہاں جا رہے ہیں؟

میرے ہم سفر۔۔۔ تمہارا مطلب ہے

ہم سفر ہی کہہ لو

یہ بھی معلوم نہیں

نکشہ لا تو برہمنوں کی درسگاہ ہے۔۔۔ تم وہاں کیسے پہنچ گئے

میں۔۔۔ میں تو پاکھتاوں کے دلیں بھی رہا ہوں۔۔۔ جہاں اتر کے نیلی آنکھوں والے سفید فام والا تی شیو کی عبادت کرتے ہیں۔۔۔ میں نے ایراوتی [راوی] اور

چندر بھاگ [چناب] کی وادیوں کی سیر کی ہے۔ میں سندھو کی لہروں پر تیرا ہوں
۔۔ پورب میں دنگا تک گیا ہوں۔۔ میں نے برہم پترا اور سندھ بن اور چندر ادیپ کی
دلدوں میں جنگلی دھان اگتے دیکھے ہیں۔۔ جہاں سیاہ لباس پہنے لمبے بال کے
ندھوں پر چھٹکائے مرگ نہیں لڑکیاں ہرے بانوں کے جھنڈوں میں رہتی ہیں اور
پریوں کی طرح گاتی ہیں۔۔ گوم زندگی کا پھیلاو بہت عظیم ہے۔۔ اس وعثت سے
بچتے رہو۔۔ کائنات۔۔۔ اور اس کی وعثت کہاں سے پیدا ہوتی ہے؟ کہاں جاتی
ہے؟ ہم کہاں پیدا ہوئے؟ کس طرح اور کس وجہ سے زندہ ہیں۔۔ اور یہاں سے
کہاں جائیں گے؟ قسم جو برہما سے واقف ہو۔۔ ذرا بتلو و دکھ یا سکھ کس کے حکم
سے یہاں رہ رہے ہیں؟ وقت یا فطرت۔۔۔ یا... حادث۔۔۔ یا عناصر کو سمجھا جائے یا
سے پر جوش کہا تا ہے جو تمہارے نزدیک پرم آتا ہے؟ ہری شنگر نے بات ختم کی
انپشندوں میں لکھا ہے کہ کائنات آزادی میں پیدا ہوتی ہے، آزادی موجود
رہتی ہے اور آزادی میں سمو جاتی ہے
وہی ابدیت۔۔۔ ہری شنگر نے رنجیدہ آواز میں کہا۔۔۔ آزادی اور ابدیت خودا
یک قید نہیں؟

بارش تیزی سے شروع ہو گئی۔۔ دیا ہوا کے جھونکے سے بجھ چکا تھا۔۔۔ شنگر نے
امینوں کا تکمیلہ بنا کر سر کے نیچے رکھ لیا گوم نے اپنی سفید چدر اوڑھ کر دیوار کی طرف
کروٹ بدل لی۔۔۔ دونوں کچھ دیر تک چپ چاپ اندر ہیرے میں پلکیں جھپکا کیے
۔۔۔ پھر پرواں کے جھونکوں سے انہیں بھی نیند آگئی
اس رات گوم کو عجیب عجیب خواب نظر آئے، منڈی کی کوٹھڑی میں سے نکل کر

چندی دبی اپنے گوری کے روپ میں چھن چھن کرتی باہر آئیں۔ پھر وہ کیسری ساری والی اڑکی میں تبدیل ہونا شروع ہوئیں۔ اس کے بعد ان کی شکل پھر مختلف نظر آئی۔ پہلے وہ دین بیٹی کے روپ میں مہادیو سے ان کا بیاہ ہوا۔ پھر پل کی پل میں ایک بوڑھی عورت۔ درگاہ سے بھی زیادہ خوفناک۔ آلتی پاتی مارے ان کے سر ہانے آن پیٹھی۔ اور زور زور سے رونے لگی۔ میری ماں۔ میری ماں۔ گوم نے لرز کر کہا۔ لیکن بوڑھی عورت نے دانت نکوس کر جواب دیا۔ میں تمہاری ماں نہیں مارے میں نے تو ویشالی کی۔ اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ایک پل درخت کی شاخ پر سے ٹوٹ کر آنگلن میں آن گری اور گوم ہڑ بڑا کراٹھ بیٹھا۔ شکر بڑے سکون سے سورہا تھا۔ بارش تھم چکی تھی۔ ندی کے کنارے چندال کسی کی لاش مر گھٹ کی سمت لیے چاہے تھے اور کشمکشیوں کی روشنی اندر ہیرے میں آگیا بھتال کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس نے جلدی جلدی منتر پڑھنا شروع کر دیے۔ بہت دیر کے بعد اسے نید آئی۔

منہ اندر ہیرے جب شکر کی آنکھ کھلی۔ اس وقت گوم چندی پاٹھ میں مصروف تھا۔ گھاٹ پر برہمن کھنکار رہے تھے آم کا باغ چڑیوں کی چہکار سے گونج اٹھا تھا۔ گوم عبادت کے باہر نکلا۔ تو ہری شکر اسے دیکھ کر مسکرا یا۔ دفعتاً گوم نے اس کو پوچھا
... ویشالی میں کون رہتا تھا؟

میں ویشالی کی کسی مہیاں سے واقف نہیں ہوں۔ شکر نے بری سنجیدگی سے سر ہلا کر جواب دیا اور پھر ہنسنے لگا۔ گوم کو اس کی بے تکلی ہنسی پر بہت غصہ آیا۔ وہ دونوں مندر کی سیر صیاں اتر کر جنگل کے راستے پر آگئے۔ ندی کے کنارے

بھکشوں کا گروہ نہانے کے لیے آیا ہوا تھا
تم اب شراوستی والپس چلے جاتے ہو... شنکر نے پوچھا
ہاں تم نہ چلو گے۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر کپلا وستی ہے۔ ادھر پورب میں کوئی
نگر ہے۔ اور گیا۔ تم ان سب جگہوں کی یاترائے لیے نہ جاوے گے؟
تم اپنا مطلب بیان کرو
میرا مطلب یہ ہے کہ تم بھی میرے ساتھ چلو۔ تم میرے آشرم میں بھر سکتے ہو
۔۔۔ یا اگر میرے ماں باپ کی عزت بڑھانا چاہو تو شہر کے اندر میرا گھر ہے
میرا ارادہ کاشی جانے کا تھا۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم میری راہ میں حائل ہوتے
ہو۔

یہی بات دوسری طرح بھی کہی جاسکتی ہے۔ تم میرا راستہ کھو گا کہر ہے ہو
۔۔۔ بھائی ہری شنکر۔ پلڈنڈی پتلی ہو اور دو راگیں آئنے سامنے آئں کھڑے ہوں تو ان
میں سے ایک کوہٹ جانا چاہیئے۔ ورنہ دونوں کھڈے میں جاگریں گے گوتم نے کہا
پھر میں تمہارے ساتھ شراوستی کیوں چلوں۔ اس لیے کہ تمہیں میرے مزہب
سے دچکی ہے یا اس لیے کہ تم ایوں صیا کی ماری جمپک کے متعلق مزید معلومات
حاصل کرنا چاہتے ہو؟

ہری شنکر اگر تم نے شاکیہ منی کے چیلوں کا یہ گیر واپہناوانہ پہن رکھا ہوتا تو میں
تمہاری ٹھھٹائی کر دیتا۔ گوتم نے دل میں کہا
وہ دونوں آبادی چھوڑ کر شراوستی کی طرف بڑھنے لگے
آسمان پر سے بادل چھٹ گئے تھے، ہوا میں کچھ کلیوں کی مہک امدادی تھی

یکم کے ایک جھنڈ میں مور پر پھیلائے ناج رہا تھا۔ کھیتوں کی منڈیر پر دھانی اور کپاسی سائزیاں پہنے ہوئے کسن عورتیں ادھر سے ادھر جا رہی تھیں اس توک کے جنگلوں میں جگہ جگہ جودیو استھان اور دیوگرہ بننے ہوئے تھے گوتم ان پر پھل پھول چڑھاتا راستہ طے کرتا جا رہا تھا شکر خاموشی سے اس کے ساتھ ساتھ آ رہا تھا
شام پڑے دونوں لڑکے مور پالنے والوں کے ایک گاؤں کی فصیل میں داخل ہو گئے، ان گنت مور چاروں اور باغوں میں گھوم رہے تھے چھپروں کے نیچے مور کے پروں کے نیچے اور مور چھل تیار کیے جا رہے تھے۔ چوپال میں گانا ہو رہا تھا گوتم اور ہری شنکر کنوئیں کے من پر بیٹھے گئے۔ پل کی پل میں سارے میں خبر پھیل گئی تھی دو دیوارتی گاؤں میں مہماں آئے ہیں۔ ان کی او بھگت شروع ہوئی شنکر آنکھیں بند کیے بیٹھے رہا

ایک لڑکی دو خوبصورت پنکھیاں نظر کرنے کے لیے آئی تھی۔ گوتم نے لڑکی کے ہاتھ سے پنکھا لے لیا اور اسے الٹ پٹ کر دیکھنے لگا۔ اس کے پروں پر انگلیاں پھیریں۔ لڑکی بڑے ادب سے آشیرباد کی منتظر کچھ فاصلے پر کھڑی رہی۔ یہ پنکھے کہاں کہاں کن کن دور دراز کے شہروں اور ملکوں کو تجھے جائیں گے۔ کیسے کیسے لوگ ان کو استعمال کریں گے۔ وہ سوچ رہا تھا۔ یہ پنکھیا جو میں چھورہا ہوں۔۔۔ یہی ایو دھیا کے بازار میں جا کر بکے گی اور شاید وہی لڑکی اسے خرید لے گی۔ پھر اس نے دونوں پنکھیاں واپس کر دیں۔ ہمیں عیش و آرام کا حکم نہیں۔ ہمیں تمہارے یہ خوبصورت پنکھے نہیں چاہیے۔ مور کے پروں کو ہم بن میں دیکھ کر خوش ہو لیتے ہیں۔ اس نے جلدی جلدی کہا۔ لڑکی نے پنکھیاں اٹھا لیں اور پر نام کے لیے جھکی اور شنکر چونکہ بھکشو

کانارنجی لباس پہنے ہوئے تھا اس نے آگے بڑھ کر شنکر کے پاؤں چھولیے
تمہارا نام سجاتا تو نہیں... گوتم نے نہ کراس سے پوچھا۔ اور شنکر پر نظر ڈالی وہ
اب بھی آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا

نہیں۔ میرا نام نند بالا ہے۔ سجاتا میری بڑی بہن ہے لڑکی نے سادگی سے
جواب دیا اور پھر کنوئیں کے من پر سے اتر کر گاؤں کی طرف لوٹ گئی
بھائی گوتم ہرز مانے میں ہر قدم پر تمہیں کوئی نند بالا ملے گی۔ کوئی سجاتا اور وہ
تمہارے پاس آ کر تمہاری پستش کرنا چاہے گی۔ اب بھی وقت ہے کہ آنکھیں کھولو
۔۔۔ ہری شنکر نے کہا

صحح سو یورپھر وہ اپنے سفر پر چل نکلے اور دو دن تک چلتے رہے۔ اب شراوی
زیادہ دور نہیں تھا۔ شیشم کے جنگلوں کے اختتام پر آبادی شروع ہو گئی تھی۔ سڑک پر
دو رو یہ درخت لگے تھے۔ جن کے پرے امراء کے مکانات تھے۔ ان مکانوں کے
باغوں میں نقیٰ پھرایاں بنی ہوئی تھیں۔ اور امرو ڈا و رانار کے درختوں کے جھنڈ تھے
جن پر بزر پروں والے طوطے سورج مبارہ ہے تھے۔ پا تو مور مریں تالابوں کے
کنارے کھڑے پانی میں اپنا عکس دیکھتے تھے۔ جامن کے درختوں میں جھولے
پڑے تھے۔ مکانوں کی دیواروں کی سفیدی ہلکی ہلکی دھوپ میں دورست جگہ گارہی
تھی

برادر کی پلڈنڈی پر سے خانہ بد و شوں کا ایک قافلہ بیلوں پر بیٹھا گاتا بجا تا گزر
گیا

چلتے چلتے دھلتا رک کر شنکر نے گوتم کو مخاطب کیا۔۔۔ بھائی گوتم ویشاوی کی ابیا پالی

تھی گوہمپک اور سجا تا اور نند بالا سب ایک ہی ہیں۔ اپنے ذہن کو انتشار سے محفوظ رکھو۔ اور پھر یکخت شنکر گلڈنڈی پر سے اتر کرو اپس شیشم کے جنگلوں کی طرف مڑ گیا گوتم اسے آوازیں دستارہ گیا لیکن وہ نظروں سے اوچھل ہو چکا تھا

۲

شراوی کا خوبصورت شہر راپتی کے جنوبی کنارے دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے اتر میں ذرا فاصلے پر ہماوت کے گلابی اور نیلے پیہاڑا یستادہ تھے اور دیوار کے گھنے جنگلوں اور آس پاس ترائی کے نزلوں میں با گھاؤ بجھلے گھومتے تھے پیہاڑوں کا یہ سلسلہ بہت اوپر سے آ رہا تھا جا، ہن ماں سرود کی جھیل تھی۔ جس کی شفاف لہروں پر دنیا کی آتما کا راج نہس اکیلا تیرتا تھا۔ ہماوت کے اوپرے پیہاڑوں کا اور کامروپ پتک پھیلے تھے ان پیہاڑوں کے اس پاراٹر میں سونے کی رنگت والی کچھوں کا دلیس تھا، واویوں میں ان گنت روپ پہاڑ اور جنگلے پانی کی ندیاں تھیں۔ اور خوشبو دراپتوں کے درخت اور وحشان کے کھیت اور تاریک خنک جنگلوں میں گروگل بنے ہوئے تھے جہاں ملک کے نوجوان اڑکے۔۔۔ شہزادے اور مغلس برہمن اور کشتی امیرزادے علم حاصل کرنے میں جئے تھے انہیں جنگلوں میں۔۔۔ پیہاڑوں کی ڈھلوانوں پر جہاں دن میں بھی گھپ اندر ہمرا رہتا تھا۔۔۔ ہاتھی پلے تھے۔۔۔ جن سال میں ایک بار کھیدا کے لیے وہاں آتے تھے ہاتھی پکڑنے والے ہاں کا لگاتے۔۔۔ درباریوں کا پڑا اور ہوتا۔۔۔ جنگل میں منگل لگ جاتا ہاتھیوں کا راستہ تلاش کرنے والا اور سدھانے والوں کا عملہ جنگلوں کے کنارے لکڑی اور بانس کے جھونپڑوں میں رہا کرتا تھا ان کی اڑکیاں موئے اور فیروزے

کے رو پہلے زیور پہنے بالوں کی مینڈھیاں گوندھے ہاتھ بازار کے لیے جب
میدانوں کی طرف آتیں تو شہری لڑکیاں ان کی رنگ برلنگی سیاہ۔ سرخ اور زرد
و حاریوں والی پوشش کو بڑی دلچسپی سے دیکھا کرتیں
اڑکوٹل کی ریاست میں نگر۔ پورا اور نگریاں۔ شہر اور قصبات اور گاؤں ان ہرے
بھرے میدانوں میں آباد تھے جنگلوں کی افراط تھی۔ جن کی لکڑی سے خوبصورت
مکان بنائے جاتے۔ اب آبادی بڑھ رہی تھی اور جنگل کثتے جاتے تھے
شر و اسی کا شہر بہت گنجان اور بارونق تھا۔ دور کے دیشوں سے آئے ہوئے
لوگ یہاں رہتے تھے۔ الگ الگ محلوں میں کاری گر۔ سنار۔ بزاں۔ آڑھتی اور
دوسری پیشہ و رجماعیتیں آباد تھیں۔ ان کی اپنی اپنی منڈلیاں تھیں اپنے قوانین
چوروں تک کی کنڈلی معہ ایک ضابطہ شاستر کے پاس موجود تھی بارہ مہینے چہل
پہل رہتی۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی تھواں مذکور میا جاتا۔ ہر شخص اپنے اپنے کام میں منہمک تھا
۔۔۔ مصوروں اور سنگ تراشوں کی ٹولیاں نگارخانوں میں مصروف رہتی تھیں ناٹک
منڈلی میں صبح سے کھیل شروع ہو جاتا اور دن بھر جاری رہتا۔ ناٹک اور ناٹکا میں
زرق برق کپڑے پہنے، چھروں پر روغن لگائے مشہور تمثیلیں پیش کرتیں
۔۔۔ چوراہوں پر مدرایی اپنے کرتب دکھاتے۔ بھنگ کی دکانوں پر آوارہ گردوں
۔۔۔ اچکوں اور جنگلوں کا مجمع رہتا۔ تھواں کے موقع پر بخارے تاثری پی کر زور زور
سے گاتے پھرتے۔ دوم نقلیں کرتے۔ دلیش ناریاں چھمن چھمن کرتیں اپنی گلیوں
میں ٹھہریں امیرزادیاں سولہ سنگھار کیے تھاںوں میں گھنی کے چراغ جلائے مندروں
کی اور جاتی نظر آتیں۔ عودا اور لوہا بن کی خوشبو سے فضا بوجھل ہو جاتی

رتحکار مٹی کے برتن بنانے والے کلاں اور بید کی نوکری بننے والے شہر کے باہر رہتے تھے۔ آبادی سے بالکل الگ تحملگ چندالوں کی بستی تھی ان کا پچھم طبقہ چاروں زاروں سے کم تر تھا۔ محض لاٹیں اٹھانا اور مردے جلانا ان کی قسم میں لکھا تھا یہی ان کا پیشہ تھا۔ وہ صرف مردوں کی اترن پہن سکتے تھے ان کو حکم تھا کہ نوٹے پھولے برتوں میں کھانا کھائیں اور محض کافی کے گئے استعمال کریں لیکن زیادہ عرصہ نہیں اُزرا۔ شراوتی میں کپلاوتی کے شاکیرہ منی آن کر رہے تھے اور انہوں نے اور ان کے حواریوں نے اپنے واعظوں میں بتایا کہ آدمی پیدا کش کی بناء پر نہیں بلکہ عمل کی بناء پر ملیچھ یا اچھوت بنتا ہے اور اب نارنجی لباسوں والے بھکشوں کی نولیاں بستی گھوم کر چندالوں اور اچھتوں کو نیک عمل کی تلقین کر رہی تھیں

شراوتی کی رونق ہر موسم میں قائم رہتی۔ اگر میاں آتیں تو امراء اپنے باغوں میں تالابوں کے کنارے جا بیٹھتے۔ یا خنک تہہ خانوں میں آرام کرتے۔ شام کے سے بازار میں کھوئے سے کھوا چلتا۔ بوڑھی عورتیں موتیا اور چنیلی کے سمجھے گھروں کی ڈیوڑھیوں پر لے جا کر پیتیں۔ خوبصورت اڑکیاں اونچے مکانوں کے جھروکوں سے نیچے جھانکتیں۔

شہر سے باہر کھلے بزرہ زاروں میں کشتی سور ما سندھ اور ایران اور عرب کے اصل گھوڑوں پر سوار ہوا سے باتیں کرتے نظر آتے۔ گاؤں کی سمت جانے والے سایہ دار کچے راستوں پر کسانوں کی بیل گاڑیاں اور بہلیاں چرخ چوں کرتی زم روی سے چلتیں

موں برت رکھنے والے برہمنوں کی مانند۔ سال بھر گم سم رہنے کے بعد مینڈ کوں نے طوفان کے دیوتا سے زندگی کی اہر حاصل کی ہے اور اب کیسے زور زور سے چلا رہے ہیں جس طرح طالب علم اپنے استاد کے الفاظ یک زبان ہو کر دہراتے ہیں اسی طرح ایک مینڈ ک دوسرے مینڈ ک کی بوئی نقل کرتا ہے سب کے سب تکیا میں لیئے بر ساتی راگ الائپنے میں جئے ہیں

گوتم نے مسکرا کر کتاب بند کر دی اور نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا بارش جھما جھم برنسا شروع ہو گئی تھی مینڈ ک ٹرار ہے تھے سور جھنکارتے تھے۔ پپیچا غل مچا رہا تھا ساون کی لھٹا میں جھوم کر لھٹی تھیں رگ وید میں صدیوں پہلے بر کھارت کی جیسی منظر کشی کی گئی تھی۔ وہ منظر دیسے کاویسے بالکل اس کے سامنے موجود تھا۔ کٹی کے پھونس پر لوکی کی یتیل پھیلی تھی اس پر سے پانی کے قدرے پک پک کر گوتم کے پیروں کو بھگوئے ڈال رہے تھے وہ کٹی کے برآمدے میں بیٹھا ساون کی آوازیں سنتا رہا سازوں کا ایک بہت عظیم اجتماع تھا۔ جس پر سر سوتی میگھ راگ بجارتی تھی امن اور سکون کا راگ۔۔۔ میگھ؟۔۔۔ اس کا ذکر میں نے ابھی کسی سے سنا ہے؟۔۔۔ کیا میں ابھی تک اپنے حافظے پر قابو نہیں پاس کا۔ مجھے غیر ضروری باعثیں کیوں یاد رہتی ہیں۔۔۔ اس نے اداسی سے سوچا اور کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی۔۔۔ اور بارش کی بوندوں کو دیکھنے لگا۔ ساون کی پورن ماشی آگئی تھی اور پڑھائی شروع ہو نے والی تھی گوتم نیلمبر اپنے آشرم والپس آچکا تھا۔ آشرم شہر سے دور اسوس کے جنگل میں واقع تھا۔۔۔ ندی کے کنارے کنارے جھونپڑوں میں طالب علم رہتے تھے۔ اس

پار گرو کے کھیت تھے جو کہ سر کار کی طرف سے آشرم کو ملے تھے... بارش تھمتی تھی تو طالب علم ان میں کام کیا کرتے تھے۔ خزان کے مہینے میں تبت کی طرف سے اڑتے ہوئے نہ آتے اور بستن کے زمانے میں لوٹ جاتے۔ طالب علم صحیح صبح جب اشنان اور عبادت کے لیے گاٹ پر جاتے تو انہیں اپنے یہ خاموش رفیق سنیا۔ سیبوں کی طرح مرائبے میں ڈوبے ملتے

گوتم اپنے گرو کے پاس جنمیں اچاریہ کا درجہ حاصل تھا۔ مدتow سے پڑھ رہا تھا۔ یہ اس کی تعلیم کا آخری سال تھا۔ اس دواران اس نے ناٹک لکھنے اور تصویریں بنانے میں بہت شہرت پائی تھی اپنے آشرم سے باہر دوسرا درس گاہوں میں بھی اس کا نام عزت سے لیا جاتا تھا۔ اگر یہ پیدائشی شاعر ہے تو اسے پروہت بنانے کا کیا فائدہ؟ اس کے معلم نے سوچا تھا۔ مگر گوتم کے پاس یہی راستہ اُن تھاراج دربار میں پروہت کی مند اس کی منتظر تھی جس پر اس وقت اس کا باپ بیٹھا تھا۔ ممکن ہے کہ ایک روز وہ ایکا پروہت کے رہبے تک پہنچ جائے اور اتر کوشل کے عالوہ دوسرا ریاستوں کا بھی مشیر بنے وہ بے حد ذہین اڑکا تھا اور اس کے پورو دلیں میں علم کی بہت قدر کی جاتی تھی اسے فنون جنگ بھی سکھنے پڑنے تھے اور اگر اسے لکھنے پڑھنے سے زیادہ دلچسپی نہ ہوتی تو تب بھی اس کا کوئی نقصان نہ تھا۔ مغرب کے کورو پنچالوں کے ہاں بینا پتی کو پروہت پر فوکیت حاصل تھی۔ گوتم اندر پرستی ہو جا کر فوج میں نوکری کر ستا تھا۔ مگر اس نے طے کر کھا تھا کہ وہ صرف ناٹک لکھا کر ریگا۔ فین کے نظریوں پر کتابیں تصنیف کرنے گا۔ تصویریں اور مجسمے بنائے گا۔ شاعروں نے سماج سے ہمیشہ بغاوت کی ہے۔ پر اس کے ساتھ ہی اسے اپنے گرو کا بڑا خیال تھا

وہ بھی کوئی ایسی بات نہ کرئے گا جس سے اس کے گروکو دکھ پہنچے۔

گرو چلے کا یہ سلسلہ صدیوں سے.. عالموں کے بادشاہ جنک اور شی دلتاریہ کے زمانے سے چلا آ رہا تھا۔ اسی آشرم کے آس پاس۔ ایک ہزار سال قبل... سر جو کی ایک شاخ ملینا ندی کے کنارے ایک مشہور درسگاہ موجود تھی یہ کنج۔ جہاں گوم اور اس کے ساتھیوں کے جھونپڑے تھے۔ یہیں دوسرے لڑکے گھوما کرتے ہوئے دوسرے لڑکے..... دوسری لڑکیاں

برہمچاریہ کی زندگی بسر کر کے لڑکیاں بھی اکثر اعلیٰ تعلیم حاصل کرتیں۔ رُگ وید کی کئی نظمیں اور، راہبات کے نغمے، لڑکیوں نے لکھے تھے۔ شاعرہ اپالا کی نظمیں گوم نے پڑھی تھیں۔۔۔ لڑکیاں بھی کیسی عجیب ہستیاں ہوتی ہوئی۔ گوم کو اکثر خیال آتا

دوسرے برہمن زادوں کی مانند گوم نیلمبر کی پڑھائی بھی پانچ سال کی عمر سے شروع کر دی گئی تھی۔ اب وہ پورے چوبیس سال کا ہو چکا تھا۔ اور اس نے الہیات تمثیل۔ ادب۔ بحوث و دیے۔ علم عناصر۔ ریاضی۔ صرف و نحو۔ منطق۔ فلسفہ۔ اخلاقیات۔ ادا کاری۔ کیمیا۔ طبیعت۔۔۔ نصاب کے سبھی علوم پڑھائے گئے تھے۔ فن سپہ گری کے علاوہ وہ راگ و دیا کا بھی ماہر تھا۔ اتر پردیش کے رہنے والے اہل زبان تمجھے جاتے تھے۔ گوم کو بھی زبان کی صحت کا بہت خیال رہتا

برسون سے اس کی زندگی اسی دھڑے پر چل رہی تھی۔ وہ ماں باپ سے الگ آشرم میں رہتا۔ گرو کے جانے سے قبل طلوع آفتاب کے وقت اٹھ جیٹھا۔ ندی پر جا کے نہانے کے بعد۔ جنگل کے خاموش ترین حصے میں بیٹھ کر عبادت کرتا

.. درختوں کے مقدس کنھوں سے جودیویوں اور دیوتاؤں کے نام سے معنوں تھے
اس سے سر لیے بھجوں کی آوازیں بلند ہوتیں۔ عبادت کے بعد گوم آبادی میں
جا کر دن بھر کی خوراک کے لیے بھیک حاصل کرتا۔ پھر لکڑیاں چین کر لاتا اور رُگ
کی کٹی کی آگ روشن کی جاتی۔ آشرم میں روزانہ چاول اباۓ جاتے تھے۔ اور جو کی
روئی بنتی تھی۔ شراوتی میں بڑے بڑے قصاب خانے موجود تھے۔ شہر کی دعوتوں
میں اکثر گائے کا گوشت بھی پکتا تھا۔ لیکن طالب علم کو گائے کا گوشت کھانے کی
ممانعت تھی لہذا گوم اور اس کے ساتھی گروکھلانے کے بعد خود بھی اسکیلے بیٹھ کر
ساغ پات ہی کھاتے تھے

اس دلیل کے رہنے والوں کو صفائی کا جنون تھا۔ آشرم میں دن میں دس بار
جھاڑ و بہاری کی جاتی۔ پیٹیل کے برتن جھونپڑوں کے برآمدے میں رکھے جگر جگر
کرتے۔ بات بے با پیر دھوئے جاتے۔ تنکا بھی فرش پر نظر نہ آتا، پھر باغ کی
صفائی کی جاتی۔ اس ساری مشقت، کے بعد پڑھائی ہوتی۔ پڑھائی کے بعد یادخدا
برہمچاری کے قوانین کٹھن تھے۔ گوم کو شروع سے سکھلایا گیا کہ وہ عطر پھول
استعمال نہیں کر ستا۔ بر مدد لگانے۔ جو نتا پہنچے۔ بارش یا دھوپ میں چھتری لے کر چلنے
کی اس سختی سے ممانعت تھی۔ دریا پار کرنے کے لیے وہ کشتنی استعمال نہیں کر ستا تھا
۔ اسے بتالیا گیا تھا کہ طالب علم کو دن بھر کھڑا رہنا چاہیے۔ رات بیٹھ کر گزارنی
مستحسن ہے۔ مونا جھوٹا پہنچنا اور روکھا سوکھا کھانا اس کا وظیرہ ہے۔ بڑیوں کے
ساتھ عزت سے پیش آنا اس کا فرض ہے۔ بے ضرورت دوڑ بھاگ نہ مچاو۔ زبان
نہایت صاف اور شستہ بولو۔ ایک لفظ بھی غیر فصح منہ سے نکلنے نہ پائے۔ بڑیوں کا

مزاق بھی نہ اڑانا.. عیش و عشرت .. راگ رنگ سے تمہیں کوئی سروکار نہ ہونا چاہیے
۔ شہر کے سرکاری قمارخانے میں معز زین شام کو جمع ہو کر جواہیلیت .. گوتم جو کہ طالب
علم کی حیثیت سے بھیک مانگ کر اپنا پیٹ پالتا تھا۔ محض خواب میں ہی سکون کے
درشن کر ستا تھا۔ چنانچہ ایک روز اس نے خواب میں دیکھا کہ قیمتی دو شالہ اوڑھے
گھٹنوں کے بل بیٹھا پنا پہ پن داو پہ لگا رہا ہے .. اور اس کے چاروں اور عجیب
عجیب شکلوں کے لوگ جمع ہیں .. ایسے لوگ جو کہ اس نے جاگتے میں شراویتی کے
بازار میں بھی کبھی نہیں دیکھتے تھے

لیکن گوتم اپنے گرو کا نہایت فرمانبردار اور عقیدت مند چیلدا تھا اور گرو کے
احکام کی تعییں کرنا اس کا ایمان تھا لہر اجب بھی وہ شراویتی کے ناج گھریا قمارخانے
کی عالی شان عمارت کے سامنے سے گزرتا تو اپنا منہ وہ مری طرف پھیر لیا کرتا
ناج گھر کی سڑھیوں پر سے اکثر پاتریں گھنٹھر و سنجھا لے اترتی یا چڑھتی نظر
آتیں بھی طالب علم اسی طرح گور کے تابع تھے بعض مرتبہ وہ گرو کے لیے اپنی
جان پر کھیل جاتے بھیک مانگ کر سب سے پہاڑ گرو کو لا کر دیتے اور اکثر خود بھجو
کے رہ جاتے پچھلے وقتوں میں پنچالوں کے علاقے کا ایک طالب علم جو کہ تکشلا میں
پڑھتا تھا، اپنے استاد کے کھیتوں کو سیااب سے بچانے کے لیے بند باندھنے کے
بجائے خود پانی کی آڑھی میں لیٹ گیا تھا

طالب علم کو حکم تھا کہ وہ ذات و نسل کے غرور اور شہرت اور نیند کی تمنا سے دور
رہے، شیخی اور خود نمائی کے جذبات پر قابو پائے دماغ کا سکون اور دل کا صبر و ضبط
حاصل کرے

ساون کی پورنماشی سے لے کر پوس کی پورنماشی تک پڑھائی ہوتی تھی، طریقہ تعلیم سوال و جواب پر مبنی تھا۔ چیلا سوال کرتا گرو اس کا جواب دیتا۔ پھر درختوں کے سائز میں بینہ کر آپس میں بحث و مباحثہ کرتے، بال کی کھال نکالی جاتی۔ اگر کبھی سیاسی ہنگاموں، جنگوں یا یہودی حملوں کی وجہ سے پڑھائی ماتوی کرنا پڑتی یا تھوا روں کی چھٹیاں ملتیں تو گوتم اکیلا ہی اپنی کٹی میں بیٹھا چراغ جلانے رات رات بھر انھمیں لکھا کرتا۔ گیدڑوں کا چلانا پڑھائی کے لیے برائیں تھا۔ مرگھٹ میں اور سڑک کے کنارے بینہ کر پڑھنا منع تھا۔

جاڑوں کی راتوں میں نزدیک کے جنگل میں گیدڑ چلاتے۔ بے چاروں کو سردی لگتی ہے۔ اوڑھنے کے لیے راجن سے کمبل مانگتے ہیں۔ گوتم کی ماں بچپن میں اس سے کہا کرتی تھی۔ جب وہ اپنے شاندرامکان کے ایک اندرولی کمرے میں گرم، کپڑوں میں ملفووف۔ چھپر کھاٹ پر لیٹا بیچ تنسز کے قصے۔ چند اماں اور ان کی بیوی رونی اور راہو اور کیتو کی کہانی سنتا تھا۔ چند اس کے ماموں تھے۔ سب بچوں کے ماموں تھے۔ کیونکہ ماموں کا رتبہ اس عہد میں بڑا تھا۔ وہ ماں کا بھائی تھا۔ اور ماں بے حد تکریم،ستی تھی۔ جاڑوں کی طویل راتوں میں گیدڑ چلاتے تھے۔ سارے جنگل چاندنی میں سائیں سائیں کرتا، چند اماں اور پر کمرے میں تیرا کرتے۔ اسے اپنی ماں یاد آ جاتی۔ پھر وہ کوشش کر کے دوبارہ صرف ونجو میں منہمک ہو جاتا۔

طویل چھٹیوں کے زمانے میں گوتم نیلمبر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ یا تنہا اپنے موقلم یار گنوں کی کلیاں لے کر دور دور نکل جاتا۔ اسی طرح وہ ایودھیا گیا۔ ایک مرتبہ کوئی بھی جا پہنچا۔ مگدھ میں راج گیر کے کھنڈ راس نے چاندنی رات میں دیکھے اور

بہت اداس ہوا اور وہیں بیٹھ گیا۔۔۔ اس نے بھیم بسیار کے آخری دنوں کے متعلق ایک نالک لکھا۔۔۔ یہ ایک واقعہ تھا کہ اب اس کا دل صرف دخوں میں نہیں لگ رہا۔۔۔ وہ چاہتا تھا کہ محض فن کے نظریات پر اور بہت کچھ پڑھے اور لکھے قدم قدم پر جو سوالات ذہن کو الجھاتے ہیں ان کا کوئی حل کھو جے۔۔۔ ہری شنکر جو کہ اسے ایودھیا سے واپسی پر ملا بہت دلچسپ تھا۔۔۔ مگر اس کے محدودیت کے فلسفے سے بھی گوم کو ڈر لانے کا قدمیم برہمنوں کا فلسفہ تھا۔۔۔ زندگی سے موسیقی سے زندہ رہنے کی لگن سے بھر پور لیکن اپشندوں کی موسیقی نے زندگی کو اور گہرا کر دیا تھا۔۔۔ جواب تک بڑے صبر و ضبط اور ذہنی سکون کی زندگی گزار رہا تھا اسے اب سر جو کے گھاث پر بیٹھی اڑ کی یاد آ جاتی جس نے کیسری ساری پہن رکھی تھی۔۔۔ اس کا دل چاہتا کہ ایودھیا واپس جا کر اسے تلاش کرنے پتا چلائے کہ وہ کون ہے کیا کرتی ہے؟۔۔۔ شنکر اس کمخت منہوں بودھ بھکشوں سے، جو کہ پل کی پل میں چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا تھا اس کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے؟۔۔۔

اقامتی درسگاہوں میں نئے نئے نظریات کی ہوا وقا فو قتا چلا کرتی تھی اسی طرح اپشندوں کے مختلف فلسفے وجود میں آئے۔۔۔ ان کی شرہیں لکھی گئیں مختلف مدارس فلکر قائم ہوئے۔۔۔ بدھ مت تازہ ترین ذہنی رواج تھا گوم نیلمبر کے مدرسے میں بہت سے اڑ کے اسی مسلک کے حامی ہو چکے تھے گوم کی کتبیاں میں شام پڑئے دوسرے طالب علم آن بیٹھتے شہر کے مصور۔۔۔ سنگ تراش، شاعر، لیکھک اور اس طرح کے دوسرے لوگ جن کا تعلق فنون اطیفہ سے تھا اور کلا جن کا پیشہ تھا گوم کے چھوٹے سے کمرے میں محفل جنمی لپے تلے فرش پر چھائی بچھائی جاتی۔۔۔ درمیان

میں چراغ جلتا رہتا۔ رات گئے تک مختلف موضوع زیر بحث لائے جاتے۔ ادب اور فنون کے نئے اور پرانے نظریوں پر تبادلہ خیالات ہوتا۔ سگیت کا مظاہرہ کیا جاتا۔ سیاست کا بھی فنون لطینہ میں شمار کیا جاتا تھا۔ گوتم کے دوستوں میں سجاو کے نیتا شا مل تھے طالب علم تھے جو کہ سایسٹ پر کتا میں لکھا کرتے تھے۔ ان محفلوں میں سیاسی موشک گافیاں کی جاتیں۔ ریاست اور عدم ریاست میں کاے فرق ہے؟ راجہ اور پر اجاء میں کیا تعلق ہوتا چاہیے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ جائیداد ریاست کو غیر ریاست یا مہاتما بدھ کی سکھوتی سے ممتاز کرتی ہے اور سکھوتی وہ کیفیت ہے جن میں انسان کا جسم بھی اس کا اپنا نہیں اور ریاست اور ریاست کی حدود سے ماوراء ہو کر انسان یا تو جانور بن جاتی ہے یا خدا۔ ملکیت... یہ میرا ہے۔ کے تصور اور دھرم کے احساس سے ریاست بن جاتی ہے اور ملکیت کی اجازت رایست عطا کرتی ہے۔ ملکیت ریاست کا نتیجہ ہے۔ اس کی وجہ نہیں۔ لہذا سیاست کے طالب علموں نے طے کیا کہ ریاست اس کیفیت کا نام ہے جہاں دروازے کھلے چھوڑ کر سو سکتے ہوں جو عورتیں زیور پہن کر مرد کے بغیر رکھوالي کے باہر نکل سکتی ہوں اور ملکیت۔ فرض اور سزا کی بنیاد پر ریاست قائم ہوتی ہے۔ مہابھارت میں لکھا تھا کہ ڈنڈ لعنی سزا نہ ہو تو طاقتور کمزور

کو اس طرح کچلیں۔ جس طرح بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھاتی ہے۔ اور مہابھارت کی کتاب۔ شانثی۔ میں لکھا تھا کہ انسان خطرناک حد تک حریص اور تشدید پسند ہے۔ لہذا یہ میرا ہے کافقرہ بھلا دینا چاہیے۔ مامتوں اس حس ملکیت سارے جھگڑے کی جڑ ہے؛ ظلم انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ تہذیب اسے

اخلاق سکھا دیتی ہے اور متمدن بناتی ہے۔ ریاست ڈنڈ کے زریعے انسان کی جبلت کو ضابطے میں لاتی ہے۔ بادشاہ ڈنڈ دھر ہے۔ مگر وہ بھی قانون سے بالاتر نہیں۔ لہذا منو نے حکم دیا تھا۔ کہ نالائق بادشاہ کو بھی ڈنڈ سزا دے سکتا ہے۔ ریاست اور سیاسی نظام انسان کے لیے ضروری ہے۔ مہا بھارت اور منودنوں کے نزدیک حکومت کو سخت گیر ہونا لازمی تھا۔ کیونکہ انسان فطرت ابد تھا۔ جو امور کا فرض تھا کہ وہ اپنے وزن کے لحاظ سے اپنا فرض ادا کریں سپاہی کو محاذ پر مرنا ہوگا۔ طالب علم شادی نہیں کر سکتا۔ بادشاہ کا کام انصاف کرنا ہے۔۔۔ یہ تفریق عمرانیات کی بنیاد پر کئی گئی تھی۔۔۔ چنانچہ ریاست ظہور میں آتی ہے۔ تو پر جا کے ساتھ لا محالہ ورن آشرم کا بھی ظہور ہوتا ہے۔ اگر پر جا اپنے فرائض انجام نہ دے تو ورن آشرم کا خاتمه ہے۔ سیاسیات بڑے مقتضاً نظر یے تھے جو کہ گوتم نے پڑھے تھے۔ جیمنی نے کہا تھا کہ انعال اچھے اے برے انسان کے خود پیدا کر دے ہیں۔۔۔ ورنہ دنیا کے دکھوں کا سرچشمہ اگر خدا کو قرار دے دیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا ظالم ہے۔ لہذا جیمنی نے ثابت کیا کہ دنیا کی اخلاقی قوت کے لیے کسی خدامی نظام کی ضرورت نہیں۔۔۔ گوتم کے بدھ ساتھی بھی یہی کہتے تھے۔

سیاسی آزادی کا تصور ان سب کو بہت عزیز تھا۔۔۔ یہ آزاد انسانوں کا سماج تھا۔۔۔ یونان۔۔۔ مصر۔۔۔ بابل۔۔۔ نینوا؛؛ اور ایران کی ہم عصر تہذیبوں کے بر عکس اس دلیس کا معاشری نظام غلامی کے ادارے پر مبنی نہ تھا۔۔۔ شہنشاہ بھی ابھی تک نمودار نہ ہونے تھے۔۔۔ تراں کے عالقوں میں کشتريوں کی جمہوریتیں مہا بھارت کے زمانے سے بھی پہلے سے موجود تھیں۔۔۔ بادشاہ زمین کا مطلق العنان مالک نہ تھا۔۔۔ اسے الہی درجہ بھی

حاصل نہ تھا۔ کرم کی طاقت کے ساتھ کسی خود مختاری کی گنجائی نہیں۔ کرم نے ہر شے کو غیر ضروری بنادیا ہے۔ گوتم کے ایک ہم جماعت نے اپنے ایک مقالے میں لکھا۔ لہذا خدا بھی پاداش اور مكافات کے قانون کو توڑ نہیں سستا۔ اس قسم کے نظریات کی موجودگی میں مطلق العنوان حکومت کا قیام ناممکن تھا۔ جمہوریتوں کے زمانے میں کوئی نے بادشاہ کو سنگھ مکھیا کی حیثیت سے مخاطب کر کے کہا تھا۔ تیرے ہاتھ میں راج آیا ہے۔ اٹھ اور اسی شان سے حکومت کر کے۔ تجھ کو عوام نے اپنا بادشاہ چنا ہے۔ انسانوں کے اندر کی طرح اپنی راہ چل۔ تو جو گوپا ہے گواں۔ ووردا۔ اٹھ اور دنیا کے گلے کی رکھوالي کر

سارے ملک میں مختلف حیثیتوں کی حکومتیں موجود تھیں۔ جنوب کے راجہ بھون کہلاتے تھے۔ شمال کے ورات اور مغرب کے سوراٹ لیکن سامراجیہ کی داعی بیل مگدھ میں پڑی شروع ہو چکی تھی۔ یہاں کے بادشاہ مدوں سے سمراث کہلا رہے تھے۔ جس عالمگیر قومیت اور شہنشاہی کے تصور کا ذکر نمی تھا۔ شاستروں میں کیا جا رہا تھا۔ اس کو قائم کرنے کے لیے کوئی ایکراث بادشاہ جو کہ سارے ملک کا بادشاہ ہوا بھی تک پیدا نہیں ہوا تھا۔ چکروتی بادشاہ۔ جس کی مملکت کے ساتھ رتحہ کا پہریہ بغیر کسی رکاوٹ کے چلتار ہے۔

اور شاکیہ منی نے کہا تھا۔ میں شہنشاہ ہوں اے سیا۔ میں نے اچھائی کے رتحہ کا چکر چلا یا ہے۔۔۔

اکلیش نے جو کہ نیانیا تکشلا سے لوٹ کر آیا تھا۔ ایک نئے نام کا ذکر کیا۔ وہ شنوگپتا
نئی پر اس کے دچار بھی سننے کے قابل ہیں۔ تکشلا میں تو اس نے اپنی ذہانت کی
دوہم مچار کھی تھی میں نے سنا ہے کہ وہ آجکل کسم پور کے دربار میں موجود ہے
تم کاے کرتے رہتے ہو۔ گوتم نے اکلیش سے پوچھا
میں..... میں نے ایک نئی مورتی شروع کی ہے۔ کسی روز شہر آؤ تو دکھلوں
تم شیلا کاروں کی منڈلی میں شامل ہو گئے ہو؟ کیوں کشتريوں کا نام ڈبوتے
ہو۔ گوتم نے اسے چڑھاتے ہوئے کہا

تکشلا سے لوٹ کر بہت دن ہاتھ پرہ اتحد دھرے بیٹھا رہا۔ کوئی جنگ ہی
شروع نہیں ہوئی۔ کیا کرتا۔ اکلیش نے نہ کر جواب دیا
جنگ۔۔۔ ملیشور جو کہ ایک کونے میں بیٹھا ایک ایشی سے شاعر سے زبردستی
اس کی اعظم سن رہا تھا۔ کان کھڑے کر کے بولا۔ تم کو کسم پورے کی تازہ خبریں
معلوم ہیں؟

سب اپنی اپنی باتیں چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ دھن نند جوال کمھی
کے منہ پر بیٹھا ہے۔ وہ کہتا رہا۔ اتنی بڑی فوج کا خرچہ دلیس کو اٹھانا پڑ رہا ہے۔ پھر
جو گیشور نے مذکر کہا۔ یہ شراوستی میں وقایع نویں تھا۔ دو دھر۔ دہی۔ نمک۔ کھانڈ
۔ گھاس۔ لکڑی۔ پھل۔ پھول۔ تر کاری۔ بیگار۔ ڈھور ڈنگر۔ ہر چیز میں سر کارا پنا
 حصہ بٹا رہی ہے۔ تم سمجھتے ہو پر جا چپ رہے گی؟

ملک کے سیاسی حالات پر زور و شور سے گفتگو شروع ہو گئی۔ گوتم ایک طرف کو
خاموش بیٹھا سنتا رہا۔ عجیب عجیب نام لیے جا رہے تھے۔ واقعات دھرائے جا

رہئے تھے۔ رائیں دی جا رہی تھیں۔ ان سب میں شامل اور سب سے الگ بیٹھا وہ
ستارہا۔ خود بھی اپنے تین بحث و مباحثہ میں شامل پایا۔ کبھی وہ جوش میں آ کر زور
سے بوتا کبھی نہ تھا۔ کبھی کسی ساتھی سے کسی نکتے پر جھگڑا کرنے لگتا۔ لیکن ایک گوم
نیلمبر کیا سے باہر موجود تھا۔ جنگلوں میں گھوم رہا تھا سر جو کی لہروں کو عبور کرنے میں
مصروف تھا۔۔۔۔۔

ترانی کے زکلوں میں گھاس پر سر رکھے لیٹا تھا۔ جبکہ یہ گوم نیلمبر اپنے ساتھیوں
سے مدد کی سیاست پر تبادلہ خیالات کرنے میں منہک رہا
مدد میں ان دونوں نندوں کی حکومت تھی
جو خدا نے دولت کبیر سے بھی زیادہ امیر تھے

مدد ملک کی ریاستوں میں سب سے زیادہ طاقتور تھا۔ ایک زمانہ تاہج جب کو
شل بھی عرونچ پر تھا اجیں کے باڈ شاہ مہاسین نے یہاں کی شہزادائی سے شادی کی
تھی۔ مہا کوشل اور اور پر سن جیسی ہستیاں یہاں حکومت کرتی تھیں۔۔۔۔۔ عہد عقیق میں،،
جب ایودھاے اس سارے دلیں کی راج و حاضری تھی۔۔۔۔۔ اس کے سور ما شہزادے دور
دور کن اور لنکا تک مہمیں سر کرنے کے لیے جاتے تھے۔۔۔۔۔ ایودھیا کے شاہی خاندان
کی ایک شاخ نے شروعاتی میں اپنا راج قائم کرنے کے بعد شاکریہ اور کاشی کے علا
قو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔۔۔۔۔ پھر ایک وقت ایسا آیا جب اتر کوشل کی
طاقت کی تکرجنوبی مدد سے ہوتی

مدد والے ہمیشہ سے کوئی نہ کوئی گز بڑ پھیلاتے آئے تھے۔۔۔۔۔ یہاں کا ایک
راجہ جرا سنده جنگ عظیم میں سری کرشن اور ان کے ساتھیوں کے خلاف لڑا تھا

...اور بھیم کے ہاتھوں سے مارا گیا تھا... پرستان کا ایسا شہر گری ورج اس کا پایہ تخت تھا اور وہ راجہ ایسا زور آور تھا... مہا بھارت میں لکھا تھا کہ بھوج نہس کے اٹھارہ حکمران اس کے رعب سے اتر پچھم بھاگ گئے تھے... کری ورج کے قلعے میں سینکڑوں بادشاہ اس نے قید کر رکھے تھے جس طرح پہاڑوں کے غار میں شیر ہاتھیوں کو قید کرتے ہیں اور انہیں سرمی کرشن دیو کے پتھر نے آ کر آزاد کیا تھا... اسی جراسندھ کے باپ راجہ برہمن در تھے نے تخت و تاج اس کے حوالے کر کے غور و فکر کی زندگی گزارنے کے لیے اپنی دونوں رانیوں کے ہمراہ بن کی راہ لی تھی اور بنوں میں جا کر فلسفی سا کیا نہ کا چیلا بن گیا تھا یہی وجہ ہے کہ کتابوں میں لکھا ہے کہ رشیوں کے گھر میں راکھشس جنم لیں گے

مگر جگ عظیم سے بہت پہلے اسی علاقے کی شمالی ریاست متحلا پوری کی راج دلاری ایودھیا کے شہزادے سے بیاہ کر آئی تھی، کوشل دلیس کی اس بہو کا نام سیتا تھا ویدوں کے عہد سے لے کر اب تک مگدھ پوری طرح سے برہمنوں کے اثر میں بھی نہ آیا تھا... یہاں کی آبادی ہمیشہ مخلوط رہی... ان کی اوپنی ذاتوں کو بھی باہر والوں نے کبھی خالص نہ سمجھا تھا... اور مگدھ کے برہمن اور کشتی بھی کوشل دلیس والوں کی نظروں میں حضیر تھے پچھلی دونوں صدیوں میں شیش ہاگ خاندان کی مگدھ پر حکومت رہی... اس خاندان کے بادشاہ بھیم بسار کے عہد میں شہزادہ مہاویر اور شہزادہ سدھار تھے اپنے فلسفوں کا پرچر کیا تھا

زندگی کی ندی پر پل بنانے والا چوبیسوں مہا ویر جو ویشاںی کے کندگرام میں پیدا ہوا... انہا کی تلقین کرتا سارے دلیس میں گھوما... اور پھر دور نگاہ کے جنگلوں کی

طرف نکل گیا... کپڑوستی کے لمبھنی گرام میں پیدا ہونے والا سدھار تھوڑا جو کہ گری ورج کی بزر پہاڑیوں پر چلا۔ نر نجمن ندی میں نہایا... پہلی پل کے درخت کے سامنے میں جسے گیان حاصل ہوا۔ شراوستی اور کاشی کے باغوں میں۔ جہاں ہر کیا بھرتے تھے۔ اس نے وعظ کہے اور جو کوئی نگر میں مرا۔

بھیم بسیار کے زمانے میں یہ دونوں آئے تھے۔ اس کی راجدھانی کا نام گری ورج تھا۔ اس کے چاروں اور سر بزر پہاڑیاں تھیں۔ اور خوبصورت دریا اور اس کی سر زمین شاداب تھی اور سونا بہا کرانے والی سون ندی اس میں بہتی تھی کوشلا دیوی۔ شراوستی کی شہزادی۔ مہاراجہ پرستیں جیت کی بہن۔۔۔ بھیم بسیار کی ملکہ نے گری ورج کے اتار میں راج گیر آباد کیا لیکن اس کے بیٹے اجات سترو نے اپنے اپ کوفاٹے دے دے کر مارڈا۔ اور کوئی نگھاسن پر جا بیٹھا۔۔۔ رانی نے اپنے شوہر کے غم میں رورو کر جان دے دی۔۔۔ تب شراوستی کے پران جیت نے گرج گرج کر کہا۔ میری لاڑلی بہن مر نے کے لیے مگدھ نہیں بھیجی گئی تھی۔۔۔ اتر کی جمہوریتیں کاشی کوشل کی ساتھی بنیں۔۔۔ اور کوئی نگر اور ویشالی اور شراوستی مگدھ کے مقابلے میں صفائی ہوئے

تب مگدھ کے وزراء نے ویشالی والوں کے حملوں کو روکنے کی خاطر پاٹلی گرام کی چھوٹی سی بستی کے چاروں اور ایک فصیل بنائی مگر اجات سترو جیتا اور اپنے ماموں راجہ پران جیت کی بیٹی بیاہ کر لے گیا۔ اس کے پوتے اودے نے کسم پور آباد کیا پاٹلی گرام۔۔۔ پشپ پور، پاٹلی پتھر۔۔۔ پھولوں کا شہر۔۔۔ پریوں کا شہر۔۔۔ ملک کا سب سے عظیم الشان دار لسلطنت۔۔۔ جہاں

سونندی کے کنارے کنارے دلیش ناریوں کے نظری بھرے تیرا کرتے تھے۔
جہاں پاٹی کی گلیاں بالوں میں سنوارے شہری آنکھوں والی سورناکشی لڑکیاں مر
مریں چبوروں پر رقص کرتیں

اور گوم سدھارتھ نے پیش گولی کی تھی کہا یک وقت آنے والا ہے... جب یہ
شہر آگ اور سیاہ اور جنگ کی نذر ہوگا... اور نئے اس شہر کا باہمی ایران کے شہر
داریوں اول کا ہم عصر تھا جس نے یونان پر قبضہ کیا

گوم نیلمبر کو ایران سے بہت دلچسپی تھی انگلیش اور جودو مرے طالب علم تکشلا
سے واپس آتے، گوم ان سے کرید کرید کر اس انوکھے ملک کے متعلق پوچھتا
... پارنسپیکاواں کے شہنشاہ جو کہ بہت زبردست اور مطلق العنوان تھے... ان کی
راج نعمتی کے اصول جانے کیا ہوں گے ان کے مذہب

میں اُنکی کی پرستش مقدم تھی وہ ویدوں کے سارے خداویں کو پوچھتے تھے... ویو
کے علاوہ جسے وہ واہیو کہتے تھے... وہ سورج دیوتا متر اکومانتے تھے... ان کی زبان
سنگرکت کی بہن تھی... سب سے بڑی بات یہ کہ وہ خود بھی آریا تھے۔

مگر دوسرے ملکوں پر وہ حملہ کیوں کرتے ہیں؟ - گوم نے اوسی کے ساتھ کہا
.. انسانوں کیا یک جماعت کو دوسری جماعت پر قابض نہ ہونا چاہیے.. کسی ایک قوم
کا دوسری قوم کو تغیر کرنا.. کسی ایک تہذیب کا دوسری تہذیب کی بیچ کرنی کرنا غلط ہے
.. اخلاقی گناہ ہے... سایت کے نظر یہ کی بات مت کرو کہ ایک مجھلی دوسری مجھلی
کو کھاتی ہے

ایرانیوں نے جب گندھارا دلیس پر حملہ کیا تو وہاں کے راجہ نے بھیم بسیار کے

پاس اپنا سفیر بھیجا تھا بخاششی شہنشاہیت نے سپت سندھو کے اتر پچھی علاقوں کو اپنا باج گزارنائے رکھا۔ سب سے زیادہ چاندی یہیں سیاپارنی خزانے میں داخل کی جاتی تھی

ایرانی سلطنت بہت زبردست تھی... اتنی زبردست کے ایک لمحے کے لیے بھی اسے احاطہ تصور میں نہ لایا جا سکتا تھا... اس سامراج میں مصر اور بابل اور شام اور ایشیائے کوچک اور یونان کے شہر اور جزیرے اور سپت سندھو کے اتر اپنے حصے بھی شامل تھے اور سریوش کے بعد دارانے کہا تھا... میں دارایوش ہوں... شہنشاہ شاہ ہوں کا شاہ۔ ملکوں کا بادشاہ جن میں بھانست بھانست کے انسان بنتے ہیں... اس وسیع و عریض زمین کا حاکم... گشتوں اک بیٹا... ایرانی... ایرانی کا بیٹا... آریہ... آریہ گھر انے کافر زندہ... اور اس کے جہازوں کے چڑیے مقدس سندھو کی لہروں پر تیرتے تھے...

اور دارایوش اول کے بیٹے ارتشیر نے اتر اپنے کی ان مقبوضات کے متعلق خبر یہ اعلان کیا تھا... یہ علاقے جہاں دیوپوجے جاتے تھے... اہورمزدہ کی خواہش کے مطابق میں نے ان م迪وں کے مندوں کی بنیادیں ہلادیں... سوس کی کیا خبریں ہیں... تم تو وہاں آئے ہو۔ واقع نویں نے اکلیش کو مخاطب کیا تھا

پچھلے دنوں کچھ تاجر پری سی پولیس سے جان بچا کر تکشل آئے تھے وہ کہتے تھے کہ ایران میں بہت زبردست اڑائی چھڑی ہے کہیں اور جنگ چھڑگئی ہے...؟... ملیشور نے دوسرے کونے سے سراٹھا کر

سوال کیا

یاونوں نے جب سے ایران کی غلامی سے چھٹا کارہ پایا ہے... ایرانی سلطنت کمزور ہوتی جا رہی ہے... تمہیں ایک بات بتاؤں... اکلیش نے گوم کو مخاطب کر کے کہا۔ وشنو گپتا مجھ سے کہتا تھا کہ ہمارے دلیش کو بھی ایک چترانت ریاست کی ضرورت ہے... جس کی دنیا کے چاروں کھونٹ تک وعث ہو۔ مضبوط سامراجیہ مجھے مضبوط سامراجیہ نہیں چاہئے۔ گوم نے کہا۔

ایرانیوں کی سلطنت ان کے شاہی خاندان کی پھوٹ نے ختم کی۔ اکلیش طیمنان سے کہتا رہا۔ پچھلے دنوں اروشیر سوم قتل ہوا۔ پھر اس کے بیٹے کو زہر دے دیا گیا۔ ان کے پہاں اتنی خون کی ندیاں بھی ہیں کہ اس کے بعد تخت پر بٹھانے کے لیے انہیں کوئی بھائی بھیجا رہ نہ ملا۔ اور وہ ایک دور کے عزیز دار کو پکڑ لائے۔ پر سی پولیس کے اتجہ کہتے تھے کہ دارالیوش سوم بہت بہادر بادشاہ ہے۔ لیکن اس غریب کو یاونوں کے سینا پتی سکندر نے شکست دی جو کہ دور پچھم سے بڑی بھاری فوج لے کر آیا تھا

گوم سنتا رہا۔ بھاری فوجیں۔۔۔ خون کی ندیاں۔۔۔ شکست۔۔۔ فتح۔۔۔ اکلیش کتنے مزے سے یہ خونناک واقعات بیان کر رہا تھا

اور اب سارا یاران سکندر کے ہاتھ میں ہے۔ اکلیش نے بات ختم کی یعنی پارسیکاوں کی چترانت ریاست کا مالک۔۔۔ اب جس کا تم نے نام لیا ہے۔۔۔ سکندر ہے۔۔۔

گوم نے ہلکے سے تبسم کے ساتھ پوچھا۔۔۔ ہاں۔۔۔ وہی ہے۔۔۔ اکلیش نے

یک لخت ذرا ہچکپا کر جواب دیا۔ وہ گوتم کے تبسم کے معنی سمجھ گیا تھا.....

بھائی اکلیش تم کھشتیری ہو۔ حکومتیں قائم کرنا اور حکومتیں اکھاڑ کر پھینک دینا تمہارا کام ہے۔ میں تمہیں کیا سمجھا سستا ہوں۔ گوتم نے کچھ دیر کے بعد آہستہ سے کہا۔

گوتم اکلیش نے چراغ میں تیل ڈال کر اسے پھر وسط میں رکھ دیا۔ اور گوتم کو غور سے دیکھنے لگا تم کو اگر کسی جنگ میں شامل ہونا پڑے تو کیا تم اڑنے سے انکار کرو گے؟

گوتم اکلیش کے اس سوال سے لڑکھڑا گیا۔ یہ سوال وہ مدتیں سے اپنے آپ سے کر رہا تھا۔ کیا دنیا میں ایسے لوگوں کی جگہ ہے جو کہ بغیر لڑنے زندہ رہنا چاہتے ہوں۔ اسے جو شون جنگ سکھائے گئے ہیں کیا وہ استعمال کرنے گا۔

تم سمجھتے ہو کہ پر جا چپ رہے گی۔ کئی کے دوسرا کے کونے میں بیٹھا ہوا جو گیش ولیشور سے کہہ رہا تھا۔

ہرگز نہیں۔ دوسرے نے جوش سے جواب دیا۔ کوئی دن جاتا ہے۔ کوئی دن دیکھ لیتا۔

گوتم ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوا جو کہ مدد کے سیاسی حالات پر زور شور سے تبرہ کرنے میں مصروف تھے۔

اجات سترو کے پوتے کے بعد مہا پدم نند پاٹلی پتر کے تحت پر قابض ہوا۔ اس کی ماں شودرتھی اور اس کا باپ نائلی۔ یہ مہا پدم پتی نند تھا۔ بے حد و حساب دولت کا مالک۔ اور اگر سیمن تھا۔ زبردست فوجوں کا سپہ سالار۔ اس کے

بعد اس کے آٹھ بیٹھے بارہ سال کے عرصے میں یکے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے اور اسی لیے یہ خاندان نو مند کہا یا... اس کا آٹھواں بیٹا دھن مند تھا... جس کے خزانے ہیرے جواہرات اور سونے چاندی سے پٹے پڑے تھے.... اور جس کے شکر میں بیکھرے ہزار سوار، دولا کھپیادے... دو ہزار جنگلی رتھ اور تین ہزار ہاتھی تھے... اور جو محصول بڑھائے جا رہا تھا... اور جس کی پر جابے چین تھی

سارے دلش میں برہمنوں اور کشتريوں کا راج تھا... سندھ کی وادی میں برہمنوں کی حکومت تھی... لیکن مگدھ میں مہا پرم پتی نند کے عہد سے کھشتريوں کی حکومت کا خاتمہ شودروں کے دور کے آغاز سے ہوا تھا

شر اوستی والے مگدھ کے باسیوں کو پہلے ہی کب خاطر میں لاتے تھے... برہمنوں کا احساس برتری... آریاوں کے اس دور کی یادگار تھا... جب انہیں ڈینیوب کے ساحلوں پر قبائلی فوقيت حاصل تھی... اس زمانے میں روما کا ہم عصر سماج اور فرانس کا کیتیلک معاشرہ کا ہنوں... جنگجو سپاہیوں اور عام کاریگروں کے فرقے میں بنا ہوا تھا... اور اس احساس برتری کا برہمنوں کے پاس اب بہر حال کو لی عالج نہ تھا...

اور گو طالب علم کا فرض تھا... کہ وہ نسل اور ذات کے غرور سے بچے... لیکن گوتم اور اس کے جمہوریت پسند ساتھی شودروں کو بہر حال برداشت نہ کر سکتے تھے... پائیلی پتہ کا دھن مند جوالا کمکھی کے دہانے پر بیٹھا تھا

ہوا... گوتم جو اس سے اپنی کٹی میں کھڑکی کے پاس بیٹھا ایک تصویر بنا رہا تھا... اسے دروزاے میں کھڑا دیکھ کر بھول کچا رہ گیا...

میں اندر آ جاؤں... دلیز پر پہنچ کر شنکر نے مسکراتے ہوئے پوچھا
اواؤ..... کیسے آنا ہوا..... گوتم نے گلہری کی دم کا موقلم اور نگوں کی کلیاں اور سفید چین پٹھے ایک طرف کو سمیتے ہوئے کہا

ہری شنکر آتے کے ساتھ ہی چین پٹے کو گور سے دیکھنے میں مصروف ہو گیا
گوتم نے جلدی سے فرش پر دوبارہ جھاڑ و پھیر کر چٹائی۔ بچھائی۔ بھونج پتھر...
ریشم اور تابنے کی تختیوں پر لکھی ہوئی کتابوں کو جوانبار چاروں طرف بکھرا پڑا تھا
اسے سمیٹ کر ایک کونے میں رکھا۔ دوسرے کونے میں گفتگی کے چند برتن اوندو ہے
سیدھے پڑے تھے۔ کھڑکی کے نزدیک اس کا مکمل بچھا تھا۔ جس پر وہ رات کو سوتا
تھا۔ اس کا سکول چھپر کے ایک بانس میں ٹکا تھا کہیا میں اس وقت خاصی بے تر
تینی تھی۔ گوتم کو بڑی مدامت محسوس ہوئی۔ وہ ہری شنکر کی سحر انگیز اور پر سکون
شخصیت سے متاثر ہو چکا تھا۔ جانے یہ مجھے کیما بے ڈھنگا لڑکا سمجھے گا۔ اس نے
پریشان ہو کر سوچا۔ پھر سرعت سے مہمان نوازی میں جت گیا

اس نے مخندے پانی کی گذوی ہری شنکر کے سامنے رکھی۔ پھر برآمدے
میں جا کر چوالہار و شن کے اور چاول ابلنے کے لیے چڑھا دیے۔

ہری شنکر متبسم انداز میں اپنے میزبان کی یہ ساری تیاریاں دیکھ رہا تھا گوشت
کے بغیر مہمان نوازی مکمل نہ ہو سکتی تھی۔ اسی بڑا بڑا ہمٹ میں وہ چادر کو کندھے پر ڈال
ل کر باہر جانے کے لیے اٹھا

کہاں جاتے ہو... شکر نے چونک کر دیا فت کیا
بستی سے ماس مانگ لاوں... بھی آیا

ماس..... ہری شکر کے خوبصورت چہرے پر کرب کیا ہر دوڑ گئی
ارے... گوتم دفتا خاموش ہو گیا۔ اسے اور زیادہ خفت محسوس ہوئی۔ اسے اپنی
بے وقوفی پر سخت غصہ آیا۔ وہ جانتا ہے کہ ہری شکر بھکشو ہے۔ اور اپنے کے اس نئے
اصول کا قائل۔۔۔ پھر اسے شکر کو ماس کھلانے کا خیال کیسے آیا کیونکہ وہ خود مذوق
سے ماس کھانے کے لیے بے چین ہے۔ لیکن بر مچاریہ کے قوانین کو توڑنہیں سنتا
اوڑیہ انوکھا بے تکا بھکشو سے بے حد عزیز ہے اور اپنی عزیز بستی کو اپنی پسندیدہ
شہی پیش کر کے دل کو سکون اور خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اس طور پر اپنی حماقت کا
تجزیہ کر کے اسے ذرا طیمنان حاصل ہوا۔ دفتا اسے خیال آیا کہ ایک اور پسندیدہ
شہی ہے جو کہ وہ موجود کے پاس چھوڑ آیا ہے۔۔۔ غالبا وہ دونوں چھوڑ آئے ہیں۔۔۔ اور
اس، ہری شکر جانتا ہے۔۔۔ اور حسد کا جز بہ اس کے دل میں الہا۔۔۔ اور اس کے
چہرے پر سے ایک بادل سا گزر گیا۔۔۔

پھر وہ ہری شکر سے ادھرا دھر کی باتیں کرنے لگا۔۔۔ وہ اتنے دنوں تک کہاں رہا
؟۔۔۔ کہاں کہاں گیا؟۔۔۔ کیا کیا سوچا۔۔۔ کیونکہ سوچنا ہی ان لوگوں کا خاص مشغله تھا
اس کے بعد اس نے شکر کے سامنے سے اس کے جھوٹے برتن اٹھائے
تم میری اتنی عزت کیوں کرتے ہو۔۔۔ شکر نے پوچھا۔۔۔

پتا نہیں۔۔۔ کیونکہ اگر دیکھا جائے تو میں خود کافی عزت کے قابل ہوں۔۔۔ اس نے
ہنس کر جواب دیا

برہمن ایک بات بتلو

ہوں

خواہشیں تم کو بہت ستائی ہیں

یعنی

مثلاً... یہی ماں کی خواہش

پتا نہیں...۔۔۔

تم نے کبھی قربانی کے فلسفے پر غور کیا ہے؟

آج کل میں اسی پر غور کر رہا ہوں... مگر کس طرح کی قربانی... جان کی
یاروں کی...؟ جو بھی شتمہارے تصرف میں آئے گی... وہ گویا اپنے وجود کی

قربانی تمہیں دے گی

میں سمجھنا نہیں

تم خوب سمجھتے ہو

میں کیا کر سستا ہوں اگر... گوتم نے گھبرا کر بات کوٹانا چاہا... اگر میرے پس منظر
میں خون ہے... میرے چاروں طرف خون ہے... میں اتنے سارے خون کا غارہ
کس طرح ادا کروں گا؟

ہری شکر خاموش رہا... پھر وہ دونوں کھڑکی میں جا کر کھڑے ہو گئے

باہر سبزہ زاروں میں کسانوں کے بیلوں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں... اور
چڑواہوں کی بانسریوں کی آوازیں آرہی تھیں... شکاریوں کے بالوں میں بجے ہو
ئے پر ہوا میں لہراتے تھے... ندی کے اس پارکھشتہ ایمیرزادے اپنے باغوں میں

لبی ڈوق

تیراندازی سکھنے میں مصروف تھے

زندگی جاری تھی

مجھے زندگی کے متعلق کچھ بتاؤ

تمہاری زندگی تمہاری اپنی ہے... میری زندگی سے علیحدہ ہے... میں تم کو کچھ نہیں بتا ستا

گوتم نے دھیرے سے کونے میں جا کر تاثر کا ایک صاف پتہ اٹھایا... مجھ سے امن کے متعلق باتیں کرو... میں لکھوں گا... وہ... اس نے قلم نکالا اور فرش پر آلتی پا لتی مرکر پیدھی گیا... میں اپنی کتاب کا دروازہ باب لکھوں گا
لیکن تمہاری کتاب کا آخری باب کون لکھے گا...

سارے میں تاریخ کا اتحاد سمندر ہے... جس میں ہم اور تم پتوں کی طرح ڈول رہے ہیں... مجھ سے پہلے اب تک جو کچھ ہوا اس کی زمرہ داری مجھ پر ہے یا نہیں...؟ بتاؤ میں کیا لکھوں... گوتم نے پوچھا

وقت کا تعین کرنے کی ضرورت نہیں... سب خواب کی طرح گزر رہا ہے
... گزر جائے گا... ہری شنکر نے جواب دیا
گزر جائے گا یا گزر تار ہے گا...؟ گوتم نے پوچھا
یہ تمہارا اپنا مسئلہ ہے....

مجھے اہمسا کے متعلق بتاؤ

برہمن ہو کر اہمسا کے قائل ہونا چاہتے ہو... ہری شنکر نے نہس کر پوچھا
گوتم بھی ہنسا... ہاں بڑی عجیب بات ہے ہے نا؟ اس نے نظریں اٹھا کر

شکر کو دیکھا

جانوروں کو مارنا ہزاروں برسوں سے برہمنوں کا خاص مشغله رہا ہے۔ جب یہ آریہ مشرقی یورپ اور وسط ایشیا کی چڑاگاہوں میں گھوٹتے تھے۔ تب زندہ رہنے کے لیے اور گرم رہنے کے لیے درندوں کا شکاران کے لیے ضروری تھا۔ اسی وجہ سے گنگا اور جمنا کے انتروپیدی علاقے میں آن کرنے کے بعد بھی ان کی معرفت اور ان کے فلسفے کے ارتقاء میں جانوروں کے خون بہانے کا بڑا ادخل رہا ہے۔ ان کی کوئی عبادت قربانی کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی۔ سام و یدوں کے اصولوں کے مطابق قرا ابن گاہ ایک زبردست رمزیت کی حامل تھی۔ خود تخلیق کائنات مابعد اطیعات کے نقطہ نظر سے ایک عظیم آفاقتی قربانی تھی۔ اور کائنات کی کایت اور اس کے بقاء کی علامت اتصور کی جاتی تھی؛... چکروتی راجہ کے لیے گھوڑے کی قربانی لازمی تھی۔

کھیتوں کے اس پارالا اور وشن کیے جا رہے تھے۔ بہت دور گاؤں کے سرے پر چوپال میں محفل جمی تھی۔ بھاث جنگ عظیم کی داستان سنارہا تھا۔ شام کے مکمل نائل میں ہوا کے جھونکے کے ساتھ اس کی پاٹ دار آواز کی لہر تیرتی ہوئی گوتم کی کٹی سے آنکرائی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

لیکن گوتم کا دل دھڑکتا رہا

یہ نائل مجھے طرح طرح کی داستانیں سناتے ہیں۔ الفاظ کے خاتمے میں بھی میری نجات نہیں۔ گوتم نے اپنے آپ سے کہا اور ہری شکر کو دیکھتا رہا۔

قربانی کا اتصور۔ اڑائی کا فلسفہ۔ جنگ اور مُن کا مسئلہ۔ یہاں برہمن تلوار

لیے گھوٹتے تھے... اور کھشتری فلسفی بن جاتے تھے... ورن اور جاتی کی تفریق
ابھی شدید نہیں تھی... نینی شاستر... ویدوں اور اتھاں پر انوں کی تعلیم برہمن اور
کھشتری دونوں کے لیے لازمی تھی... ویدوں کے عہد میں پتھی کرت آئی
درستے تیار کرنے والی مقدس آتش... کی عبادت گھنے جنگلوں میں پلڈندیاں
بناتی مشرق تک پہنچ چکی تھی... پورب میں گوتم بیہدر کے سفید فام ہم قوموں نے
ناگوں کو اپنی تہزیب کے دامن میں سمیتا... پچھتم میں سندھو کے کنارے بے ہو
کے شہروں پر اندر کا قہر ٹوٹا... ہری یو پیا کانگرمیدان کارزار میں تبدیل ہو گیا
... جہاں نادر کے زرہ بکتر میں مابوس... سپاہی لڑائے اور فتح یا ب ہوئے... سندھو کا
شہر... جہاں کہنیوں تک کپڑے پہننے ہوئے... ما تھے پر تلک لگائے ہوئے... گلے
میں سیاہ پوچھ پہننے... کندن کے رنگوں والی سہا گنیں... شیو... درگاہ... دیوب... کاشمی
اور پیپل کی دیوی کی آرتی اتنا تینی یہ لوح جنہوں نے اپنے تدن کو راجھستان
... سوراشر اور پچھمی اتر پر دلیش تک پھیلا لایا تھا... ایک روز شمال مغرب کے اوپنے
پہاڑوں کے اس پار... کسی انجانے دلیش سے گویا اندر مہاراج کا سب رفتار جنگی
رتھ آیا... اور ان سب کو رومندا ہوا آگے نکل گیا

برہمن و رت پہنچ کر یہ شہری رتھ رک گئے... اور ان لوگوں نے اندر پر سعہ آباد
کیا... اور حمدیں لکھیں اور موسیقی تیار کی

اب تہزیب کے مرکز اندر پر سعہ اور یادو خاندان کی راجدھانی سے ہٹ کر
مشرق تک آچکے تھے... یہ ایو دھیا اور شرواستی اور اجینی کے عروج کا زمانہ تھا
... مگدھ اور اتر کوشل کے انہائی مہربا شندے اب شمال مغرب اور سرسوتی کے

اس پار رہنے والوں کو نیم وحشی اور جاہل گردانے تھے
گوتم نیلمر کی تاریخ عظیم ناموں سے پڑھی۔ ان میں سے بہت سے نام اب
روایت اور اسرار کے دھند لکھے میں جا چھپے تھے۔ جس طرح ہماوت کی اوپنی
پیاریوں پر دھند جمع ہو جاتی ہے۔۔۔

گوتم کو ماضی سے ڈر لتا تھا۔۔۔ کیا ضرورت تھی۔۔۔ کیا وجہ تھی کہ ان سب کا یہ
تسلیل قائم تھا۔۔۔ جاری و ساری۔۔۔ اور کب تک ایسا ہے گا۔۔۔ ڈگ وجہ شری رام
چندر کے عہد سے دو اپا ر شروع ہوا تھا۔۔۔ جس کا اختتام جنگ عظیم پر ہوا۔۔۔ مہا بھارت
کے بعد۔۔۔ بیری کرشن کے عالم موجودات سے روپوش ہونے کے ساتھ ہی کالی
گیک شروع ہو گیا۔۔۔ جو کہ اب تک باقی تھا
اس کالی گیک میں کیا ہو گا؟

پرانوں کی داستانیں اس نے پڑھ رکھی تھیں۔۔۔ جن میں کائنات کی مادیے سے
تخلیق کا بیان تھا۔۔۔ اور خداوں اور فلسفیوں کے قصے اور شاہی خاندان کے نسب
نامے۔۔۔ پراکرت کی تاریخوں پر ان قصوں کی بنیاد تھی۔۔۔ جو کہ صدیوں سے
درباروں اور چوپالوں میں داستان گونتے آرہے تھے۔۔۔ ان پرانوں میں چا
لیس چالیس ہزار اشعار ہوتے تھے۔۔۔ جو وشنو اور شیو کی حمد کے ساتھ شروع کئے
جاتے تھے۔۔۔ پرانوں کے مطابق ارجمن کے پوتے کے وقت سے لے کر جس کے
دربار میں پہلی بار جنگ نامہ مہا بھارت سنایا گیا تھا۔۔۔ مہا پدم نند کے عہد تک ایک
ہزار سال کا وقفہ گزر گیا تھا۔۔۔ ارجمن سے لے کر اودے تک چوبیس پیشتن گزر چکی
تھیں۔۔۔ اودے کے دور حکومت میں شاکیہ منی پیدا ہوئے

گوتم نیلمبر نے نظریں اٹھا کر شنکر کو دیکھا جو کہ بڑی دلچسپی کے ساتھ پیتل کی ایک حنختی پڑھنے میں مصروف تھا۔ کھڑکی کے باہر گیندے کے پھول غروب آفتاب کی روشنی میں قرمزی نظر آ رہے تھے... گوتم کی جھنجھلاہٹ بڑھتی گئی اس کا فیصلہ کرنے والا کون ہو گا؟ کہ کون کس سے برتر ہے... کس نے کس پر فتح پائی... کون کو رو ہے کون پانڈو؟

جنگ عظیم آج سے سینکڑوں برس قبل کور و کیشور میں اڑی گئی تھی... اور سنتاپور کے ان بہادروں کے قصے... جنہوں نے درود پدی سے بیاہ رچانے کے بعد اندر پرستہ کا ایسا خوبصورت شہر آباد کیا تھا... گانے والے وینا اور مردگ بجا بجا کر گاؤں گاؤں سناتے پھرتے تھے سورماوں کا تزکرہ رک وید اور قدیم ترین برہمن ادب میں موجود تھا جس میں ہر چیز اصل سے ٹری دکھائی دیتی تھی... بادلوں کی گرج... ہاتھیوں کی چنگھاڑ... عظیم معمر کے... دل اور سورما... نواری رشی... آسمانی سُگنیت... پری وش اڑکیاں... یکلٹلا... وینستی... کاشی کے راجہ کی بیٹی امبا... یہ سب ظلماتی ہستیاں ڈیڑھ دو ہزار برس قبل زندہ رہی ہو گئی... انہی جگہوں پر چلتی پھرتی ہو گئی... یہ سب سوچ کر گوتم کو بڑا عجیب سالگتا... کہ ایک وقت تھا کہ نر بد اور تاپتی کے درمیان راجہ ٹل کی حکمرانی تھی... وینستی برار کی راج مای تھی... سیتا مہارانی کے بابا کا ملک اسی انگاکے اتر میں گندک ندی کے کنارے آباد تھا... پل کی پل میں وہ سارا زمانہ داستان میں تبدیل ہو گیا... اور یہ وقت جس میں وہ زندہ تھا وہ خود گوتم نیلمبر برہمن... ہری شنکر بھکشو... جو کہ کھڑکی کے پاس بیٹھا مطالعے میں مصروف تھا... اور ایو دھیا کی جمپک اور باہر آشرم کے کنج میں شبکتے ہوئے طالب علم... یہ سب کے سب ایک آن میں ما

ضی کے دھن لے .. ناقابل یقین .. غیر حقیقی کرداروں کی حیثیت اختیار کر لیں گے .. جن کی کائنات کے .. وقت کے بہتے ہوئے سمندر میں کوئی حیثیت نہیں ہوگی .. بھیم .. دریودھن .. کرشن .. ارجن ..

اگر کسی وقت مجھے جنگ میں شامل ہونا پر گیا تو کیا میں لڑوں گا؟ .. اس نے چوروں کی طرح ہری شنکر کو دیکھا .. کلیش کہہ رہا تھا کہ جنگ کوئی دن جاتا ہے کہ چھڑ جائے گی .. تم لڑو گے؟ .. اس نے یکخت باؤاز بلند سوال کیا ..

ہم محض اپنے خیالات کا نتیجہ ہیں .. ہری شنکر نے جواب دیا لیکن کیا تم لڑو گے؟ گوتم نے ضد سے دہرا�ا

ہر انسان سے اس کے انفعال .. ضرورت یا حادثے یا اس کی فطرت کی وجہ سے سر زد ہو جاتے ہیں .. وہ خود مختار نہیں ہے ذمہ داری کی کوئی اہمیت نہیں .. ہری شنکر تنخیاں ایک طرف رکھ کر کھڑکی کے نزدیک چلا گیا دفعتا دریا پر بہت سی روشنیاں جھلملکا ٹھیں ..

کسی کی بارات جا رہی ہے .. گوتم نے اظہار خیال کیا ..

ہوں ..

یا ممکن ہے شاہی بجرے نے ادھر کارخ کیا ہو ..

چلو باہر چلیں .. اندھیرے میں میرا دم گھبرا تا ہے .. ہری شنکر نے بیک وقت وحشت زدہ ہو کر کہا

وہ دونوں آشرم کے باغ سے نکل کر گاؤں کے راستے پر آگئے .. بارشوں کا زمانہ .. ختم ہو چکا تھا .. فضا میں ہلکی سی خنکی آگئی تھی چوپال کی طرف سے بھاٹ کے

گانے کی آوازاب زیادہ صاف سنائی دینے لگی تھی
گوتم خاموشی سے شکر کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ پھر ٹھنک کر اس نے اداسی سے
کہا۔ تم خود پرست ہو ہری شکر۔ تم کو دوسروں کی پرواہ نہیں۔ اپنے ذہن کے بل پر
اپنے آپ کو ارتھ کے درجے پر پہنچا دینا کوئی بڑی بات ہے۔ تم کو اس سے کیا
غرض کہ دوسروں پر کیا بیت سکتی ہے
مجھ کو خوب معلوم ہے کہ دوسروں پر کیا بیت سکتی ہے۔ ہری شکر نے مختصر جواب
دیا۔ آواز ہر چل کر دیکھیں کہ کیا ہو رہا ہے؟

گوتم چپ ہو گیا۔ وہ دونوں چوپال کی طرف بڑھنے لگے
تم بھیشم کا قصہ سنو گے۔ مجھے کے قریب پہنچ کر گوتم نے غیر یقینی سے انداز
میں اپنے اس تھی سے پوچھا
کیا حرج ہے اسے جواب ملا

ان دونوں کے برہمچاری لباس دیکھ کر سامعین نے فوراً تھیماں کے لیے جگہ
خالی کر دی۔ بھاٹ لہک لہک کر قصہ سنایا گیا۔ گوتم نے اسے پہچان لیا۔ اس نے
وہیں سے کھڑے کھڑے مسکرا کر اسے پر نام کیا اور خود بھی قصی سننے میں مصروف
ہو گیا۔ یہ لوگ صدیوں سے اسی طرح گاتے بجا تے اور ان داستانوں پر سردھنے
چلے آرہے تھے۔ رُگ وید کے زمانے میں اندر اور دوسرے خداوں کی تقدیمیں
کے لئے الائپے جاتے تھے بادشاہوں کے اشو میدھ [گھوڑے کی قربانی] منعقد کرو
انے والے فرماؤں کے قصے پڑھے جاتے تھے۔ اس نے ایسے ایسے دان
دیے۔ ایسی ایسی اڑائیاں لڑائیں۔ ایسی ایسی فتوحات حاصل کیں اور کاہن ہوترا

ذوق

سے کہتا۔ قصے کا آغاز کرو۔ قربانی کرنے والے کو دوسرے انسانوں سے اوپر اٹھا
و۔ شام پڑنے پر بطنواز اتر مندر اگ کی دھن میں رمزیہ گیت چھیرتے
عہدِ حق میں ارجمند... واسودیو اور دوسرے بہادروں کے دربار میں اسی طرح
وینا۔ مردگ اور شاکر کی شگفتہ میں یہ نغمے الائچے گئے تھے
سلسلہ ہے۔۔۔

پرانے زمانے میں درباری بھاث کھشتیری ہوتا تھا۔ بعد میں درباری شاعری
نے رزمیہ داستانوں کے لیے راستہ تیار کیا۔ اب چھوٹی چھوٹی ریاستیں ٹوٹ کر ختم
ہو رہی تھیں... اور شاعر جو کہ پہلے درباروں سے وابستہ تھے۔ اب گلی گلی اور گاؤں
گاؤں گھوم کر اپنی روزی کماتے تھے۔ رکی اور باضابطہ مزہب کی جڑیں مضبوط ہوتی
جارہی تھیں۔ خالص رزمیہ شاعری میں مزہبی عصر شامل ہو رہا تھا۔ پروہتوں نے
مہابھارت کے جنگ نامے کو اخلاقیات کے درس میں تبدیل کر دیا تھا۔ کھشتیری
بھاث کی جگہ برہمن داستان گونے حاصل کر لی تھی۔ بتاریخ رفتہ رفتہ پیچھے پیچھے ہتھی
جارہی تھی۔ بتاریخ کے کردار فلسفیانہ اور مذہبی لمباوہ اور ڈھنچے تھے
اب داستان گوکاشی کے راجہ کی بیٹی تینوں بیٹیوں کی کہانیاں سنارہا تھا۔ جن کو
بھیشم میں ان کے سونہرے کے وقت لے اڑے تھے۔ کچھ دری کے بعد ارجمند کا قصہ
شروع ہوا۔ گوتم اب ذرا آرام سے ایک ستون کا سہارا لے کر بیٹھ گیا تھا۔ ہری شنگر
ماحول سے بے نیاز دوسری سیڑھی پر بیٹھا رہا۔

یہ ارجمند بھی خوب شے تھے۔ گوتم نے سوچا۔ سب سے پہلے انہوں نے درپدھی
سے بیاہ رچایا۔ جب بارہ برس کی بن بس انہیں ملی تو دوسری کرن کی۔ بہن سبحدرا کو

بھگا کر لے گئے جال وطنی کے زمانے میں منی پور کی شہزادی چتر انگدا سے شادی کر لی۔ ان سب کے عالوہ بھائی ارجمن نے الپی کو پر چایا۔ وہ الگ۔ گوتم کو بھی آگئی وہ ذرا غور سے کہانی سننے میں مصروف ہو گیا

اس وقت تک دونوں فریق کوروکھیشت کے میدان میں آئے سامنے پہنچ چکے تھے۔ رزمیہ شاعری میں نسلوں یا قوموں کی ایک دوسرے کے ساتھ جنگ کا ذکر نہ ہوتا تھا۔ بہادر سورماں کا مقابلہ ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ اصل موضوع تھا۔ شہرت حاصل کرنا سورماں کا اصل مقصد حیات تھا۔ اور اپنی شجاعت پر نازار ہوتا۔ اس کے لیے جائز۔ اس کے حریف کے لیے لازم تھا کہ اس کے ہم پلہ ہو۔ باڈشاہوں کے بیٹے اپنے سے کم حیثیت کے ساتھ جنگ نہیں کر سکتے تھے۔ جس وقت گوتم سبھا سے اٹھ کر باہر جانے لگے۔ اس سے ارجمن لا کار کر کرنے سے اس کا شجرہ نسب دریافت کر رہا تھا

مہابھارت کے پیسارے کردار جنگجو ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفی بھی تھے۔ یہ روایتیں نہیں تھیں۔ تاریخی شخصیتیں تھیں۔ جملہ نیم الوہی کردار بھی صحیح تھے۔ جن کی دہبی کاشمی کی طرح کنوں کے پھول سے تخلیق ہوئی تھی۔ اور جن کی جٹاوں سے گنگا بہتی تھی۔ کیونکہ گوتم اپنے ملک کے شعرا کے زور تخلیل کا بڑا قابل تھا۔ اور دیو مالا بہر حال فلسفے کی ٹھوس شکل تھی۔ اور روایت کا جال بن لینا ذہن کے لیے بہر حال آسان ترین بات ہے۔ گوتم خود بھی شاعر تھا اور شاعر ہمیشہ اپنے کرداروں کو مثالی بنا کر پیش کرتے ہی آئے ہیں۔ اروٹی اگر اپر اتھی تو کیا وہ اڑکی جو کہ ایو دھیا کے گھاٹ پر پیٹھی تھی۔ کوئی بھی کوئی اسے اپر انہیں سمجھے گا تو کیا سمجھے گا کیا وہ اس روز پا

لی کے کنارے بیٹھی جل پری نہیں محسوس ہو رہی تھی؟

سرک پر آ کرتا روں بھرے آسمان کے نیچے گوتم نے ایک لمبا سانس لیا۔ بحاثت کی آواز اس کا تعاقب کرتی رہی۔ بھیم۔ راجن۔ کرن۔ بھیم

جگنگا تے ہوئے بھرے دریا کو عبور کر چکے تھے۔ اور دوسرے ندی کے گھاٹ پر بڑی چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ یہ کسی کی بارات ہے؟

اس نے ایک راہ گیر سے سوال کیا

نہیں تو۔ راجن ایودھیا سے آئے ہیں۔ راہ گیر نے جواب دیا

گوتم نے چونک کر شنکر کو آواز دی۔ بھر پست کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ لیکن شنکر حسب معمول غائب ہو چکا تھا۔ اور گاؤں والوں کی بھیڑ میں جو کہ چوپال کے باہر جمع تھی شنکر کا پتا چلا نالا حاصل تھا۔

گوتم نے چادر کندھے پر ڈالی اور شہر کی طرف چل کھڑا ہوا وسط شہر میں پہنچ کر اسے اپنی حویلی کی روشنیاں دکھلاتی پڑیں۔ وہ فوراً دوسری گلی میں مڑ گیا۔ بنہرے اور بزرگانی مکان پر ہلکی ہلکی دھنڈ چھارہ رہی تھی۔ ایک عورت لمبا گھونگھٹ کاڑھے چھاگل بجانی قریب سے گزر گئی۔ بتاڑی خانوں میں بلڑیج رہا تھا

دکانوں پر خرید و فروخت ہو رہی تھی۔ بازار کی سرک پر دونوں طرف مشعلیں روشن تھیں۔ ان کی جھلملاتی روشنی میں شہر کے امیرزادے اور بانکے زر تار کپڑے پہنے موٹچھوں پر تاو دیتے آکڑتے پھرتے تھے۔ بھانست بھانست کی بولیاں سنائی دے رہی تھیں۔ اس ہجوم میں خود کو موجود پا کر ایک لمحے کے لیے گوتم کو بڑا چنچھا سا

ہوا۔ میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔ تیز تیز قدم اٹھاتا وہ شہر سے باہر نکل گیا۔ جدھر آم کے کنج میں ایک خاموش عمارت پتوں میں چھپی کھڑی تھی۔ اس عمارت کے سامنے جھیل تھی۔ جھیل میں ایک اکیلی ناوجس کاملاج مسافروں کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔

اس عمارت میں سو سال ادھر شاکیہ منی آ کر رہے تھے۔ اس کنج میں ان کے چیلے گھوما کرتے تھے۔ صرف سو سال ادھر گوتم کا جی چاہا کوہ عمارت کے اندر جائے اور اس کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھ کر سوچتا رہے۔ مگر قریب جانے کی بجائے وہ پھر صرف آدھے راستے سے لوٹ آیا۔ اور آہستہ آہستہ آشرم کی طرف روانہ ہو گیا۔

آزادی نہیں ہے۔ آزادی نہیں ہے۔ کھلی فضاؤں میں۔ برسا گر کی لہروں میں۔ ذہن کی وسعت میں۔ آزادی کہیں نہیں ہے۔ میں بندھا ہوا ہوں۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ کچھ نہیں کر سکوں گا۔

یہاں تک کہ ایک روز تاریخ۔۔۔ ناموں کا تسلسل۔۔۔ زمان و مکان مجھے نگل جائیں گے۔

آشرم میں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ گرو کے جھونپڑے میں چراغ جل رہا تھا۔ وہ دبے پاؤں اندر داخل ہوا۔ جہاں اکلیش اور دوسراے طالب علم جمع ہو چکے تھے

۔۔۔ ۶

گرو نے وینا ایک طرف رکھ دی اور سر اٹھا کر گوتم کی طرف دیکھا۔۔۔ یہ ہے۔۔۔ یہ ہے۔۔۔ یہ نہیں ہے۔۔۔ یہ نہیں ہے۔۔۔

ہاں گوتم نے جواب دیا۔۔۔

قید کی حالت میں آئندہ ما یہ سب سے بڑی سرست ہے جو جیو حاصل کر ستا ہے
۔۔۔ گرو نے کہا

آئندہ ما یہ سب سے بڑی سرست ہے ۔۔۔ گوتم نے دھرا یا
مقید روحوں کے لیے پرکھوں کی راہ موجود ہے ۔۔۔ وہ جسے با ربار جنم لینا ہے ۔۔۔
میرے پرکھ ۔۔۔ بھاث کی آواز گوتم کے کانوں میں گونجی
اور روح دھوئیں اور رات اور ماوں کی اندر ہیری تاریخی راتوں میں سے گزرتی
ہے ۔۔۔ وقت اپنے آپ سے منحرف نہیں ہوتا ۔۔۔ وقت سے تم فتح نہیں سکتے ۔۔۔ اور اپنی
اصلی حالت کو پا کر کوئی چیز اپنے آپ سے انحراف نہیں کرتی ۔۔۔

گرو نے مزید کہا

وقت کے سامنے کوئی رشتے نہیں ہیں ۔۔۔ کوئی منطبق ۔۔۔ کوئی طاقت ۔۔۔ وقت پر تمہار
اقابو نہیں رہ ستا ۔۔۔ جو آنکھیں رکھتا ہے وہ وقت کے ارتقاء کو پہچان لیتا ہے
لیکن آنکھیں کہاں ہیں؟ ۔۔۔ گوتم نے سوال کیا ۔۔۔ پر اکرتی انہی ہی ہے ۔۔۔ اور پرش
لنگڑا رہی ہے ۔۔۔ جو کہ انہی پر اکرتی پر سوار ہے ۔۔۔

پر اکراتی انہی ہے اور بے حس ۔۔۔ گرو نے جواب دیا ۔۔۔ پرش اسے دیکھتا ہے تو
شعور کا خارجی اور مادی دنیا میں اور دخلی اور ذہنی دنیا میں اکنہما ارتقاء ہوتا ہے ۔۔۔ اور
اور اک اور خیال کی تخلیق ۔۔۔ پر اکرتی ابدی ہے ۔۔۔ ہمہ وقت مصروف عمل ۔۔۔ جب تک
پرش کی نظروں میں رہے ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہے ۔۔۔ بے حس مادہ ذہن کی
جوت سے روشن ہو جاتا ہے ۔۔۔ ذہن میں بڑی طاقت ہے

ذہن میں بڑا خطرہ ہے۔ اکلیش نے کہا۔ ویدانت میں لکھا ہے۔ گیان نیکی اور بدی سے زیادہ اہم ہے۔۔۔ کیونکہ خیر و شر مایا میں شامل ہیں۔۔۔ اور گیان مایا سے نجات دلاتا ہے

۔۔۔ میں گیان سے عاجز آچکا ہوں۔۔۔

گرو نے کہا۔۔۔ اور اک انسانیت کے بغیر کام نہیں کر ستا۔۔۔ لہذا دنیا کو خارجی اور عملی میں تقسیم کرنا ضروری ہے۔۔۔ یہ میں ہوں۔۔۔ یہ باقی دوسری چیزیں ہیں۔۔۔ بہتر ہما ایک ہے۔ جیو آتمائیں بہت سی ہیں۔۔۔ جو کچھ ہے وہ اس کا نتیجہ ہے۔۔۔ ہم اپنی حیات کی وجہ سے نہیں ہے۔۔۔ پراکرتی رقصہ ہے۔۔۔ پرش اسے دیکھ رہا ہے۔۔۔ جب وہ اس کی طرف سے آنکھیں اٹھالیتا ہے۔ تو وہ بھی اسے نہیں دیکھتی۔۔۔ کیونکہ دوسرے پرش اسے دیکھ رہے ہیں۔۔۔ بالآخر وہ ان پرشوں کو آزادی عطا کر دیتی ہے۔۔۔ پرش باہر اندھیری رات میں آ کر آزاد ہو جاتا ہے۔۔۔

لیکن دکھ کون سہتا ہے؟ پرش یا اس کی پار کراتی۔۔۔ گوتم نے سوال کیا
دکھ کا تعلق پراکرتی سے ہے۔۔۔ مقید زندگی کا حساس بذات خود تکلیف ہے۔۔۔ گرو
نے جواب دیا

ویدانت والے کہتے ہیں۔۔۔ کہ پرش ایک ہے۔۔۔ اکیم است۔۔۔ اکلیش نے پوچھا
ہاں اور کپل کا کہنا ہے کہ پرش ایک ہوتا ہے۔ تو اگر ایک انسان خوش ہوتا ہے تو
سارے انسان خوش ہوتے ہیں۔۔۔ ایک رنجیدہ ہوتا تو سارے کے سارے رنجیدہ
ہو جاتے۔۔۔ لیکن انسان اپنے اعمال اور اپنی نسل اور اپنی زندگی کے ادوار اور ورن
ہشتم کے لحاظ سے مختلف ہیں۔۔۔ گرو نے کہا

بھگوت گیتا میں سری کرشن نے کہا۔ کہ پر اکراتی کے گن اعمال پر اثر انداز ہو تے ہیں۔ لیکن خودی یہ صحیتی ہے کہ یہ میں ہوں۔ اکلیش نے کہا اور شاکرہ منی نے پوچھا ہے کہ کوئی محدود خودی ہے بھی یا نہیں۔ ممکن ہے یہ سب احساس کی مختلف کیفیتیں ہوں۔ گوتم نے دل میں سوچا پر اکراتی کے تین گن ہیں۔ نیکی۔ شدت اور تاریکی۔ گرونے کہا گوتم آہستہ سے اٹھا۔ اور جھونپڑے سے باہر نکل آیا۔ اور دوبارہ ندی کی سمت چل دیا۔ کچھ دیر قبل جس طرح بحاثت کی آواز نے اس کا تعاقب کیا تھا۔ اب گرو اور اکلیش کی کی مدھم آواز اس کا پیچھا کرتی رہیں۔ سست کاریہ وار۔ اور دیا۔ مایا۔ شکتی۔ .. پر اکرتی۔ .. پر اکرتی کے گن۔ ..

ندی کے کنارے پہنچ کر اس نے خود کو خندی گھاس پر گرا دیا اپنے شہد میں لکھا تھا کہ جس کو اپنی آتما کی تمنا ہے اس کے لیے باپ باپ نہیں، ماں ماں نہیں۔ دنیا دنیا نہیں۔ دیوتا دیوتا نہیں۔ چور چور نہیں۔ قاتل قاتل نہیں ہے۔ اس کو نیکی اور بد کی فکر نہیں ہے۔ کیونکہ وہ دل کے سارے رنجوں پر فتح پا چکتا ہے گوتم نیلمبر اب چوبیس سال کا ہو چکا تھا۔ اتنی مدت میں پہلے وہ سو فسطائی بننا پھر اس نے شوکی پوچا کی۔ ہری کا بھگوت بننا۔ پہل کے نظریوں پر اس نے بسیط شر حیں لکھیں۔ اس نے اپنے ہم نام فلسفی گوتم کا مطالعہ کیا۔ جس نے برہمنوں کے مذہب کے قوانین بنائے تھے اور وقت کے مسئلے پر سوچ بچار کیا تھا۔ ہری شنکر سے ملنے کے بعد اسے گوتم سدھارتھ سے دچپی پیدا ہو چکی تھی۔ لیکن ابھی تک وہ اس دلیں کی ازی اور ابدی سوچنے اور کھو جنے والی روح تھی۔ جو کہ کبھی اور کسی جگہ مطمئن

نہ ہوتی تھی... جو براہ راس سوال کے جواب کی تلاش میں مصروف تھی کہ ہم کس طرح
جانیں؟

وہ مدتیں سے اس کھونج میں تھا۔۔۔

ہم کس طرح جانیں یہ سب کیا ہے۔۔۔

وہ سہا ہوا گھاس پر لیٹا رہا۔۔۔ بچھلے پھر کم مدد ہم چاندنی سائیں سائیں کر رہی
تھی۔۔۔ ائے لیٹے آہستہ آہستہ اس کا ذہن صفر کے نقطے تک پہنچ گیا۔۔۔ پھر اس نے
اپنے آپ کو ان گنت حصوں میں تقسیم کر دیا۔۔۔ بہت سے گوتم جو بول رہے تھے۔۔۔
رہے تھے۔۔۔ لکھ رہے تھے۔۔۔ قبیلے لگا کر نہیں رہے تھے۔۔۔ اداں سے۔۔۔ اچنچھے میں تھے
۔۔۔ اسے اور زیادہ ڈر لگا۔۔۔ گرو کی آنکھوں میں اسے وہ خود نظر آیا۔۔۔ جو کہ چراغ کی روشنی
میں اسے گھور رہی تھیں۔۔۔ اور بالوں کی سفید جنمائیں اسکے کندھوں پر بکھری تھیں
۔۔۔ ہلکیش کام سکرا تا پھرہ۔۔۔ بازار کے لوگوں کی شکلیں۔۔۔ تو کیلی مونچھوں والے نزگر
ک۔۔۔ پر سکون چہرے والے بھکشو۔۔۔ چندھی آنکھوں والے پیماڑی۔۔۔ ان سب میں
اسے اپنا آپ نظر آیا۔۔۔ اور اسے اور زیادہ ڈر لگا۔۔۔ جکل اس قدر خوفزدہ تھا کہ اس کا
دل چاہتا تھا کہ کسی ویران مندر کے تاریک گر بھگرہ میں چھپ جائے اور اندر
سے کندھی چڑھا لے۔۔۔ گر بھگرہ کے خیال پر اسے چندھی کی بھیانک سورتی یاد آئی
۔۔۔ جس نیا سے سر جو کے کنارے ڈرایا تھا

یہ ساری دنے مل کر چاروں طرف سے اس پر حملہ آور کیوں ہو رہی تھی؟ سب
اس کے خلاف ایک لشکر تیار کر رہے تھے۔۔۔ اس لشکر میں وہ گھاٹ والی اڑکی شامل تھی
۔۔۔ ہری لشکر شامل تھا۔۔۔ گرو پر شوم اور سارے نئے اور پرانے حکماء شامل تھے۔۔۔ خدا

کا تصور شامل تاہ۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور کوشش کر کے اپنے ذہن کو مساواء سے عاری کرنا چاہا۔ اس نے سوچا کاش وہ کم از کم یوگا کا ہی ماہر ہوتا۔ کاش ایک لطیف سا خلاء اس کے ذہن میں آ کر کہیں سے بھر جاتا۔ آخر اس کا کیا قصور ہے؟ اس نے تو ہمیشہ جانے کی کوشش کی ہے۔۔۔

اسے وقت سے نہیں ڈرنا چاہئے

وقت کے راستے سے ہٹ کر وہ ایک طرف سڑک کے کنارے پینچ گیا۔ تھکے ہوئے آرام کے احساس کے ساتھ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے سوچا جیسے وہ زمان مکان سے آزاد بہار کے بادلوں کی طرح اوپر اٹھتا جا رہا ہے۔ چاروں اور خلاء ہے اور اس میں ہمیشہ کی طرح صرف وہ تنہا موجود ہے۔ دنیا کا ازالی اور ابدی انسان ابھکا ہوا۔ شکست خور دہ۔ ابشاش۔ پرمیں۔ رنجیدہ۔ انسان جو خدا میں ہے اور خدا سے الگ ہے۔ کائنات کا اولین زی ہوش جسے یہ ساری چاندی۔ سارے پھول۔ ساری ندیاں۔ سارا حسن دے دیا گیا ہے۔ اولین روشنی کا زمانہ اور برہمنا کا سارا محل سنسان پڑا ہے۔ اس میں محض نور ہے۔ نور کی دنیا سے ایک، ستی آن گری ہے جو پرش ہے اور اکیلا ہے۔۔۔

اس اولین انسان نے آنکھیں کھول کر چاروں اوڑھ نظریں دوڑائیں۔ اور اس نے دیکھا کہ چاروں اور دور دور تک بتیاں جگہ کا اٹھی ہیں۔۔۔ اور کھیتوں میں سرسوں لہراتی ہے اور اودگاتری برہمن سنت تانتو ساز کے سو سوتار چھیڑ کر سام وید کے گیت گار ہے تھے۔ اور ان دور م جھم برس رہی ہے۔ باغوں کا نوجوان خدا اندر لڑکیوں کی چڑیاں اپنی پھور سے بھگوئے ڈالتا ہے۔۔۔ شہرے بالوں والے نوجوان

آخر یہ سورا ماید ان میں رتحہ دوڑا رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں تیرماں ہیں۔ یہ جنگ اور شاعری کے دیوتاؤں کے پرستار نوجوانوں کا عہد ہے۔ شجاعت کا دور۔ طاقتور کمزور کو زیر کرتا ہے۔ یہ بے خوف مذرا انسان عناصر سے ظلم سے موت سے لڑتے ہیں۔ یوم پی کو قص کرتے ہیں۔ ان کا فلسفہ تیاگ کا فلسفہ نہیں ہے۔ یہ زندگی پر جی جان سے عاشق ہیں۔ انہوں نے چھولوں کے نگر آباد کیے ہیں۔ مٹی کے فصیلوں والے پور بنائے ہیں۔ لکڑی کے مکانوں میں اگنی شالائیں روشن ہیں۔ پھر کے قلعے تعمیر کیے جا رہے ہیں جمنا کی وادی میں گائیں چڑھتی ہیں۔ نگین گڈیاں باندھے۔ بالوں کی چار چار چوٹیاں گوندھے۔ مرگ نبھی لڑ کیاں پہپ کرم کے لیے چھول چن رہی ہیں۔ ہاملیہ کی وادی میں عظیم شوالک دریا بہہ رہا ہے۔ سبزہ زاروں میں ولیویکا۔ اور الکھنند اور بھاگرتی ندیاں گلنگناتی ہیں۔ ببریو۔ اور ورنوتوی کوشل دلیس کو سیراب کر رہی ہیں۔ اتر میں گیہوں کے کھیتوں کی کبھرہ اور وقتاً اور ویاس آبیاری کرتے ہیں۔ جنوب میں مہاندی بہتی ہے۔

یہ سریلی ندیوں کا بہت اتم سنگیت ہے۔

درائے کی لہریں چاندی میں راویں ہیں۔ گوتم نے آنکھیں بند کر تصور کیا۔ وہ اس سے دو ہزار برس قبل کی دنیا میں پہنچا۔ ہے۔ وہ اس خنک۔ آرام دہ۔ پیاری زمین پر بیٹھا ہے۔ یہ زمین اس کی زمین ہے اسے اس زمین سے عشق ہے۔ صدیوں سے وہ اس زمین کو سینچ رہا ہے اس نے اس میں خوبصورت درخت لگائے ہیں۔ اغريب شہر بسانے ہیں۔ اس زمین پر اس نے محبت کی ہے۔ شہرے بالوں والا بلند و بالا آریہ جو اپنے شہری رتحہ پر دھرتی کو رومندا مغرب

دیا

سے مشرق کی طرف آیا تھا۔ اندر کی مان اس کی معیت میں... پار ہتی اس کے ساتھ ساتھ اچھی آرہی ہیں... بڑھا کی بیلبی سرسوتی نے اپنی لفظ پر سے جھک کر اس کے کان میں کچھ کاہ علم تیرا ہے۔ گنیش نے سونڈ اٹھا کر قلم اس کے ہاتھ میں دے

تخیل میں کتنی طاقت ہے... جس نے عناصر اور چرندوں پرندوں کو شخصیتیں عطا کی ہیں... پرچھوی اور رونا... اندھیرا آسمان اور آنگنی اور اندر... عناصر کی یہ تمثیلیں فلسفے کی اولین مجسم شکلیں ہیں... ان کے زریعے سب کے قانون کو مزین کیا جا رہا ہے۔ یہ دنے کے اولین فلسفی ہیں... فلسطین کی پہاڑیاں خاموش پری ہیں، اسرائیل کے نغمہ نواز بھی پیدا نہیں ہوئے۔ مگر ان شاعروں کی آواز براہم ورت پر جھکے ستاروں سے جانکر رہی ہے۔ یہ صبح کے ستاروں کے راگ ہیں... اور خدا کے بیٹوں کی للکار... انہوں نے اطراف کے اس عظیم لاشان ناٹک کو اتنے بہت سے حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ان کو کھونج لگی ہے۔ یہ سب کیوں ہے؟ اس کا مصنف کون ہے؟ اداکار کون؟ تماشا لی کون؟ متر اروز روشن کو سامنے لاتا ہے۔ ہم سب کا دوست و رونا اندھیرے آسمان کا مالک ہے۔ بوری یہ روشنی کا خزانہ ہے۔ اوشاخ کی کنواری... والیو ہوا میں چلاتا ہے... ماروت طوفان کے فرشتے ہیں... پیش دیوتا سرکوں اور گلوں کا نگہبان ہے۔ روز آسمانوں کا چنگھاڑتا نیل ہے۔ عالم بالا کا سرخ سور...
اورونا..... ایک صاف گہری آواز فضا میں گونجی۔ گوتم نے گھس پر لیٹے لیٹے پچانا۔ یہ اس کی اپنی آواز تھی۔ جو کہ دو ہزار سال قبل باند ہوتی۔ وہ اولیٰ شال پیٹنے

کا نوں میں کرن شو بھا اور گلے میں سہری رما پہنے ایک اوپنجی چٹان پر کھڑا تھا
اس کے ہاتھ میں سرمنڈل تھا۔ اس نے پکار کر کہا۔ کیونکہ انہیں آسمان کے
نیچے اس سے وہ تنہا کھرا تھا

اورونا..... ہم نے اپنے رفیق۔ اپنے بھائی۔ اپنے دوست۔ اپنے ہمسایہ یا
کسی اخوبی کا دل دکھایا ہے۔ تو ہماری اس خطا کو درگز رکر۔۔۔

اپنی کنز و رویوں کی وجہ سے تیرے قوانین کی جو خلاف ورزی کی ہو۔۔۔

اورونا اس کی سزا نہ دے

اور اسی تاریکی میں کوئی دوسرا شاعر آہستہ آہستہ کہتا تھا

میں؛ جو بیوقوف ہوں اور جاہل ہوں

میں نے چاہا کہ دیوتاوں کے چھپے ہوئے گھر کا پتا چلاوں

میں نے میتوں سے پوچھا

وہ جس نے چھا آسمانوں کو سہارا دیا

کہیں یہ وہی تو خدا نے واحد نہیں؟

پہلوٹھی کے لڑ کے کوکس نے دیکھا ہے؟

وہ جس کے جسم میں ہڈیاں نہیں۔ اس نے ہڈیوں والی مخلوق کو جنم دیا

وہ کون جنگل تھا۔ کون درخت۔ جس کی لکڑی سے یہ کائنات گھڑی گئی؟

وہ کون تھا کہ جو جانے والے کے پاس یہ پوچھنے کے لیے گیا؟

یہم۔۔۔ دنیا کا پہلا انسان جس نے مر کر موت کا پتا لگایا

پھر اس شاعر نے سوچ کر دوسرے شاعر کو جواب دیا

دُنیا دُوق

وہ طاقتور ترین دنیا کا باپ ہے
وہ مبارک ہے یعنی شیو ہے
اس کے قبر سے گائیں اور انسان مر جاتے ہیں
پھر اس نے پوچھا

موت مجھے ختم کر دے گی.. موت کو کون ختم کرے گا؟ وہ کون سی چیز ہے جو کہ
انسان سے اس کی موت کے گھنٹے میں جدا نہیں ہوتی؟ مر نے کے بعد انسان کا کیا
ہوتا ہے؟ راجہ پر کشت کی نسل کہاں گئی؟ وہ کون ہے جو کہ ہر شہزادے پر قادر ہمیلک ہر
شہزادے سے علیحدہ ہے؟

موت سے سہم کر شاعر نے زمین سے استدعا کی...

و سعی ہر بان و هر تی... ماں... اسے اپنی گود میں جگہ

نو جوان اڑ کی... جو کہ اون کی طرح ملامت ہے

تجھے تباہی سے بچائے رکھے گی

و هر تی... اسے آپ کو دھیرے دھیرے جھکورے دے

اسے اپنے بو جھ سے نہ دبا

اسے آرام کرنے دے

اسے اس طرح چھپا لے جس طرح ماں اپنے بچے کو آنچل اور ہالیتی ہے

شمشاںوں میں روشنی ہو رہی ہے

اگنی اس کو جلانا نہیں اس کی کھال... اس کے جسم کو بھون کر رکھ دینا

اسے کھالینے کے بعد اسے اس کے پرکھوں کے پاس بھیج دینا

جب یا اپنے پرکھوں کے پاس پہنچ جائے گا تب خدا کی مرضی پوری ہو گی
اور ایسا ہوا کہ اس کی آنکھیں سورج کے پاس جائیں... اس کی سانس ہوا میں
تحلیل ہو یا آسمان کے پاس جائے یا زمین پر رہے.. جیسا سا کامقدر ہو.. اور اس
کے ہاتھ پاؤں پواؤں کی شکلوں میں پھر سے نمودار ہوں
انسان بہت کمزور نکلا... جو کہ اپنی ساری دھوم دھام.. برائی شان و شوکت ..
سارے ارادوں کے باوجود ختم ہو جاتا ہے.. شاندار شہرنیست و نابود ہو جاتے ہیں
دریا غائب ہو جاتے ہیں.. پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑتے ہیں.. باغوں میں بست
منانے والوں کا نشان تک نہیں ملتا

ہرش قافی ہے... صرف ستوب باقی بچتے ہیں
مسرت بیکار ہے... دل کی لگن بیکار ہے.. اب میں کے پکاروں؟.. کس کی
مناجات کروں؟
اندر کی مناجات کرو.. رگ وید کے شاعروں نے کہا...
اندر کی مناجات کرو.. آواز بازگشت لکڑی کے مکانوں اور پتھر کے قلعوں میں گو
نجی...

اندر کی مناجات کرو.. اگر وہ واقعی ہی موجود ہے
اندر کا کوئی وجود نہیں... دوسرے شاعر نے سوال کیا
اے دیکھا کس نے ہے؟ میں کس کو پوچھوں اور اندر نے گرج کر گنگھوڑ
لھٹاوں کو جواب دیا...
میں ادھر ہوں... امغنا مجھے دیکھو..

میں ساری مخلوقات سے عظیم ہوں
نظام کائنات نے مجھے عظیم تر بنایا ہے۔

پھر انہوں نے کہا۔ اور پہاڑوں پر رہنے والے رو ر۔ اپنے تیز۔ قہرناک تیروں

سے

کسی انسان کو کسی حیوان کو نقصان نہ پہنچا
کیونکہ موت خوفناک ہے۔

لیکن موسيقی موت کو ختم کر دے گی۔ موسيقی کی وعut۔ اس کی گہرائی میں
موت کہیں تنکے کی طرح ڈوب کر رہ جاتی ہے۔ موت دراصل بہت حقیر ہے
۔۔۔ موسيقی خدا ہے

روید کے شاعر چٹان پر بیٹھے رہے۔۔۔ نیچے وقت کا تاریک دریا بہہ رہا تھا۔ اس
دریا کی سطح پر چھوٹے چھوٹے ٹکھنوں پیدا ہو گئے۔۔۔

اس اولین موسيقار کے ہاتھ میں وینا تھی۔۔۔ انہوں نے سات سروں کی سرگم
تلخیق کر لی تھی۔۔۔ سرگم کا ایک ایک سرو بینا کے تاروں پر علیحدہ علیحدہ گونج رہا تھا۔۔۔
اب سارے تاراں کھٹھے ہو کر ایک آواز پیدا کر رے ہیں۔۔۔

ویشودیو۔۔۔ سارے خدا ایک ہیں۔۔۔ اگنی۔۔۔ اوشا۔۔۔ وردنا۔۔۔ سوما۔۔۔ کندھرو۔۔۔ ساری
طاقوتیں ایک وشو بھوانی ہیں۔۔۔

تماکم۔۔۔ خدا ایک ہے۔۔۔ مضراب کی ایک جھنکار سے فضام تعش ہو گئی۔۔۔
مگر میں کس کی عبادت کروں
کس کی بارگاہ میں قربانی چڑھاؤں

اور شاعر نے خود ہی جواب دیا
و شوکر ما... و شو دیوا مہمان اسی
تو سب کا خالق ہے خدائے بزرگ و برتر... پر جا پتی...
کون کھمباتھا... کون سہارا
کس طرح ایسا ہوا کہ و شوکر ما نے اپنی طاقت سے زمین بنائی اور آسمان تاتا

وہی ایک خدا ہے جس کی چاروں طرف آنکھیں ہیں...
اور منہ... اور بازو... اور پاؤں
جو اپنے دو بازوں اور پروں کی دھونکنی سے دنیا کو گھرتا ہے
سب سے پہلے نور پیدا ہوا... وہ سارے وجود کا خدا تھا...
اس نے آسمان اور زمین بنائے...
میں کس خدا کی بارگاہ میں قربانی چڑھاوں؟
وہ جوز ندگی اور طاقت بخشنا ہے...
ابدیت اور فنا جس کی پر چھائیاں ہیں...
میں کس خدا کی بارگاہ میں قربانی چڑھاوں؟
وہ جو اس سانس لیتی اور سوتی ہوئی کائنات کا مالک ہے
وہ جس نے فضا میں روشنی کی پیائیں کش کی ہے
جس نے جگمگا تے عظیم پانیوں کو تخلیق کیا ہے...
وہ جو ایکادیوا ہے اور پران اور سکھمباء [سہارا]

قصہ مختصر یہ کہ وہ برماء ہے

خدا نے واحد... جو کہ نہ مرد ہے اور نہ عورت... اس کی کوئی جنس نہیں... کوئی نا
لی نہیں... نہ کسی نے اس کو پیدا کیا ہے... نہ یہ کسی کو پیدا کرتا ہے... ایکا دیوا
برہما جو کہ بڑھتا ہے جو باہر لاتا ہے... اور پھیلاتا ہے... جو کہ دنیا کی تخلیق کا مادی
سبب ہے... لیکن خود غیر مادی ہے... اور دنیا جو اس نے تخلیق کی خود غیر حقیقی ہے
محض اوم اصل حقیقت ہے... خلا... روشنی اور آواز

لفظ.... جو اس زبان سے ادا ہوتا ہے... برہما پتی... جو پھیلتا ہے... برہما پت
کی حیثیت سے برہما خدا نے نطق ہے

لفظ جو کہ شروع میں تھا اور خدا تھا... حد تول بعد فلسطین کے حکماء یہ جملہ دہرا کر
ایک نئے خیال کا پر چار کریں گے... یونان میں لوگوں کے منسلکی تروتنج ہوگی... عہد
نامہ قدیم میں صوفیہ علم کی صورت میں ظاہر ہوگی
ویدوں کی تقدیمیں مضبوط تر ہوتی جا رہی ہے
کیونکہ وید زبان کی شکل میں برہما ہے۔

اب لفظ اور خیالات کے باہم رشتے پر غور کیا جا رہا ہے... زبان نے ایک حمد
میں کہا...۔

میں والیا اور رورا اور رو شودیو کے ساتھ گھومتی ہوں
میں مترا... درونا... اور اگنی کی مد دگار ہوں
میں ملکہ ہوں... دولت جمع کرتی ہوں... میں جانے والی ہوں...
ان سب میں افضل جن کی عبادت کرنا چاہئے

بغیر جانے انسان مجھ پر ہی بھروسہ کرتا ہے۔

میں جسے پسند کروں اسے برہما۔ رشی اور آنگنی بنا دیتی ہوں....

میں رو رکی مان موڑتی ہوں تا کہ وہ جو برہما سے تنفر ہے۔ اسے ختم کیا جاسکے

میں جنگلیں کرواتی ہوں۔ میں ہوا کی مانند چاروں گھونٹ چھلتی ہوں
شبد برہما۔

برہما جو کہ بذات خود ہن ہے اور کنول کے ریشے سے زیادہ اطیف بادل کی
چھلایا سے زیادہ ہلکا۔ جو کہ اس کائنات کا حامل ہے۔ جو کہ اپنے آپ کو تقسیم کرتا ہے
تا کہ دوسرا یہ پیدا ہوں۔

وہ دوسرا میں خود ہوں۔ آتما۔۔۔ جو ذہن اور زبان اور سانس کا دوسرا نام ہے
جو کہ خود اپنی گواہ آپ ہے۔ اور جو روح۔۔۔ کائنات اور۔۔۔ پر ما تما بھی ہے
اب برہمن اور آتما کا مجرد تصور وحدت وجود کے نظریے کے لیے راہیں تیار کر
رہا ہے

پرچاپتی کے تخيّل نے واحدانیت کا بیج بویا
شروع میں پانی تھا جس پر پرچاپتی ہوا کی طرح منڈایا۔۔۔ اور کائنات کی تخلیق
کی

فلسطین کا فلسفی بعد میں کہنے والا تھا۔۔۔ شروع میں پانی تھا جس پر رو جیں
دوئیں کی طرح منڈلاتی تھیں

ان شاعروں کے تخيّل نے ساری کائنات کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔۔۔ ان

کے لا شور کی وسعت میں قطب شمالی کی طویل راتیں۔ مدھم سرخ سورج اور وسیع
سیزہ زار تھے کھلی فضا میں موسم کی تبدیلیاں۔ پھولوں کے رنگ۔ بست رت کی
زردی۔ برسوں اور کپاس اور ٹیٹھو اور ہار سنگھار اور ساون بھادوں کی جھٹریاں اور مور
کی۔۔۔ مینہ آو۔۔۔ مینہ آو کی صدائیں اور جب درخت جامن۔ فالے اور کروندوں
سے لد جاتے ہیں اور خزان۔۔۔ جب دھان کی فصل کلتی ہے اور سر دیاں۔۔۔ جب
چوپالوں میں الاؤ جلتے ہیں اور کھلیاں کے اوپر ہمیعت کا چاند دھنڈ میں تیرتا ہے۔۔۔
یہ موسموں کی راگ مالا انہوں نے اس دینا کے تاروں میں قید کر لی ہے۔۔۔ برہما اور
شکتیا کا تصور سنگیت میں ڈھل چکا ہے۔۔۔ برہما راگ ہے۔۔۔ برسوتی راگ رانی۔۔۔ پا
نج سر مہادیو نے تخلیق کیے ہیں۔۔۔ کھرج اور چشم پاروتی نے بنائے ہیں۔۔۔ فضائے
بسیط تو نبور و نارو منی اور چتر سین کی موسیقی سے گونج اٹھتی ہے۔۔۔ یعنی اصر کی موسیقی
ہے جسے مشکل کر لیا گیا ہے

نٹ راج کا ڈمرو۔۔۔ آ کاش تت سماء کا مظہر ندا جس میں ساری آوازیں پیدا ہو
تی ہیں۔۔۔ رو رآ مددھیوں کا خدا اپنی پر شکوہ وینا چھیڑ رہا ہے
جمنا کے کنارے مہا و شنو بانسری پر نغمہ حیات بجا رہے ہیں۔۔۔ گوپیاں۔۔۔ آفاتی طا
قتیں۔۔۔ اس کی دھن پر رقصان ہیں
کائنات ان گنت سازوں کی جھنکار سے گونج رہی ہے۔۔۔ راگ تخلیق ہو رہے
ہیں۔۔۔ جن کی پر دیپ سے آواز کی دنیا جھلملما اٹھی ہے۔۔۔ فضائے بسیط میں بھیرو۔۔۔
مالکوں۔۔۔ ہندوں۔۔۔ میکھ۔۔۔ دیپ۔۔۔ برسی کے دیوگرج رہے ہیں
اساوری اور رام کلی کی نازک پریاں ہوا میں پر پھیلاتی ہیں۔۔۔ جنگل کے پر

ندے اور جانور بھی شاعر اور موسیقار کے ساتھی اور دوست ہیں، ان کی آواز... ان کے رنگ اور ان کی چال کو رقص و نغمہ کے تخیل میں محیط کر لیا گیا ہے مورکھ رج میں جھنکارتا ہے پہاڑ کب میں اپنی گھٹ لگاتا ہے بکری گندھار میں مناتی ہے ہنگ مدھم میں پکارتا ہے کوئی کی کوک میں پھجم کا سر ہے۔ ہدیت گھوڑے کا ہنہنا تا ہے بکھادہ تھی کی چنگھاڑ ہے۔

تان پورے پر سرچھیرا گیا۔ تان پورے کی آواز جو گیت سے پہلے شروع ہوتی ہے گیت کے دوران موجود ہوتی رہتی ہے اور گیت ختم ہونے کے بعد تک گوئی رہتی ہے۔ سر جو ذات مطلق ہے۔ جو ہمیشہ سے تھا۔۔۔ ہے۔۔۔ اور ہے گا۔۔۔ نگیت کار کے فن میں فلسفے۔۔۔ رنگ و نور۔۔۔ خیالات اور جز بات کا دھارا کشاہ بہہ رہا ہے

اس شاعری اور موسیقی کے پس منظر میں بہت عظیم رنگوں اور آوازوں کی دنیا پھیلی ہے۔ آسمان سے الہی پانی برستا ہے اور الہی شفاف ندیوں میں بدل جاتا ہے۔ آسمان کی روشنی کا سمندر اوشما کے اجائے کے ساتھ ساتھ صبح کے راؤں میں گھل مل جاتا ہے اور اس مقدس کھرے پر شہری دہبی سرسوتی تیرتی ہے سرسوتی جو کہ تخلیق کرنے والی ماں کا تصور ہے۔۔۔ جو راگی ہے۔۔۔ جو علم ہے۔۔۔ جوزندگی کا مقصد ہے۔ علم سے آزادی ملتی ہے۔ علم سرائے وجود کی بنیاد ہے۔ گیان میں نجات ہے۔۔۔ [سوچتے سوچتے گوتم وقت کے اس نقطے پر لوٹ آیا جہاں وہ اس سے موجود تھا۔۔۔ قید اس لیے ہوتی ہے۔ اس نے گھاس پر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا کہ خودی اپنے آپ کو اپنے ذہن سے مہائل کر لیتی ہے اور لہذا اس دکھا اور رگناہ اور ڈنی اور اخلاقی

کمزوریوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ اور پر اکرتی کا تجربہ کسی کو تو کرنا ہوتا ہے۔۔۔
یہ تجربہ خالص روح کرتی ہے۔۔۔
یہ تجربہ میں بھی کر رہا ہوں۔۔۔
یہ تجربہ کرتے کرتے میں کدھر نکل جاؤں گا۔۔۔
لیکن کوئی پرواہ نہیں

سوالِ حقیقت پسندی یا تصوریت کا نہیں۔ صحیح عمل اصل چیز ہے
وہ گھاس کی پتوں کو توڑ کر اکھا کرتا رہا اور پھر زمین پر پھر کے سہارے نہم
دراز ہو گیا رات آدمی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اور درختوں کے حصر مٹ میں کسی یوگی
کی جھونپڑی کے سامنے آگ جل رہی تھی۔ اس نیم تاریکی میں اس کی روشنی
آنکھوں کو بہت اچھی معلوم ہوئی۔۔۔

پتا نہیں بیچارا اس وحشت اور ویرانی میں وہاں بیٹھا کیا سوچتا ہو گا۔۔۔ گوتم کو
یا ک لمحے کے لیے بڑا چنچلا ہوا

وہ ان شعلوں کو نکلی باندھے دیکھتا رہا۔ وقت سننا تا ہوا اس کے چاروں اور
ڈول رہا تھا۔۔۔ زہن کی جوست کے آگے اب قربانیوں کی آگ مدھم پڑ چکی تھی۔۔۔ انسانی
دماغ دیو مala کی تخلیقی مدتیں ہو میں کر کے ختم کر چکا تھا۔۔۔ خیال کے صنم خانے آباد
ہو کرنے پر اُنے بھی ہو گئے۔۔۔ دماغ اب دیقق مسلوں کا حل تلاش کرنے میں
مصروف تھا۔۔۔ مذہب اب محض کمتر درجے کا علم سمجھا جاتا تھا۔۔۔ اصل چیز فلسفہ تھا اور ما
بعد الطیعتا۔۔۔ سارے ملک میں خیالات کی فرمانزوں کی تھی اور آزادی۔۔۔ افکار اور
مزہبی رواداری۔۔۔ ایک ہی کنبے کے افراد بہما کے مختلف مظاہر کی کوشش کرتے اور

متضاد نظریوں پر یقین رکھتے۔ مادہ پرست۔ شویت کے قائل۔ محمد۔ بے خوفی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے کیونکہ سچائی کی تلاش ان سب کا مشترکہ مقصد تھا۔ ہر فلسفی اپنی اپنی جگہ سے جو اس نے اپنے لیے منتخب کی تھی۔ ذرا براہم بر کنے کو تیار نہ تھا۔ مگر ان سب نے علم معقولات کو سب سے زیادہ فوقيت دی تھی۔ جسی اور اک۔ استنباط۔ اور لفظ کی شہادت اور سند پر اس جستجو کی بنیاد تھی۔

محمد حکیم کپل کئی سو سال قبل گزر اتھا۔ چونکہ اور اک۔ استنباط اور لفظ کی شہادت میں سے کوئی چیز بھی خدا کے وجود کا ثبوت بھم نہ پہنچا سکتی تھی۔ لہذا کپل نے بڑی دیری سے ایشور کی بجائے ان ایشور پر زیادہ توجہ دی تھی۔ منطقی کی حیثیت سے وہ خدا سے منکر ہونے کی بجائے محض اسی پر مطمئن رہا کہ شہادت کے عام زرائع سے خدا کے وجود کو ثابت نہیں کر ستا۔ گواں قدر رو اوار تھا کہ عوام کے دیوتاؤں شیبو اور وشنو تک گوارا کر لیتا تھا کہ ممکن ہے کہ وہ موجود ہی ہوں۔ لیکن اس کے نزدیک یہ محض تخلیق شدہ دنیاوی خدا تھے اس کے خیال میں ایشور تک کا وجود مظاہری تھا۔ ساتھ ہی وہ کہتا تھا کہ کوئی چیز زمان و مکان میں مقید ایسی نہیں جو بلا خر حقیقت اور ابدیت پر مبنی نہ ہو۔

کپل ناستک یا معدومیت پرست نہ تھا۔ سید حاسادا محمد تھا۔ برہما کے بجائے اس نے پر اکرتی کو وجہ کائنات ثابت کیا۔ پر اکرتی یا فطرت۔ جو کارن کاریہ نظریے کی بنیاد تھی پر ان کرتی اولین کارن ہے۔ ذہن خودی۔ جو اس خمسہ اور عناصر اربعہ اس کی ترکیب اور سارا ارتقاء اس میں مشتمل ہے اور پر پوش جو کہ خالص روح ہے۔ جو کہ نہ کسی کا کارن ہے اور نہ کاریہ۔ اور پر اکرتی الگ کھڑا ہے۔ پوش ابدی

شخصی شاہد ہے۔ اور اس کے اوپر پراکرتی کے ملاب سے دنیا ظہور میں آتی ہے۔ ان دونوں کے عالوہ تیسری کوئی طاقت نہیں ہے۔ اور دونوں کی علیحدگی سے قطعی کامل صرفت اور مطلقیت پیدا ہوتی ہے۔ کچھ کہنا تھا کہ ارتقاء مخصوص اتفاقات نہیں ہوا۔ موجودہ کائنات کے پس منظر میں کوئی اور حقیقت رہی ہوگی۔ کاریہ کارن میں پہلے سے موجود رہتا ہے۔

ویدانت والے موحد خدا پرست جو کہا یک بُرہما کو قادر مطلق جانتے تھے کاریہ
اکرن بھید کے منلے پر متفق نہیں تھے۔ ان کے نزد یک کاریہ اور کارن ایک ہی تھے
کیونکہ ہر شے بُرہما تھی۔ بت قوم اسی تو وہ ہے جیو آتما بندہ دراصل وہ ہے۔
تو ہی خدا ہے۔

لیکن ہر شے برہما ہے۔ تو یہ دولی کا ہے کے لیے؟.. کپل کے ملحد ساتھیوں نے
(دلي ۲۹۹)
پوچھا
یہ دولی دراصل مایہ کافریب ہے.. ما یا پر اکرتی کا... انہوں نے جواب دیا۔ مدد
پرست کپل کی فطرت کو ویدانت والوں نے برہما کا سایہ قرار دیا۔ انہوں نے
اوراک پر الہام کو ترجیح دی۔ اور اک اور استنباط مخفی عالم موجودات کے لیے ہی
سند تمجھے جاسکتے تھے۔ اگر برہما ایک ہے تو دنیا میں کثرت کیوں ہے؟ تجربے
متنوع کیوں ہوتے ہیں؟ لیکن برہما کی ذات کا ایک پہلو۔ نام روپ بھی ہے
اس کی ملایا۔ شکنی اور پر اکرتی دنیا کی تحقیق کرتی ہے۔

لیکن اصل ذات خداوند کی نام روپ اور ملایا سے بلند تر اور بے نیاز ہے.....
گنی جن کے لیے ساری دنیا سر اب کی مانند ہے۔ اصل برہما غیر مشروط اور قطعی ہے

..ہماری اودیا کی وجہ سے وہ ہمارے ذہن میں آ کر مشروط عملی.. خالق اور شخصی بن جاتا ہے... دنیا کی تخلیق بھی اودیا اور اصلی اودیا کی وجہ سے ہمارے اور اک سے باہر ہے... یا شکتی کے زریعے ہوئی اور اس کی وجہ سے برہما کا درجہ کم ہو گیا بڑھا نہیں.. برہما صفات سے متاثر نہیں.. جس طرح ہماریا پنی مشروطیت ہماری اصلی روح کو متاثر نہیں کرتی.. جس طرح صفات زدہ برہما میں تخلیق کرتا ہے۔ اسی طرح ہماری مشروط آتما اس برہما کو تخلیق کرتی ہے... مایا کی دوسرا تھا میں نرگن برہما سکن بن جاتا ہے

نا..... برہما کے لیے ہم محض یہی کہہ سکتے ہیں۔ وہ یہ نہیں ہے... وہ یہ بھی نہیں ہے۔ ویدانت میں لکھا تھا... وہ سست بھی ہے اور است بھی ہے۔ وجود بھی ہے اور عدم وجود بھی ہے۔ عظیم ترین وجود اور عدم وجود۔ یوں کہ جن چیزوں کو دنیا وجود بمحضتی ہے وہ اس سے مختلف ہے۔ برہما شخصی ہے۔ اس کی خارجی صفات نہیں۔ اگر وہ جانتا ہے تو محض خود کو جان سستا ہے۔ جس طرح سورج اپنے آپ کو روشن کرتا ہے۔ ہمارا برہما کے متعلق علم محض برہما کا احساس ہو سستا ہے۔ جو کہ خود ہمارا اپنا احساس ہے۔ ملکتی سے ایشور۔ مظہری خدا اپنے آپ سے غائب ہو سستا ہے

یہ حکماء بجائے خود بدعتی تھے۔ کیونکہ فلسفی تھے۔ ویدانت والوں نے اسی آزادی کو استعمال کرتے ہوئے خود ویدوں کو منتخب کیا اور الہام سمجھ کر ان کے آگے بھکے گو سند کو بڑی آسانی سے منتظر یا نامنظر کیا جا سستا تھا۔ خود کو کپل کا ایسا منطقی بھی ویدوں کو کہیں کہیں سے اس شرط کے ساتھ مان لیتا تھا کہ وید بھی غلط کو صحیح ثابت نہیں کر سکتے

ابدیت پرست کہتے تھے کہ روح اور دنیا دونوں ابدی ہیں۔ محض زندگیوں کا
تسلسل قائم ہے۔ اور ابد الاباد تک رہے گا۔ چندو کے نزدیک آتما اور دنیا ایک حد
تک ابدی تھیں اور ایک حد تک نہیں۔ انتانتوں کے نزدیک دنیا یا محدود تھی یا غیر
محدود اس کے استہ بی دنائے محدود تھی نہ غیر محدود۔ سیا وادیوں کا خیال تھا کہ ہر
چیز ہے بھی اور نہیں بھی۔ وہ کو کسی بارے میں قطعی رائے نہیں دیتے تھے۔ دوسرا
دنیا ہے یا نہیں حادثہ ہے یا نہیں۔ جزا اوسرا ہے یا نہیں۔ حیات بعد الممات ہے یا
نہیں۔...

کچھ لوگ سمجھتے تھے کہ دنیا اور آتما محض حادثے کے طور پر ظہور میں آئے۔ کیوں
نکہ ان کا کہنا تھا کہ انہیں خود یا وہ تھا کہ کچھ عرصہ قبل وہ نہیں تھے اور اب ہیں
صدیاں گزرتی گئیں۔ فتنی اپنڈوں کی شدید ما بعد الطیعتاں سے آتا گیا
۔۔۔ رفتہ رفتہ خدا جو کہ فلسفے کا مسئلہ تھا شخصی ہنا
تا کہ بالآخر دل کو ذہن پر فتح حاصل ہو۔۔۔ رورا یک ہے۔۔۔ ایک اپنڈ میں لکھا گیا
جو انسانوں کے دل میں رہتا ہے اور اسے پہچان کر ساری اور یا کا خاتمہ ہو جاتا
ہے۔۔۔

ما بعد الطیعتاں کے کارن نے اوہ تارکاروپ دھارا۔۔۔ اضافی کام مطلق سے تعلق
خرد کے بجائے وجد انٹھہرا۔۔۔ بے خنس برہما مردہنا۔۔۔
وشنو جو پتے کے گرنے میں نہیں ہے۔۔۔
نارائن جو خود مجھ میں ہے۔۔۔

درندابن سے بانسری کی تان بلند ہوتی۔۔۔ اور انگنا اور جمنا کے کناروں پر چھا گئی

انگ رنگ سارم

مدھوسو دن.... جو کہ محبت کا اتحادِ سمندر ہے۔ گر دھر گو پالا۔ کر شنا۔ کر شنا۔ کر شنا
گوتم نے گھاس پر سے سراٹھایا اور ندی پر سے برتستے نائے کو دھیان سے
سننے لگا۔

اور کر شنا نے کہا۔ اوار جن میں بے پایاں وقت ہوں۔ میں تباہ کن موت ہوں
میں رازوں کا سناٹا ہوں۔ میں ابتدائے عالم ہوں اور میں ہی اس کی انتہا ہوں۔ او
کنٹی کے بیٹھے میں پانی کا سودا ہوں۔ سورج اور چاند کی روشنی۔ میں سارے
ویدوں میں لکھا ہوا اوم ہوں۔ میں آ کاش کی آواز ہوں۔ میں انسانیت کا اجتماعی
شعور ہوں۔ او کنٹی کے بیٹھے۔ میں عورت کی ذہانت اور وفاداری اور حرم دلی ہوں
میں گاتری منتر ہوں۔ میں اچھوں کی اچھائی ہوں۔ اوار جن میرے الہی مظاہر
بیکراں ہیں۔ میں عالم الغیب ہوں۔ لیکن مجھے کوئی نہیں جانتا
اور کر شنا نے کہا۔ مجھے چاہو۔ مجھ سے محبت کرو۔ میں تمہارا سکھا ہوں۔ تمہارا
ساتھی۔ تمہارا محبوب۔ میں محبت کا سمندر ہوں۔ انگ رنگ سارم

کائنات اس کی بانسری کی آواز سے مسحور ہو گئی۔ پھر ویشاںی کے مہا ویر نے کہا
خداوند عالم کا کوئی وجود نہیں۔ دنیا بادی ہے اور اپنے وجود میں قائم اور مادے اور
خلاء اور دھرم اور روحوں کی ترکیب سے بنی ہے۔ صرف یہی ایک حقیقت
ہے۔

اور شاکیہ مثی نے کہا۔ خدا ہو یا نہ ہو۔ حقیقتِ محض یہی ہے کہ دکھ موجود ہیں۔
باسٹھ فلسفے اور دیا کے باسٹھ گن ہیں۔ محبت بے کار ہے۔ فلسفہ بے کار ہے۔ سب مہا

موہ ہے۔ سب مایا ہے۔ سب دھوکہ ہے۔ شروع میں نہ وجود تھا اور نہ عدم وجود۔ ہر شے خلا غیر حقیقی ہے۔ پھر یہاں خواہشوں کا گزر کہاں؟ کون تمنا کرے گا اور کس چیز کی؟ کسی چیز کا کسی چیز کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ ہر شے اپنا الحاقی وجود خود ہے۔ اور شاکیہ منی نے کہا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم ہیں۔ حالانکہ ہم اضافیت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

ہر شے تکلیف ہے۔ سر و م د کھم د کھم۔ ہر شے فانی ہے۔ جسم اور روح دونوں کی کوئی اصلیت نہیں۔ روح لازماً اول نہیں۔ محض اس کو تشکیل دینے والے عناصر باقی رہتے ہیں۔ روح کا آواگون نہیں محض کرم کا آواگون ہے۔ انسان اس طرح دلختا بجھ جاتا ہے۔ جیسے چراغ کو پھونک مار کر گل کر دیا جائے۔ صرف واقعات اور احساسات کا دور تسلسل قائم ہے۔ اور رہے گا

پانی کی نقری لہریں کنارے تک آ کر لوٹی رہیں۔ گوتم نے آگ پر سے نظریں ہٹالیں اور ندی کو دیکھا جو کہ بڑے سکون سے روائی دواں تھی۔ میں دکھ سہنا چاہتا ہوں۔ میں کمزور بننا چاہتا ہوں۔ میں اپنی حماتتوں کا نظارہ خود کروں گا۔ میں تکلیفیں اٹھاوں گا۔

دل اور دماغ کے رنج اور آزمائیشیں۔ میں مکتنی نہیں چاہتا۔ میں مکتنی بالکل نہیں چاہتا۔ رحم بہت بڑی چیز ہے شاکیہ منی۔ لیکن ممکن ہے کہ مجھے خود ہی تم پر بہت ترس آتا ہو۔ سوال یہ بھی ہے کہ مقدس شہزادے کوون کس پر ترس کھائے گا؟

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ افق پر صبح کا اجالا بکھر نے لگا۔ لیکن دھند لکھ کی وجہ سے ندی کا دوسرا کنارہ ابھی صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ایک طویل انگڑائی لی۔ اور پانی

میں کو دیگیا....

رات وہ کچھ سویا تھا کچھ جا گا تھا... رات اس نے بڑی بے چینی سے گزرای تھی .. پانی سے باہر نکل کر اس نے آشرم کی طرف جانے کی بجائے اس نے گھنے جنگل کا رخ کیا۔ اور ساحل کی رہیت پر ایک سمت کو روائی ہو گیا۔

.....

ترانی کا راستہ جو شراویتی سے اتر کی طرف جاتا تھا۔ اس میں دونوں طرف پیڑ تھے۔ اور اونچے اونچے سر کنڈے اور ڈھاک کے جنگل اور رنگ برلنگے پھولوں والی جھاڑیاں میں لمبی دمou اور جھلماٹتے پروں والے پرندے سیٹیاں بجاتے تھے .. اور ادھر ادھر چکر کاٹ کر پھر گھنے جنگلوں میں چھپ جاتے تھے۔ دریا اس پھولوں کے جنگل میں سے لہراتا ہوا گزرتا تھا۔ اس کے مشرقی کنارے پر گھاٹ تھا۔ جہاں شاہی بجرا رات کو کنارے پر آن کر لگا تھا

ایو دھیا اور اتر کوشل کے علاقے کے حمر ان ارجمن اور ان کے کا دربار صح سویرے کھیدا کے لیے اتر کی طرف کوچ کرنے والے تھے۔ مگر راسی تلاش کرنے والوں نے اطلاع دی تھی۔ کہ ہاتھیوں کے علاقے میں بالکل غیر متوقع بارش شروع ہو گئی ہے۔ بھرے سے اتر کر شاہی قافلہ ہاتھیوں .. پالکیوں .. رجھوں اور بیلوں پر سورا ہو رہا تھا۔ جب یہ خبر ملی تو قافلے نے اپنا رخ پھر گھاٹ کی طرف موڑ لیا۔ اور گرو پر وشم کے آشرم سے چند میل کے فاصلے پر مہوا کے جنندہ میں خیمے لگ گئے۔ آنا فانا جنگل میں منگل ہو گیا۔ باغ جہاں صرف ہرنوں کی ڈاروں اور مرغابیوں اور موروں کی عمل داری تھی۔ اور جہاں کبھی اکادمک طالب علم مراقبے میں

غرق کسی گپدندھی پر سے گزرتا نظر آ جاتا تھا۔ وہاں پل کی پل میں میلہ سالگ گیا۔۔۔ شراویتی کے سنار اور بز از اپنیا پنی دکانیں شہزادیوں کی خدمت میں حاضر کرنے کے لیے اٹھالائے۔۔۔ پچھول والوں نے تازہ کلیوں کے انبار لگادیے۔۔۔ بھاؤں نے اپنا ڈیرا جمایا۔۔۔ اور لہک لہک کر قصیدے گانے لگے۔۔۔ بخاروں کی ٹولیاں طوطے۔۔۔ مینا میں۔۔۔ پاتو بندرا اور موئی میکے خپروں اور بیلوں پر لاو کراس امید میں آ کر دور کھڑی ہو گئیں کہ شاید کوئی راج کاری طوطا خریدے۔۔۔ کئی مصور اور سنک تر اش اپنا اپنا سامان لے کر فروخت کرنے کی نیت سے آن موجود ہوئے۔۔۔ بفت اور بازی گر اپنے کرتب دکھانے لگے۔۔۔ رات کو مشعلوں اور الاؤ کی روشنی سے جنگل کی چیزیں جگ اٹھتیں اور خوب شور مچاتیں۔۔۔

شاہی قافلے کی لڑکیاں دن بھر باغوں میں گھومتیں۔۔۔ اندھیرا پڑنے ندی میں جا کر تیرتیں۔۔۔ کبھی دن میں تیرمان لے کر ہرنوں کا شکار کرتیں۔۔۔ ورنہ پھر سیموں کے نیچے یا درختوں پر بیٹھ کر گپیں ہائکتیں۔۔۔

دو تین دن کے اندر ہی چمپک کا اس بے مصرف زندگی سے جی اکتا گیا۔۔۔ وہ بخاروں سے ان کے موئی۔۔۔ بزازوں سے ان کے ریشم۔۔۔ چینی اور چمنے۔۔۔ سناروں سے ان کے گہنے اور مصوروں سے ان کی تصویریں خرید چکی تھیں۔۔۔ کسی سائل کو لوٹانا اس کے بس کا کام نہیں تھا۔۔۔ دکانداروں سے اس نے بیکار کی چیزیں بھی خرید لی تھیں۔۔۔ کہ کہیں ان کا دل نہ ٹوٹ جائے۔۔۔ وہ لوگوں سے ان کی بیوقوفی کی با تین سنتی رہتی تھی اور کبھی ان سے یہ نہ کہہ سکتی تھی کہ آپ لوگ سب کے سب عموماً کس قدر گدھے ہیں۔۔۔ لوگ اسے اپنی اپنی کھانا میں ناتے تھے۔۔۔ ہر انسان اس سے

ہمدردی کا خواہاں تھا۔ کیونکہ سارے میں مشہور تھا کہ وہ بڑی گنی ہے۔ بڑی نیک دل ہے بڑی فیاض ہے۔ یہ ہے۔ وہ ہے۔ دنیا بھر کی باتیں اس کے لیے مشہور تھیں اور اسے نہیں آتی تھی۔

تین دن جنگل میں رہ کر اس کا دل مسلسل اس سیر و شکار سے گھبر آگیا۔ اس نے نر ملائکو ساتھ لیا۔ اور چپکے سے آبادی کی طرف چل کھڑی ہوئی۔ سامنے آم کا گھنا جھرمٹ تھا۔ یہاں بڑا سکون تھا۔ اور خنکی۔۔۔ آسمان پر جھٹ پٹے کے قرمزی رنگ بکھر گئے تھے اور باغ میں رہت چل رہا تھا۔

اوادھر چلیں جدھر سے گانے کی آواز آرہی ہے

نر ملانے کا ناگا کر کچھ سنتے ہوئے تجویز کیا

چلو یوں سب راستے ایک جیسے ہیں۔۔۔ جمپک نے کہا
وہ پتوں کو رومندی آم کے جھرمٹ کی اور بڑھتی رہیں۔ درختوں کی شاخوں
میں سے دور کسی آشram کے جھونپڑے نظر آرہے تھے۔

یہ کون جگہ ہے۔۔۔ جمپک نے کدم کی ایک شاخ پر ہاتھ رکھ کر ٹھہر کتے ہوئے کہا۔

یہ سامنے کون لڑکے ہیں۔۔۔ نرمال نے بے ساختہ سوال کیا

ہر جگہ بہمچاری لباس والے لڑکے دیکھ کر اسے اپنا بھائی یا دا جاتا تھا

.....8

گوتم نیلمہر تین دن اور تین راتیں مستقل بھوکا پیا ساندھی کے کنارے کنارے اوہرا اور گھومتا رہا۔۔۔ رات کے وقت وہ گھنٹوں ٹھنڈے پانی میں ایک ناگ پر کھڑا رہا۔۔۔ پھر ریت پر بول کے کانٹے بچھا کر ان پر سویا

ایک دن سارا اس نے چیوٹیوں کو آٹا کھلانے میں صرف کیا... جو کہ وہ ملا جوں
سے مانگ کر لایا تھا۔ پھر وہ اس نے آنکھیں بند کر کے منتظر پڑھے
لیکن چوتھے روز وہ اس قدر جھخٹھلایا کہ اس نے واپسی کی شان لی
شام پڑے وہ ڈھیلے ڈھالے قدم رکھتا آئشرم کی کو جانے والی سڑک پر چل رہا
تھا کہ اس نے کسی نے پیچھے سے آواز دی
اس نے مرکر دیکھا۔ انگلیش اس کی سمت ہستا ہوا آرہا تھا
بھائی گوم۔ تم تین دن سے کہاں غائب تھے۔ سارے میں تمہاری ڈھنڈیا
مجی ہوئی ہے۔

میں تو یہیں تھا۔ تم یہاں اس وقت کیا کر رہے ہو۔؟ گوم نے سکون سے پوچھا
وہی جو کہ تم کر رہے ہو۔ انگلیش نے خوش دلی سے جواب دیا۔
میں تو بھگوان کی لیما دیکھ رہا ہوں۔
میرا بھی ان دونوں یہی مشغله ہے
آئشرم میں سب خیریت ہے۔ گوم نے یونہی بات جاری رکھنے کے لیے
پوچھا۔ اس وقت اسے احساس ہوا کہ ہری شکر ٹھیک کہتا تھا۔ الفاظ بیکار ہیں
ہاں تم اس طرح خیریت پوچھتے ہو جیسے برسوں کے بعد لوٹے ہو۔ وہاں تو یہ
خبر اڑ گئی ہے۔ کہ تم پتوں کے لیے اندر ہیرے جنگلوں میں چلے گئے۔ اب کبھی نہ
لوٹو گے

مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔ گوم نے دھلتا کہا۔ چلو سامنے پڑاو ہے۔ وہاں

سے لے کر دھنٹا لے لیں۔

میں دیکھتا ہوں تم کسی اور چکر میں یہاں آئے تھے۔

کیسا چکر... گوم نے سادگی سے پوچھا۔ وہ بھوک کی وجہ سے مذہبی ہوا جا رہا

تھا۔

گرو یہ معلوم کر کے بہت خوش ہونگے کہ چیلا اتنا سعادت مند بکا۔ ہلکیش
نے پھر خوش دلی سے کہا۔

گرو یہ معلوم کر کے بہت خوش ہونگے... کہ چیلا اتنا سعادت مند بکا۔ ہلکیش
نے پھر کوش دلی سے کہا۔

گرو کو تو خوش ہونا چاہیے۔ تین دن تین راتیں میں نے بھگوان کی لیا۔ کاظراہ
کیا۔ گوم نے معصومیت سے جواب دیا

بھگوان کی لیا کی ایک بھلک توکل میں نے بھی دیکھی۔ تیرمان لیے ایک
ہرن کے پچھے

بھاگ رہی تھی۔ مجھے آتا دیکھ کر فورا درخت پر چڑھ گئی۔

گوم کو سمجھ میں نہ آیا کہا ہلکیش کیا کہہ رہا ہے۔ وہ اوسیا ہلکیش کی بشاش شکل
دیکھتا رہا۔

امتاس کے پتے ہوا میں اڑتے ہوئے آئے اور پگڈی پر آ کر ان کے
چاروں اور گر گئے۔

ہر طرف خوبصورت درختوں پر زرد اور سرخ پتوں نے آگ ایسی لگا کر کھی تھی
۔۔۔ سارا باغ شام کی مختلف روشنیوں سے جھلما رہا تھا۔

بن دیوی... بن دیوی دور جھرمٹ میں کوئی بھجن گاتا ہوا جا رہا تھا۔ بن دیوی
تم در سے جھلک دکھا کر غائب ہو جاتی ہو۔

کبھی ہمارے گاؤں میں آ۔۔۔

کیا تمہیں آدمیوں سے ڈر لگتا ہے؟

گوتم اور اکلیش ہوا کی مدھم خوشبو حلقت میں اتارتے گھاس پر چلتے رہے۔۔۔
جب گھیوں کے ڈکرانے کا جھینگر جواب دیتا ہے اور گھنٹیاں بجتی ہیں۔۔۔ اس
سے بن دیوی ہرے کنجوں میں رقصان ہوتی ہے۔۔۔

طالب علم بھجن گاتا ہوا جھرمٹ میں غائب ہو گیا۔۔۔

بن دیوی..... کبھی اس کی جھلک دکھانی پڑ جاتی ہے۔۔۔

جیسے بہت دور گائیں چڑ رہی ہوں

یاد رختوں میں کوئی گھر چھپا کھڑا ہوا

رات کو بن دیوی کی آواز الی کی آتی ہے۔۔۔

جیسے کہیں دور گائیں چڑ رہی ہوں۔۔۔

یاد رختوں میں کوئی گھر چھپا کھڑا ہو۔۔۔

رات کو بن دیوی کی آواز الی کی آتی ہے۔۔۔

جیسے کہیں دور نیل گاڑیاں گزرتی ہوں۔۔۔

جیسے کوئی اپنی گھیوں کو پکارے

جیسے درخت اگرے۔۔۔

یا بہت دور کوئی چپکے چپکے روتا ہو۔۔۔

ذوق

بن دیوی جو کہ جنگلی پھول کھا کر جیتی ہے... جو جہاں جی چا ہے تھہر کر آرام کرتی ہے...

جو مہکتی ہے... جو سارے جنگل کی ماں ہے۔

گوم تم اور اکلیش گاتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ کچھ فاصلے پر بانسری بجاتے ہوئے لڑکوں کی ایک نوی آبادی کی اور جاری تھی... آج زراعت کی دیوی سیتا اور کھجتوں کے خدا کھیشتہ پتی کی عبادت کا تہوار تھا۔ گاؤں میں بڑی چہل پہل پہل تھی

بالآخر گوم تم تھک کر ایک درخت کے نیچے ٹھیک گیا۔

ایک طرف دیویاں ہیں۔ دوسری طرف اپسرا میں اور درختوں کی پریاں۔ دونوں وقت ملتے ان درختوں کے سائے میں کھڑے نہ ہوتا۔ اکلیش نے اسی طرح مصنوعی سنجیدگی سے کہا۔

کیونکہ درختوں کی پریاں انسانوں کو ورغا کے لے جاتی ہیں۔ دیکھنا کسی اور پاٹلی پتک کی بنیاد پر ہمیں نہ پڑ جائے

ارے یہ سامنے کون کھڑا ہے۔ گوم تم نے یہ درخت ہڑ بڑا کر پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا

کون۔ اکلیش نے کہا۔ مہاباہرت کے کوئی نے پوچھا۔ ہے تو کون ہے جو کہ کدم کے درخت کی ٹہنی جھکائے ہے۔؟ دیوتا ہے اے یکشی یا اپسرا؟ درختوں کے اسرار بہت گہرے ہیں گوم تم بھائی۔۔۔۔۔

کیسے درخت؟

گوتم تم بھولتے ہو کہ ہمیں لڑکیوں پر نظر نہ ڈالنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اکلیش نے دھڑا سنجیدہ ہوتے ہوئے جواب دیا اور آنکھیں بند کر کے ایک درخت کی اوٹ میں چلا گیا۔

گوم نے چونک کر دو بارہ سامنے دیکھا
کدم کے نیچے اجودھیا کے گھاٹ والی لڑکی کھڑی تھی

9

چمپک نے گوتم کو نہیں دیکھا۔ وہ نر ملائے با تین کرتی ہوئی دوسری پلگڈ غذی پر
مزگئی

انگلیش ایکل پھر پر بیٹھ کر وہیاں میں مصروف ہو چکا تھا۔ آواز شرم چلیں۔ اس نے ایک آنکھ کھول کر گوم کو مخاطب کیا
انہوں نے پھر راستہ طے کرنا شروع کر دیا
گاؤں کے قریب پہنچ کر گوم رک گیا۔ شرم میں کچھ کھانے کو ملتے گا۔۔۔
میں دیکھتا ہوں کہ تم بیحد مادہ پرست ہوتے چار ہے ہو۔۔۔

میں پوچھتا ہوں تمہاری کٹی میں چاول ہونگے؟
نہیں آج صحیح سے سب لڑکے سیتا کی پوچھائیں لگے ہوئے ہیں۔ ایک روز اور
پھوکے رہ لو
میں دکھتنا لے کر ابھی آتا ہوں
اچھا انگلیش چپ ہو گیا مگر جلدی آنا گوتم بھائی۔۔
بھائی انگلیش ابھی آیا۔۔

اکلیش سے پیچھا چھڑا کر وہ تیزی سے اس سمت روانہ ہو گیا جدھر لڑکیاں گئی
تھیں۔ جلدی میں کانٹوں پر دوڑنے سے اس کے پاؤں بھی زخمی ہو گئے
جمپک پڑا اور کے نزدیک پہنچی تو اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کے پیچھے پیچھے آ رہا
ہے۔ اس نے پٹ کر دیکھا

اس کے سامنے وہ سر جو کوتیر کر پار کرنے والا لڑکا کھڑا تھا جس کی کالی آنکھیں
تھیں اور کھلی رنگت اور جس نے برہمن طالب علموں کا سفید لباس پہن رکھا تھا
مجھے معلوم تھا کہ ایو دھیا والے ادھر آئے ہوئے ہیں۔ میں نے سوچا کہ آج کی
بھیک ادھر سے ہی لے لوں۔ وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

تم کہاں پڑھتے ہو؟ جمپک نے پوچھا
ادھر کل پتی گروپ شو تم کے آشرم میں۔

جنگل میں بن دیوی کا بھجن تم ہی گا رہے تھے
کہہ نہیں ستا کہ میں کون ہوں اور جو بھجن گا رہا تھا وہ کون ہے

اچھا یہ بات ہے؟ آ کسی روز مجھ سے بحث کرو۔ جمپک نے قبسم کے ساتھ کہا

اس جگ میں ماتیری اور گارگی کی جانشین بننے کا تمہارا ہی ارادہ ہے۔ وہ فورا
بحث پر تیرا ہو گیا

ارادہ ایک نہایت فضول لفظ ہے۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ عام طور پر الفاظ
کے معنی نہیں ہوتے۔ تمہارے مضامین کیا ہیں؟

فلسفہ... اخلاقیات.... اور... پھر گوم دفتا جھنجھلا کر چپ ہو گیا... یہ لڑکی اسے
بیوقوف بنارہی تھی
تم تصویریں بناتے ہو؟
ہاں.....

میں نے سنا ہے کہ گروپ شوم کے آشرم کا گوم نیلمبر تصویریں اچھی بناتا ہے
تباہی شکل دیکھ کر لگتا ہے کہ تمہارا نام ہی گوم نیلمبر ہو سکتا ہے۔ میں انہوں کے
اسرار کی بہت قائل ہوں۔ تم ناموں کے اسرار کے قائل نہیں ہو؟
میں وہی ہوں جس کا تم نے شاید چند احمدقوں سے ذکر نہ ہوا اور تم نے ٹھیک نہ
ہے

تو غالباً تم بھی میری تصویر بناؤ گے۔ آج صحیہ بہانے سے چتر کار آئے تھے
میں پرستما کاریک ہوں۔ صرف تخيّل کی بنا پر دل کی آواز ان کر تصویریں
بناتا ہوں

اس نے ذرا خیر سے کہا میری قدر و شو اکرم الوہی مصور تک کو کرنا پڑئے گی جو
کہ سب سے بڑا چتر کار ہے
وشو اکرم... تو تم ملحد نہیں ہو؟ آج کل تو طالب علم کپل اور شاکریہ منی کے زیادہ
قابل ہیں

مجھے آٹا لا کر دو۔ میرا راستہ کھوٹا ہوتا ہے۔ گوم نے زرا بگڑا کر کہا۔ اس لڑکی کو
دوبارہ دیکھنے کے لیے وہ مدتوں گھوما گھوما پھرا تھا اور اب جب کہ وہ اس کے سا
منے تھی تو وہ کھڑا کھڑا اس سے جھگڑا کر رہا تھا۔ کیونکہ اسے یک لخت یا احساس ہوا کہ

وہ اس کی اپنی چیز تھی اس کے اپنے وجود کا... اپنے ذہن اور دل کا ایک حصہ... یہاں دونی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کسی تکلف۔ غیریت یا حجاب کی گنجائش یا ضرورت نہ تھی وہ اسے ازل سے جانتا تھا

اس نے دوسری لڑکی پر نظر ڈالی جو کہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ گوم نے اسے پھر ذرا بھی سے دیکھا۔ یہ لڑکی ہری شنکر کی بہن تھی جمپک خیسے کے اندر جا کر آٹا نکال لائی۔ اور گوم کے کشکول میں ڈال دیا اب جاو۔ پھر کبھی آنا۔۔۔ جمپک نے کہا

وہ اسے پر نام کر کے پڑا و سے باہر آگیا۔ اسے اب تک یہ معلوم نہ تھا کہ یہ دونوں لڑکیاں کون ہیں۔ اور راجن کے لاوشنکر سے ان کا کیا تعلق ہے۔ خیموں کے آس پاس نا کی طرح کی بہت سی لڑکیاں گھوم رہی تھیں۔ مگر یہ دونوں اس ہجوم میں سب سے علیحدہ اور ممتاز نظر آتی تھیں۔

یہ دونوں کون ہیں۔ اس نے بڑی ہمت کر کے ایک بڑھیا سے پوچھا جو کہ تیز تیز قدم رکھتی رسولی کی طرف جا رہی تھی

بڑھیا نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے اسے گھورا۔ تم تو بہمچاری نظر آتے ہو۔ اس نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ پھر تم کو یہ جان کر کوئی دلچسپی نہ ہونا چاہیے کہ ان میں سے ایک راج گرو کی بیٹی چمپاوت ہے۔۔۔ اور دوسری راج ماری نزل ہے اور یہ دونوں راجن کے ساتھ کھیدا کے لیے جا رہی ہیں اور تم آئندہ ادھرنہ آنا۔ آج کل بہت سے چورا چکے سنیا سیوں کا بھیں بدل کر ٹھگی کرتے پھرتے ہیں۔۔

کلئی کہیں کی چڈیل۔۔۔ گوم نے چکے سے کہا اور آشرم کی طرف روانہ ہو گیا

دوسرا دن وہ چادر پیٹ کر پھر پڑا وہ کی سمت چل کھڑا ہوا۔ سارے میں گھوما
مگروہ اسے نظر نہ آئی۔ [راج گھرانے کی لڑکیاں یوں بھی جمع عام میں سامنے نظر
نہ آتی تھیں] ممکن ہے کہ وہ اندر کسی زرفت کے شامیانے کے نیچے کسی طوطے کو
بیٹھی پڑھا رہی ہو۔ یہ سوچ کر وہ مسکرا یا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ طوطوں کو پڑھانا
امیرزادیوں کا مشغله ہے۔ ممکن ہے کہ وہ پاکی میں بیٹھ کر سیر کرنے کے لیے شہر
چلی گئی ہو وہ شراوی کی طرف مڑ گیا۔ جہاں سڑکوں۔ بازاروں اور جھروکوں میں
بہت سے چہرے نظر آئے جو کہ ایک جیسے تھے۔ وہ پھر باغ کی سمت لوٹ گیا۔ شا
ہی خیسے میں کائک پور نیما کے تھوار کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ ان گنت لڑکیاں
پھول سنبھال لے ساز اٹھائے اور سے اہر سے اہر جا رہی تھیں۔ رنگ برلنگی ساریاں پہنے
ہری شاخوں کے نیچے رقص میں مصروف تھیں۔ ان میں جمپک کون ہی ہے۔ اس
نے ہڑبرڑا کر سوچا۔ کیونکہ اب اسے ہلاکا سا شبهہ ہوا کہ عورتیں سب ایک سی ہوتی
ہیں۔ ان میں سے جمپک کون ہے۔ اس نے ذرا چنچھے سے ل میں کہا
میں یہ ہوں۔ کدم کے درخت کے پچھے سے کو دکروہ نیچے اتر آئی۔
وہ اور زیادہ پریشان ہو گیا۔

تم بھی اداس ہو۔ میں اس اداسی سے اب عاجز آچکی ہوں۔ کل سے نرملا بھی
بہت رنجیدہ ہے۔ اُو ہمارے ساتھ ناچو۔
میرا خیال تھا کہ تم میرے ساتھ بحث کرن اچا ہتی تھیں۔
فی الحال تو میرا بھی ناچنے کو چاہ رہا ہے۔
نسل کیوں رنجیدہ ہے۔

اس کا بھائی راج پاٹ چھوڑ کر غائب ہو گیا ہے۔ یکل تھیں دیکھ کر اسے اپنا
دلارا بھائی یا دماغ گیا

آنند نے بھی دنیا ترگ دی تھی یہ را ہیں بہت کھشن ہوتی ہیں۔
ٹھیک کہتے ہو....

اس کے بھائی کا نام کیا ہے؟
مہارا جھمار ہری شنکر....

اور اس نے دنیا.....

دنیا کے علاوہ اس نے اور بہت کچھ تیاگ دیا۔ گدھا کہیں کا۔ جمپک نے گوتم
کی بات کافی

گوتم نے اسے دھیان سے دیکھا
تاہے آنند نے اپنی چیختی سندھی کو چھوڑ دیا تھا اور وہ بھی سدھارتھ گوتم کے
ذراء سے کہنے پر
تو پھر تمہارا مطلب؟

میرا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں لاکھوں سندھیاں اور ہوں گی اور لاکھوں آنند
اور ہری شنکر۔ یہ چکر تو بہت وسیع ہے جمپک رانی
تیاگ کا فلسفہ خودا پنی جگہ ایک اور چکر نہیں؟

اس سندھی کو کیا اس بات کا بہت رنج ہے۔ گوتم نے تجھاں عارفانہ سے کام
لیتے ہوئے پوچھا
وہ خاموش رہی۔...

اور اگر آئندہ والپس آجائے تو.... کیونکہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ ابھی پورا راستہ نہیں بن سکا۔ اس کی ارہ کی مشکلیں ابھی باقی ہیں۔ وہ بار بار لوٹ آتا ہے۔ وہ ابھی پوری طرح آزاد نہیں ہوا۔

یہ تو بہت بڑی خبر ہے۔ جمپک نے کہا۔ کیونکہ آزادی بڑی بھاری چیز ہے۔ اس سے کہنا کہ کیا وہ بھول گیا۔ کہ شاکریہ منی نے مہماں سے کیا کہا تھا؟

کیا کہا تھا؟ گوم نے زراچڑ کر پوچھا

شاکریہ منی نے کہا تھا۔ اے مہماں جس طرح نانک کے ناج گا نے۔ وینا بجائے مصوری اور دوسری کلاوں کی مہارت بتدریج حاصل ہوتی ہے اسی طرح ارہست بھی ایک دن میں نہیں بن جاتا ہمارے مہاراج مارنے بھی تو تیاگ کو ایک قسم کی کلام بھر کھا ہے

وہ باتیں کرتے کرتے تالاب کی منڈپ پر بیٹھ گئے جو کہ خیمہ گاہ کے عقب میں تھا۔ دور سے آشرم کے جھونپڑے نظر آرہے تھے۔ جن پر پھیلی ہوئی کدو اور لوکی کی ہری بیلیں آنکھوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن تم کچھ کہنا چاہتے ہو۔ کیا بات ہے؟ جمپک نے سوال کیا

اظہار۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ اظہار نہیں کر ستا۔ اسارے اظہار کا ایک مقصد ہے جو کہ اظہار سے ماوراء ہے۔ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ چلو میں تمہیں اپنی تصویریں دکھاو۔ اس نے گرد بڑا کر کہا

اس کا مجھے کیا فائدہ ہوگا۔ اس نے بنشاشت سے پوچھا تم سمجھتی ہو کہ میں بالکل غما تختیل پرست مخرا ہوں۔ جیسے سب طالب علم ہو

تے ہیں۔ مگر جمپک رانی ایک روز تم سنو گی کہ شراویتی کا گوتمن نیلمبر بہت بڑا چڑ
آچاریہ بن چکا ہے۔ اس نے بچوں کی طرح غصہ سے کہا اور پھر جمپک کو دیکھنے لگا
کہ شاید وہ خفا ہو گئی اور اب اسے ترکی بڑ کی جواب دے گی۔ مگر وہ چپ رہی
وہ منڈر پر خاموش بیٹھی رہی۔ کیونکہ اسی طرح آج سے چند سالا پہلے ہری نے
اس سے کہا تھا۔ تم مجھے نکما اور تخلیل پرست مسخرہ سمجھتی ہو جیسے سب طالب علم ہوتے
ہیں۔ لیکن ایک روز تم سنو گی چمپا رانی۔ کہ ایودھیا کا مہاراج مار بہت بڑا ریاضی
دان بن چکا ہے

اظہار مقصد سے ماوراء ہے۔ ویدانت میں آیا ہے۔ کہ آتما کو اپنی خواہشوں کے
زیر اثر کائنات سراب کی ایسی دھلائی پڑتی ہے۔ جس طرح پیاسے ہرن کو ریگستان
میں ندیاں نظر آتی ہیں۔ اسی مرگ ترشنا نے مجھ کو۔ ہری کو بہت پریشان کیا تھا
مقصد کیا ہے؟ اصل مقصد کیا ہے۔۔۔ وہ منڈر پر پرے اٹھ کھڑی ہوئی۔۔۔ اگر
تمہارا آئندہ تمہیں کہیں ملے تو اس سے کہ دینا سندھی مرگ ترشنا سے بھی آزادا ہو
چکی ہے اسے فکر نہ کرنا چاہئے

تم۔۔۔ یہ خبر صحیح ہے کہ ویہار میں جانے والی ہو۔۔۔؟

شاید۔۔۔ کیا حرج ہے؟۔۔۔ یہ تجربی بھی کر دیکھنا چاہئے۔۔۔ سجرا نی نے تو اپنی
ہمکھیں اکا کر دی تھیں۔ کہ دنیا کی ترغیبات سے بچیں
جمپک تمہاری عمر کتنی ہے؟

کئی سو سال۔۔۔ اتنے سو سال کہ مجھے بھی یاد نہیں رہا۔ اس نے نہس کر کہا
چند روز ہونے میں نے بھائلوں سے بھیشم اور ارجمن کا قصہ سن کر یہ سوچا تھا

کچتر انگلداور الوبی کیسی رہی ہوں گی۔

مجھے دیکھ کر تمہیں معلوم ہو گیا۔۔۔ وہ پھر نہیں۔۔۔ اور اس نے کہا۔۔۔ تم تو پر۔۔۔ تما کاریک

پاں

لیکن تم بھولتی ہو کہ ہر فن پارہ نام و ت اور روپ و ت کا امتزاج ہے۔ ایک
سے کان دوسرے سے آنکھ آشنا ہوتی ہے۔۔۔

لیکن جو شے خالص ماہیت ہے.. جس کا ادراک خالی عقل کے زریعے کیا جاتا ہے.. اسے محسوس نہیں کیا جاستا.. ورنہ تم خود اپنے نظر یے کی تردید کر رہے ہو خالص ماہیت صرف ماہیت ہے موزونیت نہیں.. گوتم نے جواب دیا... کسی مادی علامت کے زریعے اس کی طرف اشارہ کیا جاستا ہے اسے مادی علامات سے مماثل نہیں سمجھ جاستا
آکاش رو پم لکھیا..... چمپک نے فس کر کہا
خالص بہیت... گوتم نے جوش سے بولنا شروع کیا.. وجود کی تشریح کرتی ہے خود اس کا وجود نہیں..

تم کیا بننا چاہتے ہو؟

میں تم کو بتاؤں گا ایک دن ضرور بتاؤں گا کہ میں کیا بنانا چاہتا ہوں۔ تم میرے گرو سے نہیں ملوگی؟

نہیں.....میں نے ایودھیا میں اپنے اساتذوں سے تھا پڑھا ہے کہ وہ لوگ مجھے پڑھا پڑھا کر آتا گئے۔ دیکھو تو نرملا کے کتنے مزے ہیں۔۔۔ دن بھر سنگھار پتار میں

مگن رہتی ہے... ناج اور گانا سیکھ چکی ہے... پڑھنے میں اس کا جی نہیں لگتا۔

نر ملائمہاری بہت دوست ہے؟

وہ ہماری اور تہاری جہا راج ماری ہے

پڑھنا تو اس کا بھی فرض ہے

اس کا فرض ہے کہ اب وہ گھر سائے... جمپک نے بزرگوں کی طرح کہا... تم

بھی تو انہا بر جھا پری کا زمانہ ختم کر کے بیاہ ویاہ کر ڈالو گے.....

پیچھے سے چھا گل کی آواز آئی... نر ملا بہت سارے چھول لوکری میں اٹھائے مانی بنے ہوئے گلڈنڈی پر سے آرہی تھی... گوتم کو دیکھ کر اس نے لوکری منڈ پر پر رکھ دی... اور ہاتھ جوڑ دیے... گوتم نے برے پہنچ ہوئے اور مقدس برہمن کی طرح اسے آشیر با ودی اور اٹے پاؤں لوٹ گیا.....

علاوہ تصویریں اور مجسمے بنانے کے تم ناٹک بھی اچھا کھیل سکتے ہو... جمپک نے بیٹاشت سے کہا اور گوتم کو درختوں میں او جھل ہوتا دیکھتی رہی

..... ۱۰

مبارک ہیں وہ جن کو شانتی میسر آ چکی ہے... جمپک نے دل میں دھرا لیا اور اسے گوتم سدھا رتھ کا وہ وعظ یاد آ گیا جو کہ انہوں نے گیا میں دیا تھا... ساری چیزوں میں... اے پروہت آگ لگی ہے... انکھیں آگ میں جلتی ہیں اور اشکال اور بصیرت... حیات... فور شوق... آوازیں... خوشبوئیں... ذہن و دماغ... جسم... تصورات... سب دھڑ دھڑ آگ میں جل رہے ہیں... اور انفرت اور محبت اور پیدائش اور بڑھا پے اور موت اور رنج والم اور دکھ اور گریز اری اور مایوسی نے اے

پروہت یا الوتیار کیا ہے...

آشرم کا طالب علم اڑکاوا پس جا چکا تھا۔ جنگل پر واٹی ہوا میں سمنارہا تھا
درختوں کے نیچے سے چند بھگونیاں کشکول سنجھا لے اپنی جھونپڑیوں کی طرف وا
پس جا رہی تھیں ان کے چہروں پر کس قدر سکون تھا کیونکہ وہ ندی میں داخل ہو چکی
تھیں... اس راستے پر چل رہی تھیں جہاں سے کبھی واپسی نہیں ہوتی۔ کیا میں بھی
ندی میں داخل ہو سکوں گی۔ جمپک نے اداکی سے سوچا۔ مبارک ہیں وہ... اس نے
دل میں دہرایا۔ اس نے پٹ کر خیمہ گاہ پر نظر ڈالی۔ جہاں جشن کی تیاریاں کی اج
رہی تھیں۔ پھر وہ چپکے سے منڈیر سے اتر کر اس پلڈنڈی پر آگئی۔ جدھر سے گوت
اپنے آشرم کی طرف اور لوٹا تھا۔ اور جس پر سے گزرتی ہوئی بھگونیاں ندی کے
کنارے اپنی جھونپڑی کی طرف گئی تھیں

جمپک درختوں کی ٹہنیوں کو اپنے سامنے سے ہٹاتی راپتی کی طرف روانہ ہو گئی
سامنے کچھ فاصلے پر کئی تھی۔ جس پر تریں کی بیل پھیلی تھی... اور اس میں سے گانے
کی آواز بلند ہو رہی تھی... یہاں اس نے سن رکھا تھا کہ بزرگ ترین راہبہ سمن رہتی
ہے۔ جو کہ کوشل دلیں کے ایک راجہ کی بہن تھی اور پچاس سال سے سنبھال کی اس
کئی میں رہتی آئی تھی

شر و اسی بھگونیوں اک سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس وقت ان کی ٹولیاں بھیک
ماگ کر لوٹ رہی تھیں ان میں ہر طبقے اور ہر عمر کی عورتیں شامل تھیں۔ جمپک
حیرت اور اچنچھے سے ایک طرف کھڑی ان کو دیکھتی رہی۔ انہوں نے کام لوک فتح
کر لیا ہے اور برہم لوک میں داکل ہو چکی ہیں.... کیا میں بھی کبھی کام لوک فتح کر

سکوں گی... اے گوتم نلہبہر کی بات یاد آئی... اے ہری شنکر کا خیال آیا... جو کہ برسوں سے اس کے دل میں رہتا تھا.. ان بھگوئیوں نے کام لوک کس طرح تنفس کیا... وہ سوچتی رہی مگر اس کی ہمت نہ پڑی.. کہ ان کے قریب جا کر ان سے بات کرنے... وہ جوز رتار بنارسی سارہی اور سونے کے زیورات سے مزین تھی.. وہ جو جی بھر کر راگ اور رنگ کی دنیا سے محظوظ ہوتی تھی.. حیات کی کنیز جو جب سے اس لڑکے سے باٹیں کر کے آئی تھی جی بھی میں ایک نامعلومی خوشی کی کیفیت محسوس کر رہی تھی وہ ایسی حقیر بندی... ان اوپنجی.. پورت.. دیوبالا دوں سے کیا بات کر سکتی تھی...؟

بہن.... ادھر آؤ... ہاں کا ہے کوکھڑی ہو... ان میں سے ایک نے گویا اس کی شنکش کو بھانپ لیا.. ادھر آؤ... ہمارے سنگ بیٹھو.. ایک بھگوئی نے قریب آ کر بڑی شفقت سے اے کہا...
میں..... دیوی سمن سے مل سکتی ہوں....؟

ہاں کیوں نہیں... بہن سمن تو تمہاری ہی راہ دیکھ رہی ہیں
ڈرتے ڈرتے جمپک اس نوجوان بھگوئی کے ساتھ کٹی میں داخل ہوئی
سامنے سمن پیٹھی تھی.. جوش عقیدت سے جمپک کا گلہ رندھ گیا... اور اس کو اپنے جسم میں جھجھنا ہٹ ایسی محسوس ہوئی۔ یہ ری کرشن کی پچارن جمپک کسی خدا کو نہ ماننے والی راہبہ سمن کے آگے جھک گئی..

باہر اندر ہیرا چھارہا تھا... سمن ان سب سے الگ مرگ چھالے پر پیٹھی تان پورہ بجا بجا کر گا رہی تھی...
یہ گانا راہبہ چنانے راج گیر کی چوٹیوں پر گایا تھا...

گوکہ میں کمزور اور دکھلی ہوں اور میری جوانی ختم ہو چکی ہے
اور میں لاٹھی کے سہارے پھاڑ پر چڑھی ہوں۔ اور میری چادر میرے کندھے
سے لٹکی ہے۔

اور میرا کاسہ الثا ہے۔

چٹان کے سہارے کھڑے ہو کر میں نے اپنی خودی کو سہارا دیا ہے۔

اور آزادی کی ہوا میرے چاروں اور منڈلا رہی ہے

بدهکی خواہش پوری ہوئی

جمپک کئی کی دلیز میں بیٹھی رہی۔ بھگونیاں گارہی تھیں۔ یکلکت جمپک نے
ٹکرایا کہ وہ اپنی بنا ری سارھی یہیں پھینک کر اور کیسری دھوتی پیٹ کران سے
آن ملے گی ان لوگوں کے اور اس کے درمیان مغائرت کی جو دیوار اکھڑی ہے اس
کو وہ اپنے اس لباس اور اس زندگی کے ساتھ بھی بھی عبور نہیں کر سکتی۔

مجھے کچھ گوتی کے بارے میں بتاؤ۔۔۔ کچھ شاکیہ منی کے بارے میں۔۔۔ اس
نے ڈرتے ڈرتے سمن سے کہا

سمن خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ ایک لمحے کے لیے جمپک کو ڈر
سا گا۔ ان آنکھوں میں گزرے ہوئے وقت کی چھالیا جھلما رہی تھی اور جمپک کو
معلوم تھا کہ سمن کتنی بوڑھی ہے۔ اور جمپک کو وقت سے ڈر لگتا تھا۔

مجھے کچھ اپنے سنگ کے بارے میں بتاؤ۔۔۔ اس نے ہڑ بڑا کر دوبارہ کہا
سمن اٹھا رہ برس کی عمر میں اپنا راج گھرانہ تج کرنگھے میں شامل ہوئی۔ وہ میں
سال کی تھی جب شاکیہ منی نے مہا پری نزواں حاصل کیا۔ اس کو گئے اسی سال ہو

چکے تھے۔ اٹھا رہ برس کی عمر میں راج ماری سمن کے حسن کی شہرت دوڑ دوڑ تک پھیلی تھی۔ اب ایک اٹھانوے سالہ بوڑھیا پھونس گھیر و لباس پہنے اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ دنیا تج کر بھی اسے کیا ملا تھا؟ جمپک کے دل میں کسی چور نے پوچھا۔ اگر میں نے دنیا چھوڑ دی تو مجھے شانتی مل جائے گی؟ اور اگر یہاں بھی شانتی نہ مل تو؟ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر اس نے آہستہ سے سمن کی ساری کے کنارے کو چھوڑا۔ سمن گزرتے ہوئے وقت کی گواہ۔ شاکریہ منکرے قدموں میں بینہ چکی تھی۔ جیت دون ویہار کی گندھ کی معطر کرہ جس میں مہاتما بدھ رہتے تھے۔ میں داخل ہو چکی تھی۔ کنڈل کیشی سے مبایش کر چکی تھی۔ جمپک نے اس کی ساری کے کنارے کو چھوڑا اور اسے محسوس ہوا۔ جیسے اس لمس کے زریعے وہ شاکریہ منی تک بھی پہنچ گئی ہے۔ اور اس احساس سے اسے ایک لمحے کے لیے بڑا سکون ملا۔۔۔۔۔

روہنی ندی کے کنارے شاکریہ منی کا وعظ سنبھل کے بعد ملک کے پانچ سو امراء نے دنیا تیاگ دی تھی۔ ان کی ڈیباں شاکریہ منی کی خالہ اور سوتیلی ماں پچاپتی کے پاس آئیں۔ جنہوں نے اپنے شوہر کے مرنے کے بعد رہبانیت اختیار کر لی تھی۔ اور انہوں نے پچاپتی سے کہا کہ ہم بھی ترک عالق کے خواہش مند ہیں۔ شاکریہ منی نے ان کا سنگھ قائم کیا۔ اور شہزادیاں اور گرہستیں اور ہر طبقے اور ہر عمر کی لڑکی بھگوانی بننے لگی۔ ان کے نگموں سے جنگل اور روادیاں گونج اٹھیں۔ وہ گروکی چیلی بن کر بعد میں خود گروہ بنتیں۔ دوسروں کو پڑھاتیں۔ دھرم کا پرچار کرتی تھیں۔ علمی مباحثوں میں حصہ لیتی تھیں۔ پنا جو کہ پہلے چند رجھاگ ندی کے کنارے پیدا ہوئی تھی۔ اور جس نے اب کے سے شروع اسی کے ایک امیر گھرانے میں جنم لیا تھا۔۔۔ اور

جس نے جوئی ہی میں ارہت کا درجہ حاصل کیا۔ اور دھیرا اور بھدر را اور بھی روپ نندھے اپنے حسن پر بڑا ناز تھا۔ اور بھارس کی ویشا اور حاکاشی اور اتنا جو کہ پہا جنم میں داسی تھیں۔ اور دوسرے جنم میں شرواستی کے ایک سیٹھی کے یہاں پیدا ہوئی اور راجہ بھیم بسیرا کے پروہت کی لڑکی سو ما جو کہ جیت ون کے نیم تاریک کنج میں بیٹھی تھی۔ اور مارا [ابیس] نے ... ہوا میں نمودار ہو کر اسے مخاطب کیا۔ کہ اس عورت جس کے پاس صرف دو انگلیوں کا احساس ہے۔ تو اس میدان کو تغیر نہیں کر سکتی جس پر بڑے بڑے رشی منی چلتے ہوئے گھبرا تے ہیں۔ [کیونکہ عورت جو کہ سات آٹھ سال کی عمر سے رسولی میں چاول ابا لانا شروع کرتی ہے اور سارے وقت یہ دیکھنے کے لیے کہ چاول گلے ہیں یا کہ نہیں انہیں ڈولی سے نکال نکال کر اپنی دو انگلیوں کی مدد سے مسل مسل کران کی کتنی دیکھتی ہے] پرسونے مارا کو مار بھگایا۔ اور ارہت بن گئی اور ویشا لی کی طوائف و ملا اور ویش لی کے پہ سالار کی لڑکی سہا جس نے گایا۔ ... میں جسے چیزوں کا ... کیا۔ کیوں بہت ستاتا تھا۔ اور گزر تے وقوں کی یاد بہت تگ کرتی تھی۔ میں نے خود کشی کی تھانی۔ بتا کہ پھر سے اس دنیا میں ڈیل زندہ ہوں۔ مگر مجھے راستہ مل گیا اور بدھ کی خواہش پوری ہوئی۔ اور شرواستی کی براہمن زادی ملتا اور ویشا لی کی رقصاصہ امباپا لی اور نہس و قی شہر کی سندھی نندھا اور راج گیر کی شہرے بالوں والی کنڈل کیشی جو کہ ایک ڈاکو کے عشق میں دل شکستہ ہو کر پہا جیں سنیا سن بنی اور جو کہ سب کی ٹھنی ہاتھ میں لے لے کہ گاوں گاوں لکارتی پھرتی تھی۔ کہ کوئی ہے کہ جو آن کر بحث میں مجھے ہرائے۔ اور چندرا اور راج گیر کی ملکہ بھیم جو کہ اپنے حسن پر بڑی مغروف تھی۔ اور جس نے بانس کے

جہنڈ میں پہلی بار شاکیہ منی کو دیکھا اور خوبصورت امیرزادی انوپم اور مہارانی کھیم کی سیلی و بے اور سبھارانی... آم کے باغ میں ایک نوجوان نے ان پر ڈورے ڈالنے چاہے تھے تو جنہوں نے اپنی آنکھیں نکال لی تھیں

یہ سب اب دوبارہ پیدا نہیں ہو گئی کیونکہ انہوں نے ارہت کا درجہ حاصل کر لیا تھا... یہ سب ندی میں داخل ہو چکی تھیں.... باہر کوئی اسے آواز دے رہا تھا... وہ کئی سے نکلی... خواصیں اور ہر کارے اسے ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک آن پہنچے تھے کیونکہ جشن کے لیے خیموں میں اس کا انتظار کیا جا رہا تھا... عورتوں کے متعلق ہمارا روپیہ کیا ہونا چاہیے...؟ سوال قبل یہیں شروعاتی میں ایک اہم سوال کیا گیا تھا....

ان کی طرف دیکھنا بھی نہیں آئند... جواب ملا تھا

لیکن فرض کیجیے وہ نظری آجائیں

ان سے بات مت کرنا

لیکن اگر وہ خود سے بات کرنے لگیں تو....؟

برابر جائے رہنا.....

کئی راتوں تک متواتر جاگتے رہنے کے بعد دفتراً گوتم کو نیند کا زور دار جھونکا ہگیا۔ لیکن کوشش کر کے اس نے اپنی آنکھیں کھلی رکھیں

طالب علمی کے زمانے میں جب وہ آشرم میں یا کتب خانوں میں مختلف کتابیں پڑھتا تو عجیب و غریب متفاہ نظریے عورتوں کے متعلق اس کے مطالعے میں آتے... مہابھارت کی بارہویں کتاب میں لکھا تھا کہ عورت کبھی غیر مقدس ہو

دوف

ہی نہیں سکتی... لیکن تیر ہو یہ کتاب کا بیان تھا کہ عورت ہی ساری براٹیوں کی جڑ ہے۔ اس کی طبیعت میں اوچھا پن ہے۔ اسور یہ کہ اچھے گھر انوں کی خواتین طوالیوں کے مابوسات اور گھنے پاتوں کو رشک کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ سا اور چونکہ سارا شر پیدائش کی وجہ سے ہی ظہور میں آتا ہے۔ اور عورت پیدا کرنے والی ہے لہذا عورت ہی دنیا کے سارے شر کی ذمہ دار ہے۔۔۔ اور یہ عورت صرف محبت کی بھوکی ہے۔ اور سخت ناقابل اعتبار

لیکن اسی صحیفے میں یہ بھی لکھا تھا کہ ان سب کمزوریوں کی باوجود عورت کی عزت کرنا چاہئے۔ ساتھ ہی ساتھ عورت کو دیوی کا درجہ حاصل تھا۔ اس کی وفاداری۔۔۔ شرافت۔۔۔ شرم و حیا کی روشنی قسمیں کھاتے تھے۔۔۔ لیکن شرواستی کی ویشاں میں اور ناٹک میں ادا کاری کرنے والی نایکا میں اور سیاسی خدمات انجام دینے والی جاسوسی عورتیں اور ووش گینیاں میں بھی تو عورتیں ہی تھیں

اور اروٹی نے اپنے چاہنے والوں سے کہا تھا کیوں اپنی اجتن کے پیچھے ہاتھ دھو کو پڑئے ہو۔۔۔ خود کو بھیڑیوں کے پنجوں سے بچاو۔۔۔

عورتوں سے دوستی رکھنا ناممکن ہے کیونکہ ان کے دل بھیڑیوں کے مانند ہوتے ہیں۔۔۔

اور دوسری طرف گندھاری تھی۔۔۔ جس نیا پنے اندھے مگنیٹر کی خاطر خود بھی اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لی تھی اور انو سیا اس قدر روفا شعار تھی کہ اپنے پتی کو خود اپنی سوتن کے گھر پہنچانے کے لیے گئی تھی اور کہیں پر یہ بھی لکھا تھا کہ پتی ورتا عورت کے لیے دوسرے آدمی سائے کے سماں ہیں۔۔۔ اور منوہ بہاراج نے کہا تھا کہ جس جگہ

عورتوں کی عزت کی جاتی ہے وہاں دیوتا خوشی سے رہتے ہیں
لیکن شاکریہ منی نے کہا تھا... عورت بیوقوف ہوتی ہے آئند... عورت حاصل
ہوتی ہے آئند... عورت بدباطن ہوتی ہے آئند... عورت سے پچھو... عورت سے پچھو
ناری برتی ہے... محمد شر

ایک مرتبہ شاکریہ منی اپنے بارہ سو چھیلوں سمیت اسی جیت ون میں موجود تھے
جو کہ جھیل کے اس پار نظر آ رہا تھا... اور راجہ پر سین جیت نے ان کی دعوت کی تھی
.... اور انند جو کہ کہیں باہر گیا تھا... اس دعوت میں نہ پہنچ سکا تھا

خوبصورت آئند نے اپنا کشکول اٹھایا اور بیشہ کی طرح سوچ میں ڈوبا شہر میں
بھیک مانگنے کے لیے نکل گیا... اس کے لیے کشتیری اور چنڈال سب برادر تھے... اور
اسے اپنی نیک نامی کا بڑا خیال تھا... اور بڑے وقار کے ساتھ اس نے شہر کی پناہ کی
خترق عبور کی... اور شرواستی کے چھانک میں داخل ہوا... اور بھیک مانگنے مانگنے ایک
مشہور رقصہ کے دروازے پر پہنچا... اور رقصہ کی لڑکی اس پر عاشق ہو گئی اور اس
نے ایسا جادو ڈالا کہ بچارہ آئند کھشنا لیتا بھول کر سیدھے اس کے گھر میں داخل ہو
گیا

اور شاہی محل کے ایوان ضیافت میں بیٹھے بیٹھے شاکریہ منی کو علم ہوا کہ آئند بڑی
آفت میں مبتا ہے اور انہوں نے دوسرے چیلے کو اس کی دشگیری کے لیے روانہ کیا
اور شاکریہ منی نے آئند سے کہا... میں اپنے پری زروان کے بعد چاہتا ہوں کہ تم
سب میرے خاص چیلے... بودھی ستو... مہا ستوا اور ارہست... مکمل نجات حاصل کر
نے کی بجائے آخری ٹکپوں میں دوبارہ پیدا ہونا منتظر کرلو... تم طالب علموں... عام

آدمیوں... بادشاہوں... وزیروں... امیروں... برہمچاریوں جملگہ طوائفوں اور بیواؤں اور بدمعاشوں... اور چوروں اور قصابوں اور بساطیوں کی صورت میں جنم لو... بتا کہ تم ہر طبقے کے انسانوں میں گل مل کر انہیں لکھتی کاراستہ دھلا سکو... صرف مر تے وقت اپنی اصلیت ظاہر کرنا ورنہ بدعتی تمہیں در غلامیں گے۔

اگر کوئی چیلا اپنے پہاڑ کلپ کی عادتوں کو ترک نہ کر سکا تو تم اس پر وہ اسرار منکشف کرنا جو کہ مجھ پر بودھی درکت کے نیچے کنول کے پھولوں کے درمیاں ظاہر ہوئے تھے

آنندابھی جب اس لڑکی نے تم کو بہ کلایا یہ مخف اس جنم یا اس کلپ کا اتفاقی حادثہ نہ تھا۔ کئی کلپوں سے تم اس کی کشش میں مبتا ہو... لیکن وہ پچھلے کلپوں کا بندھن اب ٹوٹ چکا ہے تم اور وہ اب آزاد ہو۔

آزادی کا مقصد کیا ہے؟ اس کے معنی کیا ہیں؟ اس کا فیصلہ کون کرنے گا کہ کون آزاد ہے اور کون نہیں؟ گوتم نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ ہری شنکر تم کو آزادی کی تلاش میں کیا ملا؟ آندجو اسرار تم پر منکشف ہوئے وہ تمہارے سوا کون جانے گا؟ ہم سب اپنے اپنے اسرار میں کسی دھرمے کو شریک نہیں کر سکتے

شاہی خیمه گاہ کی جانب سے جھانجھ اور شہنماں کی آوازیں بلند ہونا شروع ہو چکی تھیں۔ کبھی کبھی گھنٹھروں کی جھنکار سنائی دی جاتی تھی۔ چودھویں تاریخ کا چاند ڈولتا ڈولتا آشرم کے اوپر آگیا۔ اور اس کے اجائے میں پھلوں کی بیلوں سے ڈھکے ہوئے جھونپڑے انتہائی پر سکون نظر آ رہے تھے۔ اکاد کا چرانغ جل رہے تھے... باقی طالب علم سوچکے تھے۔ صرف اب تک وہی جاگ رہا تھا

جانے اس سے راجن کے پڑا اور پر کیا ہو رہا ہوگا؟ روشنی.. موسیقی .. اور رقص
اس نے اپنے ذہن میں چمپک کے تصور کو انہی تین چیزوں سے وابستہ کر کھاتھا
روشنی.. موسیقی .. اور رقص

وہ آہستہ سے اٹھا اور کاندھے پر چادر اچھی طرح لپیٹ کر دبے پاؤں آشرم
سے باہر بھکا اور مہوا کے باغ کی سمت روانہ ہو گیا۔ اس سے وہ بڑی بھاری چوری کر
رہا تھا۔ اور اس چوری پر شدت سے مسرو رہتا۔ اس کا سایہ زمین پر اس کے پیچھے
پیچے چلتا رہا۔ اس کے پیروں کے نیچے خشک پتیاں زور زور سے کھڑکھڑا رہی تھیں
۔۔۔ ایک گلہری اس کی آہٹ پر چونک کرتیزی سے بھاگی۔ ادھر ادھر دیکھتا ہوا کہ کوئی
اسے پہچان نہ لے۔ وہ دھیرے دھیرے سے مہوے کے باغ میں داخل ہوا
۔۔۔ جہاں مشعلوں کی روشنی تیز ہو رہی تھی۔ وسط میں منڈپ ایسا بنا تھا جس کے ایک
جانب سُنگیت کاراٹ کیاں سرمنڈل اور چھتارے اور جھانجھ لیے پیٹھی تھیں۔ راج
گھرانے کے مرد اور عورتیں چاروں اور جمع ہنسنے بولنے میں مشہک تھے ایو دھیا کے
لوگ رقص اور موسیقی میں اپنی مہارت کی وجہ سے سارے دلیں میں مشہور تھے
۔۔۔ اس مجمعے میں ہر شخص کلاونٹ جان پڑتا تھا۔

دفعتاً گوم کی نظر اس بوڑھی خادمہ پر پڑی۔ جس نے کل اسے ڈانٹا تھا۔ وہ ذرا
گھبرا کر ایک خیسے کی آڑ میں ہو گیا۔ اگر کوئی اسے دیکھ لے تو کیا ہو۔ وہ گوم
نیلمبر آشرم کا سب سے سعادتمند اور قابل طالب علم۔ مشہور لیکھک اور چتر کار۔
برہمچاری۔ اس سے چوروں اور آوارہ گردوں کی طرح ایک خیسے کے پیچھے چھپا
لڑکیوں کو ناچتا ہوا دیکھ رہا تھا

ناج...ناج...ناج

چھایا پتھ کھکشاں.. پر اپسرا میں ناج رہی تھیں۔ مرگ گھٹ میں کالی رقصاء
ہے۔ دل کے سنہرے ایوانوں میں شیونا چتا ہے۔ اور گولی میں تنور گردھاری۔۔۔
کیلاش پر او ما نا چتی ہے۔ اور یہاں راپتی کے کنارے۔ مہوا کے جھرمٹ میں۔۔۔
خزاں کے چاند تلمے وہ ناج رہی ہے۔ جسے کوئی ماری جمپک کہتا ہے۔ کوئی چمپا را
لی۔ کوئی چمپاوی۔ اس کے ہزاروں نام ہو سکتے ہیں کیونکہ اس کے ان گنت روپ
ہیں۔۔۔ اس کی ادا سی۔۔۔ اس کی بھنسی۔۔۔ اس کی مسکراہٹ۔۔۔ اس کا دکھ۔۔۔ اس کا ویراگ۔۔۔
اس کی سمرت۔۔۔ اس کی نفرت۔۔۔ یہ ایسے بھاؤ اور ایسے رس ہیں جنہیں بھرت منی بھی
نہیں سمجھ سکتے۔۔۔ کسی ٹلپ شاستر میں اس ناج کا ذکر نہیں۔۔۔ جو کہ میں نے اپنے دل
کی آنکھوں سے دیکھا۔۔۔ کسی نند کشور۔۔۔ کسی بھرت منی نے اپنی کتابوں میں اس کی
مددراوں کا تذکرہ نہیں کیا۔۔۔ اس ناج کے قوانین نہیں بنائے۔۔۔ یہ بڑی انوکھی راس
لیا ہے۔۔۔ یہ بڑا تم شرنگار دس ہے۔۔۔ کیا سازوں پر چھایا راگ الاپ رہی ہیں
۔۔۔ بزر طو طے پر سوار کام دیو اپنا پھولوں کا بان چلاتا ہے۔۔۔ اور پر اکراتی ملیا بن جاتی
ہے۔۔۔ شوکی تیسری آنکھ کے شعلے نے کا دیو کو جلا کر بھسم کر دیا تھا۔۔۔ لیکن کام دیو تو انگ
ہے۔۔۔ انسانوں کے دلوں میں موجود ہے۔۔۔ شیواس کا کچھ نہیں بگاڑ ستا
اور وہ اس طرح ناج رہی ہے۔۔۔ انوپاروئی نے دبی اوشا کی بجائے اسی کو بھرت
ناٹیم کی تعلیم دی تھی۔۔۔ رقص شہزادے ارجمن نے آسام کی چتر نگدا اور کھشن کی
راجھماری اترا کی جگہ اس کو اپنا شاگرد بنایا تھا۔۔۔ وہ جو سفید ساری پہنے کمدی اللسو کا

تھوار منارہی ہے اس نے بالوں میں کیسر کے پھول اڑس رکھے ہیں۔ اس کے جوڑے کور تنا جلی نے ڈھانپا ہوا ہے۔ اس کے گلے میں وجنتی مala ہے۔ جس کے صدف اور یاقوت۔ زمرداور نیلم اور ہیرے چاندی میں جھلما لاتے ہیں اس کے گلے کی مکٹاولی اور شیکر بارا اور سفید موتویوں کی سدھایکاولی کی چھوٹ اس کے چہرے پر پڑ رہی ہے۔ اس کے کانوں میں کرن پھول ہیں۔ اس کے کنول ایسے پیروں میں پد پد ما جگما رہی ہے۔ اس کے ما تھے پر طالی سیس پھول سجا ہے۔ وہ سولہ سنگھار کیے اپر اشردوتی کی طرح خزان کے چاند تلنے ناچتی ہے۔ سارا شرواستی سارا یو دھیا سارا کسم پورہ سارا جبودیپ۔ کا تک پورنماشی منارہا ہے۔ اور شیو نے آنکھ کھولی ہے۔ خزان جو کہ شیو کے جسم کی مانند زرد ہے۔ شیو بھجھوت رمائے ہاتھی کی کھال پینے لیٹا ہے۔ اس کی جٹاں سے انگا بہرہ رہی ہے۔ اس کے ما تھے پر ہلال جگما تا ہے۔ وہ بہت کم کم ہستا ہے۔ پتھرم سا گزرنے کے بعد وشنو اپنی گھری نیند سے جا گا ہے۔ وشنو جو کہ اہت ل احمد و عقل کا مظہر شیش ناگ۔ کی پیٹھ پر پڑا سوتا تھا۔ وشنو پتھر جو کہ خلا کو نگلی چکا ہے۔ جو کہ ساری کائنات کا زبر ہلال پی چکا ہے۔ اہت پر بیٹھا ہوا وہ زمان و مکان کی قید سے بلند ہے۔ اور وشنو اپنی ڈمر و بجا رہا ہے۔ اور زمان و مکان اس کے ڈمرو کی آواز پر لرز رہے ہیں۔ اور بزرگزاروں پر چاند کی روشنی برک رہی ہے۔ اور چاندی فضا میں گھل گئی ہے۔ اور جب دنیا احساس اور چھونے اور دیکھنے اور تحریک کرنے کی دنیا اس قدر لکش ہے تو اس میں مرگ تر شنا کا کیا دخل؟ یہ سب اصلیت ہے۔ زندگی سب سے بڑی اصلیت ہے۔ تخلیق سب سے بڑی حقیقت ہے۔ تخلیق عظیم ہے۔ شکننی کی تقدیس کرو جو کہ تخلیق کرتی ہے

دیوی کی تقدیس کرو جو کہ ماں ہے... ماں... اوما... گوری... کاشمی.... جس کا دوسرا
نام آشہ ہے.. جس کا دوسرا نام کملہ ہے.. جس کے تصور کی تشکیل کنوں کے پھولوں
نے کی... وہ چمپا کے پھول کی طرح معطر ہے... وہ ماں ہے... جیسے کہ زمین ماں
ہے.. جیسے ندی ماں ہے.. ماں الوہی ہے.. عورت الوہی ہے... کیونکہ ماں ہے
بمپک الوہی ہے... اس کی حمد کرو... اس کی عبادت کرو... اس کے آگے جھک جاو
... وہ اس خنک زر دگھا س.. اس ہری زمین کی دیتی ہے... ابدی ماں... اور ابدی
رفیق.. میری بہت پرانی ساتھی ہے... کیا میں اسکو نہیں جانتا؟

رُگ وید میں لکھا ہے کہ میاں بیوی وہ ہیں جو کہ ذہنی طور پر ایک دوسرے کے
ستاہ بندھے ہوئے ہوں

کیا کبھی ایسا ہو گا کہ اسے وواہ [رتھ] میں بٹھلا کر اپنی دلben کی طرح اپنے گھر
لے جاؤں گا...؟

۱۲

مجموع چونک اٹھا... ایک نوجوان خیے کے پیچھے سے آکا۔ منڈپ میں آ کر اس
نے جھک کر گھنٹھر و باندھے.. اور اپنی سفید چادر ایک طرف پھینک کر انندتا ندو
ناچتا سامنے آ گیا...۔

مجموع مسحور ہو کر اس کا رقص دیکھتا رہا..... لگتا تھا کہ جیسے نٹ راج نے اپنا فن
اسے خود سکھایا ہے وہ خود ہی نٹ راج ہے

بمپک ناپتے ناپتے رک گئی.. اس نے رقص کو اچنچھے سے دیکھا
مرد نگ زور زور سے بجتی رہی... سندھیا تانڈوا چتا ہوا وہ منڈپ کے وسط میں

اگیا۔

اس نے شوکی مانند قص کے ایک سو آٹھ مختلف مظاہرے کیے۔ اس نے آٹھوں رس دکھائے۔ یہ وشنو کا سرنگارس ہے۔ یہ اندر کا ویرس ہے۔ یہ یم کا کرونا ہے۔ یہ رورا کاروس ہے۔ یہ کال کا بھیا نک رس ہے۔ یہ گندھرو کا ابھت رس ہے۔ یہ شانت رس ہے۔ یہ شوکا رقص ہے۔ اس کی زراں میں کائنات کا سارا عمل ارتقاء مضر ہے۔ اس کی زبان سارا اظہار ہے۔ اس کا لباس چاند اور ستارے ہیں۔ بوجو کہ جسم تان ہے اور جسم سنگیت۔ جو کہ آفاتی لے کامظہر ہے مادر کائنات اور ماہوتی کو کیلاش کے سب سے اونچے تخت پر بٹھا کر نٹ راج اس کیاں منے ناچتا ہے۔ برسوتی وینا بجارتی ہے۔ اندر بانسری۔ برہما جھا نجھ، بجا تا ہے۔ کاشمی گاتی ہے۔ اور وشنومر دنگم بجارتا ہے۔ سارے دیوتا اور گندھرو اور سده اور ودیا دھر اس پاس کھڑے ہیں۔ یہ شام کا سے ہے۔ سندھیا کا رقص ہے۔

چمپک اپنی جگہ سے اٹھی اور ناپتے ہوئے اس کے برابر ہو گئی۔ ان دونوں نے مل کر اوٹا مانڈا شروع کر دیا۔ وہ گوری تھی اور شنکر کے ساتھ رقص تھی۔

چاندنی کھلے میدانوں پر نفر ریتھی۔ اور چاندی کے رنگ کے بالندی پر تیر رہے تھے اور چاندی کے رنگ کے سارے پروں میں چونچ چھپائے بالو پر سورہ ہے تھے اور کاٹک کا پورا چاند پھولوں کے اوپر سے جھانکتا تھا۔ مگر وہ رات بھی ختم ہوئی۔ اور تھوا رمنا نے والوں کا ہنگامہ کم ہوا۔ اور ان کے

گیتوں اور گھنٹھروں کی آوازیں مدھم پڑ گئیں... اور پوہنچنے سے تک شاہی خیمه گاہ پر خاموشی چھا گئی... اور منڈپ میں بچلوں کے چند کھرے اور کلیوں کے سے انبار بکھرے پڑنے رہ گئے

۱۳

صحح ہوئی... ہالیہ کی چوٹیوں پر دھند تیر رہی تھی۔ تالابوں میں سرخ کنوں کھل گئے تھے... گاؤں کی سڑک پر جاتی ہوئی گنوں کی رنگیں گلریاں دھوپ میں جگما رہی تھیں مہوا کے پیلے بچلوں پر منڈلاتی ہوئی مدھو کر... شہد کی کمھی... اس کے کانوں میں بھنسجھایا کی... اور جب سورج کی تیز کرنیں اس کے پوٹوں میں گھسیں تو وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ اور اس نے اپنے آپ کوتا لاب کی شکستہ سیرھیوں پر لیٹا ہوا پایا... اس نے گھبرا کر چاروں اور دیکھا... وہ کہاں تھا اور یہ سب کیا تھا؟... اس نے دماغ پر بہت زور دلانے کی کوشش کی لیکن اسے کچھ یاد نہیں تھا
چمپک..... چمپک..... چمپک

سارے وقت مدھو صرف یہی بھنسجھاتی رہی تھی... وہ اطمینان سے انگڑائی لے کر اٹھا اور دوسرا انگڑائی لے کر پھر سیرھی پر بیٹھ گیا... دھنعا اس کی نظر مہوا کے جھنڈ پر پڑی... جو کہ سنسان پڑا تھا... یہ جگہ جہاں ساری دنیا کی رونقیں سمٹ آئی تھیں اس وقت بھائیں بھائیں کر رہی تھی... ایک ہر دن درخت کے پیچھے سے بھاگا... چند گلبریاں بیل کے پھل کترتی رہیں... ہرے طوطوں کی ایک ڈارشاخ پر سے اڑ گئی... جنگل خاموش پڑا رہا... وہ حیران و پریشان و ہیں بیٹھا تھا... پھر اسے رفتہ رفتہ بہت دھند لے خواب کی طرح یاد آیا اس جگہ رات بھر پہلے شاہی خیمه گاہ تھی... اور اس میں

وہ منڈپ کے نیچے رات گئے تک ناچا تھا۔ وہ سب ناچے تھے اور جب ان اپنے
ناچتے وہ تحکم گیا تھا تو راجن سے اسے بلا کر اپنے پاس بٹھایا تھا۔ اور اس نے
راجن کے ساتھ خوب جی بھر کر مد راپی تھی اور بھنا ہوا ماس کھایا تھا۔ اور زرزگار پھتر
کے نیچے اطلسی مند پر بیٹھا تھا۔ اور اس محفل رنگ و بو میں اس کی نظریں براہر
جمپک کی متلاشی تھیں۔ لیکن وہ رقص ختم ہونے کے ساتھ ہی شہزادیوں کے ساتھ
زنان خانے کی طرف چلی گئی تھی۔ اور اس کے انتظار میں وہ پوچھنے سے تک وہاں
بیٹھا رہا۔ جب وہ منڈپ سے باہر نکل کر لڑکھڑا تاہما آشرم کی طرف لوٹ رہا تھا۔
اس وقت اسے نیند کا جھونکا آیا تھا۔ اور وہ تالاب کے کنارے پڑ کر سو گیا تھا۔ اور
صحیح کوچ کا نقارہ بجا تھا۔ اور خیسے اٹھادیے گئے تھے۔ اور جب شاہی قافلہ کھیدا
کے لیے روانہ ہو رہا تھا۔ اس وقت جمپک نوملا کے ساتھ تالاب کے کنارے سے
گزری تھی۔ اور نملائے اس سے کہا تھا۔ کیسا انوکھا بہمن ہے۔ پرسوں تم سے چتر
کاری کے متعلق بحث کر رہا تھا۔ رات کو نٹ راج کی طرح ناچا۔ اور اس وقت بچوں
کی طرح پڑا سوتا ہے۔ جانے سے پہلے آوازے جگا کر پر نام تو کر لیں۔

جمپک چند لمحوں کے لیے خاموش گمن سم کھڑی رہی تھی اور پھر اس نے جواب
دیا تھا۔ نہیں۔ کیونکہ جو جا گتا ہے اسے ایک دن نیند آ جاتی ہے۔ اور جو سوتا ہے وہ
ایک روز جاگ اٹھتا ہے۔ ان لوگوں کی طرف دیکھو جو کہ مسلسل جا گتے رہتے ہیں
اور اب مہوے کے باغ میں مکمل سناٹا تھا۔ وہ تالاب کی سیر ہیوں پر بیٹھا سوچتا
رہا۔ اس ایک رات میں وہ دفعتا کتنا بڑا ہو گیا تھا۔ اس نے دل کی کائنات کی سیا
حت کی تھی۔ اس نے مایا کا تجربہ کیا تھا۔ اور وہ اس تجربے سے غیر مطمئن نہیں تھا۔

لیکن یہ کیسا عجیب احساس تھا جیسے شیوا کی بجائے زندگی کا سارا ہلاں اس نے خود پالیا ہو۔ یہ کیسا انوکھا تجربہ تھا۔ اس کی شرط تو اس نے کپل سے نہیں لگائی تھی۔ اور ہری شکر تو کہیں ہزاروں میل کے فاصلے پر کھڑا رہ گیا تھا

اس کا جی چاہا کہ دوڑتا ہوا جائے۔ اور شاہی قافلے سے جاتے۔ راجن کا ایک حصیر کہاں کران لوگوں کے ساتھ چلے۔ اس لڑکی کے پیچھے پیچھے افق کے درمیے کنارے تک پہنچ جائے

لیکن وہ تو اس سے چلتے وقت مل کر بھی نہیں گئی۔ اس نے اسے قریب آ کر جگایا تک نہیں

چنانچہ وہ مجھ سے ایک بات کہے بغیر ہی چلی گئی۔ اور ایک لمحے کے لیے اسے بڑی طہانیت محسوس ہوئی۔ اس کا یہ احساس شدید ہو گیا کہ وہ اس سے الگ نہیں۔ اس کے وجود میں شامل ہے۔ اسے مجھ سے بات کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ تو مجھ سے ہر سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ مگر یہ بھی غلط ہے۔ بکواس میں تو اپنے آپ کو دھوکہ دے رہا ہوں۔ میں مایا کے فریب میں اچھی طرح بتا ہو چکا ہوں۔ وہ مجھ سے الگ ہے۔ بہت دور ہے۔ بھلا میں کہاں اور وہ کہاں؟ یہ سب جھوٹ ہے۔ بہت اچھا۔ اس نے تالاب کی سیر ہی پر سے انھتے ہوئے کہا۔ [یہیں اس روز وہ بیٹھی تھی] تم اپنے کروفر کے ساتھ ہاتھیوں کے شکار کے لیے روانہ ہو چکی ہو۔ اور زندگی۔۔۔ تمہارے ہنا بھی گز رکھتی ہے

اکتوبر کے راستے پر چلتے ہوئے اسے یاد آیا کہ اس کی تعلیم کا آخری سال ہے۔ عنقریب اس کا باپ اسے گھر لے جانے کے لیے آئے گا۔ گروائے رخصت کر

تے وقت اپنی نصیحت دہرائیں گے۔ وہی الفاظ دہرائیں گے جو کہ ہر فارغ التحصیل طالب علم کے سامنے صدیوں سے دہرائے جا رہے تھے۔ سچ بول اور دھرم کر۔ (دھرم؟) آشرم کے سارے لڑکے اس کے عمر بھر کے ساتھی اسے گھاٹ تک پہنچانے جائیں گے۔ فضیلت کی گپڑی باندھ کروہ آنکھوں میں پہلی بار انجمن لگائے گا۔ کانوں میں منی کنڈل پہنے گا۔ کیسری لباس کے ساتھ کاندھوں پر اونی کمبل ڈال کر پیروں میں جوتی پہن کر بالوں میں تیکی کے کاتنوں سے بنی نگھی اڑے۔ چھتری لگائے وہ شان سے شرواستی کی سڑکوں پر نکلے گا۔ ایودھیا اور پامی پتھر کے در بازوں میں جائے گا۔ وہ پروہت کی مندوں پر بیٹھے گا۔ حکومت کے منتری منڈل میں شامل ہو گا۔ جبکہ بیچاری مورکھا لڑکی مگدھ کے کسی اجائزہ و حشت خیز دیپہار میں سر ھٹائے بیٹھی شاکریہ منی کے بتائے ہوئے زواں کے حصول میں جٹی ہوگی۔

اگر وہ اپنے ذہن پر اس قدر غرور کر سکتی ہے تو کیا میں اپنے رتبے پر نازاں نہیں ہوں۔ اور خالی سوری اور سختراشی میں کیا رکھا ہے۔؟ میں ستر ادھر بنوں گا۔ میں قوانین بناؤں گا۔ منو کپل اور جسمی میری گرد کو نہیں پہنچ سکتے۔ میں ذہن کی دنیا تہہ دبالا کر کے رکھ دوں گا۔ علم میرا ہے۔ گنیش کا قلم میرا ہے۔؛ اگر جمپک میری نہیں ہو سکتی۔ تو کیا اندھیرا ہو گیا۔ سرسوتی تو میری ہے وہ مجھے کبھی بھی اس طرح چھوڑ کر نہیں جائے گی۔

اور جمپک میں رکھا ہی کیا ہے۔ خوبصورت تو دنیا میں ہزاروں لڑکیاں ہیں۔ زملائی خوبصورت تھی۔ جمپک اگر غور سے دیکھ جائے تو تم ایسی بھی حسین نہیں اس کی شکل کیسی تھی بھلا۔؟ اس نے غصے سے چلتے چلتے تین چار کنکروں کو ٹھوکر

لگائی.. میں نے کم ازکم یہ تو طے ہی کر لیا ہے۔ کہ تمہاری تصویر ہرگز نہیں بناؤں گا۔ تم سمجھتی کیا ہوا پنے آپ کو۔ میں تمہیں کچھ نہیں سمجھتا۔ میں تو اس کی شکل بھی بھولتا جا رہا ہوں۔ شکل مخفی ہیوں لے ہے۔ میرے دل کے اندر جو روپ محفوظ ہے۔ اسے صرف وشوکر من پہچان سکتا ہے

وہ اپنی کئی میں داخل ہوا۔ پھر باہر نکل آیا۔ اور ادھر ادھر گھوما پھرا۔ آشرم کے اٹکوں نے اسے حیرت سے دیکھا کسی نے اس سے پوچھا۔ کل رات سے نظر نہیں آئے۔ کہاں تھے؟

تو اس نے رکھائی سے ان کی بات ٹال دی۔
اکلیش سے اس نے جھوٹ بولا تھا۔ کندی کے کنارے تپیا کر رہا تھا۔ عمر میں پہلی بار اس نے جھوٹ بولا تھا اور اب اسے سارے جھوٹ بہت اچھے لگ رہے تھے۔ اس نے سندھیا نہیں کی نہ گرو کے درشن کے لیے گیا۔ اشم کے کنجوں میں مارا مارا پھر تارہا

میں اس کی تصویر ہرگز نہیں بناؤں گا میں پرستما کاریک ہوں۔ فن پارے کو زندگی کے سارے رشتؤں سے بلند تر ہونا چاہیے۔ اس نے بار بار دل میں دہرایا۔ لیکن بالآخر اس سے رہانہ گیا۔ وہ کلا کا رہا۔ اور تخلیق کی لگن نے اسے بہت پریشان کر رکھا تھا

دوسرے روز صبح سوریے وہ اپنا تصویر کشی اور مجسمہ سازی کا سامان لے کر مہوئے کے باغ کی سمت روانہ ہو گیا۔ تالاب کے کنارے پیٹھ کر اس نے گیرو پیسا اور سرخ رنگ تیار کر لیا۔ نیل کی پڑیا مٹی کے کثورے میں گھول دی۔ ہلدی اور کیسر

سے زرد اور زعفرانی رنگ تیار کیے۔ دوسرے رنگوں کے لیے جڑی بوٹیاں ابالیں۔ اور سفید چین پٹہ سامے پھیلا کر تصویر بنانے بیٹھ گیا۔ مگر روپ اور رودپ کی کلکش نے پھر اس کا موقلم روک لیا۔ میں کیا بناؤ؟ پھر اس نے سوچا کہ معنی کا کوئی مقام نہیں ہوتا۔ ایک ہی معنی کو مختلف علامتوں کے زریعے حاصل کیا جاستا ہے۔ اور ان علامتوں کو مختلف مقامات سمجھا جاستا ہے۔ ان کی وجہ سے معنی محمد و نبیم ہو جاتے۔ تصویر رنگ نہیں مصور کی روح ہے۔ دیکھنے والوں کی آنکھیں ہیں جنہوں نے اس کا اشارہ سمجھ لیا ہے۔ رنگ ناودیاتے چترم۔ آنکھ صرف رنگ دیکھتی ہے جو کہ سطح پر موجود ہیں۔ جس طرح شاعری محض بیان ہے جسے جس نے تحریک دی ہے۔ جس کا کوئی مقام نہیں۔ جس تحریک جس میں موجود ہے۔

اسے یاد آیا۔ وید وانت والے کہتے ہیں۔ ذات مطلق امورت ہے۔ جس کی کوئی شکل نہیں۔ جو کہ اور اک سے باہر ہے۔ وہ ذہنی تصویر یا خیال بھی نہیں۔ اس لیے وید وانت والوں کے نزدیک فن کا تصویر اپار برہما یا کمتر درجے کی عالمت سے آگے نہیں بڑھتا۔ برہما ایشور ایسی ذات ہے جسے شکل سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ اور اس تصویر کا اصل مخرج روشنی ہے۔ اس کی اصل ہیئت یا سر و روپ مختلف چیزوں کی ہیئت ہے۔ وہ شواروپ

اصل مسئلہ یہ تھا کہ خیال محض علامت کے زریعے ہی دیکھنے والوں تک پہنچایا جاستا تھا۔ براۓ چتر کا رونق ادا کم از کم اس بات پر متفق تھے۔ اسی نظریے نے اقسام پرستی کی ترویج شروع کی تھی

مگر خیال سے علیحدہ گوتم نے سوچا۔ زندہ ہستی تو بذات خود زندگی ہے۔ بعلا

مت نہیں.. اس کی طرف کشش جذبات پرمنی ہے۔ پھر کلا کار خالص خیال کو کس طرح پیش کرئے؟ اس کا رو ی تو غیر جانبدار نہیں رہ پائے گا۔ دھیان... جو کہ کلا کار کا اصل فن ہے.. سالم نہیں رہ ستما... خالص بہیت..... شے کا تصور جو کہ خود شے ہے... اصل دھیان ہے... شے کی شخصی کیفیت کو کس طرح نظر انداز کیا جائے؟

حقیقت زندگی سے آنکھیں نہیں چڑائیں جا سکتیں

اسی طرح تالاب کے کنارے بیٹھے بیٹھے اس نے بہت سی تصویریں بنائیں .. اور بگاڑدیں... سرخ مٹی سے بہت سی مورتیاں گھریں اور توڑوڑا لیں آشرم کے لڑکوں میں کانا پھوسی شروع ہوئی... یہ گوتم کچھ باولا ہوتا جا رہا ہے .. سے کیا ہو گیا؟ ہلکیش نے غصے سے کہا۔ نہیں گوتم باولا نہیں ہوا.. اس پر ایک استری کی دھن سوار ہے۔ ایسی شرمنا کہ بات آج تک اس آشرم میں بھی ہوئی تھی؟ کال کا رہتا ہے اور خیال کی بجائے روپ کے پچھے بھاگ رہا ہے

شہر کی چتر شالاوں میں چہ میگویاں ہو رہی تھیں۔ گوتم نیلمبر کیا اب ناگر ک فیشن اسپل پورٹ بیٹ پیننگ [تصوری کرئے گا] سنا ہے کہ اس نے ایو دھیا کی ماری جمپک کی تصویر بنائی ہے.. ہاں میں نے بھی یہی سنا ہے۔ چتر کاروں کی منڈلی کے پرکھ نے اظہار خیال کیا۔ اب وہ پرستما کاریک نہیں رہا۔

گوتم تصویریں اور مجسمے بناتا رہا۔ اس نے آشرم کی زرد دیوراں پر مٹی اور برادہ اور چونا پھیر کر گہرے رنگوں کے خطوط بنائے۔ اس نے سرخ مٹی کی مورتیاں ڈھالیں۔ اب تک جو تختیاں سینکی جاتی تھیں۔ ان پر زیادہ تر ما بعد اطیعات کی علامتوں کے نقوش ابھرے ہوئے ہوتے تھے۔ ترشول اور زندگی کا درخت اور زمین

کے کنوں اور دنیا کے پیسے اور کنوں کے سلگھاسن اور آگ کے ستون۔ گوتم نیلمبر کی تختیوں پر گاؤں کے مناظر تھے عورتیں۔ بیل۔ پتے۔ گائیں۔ پھولوں کے نمونے۔۔۔ کسان اڑ کے۔۔۔ ان نقوش میں قوت تھی۔۔۔ اور زندگی کی سرخی اور پیش۔۔۔ ماوراء حیات کی بجائے یہ اصل حیات تھی۔۔۔ یہ زمین کی اپنی تخلیق تھی
پھر ایک دن اس نے سدرشن پکمشی کا مجسمہ مکمل کر لیا۔ سدرشن پکشی جو کہ کدم کی ڈالی جھکائے درخت کے تنے سے لگی کھڑی تھی

شہر کے فنکاروں نے اسے دیکھ کر سراہا۔۔۔ چتر شالاوں اور مندروں میں اسے نا پسند کیا گیا عوام جن میں فن کا ذوق عام تھا۔۔۔ اسے دیکھ کر خاموش رہے۔۔۔ نقاوں نے گہری نظروں سے اس کو جانچا۔۔۔ لیکن گوتم کی تعریف کسی نے نہیں کی۔۔۔ سب کو اچنچا تھا

فنکاروں اور ذہن پرستوں کے حلقوں میں اس کے متعلق زور دار بحثیں چھڑ گئیں گوتم خاموشی سے سب کی سنتا رہا خود کچھ نہ بولا۔۔۔ وہ فلسفے کا راستہ چھوڑ چکا تھا اس لیے یہ نہ بتا سکا کہ خالص جمالیاتی تجربیہ دراصل کیا شے ہے؟ کس طرح حاصل ہوتا ہے؟ کس طرح دوسروں تک پہنچایا جاستا ہے؟ روہ اور اروپ۔۔۔ بھاو اور ابھاو کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنے والا کون تھا؟ وہ تو محض یہ چاہتا تھا کہ انسانوں کو ان کے اسرار کو پتھر میں مقید کر لے۔۔۔ انسان جیسے وہ ہیں۔۔۔ ویدانت کے پرستار کی حیثیت سے۔۔۔ اس نے سوچا کہ خالص جمالیاتی تجربہ غیر متعلق آئندہ ہے۔۔۔ بجلی کی طرح ہے اکھنڈ ہے اسے تقسیم نہیں کیا جاستا خود ظاہر ہوتا ہے یعنی سو پر آ کاش ہے۔۔۔ جس طرح کے فنکار کا تصور و شواکر من کے تصور میں شامل ہے اس طرح دیکھنے والے

لا آتم یا خودی میں شامل ہے... جو ہم وقت دیکھتا ہے... اور جس کا سروپ ساری کائنات کا مظہر ہے... شواروپ... روپم روپم پرتی روپ... جمالیاتی لگن کا مکمل نمونہ وہ ہے جو کہ دنیا کی تصویر کو محض خودی سمجھتا ہے... جو کہ خودی کی سطح پر بنائی گئی ہے... یہ وہی خالص وجود ہے خالص اور اداک اور خالص حیات... دل کا نگارخانہ جہاں کہ ساری تصویریں موجود ہیں... سارے تخلیل موجود ہیں... جہاں پہنچ کر ساری شبہیں ایک ہو جاتی ہیں جہاں مختلف رنگیں شیشوں میں سے ایک ہی روشنی گزرتی ہے اور ہر شے جو کہ ڈھنگ سے بنائی گئی ہے اور سچائی سے بنائی گئی ہے... مکمل فن پاڑہ ہے... اور فن کا را اور دیکھنے والے دونوں کے لیے ہی یہ ایک ہی مارگ ہے... اور سمجھنے والے دو ان پر بدها سے سمجھ سکتے ہیں

سدرن یکشی کی تخلیق کے ساتھ ہی سینکڑاشی کا ایک نیا مدرسہ شروع ہوا۔ سینکڑاش کافن خالص دنیاوی بناء... ان جسموں میں شدیدِ حقیقت پسندی تھی یہ کدم اور پاتلی کے درختوں کی پریاں... اندر لوک کی دیوی مالائیں دراصل ایودھیا اور شرواستی کی امیرزادیاں تھیں... گاؤں کی کسان لڑکیاں تھیں... جو کہ دراصل زندگی میں پنگھٹ پر پانی بھرنے جاتی تھیں... ساون گاتی تھیں... کھیتوں کی نزاکتی کرتی تھیں

سدرش یکشی کر پر سے بل کھائے ہوئے انداز میں کھڑی تھی... اس کی باہیں گداز تھیں... انکھیں بہت بڑی بڑی... اس کا جسم بہت مضبوط اور سڑوں تھا... یہ خطوط اور جنم کے توازن... شانت اور لوچ اور حرکت کے احساس کا مکمل امتزاج تھا... اس انداز میں جان تھی اور حرکت اور قوت اور آزادی... اور زندگی اور اطمینان

کی شدید کیفیت... یہاں قید نہیں تھی... بندھن نہیں تھا.. کلا کار کو بلا خرقدید سے آزادی مل تھی۔ اب اسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کیا بنائے گا؟

اب سگتریش را ہب نہیں رہا تھا۔ اس نے خوبصورت تند رست مسکراتی ہوئی عورتوں اور مردوں کے پیکر تراشے۔ عورتیں جو دل آؤز کا ہی اور آسانیش کے احساس کے ساتھ کھڑی تھیں یا بیٹھی تھیں۔ ان کے چہروں پر افسردگی کمیں نہیں تھی۔ چہرے جو کہ سوچ میں ڈوبے مسکرا رہے تھے۔ یہ بہت حقیقی۔ بہت اصل بہت واقعیاتی دنیا تھی۔ دنیا جو کہ آس پاس چاروں اور دور دور تک پھیلی ہوئی تھی اور کلا کار جس کی شکنی اسے سرسوتی کا چھپتا بناتی تھی۔ سکون سے زندہ رہنے کا خواہاں تھا۔ ایک روز گوتم اپنی چند نئی تصویریں لے کر کملیشور کے نگارخانے میں پہنچ گیا۔ وہاں حسب معمول اس کے اسرے دوستوں اور مخالفوں کا مجتمع موجود تھا اس آگروہ میں اسے چند لپی کار (رپورٹ) اور پتی ویڈیک بھی نظر آئے۔ اور اسے ذرا تعجب ہوا۔ یہ سب ایک زمانے میں سیاست پر گفتگو کرنے کے لیے اس کی کنیا میں جمع ہوا کرتے تھے سب لوگ چپ چاپ کسی گہری فکر اور سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ انہوں نے سراخا کر اسے دیکھا اور پھر خاموش رہے۔ وہ چپ چاپ کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا اور نیچے بازار کی چہل پہل کو دیکھنے لگا۔

تم کو نہیں معلوم کملیشور نے بلا خربات شروع کی

کیا۔؟ گوتم نے پوچھا

تم نے کچھ بھی نہیں سنا؟ آخر کس دنیا میں رہتے ہو؟

کیا ہوا؟ بتاؤ تو

باہر کسی نے کنڈی کھڑائی... اور اکلیش داخل ہوا۔ اس کی انس پچولی ہوئی تھی اور اس کے پیر گرد آؤ دتھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کہیں دور سے بھاگتا ہو آ رہا ہے

بھائیو۔ اپنا اپنا سامان سمیٹو اور فورا یہاں سے بھاگ نکلو
کیوں کیا ہوا۔ گوم نے سوال کیا۔

مگدھ میں اڑائی چھڑی چکی ہے۔ بھائی گوم۔ چند رپت کی فوجیں سارے دلیس پر قبضہ کرتی ہوئی اس طرف آ رہی ہیں۔ اب یہاں مل چل جائیں گے۔ میدانوں میں بہرام نیہ جنگ کے دیوتاؤں نے اپنا قص کرنا شروع کر دیا ہے۔۔۔ اب تمہار وقت ختم ہوا۔ موت جنگ کا نقارہ بجائی تمہارے تعاقب میں آ رہی ہے۔ موت جو کہ روپ اور اروپ۔۔۔ بھاوا اور ابھاوا کے جھگڑوں کو مٹا دیتی ہے۔۔۔ اکلیش تھک کر چار پالی پر بیٹھ گیا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ جھوڑی در پر بعد اس نے کہا۔ راجن کھیدا سے واپس آ رہے تھے۔ جب وشنو گپتا کے پا ہیوں نے ان پر حملہ کر دیا۔۔۔

سب کے سب مارے گئے

سب کے سب۔۔۔ گوم نے اڑ کھراتے ہوئے پوچھا۔۔۔

ہاں۔۔۔ سنا ہے کہ شہزادیاں ندی تیر کر پنچالوں کے علاقے کی اور نکل گئیں مگر سپاہی نا کے تعاقب میں ہیں۔۔۔

کاے۔ جمپک بھی ماری گئی ہو گی؟

وہ کون ہے؟ اکلیش نے آنکھ کھول کر بڑی بے رحم آواز میں کہا۔۔۔ جنگ میں انسان نہیں رہتے صرف نام رہ جاتے ہیں۔۔۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا

تم کہاں جاتے ہو بھائی ٹھلیش؟

میں اڑنے جاتا ہوں۔ مگر شاید تم نہیں اڑو گے۔ کیونکہ تم اپنا کے قائل ہو چکے ہو
اس نے اپنی چپلوں سے گرد جھاڑی اور اسی سکون سے باہر نکل گیا
جنگ... امن... خوفزیزی... اپنا

وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کملیشور کو مخاطب کیا: ”مجھے کوئی بتاؤ، تم سب
کلا کار اور عالم جو یہاں موجود ہو، بتاؤ کس وقت اڑا جائے۔ کس وقت نہیں۔ کوئی
ہری شنکر سے یہ پوچھنے جاؤ، جیو ہتھیا کس سے جائز ہے کب ناجائز؟“ وہ کمرے میں
ادھر سے ادھر شبلے لگا۔ ”بھائیو مجھے نند رجہ سے کوئی دچپی نہیں، میں وشنو گپتا کو نہیں
جانتا۔ چند رگپت سے میرا کوئی جھگڑا نہیں۔ یہ سب مل کر مجھے اپنی اڑائی میں کیوں
گھسیتے ہیں، لیکن مجھے بھی دوسروں کو مارنا پڑے گا۔ مجھے تو ان سب کی جانیں
پیاری ہیں۔ میں خود بھی زندہ رہنا چاہتا ہوں، میں اب کیا کروں گا۔“ کھڑکی کے
پٹ سے سر لگا کراس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اس اتنا میں لوگ، جونگارخانے میں موجود تھے اپنے اپنے جوتے پہن کر باہر
نکلنے لگے۔ ان کے جانے کی آہٹ پر گوتم نے آنکھیں کھولیں اور دیکھا کہ کمرہ
سنسان پڑا ہے، وہ ان کے پیچھے پیچھے برآمدے تک بھاگا اور زور سور سے چلانے
لگا: ”ارے اپنی اپنی سورتیاں چھوڑ کر کہاں جاتے ہو، یہ ٹوٹ جائیں گی۔ بھائیو۔
بھائیو۔“

لیکن دفتار نیچے بازار میں شور قیامت بلند ہوا۔ شہر پر جنگی رجموں اور ہاتھیوں کی
یلغار شروع ہو چکی تھی۔ پل کی پل میں سارا بازار بن میں تبدیل ہو گیا۔ دھول اور

ہاتھیوں کی چنگھاڑ اور تیروں کی سمناہٹ اور تلواروں اور ڈھالوں کی جھنکار اور عورتوں اور بچوں کے رو نے اور چینے کی صداوں کے خوفناک ہنور میں اس کی اپنی آواز ڈوب کر رہ گئی، وہ سکتے کے عالم میں برآمدے کی سیر ہیوں پر کھڑا سامنے کا منظر دیکھتا ہا۔ بازار کی ایسٹ سے ایسٹ نج چکی تھی۔ اس کے چڑ کار ساتھیوں کی لاشیں سڑک پر ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ چانکیہ کے سپاہی بڑی صفائی سے لوگوں کی گروئیں اتنا نے میں مشغول تھے۔ گوتم کی نظروں میں اندر ہیرا چھا گیا، آخر وہ لڑ کھڑا تے قدموں سے نگارخانے کی سیر ہیوں سے اترًا۔ اس نے مرے ہوئے کملیشور کے ہاتھ میں سے تلوار نکالی اور خواب کے عالم میں چلتا، تلوار گھماتا، کیونکہ خود ہنون جنگ میں طاق تھا، سڑک پر اتر گیا۔

گوتم رات گئے تک لڑتا رہا اور آخر کار زخموں سے مذھاں ہو کر ایک گلی میں گر پڑا جہاں چاروں طرف اہل شہر کی لاشوں کے انبار لگتے تھے۔

افق کے نزدیک شہر سے کچھ فاصلے پر جیت ون کی عمارت چپ چاپ درختوں میں چھپی کھڑی تھی۔ اس کا کلس اندر ہیرے میں مدھم مدھم یوں جھلما رہا تھا جیسے اس سارے نقشے پر خاموشی سے ہستا ہو۔

وقت گزرتا جا رہا ہے۔ دیس پر اب مور کے انشان والے شہنشاہ کا راج ہے، وہ جو دیس کی چترانت ریاست کا پہاڑ سراث ہے۔ اتنا س پران میں ایک نئے باب

کا اضافہ ہوا ہے۔ بادشاہوں کے نب نامے لکھنے والوں کے قلم یہاں پہنچ کر ک گئے ہیں۔ یہ پر یہ درشن نزی چندر، انسانوں کا چاند، جو پاٹلی پتھر کے سنبھال پر طلوع ہوا ہے۔

یہ شور دم کا بیٹا، جسے گذریوں نے پالا، جسے چانکیہ نے تکشلا میں پروان چڑھایا اب نئی تواریخ لکھوائے گا۔ روایت کے زمانے ختم اور نندوں کے ننانوے کروڑ اشرافوں کے خزانوں کے قصے خواب و خیال ہوئے۔

یہ عہد جدد یہ ہے۔

چندر گپت بڑا زبردست بادشاہ ہے، اس کی سلطنت کا ڈنکا سارے عالم میں نج رہا ہے، اس کا پایہ تخت دنیا کے عظیم ترین شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی فوجی طاقت سے دوسرے ممالک خوفزدہ ہیں۔ اس کے ہزار ستوں واںے چوبی محل میں دور دور کی سلطنتوں کے نیپر موجود ہیں۔ اس کے دربار میں ملیچھ دوسری زبان بولنے والے غیر ملکی لوگوں کا ہجوم ہے۔ دور پچھم کے دیسیوں کی سفید فام اڑکیاں محل میں نزکیوں اور داسیوں کی حیثیت سے ملازم ہیں۔ سارا شہر دہن کی طرح آرستہ ہے۔ وسیع تماشا گاہ میں نیزہ بازی اور رتحوں کے مقابلے ہو رہے ہیں۔ سڑک پر سے سرات کی سواری گزرتی ہے۔ جلوس میں موسیقار شنکھ بجاتے بجاتے ساتھ ساتھ جا رہے ہیں۔ چوراہوں پر قص ہو رہا ہے۔ جھروکوں میں سے پھولوں کی بارش ہوتی ہے۔ عوام بے شبد بولتے ہیں۔ اب گرام بھوجک ان سے زبردستی لگان وصول نہیں کرتا، اب وہ چوری اور بد امنی کی آفتوں سے محفوظ ہیں۔ ان کی خوشحالی میں اضافہ ہوا ہے۔

کیونکہ وشنو گپتا، جس کا دوسرا نام چانکیہ ہے، جس کا دوسرا نام کوٹلیا ہے، جس نے مہا پدم نند کو اپنی سیاست سے شکست دی، وہی وشنو گپتا مشیر سلطنت ہے۔ (اور شاکریہ منی نے کہا تھا کہ فتح اندر پیدا کرتی ہے کیونکہ مفتوح دکھ کی نیند سوتے ہیں لیکن فتح و شکست سے بلند شانت آدمی سکھ میں رہتا ہے۔)

لیکن ہر فتح یا شکست تاریخ کے راستے پر ایک موڑ ہے جس کی وجہ سے دنیا کسی نہ کسی طرح آگے بڑھتی ہے۔ اس فتح کے بعد سے عوام پہلی بار قومیت کے تصور سے دو چار ہوئے ہیں۔ ان کو ایک بھم سما احساس ہوا ہے کہ وہ ایک قوم ہیں جو بہت سارے قبیلوں اور ذاؤوں اور خاندانوں سے بلند تر ایک اور ٹھیک ہے، وہ ایک اسی قوم ہیں جنہوں نے چندر گپت پر یہ درشن کی قیادت میں ایسا نہیں اور یونائیٹڈ کو اپنے دلیس سے نکال باہر کیا ہے۔

وشنو گپتا، تکشلا کا برہمن، اپنے سیاسی تصورات کو اب عملی جامہ پہننا رہا ہے، وہ جانتا ہے کہ نیکی کا سیاست میں بدلہ نہیں ملتا۔ سیاست میں جرام کی بھی سزا نہیں دی جاتی۔ جزا و سزا کے مسئلے کو اس نے دھرم شاستر والوں کے لیے چھوڑ دیا ہے، وہ کہتا ہے سیاست میں صرف غلطی سے احتراز کرنا چاہئے۔ ریاست کی بہتری شخصی فائدے سے برتر ہے۔

معدنیات، بازار، منڈیاں، نہریں، آبپاشی، شفاخانے، مالیات، تجارتی گودام، باغات، محصول، دیوانی، فوجداری، طلاق، شادی، وراثت کے قوانین، تعلقات عامہ، امور خارجہ، دفاع، چراغوں اور قصاب خانوں کے اس نے الگ الگ ملکیے قائم کیے ہیں۔ سارے میں جاسوسی کا جال پھیلا دیا گیا ہے۔ جو برہمن

اپنے علم کے ذریعے روزی نہیں مانسکتے اور ناکام سو داگر، حجام، نجومی، فوکر چاکر، طواںغیں اور کسان، ہر شخص اپنی قابلیت کی بدولت جاسوسی کے محکمے میں شامل ہو سکتا ہے۔ سادھوؤں کے بھیس میں ادھر ادھر گھوم کر جاسوس چند ریپٹ کے تحت و تاج کی حفاظت میں جائے ہیں۔ بغاوت کا پتا چلاتے ہیں۔ ولیشاؤں کے گھروں اور قمارخانوں میں جا کر عوام کے خیالات سے باخبر رہتے ہیں۔ جرم کی بخش کنی کے لیے بھیدی کا کام کر رہے ہیں۔ سارے میں امن قائم ہے۔ منونے کہا تھا جہاں سیاہ فام سرخ آنکھوں والی ڈنڈ مجرموں کو ختم کرتی زمین پر گھومتی ہو وہاں کی پر جانگ نہیں ہوتی۔

یہاں باڈشاہ ڈنڈ دھر رہے اور پر جاخوش ہے۔

پاٹلی پتھر پر اتنی رونق اس سے پہلے کبھی نہیں آئی۔ نئی نئی عمارتیں بن گئی ہیں۔ آبادی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ زبان میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ مگدھ نام نزتی (پراکرت مگدھ کی عوامی بولی) میں بدلتی جا رہی ہے۔ ناٹک اور موسیقی کے فنوں اپنے عروج پر ہیں۔ گلی کوچوں سے گیتوں کی تانیں بلند ہوتی ہیں۔ کاریگر نے نئے زیور گھر رہے ہیں۔ دور دور کے ملکوں کا سامان بازاروں میں فروخت ہو رہا ہے۔ بیراگی اور سپیرے گلیوں میں دو تارہ اور جین بجائے پھر رہے ہیں۔ بہروپیے منڈپوں کے نیچے سوانگ بھر رہے ہیں۔

این ناٹک منڈلی، جو کاشی سے آئی ہے، نئے نئے تماشے دکھاری ہے۔ ان ناٹکوں کا لیکھک پہلی بار پاٹلی پتھر آیا ہے لیکن اس کی شہرت اس سے پہلے یہاں پہنچ چکی ہے۔ اس کے بارے میں طرح طرح کے افسانے مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے وہ

بہت بڑا گنی اور کلا وقت ہے، ایک زمانے میں چتر کا رکھا اور مور تیار بناتا تھا۔ نٹ (رقص) ہے۔ بہت معز کے کا ناچتا ہے۔ ناٹک (ایمپر) ہے۔ غضب کی ادا کاری کرتا ہے۔ بھرت منی کا سارا فن اس نے گھول کر پی رکھا ہے۔ رسول برس اس نے ایودھیا کے گنی جنوں اور گندھر پوں کی شگفت میں گزارے ہیں۔ سارے سر اس کے قابو میں ہیں، بڑے بڑے گائیک اس کا لوبہ مانتے ہیں۔ پرتب بھی اسے چینیں نہیں پڑتا۔ سارے دلیں میں گھوما گھوما پھرتا ہے۔ کسی ایک جگہ نک کر نہیں بیٹھتا۔ کسی ایک فن کو اپنی پوری وجہ کام کرنے نہیں بناتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے بادل کی چھایا کو اپنی گرفت میں لیما چاہتا ہو اور وہ اس کے ہاتھ نہیں آتی۔

اس ناٹک کی بہت دھوم مچی ہے، سارا پاٹلی پتھر ناٹک گھر کی اور امنڈا چلا آ رہا ہے۔ خواتین کے رجھوں اور پالکیوں کا تاتا بندھا ہے۔ راج محل کی شہزادیاں، امیروں، وزیروں اور تاجروں کی بیباں، انتظامی ملازمتوں کے افسروں کی بیباں، سبھی رنگ برلنگی ساریاں، زر زگار پلکے اور شہری کردھیاں پہنے آ کر ناٹک گھر کے ایوان میں بیٹھ رہی ہیں۔ بن بیا ہی نوجوان لڑکیاں اس ادا کار اور لیکھ کو دیکھنے کی بہت مشاق نظر آتی ہیں۔ انہوں نے سن رکھا ہے کہ وہ بہت خوبصورت آدمی ہے اور خواتین کی ایک بڑی عادت یہ ہے کہ وہ کلا کی اچھائی یا بُرائی کے مسئلے کو کلا کار کی شکل و صورت سے گڑ بڑا دیتی ہیں۔

سفید پرده ایک طرف کو سر کایا گیا۔ منقش چوبی رنگ بھومی کا عقیبی پرده ہکلوں، پلکوں اور تصویروں سے سجا تھا۔ سازندوں کی روشن چوکی سامنے پیٹھی تھی۔ شنگیت کار لڑکیوں نے پہلو کے ستونوں سے برآمد ہو کر مہادیو کی استوتی کی اور ان میں

سے ایک لڑکی ٹولی سے باہر آ کر کمر پر ہاتھ رکھے ایک طرف کو کھڑی ہو گئی۔ یہ لڑکی تمثیل کی نائیکہ تھی۔ اس کی لمبی چوٹی میں مو تیا کا کھرا گندھا تھا اور اس کی طالی کر دھنی میں یا قوت جڑے ہوئے تھے۔

پھر پر دیپ کی روشنی میں رنگ بھوم کے سفید روغنی تختوں پر وہ نمودار ہوا جس کا اتنی دیر سے سب کو انتظار تھا۔ اس نے کیسری رنگ کے ریشمیں کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے کانوں میں کرن بھوشن جگہ گار ہے تھے، وہ بڑی شان سے سر اٹھائے سامنے خلاء میں دیکھتا باوقار انداز سے قدم رکھتا سامنے آیا اور چند لمحے تک سب کی طرف نظر ڈال کر اس نے قاعدے کے مطابق نئی سے اس ناٹک کے موضوع کے متعلق مکالمہ شروع کیا۔ مجمع اس کی خوبصورت آواز سے محور ہمہ تن گوش رہا۔ سب ٹکنگی باندھے اپنی اپنی جگہ پر ساکت و صامت گرد نہیں آگے بڑھائے اسے دیکھنے میں مصروف تھے۔

مکالے کے دوران میں کسی بات پر زور ڈالنے کے لیے اس نے پہلے اپنا دلیاں اور پھر بایاں ہاتھ ہوا میں باند کیا۔

تماشائی چونک اٹھنے ان کے چہروں پر دکھ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ خواتین نے تاسف کی شدت سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس خوبصورت اور انوکھے کلاکار کے دونوں ہاتھوں کی کئی انگلیاں کٹی ہوئی تھیں۔

گوتم نیلمبر کے سامنے ایک اور شہر تھا۔ تماشائیوں کا ایک اور ہجوم جو حسب معمول عقیدت اور محبت سے اسے دیکھ رہے تھے، وہ سب کو تماث دکھاتا تھا لیکن اس کا تماشا کسی نے نہ دیکھا تھا۔ جس طرح رنگ بھومی کے پر دے کے پیچھے ایک

اور جنگ بھوئی ہوتی ہے جو دیکھنے والوں کو نظر نہیں آتی۔

پالی پتر کے یہ مہذب باوقار شہری، جو ایوان میں بیٹھے اس کے مکالمے پر عش عش کر رہے تھے، ان میں سے کسی کو بھی معلوم نہ تھا وہ کیسی کیسی دنیا دل کی سیاحت پر بکا ہے۔ اس نے زندگی کے سارے تجربے کر دیکھے ہیں اور اب کچھ باقی نہیں۔ ہن چیزوں سے اس نے پچنا چاہا، ہن باتوں کو اس نے نظر انداز کرنے کی کوشش کی محض یہ سوچنا چاہا کہ زندگی میں خلااء ہے یا محض روشنی یا محض تاریکی مگر یہاں محض کا وجود نہ تھا، وہ ماسوا کو اپنے راستے سے نہیں ہٹا ستا۔ دنیا قدم قدم پر اپنے ہر روپ میں اس کے سامنے موجود اس کامنہ چڑھا رہی ہے، وہ جنگ کے خلاف تھا اور اس نے اپنی تلوار سے شراوی کے معمر کے میں مخالف فوج کے پانچ سپاہیوں کو قتل کیا۔ پانچ انسان۔۔۔ جو اس کی اپنی دنیا کے باسی تھے۔ اسی کی طرح بولتے تھے، گستاخ تھے، اسی کا ایسا دل و دماغ رکھتے تھے، وہ برمچاری تھا لیکن یہ برمچاری یہ کے سخت قوانین کو توڑ کر اس نے ایک لڑکی کو دیوانہوار چاہا۔ اس کی سوچ کو منجد کرنے کے لیے، اس کے پیکر تراشنے کی خاطر اس نے کلا کی دنیا میں بنناہ ڈھونڈی۔ یہ بالآخر اس کی اپنی دنیا تھی۔ خالی الفاظ اور سوکھے فلسفے کے مسائل سے بلند تر۔ یہاں رنگوں اور پتھروں کی سُنگت میں وہ زندہ رہا، لیکن جنگ میں لڑتے سے ”دشمن“ کی تلوار سے اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں قلم ہو گئیں۔

شراوی کے بازار میں حملہ آوروں سے وہ دن بھر لڑا تھا۔ رات گئے تک لڑتا رہا تھا اور پھر نیزے کے ایک وار کی تاب نہ لائکر گر پڑا تھا۔ جب اسے ہوش آیا اور اس نے سر اٹھا کر دیکھا کہ رات کی سیاہی آسمان پر سے مدھم ہوتی جا رہی ہے، وہ

زخموں سے چور ہے اور اس کے ہاتھ لہو اہان ہیں۔ اس نے لیئے لیئے بڑی مشکل سے اپنی انگلیوں کو پھیلا یا جو خون میں لٹ پت تھیں۔

تب اسے ایک اُمل حقیقت کا اندازہ ہوا۔ ہاتھ، انگلیاں، جو حسن کی تخلیق کے لیے بنائی گئی ہیں، خون میں نہ لادی جاتی ہیں۔ کسی خاموش ویہار میں بینچ کروہ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سستا تھا۔ کلا کار کی حیثیت سے انسان کا ہاتھ اس کے لیے بہت بڑی علامت تھی۔ انگلیاں، جو قص کی مددواروں کے ذریعے کائنات کے سارے اسرار، ساری زندگی کے معنی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ جو مکان بناتی ہیں۔ باغوں کو سینچتی ہیں۔ بانسری بجاتی ہیں۔ تمپک تمپک کر بچے کو سلاتی ہیں۔ آرتی کے لیے نارنجی پھول چنتی ہیں اور دوسری حقیقت یہ تھی کہ انگلیاں تیرگری کرتی ہیں۔ نیزے ڈھاتی ہیں۔ دوسرے انسانوں کا اپنی گرفت سے گا گھونٹتی ہیں۔

تب اس نے اپنی کٹی ہوئی انگلیوں کو دیکھا اور سوچا کہ یہ اس کے کرم کا پھل ہو گا۔ اس کے علاوہ اور کیا ہو ستا ہے۔ کرم کے فلفے سے اسے بڑا سکون حاصل ہوا۔ اگر یہ فلسفہ میرے پاس نہ ہوتا تو میں سوچ سوچ کر دیوانہ ہو جاتا۔

ذراسی سکت آنے کے بعد وہ اٹھا اور اشوں کو پھانگتا، گلیوں کی دیواروں کا سہارا لیتا اپنے مکان کی سمت گیا۔ جہاں اس کی ماں تھی جو اس کے زخم دھوئے گی، اس کو اپنی گود میں سلاٹے گی۔

لیکن اس کا مکان سنسان پڑا تھا۔ یہاں وہ بیس سال بعد اس وقت پہنچا تھا جب اس کے ماں اور باپ چند گھنٹے قبل اڑائی میں مارے جا چکے تھے۔ اڑ کھڑا تھا ہوا وہ شہر سے باہر آشرم کی سمت روانہ ہوا جہاں ہوا کا عالم تھا۔

جھونپڑے خاموش پڑے تھے۔ گرو کی کنیا خانی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ مہوے کے باغ میں داخل ہوا اور تالاب کی سیڑھیوں پر لیٹ گیا، اس کے زخموں کے خون نے تالاب کے شفاف پانی کو اغوانی کر دیا۔
ایک نوجوان گولن نے، جو ادھر سے گزر رہی تھی، اسے سکتا ہوا دیکھا، وہ گھبرا کر دوڑی ہوئی اس کے قریب آئی۔ اس نے پانی سے اس کے گھاؤ صاف کیے، اسے گائے کاتازہ دو دھلائے کر کھلایا۔

اور بجائے اس کے کوہ اس کا شکریہ ادا کرتا اسے بڑے زور سے بھسی آگئی۔
گولن اسے اچھے سے دیکھنے لگی۔ کیسا انوکھا سپاہی ہے۔ میدان جنگ سے اڑتا مرتا ہوا آ رہا ہے اور ہفتا ہے۔

اس کو اتنی بھسی آئی کہ اس کا جی چاہا کہ زور زور سے قبیلے لگائے۔ اس وجہ سے اس نے ازراہ مذاق بھی گولن سے یہ نہ پوچھا کہ تمہارا نام سچاتا ہے یا نند بالا۔
کیونکہ اس سے ہری شکر کے الفاظ یاد آ چکے تھے۔ ”بھائی گوتم! ہر زمانے میں ہو موڑ پر تمہیں کوئی نند بالا ملے گی کوئی سچاتا اور وہ مزدیک آ کر تمہاری خدمت تمہاری پرستش کرنا چاہے گی۔ اب بھی وقت ہے آنکھیں کھول لو۔“ یہ دوسری تجربہ تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ عورت کی خدمت، اس کی پرستش کو ٹھکرانا خدا کا سب سے بڑا ناشکراپن ہے۔ اس نے آنکھیں نیم واکر کے بڑے سکون اور بڑے اطمینان کے ساتھ گولن کے کنگنوں کو چھوڑا، پھر اس کے پلو پر سر رکھ کر سو گیا۔

گولن اسے اٹھا کر اپنے گھر لے گئی جہاں وہ کئی دن۔۔۔ جب تک اس کے زخم اچھے نہیں ہوئے۔ اس کا مہمان رہا۔ یہ اس کا نہایہ گاؤں تھا لیکن اب اجڑ پڑا

تھا۔ گاؤں کے بہت سے باسی مہاراج چندر گپت کی فوج کے خوف سے بھاگ کر ادھراً ڈھر چلے گئے تھے۔ گولن نے اسے روکنا چاہا لیکن ایک روز وہ چپکے سے اس گاؤں سے نکل گیا۔ نند بالا، کہ یہی اس گولن بڑی کا نام تھا، بہت روئی لیکن وہ ندی پار کر کے بہت دور پہنچ چکا تھا۔

رفتہ رفتہ ملک میں امن قائم ہوا۔ چندر گپت کی سلطنت مستحکم ہو گئی۔ گوتم گھومتا پھرتا کاشی جانکا، وہ عالم برہمن تھا۔ سوائے اپنے علم و فن کے اس کے پاس کوئی اور تجارت نہ تھی، لیکن اسے فلک نہیں تھی۔ ودیار تھی برہمچاری کی حیثیت سے اسے ہمیشہ سے بھوکار ہے اور سختی اٹھانے کی عادت تھی۔ اسے یہ ونجاروں کی ایسی زندگی برہی نہیں لگی، مگر اب وہ عالموں کی صحبت سے اور ان سے بحث کرنے سے بچتا تھا۔ کاشی میں ایک ناٹک گھر کی نایکا سے اس کی ملاقات ہوئی جو دیکھتے ہی اس پر رتبخود گئی۔ اس نے گوتم کو اپنی منڈلی میں شامل کر لیا۔

اپنی کئی ہوئی انگلیوں سے اب وہ تصویر یہ نہیں بناتا تھا۔ مورتیاں نہیں ڈھال سستا تھا۔ ناج نہیں سستا تھا، صرف اداکاری کے ذریعے اپنا اظہار کرنے کا راستہ اس کے سامنے تھا۔ طالب عالمی کے زمانے میں اس نے ناٹک لکھے تھے۔ فن اداکاری کا مطالعہ اس کی تعلیم کا ایک جزو رہ چکا تھا، وہ فلسفی، عالم، چتر کاراب نایک بن گیا۔

نٹ شاستر میں لکھا تھا کہ اداکار کے لیے ضروری ہے کہ اس کی آنکھیں طویل ہوں۔ ہونٹ سرخ، دانت چمکیلے۔ اس میں وقار، تمکنت اور غرور ہونا چاہئے۔ اسے فن عروض، فن خطابت اور فنون لطینہ پر دسترس حاصل ہوئی چاہئے۔ گوتم میں

یہ سارے وصف موجود تھے۔ یہ علم بحر ذخیر تھا۔ اس کا رتبہ بلند تھا۔ اسے بھی رقص اور موسیقی کی مانند الوی حیثیت حاصل تھی۔ کہا جاتا تھا کہ برہمانے اندر کی خواہش پر پانچوں وید کی حیثیت سے نالک قائم کیا۔ شیوا اس فن میں دیوتاؤں کے استاد بنے۔ پاروتی نے اپراؤں کو اپنی شاگردی میں لیا۔ وشاکرمن نے رنگ بھوم تیار کی۔ پر ایک مرتبہ گندھر و اور اپراؤں نے ایک تمثیل میں ایک رشی کامداق اڑایا جس کی بد دعا کی وجہ سے ان اداکاروں کو دیولوک چھوڑ کر دنیا میں آنا پڑا، یہاں بھی ان کے درجے میں کمی نہیں آئی۔ اداکارکشی لوکہاتے تھے کیونکہ رام کے دونوں بیٹے خانہ بدوش مغنوں کے بھیں میں اپنے باپ کے دربار میں پہنچتے۔

سارا عالم بہروپ سے خوش ہوتا ہے۔ گوتم ان روایتوں کے متعلق سوچ کر خیال کرتا۔ بہروپ ایک اور حقیقت ہے۔

نالک کافن بہت ترقی یافتہ اور ہمہ گیر تھا۔ بھرت منی نے اس کے قوانین کی تکمیل کی تھی۔ انہوں نے اڑتا لیس قسم کے نائیک اور پونے چار سو اقسام کی نائیکاؤں کی فہرست بنائی تھی۔ انہوں نے ہدایت کاری اور رنگ بھوم کی آرائش اور اداکاروں کے اوصاف کے متعلق تفصیل سے لکھا تھا۔ سکون اور ع تو ازن تمثیل کے لیے لازمی تھا، شدید ایسے اور قتل و دہشت کے مناظر سے گریز کیا جاتا تھا تاکہ تماشا ہیوں کے ذہنی سکون میں خلل نہ پڑے۔

فراق تمثیل کا خاص موضوع تھا۔ گوتم بیکھر نے بھی اس روایت کو قائم رکھا، فراق کے علاوہ اور کون سے موضوع وہ اپنے لیے منتخب کر سetas تھا؟

ناہیہ، نہ تیہ اور نہ سر کے سام گیت میں اس نے خود کو سو دیا۔ ایک روز نالک

گھر کی اس نایکانے اس سے کہا: ”میں نے سنا ہے تم بہت اچھا ناپتے ہو، مجھے بھی سکھلا دو۔“

”تم کو سکھلا دوں۔۔۔؟ تم کو ابھی اور سیکھنے کی ضرورت ہے؟“ گوتم نے چڑ کر کہا، ”مجھے تو سچھنیں آتا جاتا۔“ اس روز اس پر شدید بد مزاجی اور چڑ چڑ اہٹ کا دورہ پڑا ہوا تھا، وہ سہم گئی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا: ”پتہ نہیں۔ لوگ کہتے ہیں انہوں نے تم کو خود ناپتے ہوئے دیکھا ہے۔“

”کون لوگ۔ وہ پھر گرجا۔

”جانے کون۔ ایودھیا کے کجھنٹ بتا رہے تھے ایک دفعہ انہوں نے جنگ سے پہلے کسی تھوار میں تمہیں ناپتے دیکھا تھا۔“

ایودھیا کے۔ گوتم کا دل ڈوب سا گیا، وہ یکنخت نرم پڑ گیا۔ اسے اٹر کی پر ترس آیا، وہ اس پر کتنی بری طرح فریغتہ تھی۔ بے چاری۔ ”وہ کون لوگ تھے۔“ اس نے پھر کہا۔ ”کیا معلوم۔ تاکہ گھر میں دبیوں طرح کے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔“ اٹر کی نے ذرا بے پرواٹی سے جواب دیا۔ ”اچھا اب میں گھنگروں باندھتی ہوں۔“

وہ او ما تانڈو کرتی رہی، وہ اسے دیکھا کیا۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

گھنگروں کی آواز اس کے کان میں پہنچا کی، وہ ایک اور حقیقت سے دو چار ہوا۔ سارے نظام کائنات میں لے ہے۔ آفاق میں لے ہے اور چدمبرم، انسان کا دل، جو کائنات کا مرکز ہے، شواس میں ناچتا ہے۔ شوکسی تخلیقی خدا کا نام نہیں جو پیاروں پر رہتا ہو۔ وہ میرے اپنے دل میں موجود ہے، وہ جو تخلیق ہے اور تخریب

بھی۔ جو بناتا بھی ہے اور بگاڑتا بھی ہے۔ جو وجد اور عدم وجود، موت و زیست کا مکمل قانون ہے۔

اور ہر شے میں تال لے اور سر پہاں ہے۔ تخلیق اور ارتقا اور بقا، اور تخریب میں رقص ہے۔ روح کی تشکیل اور اس کی آزادی میں رقص ہے۔ برہما جس نے تخلیق کی ہے۔ وشنو جو بقا ہے رور جو خاتمہ ہے۔ مہیشور جس نے رو میں تشکیل کی ہیں۔ سدیشور جو انہیں ان کے چکر سے نجات دلاتا ہے۔ یہ سب اس کے مختلف پہلو ہیں جو ذات مطلق ہے، جوازی اور ابدی رقص ہے۔

اس ناج کے رس اور بھاؤ انسان کی ساری ذہنی، دلی اور روحانی کی خصیتوں کے عکاس ہیں اور آفاقی تصورات سے انہیں نسبت دی گئی ہے۔ شرنگار رس و شنو کا ہے، اس میں ان کے اوتا رنگوں کے دھاری درندابن میں اپنی گوپ لیا ارجاتے ہیں۔ ویر رس کرٹ کے تگر جتنے بادلوں کے سہرے خدا اندر سے منسوب ہے۔ کرونا ترجم کا جذبہ ہے۔ یم سے اس کا رشتہ جوڑا کوؤ گیا ہے۔ رو غنیض کی کیفیت ہے۔ ہاسیا سفید رنگ میں مابوس مزاح ہے۔ بھیا نک رس کا رنگ سیاہ ہے۔ کال سے منسوب بھاسیہ شیو کے مہا کال روپ کی نیلی علامت ہے۔ او بھت رس میں حیرت ہے۔

ان کی خصیتوں کے اظہار کے لیے مکمل قوانین ہیں۔ ان کے لیے کس طرح کی ادا کاری کی جائے، کیسے رنگ ہوں، کیسے پس منظر، کون کون راگ۔

میکھ، سری، ہندو، توڑی، چھایا، للت، شرنگار رس کے، محبت کے راگ ہیں۔

گوری، سوم اور دیو کرتی ویرس کے ساتھ گائے جاتے ہیں۔ رام کلی اور آساوری کرونا کے راگ ہیں۔ شنکر اہاسیہ کا غصہ ہے۔

ادا کار رقص اپنے سر، اپنی آنکھوں، اپنی بھوؤں، اپنے بازوؤں، اپنے ہاتھوں، اپنی انگلیوں، اپنے پیروں، اپنے پورے جسم، سارے وجود کے ذریعے کائنات و زندگی کی کہانی سناتا ہے۔ آنکھوں اور انگلیوں اور بازوؤں میں آہنگ قائم کر کے ناچتا ہے۔ آنکھوں کے تین طرح کے اشاروں کی پیشتابیں فتمیں ہیں۔ گردن کے نو مختلف اشارے ہیں۔ ہاتھوں کی مدراؤں کی چار فتمیں اور ہر قسم کی چوبیں علیحدہ علیحدہ شناختیں۔ ان گنت طرح کے لوق اور جھکاؤ ہیں۔ جسم کی حرکات ایک سو آٹھ انداز کی ہے۔ جس طرح گانیزیری منتر ایک سو آٹھ دفعہ پڑھا جاتا ہے یا جیسے آرتی کے پر دھپ میں ایک سو آٹھ چراغ روشن ہوتے ہیں اسی طرح نٹ راج کے ایک سو آٹھ مختلف ناق ہیں۔

کاشی کی خوبصورت پاتراس کے سامنے ناچا کی۔ اس نے پیروں کی مختلف چالوں کا مظاہرہ کیا: یہ مور کی چال ہے، یہ ہرن کی، یہ ہاتھی کی، گھوڑے، شیر اور مینڈک کی۔ کوئنے کے پانچ، قدم رکھنے کے دس، چکر کاٹنے کے آٹھ انداز ہیں۔ ہاتھوں کی دو سو سینتا لیس مدراؤں نے ساری کائنات کو سمیٹ لیا ہے۔ ساری کیفیات، احساسات، خیالات۔ درخت، پھل، پھول، پرند، عہد عتیق کے شہنشاہ۔ انسانی رشتہ دیوی دیوتا۔ وشنو کے اوتا، چترورن، تاریخی ہستیاں، ساتوں سمندر، مشہور ندیاں، ساتوں طبقات ارضی، ساتوں طبقات سماوی۔ ان سب کا مدراؤں کی زبان سے بیان کیا جاتا ہے۔ المیہ اور طربیہ ادا کاری کے

سارے اتنا رچپڈھاڈ پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ تال، لے اور گیت کا مکمل آہنگ ہے۔

یہ بھرت نائم ہے۔

شیو کا ناج، بھرت منی نے جس کے قوانین دنیا کے سامنے پیش کیے۔

کاشی کی رقصہ بھرت نائم ناج رہی ہے جس طرح ایک مرتبہ ہمپک ناچی تھی، جس طرح جب تک تال اور لے اور سر قائم ہے بھرت نائم ناچا جائے گا۔ مگر میں نہ راج کا ایک حقیر بندہ کبھی نہیں ناج سکوں گا کیونکہ میں اپانج ہوں۔

اس نے لڑکی کو غصے سے دیکھا جو ناچے جا رہی تھی، وہ خود شکر نہیں تھا، وہ گوری بھی نہیں تھی۔ تھیل کا جاؤٹوٹ چکا تھا۔ تب اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ خواب زیادہ درستک قائم رہنے والی چیز نہیں۔

لڑکی ناچتے ناچتے اکتا کراس کے قریب آئیں اور اداسی سے اس کی شکل دیکھنے لگی۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ میں اس آدمی کو کبھی نہیں سمجھ پاؤں گی، مگر کیا آدمی کو سمجھنا ضروری بھی ہے۔۔۔؟ کیا یہ کافی نہیں کہ وہ میرے پاس بیٹھا ہے اور کم از کم گزرتے ہوئے وقت کے اس حصے میں میرا ہے۔۔۔؟

تمثیل گھر کی اس حسین لڑکی کا نام امپیکا تھا، یہ بڑی مشہور اداکار تھی۔ بڑے بڑے امیرزادے اور بانکے اس کے نام کی مالا جپتے تھے مگر وہ رنجھی بھی تو کس پر۔۔۔ ایک مفلس برہمن طالب علم جس کے ہاتھوں کی انگلیاں کٹی ہوتی تھیں۔

تب گوتم ایک اور حقیقت سے آگاہ ہوا، تم جس کو چاہتے ہو تمہاری پروانہیں

کرتا اور جو تم پر جان دتا ہے اس میں تمہارے لیے کوئی کشش نہیں۔ یہ بھی زندگی کا ایک ایسا تجربہ تھا جو اس سے پہلے ہزاروں کرچکے تھے مگر اس کے لیے نیا تھا۔

امیریکا میں روپ و قیمتی ہونے کے علاوہ وہ ساری خوبیاں اور ہنر موجود تھے جو ایک رقصہ اور ادا کار کے لیے لازمی اتصور کیے جاتے تھے، وہ سنگیت کا تھی۔ شاعری کرتی تھی۔ پھولوں کو سجائے کافن جانتی تھی۔ ضلع جگت کی استاد تھی۔ فنِ باغبانی، تیر اندازی اور منطق کی ماہر تھی۔ اس کی آنکھیں بادام کی ایسی تھیں۔ اس کا رنگ خزان کے پتوں کی مانند پیلا تھا۔ ستوری کی پنکھڑیوں کا نازہ چہرے پر مل کر، کم کم اور کاجل سے آراستہ ہو، نیس مینا کاری کے گہنے پہن کے جب وہ تماشا گاہ میں نمودار ہوتی تھی چاروں اور تہلکہ مجھ جاتا تھا۔

پر گوتم ان تمام اوصاف کے باوجود اس پر متفق نہ ہوا، وہ امیریکا کی منڈلی کے ساتھ سارے میں گھوما۔ موریہ سلطنت میں خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ فنون اطینگہ کو زبردست مقبوبیت حاصل ہو چکی تھی۔ اب گوتم بھی امیرزادوں کے سے ٹھانٹھ سے رہتا۔ شرایں پیتا نت نئی لڑکیوں پر ڈورے ڈالتا اور پھر فوراً ان سے اکتا جاتا۔ امیریکا، اس کی پچارن، اس کی ان ساری بردی عادتوں کے باوجود اس کی پرستش کیے گئی، وہ اس کی محبت کے جواب میں اس سے انتہائی بے رحمی کا برنا و کرتا اور اس کو دکھ پہنچا کر دل ہی دل میں خوش ہوتا۔

اب اس کی شہرت دور تک پھیل گئی تھی۔ اس کی بد مزاجی، اس کے اکل کھرے پن، اس کے غرو اور اس کی عشرت پسندی کے قصے بھی مشہور ہو چکے تھے۔

یہ سب تھا مگر ایک خیال دل و دماغ پر برادر مسلط تھا، اس کی روح کی گہرائیوں میں تان پورے کے سروں کی طرح گوجتا رہتا تھا۔ جمپک۔۔۔ جمپک۔۔۔

اس نے جمپک کی تلاش میں دور دراز کی یاترائیں کیں، شاید وہ زندہ ہو۔ مارے جانے سے فج گئی ہو۔ شاید کسی پرانے منٹھو یہاں میں دکھائی دے جائے، وہ شاکیہ منی کی بھکشوں کی ٹولیوں کو غور سے دیکھتا، وہ ہر ٹنگھٹ، ہر براز کی دکان، ہر سنگیت منڈلی میں، ہر اس جگہ جمپک کو تلاش کرتا جہاں اڑکیاں جمع ہوتی تھیں مگر وہ کہیں نہیں۔

تب اس نے تھک کر اپنی کھونج ختم کر دی اور امپیکا کی محبت کے آگے اپنی ہار مان لی۔ اب وہ صرف امپیکا کے ساتھ ہی رہتا۔ اس نے دوسری لڑکیوں کی طرف توجہ بھی کم کر دی۔ امپیکا کے ساتھ اس کی زندگی میں ایسا سکون آگیا تھا جو صرف ایک گرہست ہی کو میسر ہوتا ہے۔ بعض دفعہ وہ امپیکا کو افسوس سے دیکھتا، یہ بے چاری میرے لیے کیوں اپنا وقت خراب کر رہی ہے۔ بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب اس کے بال سفید ہو جائیں گے، اس کی آنکھوں کے نیچے لکیریں پڑ جائیں گی۔ خوبصورت عورت کی اصل موت اس کا بڑھا پا ہے۔ بیوقوف امپیکا کیوں نہیں ان لوگوں کی طرف دیکھتی جو سچ مج اس کی قدر کرتے ہیں۔

مگر برس اسی طرح نکلتے گئے۔ گوتم نیلمبر اب اڑتیں سال کا ہو چکا تھا۔ اس کے ہنورا یے کالے بالوں میں چاندی کے تار جھلمنا نے لگے تھے، وہ اب بھی اسی طرح ہنستا تھا۔ مشرقی ونگا کی ملامِ مملک اور قیمتی ریشم میں مابوس اپنے منقش رتھ میں

امپریکا کے ساتھ ہوا خوری کے لیے نظرتا تھا۔

آج وہ پائلی پتھر میں موجود تھا اور حسب معمول تمثیل کے دوران میں امپریکا کے ساتھ مکالمہ ادا کر رہا تھا اور تماشائی اسے عقیدت سے دیکھ رہے تھے۔ تماشائی جو بہروپ کے عاشق ہیں، جو اصل گوم نیلمبر کو کبھی نہیں دیکھ پائیں گے۔

۱۶

خواتین نے تاسف کی شدت سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ خواب پرست اڑکیوں نے حیرت اور دکھ سے اپنے دانتوں تلے انگلی دابلی۔

انہیں خواتین کی صفوں میں ایک طرف جمپک پٹھی تھی۔ اس نے فرنی پھولوں والی اودے رنگ کی ریشمیں ساری پہن رکھی تھی اور اپنی سیکلی سے با تین کرنے میں مصروف تھی۔

جب اس نے نظریں اٹھائیں تو اسے گوم نیلمبر نظر آیا، وہ لرزائھی اور اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی دھنڈتیر نے لگی اور اس دھنڈ لکھے میں گوم کا چہرہ اس کے سامنے جھلما تارہا۔

گوم نے گرج کر کچھ سناتے ہوئے دیکھا اور تماشائیوں کے اس ہجوم میں اسے وہ دکھائی دی، وہ چند لمحوں تک اپنا مکالمہ فراموش کر کے وہ بہوت اسے دیکھتا رہا۔

پھر یک لخت اس نے اپنی نظریں جھکایں۔

کیونکہ جمپک جو اودی ساری پہنے اس کے سامنے بیٹھی تھی، جو اتنے انتظار، اتنی تلاش کے بعد اسے یوں اچانک نظر آگئی تھی۔ گومم نے اسے اس وقت دیکھا جبکہ اس کی مانگ میں سیند و رتھا اور پیروں میں سرخ مہندی اور بچھوے اور اپنے چھوٹے سے بچے کو گود میں لیے تماشا گاہ کے فرش پر سہیلیوں کے ساتھ آلتی پاتی مارے اطمینان سے بیٹھی تھی۔

اور آن کی آن میں وہ دوسرے کنارے پر بیٹھ گیا کیونکہ پہلے وہ مقدس تھی اب مقدس تر ہو چکی تھی، وہ ماں تھی اور اب یہ بیک اس پر انکشاف ہوا کہ شکستا، دمپتی، ساوتزی اور سیتا کیسی رہی ہوں گی، کیسی لگتی ہوں گی۔

اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ اتفاقات، حادثے، وقت کے انوکھے کھیل بھی بہت بڑی حقیقت ہیں۔

وہ سن بھل کر پھر اداکاری میں مصروف ہو گیا۔ وہ آپ ہی آپ چپکے چپکے آنسو پیٹی رہی۔ ایک شخص نے دنیا تیاگی پھر بھی اس کی یاد سے نہ ہٹا سکا، وہ ہری شکر تھا۔ ایک شخص نے اس کی یاد سے بچنے کے لیے تیاگ کی بجائے دنیا میں پناہ ڈھونڈی اور پھر بھی ویراگی رہا گو ظاہر میں مکمل دنیا دار بنا، وہ گومم نیلمبر تھا، وہ خود، وہ دھیاری نہ دنیا تیاگ پائی نہ دنیا میں زندگی کی مرتاوی ہی کو حاصل کر سکی۔ یہ سب مایا کے کھیل تھے۔

اسے وہی کرنا پڑا جو عورت کی حیثیت سے اس کے بھاگ میں لکھا تھا اور جو غالباً اس کا فرض تھا۔ راجن کے قتل کے بعد اسے دوسری شہزادیوں کے ساتھ پکڑ کر پائی پتر لایا گیا۔ ایو دھیا کے راج گھرانے کی ساری لڑکیوں سے فاتحین نے

شادیاں رچائیں۔ اس کا بیاہ بھی چانکیہ مہاراج کے ایک افر سے کر دیا گیا جو پچاس سالہ، موٹا، گنج اور نہایت چالاک برہمن تھا جو مالیات کے محکمے میں ملازم تھا اور ہر وقت ننانوے کے پھیر میں پڑا رہتا تھا۔

جمپک کا دھرم تھا کہ اس کی پرستش اور اس کی خدمت کرے کیونکہ وہ اس کا شوہر تھا اور وہ اس کی خدمت کرتی تھی۔ جیسے پائلی پتر کی اور ہزاروں گردہ پتینیاں تھیں ان میں سے ایک وہ بھی تھی، اس میں کوئی خاص بات نہ تھی اور اس کی گود میں اس کا بچہ تھا اور وہ اپنی سیکلی سے اوہرا دھر کی عام باتیں کرنے میں مصروف تھی۔ فلسفوں کے ذکرے کا وقت نکل چکا تھا۔

اس نے احتیاط سے اپنے آنسو پوچھئے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ پتی ورتا عورت ہونے کی حیثیت سے اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔

کچھ دیر بعد جب تمثیل کا پہلا باب ختم ہوا اور پرودھ اگر تو اس نے آہستہ سے اپنی داسی کے کان میں کچھ کہا۔ داسی اوہرا دھر دیکھتی ہوئی سرعت سے باہر چلی گئی۔

۱۷

پہلے باب کے خاتمے پر گوم بھی ٹنگ بھومی کے پیچے سنگھار کرے میں گیا جہاں دوسراے ادا کار آ آ کر جمع ہو رہے تھے۔

”ایک داسی تم سے مانا چاہتی ہے۔“ امیرکانے آئینے کے سامنے اپنی مالائیں اتارتے ہوئے مرکراس سے کہا۔

”کون ہے؟“ گوتم نے پوچھا۔ اس کی آواز میں سے ساری درشتی، سارا چہ چہ اپن غائب ہو چکا تھا۔ امیریکا اس کی اس اچانک تبدیلی پر ہکا بکارہ گئی، وہ کس قدر شانت معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گھر اسکون تھا۔

”بٹا نہیں۔“ امیریکا نے ذرا ہکلا کر جواب دیا، ”تم خود دیکھ لو۔“ اور پھر وہ اپنے مابوسات اٹھا کر دوسری رقصاصوں کی طرف چلی گئی۔

گوتم سنگھار کمرے کی سیر ہیوں پر آیا جو باہر باغ میں اترتی تھیں۔

نیچے ایک سانوں کی خادمہ کھڑی تھی۔ اس نے جھک کر گوتم کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور اس نے کہا: ”میری رانی نے تم کو پر نام کیا ہے اور کہا ہے کہ کیا تم جاتے وقت ان سے مل کر نہ جاؤ گے۔“

وہ ایک سیرھی اثر کر نیچے آیا اور چند لمحوں تک گم سم کھڑا رہا۔ پھر اس نے جواب دیا: ”نہیں۔ اپنی رانی سے کہو، جو جا گتا ہے اسے ایک دن نیندا آ جاتی ہے اور جو سوتا ہے وہ ایک روز جاگ اٹھتا ہے۔ ان لوگوں کی طرف دیکھو جو برادر جا گتے رہتے ہیں۔ ان سے کہنا، اب میں بھی جاگ رہا ہوں اور اب کوئی ش میرے راستے میں نہیں آ سکتی۔ اور ان سے یہ بھی کہنا کہ کیا وہ بھول گئیں کہ پتی ورتا عورت کے لیے دوسرے مرد سائے کے سماں ہیں۔۔۔؟ اب تم جا سکتی ہو۔“

وہ جھا نخشن بجا تی تمثیل گاہ کے اندر گئی اور چند لمحوں بعد واپس آ گئی اور اسے یہ دیکھ کر ذرا بھی تعجب نہ ہوا کہ وہ اب تک وہیں سیر ہیوں پر کھڑا تھا۔ اس نے قریب آ کر کہا: ”میری رانی کہتی ہیں تمہارا خیال ٹھیک ہے، اگر اب جاگ گئے ہو تو یہ بھی بہت اچھا ہے۔ دوسری بات کا جواب یہ ہے، انہوں نے کہا ہے کہ تم پتی

وہ تا کے معنی کیا جانو، لیکن ٹھیک ہے، کسی شے کو تمہارا راستہ روکنے کا کوئی حق نہیں ہے، اب تم بھی جاسکتے ہو۔۔۔

اتنا کہنے کے بعد وہ جلدی سے منہ پر گھونگھٹ کھینچ کر تماشا یوں کے ہجوم میں غائب ہو گئی جو دوسرا باب شروع ہونے کے لیے اندر جا رہے تھے۔

تمثیل ختم ہونے کے بعد گوم تماشا یوں پر نگاہ ڈالے بغیر رنگ ہجوم سے باہر نکلا۔ سنگھار کمرے میں جا کر اس نے اپنے رشیمیں کپڑے اور گھنے اتارے۔ ایک سفید چادر کندھے پر ڈال کر نگنے پاؤں وہ ہجوم کی نظروں سے بچتا تماشا گاہ سے باہر آ گیا اور اس قدر تیز رفتاری سے شہر کے چانک کی طرف بڑھنے لگا جیسے کوئی مجرم قید خانے سے نکل بجا گا ہوا اور ڈرتا ہو کہ پہرے دار سے پھر سے نہ پکڑ لیں۔ ہر طرف گہما گہما تھی۔ سڑک کے دونوں طرف سرایوں میں تیز روشی جل رہی تھی۔ طعام خانوں میں سے کھنکھتے قہقہوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ شفا خانوں میں مریض لیٹے موت کا یا تندرستی کا انتظار کر رہے تھے۔ بازاروں میں چاندی اور تانبے کے سکے کھنک رہے تھے۔ سوتی ساریاں پہنے مزدور عورتوں کی ٹولیاں کپڑا بننے کے سر کاری کارخانوں میں کام کر رہی تھیں۔ ہتھیار خانوں میں اسلحہ گھڑے جارہے تھے۔ دریا کی بندراگاہ پر جہاز بنا رہے تھے۔ چلتے چلتے وہ دیشیاں کے علاقے میں سے گزر را جہاں ٹھیکوں، جواریوں، مداریوں اور نقلي جادوگروں کے اڑوں پر جوا ہو رہا تھا۔ دور سے راج محل کے بلند کنگورے نظر آ رہے تھے۔

اس وقت سرات اپنے دیوان خانے میں لیٹے چانکیہ مہراج کے ساتھ چڑ

رنگ (شترنج) کھیل رہے ہوں گے۔ یہ سوچ کر بھی وہ مسکرایا۔

ایک دلیشا اس کے قریب سے اسے بغور دیکھتی ہوئی گزر گئی۔ غالباً یہ بھی دوسری قابل ولیش ناریوں کی مانند جاسوسی کے مجھے میں ملازم تھی۔

سوال یہ ہے، چانکیہ مہراج سے کوئی پوچھئے، اس نے دل میں کہا، کہ کون کس پر جاسوسی کرے گا؟ وہ پھر مسکرایا۔

اب اندر ہمرا چھار ہاتھا اور تاروں بھرے آسمان کے نیچے فصیل کے بر جوں میں پہرے دار للاکار رہے تھے، وہ ایک پھائک کے قریب پہنچ کر ٹھہر گیا۔ اس شہر پناہ کے چونسٹھ پھائک ہیں۔ کوئا پھائک میری منزل کے راستے پر کھلتا ہے۔؟

پھرے دار نے اسے کوئی غریب باعزت برہمن سمجھ کر خاموشی سے باہر جانے دیا۔ وسیع خندق عبور کر کے وہ شاہراہ پر آ گیا جو پریاگ کی سمت جاتی تھی۔

سون ندی عبور کرنے کے بعد کئی دن تک وہ سرگرم سفر رہا۔ راستے میں اندر ہمرا جنگل پڑتے تھے اور ندیاں نالے۔ ندیوں کے کنارے سادھو تپیا میں مصروف تھے۔ وہ پرستھ، جوگر میوں میں چلچلاتی دھوپ میں بیٹھے، بر سات میں باڑش میں شرابور ہوتے، جاڑوں میں بھیگے کپڑے پہننے تاکہ جسم کی تنظیف زیادہ ہو۔ اسے یاد آیا وہ ابھی ایک بار بول کے کانتوں پر سویا تھا، پانی میں ایک ٹانگ سے رات بھر کھڑا رہا تھا۔

ون پرستھ کے بعد سنیاں کا دور آتا ہے جب تاک الدنیا انسان مستقل سفر میں رہتا ہے۔ غالباً میرا بھی یہی دور ہے، وہ زمانہ جس میں نہ موت کی تمنا رہتی

ہے نہ زندگی کی، وہ چلا کیا۔ راہ میں شہر تھے، سرکاری کھیت، آشرم، مورپا لئے والوں کے گاؤں۔ اس کاٹھانہ کدھر ہے؟
لیکن ڈرنے کی کیابات تھی، وہ زمین کے ساتھ تھا۔ زمین اس کی ماں تھی، وہ اس کا ساتھ دے گی۔

گھاس کی بھی خوبی، پھروں کی خنکی اور مٹی کی قوت اس نے اپنے تلووں کے نیچے محسوس کی۔ اس نے بازو پھیلا کر ہوا کوچھوا اور آہستہ آہستہ دہرا دہرا شروع کیا: زمین (رگ وید کی ایک حمد) تیری پہاڑیاں، برفانی پہاڑ اور جنگل مسکرار ہے ہیں۔ میں تیری سطح پر کھڑا ہوں، میں مغلوب نہیں ہوا، مجھے کوئی گزندگی میں پہنچا مجھے زخم نہیں لگے۔ میں سالم ہوں، مجھے کوئی ختم نہ کر سکا۔

زمین تیرے اندر کیا کچھ ہے۔ تو جو بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے انسانوں کو اپنے اوپر لا دے ہے، جس نے ہزاروں ندیوں کی صورت میں مجھے دولت عطا کی ہے۔ کون گاؤں، کون جنگل، کون سبھائیں زمین پر ہیں، جہاں ہم تیری تقدیس کرتے ہیں۔ زمین مجھے ٹھانہ دے۔ مجھے کہیں ٹھانہ دے۔

اسے چلتے چلتے کئی دن گزر گئے۔ طرح طرح کے پوتوں اور پھولوں کی ٹہنیاں اس کے راستے میں جھک جھک آئیں پرندے اس کے ہمراہ سیڑیاں بجا رہے تھے۔ ساون کی بوندیں کنوں کے پتوں پر جل تر گچھیرہ ہی تھیں۔

کھیتوں پر بادل جھکے کھڑے تھے۔ لڑکیوں کی چڑیاں ہوا میں اڑ رہی تھیں۔ وہ ایک منڈیر پر کھڑا ہو گیا اور بھیگی آنکھوں سے اس نے اس منظر کو دیکھا۔ بڑھتی جاؤ۔ بڑھتی جاؤ، اوجو کی بالیو۔ تاکہ ہمارے گھرے بھر جائیں۔ طوفانوں

سے محفوظ رہو۔ جو کی الوہی بالیو۔ سمندر کی طرح اتحاہ رہو، وہ سب امر رہیں جو تمہاری خدمت کرتے ہیں۔ تمہارے کھلیان امٹ (رگ وید کی ایک حمد) رہیں۔ اس نے چپکے سے اپنی پلکوں کو خشک کیا۔ پھر آسمان کی اور دیکھا۔ باolloں میں سے ایک قطرہ ٹپ سے اس کی پلکوں پر آن گرا۔ جس طرح پینی میں بھار کی بوندیں پک جاتی ہیں۔

وہ منڈیر پر سے اتر کر پھر پگڑی پر آگیا اور سڑک پر چلنے لگا۔ افق پر سیاہ بادل گرج رہے تھے، وہ خوشی سے سرشار تھا۔ اس کے دل میں طوفانی دریا الہریں مار رہے تھے۔ اس کے دماغ میں سریلے آبشار گیت گارہے تھے۔ اس نے اندر کو اپنی معیت میں کھڑا پایا۔ رو اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ مسرت میں ڈوب کر اس نے باolloں پر نگاہ ڈالی۔ ایک درخت کے تنے سے بیک لگا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ بوندیں پتوں میں سے چھن چھن کر اس کے بالوں کو بھگوتی رہیں۔ بارش کے قدرے اس کے خوبصورت اداں چہرے پر جھرنے کی طرح گرا کیے۔ اس نے آہستہ آہستہ رو رکی تقدیں کی:

رتحہ بان (رگ وید کی حمد) کی طرح جو اپنے گھوڑوں کو کوڑے لگاتا ہے، وہ بارش کی آمد کی اطلاع دے رہا ہے۔ آسمان پر بادل امنڈ آئے ہیں اور دور سے شیروں کے دھاڑنے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ ہواتیز ہے اور بجلی چمکتی ہے۔ پودے تیزی سے بڑھ رہے ہیں اور آسمان پر دھند چھاتی ہے۔ زمین پر بیج گرے ہیں اور زرخیز بارش سب کے لیے بر سے گی۔ گرج اور دھاڑ۔ دھاڑ اور گرج۔ بیج بو۔ پامی کے زور دار چھینٹے اڑاتے رتحہ میں اڑتا ہوا، بستا ہوا آتا کہ جل اور تھل

ایک ہو جائیں۔

رات بھر بارش ہوتی رہی۔ پھر صبح ہوئی اور بارش تھمی اور روشنی پھیلی۔ کنجوں میں فنکھر پھونگے جا رہے تھے۔ ندیوں کے کنارے برآمن اوسا کی حمد الاب رہے تھے۔

روشنی پھیل گئی۔ برہمنوں نے کہا۔

ان گنت آنے والی صحبوں میں سب سے پہلی، گزری ہوئی صحبوں کے راستے پر چلتی ہوئی او شازندہ انسانوں کو اٹھا رہی ہے لیکن جو مر چکا ہے اسے وہ نیند سے نہیں جگائے گی۔

تو، جس کے رتھ میں اودے گھوڑے جتے ہیں، پر وہت اور شاعر تیری تقدیس کرتا ہے۔۔۔ برہمنوں نے کہا۔

دولت مند اڑکی، آج کے دن ہم پر اپنا فضل کر۔
بہادر بیٹی اور گائیں اور گھوڑے عطا کرنے والی اوشا، شاعر اپنی حمد و ایو (ہوا) سے بلند تر آواز میں ختم کر رہا ہے۔

خداوں کی ماں، جگمگائے جا اور ہمیں قوموں میں بلند ترین مرتبہ عطا کر۔۔۔ اور ایسا ہو کہ مترا اور وردنا اور سندھو اور زمین اور آسمان ہماری حفاظت کریں۔
برہمنوں نے کہا۔

گوتم ہوا کے نرم جھونکوں کی زد میں چلتا آگے بڑھتا گیا۔

خداوں کی ماں۔ جگمگائے جا اور ہمیں قوموں میں بلند ترین مرتبہ عطا کر۔
برہمنوں کی آواز اس کے پیچے دریا پر پھیلتی گئی۔۔۔ وہ مندروں کی قطار کے

سامنے سے گزر کر پھر جنگل کے راستے پر آگیا۔

سامنے ایودھیا تھا۔

تب وہ بھیگی مٹی پر دوزانو بیٹھ گیا اور اس نے دیکھا کہ چاروں اور خلا ہے اور اس میں ہمیشہ کی طرح وہ تنہا موجود ہے۔ دنیا کا از لی اور ابدی انسان۔ تھکا ہوا شکست خورده۔ بتش۔ پرمیں۔ انسان جو خدا میں ہے اور خود خدا ہے اور سامنے ایودھیا کا سنہر اشہر تھا، جو بارش کے دھنڈ لکھ میں یوں جگہ گارب اتھا نو سارا کاسارا سونے کا بنا ہوا اور اس میں سے جگر جگر کرتی تیر کرنیں نکل رہی تھیں۔

پھر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کی آواز میں یقین تھا اور شان اور غرور۔ اس نے اپنے خدا کو لکار کر مخاطب کیا۔ اس نے کہا:

خداوند۔ تو جو آگ ہے، تو سورج ہے، ہوا، چاند، ستاروں والا آسمان، تو برمہا ہے، پانی ہے، پر جا پتی ہے۔

تو عورت ہے، تو مرد ہے، تو نوجوان ہے، تو اڑکی ہے، تو وہ بوڑھا ہے جو اپنی لائھی شیکتا اڑکھڑاتا ہوا جا رہا ہے، تو اپنے چہرے کا رخ ہر سمت کیسے پیدا ہوتا ہے۔ تو گھری نیلی مکھی ہے، تو سرخ آنکھوں والا سبز طوطا ہے، تو طوفانی بادل ہے، تو سارے موسم ہے، تو سمدر ہے۔

-- دو پرند، چھیتے دوست، ایک درخت پر بیٹھے ہیں۔ ایک پھل کھا رہا ہے دوسرے سے لکر لکر دیکھتا ہے۔ اسی درخت پر انسان بیٹھا ہے۔ اداں، اپنی کم طاقتی پر متغیر، لیکن وہ جو دوسرے کو مطمئن دیکھتا ہے اور اس کی عظمت پہچانتا ہے اس کا اپنا دکھتم ہو جاتا ہے۔ جو رگ وید کی اس امث هستی کو نہیں جانتا جس کے اندر خدا

رہتے ہیں رگ وید کا اسے کیا فائدہ ہوا۔؟ وہ جو اسے جانتے ہیں مضمون بیٹھے ہیں۔

وہ جو اسے پہچان گیا، جو اطیف سے اطیف تر ہے، جس کے بہت سے روپ ہیں، جو شیو، یعنی سرور ہے۔

اور جب روشنی بلند ہوتی ہے تو نہ دن باقی رہتا ہے نہ رات، نہ وجود، نہ عدم وجود۔ صرف شیو باقی ہے، وہ ابدی روشنی ساوترا کی ہے، جس روشنی سے عقل پیدا ہوتی۔

اس کا حسن دیکھا نہیں جاتا۔ اس کے جلال اور عظمت کی شبیہ نہیں بن سکتی، وہ دل میں موجود ہے۔

تو جو پیدا نہیں ہوا، ان الفاظ کے ساتھ کوئی تحریر کانپنا تیرے نزدیک آتا ہے۔ اور وہ میری حفاظت کرتے۔

وہ دنیا میں تنہا پرندہ ہے، وہ آفتاب کی مانند ہے۔ جو سمندر میں ڈوب چکا ہے۔ انسان جو اسے جان جائے موت پر سے گزر جائے گا۔

کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ سفر کا نہیں۔

پھر اس نے آنکھیں کھولیں۔ اس کا جسم مرتعش تھا، جس طرح تان پورے کے تار جھنجھناتے ہیں۔ اس کے قدموں کے نیچے پانی کے بنپنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ سر جو بے نیازی سے روایا تھی۔

پھر اسے لگا جیسے اسے کوئی دور سے آواز دے رہا ہے بارش کی وجہ سے دریا کا پاٹ بیحد و سعی ہو چکا تھا۔ اس نے غور سے نالیکن آواز اس کے کانوں تک صاف

نہیں آ رہی تھی۔ اس نے بہت غور سے، ماتھے پر ہاتھ کا سایہ کر کے دیکھنے کی کوشش کی، اسے کچھ نظر نہ آیا۔ ندی کے دوسرے کنارے پر نارنجی پوشک میں مابوس ایک ہیو لے ساڑوں رہا تھا۔

تب اس نے گھاث پر بیٹھی ہوئی ایک لڑکی (اس لڑکی نے کیسری ساری پہن رکھی تھی اور اس کے بالوں میں چمپا کے پھول تھے) سے پوچھا: ”کچھ جانتی ہو، ندی کے اس پار کون رہتا ہے؟“

”کچھ بھکشو لوگ ہیں۔“ لڑکی نے بے پرواںی سے جواب دیا اور پیر دھونے میں مصروف رہی۔ ”وہ ان میں سے ایک سامنے کھڑا تو ہے۔“

”تم اسے جانتی ہو؟“

”میں اسے جان کر کیا کروں گی۔۔۔؟“ لڑکی نے حیرت سے پوچھا۔

”اچھا ذرا میں اس سے مل آؤں۔“

”ایسی طوفانی ندی کو پار کرو گے؟۔۔۔ اس وقت تو یہاں کوئی ناؤ بھی نہیں ہے۔“

”کیا حرج ہے۔۔۔ ندیاں پار کرنے کے لیے ہی تو ہیں۔“

موسم بے حد سہانا ہو چکا تھا۔ مور جھنکار رہے تھے، پیسیہ چلاتے تھے، ہنورے گونج رہے تھے۔ بہت سے پھول ڈال سے ٹوٹ کر اس کے قدموں پر آن گرے۔ اس نے جھک کر انہیں اٹھایا اور ندی میں بہادیا۔ پھر وہ پانی میں کو دگیا اور دوسرے کنارے کی طرف پیر نے لگا۔

دوسرے کنارے پر ایک اوہیڑ عمر کا بھکشو، نارنجی پوشک میں مابوس، دیر سے

اس کی راہ تک رہا تھا۔ گوتم کو اپنی اور آتے دیکھ کر اس کا چہرہ انہ باط سے جگمگا اٹھا۔ وہ ندی آدھی سے زیادہ عبور کر چکا تھا تب اس نے بھلشوکی آواز سنی:

”بھائی گوتم۔“

”ہاں بھائی ہری شکر۔۔۔ پہنچتا ہوں۔۔۔ ٹھہرے رہو۔۔۔“ اس نے زیادہ تمیزی سے پیدا شروع کر دیا۔

اتئے میں پانی کا ایک زوردار ریلا آیا جس کے تھیڑے سے وہ کنارے کے بہت قریب پہنچ گیا مگر اب پانی کی لہریں اوپنچی ہو چکی تھیں۔ اس نے پوری طاقت سے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے مگر پانی میں اس سے زیادہ طاقت تھی۔ اسی شکمش میں اسے ایک چٹان ایسی نظر آئی جو پانی کے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ یہ چندی کے شکستہ مندر کا ایک حصہ تھا جو باہر کو جھک آیا تھا۔ اس نے جلدی سے اس کی ایک گلگر کو پکڑ لیا۔ اب وہ بہت تحکم چکا تھا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ پتھر کو پکڑ کر اس نے ذرا کی ذرا آنکھیں بند کیں۔ وقت کا ریلا پانی کو بہائے لیے جاتا تھا۔ چاروں اور وععت تھی لیکن پتھر کو اپنی گرفت میں لے کر اسے ایک لختے کے لیے اپنی حفاظت کا احساس ہوا کیونکہ پتھر، جس کا ماضی سے تعلق ہے، آنے والے زمانوں میں بھی ایسا ہی رہے گا۔

لیکن اس کے ہاتھوں کی انگلیاں کئی ہوئی تھیں اور وہ پل بھر سے زیادہ پتھر کو اپنی گرفت میں نہ رکھ سکا۔

سر جو کی موجودیں گوتم نیلمبر کے اوپر سے گزرتی چلی گئیں۔ ابوالمنصور مال الدین نے کنارے پر پہنچ کر اپنا شیام کرن گھوڑا بر گد کے درخت کے نیچے باندھا

اور چاروں اور نظر ڈالی۔ اس کی تھکی ہوئی آنکھوں کو یہ جگہ بڑی سہانی معلوم ہوئی۔ سامنے ندی بہہ رہی تھی۔ دور جھونپڑے بنے تھے۔ شوالوں میں سے گھنٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ بر گد کے درخت کے نیچے کسی پیر کا مزار تھا۔ گاؤں کی عورتیں گھونگھٹ کاڑھے آتیں اور مزار پر پھول پھول چڑھا کر آگے چلی جاتیں۔ اس نے جھک کر پانی میں انگلیاں ڈبوئیں اور پانی کی خنکی اسے بہت اچھی لگی۔ پھر وہ کے نیچے، جہاں لہروں کا بھنوڑا یہاں بنا تھا، اس میں اسے اپنا چہرہ نظر آیا اور ایک لمحے کے لیے وہ متعجب سا ہو گیا، وہ یہاں آ کر کیا کر رہا ہے؟

چمپا اب تک نہ آئی تھی۔ اس نے دوبارہ ندی کی طرف دیکھا۔ شاید کشتی میں آتی ہو، مگر کشتی میں چند دیہاتی بھجن گاتے اپنی دھن میں مگن ایک سمت کو چلے جا رہے تھے۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر ایک جھاڑی پر پھیلی ہوئی امر نیل کا ایک پتا توڑا۔ کدم کی ٹھنپی پھولوں سے لدی تھی۔ چند پھولوں ٹپٹپ اس کے سر پر آگرے۔ اس نے گلڑی اتار کر ان پھولوں پر ہاتھ پھیرا اور اپنی تلوار کے منقش قبضے کو چھووا۔ پھولوں کے اس ہجوم میں تلوار اسے بہت بے تکلی معلوم ہوئی۔ اس نے آہستہ آہستہ تلوار کر سے علیحدہ کر کے گھاس پر رکھ دی۔

تب پانی میں پیرتی ہوئی چمپا گھاث پر آگئی۔

”ہم تو تجھے تھے تم کہیں اور مارنے کے لیے چک دیے۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ابھی تک تو نہیں۔ پر اب شاید چلا جاؤں۔ کچھ عرصے بعد۔“

”کہاں۔“ اڑکی نے گھبرا کر پوچھا۔

”بہار۔ اور اس سے بھی آگے، بنگال۔“

”وہاں جا کر کیا کرو گے۔ یہیں رہو۔“

”وہاں میرے بھائی بند ہیں۔“

”جھوٹ مت بولو۔ تمہارے بھائی بند کہیں پیاروں میں لوٹ مار مچاتے ہوں گے۔ گوڑ کے دربار میں ان کا کیا کام۔“

”تم میرے بھائی بندوں سے بہت خفا ہو اور دوسرا بات یہ کہ وہ لوٹ مار نہیں مچاتے۔ یہ تو کوں اور انقاونوں کا مشغله ہے۔ میں عرب ہوں۔ میرا کام فلسفہ دالی ہے اور۔“ اس نے ذرا رک کر کہا، ”میری ماں ایرانی تھی اور ایران والے، اوپر قوف لڑکی، شعر کے پرستار ہیں، خون نہیں بھاتتے۔“

وہ اسی طرح ہنستی رہی۔ اب وہ گھاث کی سیڑھیوں پر بیٹھی اپنے بال سکھاری تھی۔

”ہنستی رہو۔ ایک روز زیر دستی اڑا کر لے جاؤں گا۔ پھر بعد میں جو چاہنا کہنا۔“

”ہے ہے۔ ایسا اندھیرہ کرنا۔ شکر کرو یہ گاؤں ہے جہاں تم سے بات کر لیتے ہیں تو کوئی برائیں مانتا۔ جو نپور میں اگر اس طرح تم گھنٹوں ہم سے باقیں کرتے تو دیکھتے اپنا حشر۔“

”جونپور میں تو میں تم کو قطعی بھگالے جاتا۔ لے جا کر سیدھا اپنی حوالی میں بند کر دیتا۔“

”رام رام۔ کیسی باقی کرتے ہو۔ جونپور میں ہمارا ایسا مہاتما سماں با دشہاں

رہتا ہے، مجال ہے جو تم اسی حرکت کرتے۔“

”اجی دیکھے ہیں تمہارے مہاتما سان بادشاہ۔“

”کیوں۔ ایسے ایسے گیت بناتا ہے۔ جو انسان اتنا بڑا سنگیت کا رہو وہ دیوتا نہیں تو اور کیا ہو گا۔ ایک روز بھین نے مجھے ایک بڑا پیارا گیت حسینی کا نترامیں سنایا تھا۔ بھین کہتے تھے کہ یہ سلطان کی سنگیت ہے۔ اسے خیال کہتے ہیں۔“

”اب تم مو سیقی پر تقریر کرو۔ اور کل تم اپنے برآمدے میں بیٹھی کس کو حسینی کا نتر سنارہی تھیں؟ تم کتنے آدمیوں سے ملتی ہو؟“

”تم کواس سے مطلب۔ کمل جی تم اپنا رعب مجھ پر مت جھاڑو۔ صوبیدار ہو گئے اپنی فوج کے ہو گے مجھ پر کا ہے کی دھونس ہے۔“
میں صوبیدار نہیں ہوں۔ لا حول ولا قوۃ۔۔۔ ویسے سپاہی کا پیشہ ہی مرد کو بجتا ہے۔“

”قاتل کا پیشہ۔۔۔“

”پھر تم نے کمینی باتیں شروع کیں۔“

”اچھا اب نہیں کہنے کے، مگر ہو تم قاتل ضرور۔۔۔ جانے کتنی ماوں کے بیٹوں کو اس تلوار سے مارا ہو گا۔۔۔ ہائے ہائے۔“

”پھر وہی مرغے کی ایک ناگ، کتنی بار سمجھایا ہے کہ میں فوجی نہیں ہوں۔ سلطان کے کتب خانے کا نگران ہوں۔“

”وہ کیا ہوتا ہے۔“

”اس میں کتابیں لکھی جاتی ہیں، پلکتیں، جنہیں سمجھدار لوگ پڑھتے ہیں۔ یہ

جو ٹیز ہمی میز ہمی لکیریں تمہارا بھائی صبح سے شام تک چوکی پر بیٹھا باعث میں سے دائیں طرف کھینچا کرتا ہے ان کی کتابیں بنتی ہیں۔ سمجھیں۔“

”جانشی ہوں، مگر پھر یہ تلوار کیوں باندھتے ہو۔۔۔ یہ بڑی خوفناک چیز ہے۔“
”چمپا رانی اسے مردوں کا زیور کہتے ہیں۔ اس کے اور پیڑی کے بغیر لباس مکمل نہیں ہوتا۔ تم اودھ والوں نے افسوس کہ چتوڑ اور قنوج اور مالوے اور بندھیل گھنڈ کے راجپوت نہیں دیکھے۔ دیکھے ہیں کبھی! ایک مرایا ر ہے اودے سنگھ راثور۔ قنوج کا راجپوت ہے۔ کیا بانکا آدمی ہے۔ آج کل جانے کہاں ہو گا۔ ساتھا گوایر کے کرت سنگھ کی فوج میں ہے۔ پتا نہیں شاید مالوے میں کہیں اڑ بھڑ رہا ہو گا۔“ مال الدین چند جھوں کے لیے اپنے میدان جنگ کے ساتھیوں کی یاد میں ڈوب گیا۔ ”تم پورب والوں کا اس کے سوا اور کوئی مشغلم نہیں کہ بس گا میں بجا میں گے، پوچلاپاٹ میں لگے رہیں گے۔ ارے لڑکی زندگی کا اصل لطف تو میدان جنگ میں آتا ہے۔“

”ابھی تو تم کہتے تھے کہ مارنا مرنا خالی افغانوں کا کام ہے، تم کو تنا لکھتے ہو۔“ وہ جھنجھلا گیا: ”تم عورتوں سے بحث کون کرے۔“ اس نے امر نیل کا ایک پتا اور قوڑا۔

”دیکھو،“ لڑکی گھاٹ پر سے اٹھی اور اپنے سیاہ لمبے بالوں میں سے پانی جھنک کر ان کا جوڑا بناتے ہوئے بولی، ”جنگ کی باتیں مت کیا کرو۔ میں جب تم کو دیکھتی ہوں اور یہ تلوار دیکھتی ہوں تو مجھے بڑا وہم آتا ہے۔“

”وہ کیا چیز ہے؟“

”تم کو سمجھانا بیکار ہے۔“ وہ پھر سیڑھی پر بیٹھ گئی۔

مال الدین نے درختوں کے سامنے کی اور دیکھا جو ڈھلتے جا رہے تھے۔

”اچھا چمپاوتی تم کو خدا کے حوالے کیا۔“ وہ اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا۔

”ایو دھیا سے تم ابھی چلے جاؤ گے؟“

قریب سے درویشوں کی ایک نولی گزری، ان میں سے ایک نوجوان نے چمپا اور مال کو دیکھا اور پھر نظریں نیچی کر لیں اور سر جھکائے آگے چلا گیا۔

”یہ بھی کیا مسخرے لوگ ہیں۔“ مال نے اظہار خیال کیا۔

”مسخرے نہیں ہیں۔ بڑے پیارے لوگ ہیں۔ ان کا مذاق مت اڑانا۔“ چمپا نے یہ نکھت غصے سے کہا۔ ”ایک روز یہی تمہارا ساتھ دیں گے۔“

”تمہارے بھائی نے تمہیں اچھی خاصی پنڈتاں بنار کھا ہے۔ میں کسی روز اس سے مناظرہ کروں گا۔“

”وہ کیا ہوتا ہے۔“

”اس میں یہ ہوتا ہے کہ۔“ مال الدین نے جاتے جاتے مژکر رکاب میں سے پیر نکال کر اسے سمجھانا شروع کیا، ”کہ جیسے دو مذہب ہیں نا۔ ایک تمہارا۔۔۔ ایک میرا۔۔۔“

”میرا اور تمہارا کوئی الگ الگ مذہب ہے۔۔۔؟ میں تو ایک ہی سمجھتی ہوں۔“

”پھر تم نے خرقہ پوشوں والی باتیں شروع کر دیں۔ تو مطلب یہ۔۔۔“ اس نے پھر سمجھانا شروع کیا۔ ”کہ دو فریق اپنے مذہب کی سچائی ثابت کرنے کی کوشش کریں، اسے مناظرہ کہتے ہیں۔“

”سچائی ثابت کرنے والے ہم اور تم کون۔ وہ توستیہ پیر ہے جو سب جھوٹ
چک کافی صدہ کرتا ہے۔ کہہ بیکر اک رام چپوری۔ ہندو ترک نہ کوئی۔“

”پھر تم نے تقریر شروع کی۔ تم کاشی جا کر اپنے بیکر کی چیلی کیوں نہیں بن
جاتیں۔ مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے میں اپنا وقت کیوں خراب کرتی ہو۔“

”کاشی تم کو بھی ساتھ لے جائیں گے مگر اس سے پہلے تم کو اپنی توار اتنا
پڑے گی۔“

”یہی شرط ہے؟“

”بالکل یہی شرط ہے!“

”تم کو تو جونپور کا قاضی ہونا چاہتے تھا۔ اچھا خدا حافظ۔“

وہ دریا کی طرف بڑھا۔ اس پاروہ نوٹے پتھروں کا اونچا ذہیر ایسا کیا ہے؟“
”وہ۔۔۔ ارے وہ تو بہت پرانے مندر کے کھنڈر ہیں۔ سینکڑوں ہزاروں برس
پرانے۔۔۔“

”اور اس کے اوہ روہ جھونپڑیاں ایسی ہیں، ان میں کون رہتا ہے۔“

”ان میں بھی صوفی لوگ رہتے ہیں۔۔۔ بھگت۔۔۔“

”تب تو تمہارا وقت بہت اچھا کشنا ہو گا۔۔۔ صوفیوں کی نگت۔۔۔ مسئلے مسائل
ذکر اذکار۔۔۔ ایک اٹھارہ سالہ لڑکی کے لیے کس قدر دلچسپ مشفظے ہیں۔“

”اور کیا کریں۔۔۔ تمہارے جونپور کی شہزادیوں کی طرح محل سرا میں بیٹھ کر
شترنج کھیلا کریں۔“

”بالکل۔۔۔ لیکن میری محل سرا میں شترنج کے علاوہ کتنا بھی ہیں۔“

سینکڑوں۔ اور تم اس قدر عالم فاضل پہلے ہی سے ہو۔ میں تم کو عربی فارسی بھی پڑھا دوں گا۔“ وہ دفتار جھینپ کر سرخ ہو گئی۔ مال نے اسے تبسم کے ساتھ غور سے دیکھا۔ ”مگر تم عربی بولتی محیب مسخری لگو گی۔ نہیں بھائی۔ تم چمپا و تی ہی رہو۔ تمہارے روپ میں میں نے عورت کا حسین ترین روپ دیکھا ہے۔ اچھا خدا حافظ۔“ وہ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا۔

لڑکی کی آنکھوں میں آنسو بھلملا رہے تھے：“تمہارا پڑا اویہاں ختم ہوا۔ اب کہاں جاتے ہو؟” اس نے آہستہ سے پوچھا۔

”بہراجج۔ وہاں جانے کتنے دن لگ جائیں۔“

”بارشیں شروع ہونے والی ہیں، اپنا خیال رکھنا۔“

”ہاں۔ میں اپنا خیال رکھوں گا۔ خدا حافظ و ناصر یوقوف لڑکی!“ وہ اسے یوقوف لڑکی کہا کرتا تھا اور اس خطاب میں کتنا اتحاد پیار چھپا تھا۔ وہ آنسو پی کر مسکراتی۔ مال الدین نے گھوڑے کی بائیں موڑیں اور سڑک پر پہنچ کر غبار میں غائب ہو گیا۔

لڑکی گھاث پر اسے اٹھ کر اپنے مکان کی طرف روانہ ہو گئی جس کی کھپر میل پر نیلے پھولوں کی بیلیں چڑھی تھیں اور جس کے بیز رنگ کے کواڑوں پر دیوی دیوتاؤں کی رنگ برلنگی تصویریں منقش تھیں۔ برآمدے میں اس کا بڑا بھائی چٹائی پر بیٹھا کبیر کی نئی بانی کاغذ پر نقل کر رہا تھا۔ اس کے قریب دو تین دوست اور بیٹھے تھے۔ دروازے طاق پر بھوانی کی چھوٹی سی مورتی رکھی تھی جس کے سامنے رکھی ہوئی دھوپ کی پتلی سی لکیر لہرائی ہوئی اور پرانا ٹھہرہ تھی۔ چمپا نے دروازے کے

قریب کھڑے ہو کر اس پر سکون منظر کو دیکھا اور اپنے آنسوؤں کو خشک کرتی ہوئی
اندر چلی گئی۔

۱۸

بہراج کی چھوٹی سی آبادی میں پلیے رنگ کے کچے مکان اور ادھر بکھرے
تھے۔ خاک آسودہ ستون پر سے بیل گاڑیاں گز رہی تھیں اور اداسی کی بے رنگ،
بے نام کیفیت سارے میں طاری تھی۔ سنا تھا کہ کسی زمانے میں یہاں ایک بے
حد عظیم الشان شہر آباد تھا جسے شراوتی کہتے تھے۔ اس کے سوم ولیٰ بادشاہ بڑے جاہ
وجلال والے تھے اور نجومیوں نے شراوتی کے سوہل دیو سے کہا تھا کہ ایک وقت
آنے والا ہے جب اتر سے دیوز اور باند و بالاترک آ کر تمہارا خاتمہ کر دیں گے اور
غزنی کے محمود کا ایک سپہ سالار ادھر آیا جس کا نام مسعود غازی تھا اور اس مسعود
غازی نے سوہل دیو کا خاتمہ کر دیا اور ولیٰ میں قطب الدین ایک آیا اور اس کے
سپہ سالار احمد بختیار نے کوشل دیس اور مکده اور بنگال کے سارے بت پرست
بادشاہوں کا خاتمہ کر دیا۔

اور شراوتی اور نالنده اور وکرم شالا کے سارے برہمچاری اور بھکشو اپنے اپنے
پوتحی پتھرے وہیں چھوڑ کر ادھر بھاگ گئے یا مر کھپ گئے یا نیپال اور تبت کی
اور ننکل گئے۔

لیکن جس طرح شاکریہ منی پچھلے دو ہزار سال میں وشنو کے اوتاں بنادیے گئے

تھے اور مہايان بذریعت کے مندروں میں ہزاروں دیوی دیوتا آباد ہو چکے تھے اور سارا بنگالہ اور سارا بھارت انترک منتروں اور دینی تارکے بھجوں کی سریلی آوازوں سے گونج رہا تھا اسی طرح بت شکن سالار مسعود غازی پچھلی دو صدیوں میں بالے میاں کے روپ میں کوشل دیس کے سنواریوں کے لیے ایک اور دیوتا بن چکے تھے۔ ان کے مزار پر گھنی کے چراغ جلانے جاتے۔ ان کے جھنڈے اٹھائے جاتے۔ ہر سال دھوم دھام سے ان کی بارات ہلکتی۔
یہ کیسی عجیب باتیں تھیں۔

ابوالمنصور مال الدین، جو پہلی دفعہ بہراج آیا تھا، سالار مسعود کی زیارت گاہ کی دیوار سے لگ کر درخت کے سامنے میں بیٹھ گیا اور اچنچھے سے عورتوں کی ایک ٹولی کو دیکھنے لگا جو بھجوں میں پیش کی تھا لیاں سنجھائے سامنے مزار پر چڑھاوا چڑھانے کے لیے آ رہی تھیں۔ یہ ہندو عورتیں تھیں۔

اور گونا گونہ اور وکرم شیلا اور اجین اور امر اوتو کے عظیم الشان بین الاقوامی والاعلوم اب اجز چکے تھے اور شر اوتو کے پرانے آشرم سنگان پڑے تھے اور ان پوچھی پتروں کو سمجھنے والا اب کوئی نہ تھا جو عجیب و غریب زبانوں میں لکھے گئے تھے اور عجیب و غریب باتیں ان میں لکھی تھیں، ناقابل فہم فلسفے اور عقل سے بالآخر الہیات۔

مگر کچھ لوگوں کو پیدا آئی سنک ہوتی ہے اور کشمیر کے زین العبدین اور گوڑ کے علاوہ الدین حسین شاہ کی طرح جونپور کا حسین شر قبھی انہی سنکی لوگوں میں سے تھا۔ ان بادشاہوں نے مزید بت شکنی کے بجائے ان پوچھی پتروں میں دلچسپی لیا

شروع کر دی۔

حسین شرتی کو جب بھی دلی کے سلطان بہلوں اور سلطان سکندر سے جنگ کرنے سے فرصت ملتی وہ اپنا طنبورہ لے کر بیٹھ جاتا۔ راؤں کی دنیا کی نئی نئی سیاحتیں کرتا یا قدیم نسخوں کی ورق گردانی میں مصروف رہتا۔ پچھلے دنوں اسے ایودھیا کے چند پنڈتوں سے معلوم ہوا تھا کہ بہراجھ کے کسی مٹھے میں ڈیڑھ پونے دو ہزار سال پرانے سنسکرت کے کچھ تاب پتھر موجود ہیں۔ اس نے اپنے کتب خانے کے جواں سال نگران ابوالمحصور مال الدین کو ان پنڈتوں سے ملنے کے لیے ایودھیا بھیجا۔

مال الدین ایودھیا چند دنوں کے لیے گیا تھا لیکن اس کا وہاں اتنا جی لگ گیا کہ اسے تقریباً یاد ہی نہ رہا تھا کہ اسے وہاں سے آگے گئے ترائی کی طرف بھی سفر کرنا ہے کیونکہ ایودھیا میں اسے انہی پنڈتوں میں سے ایک کی بہن نظر آئی جو چھپاویتی کھلاتی تھی۔

اپنے دیقا نوی فلسفوں کو چھوڑ کر سلطان کے حکم کے مطابق، جن کی تلاش میں مال ان کے پاس گیا تھا، سر جو کے کنارے رہنے والے یہ پنڈت لوگ ایک نئے چکر میں پڑے ہوئے تھے۔ اس چکر کا نام انہوں نے بھگتی رکھ چھوڑا تھا، وہ لوگ دن رات زگن رام، زگن رام جپورے بھائی کی رث لگایا کرتے۔ ان ہی کے یہاں مال الدین شنگر اچاریہ اور ولہا اور راما نند کے ناموں سے آشنا ہوا اور اب وہ سب کے سب کاشی کے بھگت کبیر کے پیچھے دیوانے ہوئے جا رہے تھے لیکن مال کو بھگت کبیر یا کسی اور بھگت یا سنت یا اچاریہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی، وہ

اپنے آپ کو فلسفی نہیں سمجھتا تھا، وہ مورخ بننا چاہتا تھا۔ اسے دنیا کی قوموں کی تاریخ بڑی عجیب لگتی۔ سلطان نے اسے مختلف مہم قسم کی تاریخیں لکھنے پر مامور کر رکھا تھا اور اس کا وقت بہت اچھا کٹ رہا تھا۔ لیکن اب سلطان کا حکم تھا کہ پنڈتوں کی مدد سے سنکریت اور پالی اور پرآکرت اور ارادہ مگدھی میں کامی ہوئی ان بے شکنی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرے۔ یہ کام بھی زیادہ غیر دلچسپ نہ تھا گو وہ جلد از جلد جو پورا پس پہنچنا چاہتا تھا جہاں شاہی محل میں سلطان کی بھانجی رہتی تھی جس کے لیے اس نے بہت سی نظریں لکھی تھیں اور جس کے تصور میں اسے نہ بہت سی چاند نی راتیں کتب خانے کی برجیوں میں پینٹ کر جائے ہوئے گزار دی تھیں۔

لیکن ایودھیا میں اسے ایک براہمن زادی ملی جو اس سے ہر وقت کبیر کی باتیں کیا کرتی، اس سے ائمہ سیدھی بھیشیں کرتی اور کچھ عرصے کے لیے وہ جو پور کی شہزادی کو بھول گیا۔

اب وہ چمپاوتی ہی کے خیال میں کھویا رہتا کیونکہ وہ بڑی انوکھی، بڑی نئی سی چیز تھی۔ تاجیہ اور ارم رباب اور شہزادی سلیمانہ بانو بیگم سے بالکل مختلف۔
مرد بیشہ تنوع پسند کرتا ہے۔

پرانی کتابوں کی جستجو میں وہ سارے مٹھوں میں گیا جو پانچ چھ سو سال قبل یہاں شنگر اچاریہ کے چیلوں نے قائم کیے تھے۔ شراویتی کے کھنڈروں میں گھوما جو بہرائچ کی بستی سہت مہت کے علاقے میں پڑے سائیں سائیں کر رہے تھے اور جہاں دن میں الوبولتے تھے اور رات میں چمگاڑیں اپنے پر پھیلاتی ہیں۔ ایک روز اسے انہی کھنڈروں میں پھرروں اور شہزادیوں کا ایک بہت بڑا انبار نظر آیا جس

کے چاروں طرف گلیاں تھیں۔ یہاں بھی شامدار بازار رہا ہو گا اور اوپری اونچی حوصلیاں بنی ہوں گی، وہ حیرت اور اشتیاق کے ساتھ اس عمارت کے اندر گیا۔ اس کے سارے کمروں میں گھوما۔ گودام، نشست کے ایوان، جن کی دیواروں میں آتش دان تھے، کوٹھریاں، غسل خانے، آنکھوں میں بنے ہوئے کنوں اور تالاب۔ مکان کے شمالی مشرقی حصے میں چھوٹا سا مندر تھا۔ جنوبی مشرقی کونے میں باورچی خانہ تھا۔ پندرہ سولہ کمرے سارے میں پھیلے تھے۔ چاروں طرف برآمدے تھے۔ اوپر کی منزل میں جھروکے تھے۔ وسط میں آنکھ کے گرد اگر جو برآمدی تھا اس کے ستون نوٹے پھولے بکھرے پڑے تھے۔ ان ستونوں کے اختتام پر ہاتھی کے سر ترثے ہوئے تھے۔ یہ جانے کس کا مکان رہا ہو گا، مال نے سوچا۔ پھر اس نے ایک دیہاتی کو آواز دی جو گھاس کا گٹھا سر پر اٹھائے سامنے کی شکستہ گلی میں سے اگزر رہا تھا۔ دیہاتی رک گیا اور اسے پر اسرار، سوالیہ نظرؤں سے دیکھنے لگا۔ مال کو ایک پھر بیسی آئی۔ اس نے ہمت کر کے حلق صاف کیا اور بولا: ”اے بھائی۔ جانتے ہو یہ کس کا مکان ہے؟ یہاں کے راجا کا تو نہیں۔“

”راجا کا۔“ دیہاتی کھلکھلا کر ہنسا گویا بہت بڑا طینہ اس نے سنا ہے۔ ”ارے راجا کا مکنوا اتنا چھوٹا۔؟ راجا کے محلوں پر تو ہل چل گئیں۔ ای تو ہجارت مرس پرانی حوصلی ہوئے۔ پر کھن سے سننے ہن ای ما کوڈ بآہمن پر وہت رہت رہے۔ ان کا لڑکوں کا بڑا دو ان رہا۔“

”اس لڑکے کا نام جانتے ہو۔؟“

”ہم کا جانی۔ ہم بچ نام ناہیں یاد رکھتے ہیں۔ نام مٹ جاتے ہیں۔ کھالی

کھدائے کا نام امر ہو۔۔۔ اتنا کہہ کروہ اپنا گلھا سنجال کر آگے بڑھ گیا۔

مال کو بڑی جھنجھلاہٹ محسوس ہوئی۔ سلطان کا فرمان ہے اس ملک کی تاریخ لکھو۔ ایسے ابدیت پرست لوگوں کی تاریخ کس طرح لکھی جاسکتی ہے جو اپنے نام یاد رکھنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے!

پھر اس نے مٹھ میں جا کر ایک پنڈت سے پوچھا: ”کھنڈروں میں سے جو سب سے بڑا کھنڈر ہے وہ کس کا ہے۔“

اس نے بھی مال کو بڑی پراسرار نظروں سے دیکھا گویا یہ غیر ملکی عالم کیسا فضول سوال کر رہا ہے۔ ”یہاں ان گنت چکرورتی راجہ ہو کر گزر گئے ہیں۔ چندر گپت موریہ، اشوک پریہ درشن، سمدر گپت۔ چندر گپت موریہ سے قبل یہاں بڑے بڑے چتر کا رہتے تھے اور سنگتراش اور لیکھک لیکن ان کے نام ہم کو معلوم نہیں۔ نام مٹ جاتے ہیں انسان زندہ رہتا ہے۔“

”لا حول ولا قوۃ۔“ مال نے دل میں کہا۔ تاریخ لکھنا ممکن ہے، ان تائب پتروں کے مصنفوں کا نام بھی موجود نہیں تھا جن کا ترجمہ کروانے کے لیے وہ یہاں آیا تھا، وہ گھوم پھر کراسی کھنڈر میں واپس آ گیا اور ایک ٹوٹے ہوئے ستون پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ اب کیا کرے۔

یکنخت اسے بغداد اور نیشاپور کی یاد نے بے طرح ستان اشروع کر دیا۔

مال اس ملک میں تازہ وارد تھا، اسے جونپور میں رہتے صرف چند سال گزرے تھے۔ باہمیں سال کی عمر تک اس نے بغداد کے مدرسے میں بہت سی کتابیں پڑھ دی تھیں۔ بہت سے نظریوں پر غور و فکر کیا تھا، وہ بخارا کے ابن سینا، الفارابی اور ایران کے فخر الدین رازی اور اندرس کے ابن رشد اور ابن العربی کا منفصل مطالعہ کر چکا تھا۔ ابن خلدون کو وہ اپنا گروسمجھتا تھا اور ارادہ کر رہا تھا کہ عرب اقوام کی تاریخ لکھنا شروع کرے۔ ابن خلدون کے کتب سے تعلق رکھنے والے چند مفکروں سے ملنے کی غرض سے وہ مغرب کی طرف روانہ ہونے والا تھا جب قاہرہ میں اسے اطلاع ملی کہ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا ہے۔ واپس لوٹا اور وہاں سے ایران چلا گیا۔ نیشاپور میں اس نے اپنے ایک دوست سے سنا کہ اہل سیف کے ساتھ ساتھ اہل علم بھی اب ایک نئے ملک کا رخ کر رہے ہیں جس کا نام ہند ہے۔ مال نے اپنی محبوب کتابیں اپنے ساتھ لیں اور وسط ایشیا، کشمیر اور لاہور سے ہوتا ہوا تعلق آباد پہنچا۔

دنیا عجیب ہنگاموں کے دورے گزر رہی تھی بلکہ مال کو تو یاد تھا کہ تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں آیا جب بے چارے انسان پہ کوئی نہ کوئی قیامت نہ گزری ہو۔ پہلی صدیوں میں تاتاریوں کی یلغار نے ملکوں کو تباہ کر دیا۔ عیسائی سطوریوں اور ایران کے آتش پرستوں اور اندرس کے یہودیوں اور عرب کے مسلمانوں نے مل جل کر علم کا جو دھوم دھام سے چڑا گا منیا تھا وہ صحرائے گوبی سے اٹھنے والا زرد آندھیوں نے سارا کاسارا بجھا کر رکھ دیا۔ بنو امیہ کا دمشق، بنو عباس کا بغداد، عبدالرحمن کا اشبيلیہ۔ آنکھوں کے سامنے کیسی کیسی تصویریں کھنچتی تھیں۔ اس

قیامت کے بعد پچا کچھا علم جو باقی رہا تھا وہ مسلمان اقوام کی آپس کی تفرقہ اندازیوں اور تنازعوں کی نذر ہوا۔ خیالات کا ایکسٹر، جسے دوبارہ آباد کیا گیا تھا، بغداد کے ساتھ ساتھ اجڑا۔ اسکندر یہ کی خانقاہیں سنان ہوئیں، صرف ایک خیال باقی رہا۔ دنیا ناپاکدار ہے، دنیا فانی ہے، دنیا قابل نفرت ہے۔ فلسفہ اب محض شیعوں کا پیشہ سمجھا جاتا تھا اور شیعہ ہمیشہ بڑی گڑبرد پھیلاتے تھے، ہر قسم کی نظریاتی اور سیاسی فتنہ پر داڑی ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔

اب سلجوقی ترکوں کا دور دورہ تھا۔ ان جہان بانوں کو نت نے ملک تغیر کرنے سے ہی کہاں فرصت تھی کہ وہ فلسفے کی ریشہ دوائیوں میں اپنا سر کھپاتے اور بہر حال وہ بھی راخی العقیدہ کرنسی مسلمان تھے، عجمی شیعوں کی طرح بدعتی تھوڑا ہی تھے۔

عربوں کا ذہن، ایرانیوں کے فنون لطینیہ، تاتاریوں کے حملے سے سب کا خاتمه باخیر ہو چکا تھا مگر اس کے ایک سو سال بعد سمرقند اور ہرات میں پھر روشنی ہوئی۔ مصوری میں چین اور ایران کے نقوش ہم آہنگ ہوئے۔ یہ تحریک پسند تاتاری مغرب میں مسلمان ہوئے مشرق میں انہوں نے بدھ مذہب اختیار کیا۔ سکنگنیں کے دور میں کابل کے ہندو ترکی شاہیہ بادشاہ مسلمان ترکوں میں تبدیل ہوئے۔

گو انسان کو اب بھی چین نصیب نہیں تھا۔ محمود کے متعلق الیروینی نے کہا کہ ہندو اس حملے سے ریت کے ذریعہ کی طرح بکھر گئے۔ ان کی کہانی داستان پاریسہ میں شامل ہو چکی ہے، جو باقی ہیں وہ مسلمانوں سے شدید نفرت کرتے ہیں۔

جس طرح بغداد اور اسکندر یہ تباہ ہوا تھا اسی طرح متھر اجڑا اور نالنده، قتوچ

اور اجیمن۔ یہ سب انسانوں کی بستیاں تھیں جن میں عام مرد اور عورتیں رہتے تھے اور جنہوں نے ان کو ختم کیا وہ بھی عام انسان تھے۔

مگر اس افراتفری، اس قتل و غارت، ان جنگوں اور معرکوں کے گرد و غبار کے پیچھے علم کے چراغ ٹھیک نہ رہے، کتابیں لکھی جاتی رہیں۔ درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ انسانیت کا چراغ بھی نہ بجھ سکا!

اور اسی خوزیریز دور میں جنوب کے پرسکون ساحلوں پر خوبصورت کیسا تغیر کیے جا رہے تھے اور یہودیوں اور عیسائیوں کی شاداب بستیوں میں پھولوں کے تہوار منائے جاتے تھے اور عرب تاجریوں کی آبادیوں میں رات کے وقت قانون، عود، نے اور نفیر کی آوازیں بلند ہوتی تھیں اور مہالی پورم کے مندروں میں رقص ہوتا تھا۔

یہ لوگ بھی عام انسان تھے مگر امن سے رہنا جانتے تھے۔

امتشار اور بدآمنی کے اس دور میں صوفیوں کی خانقاہوں میں علم محفوظ رہا اور خرقہ پوش قلندر اب ایک ایک کر کے اس نے ملک کی طرف آچکے تھے اور آ رہے تھے جسے محمود نے تسبیح کیا تھا۔ ان قلندروں نے بنگال، بہار، اودھ، راجستان، دکن اور کجرات، سندھ اور پنجاب میں نئے ویہار آباد کیے۔

محمود یہ نہ جانتا تھا کہ خیالات کے صنم خانے ہمیشہ آباد رہیں گے۔ دنیا کا نقشہ بدل چکا تھا۔ قرطیبہ کی مسجد میں عیسیٰ ابن مریم کے مجسم سجادیے گئے تھے۔ قسطنطینیہ کے کیسا نئے صوفیہ کے میناروں سے اذان کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ تموجن کا پوتا، ترچھی آنکھوں اور پیلی رنگت والا چغتائی ترک، دلی کوہس نہس کر کے سر قندواپس

جا چکا تھا۔

شرقیہ سلطنت ہند میں تہذیب کا عظیم الشان مرکز بنی ہوئی تھی۔ جونپور شیراز ہند کہا رہا تھا۔ اس سلطنت کو قائم ہوئے ابھی فقط ستر سال گزرے تھے۔ صاحبر اس کے حملے کے بعد کی گڑ بڑ سے فائدہ اٹھا کر ملک اشراق خواجہ جہاں نے اس کی بنیاد ڈالی تھی، اس کے سلاطین اپنے آپ کو غیر ملکی نہیں گردانتے تھے۔ دکن کی بادشاہتوں کی مانند ان کی حکومت بھی خالص ہندی حکومت تھی، انہوں نے خوبصورت عمارتیں بنائی تھیں، گلاب کے باغ لگائے تھے۔ دور دور سے اہل علم آ کر جونپور میں جمع ہو رہے تھے۔

ابوالنصر مال الدین نے بھی دلی میں چند روز ٹھہر نے کے بعد جونپور آ کر دیکھا۔

اس کے سامنے ایک بالکل نئی عجیب و غریب دنیا پھیلی ہوئی تھی۔ جونپور، کاشی، ایودھیا اور بہراچ اور ان سب جگہوں کے مسلمان ان سے بالکل مختلف تھے۔ یہ لوگ جو بت پرستوں کے طریقے سے رہتے سہتے تھے۔ ٹشمیں پوشوں اور جو گیوں کے ساتھ درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر گیت گاتے اور جھوٹتے تھے۔ ان کی عورتیں عباً میں پہننے کے بجائے عجیب طویل سی سفید یا رنگیں چادر جسم سے لپیٹ لیتی تھیں اور ان کی آنکھوں میں بڑی حیا تھی۔

پچھلے چند سال سے اس کی زندگی سلطان حسین شاہ کے ساتھ یا میدان جنگ میں کثیتی تھی یا محفل چنگ ورباب میں۔ کتابیں اس کا اوڑھنا پچھونا تھیں لیکن حال و قال سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے امام غزالی اور ابن رشد دونوں کو اپنے

اپنے حال پر چھوڑ دیا تھا اور مسلسل خانہ جنگیوں، بغاوتوں، سیاسی شورشوں اور بد امنیوں کے باوجود، کہ یہ ہنگامے زندگی کا لازمی جزو تھے، وہ نا امید نہیں تھا، وہ ہر شے کو استحباب سے دیکھتا۔ وہ بہت سے ملک گھوم چکا تھا۔ ہند میں آ کر بھی اس نے اپنے سیاہ گھوڑے پر بڑی دور دور تک سیاحت کی تھی۔ ناموں میں، جگہوں میں، انسانوں میں جو اسرار تھا اس نے اس کو بہت محور رکھا۔ شیراز اور بد خشائی کے لالہ زار، کاشغر، یار قند اور بخارا کی گلیاں جن کی دیواروں پر چینی گلابوں کی بیلیں جھکی ہوئی تھیں اور جہاں تر چھپی آنکھوں اور لمبی لمبی چوٹیوں والی اڑکیاں رقص کرتی تھیں اور دریاۓ چیزوں کا ساحل اور شہرے بالوں والے ترمانوں کی خیمه گاہیں۔ شمال مغرب کے کوہستان جہاں یونانیوں، سیستانیوں، ترکوں، چینیوں اور اپر انیوں نے مل کر سُنگتر اشیٰ کی ایک نئی آبادی کی تھی اور پھر ہند کے جنوب میں مہاندی کے سر بینز کنارے اور آندھرا دلیس، اور کیرالا، مال مال ناؤ اور کور و منڈل کی ہری گھائیاں اور سلطنت و بے نگر کے خوبصورت باغات اور لرزہ خیز مندر جن کے آنکنوں میں تاثر کے درختوں کے نیچے بادامی آنکھوں والی دیودا سیاں ہیرے کی لوگیں پہننے بھرت ناطیم ناچتی تھیں۔

خداوند! کیسے کیسے لوگ تھے، کیسی کیسی قومیں! دنیا کتنی عجیب، کتنی دلکش، کتنی خوفناک، کتنی قابل قدر ریز تھی۔
ہند کتنا حسین ملک تھا۔

لیکن یہ بہر حال اس کا وطن نہیں تھا۔
اور گواں کے بہت سے حصوں پر مسلمانوں کی حکومتوں قائم تھیں لیکن بہر حال

یہ مجموعی طور پر دارالحرب تھا کیونکہ کافروں کی یہ بڑی زبردست آماجگاہ تھی۔

اور اگر یہ دارالحرب نہ بھی ہوتا تب بھی اس کا وطن نہیں تھا۔ یہ سامنے لہریں مارتی ہوئی سر جو بھادڑے کا کیا مقابلہ کر سکتی تھی۔ آم کے سائے میں وہ سکون نیسرا نہیں جو کسی نخلستان میں چشے کے کنارے کھجور کے تلے پینچ کر الفارابی کے نظریات پڑھنے میں حاصل ہوتا تھا۔

گوا آم بھی اپنی جگہ پر خوب درخت ہے۔

غیریب الوطنی کے احساس نے اسے بہت رنجیدہ کیا، اس نے گھنٹر کے ستون سے سرٹیک کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں یہاں سے آخر واپس کیوں نہیں چلا جاتا۔ اس نے طے کیا کہ وہ جو نپور واپس جا کر سلطان سے معدمرت چاہے گا اور دشمن لوٹ جائے گا۔ دشمن؟ اسے یہ لکھت یہ نام بھی بے حد اچبی سالگا، وہ دشمن جا کر کیا کرے گا؟ نیشاپور میں اس کا کیا رکھا ہے؟ بغداد کو اس سے اب کیا واسطہ؟ یہ سوچ کر بھی اسے بڑا دکھ ہوا۔

اور اس قدر بے شکے لوگوں سے اس کا سابقہ پڑا ہے۔ اس نے ایک آنکھ کھول کر اس کسان کو دیکھا جو انگو چھاسر پر لپیٹے زور زور سے بارہ ما سالا پتا بستی کی اور لپکا جا رہا تھا۔

وہ جس کے پس منظر میں سارا عبرانی تمدن تھا اور کلدانیوں اور قبطیوں اور اسوریہ والوں کی روایات اور یونان تھا اور روم، اور مقدس سلطنت روم کی مشرقی مملکت جسے ورثے میں ملی تھی، اور عجم کے گلستان، اور نیل کے ساحل اور مغرب کے لامھو دیپھاڑی سلسلے، وہ ایک بالکل مختلف کائنات تھی اور اس کائنات سے اس

کا کوئی تعلق نہ تھا جس میں ساتھا کہ جوگی ہوا میں اڑتے تھے اور جہاں کامروپ کی ساحرائیں آدمیوں کو بکرا بنا دیتی تھیں اور جہاں بنگال اور بہار کے تانترک معبدوں میں لرزہ خیز جادوؤں نے ہوتے تھے اور جہاں گورکھاتھ کے چیلوں کے گورکھا دھنے عقل کو چکر دیتے تھے۔

لیکن ابو ریحان البرونی نے اس ملک کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے تھے اور فضیاء الدین برلنی کی تاریخ سماں نے پڑھ رکھی تھی جو فیروز شاہ کے زمانے میں لکھی گئی تھی۔ غزنی اور ہرات میں یہاں کی دولت کے متعلق کیسی کیسی حکایات مشہور تھیں اور کتنی عجیب بات تھی کہ نلک کی گردش نے اسے واقعی اس بے شکنے ملک میں لاڈا لاتھا جہاں یہ سارے روایتی ہیرے جو ہرات وہ دن رات اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا، اس نے یہاں پورا اور گولکنڈہ کے درباروں کی جگہ گاہٹ کا نظارہ کیا تھا۔ اس نے اس دلیس کی حسین مہ جبین عورتوں کو دیکھا تھا جو چلتی تھیں تو ان کے پاؤں کے زیور چھن چھن بولتے تھے۔ اس نے یہاں کی عجیب مد ہوش کن موسيقی سنی تھی۔ غير ملکی سیاحوں نے یہاں سے لوٹ کر بغداد میں اس سے مذکورہ کیا تھا کہ یہاں کے مرد ہر اب نہیں پیتے اور عورتیں وفادار ہوتی ہیں۔

عورتوں کی وفاداری سے اسے کوئی دچپی نہیں تھی۔ جس دنیا سے نکل کر وہ آیا تھا، جس دنیا میں وہ رہتا تھا، اس میں عورت اسی وقت داخل ہو سکتی تھی جب خود اسے عورت کی رفاقت کی ضرورت محسوس ہو۔ عورت کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ اس سے کسی قسم کی رفاقت کا مطالبہ کر سکے۔ عورت کی اپنی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ سماں نے عورت کو ہر روپ میں دیکھا تھا۔ سرفقد اور قاہرہ کے بازاروں میں

بکنے والی کنیزیں، مالِ نعمت کے طور پر حاصل کی ہوئی اڑکیاں، سلاطین کی حرم سراوں میں مقید مہ جسمیں۔ عورت جو ہمیشہ ہر حالت میں مرد کی جانبِ احتجاجی، اس کے رحم و کرم پر زندگی تھی۔ اس کی خوشنودی کے لیے جس کی تخلیق کی گئی تھی۔ اس کی اپنی کوئی رائے نہ تھی، کوئی تمناً نہیں، کوئی زندگی۔

مگر بہر حال خداوند تعالیٰ کی مخلوق بہت دلچسپ چیز تھی۔ ایک حد تک زندگی میں اس کی اہمیت بھی تھی، مگر اس کے آگے اور بہت سی دنیاً میں تھیں جن میں پہنچ کر عورتوں کا ساتھ چھوٹ جاتا تھا۔ مثال کے طور پر ذہن کی دنیا، روح کی دنیا۔ گو جذبات کی دنیا میں ایک حد تک مال اسے شریک کرنے کے لیے تیار تھا مگر کسی گہرے جذباتی تحریبے میں کسی عورت نے اب تک اس کی رفاقت نہیں کی تھی کیونکہ دراصل یہ محض اس کا حق تھا کہ وہ مختلف عورتوں کو پسند کرے، وقتاً فوتیاً ان سے محبت کرتا رہے۔ اس کی محبوبہ کو یہ حق کہاں سے پہنچتا تھا کہ وہ بھی اس سے وفا کا مطالبه کرے۔ اس کا تو صرف یہی کام تھا کہ لڑیا کی طرح بھی بنی یثیمی رہے۔ مال جس زبان میں شاعری کرتا تھا اس کی روایت تھی کہ شجاع سور ما اپنی محبوبہ کے لیے جان پر کھیل جاتے تھے۔ یہ بڑا دل آدمیز تصور تھا۔ غزالی آنکھوں والی شہزادی سرخ گلاب کا پھول ہاتھ میں لیے الکبیر کے کنارے محل کے جھروکے میں یثیمی ہے۔ جھروکے کے نیچے سور ما شاعر باب بجا بجا کرا سے اپنے خطرناک عشق کے نقے سنارہا ہے۔ یہ نقے جو چاندنی راتوں میں وادیوں اور پہاڑی راستوں پر گونجتے تھے اور جن کی گونج فرانس اور اپس کے اس پارستک پھیل چکی تھی۔ سور ما شاعر محبوبہ کو اونچے سے ستون پر بٹھا کر اس کی پرستش کرتا تھا اور جب چاہتا تھا

اے اس ستون پر سے اتا رہتا تھا۔

اس اجنبی بے شکے ملک میں آن کراس نے خدا کی خوبصورت بے زبان مخلوق کو ایک نئے روپ میں دیکھا: وہ تو خود ہاتھ میں رباب لیے محبت کے نغمے الاپ رہی تھی، رادھا بن کر کرشن کی پرستش کرتی تھی، لیکن یہ پرستش اتنی عظیم چیز تھی کہ اس کے قابل بُغْنے کے لیے کرشن کو خدا کا درجہ حاصل کرنا پڑا تھا، وہ ہستے ہستے آگ کے شعلوں میں بھی کو د جاتی تھی۔۔۔ اس کی وفا شعرا کی فتوحیں بڑے بڑے ولی اللہ کھاتے تھے۔

مال چپ چاپ کھنڈر کی سیر ہیوں پر بیٹھا سامنے کی اور دیکھتا رہا، اے وہ سارے نغمے یاد آئے جو چند روز پہلے ایودھیا میں چمپا نے اے سنائے تھے۔ یہ نغمے بھجن کھلاتے تھے اور کرشن اور رام کی بھلکتی کا ان میں مذکورہ تھا اور ان سے زیادہ سرشاری کی کیفیت اس نے پہا بھی کسی زبان کی شاعری میں نہیں دیکھی تھی۔ پچھلے تین سال میں اس نے جو پور کے شاہی کتب خانے میں رہ کر اس ملک کی مختلف بولیاں سکھی تھیں۔ اے اپنے ہفت زبان ہونے پر بڑا ناز تھا مگر وہ ان لوگوں کے دل کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ یہ بڑے عجیب لوگ تھے۔ بڑے انوکھے مرد اور عورتیں تھیں۔ ان کی تاریخ، ان کی روایات، ان کے فلسفہ کائنات کو سمجھنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

وہ اجنبی، اس پرائے دلیں میں، سرد غیر مانوس پتھروں پر بیٹھا رات کے سایوں کو دیکھا کیا۔

مدھم سی روشنی سارے میں پھیل گئی۔

پورنیما کا چاند کھنڈر کی ٹوٹی ہوئی چھت میں سے نیچے جھاںک رہا تھا اور اس کی کرنوں نے سنک سرخ کے شکستہ فرش پر عجیب عجیب زاویے بنا دیے تھے۔ فرش پر طرح طرح کے مبہم نقش و نگار بنے تھے جن کو سینکڑوں برساتوں نے مٹا کر بے حد مدھم کر دیا تھا۔ یہ ترشول، اور زندگی کا درخت، اور زمین کا کنوں اور کائنات کا پہیہ اور کنوں کا سلگھاسن، اور آگ کا ستون۔ جانے ان انوکھی علامتوں کا کیا مطلب ان لوگوں کے ذہن میں رہا ہوگا۔ معنی کیا ہوتے ہیں؟ مال حیرت سے ان نقوش کو دیکھ کر سوچتا رہا۔ باہر مہوئے کے باغ پر ہولناک، ہلاکت خیز سانائی منڈل ارہا تھا۔

اور پھر اس نائلے میں عجیب و غریب آوازیں بلند ہونا شروع ہوئیں۔ ایسا لگ جیسے تاریک ویران گلی میں سے بھاری بھاری رتح گزر رہے ہیں اور ان رتحوں پر زرتار چھتروں کے نیچے، کانوں میں سونے کے کنڈل اور دوشالے اوڑھے اجنبی انسان بیٹھے اسے جھاںک رہے ہیں۔ اندھیرے میں ان کی آنکھیں فاسفورس کی طرح چمک رہی تھیں اور وہ بڑے خوفناک طریقے سے ہستے تھے۔ اس کا منہ چڑاتے ہوئے گویا کہتے ہوں، دیکھو جس طرح ہم ختم ہوئے ہیں تم بھی نیست و تابود کر دینے جاؤ گے۔ اس کے سامنے ٹوٹے ہوئے دروازے میں چند رگپت نزی چند رکھ رہا تھا۔ انسانوں کا چاند، ہند کا سمراث، مگر وہ یہاں کہاں سے آیا؟ مال

نے لاحول پڑھی، وہ تو عیسیٰ کے پیدا ہونے سے تین سو سال پہلے ہی جہنم واصل ہوا تھا۔ کم بجت نے آخر دنوں میں جین سنیا سی بن کر اپنے آپ کو فاتحے دے دے کر مارڈا، مگر وہ تو وہاں موجود کھڑا مسکرا رہا تھا، پھر اس کے پیچھے سے ایک اور آدمی نے اپنا سر نکالا اور بندر کی طرح کو دکر اس کے سامنے آگیا اور مخاطب کیا۔۔۔ دیکھو میرا نام اشوك ہے۔ اشوك پر یہ درشن۔ میں سارے بھارت ورش کا شہنشاہ تھا اور جب میں مر ا تو صرف ڈیڑھ آنولے کا مالک تھا، اس نے مٹھی کھول کر آدھا آنولہ نکال کر اس کے سامنے پھینک دیا۔

اس کے بعد ان پلید روحوں کی یلغار شروع ہو گئی، وہ رحموں سے اتر اتر کر سارے میں پھیل گئے۔ بندروں کی طرح شہیروں سے لٹک گئے، ستونوں پر جا چڑھے، آنکھن کے خشک حوض میں قلبابازیاں کھائے لگے۔ ان سب نے مل کر باریک آواز میں کووں کی طرح کائیں کائیں شروع کر دی، وہ سب مال کے چاروں طرف ناج ناج کرایک ساتھ چلا رہے تھے:

میں بھرت منی ہوں۔ میں نے رقص اور تمثیل کے قوانین بنائے تھے۔
میں نکشلا کاوش نو گپتا ہوں، میں نے ارتھ شاستر لکھی تھی۔
میں راجہ بھوج ہوں۔

میں محض گنگو اتیلی ہوں۔

اندھیرے آسمان پر بادل گرج رہے ہیں، میں کالی داس ہوں۔
میں قنوج کاراج شیکھر ہوں۔

مجھے بھجوتی کہتے ہیں۔ میں کانیا کیج میں رہتا تھا۔ میں نے ”ماں تی ما دھو“ لکھا

تھا۔

میں بھر تری ہری ہوں، میں نے کہا تھا ان کے دنیا میں محض ایک رنگ بھومی ہے اور ہم سب اداکار ہیں۔ تم نٹ ہو، میں نٹ ہوں، ہم سب نٹ ہیں۔

مٹی کی گاڑی ہانکتا ہوا شدراک (ڈرامہ "مٹی کی گاڑی" کا مصنف) صحن سے باہر چلا گیا۔

پھر چھن چھن کرتی بہت سی بچھل پائیاں ایک قطار میں آن کھڑی ہو گئیں اور انٹھانے لگیں۔

ہم کشمیر، اڑیسہ اور آندھرا پردیش کی رانیاں ہیں جو بڑی شان سے خود حکومت کرتے تھے۔

میں شہزادی راجیشتری ہوں، میں نے اپنی بحثوں سے چین کے عالموں کا ناطقہ بندا کر رکھا تھا۔

میں مار دیوی ہوں۔

میرا نام پر بھاوی تھا۔ ہائے تم مجھ کو بھی نہیں جانتے؟

میرا نام ہرش نے رتناولی رکھا تھا۔ بے چارہ ہرش۔۔۔

اپنا ذکر سن کر ہرش وردھن نے، جو کان میں قلم اڑ سے اب تک مرائبے میں محو تھا، زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ ہم سری پر تھوی ولہ کہاتے تھے۔ اس نے مقرر کی طرح ہاتھ ہوا میں باند کر کے کہا۔

ہم جو گویا دھن اور دھرتی کی دیویوں کے چیزیتے تھے اور ہم سب کو ملپچھر کوں نے آ کر ٹھکانے لگا دیا۔۔۔ ٹھکانے لگا دیا۔۔۔ ٹھکانے لگا دیا۔

اب بڑے زور سے تواروں کی جھنکار گنجی اور ان کی چمک سے نیم تاریکی میں اجالا سا ہو گیا اور سر کٹ کٹ کر چاروں طرف گرنے لگے۔ ہم چند میلے را چھپتے ہیں، ہم بھگلیے ہیں، ہم پر مار سو رہا ہیں، ہم راٹھور ہیں، ہم چوبان ہیں، ہم آ لہا ہیں، ہم اول ہیں۔

سب نے ایک ٹانگ پر کو دکون کرنا چنان شروع کر دیا۔ وہ سب چیخ چیخ کر آ لہا اول گار ہے تھے، اس قدر نسل چاکر ابوالمحصور رہاں الدین کا دماغ چکرا گیا، وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ افق پر صبح کی پسیدی نمودار ہو چکی تھی اور باہر مہوئے کے باعث میں چند کسان آ لہا اول گاتے بل کندھوں پر اٹھائے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔

اس نے گھبرا کر چاروں اور دیکھا اور اسے یاد نہ آیا کہ وہ کہاں ہے۔ یہ بہرائچ تھا اور وہ بست پستوں کے زمانے کے ایک گھنڈر میں لیٹا ہوا تھا۔ اس کا شام کرن گھوڑا بابا ہر ایک ستون سے بندھا ہنہنا رہا تھا اور بارش جھکی کھڑی تھی اور بڑی سہانی ہوا چل رہی تھی۔

اس نے دوبارہ لا حول پڑھی اور انگرائی لے کر اٹھا اور فجر کی نماز پڑھنے کے ارادے سے آہستہ آہستہ قدم رکھتا ندی کی اور چل دیا۔

گھاس پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کل صبح سوریے وہ ایو وھیا کی طرف واپس لوٹ جائے گا۔ معابر شکاف قطرہ اس کے چہرے پر آن گرا، اس نے سراٹھا کر دیکھا۔ افق پر گھنگھور لھٹا میں امنڈ کر لختی تھیں۔ بہت جلد ندیاں نالے چڑھ جائیں گے۔ مینڈک ٹرائیں گے، جل تخلی ایک ہو گا۔ مال نے ایک چھپر کے نیچے جا کر پٹکا کھولا اور کچے فرش پر لیٹ گیا، پھر اس نے ایک زور دار انگڑائی میں مدتیں بعد یہ پہااموقعہ تھا جب مال کو لاگاتا تین چار میئنے بعد اطمینان کا سنس لینا نصیب ہوا۔ شرقی سلاطین کی ولی کے بادشاہوں سے مستقل جنگیں چھڑی رہتی تھیں۔ مال کو کوئی دن ایسا یاد نہ تھا جب کسی نہ کسی نئے معمر کے کی وجہ سے اس کے کتب خانے کے کام میں خلل نہ پڑتا ہو۔ پہلے سلطان محمد شاہ اور اس کے بھائی شاہزادہ حسین میں جنگ ہوئی، پھر شہزادہ حسین نے جونپور کا سلطان بن کر خود ولی پر چڑھائی کر دی۔ ان معروکوں میں مال سلطان کے ساتھ کاپی اور اناوے اور منجل میں مارا مارا پھرتا۔ مہینوں اس نے بدایوں، کویل، مارہرہ، شش آباد اور برلن کی خاک چھانی۔

برکھا شروع ہو چکی تھی، مدیوں اور جھیلوں پر بارش کی بوندوں کی ہلکی ہلکی دھنڈ چھارہی تھی۔ بہرائچ ک پورب میں راپتی بہتی تھی۔ پچھم میں سر جوروں کی تھی۔ یہ دونوں ندیاں بڑی دور نیپال دلیس سے نکل آئی تھیں اور کس بے پرواٹی سے اپنی منزل کی طرف روان تھیں۔ یہ سامنے والی سرجو، جوبت پرستوں کی نظروں میں بڑی مقدس تھی، (یہ دریاؤں کا مقدس ہونا مال کی سمجھ میں نہ آیا!) اسی طرح گاتی گلگتاتی کچھ آگے جا کر گھاگھرا سے مل جاتی تھی اور گھاگھرا کے کنارے ایو وھیا

آباد تھا جہاں چمپاوتی رہتی تھی اور بارش ہو رہی تھی اور اس وقت وہ اسی سر جوندی کے کنارے کہیں کسی درخت میں جھولا جھوٹی اور ساون گاتی ہو گی کیونکہ مال کو اچانک خیال آیا کہ لو ساون کا مہینہ آن پہنچا۔ یہ موسموں کا سحر۔ ہر مہینے کے نام کے ساتھ اس کی اپنی کیفیت تھی۔ اس مناظر، اپنے رنگ، اپنے راگ۔ چند ماہ قبل ویسا کھٹھی۔ سارے میں بست رت چھائی تھی، پھر جیٹھ اور اسائزھ کا مہینہ آیا جب مہوا کے باغ میں لوئیں چلتی تھیں اور نیل درختوں سے ٹپ ٹپ گرتے تھے، پھر بھادوں آئے گا، پھر کوار اور کاٹک جب اداں چاندنی خنک زر درنگ سارے میں گھول دے گی۔

یہ اس کا وطن نہیں مگر وہ کم از کم موسموں کے سحر سے بچ کر نہیں نکل ستا۔

اس نے گپڑی سر کے نیچے رکھ کر روٹ بد لی اور معاچھٹا بجھنے کی آواز اس کے کان میں آئی، اس نے کافی سے آنکھ کھول کر دیکھا ایک سادھو بارش سے بچنے کی خاطر چھپر میں آن بیٹھا تھا اور بڑے اطمینان سے دھوئی رمانے میں مشغول تھا۔ مال کی موجودگی کی اس نے کوئی پرواہ نہیں کی اور اپنی کھڑ پڑ میں اگارہا۔ مال اٹھ بیٹھا اور دچپی سے اسے دیکھنے لگا۔

یہ موسم کا اثر تھا، وہ چاہ رہا تھا کہ ساری دنیا کو، ان عجیب سادھوؤں کو، ان موروں کو گلہریوں کو، ان چرواحوں کو، جو جلدی جلدی قدم اٹھاتے جنگل میں سے گزر رہے تھے، ان سب کو گلے سے لگائے۔ خوب چلا چلا کر ساون گائے۔ دنیا کتنی پر سکون، کتنی آرام دھتی، وہ طو طے، یہ سادھو، وہ کسان جو مینہ سے پناہ لینے کے لیے بھاگے بھاگے چھپر کی اور آرہے تھے۔ یہ سب اس کے دوست تھے، اس

کے لیے تھے، وہ ان سے علیحدہ کب تھا؟ ”جرام جی کی۔۔۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ اسے اپنی آواز سن کر، اپنی زبان سے یہ الفاظ نکلتے پا کر خود بڑا تعجب ہوا۔ سادھو نے مسکرا کر آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ ”جرام جی کی۔۔۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کہو سپاہی۔۔۔ کہاں سے آنا ہوا۔۔۔“

”میں۔۔۔ سپاہی نہیں ہوں۔۔۔“

”سلطان کے آدمی تو ہو۔۔۔“

”ہاں۔۔۔ مگر میں کتابیں لکھتا ہوں۔۔۔“

”اچھا۔۔۔“ سادھو نے اسی اطمینان سے جواب دیا اور پھر چھٹا اٹھا کر رام نام کا دردشروع کر دیا۔ گویا مال کے ساتھ اس کا یہ مکالمہ بالکل ضمنی تھا۔

”بابا۔۔۔ تم یہیں رہتے ہو۔۔۔“ مال نے پھر بات شروع کی۔

”نہیں۔۔۔ ہم جو پور کے رہنے والے ہیں۔۔۔“

”ارے!“ مال نے بے اختیار ہو کر خوشی سے کہا، ”تب تو تم میرے ہم وطن ہو۔۔۔“

وہرے لمحے اسے اپنے اس انجانے جذبہ مسرت پر بڑا تعجب ہوا۔ ہم وطن؟ مگر جو پور اس کا وطن کہاں تھا؟ وہ تو بغداد کا باشندہ تھا۔۔۔ اسے سخت جھنجھلاہٹ محسوس ہوئی۔

”نرگن رام۔۔۔ نرگن رام جپورے بھائی۔۔۔“ سادھو آنکھ بند کیے کیسانیت کے ساتھ ٹرا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے مال کو خود ہی مخاطب کیا: ”آج کچھ قلندر بالے میاں کے مزار کے لیے جہنڈے لے کر اپنے سے ادھر آئے ہیں۔۔۔“

”اچھا۔۔۔“

”وہ کہتے تھے کہ ہمارے سلطان اور دلی والے میں پھر ٹھن گئی۔۔۔ اب کی دفعتے ہمارا سلطان پچتا نظر نہیں آتا۔۔۔ مقابلہ بڑا ٹھن ہے۔۔۔ نرگن رام۔۔۔ نرگن رام۔۔۔“ اس نے پھرڑانا شروع کر دیا۔

مال چونک کر انٹھ کھڑا ہوا اور سادھو کے قریب گیا۔

”کیا کہہ رہے ہو؟۔۔۔ بابا پھر سے بتانا۔۔۔“

چھپر میں سات آٹھ کسان جمع ہو چکے تھے اور ان سب نے مل کر سادھو کے ساتھ رام نام کی رث لگانا شروع کر دی تھی۔۔۔ مال کے سوال کا کسی نے جواب نہ دیا۔

وہ جلدی سے پٹکا کمر سے باندھ کر برستی بارش میں باہر نکلا اور سرانے کی طرف روانہ ہو گیا۔۔۔ سرانے کے برآمدے میں اودے سنگھر انھو راس کا منتظر تھا۔

”تم۔۔۔ تم یہاں کہاں۔۔۔“ مال نے بھونچ کا ہو کر اسے دیکھا۔ ”تم تو گوالیر میں تھے۔۔۔“

”میں گوالیر ہی سے آ رہا ہوں، میرے ساتھ چلو۔۔۔ عالم پناہ نے تمہاری کھونج میں مجھے بھیجا ہے۔۔۔“

”مجھے کھونجنے اتنی دور آئے ہو، میری سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔“

”عالم پناہ بھی یہیں بہراںچ میں موجود ہیں اس وقت۔۔۔“ اودے سنگھ نے کہا، تم یہاں گیان وصیان میں لگے ہو، اوہر دنیا بدل چکی ہے۔۔۔ سلطان بہلول

نے تمہارے مالک پر راپڑی میں حملہ کر دیا۔ آؤ، یہاں بیٹھ جائیں تو میں تم کو سارا ماجرا سناتا ہوں۔“ وہ بڑے اطمینان سے کھات پر بیٹھ گیا۔ ”جب اس پر حملہ ہوا تب وہ جمنا جی پار کر کے ہمارے راجا سے مدد لینے کے لیے گوالیر آیا، ہمارے راجا نے اسے گلک پہنچائی۔ میں اس کی فوجوں کو لے کر کاپی کی اور بڑھا۔ گھسان کا رن پڑا۔“ آؤ دے سنگھ نے خالص فوجیوں والی تفصیل سے سنانا شروع کیا، پھر وہ جھک کر سنگھ سے برآمدے کے پکھے فرش پر نقشہ بنانے کا مثال کو سمجھانے میں منہمک ہو گیا۔ ” یہ دیکھو۔ ادھر بپلوں کی فوجیں ہیں ادھر ہم ہیں۔ نیچ میں جمنامیا ہیں۔ اب نہ ہم ندی پار کر سکتے ہیں نہ وہ۔۔۔ سے بیتا جاتا ہے۔ تب ایک دن کیا ہوتا ہے کہ ترلوک چند سلطان بپلوں کو ندی پار کروادتا ہے۔۔۔“ پھر وہ ٹھٹھک گیا۔

”ترلوک چند کو جانتے ہو؟“

”دنہیں۔“

”بکسر کا حاکم ہے۔۔۔ بکسر گئے ہو؟“

”دنہیں۔“ مال جھاگیا۔ ”اصل واقعہ بیان کرو۔“

”ہوتا کیا۔۔۔ دلی کی فوجیں برابر ہمارا پیچھا کرتی رہیں، ہم جونپور کی طرف لوٹے، وہاں بھی دلی والوں نے ہمارا مقابلہ کیا۔ ہم جونپور کو خدا حافظ کہہ کر بہرانج آگئے۔ تمہارا جونپور اب سنسان پڑا ہے۔ اس میں دن کے وقت الوبولتے ہیں۔ چلو میرے ساتھ۔“ وہ انٹھ کھڑا ہوا۔ ”عالم پناہ نے کہا تھا تم کئی مہینے سے یہاں ہو۔۔۔ صبح سے تم کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔ مٹھے کے پنڈتوں سے تمہارا ٹھکانہ معلوم ہوا۔“

مال نے تکوار کمر سے باندھی اور اودھے سنگھ کے ہمراہ لشکر کی سمت روانہ ہو گیا جو راپتی کے کنارے ٹھہرا ہوا تھا۔
ادھر جدھر جیت ون تھا۔

۲۲

بہرائچ سے وہ لوگ قتوں گئے جو کالندی اور گانگا کے سلجم پر آباد تھا، وہاں بھی انہیں بہلول لوڈھی سے شکست کھانا پڑی اور بالآخر سلطان حسین تھکا ہارا بہار میں پناہ گزین ہوا۔

بہار۔ یہ ایک نیا علاقہ تھا۔ ہر اجھرا، خوبصورت، جہاں سون ندی بہتی تھی، جہاں چاندی راتوں میں نا لندہ کے دارالعلوم کے کھنڈر دل میں عجیب دہشت پیدا کرتے تھے۔ یہاں ابوالمصوص رَمَال الدین سلطان حسین کے دہرے و فادر امراء اور افسروں کے ساتھ بیٹھ کر منصوبے بناتا تھا کہ جونپور کی سلطنت دوبارہ کس طرح حاصل کی جائے۔

جونپور میں اب دلی کا ایک شہزادہ تخت پر بیٹھا تھا۔ سلطنت شرقیہ کا خاتمه ہو گیا تھا۔ شیرازہند اجر چکا تھا۔

ابوالمصوص رَمَال الدین، قاضی شہاب الدین جونپوری کا جانشین، مورخ، محقق، اب سیاسی سازشوں کا بھی ماہر ہو گیا۔ دن رات وہ سلطان کے ساتھ ر جوڑے بیٹھا ترکیبیں سوچا کرتا۔ دلی کے سلطان کو کس طرح زیر کیا جائے؟

اب سلطان بہلول مر چکا تھا اور اس کا خوبصورت اور شامدار بیٹا سکندر ہند کا
بادشاہ تھا جس کی ماں کا نام ہماوتی تھا، جو شرع محمدی کا بڑا پا بند تھا، جو اپنے باپ
سے بھی زیادہ طاقتور بادشاہ تھا۔

بھار کے ان بناءں گزینوں نے سر دھر کی بازی لگا کر بساط جنگ پر ایک بار پھر
پانسہ پھینکا۔

کیونکہ لڑتا مرتا، ہار جیت ہی مردوں کے مشانیل ہیں۔

سلطان حسین اپنی جوڑوڑ کے ذریعے کئی بار جو پور میں بار بک شاہ کے خلاف
بغاوٹ کرو اچکا تھا، اب کی مرتبہ اس نے جو کا سے مل کر ایک بڑی بغاوت کا منصوبہ
بنایا۔ مال اس کا سنیر خاص تھا، دن رات وہ اپنے شیام کرن گھوڑے پر سوار دھر
سے ادھر سازشیں کرواتا تھا۔

ایک رات منزلیں مارتاؤہ جو کا کے گاؤں پہنچا۔ گڑھی پر جا کر اس نے آواز
دی۔ جو کا اس وقت اندر پوچا میں مصروف تھا۔ اس کا جوان بیٹا چدائغ ہاتھ میں
اٹھائے باہر آیا۔

”کون ہوتم؟“ اس نے شک سے پوچھا۔ بار بک شاہ خود کمزور تھا لیکن جب
سے اس کا بڑا بھائی سلطان سکندر دلی کے تخت پر بیٹھا تھا پر جا پنی جان کی خیر مناتی
تھی۔

”میں سلطان کے پاس سے آیا ہوں۔“

”کون سے سلطان کے پاس سے۔“

”تمہارا سلطان! حسین شاہ۔“

”آ جاؤ۔ اندر آ جاؤ بھائی۔“ نوجوان کارنگ تبدیل ہو گیا۔ چپاٹ کی روشنی میں مال نے اسے دیکھا، وہ اسی کا ہم عمر رہا ہو گا، وہ سیڑھیاں اتر کرتے خانے میں اسے لے جاتے ہوئے کہہ رہا تھا: ”میرا نام ہری شکر ہے۔ میں جو کا کاپیٹا ہوں۔ میں سلطان کے لیے اپنی جان لڑادوں گا۔“ وہ ایک زمین دوز کمرے میں داخل ہوئے جہاں بھوائی کی مورتی کے آگے مدھم سادیا جل رہا تھا اور دیواروں پر ڈھالیں اور تلواریں آراستہ تھیں۔

بھوائی کی مورتی اسے بڑی ڈراؤنی معلوم ہوئی لیکن اسے اس وقت یہ احساس تھا کہ وہ بھی اب اس دلیں، اس ماحول کے اسرار میں مکمل طور پر شامل ہو چکا ہے۔ ”اچھا سنو۔“ اس نے تخت پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا، ”تمہارے پاس کتنے ہاتھی ہیں؟ کدھر سے حملہ کرو گے۔“

دوسرا بھج وہ دونوں نہایت تند ہی سے جنگ کا نقشہ سوچنے میں منہمک ہو گئے، ان میں سے ایک ہندو تھا دوسرا عرب اور یہ دونوں افغانوں سے لڑنے جا رہے تھے۔ ان کے درمیان قدر مشترک صرف ایک شے تھی۔ دو دھاری خون آشام تلوار اور ایک دوسرا فریق کو شتم کر دینا ان کا واحد مقصد حیات تھا۔

چند روز بعد انہوں نے بغاوت کا علم باند کیا اور سلطان سکندران کی سر زنش کے لیے جو نپور پہنچا اور حسین شرقی کو دوبارہ شکست ہوئی اور شنگیت کار بادشاہ، جس کی آدمی عمر را گ تخلیق کرنے کے بجائے میدان کارزار میں لڑتے بھڑتے کشی، ایک مرتبہ پھر بہار کی طرف واپس لوٹا۔

اب مال کا جی اچاٹ ہو گیا۔

اس نے اس قدر خوزریزی دیکھی تھی، اس نے اتنے انسانوں کو قتل کیا تھا، اس نے اتنی بے بس عورتوں کو دیکھا تھا۔ اس نے سلطان حسین کے دربار کے امراء کو اس حالت میں سلطان سکندر کے سامنے جاتے دیکھا تھا کہ عمائد ان کی گردنوں میں رسیوں کی طرح بندھے تھے اور وہ پاپیا وہ قیدیوں کی مانند فاتح کے سامنے پیش کیے جا رہے تھے۔ یہ لوگ، جو عالم، شاعر اور اہل قلم تھے، اور ان کا فاتح بھی علم دوست اور شاعر تھا، لیکن کتابیں بے کار تھیں، علم فضول تھا، فلسفے بے معنی تھے کیونکہ انسان کا خون ان سب چیزوں کے باوجود بہتا تھا۔ خداوند! ---
دیکھی انسانیت کس طرح ساری کی ساری خون کے سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ تاریخ سے اس کو جس قدر دچکی تھی اب اتنی بھی نفرت ہو گئی۔ اس نے سلاطین کے نبی ناموں اور ان کے ادوار اور ان کی سلطنتوں کے واقعات کو بھول جانا چاہا۔

اس نے یہ بھی فرماویں کرنا چاہا کہ سلطان کی بھانجی جنگی قیدی کی حیثیت سے اب دلی میں تھی اور سلطان سکندر کے حرم میں داخل کی جا پکی ہو گی۔ اس کے دوست اودے سنگھر انھوں نے اسے غیرت دلانی۔!

”کیسے بے شرم ہو، تمہاری شہزادی دلی میں ہے اور تم بہار میں چین سے بیٹھے ہو۔ اسے چھڑا کر لاؤ، جا کر سلطان سکندر کو قتل کرو یا مجھے اجازت دو میں اس کا کام تمام کر دوں۔ شہزادی کو واپس لے آؤں۔“ مال یہ باتیں سنتا اور خاموش رہتا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کون سارا ستہ اختیار کرے۔

بہار سے غریب الوطن سلطان حسین نے بنگال کا رخ کیا۔ مال اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ گوڑ کے سلطان حسین شاہ نے جونپور کے شکست خور وہ بادشاہ کو

اپنے یہاں بنناہ دی جس کے سارے پرانے ساتھی مچھڑ چکے تھے، جس کا کتب خانہ
تباہ ہو گیا تھا۔ خالی طبیورہ اب جس کا رفیق تھا۔ طبیورہ اس سے کبھی دعا نہیں کرے
گا۔

اب میری روح کو کا ہے کی تلاش ہے؟ گوڑ کے شاہی باغات میں بے مقصد
ادھر ادھر گھومتے ہوئے مال خود سے سوال کرتا۔ بگالے کی لڑکیاں بے حد لکش
تھیں، یہاں کے مناظر بہت خوبصورت تھے۔ یہاں کی موسیقی بہت دنواز تھی۔
اسے جونپور کی شاہزادی یاد نہیں آئی، اسے چمپاوتی کا خیال بھی کبھی نہ آیا۔ اسے
خدا کی تلاش نہیں تھی۔ حد تو یہ تھی کہ اسے عورت کی تلاش بھی نہیں تھی۔ اس کا سارا
وجود اس دہشت ناک خلاء میں ڈول رہا تھا جہاں مخفی عالم سنانا ہوتا ہے۔

اس ناٹے میں صرف ایک سوچ بار بار گونجا کرتی۔۔۔ میں جب تک اس چکر
میں رہوں گا، مجھے دوسروں کو مارنا پڑے گا۔ دوسرے مجھے مارنے کے درپے رہیں
گے۔ انسان دراصل انسان نہیں ہیں خونخوار بھیڑ یے ہیں۔ انسان مجھے کہاں ملے
گا۔۔۔؟

طرح طرح کی آوازوں نے اس ناٹے میں بہت سے بھنوں پیدا کر دیے۔
میں اس سامنے والے انسان کو مار ڈالوں کیونکہ اس نے سر پر چوٹی رکھی ہے اور
گائے کو پوچتا ہے اور اگر میں نے اس کو قتل کرنے میں سبقت نہیں کی تو وہ میرا کام
کر دے گا کیونکہ میرے سر پر چوٹی نہیں ہے۔۔۔؟

خوبصورت شوپوری کی اس لیے مجھے ایسٹ سے ایسٹ بجادینا چاہئے کیونکہ
وہاں لاکھوں کروڑوں مورتیاں مندروں میں بھی ہیں، لیکن وہ مورتیاں میرا کیا

بگاڑتی ہیں؟

اگر ان مورتیوں کو میں گوارا کرتا ہوں تو کیا میں مسلمان نہیں رہا۔؟

اسلام کیا ہے۔؟

ان سوالات نے اسے دیوانہ کر دیا۔

ان سے بچتے کے لیے اس نے شراب میں بناہلی، اس نے ملک کے سارے خطوں کی عورتیں دیکھی تھیں۔ خوبصورت مضبوط جسموں والی مراثنیں۔ کجرات اور کالثینیا وار کی نازک اندام لڑکیاں جن کے چہروں کی رنگت کندنی تھی۔ یجاپور کی خوش آواز طوا اپنیں۔ بنگالے کی جادوگرنیاں جن کی آنکھوں میں جادو تھا اور باتوں میں لونا، جن کے لیے مشہور تھا کہ راتوں رات درختوں پر پیٹھ کر آسام کی سست اڑ جاتی تھیں! اور بندرا بن کی شوخ و شنگ کجھیاں، متھر اکی اہیر نہیں، پورب کی سانوںی سلوٹی کھار نہیں۔ قتوں کے باغوں کی وہ مالینی، جس نے اسے ایک بار بیٹے کے کھرے بنایا کر دیے تھے۔

موسم بدلتے رہے، وہ دل کی ویرانی سے گھبرا کر راگ رنگ کی محفلوں میں شریک ہوا لیکن سارنگی کی تانت میں اسے موت کی بچکیاں سنائی دیں۔ اس نے لکھنوتی کی پاتروں کو ناچتے دیکھا مگر حسین رقصاؤں کے بجائے اسے مردہ عورتیں دانت نکوتی نظر آئیں۔

طرح طرح کی آوازیں، عجیب و غریب گیتوں کے بول، مردہ زبانوں کے جملے اس کے دماغ میں ہر وقت شور مچاتے، وہ اس اندروںی شورش سے عاجز آ گیا۔ سنائا اس قدر پر شور ہو ستا ہے، یہ اسے معلوم نہ تھا، وہ، جو ہفت زبان تھا، اس

نے کوشش کی کہ ساری بولیاں، سارے الفاظ کسی طرح بھول جائے۔ حافظہ کس قدر را ذیلت دہ شتھی!

ایک روز کسی نے چپکے سے اس کے کان میں کہا: ہیرا جنم امول تھا۔ کوڑی بد لے جائے۔ ہیرا جنم امول تھا، ہیرا جنم امول تھا، وہ جھنجھلا کر کسی دوسری رقصاء کے یہاں جا پہنچتا۔ اس سے کہتا: گن کرمی چھیڑو۔ مدھوما دھوی سناؤ۔ للتاراگ الپ، وہ طبورہ اٹھاتی، وہ وہاں سے بھی بھاگ نکلتا۔ مخفیہ کے گیتوں کے بجائے کوئی دوسرے الفاظ اس کا تعاقب کرتے۔ سانس نقارہ کوچ کا، سانس نقارہ کوچ کا۔ باجت ہے دن رین۔ دن رین۔ دن رین۔ آخر اس نے لکھنوتی، گوڑ اور سنار گاؤں کی چھپل پہل چھوڑ کر دیہات کا رخ کیا جہاں صرف گہرے رنگوں کی راجدھانی تھی اور تالابوں میں کنول کے سرخ پھول جگمگاتے تھے اور جہاں بڑھل اور مولاری کی چھاؤں میں ویشنو پیجاری اور پیجاری میں را دھا اور کرشن کی محبت کے گیت گاتے تھے۔ ویرانوں میں اسے اگلے وتنوں کے ونگا پتی اور گوڑیشور۔ مشرقی اور مغربی بنگال کے پال بادشاہ۔ بادشاہوں کے سنسان محل نظر آئے جن میں گھاس اگی ہوئی تھی۔ ان کی دیواروں پر اس نے رقصاؤں کے مجسمے دیکھے۔ ترچھی آنکھوں والی لڑکیاں جو یہاں سے سورپنکھی جہازوں پر بیٹھ کر جاؤ کے شلیند روبربار میں راماائن کا سنگیت نالک دکھانے کے لیے جاتی تھیں۔ اس وقت ان کے خوبصورت بازوؤں اور طویل آنکھوں پر چھپکیاں چل رہی تھیں۔ پال اور سین بادشاہوں کے محلات کے گھنڈروں کے سامنے میں کوئی قدیم قبرستان تھا جس کی شکستہ دیوار کے نیچے ایک بوڑھا ہانپا کانپا بیٹھا کھانس رہا تھا، برابر کے

کھیت میں ہل چلایا جا رہا تھا۔ سامنے مہاند اور یا ہل کھاتا بہہ رہا تھا۔ تب اچانک اس کے دماغ کا شور جھوڑا سامدھم ہوا۔ اس بائی کا مطلب اس کی سمجھ میں تارے کی طرح روشن ہونا شروع ہوا جو متنی گزریں ایودھیا میں اسے کسی نے سنائی تھی۔ اس سے کسی نے کہا تھا: آج کال کے پیچ میں جنگل ہو گا باس۔ اورے اورے ہل چلیں گے، ڈھور چریں گے گھاس۔ ڈھور چریں گے گھاس۔ ڈھور چریں گے ۔۔۔

آخر جب دل کی وحشت نے زیادہ زور باندھا تو اس نے بنگال سے نکل بھاگنے کا ارادہ کیا۔ حسین شرتی کو گوڑ میں اس طرح تنہا چھوڑ کر بھاگتے ہوئے اسے اپنے آپ سے بڑی شرم آئی۔

مگر جذبے سب اضافی ہوتے ہیں، اس نے اپنے آپ سے کہا اور ایک روز خاموشی سے شاہی محلات سے نکل کھڑا ہوا۔ انگا کے گھاث پر پہنچ کروہ ایک جہاز پر بیٹھ گیا، اسے معلوم نہیں تھا کہ جہاز کس طرف جا رہا ہے۔

دریا پر روشنیاں جگمگا اٹھیں۔ لنگر انھیا گیا۔ ملاج بنشاش آوازوں میں گارہے تھے۔ مال ایک کونے میں بیٹھا رہا، وہ جہاز پر یاگ جا رہا تھا۔ پر یاگ جو کاشی سے آگے تھا۔ عظیم انگا بہت دور سے بہتی ہوئی آ رہی تھی، اس کے ایک سرے پر اتحاد سمندر تھا۔ مال نے آنکھیں بند کر لیں، دن گزرتے گئے۔ کشتنی انگا کی سطح پر آگے بڑھتی رہی۔ مسافروں سے بھری ہوئی کشتی میں بڑی چہل پہل تھی۔ بھاگل پور کے قریب ایک گاؤں سے براتی دین کا سرخ ڈوالے کر کشتی میں سوا ہوئے۔ دو لہا نے زرد جوڑا پہن رکھا تھا۔ دین لمبا سا گھونگھٹ کاڑ ہے تھی۔ اس کے پیروں

میں چاندی کے بچھوئے تھے اور اس کے مہندی سے رپے ہاتھوں میں چوڑیاں اور ہاتھی دانت کے کڑے کھن کھن بولتے تھے اور وہ چہکوہ ہکوہ رہی تھی۔ براتی بلڑی پا رہے تھے۔

مال کشتی کی دیوار کے سہارے بیٹھا خالی آنکھوں سے یہ سب دیکھتا رہا۔

”سنو چمپاوتی مجھ سے بیاہ کرو۔“

”ہوں۔“

”ہوں کیا۔ میں کہتا ہوں مسلمان ہو جاؤ، عاقبت سدھر جائے گی اور اس زندگی میں مجھ ایسا دلچسپ آدمی ملے گا۔“

”رام رام۔ کیسی باتیں کرتے ہو! میں کیوں ہونے لگی مسلمان۔ مجھے تو تمہارے مولویوں کی داڑھیوں سے ہی ڈالگتا ہے۔ جو نبور کے قاضی بن کر تم بھی یہ لمبی سی داڑھی رکھ لو گے۔۔۔!“

اب بھی وقت ہے چمپا رانی، دیکھنا کسی دن کسی سر گھٹے پنڈے کے پلے بامدھ دی جاؤ گی جو عمر بھر ٹھیل کروائے گا اور جب مرے گا تو اس کے پیچھے پیچھے چتا میں دھکیل دی جاؤ گی۔ کبھی اپنے اس خوفناک مستقبل پر غور کیا ہے۔؟“

”میں تو تمہارے ساتھ بھی مرنے کے لیے تیار ہوں۔ تم مر کے تو دیکھو!“

”سنو چمپا، سچ مجھ، مجھ سے بیاہ کرو۔“

”کا ہے اپنی ذات بگاڑتے ہو، تم سیدزادے ٹھہرے۔“

”تم بھی براہمن ہو اور ویسے تمہاری ذات اور اوپنجی ہو جائے گی، سیدانی کہاوا۔“

گی! مجھ سے بیاہ کرونا بھی۔“

”مگر ہم تو تم کو یونہی اپنا پتی مانتے ہیں۔“

وہ سن کر چکرا گیا۔ ”وہ کیسے۔۔۔“ میرا تم سے بیاہ کہاں ہوا ہے۔ یعنی کہ
۔۔۔ میں۔۔۔ تم۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔“

”اس سے کیا ہوتا ہے۔۔۔“ وہ ہنسنی رہی۔ ”ہم تو تم کو اپنا مالک خیال کرتے
ہیں، یہ بات تم نہیں سمجھ سکتے!“ وہ اسی طرح بے فکری سے ہنسا کی۔ ہم تو صرف
ایک آدمی کو اپنا پتی سمجھیں گے اور وہ آدمی تم ہو، ہمارا تمہارا تو جنم جنم کا ساتھ۔“

”جنم جنم کا ساتھ، کیا خرافات ہے۔“ مال نے بھنا کر کہا۔ ”پھر تم نے جاؤ
گری کی باتیں شروع کیں۔“

”اس میں جاؤ کیا ہے؟“ چھپا نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا کوئی لڑکی کسی
آدمی کو خود سے پسند نہیں کر سکتی، ہم نے تمہیں چنان ہے اور ہم تمہارے آگے جھکتے
ہیں۔“

”کیا کفر بکتی ہو، میں نعوذ باللہ کوئی خدا ہوں۔“

”ہو تو سبھی، دل ہی تو خدا کو جنم دیتا ہے۔“ وہ پھر زور سے ہنسی۔
اور پھر اس نے کہا تھا: ”اچھا یہ بتاؤ تم ہم سے بڑی محبت کرتے ہوں۔“

”کرتا کیوں نہیں ہوں۔“

”تو پھر اتنی گھبراہٹ کا ہے کی۔ کبیر یہ گھر ہے پریم کا، خالہ کا گھر نا نہہ۔۔۔
کبیر یہ گھر ہے پریم کا۔۔۔ کبیر یہ گھر ہے پریم کا۔“ اور وہ زور سے قہقہہ لگا کر غائب
ہو گئی۔

یہ ایوڈھیا کا کچھ نہیں تھا، انگا کی سطح تھی۔ اس کا جہاز سکون سے لہروں کو چیرتا آگے بڑھ رہا تھا اور براتی دھماрی گارہے تھے اور اڑکیاں نہ رہی تھیں اور دین رہی تھی، دین، جو گوری رنگ کی دلی پتلی بہاری اڑکی تھی، جانے کس دلیں کو جاتی تھی، کس زندگی کی طرف، کس موت کی طرف اس کا رخ تھا۔ جہاز موغلیں پہنچا۔ براتی اس کا ڈولا لے کر کنارے اتر گئے۔ گھاث کے ہجوم میں سرخ رنگ کا ڈولا نظروں سے اوچھل ہو گیا۔

جہاز نے دوبارہ لنگراٹھایا۔ انگا کے دونوں طرف سر بزرگیت تھے اور گاؤں اور بارونق شہر اور دنیا اپنے حال میں مگن تھی۔

پٹنے کے گھاث پر بہت سے مسافر اترے، بہت سے سوار ہوئے۔ نئے مسافروں میں چند امیرزادے تھے، ایک جو گیوں کا گروہ تھا۔ ایک تارنجی لباس والا بھکشو تھا جو سب سے الگ تھلگ رہتا۔

پٹنے کے امیرزادے دن بھر چوسر کھیلنے میں مصروف رہتے۔ کائنات کے دو تاجر، جوانا سامان لے کر دلی جا رہے تھے، اپنے بھی کھاتے میں لگتے تھے۔ جو گی رام دھن میں منہمک تھے۔ مال کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ بھکشو نے اس کا امیرانہ لباس دیکھا اور چپ چاپ جا کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد ان جو گیوں میں سے ایک مال کے قریب سے گزرا، وہ وضع قطع سے ہندو نہیں معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس کے سر پر چوٹی نہیں تھی۔

”بھائی، تم مسلمان ہو۔“ مال نے ہمت کر کے اس سے پوچھا۔

”انسان ہوں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”میں۔ میں بھی انسان ہوں۔“ مال نے لڑکھڑاتے ہوئے گویا اپنا تعارف کرایا۔

”کیا چاہتے ہو۔“

”یہ پتا نہیں۔“

”اگر اپنے دل کا بھید خود نہیں جانتے تو ہمارے پاس تمہارا کیا کام۔۔۔ اہر جا کر بنیھو۔“

اس نے امیرزادوں کی طرف اشارہ کیا، ایسا لگتا تھا جیسے جوگی اسے پہچان گیا
ထتا۔

”تم کہاں جاتے ہو۔“

”کاشی۔“

”وہاں کیا ہے؟“

”وہاں کیا نہیں ہے؟ وہ شیو پوری ہے، وہاں سرت ملتی ہے، وہاں میرا مرشد رہتا ہے۔ میرا شیخ، وہ جو گرو ہے میرا، لیکن افسوس کہ تم نے اتنی عمر گنوادی اور اس کو نہ جانا۔“ وہ ٹھنڈھک گیا۔ ”تم جونپور کے مال الدین ہونا۔۔۔“
مال بہوت ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔

میں سلطان سکندر کا سپہ سالا رہتا۔ میں چنار کے معرکے میں تم سے لڑا تھا بلکہ تم نے اپنی تلوار سے مجھے زخمی بھی کیا تھا، یہ دیکھو۔۔۔“ اس نے اپنا داہنا ہاتھ آگے بڑھایا جس کی تین انگلیاں کٹی ہوئی تھیں۔ اپنا چکارہ، جسے وہ با میں ہاتھ سے بجارتھا، فرش پر رکھ کر وہ مال کے پاس بیٹھ گیا۔ ”تم کو اور بتاؤں، جب تم گوڑ کے

دربار میں رنگ رلیاں منار ہے تھے وہ جنگلوں میں تمہارے انتظار میں روئی پھرتی تھی لیکن کوئی راج نس اس کا پیغام تم تک نہ پہنچا سکا۔“

مال کا دل دھڑ کنے لگا، یہ جو گی کیا کیا کہہ رہا تھا۔ کیا یہ غیب کا علم جانتا تھا؟ ”میں اپنی فوج لے کر ایودھیا سے گزر اتھا۔ راپڑی میں جو جنگ ہوئی تھی اس میں اس کا بھائی مارا گیا، وہی جو چتر و بیدی پندت تھا اور وہ جنگلوں میں روئی پھرتی تھی۔ ہر ساہی کو دیکھ کر وہ سمجھتی تھی کہ شاید تم ہی آگئے۔ کیونکہ تم نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے پاس ضرور واپس لوٹ کر آؤ گے۔ مجھے ساہی دیکھ کر تمہارا بتا پوچھتی وہ میرے پاس آئی تھی۔ میں تو اسے تمہارے متعلق کچھ نہیں بتا سکا، پھر معلوم نہیں وہ کہاں گئی۔“

مال کا دل دھڑ کتا رہا۔ سناثا اتنے زور سے گر جا کہ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے کانوں کے پر دے پھٹ جائیں گے، وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”دنیا بہت بڑی ہے“ جو گی کہہ رہا تھا۔ تم اس کو ڈھونڈ نہیں سکتے، وہ تم کو تلاش نہیں کر پائے گی۔ زندگی میں دو انسان صرف ایک مرتبہ ملتے ہیں، اگر پھر جائیں تو ان کا دوبارہ مانا نا ممکن ہے۔ ملنے اور پھر نے کامطلب جانتے ہو؟ اتنا کہہ کر جو گی نے پھر اپنا چکارہ اٹھالیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف چلا گیا۔

گنگا بہتی رہی۔ چاندی کی وسیع چادر پر مسافروں سے بھری ہوئی کشتیاں چلا کیں۔ شاہی بھرے، تجارتی جہاز، مچھیروں کی ڈونگلیاں، ان کے باڈ بان شام کو ڈوبتے سورج کے مقابل میں ہوا سے پھول کریوں پھر پھڑاتے گویا بے شمار راج نس ماسر دور کی سمت اڑنے کے لیے پرتو لتے ہوں۔ کشتیوں میں سے گانے کی

آوازیں بلند ہوئیں۔ جو گیوں کے سمن فقیروں کے ذکر، ویشنو پچاریوں کے بھجن، تاجروں کے جہاز ملک کی منڈیوں کی طرف جا رہے تھے۔ کجرات اور بنگال کے سوتی کپڑے، بنارس کا ریشم، دکن کے ہیرے دور دراز کے ملکوں کے انسان ان کشتیوں میں سوار تھے۔ چین کے عالم، تبت اور کشمیر کے بھکشو، عرب سیاح، ایران کے نقاش، جاوا کے رقص، ملک میں امن قائم تھا۔ دلی میں سلطان سکندر حکومت کرتا تھا زندگی میں بڑی گہما گہمی تھی۔

”خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں دل کا چین نصیب ہے، بھائی مجھے شانتی چاہیے۔“ مال نے آہستہ سے کہا۔

بھکشو نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا اس کے چہرے پر کامل سکون تھا اور لازوال مسرت، آج ویسا کھوپور نیما تھی، آج کی رات دو ہزار سال ادھر، اسی انگکار کے اس پار، ترانی کی ایک بستی میں شاکریہ منی پیدا ہوئے تھے۔ آج ہی ویسا کھوپور نیما کے روز انہیں گیان حاصل ہوا تھا۔ چودھویں کا چاند دریا کی لہروں پر ادھر ادھر تیرا کیا۔ اس کی تیز اور سخنہ دی کرنیں مال کے اور بھکشو کے چہروں پر پڑ رہی تھیں۔ دریا پر مکمل سناٹا طاری تھا۔

”مجھے میرے خیالوں سے نجات دلاؤ۔“ مال نے کہا۔

بھکشو اپنی پراسرار آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ ”خیال۔۔۔ خیال خود کو نہیں جان سستا، خیال اپنے آپ سے باہر نہیں جاستا۔ کائنات سے باہر کوئی خدا نہیں ہے اور خدا سے باہر کوئی کائنات نہیں ہے۔ حق و باطل میں کوئی فرق نہیں، لیکن ان سب سے بالاتر ذات مطلق ہے جو سنائا ہے۔“ اس نے گہری آواز میں کہا۔

”مجھے اس سنائے سے بڑا ذرگلتا ہے۔“ مال نے کہا۔

”شوینا۔۔ سنانا۔۔ شونیتا۔۔ جو ذات مطلق ہے۔ جو صفر کا تصور ہے۔“

”مجھے اس تصور سے وحشت ہوتی ہے۔“ مال نے کہا۔ ”۔۔ اس سنائے میں میں اکیلا کدھر جاؤں گا۔ تم بھی میرا ساتھ نہیں دے سکتے۔“ اس نے مہیاں ندھب کے بھکشو کو تک و شے کی نظروں سے دیکھا۔

جہاز ایک گاؤں کے کنارے ٹھہرا۔ ساحل پر چاندنی رات میں وست کے دیوتا کا تھوار منایا جا رہا تھا۔ مال گاث پر پہنچ کر چاروں طرف دیکھتا رہا، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کدھر کا رخ کرے۔ دھناؤ سے ویشنو پیجاریوں کی ایک ٹوپی نظر آئی جو اس کے جہاز سے اتری تھی، وہ ان کے پیچھے ہولیا، کسی نے اس پر نظر نہ ڈالی۔

بہت دن تک وہ اسی طرح ادھر ادھر مارا پھرتا رہا۔ گاؤں گاؤں گھومتا وہ ایک ہرے جنگل میں پہنچا، اسے اس جگہ کا نام معلوم نہیں تھا۔ قریب جواہوں کی بستی تھی۔۔۔ معطر ہوا میں درختوں میں امنڈ رہی تھیں۔ سبزے کی شدت سے آسمان کا رنگ ہر انظر آ رہا تھا۔ ساون کا مہینہ شروع ہونے والا تھا۔ ہنوروں کی ایسی کالی جامنیں ہری گھاس پر پٹپٹ گرتی تھیں۔ کسم رنگ کی ساریاں اور لہنگے پہنے لڑکیوں نے آم کی ڈال میں جھولے ڈالے تھے۔ چاروں اور گھن نیلی اور روپ منجری اور سدرش اور مالتی کھلی تھی۔

گلے میں تلسی مالائیں پہنے ویشنو جو گنیں کھل کے درخت کے نیچے بیٹھی کھڑتاں بجاتی تھیں۔ گلابی آنکھوں والے طوٹے شاخوں پر بیٹھے تھے۔ ترتی

بجاتے، کندل ہاتھ میں لئے جوگی اپنی یا تراویں پر جاری ہے تھے۔ جھاڑیوں میں جنگلی تیز بول رہے تھے۔

تالاب کے کنارے رس نیلی مہک رہی تھی۔ مہوا کے جھنڈ میں سے گیتوں کے خوبصورت سر بلند ہو رہے تھے۔ کمال ایک کھنڈ کی سیر ہمیوں پر بینچ کر جنگل اور ساون کی ان صداوں کو منتار رہا۔

تب اس کو معلوم ہوا وہ سنائی میں تھا، یہ سنائی کے مختلف پروتھے، وہ عالم حیرت میں تھا۔ یہ سنائی ذات مطلق تھا۔ بحکشوں کی بات اس کی سمجھ میں آگئی۔

پھر اس نے غور سے سنا۔ مہوا کے جھنڈ میں ویشنو پیجار نیں جو گیت گارہی تھیں اس کے الفاظ اب اسے صاف سنائی دے رہے تھے۔ یہ تو بردوان کے جے دیو گوسوامی کی آواز تھی۔

اس نے ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ وصیان سے سنا۔ پیجار نیں گارہی تھیں۔ صندل کے گرم جنگلوں پر سے بہتی ہوئی ہوا اپنے ساتھ مہک لارہی ہے۔ جہاں الاصنحی کی جھاڑیوں سے چرانی ہوئی خوشبو پھیلی ہے، جہاں شہد کی مکھیاں بجھنختی ہیں۔

ان کنجوں سے یہ پرواں آ رہی ہے جہاں وہ ناچتا ہے۔ یہ بہار کا مہینہ ہے اور اسی مہینے میں تہائی بہت کھلتی ہے۔

کیتیکی کی گلیاں اور زرد پھول کام دیو کے بان کی مانند جگمگاتے ہیں سپاٹل کے شکوفوں پر بخورے سوتے ہیں۔ مادھوی ہوا میں جھوم رہی ہے اور رسمی موگرے اور اس سے وہ کنجوں میں ناچتا ہے۔ یہ بہار کا مہینہ ہے اور اس مہینے میں

تہائی بڑی کھلتی ہے۔

جیسے گرم ہوت بند آنکھوں کو چھولیں اسی طرح سورج کی کرنیں آم کی
کیریوں پر پڑ رہی ہیں اور وہ پسکون جمنا کے کنارے رقصان ہے۔ موسم گل میں
وہ تہائیں ہے۔

وہ گوپیوں کے ساتھ ناج ناج کریونہی اپنا سمنے گنادے گا جب کہ رادھا اس کی
 منتظر ہے؟ پچارنوں نے گیت کا درستہ اٹھایا۔

جیسے دور جانے والے مسافر کو کوئی آواز سن کر اپنے دلیں کی ندی کنارے
آموں پر گلگتے بھنوروں کی یاد آجائے اس طرح یک بیک اسے رادھا کا خیال
آیا۔

اور رادھا نے دیکھا زریں لباس پہنے، بالوں کو خود روپ چھولوں سے سچائے،
اپنے سرخ ہوتوں کے رنگ کے یاقوت سے مزین، وہ گوپیوں کے ساتھ رقصان
ہے،

مال کھنڈ کی سیر ہیوں پر بیٹھ سنتا رہا۔

پچارنوں نے گایا۔

کوئی کی آواز سے راہی کو تکلیف پہنچتی ہے۔

ان مسرتوں کا رنج جو حاصل نہ ہوئیں۔

ان سیاحتوں کا رنج جو کی نہ جاسکیں۔

ان مختتوں کا رنج جن کا کوئی نتیجہ نہ اکا۔

اور مسرتوں کے باوجود

مرست میں کرب چھپا ہے کیونکہ کرب ہیم ہے۔

مال اٹھ کھڑا ہوا۔ پچارنوں کی آواز، جے دیو کے الفاظ رفتہ رفتہ دور ہوتے گئے۔

اور جے دیو نے کہا تھا: میں منتظر ہوں، محبت تو وہ بھی کرتا ہے جس نے محبت دیر میں شروع کی۔

مہری اور گوریا چڑیوں کی سُنگت میں وہ جنگل کے سایہ دار استوں پر ادھرا ڈھر بھکلتا پھرا، اور قب و فعتا درختوں کے جھرمٹ میں اسے گنگا کا پانی جھلما لاتا نظر آ گیا۔

اسے معلوم نہ تھا کہ وہ اس طرح گھومتا پھرتا بنارس پہنچ چکا ہے۔ سامنے دھرے کنارے پر شوپوری تھی جس کے شوالوں کے کلس دھوپ میں چمک رہے تھے اور سینکڑوں ہزاروں گھنٹے ایک ساتھ نج رہے تھے اور ہوا میں عود کی مہک تھی اور گلیوں میں عبادت کے پھول بکھرے پڑے تھے اور گھاٹ کی لا تعداد سیر ھیوں پر لوگ نہار ہے تھے۔ کاشی۔۔۔ ازلی اور ابدی شہر۔

وہ درختوں کی چھاؤں میں دن بھر بے مقصد پھرتا رہا، اب اس کے پیروں میں سکت باقی نہیں تھی اور وہ بے طرح تھک چکا تھا۔ جنگل کے اختتام پر جوا ہوں کی بستی تھی، وہ تھکے تھکے قدموں سے اس کی چوپال کی طرف بڑھا۔

ایک اہیر نے اسے سر جھکائے جاتا دیکھ کر اس سے کہا: ”بھیا، لگت ہے تم بہوت دور سے آئے رہے ہو۔ تم رے پیرن ماماٹی کتنی لাগی ہے۔“

”ہا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں نے بہت لمبا سفر طے کیا ہے۔“

”آؤ بیٹھو۔ ستو کھاؤ۔“ اہیر نے کہا اور اسے ایک سائبان میں لے گیا۔
”کپڑوں سے تو بڑے دھنوان و کھلانی پڑت ہو۔ اس اچرچ میں کا ہے پھرے
ہو۔ سلطان کے منشی ہو؟“

”میں کسی سلطان کا منشی نہیں ہوں۔“

”لو آ رام سے بیٹھو، یہاں چھاؤں ہے۔“ وہ جوتے اتار کر سائبان میں بیٹھ
گیا اور چاروں اور دیکھنے لگا۔ سامنے آم اور جامنوں کا گھنبا غ تھا جس میں وہ دن
بھر گھومتا رہا تھا۔ مہوئے کے جھنڈ میں سے اب بھی ویشنو معنیوں کے گانے کی مدھم
آوازیں آ رہی تھیں۔ گلڈنڈی کے دونوں طرف دو پہری کھلی تھی۔

لو بھی چھپاوتی، اس نے دل میں کہا، تمہاری شرط پوری ہوئی۔ تم نے کہا تھا کہ
میں اپنی تلوار اتار پھینکوں تو تم مجھے اپنے ساتھ کاشی لے چلوگی، میں نے اپنی تلوار
دریا کی لہروں کے سپرد کر دی ہے اور میں کاشی پہنچ گیا ہوں۔
لیکن تم کہاں ہو۔

سامنے سے قلندروں کی ایک نولی گزری۔ بہت سے سنیاں کندڑ پہنے،
ترسول ہاتھ میں لئے گھاٹ کی سمت جا رہے تھے۔ جولا ہوں، اہیروں اور مفلسوں
کا ایک ہجوم کھڑتا ہیں سنجالے بھجن گاتا ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

چمپا نے کہا تھا: ان کا مذاق نہ اڑانا، یہ بہت پیارے لوگ ہیں۔ ایک روز یہی
تمہارے کام آئیں گے۔

وہ آہستہ سے سائبان سے نکلا اور اس ہجوم کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

وہ لوگ اپنے مرشد کے پاس جا رہے تھے، وہ جو لہر تارا تالاب میں سے نکلا

تھا۔ وہ اسی جگہ پر رہتا تھا جہاں مولوی کے پیڑ تھے اور جہاں رسیلی مہکتی تھی۔

میاں بیہر صبح کے وقت کر گئے پر بیٹھ کر کپڑے بنتے، کپڑوں کا گھٹڑ بنا کر پیٹھ پر لادتے، بنا رس کی ٹگیوں میں جا کر پھیری لگاتے۔ شام کو ان کے مکان کے سامنے مولوی کے جھنڈ میں مجمع لگتا۔ چکارے سنجالے جاتے، کھڑتا لیں بھتیں۔ بھجن گائے جاتے، یہ نقشہ برسوں سے قائم تھا۔ کون کہہ سنتا تھا کہ اس دنیا میں جنگیں ہوتی ہیں۔ انسان ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔ اسی دنیا میں آتما بھوت دانت نکو سے دلوں کے تعاقب میں ہیں۔

سارے میں میاں بیہر کی شہرت پھیلی تھی۔ ان کی بانیاں کسانوں اور جاہلوں کی زبان پر تھیں۔ دور راز کے خطبوں سے لوگ ان کی اور کھنچ آتے تھے۔

کاشی کے پانڈوں کو اور دلی کے مولاناوں کو اور سلطان سکندر کو، جو بڑا کثر مسلمان تھا، یہ خرافات پسند نہ تھیں لیکن وہ سب کیا کر سکتے تھے؟ سارا دلیس ایک نئے رنگ میں رنگا جا چکا تھا۔ پھر تین سو سال سے اس صوفی بھگتی مارگ پر ایک بڑا خوبصورت قافلہ رواں تھا۔ اس قافلے میں کیسے کیسے لوگ شامل تھے۔ اہمیر کے معین الدین اور اپنے کے امیر خسرو اور دلی کے نظام الدین اور کجرات کے فرمانگھ مہتا اور بنگال کے بیرونی کا چنڈی داس اور بہار کی متھلا پوری کے دیبا پتی اور مہاراشر کا درزی نام دیو، پریاگ کے رامانند اور جنوب کے ماڈھو اور ولپھ اور

بادشاہوں اور چھتر پتی راجاؤں کے درباروں اور امراء، وزراء اور سپہ سالاروں کی دنیا سے نکل کر مال نے دیکھا کہ اس دوسری دنیا میں مزدور اور نانی، اور موچی اور کسان اور غریب کارگر آباد تھے۔ یہ جمہوری ہندوستان تھا اور اس ہندوستان پر ان خرقہ پوشوں کی حکومت تھی۔ کارگروں کی منڈلیاں ان سے وابستہ تھیں۔ اسلام کی مساوات ان ہندو بھگتوں کو متاثر کر رہی تھی۔ اسلام تو اُن پسند صوفی اس دلیس میں پھیلا رہے تھے، یہاں توارکا ذکر کہاں تھا۔ ہزاروں برس کے سناۓ ہوئے اچھوت ان سنتوں کے پاس بیٹھ کر رام کا نام لے رہے تھے۔ اوپنجی ڈاتوں کے برہمنوں کا یہاں کون دخل تھا۔ یہ بڑی نرالی دنیا تھی۔ اس میں ہندو مسلمان کا سوال نہیں تھا۔ یہاں محبت کا راج تھا اور مال، جو انسان کی تلاش میں سرگردان تھا، اس نے دیکھا کہ دنیا میں بھیڑیوں کے علاوہ انسان بھی بنتے ہیں۔ یہ اہیر، جس نے چوپال میں بٹھا کر ستوا حاضر کیا تھا، اس کی جان لیتا ٹیکیں چاہتا کیونکہ اسے کسی سلطنت کو حاصل کرنے کی تمنا نہیں۔ اسے تو دونوں وقت باجرے کی روئی مل جاتی ہے اور وہ خدا کا شکردا کرتا ہے اسے ملکوں کی سیاست سے کیا مطلب؟ یہ کمان، جو اس کے سامنے خوش خوش منڈیر پر بیٹھا پنی چھوٹی سی بچی کو بیر کھلرا رہا ہے، اسے کیا پرواہ کہ دلی میں آئندہ کون حکومت کرے گا؟ سلطان حسین حاکم ہوتا بھی وہ اسی طرح بل چلائے گا اور لگان ادا کرے گا اور سلطان سکندر بادشاہ ہوتا بھی۔ ان ”ترکوں“ سے پہلے جب پرتوی راج بادشاہ تھا تب بھی اس کے باپ دادا یونہی جیٹھ کی دھوپ میں ہلکاں ہوتے تھے۔ ساون میں گاتے تھے۔ قحط پڑتا تھا تو خاموشی سے مر جاتے تھے۔

تب مال نے سوچا۔ کہ گوندہب کی حیثیت زندگی میں اہم سمجھی جاتی ہے لیکن محبت ظاہری زندہب سے برتر ہے۔ محبت اصل ہے۔

دور دور سے لوگ کاشی آ کر بکیر کے قدموں میں بینہ رہے تھے۔ مال ان سب کی باتیں شوق سے سنتا، ان کی سیوا کرتا۔

کاشی میں ایک روز کو چین کا ایک اندھا برہمن وارد ہوا، وہ بکیر کا نام سن کر سینکڑوں میل کی مسافت طے کرنے کے بعد یہاں پہنچا تھا۔ اس کا ایک بازوڑا اُنی میں کٹ چکا تھا لیکن وہ ایک بی ہاتھ سے رام دھن پر کھڑتاں بجا تھا۔ اسے دیکھ کر مال کو احساس ہوا کہ وہ جنگلوں اور تباہ کاریوں سے پناہ لینے کے لئے یہاں بھاگ آیا ہے مگر باہر کی دنیا میں لڑائیاں اسی طرح جاری تھیں۔

”بھائی تمہاری جان کس نے لینی چاہی تھی؟“ مال نے اس سے پوچھا۔

”فرنگیوں نے۔“

”فرنگی۔؟“

”ہاں۔ عیسائی۔ بہت دور پچھم سے آئے ہیں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

اتنی مدت ہند میں رہ کر وہ نصاریٰ کے وجود کو بالکل بھول چکا تھا جو مسلمانوں کے جانی دشمن تھے اور بیت المقدس میں مسلمانوں سے کئے مرتد تھے۔ تاریخ میں اس کی دلچسپی پھر عودہ کر آئی، وہ حکم کر مالا بار کے برہمن کے پاس بینہ گیا۔ ”یہ عیسائی کدھر سے آئے ہیں؟“ اس نے سوال کیا۔ صلیبی جنگلوں کے

سارے واقعات اسے ازبر تھے۔

”پرنسپل۔ کوئی دلیں ہے۔“

اس نام سے تو وہ واقف تھا۔ دوسرے عربوں کی طرح علم جغرافیہ کا وہ بھی ماہر رہ چکا تھا۔ پرنسپل اندرس کے پاس تھا۔ اندرس۔۔۔ اس کے دل پر ایک برچھی سی لگی، وہ لوگ وہاں مسلمانوں کا خاتمہ کرنے کے بعد اب یہاں بھی آن پہنچے۔ مال کو یہ معلوم نہ تھا کہ پرنسپلیوں کو ان کے بادشاہ نے اور پاپائے روم نے حکم دیا تھا کہ جس طرح مسلمان ہسپانیہ سے نکالے گئے اسی طرح ساری دنیا میں جہاں جہاں ملیں چن چن کر ان کا قلع قمع کرو، ایک بھی زندہ نہ بختنے پائے۔

”انہوں نے گوا کی ساری مسجدیں ڈھا دیں، مندروں کو توڑ پھوڑ کر برادر کر دیا۔“ اندھا برہمن کہتا رہا، ”گوا کے ایک ایک مسلمان کوتلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ میں ہندو تھا اس لئے بچ گیا۔“

نوجوان برہمن۔۔۔ جو اپنی نور سے عاری آنکھوں سے اسے تکتے ہوئے دو تارے پر انگلیاں پھیر رہا تھا۔ یہ کالی کٹ کے راجہ کی بحریہ کا افسر تھا اور راجہ کے امیر الحر قاسم اور میر حسن کے ساتھ جی توڑ کر پرنسپلیوں سے لڑا تھا اور اپنی آنکھیں ان کی بارود کی مذر کر کے اور ایک بازو کش کر یہاں پہنچا تھا۔ مال کو سلطان سکندر کا وہ سپہ سالار یاد آیا جو اسی طرح جوگی کا روپ دھارے اسے جہاز پر ملا تھا۔

”ہماری ہار ہوئی یا جیت۔“ مال نے آہستہ سے سوال کیا۔

”ہم نے ترکی کے راجہ سے مدد مانگی تھی۔ ترکی کا جنگی بیڑا مصروفیں سے ہماری سہاتما کے لئے آیا مگر پرنسپلی بڑے زبردست ہیں۔“ اس نے اپنی بے نور

آنکھیں بند کر لیں اور دو تارہ بجائے میں مصروف ہو گیا۔ اب شام ہو رہی تھی اور لوگ کیر تن کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ مال اٹھا اور کوچین کے اس اندر ہے کا با تھ تھام کر اسے راستہ بتلاتا ہوا لوگوں کے گروہ میں مل گیا۔

بغداد اور جونپور کا ابوالمعصو رمال الدین، مورخ، محقق، سیاست دان، سپاہی، جسے تصوف اور معرفت سے کبھی کوئی سروکار نہ تھا، بالآخر کاشی کے پنج آنگا گھاٹ پر پہنچ چکا تھا۔

۲۲

لیکن بہت سے بیباودی سوال، سوچنے والے ذہن کے لئے، ابھی باقی تھے۔ کبیر نے اس سے کہا: سنو بھائی سادھو، ہری سے پریم کرو، تمہارے دکھ آپ سے آپ مت جائیں گے۔ دکھ سنیے۔۔۔ دکھ کی حقیقت اس کو جہاز پر اس تاترک سدھ نے بھی سمجھانا چاہی تھی، لیکن ہری کون تھا؟ یہ سوال بڑا اہم تھا۔ اس سوال پر ایضاً میں اور اسکندریہ میں اور بغداد میں بڑی لمبی بحثیں کی جا چکی تھیں۔ ہزاروں برس قبل اسی آنگا کے کنارے کپل نے اور جیمنی نے اور شہزادہ سدھار تھے نے اس پر سوچ بچار کیا تھا اور سات سو سال گزرے مہماں دی کے اس پارکیر الائیں ایک بہت بڑا عالم پیدا ہوا تھا، اس کا نام شکر اچاریہ تھا۔ مال نے عہد عتیق کے کپل کا مطالعہ شروع کیا اور کتاب بند کر کے سوچا: نوناطوینوں کی عقل فاعل پر یہ جو عقل حیوانی، پراکرتی، پر اثر انداز ہوتی ہے؟ انسان کا خدا سے اتصال نروان ہے۔۔۔

طریقت اور مارگ دونوں رحیم تک پہنچتے ہیں جو رام ہے؟

گوتم سدھارتھ کے شہرے راستے پر صدیوں تک مسافروں کے قافلے گزرا کیے جنہوں نے دنیا میں اپنے چند روزہ قیام کے دوران میں بنا رس اور سانچی، اور امر اوتوی اور اجتنا اور باغ کے نگارستان سجادا لے مگر زمانے نے ایک بار پھر پلٹا کھایا اور مالوہ اور قنوج اور مگدھ اور گوڑ میں پھر ہری کی بھگتی کا چرچا ہوا۔ کیدار نارتحسے لے کر دوار کا تک شیو کے عظیم الشان مندر تعمیر ہوتے چلے گئے۔ شاکیہ منی کا راستہ مہایاں مذہب اور تاتر ک اسرار میں تبدیل ہو گیا اور شاکیہ منی و شنو کے اوتا رہن کر انہی مندروں میں برآ جنے لگے۔ نارنجی لباس والے وہ بھکشو جو موروں کے نشان والے بادشاہ چندر گپت نری چندر کے وقت سے بھی پہلے جنگلوں میں نمودار ہوئے تھے ایک ہزار سال کی الٹ پھیر کے بعد سدھ کھلاتے تھے اور بنگال اور بہار کے معبدوں میں جاؤ نوئے کرتے تھے۔ مہایاں مذہب کا مہا سکھ کا تصور خرافات میں تبدیل ہو چکا تھا۔

کہ ہر بڑا آ درش آخر میں یونہی تباہ کیا جاتا ہے۔

لیکن آ درش کیا شے ہے؟

یکنخت مال کو محسوس ہوا کہ وہ بھی بال کی کھال کھنچنے کی عادت اختیار کر چکا ہے جس طرح اس نے آس پاس کی درگاہوں میں لمبی لمبی چوٹیاں رکھائے ہوئے ہیں من طالب علموں کو چھپیوں فلسفوں کے مسائل کی میں مبنخ نکالتے نا تھا۔

قرب و جوار کے گاؤں میں بنا رس اور جھوکی اور مگھر میں اسے بے شمار فقراء ملے جن کی خانقاہوں میں جا کر اس نے تصوف کی باقی میں سنیں۔ قصبوں اور شہروں

میں عظیم الشان مدرسے تھے جہاں ایک سے ایک جید عالم تیار کیا جا رہا تھا۔ بڑے بڑے عمامے پہنے شیخ الجامعہ جب اس کے سامنے پاکی میں بیٹھے ہوئے نکلتے تو اسے بغداد کی یاد آ جاتی۔ نہم تاریک مٹھوں میں پنڈت اپنے پوچھی پتوں سے سر کھپار ہے تھے۔ گنگا کے کنارے کنج میں بیر اور ان کے چیلے پریم پریم کی رٹ لگائے جا رہے تھے مگر وہ ہمیشہ کا فندی خود پسند عرب، اس نے تہہ تک پہنچنے کا تھیہ کیا اور جس طرح وہ سلطان حسین کے مستعد سپاہی کی حیثیت سے نے صعر کے سر کرنے کے لئے اپنی برق رفتار ہوا رپ بیٹھا بیٹھا پر شور ندیوں میں کو دپڑتا تھا، اسی طرح اب اس نے اندھیرے سمندر کو لبیک کہا جس میں اس سے پہلے ہزاروں لاکھوں روپیں ڈبکیاں لگا رہی تھیں۔ بہت سے لہروں کے خلاف ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ بہت سے کشتی کا باڈیاں اتار کر قناعت سے ایک طرف کو ہو بیٹھے تھے اور خود کو ہواں کے حوالے کر دیا تھا۔ بہت سے اپنے ٹولے پھولے جہاز کے تنتوں پر بہتے چلے جا رہے تھے۔ بہت سے ایسے بھی تھے جو کب کے ڈوب چکے تھے۔ ساحل تک کوئی نہ پہنچا تھا۔ کیونکہ ساحل نظر نہیں آتا۔ سمندر بہت وسیع تھا اور اتحاہ اور چاروں طرف گھپ اندھیرا سارے میں چھایا تھا۔۔۔ بہت سوں کا خیال تھا کہ انہوں نے روشنی کے مینار تعمیر کر لیے ہیں۔ بہت سے سمجھتے تھے کہ جو چراغ انہوں نے اپنی اپنی کشتیوں میں جلانے ان کی روشنی میں وہ اس سمندر کو عبور کر لیں گے مگر یہ بھی ان کی خوش فہمی تھی، ساحل نظر نہیں آتا تھا۔

کنارہ کہاں ہے؟ وہاں پہنچ کر کیا ملے گا؟ صحیح عقیدہ کیا ہے اور خدا کا اتصور؟
محبت؟ ویراگ میں کیا حاصل ہوتا ہے؟ نجات کیا ہے؟

پنڈتوں سے اس نے ان کے خدا کے متعلق پوچھ گچھ شروع کی۔ گوبیر نے اس سے کہا تھا: ”کاشی کے پانڈے تم کو اور باتیں بتائیں گے۔ میں کاشی کا جواہا ہوں تم تو میرا گیاں یو جھو۔“ مگر اس نے اس بات کی سنی کر دی اور ان تاریک مٹھوں اور پر اسرار معبدوں کو اس نے باہر سے جھانک کر دیکھا جن کے اندر اسے قدم رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ عودولو بان کا دیز دھواں، دیوی دیوتاؤں کے عجیب و غریب بت، مندروں کے اندر ہیرے پختہ آنگن، پیچ در پیچ گلیاں اور چبوڑے اور موکھے جن کے اندر رکھی ہوئی کسی دہشت ناک سورتی کی جھلک اسے نظر آ جاتی۔ منتروں کا جاپ، پھولوں اور مٹھائیوں کے انبار بیلوں اور گلایوں اور بندروں اور طوطوں کی یلغار۔ سیرھیوں پر جمع پچاریوں کی بھینھنا ہے، گھنٹوں کی آواز، کیا ان لوگوں کے ذہن، ان کے الہیات کے مسائل بھی ان ہی تگ و تاریک ان گنت بر جیوں، گلیوں اور کوٹھڑیوں والے مندروں کی طرح پیچ در پیچ گھلک اور اورتا قابل فہم ہیں؟ یہ کون جناتوں کی قوم ہے جسے وہ نہیں سمجھ ستا؟ اس کو تو اپنے ذہن پر بہت نا ز تھا۔ کیا وہ مدرسہ نظامیہ کا زمانہ بھول گیا؟

یہ صحیح تھا کہ ہندو فلسفے اور الہیات کے چھ کے چھ مدرسے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ادق تھے اور اسے خود کبھی فلسفے اور ما بعد الطبعیات سے لگاؤ نہیں رہا تھا۔ لیکن وہ سارے بنیادی مسائل کی طرف سے آنکھ موند کر محض ہری پریم کی رٹ نہیں لگائے گا۔ ہری کون ہے؟ ہری کون ہے؟ یا رام یا رسم؟ وہ خدا کو کس نام سے پوچھے؟ کیا نام ضروری ہے؟ اور خدا کون سا ہے اور کیا وہ بھی ضروری ہے؟ دنیا بھر میں اہل بدعت اور شک پرستوں اور دہریوں کی کمی نہیں ہے لیکن اس کے

اسلام، اس کے ایمان میں خلل آچکا تھا۔

اس نے ایک روز چپکے سے بیکر کے کنج سے نکل کر دریا پار کیا اور ایک زیر دست جنادھاری پنڈت کے پاس جا پہنچا جن کے علم و فضل کا دور دور شہر تھا۔ اس نے ان سے کہا کہ وہ مناظرے کے لئے نہیں آیا ہے، وہ علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔

مگر علم اس قدر وسیع تھا، اسے اپنے غیر احمد ہونے کا شدت سے احساس ہوا اور وہ کہاں سے شروع کرے؟ زمانے کتنے پھیلے ہوئے تھے اور صدیوں کے دائرے ملک اتنا وسیع تھا، وہ اس کے محض ایک حصے میں اس وقت موجود تھا۔ ابھی اس کو بنگال اور دھن اور مہا بھارت اور ٹالی ناؤ کی بھی خبر نہیں تھی، وہاں کے علماء وہاں کے گیت کار، وہاں کی خانقاہوں اور فقیہوں کا اسے رتی بھر بھی پتا نہ تھا۔ وہ کون سے مدرسہ فکر کا مطالعہ پہنچا شروع کرے۔ عمل اور علم اور محبت، تینوں رستے اس کے سامنے کھلے تھے، وہ کس پر پہنچا چلنا شروع کرے؟

عمل کے راستے کا بیان قدیم ویدوں میں تھا اور کلب شاستروں اور دھرم شاستروں اور مہا بھارت اور پرانوں میں اس کا مذکور تھا۔ مہا بھارت میں کرشن نے ارجمن کو عمل کی راہ دکھائی تھی۔ ویدک خداوں کا ملک پر ہزاروں برس سے راج تھا جو رفتہ رفتہ فلسفے کی علامتوں کے بجائے عوام کے ذہن میں دیوی دیوتاؤں کی حیثیت سے برآج رہے تھے۔

اس کرم مارگ کے متعلق اس نے پڑھا کہ یہ علمت و معلوم کا رشتہ ہے جس کے ذریعے انسان اور کائنات ایک دوسرے سے بندھے ہیں اور بندش ہمیشہ

تکلیف دہ ہوتی ہے اور نجات کرم کے چکر سے آزاد ہو کر ہی حاصل ہو سکتی ہے۔
دوسرا راستہ علم کا تھا۔ وید ک عہد کے بعد کے حکماء نے طے کیا تھا کہ مخفی عمل
سے نجات ممکن نہیں۔ خود عمل کی ماہیت کیا ہے؟ یہ جاننا چاہتے، یہ کھونج لگانے کا
رسٹہ بہت طویل تھا۔ اپنے دوں میں کسی ایسے طریقے کی تحقیق شروع کی گئی تھی جس
سے علم و معلوم کا چکر ٹوٹ سکے۔ اس تحقیق نے چھ مختلف مدرسے ہائے فکر کو جنم
دیا تھا۔ منطق کے اصول وضع کیے گئے۔ کپل نے کہا۔ پرش اور پراکرتی، روح اور
ماہہ ازل سے اکٹھے موجود ہیں۔ ماہہ حرکت کرتا ہے اور تبدیل ہوتا ہے۔ روح
کائنات سے علیحدہ ہے۔ کائنات کا اس کے بغیر بھی ارتقا ہوتا ہے، کیونکہ ذہن،
شخصیت، خودی روح میں شامل نہیں لیکن پھر بھی روح مادے میں مل مل جاتی ہے
اور اس کی مکنی اسی وقت ہے جب مادے سے وہ خود کو جدا کر دے۔ مادے میں بتا
رہنے کا نتیجہ دکھے ہے، اگر اسے اپنے اور پراکرتی کے فرق کا علم ہو جائے تو وہ آزاد
ہو سکتی ہے۔ کپل دہریہ تھا۔ اس کے نزدیک تخلیق اور ارتقاء خدا تعالیٰ کا رسمہ نہیں بلکہ
مادے کی طرف تھی۔

پھر مال نے پن جلی کے یوگ ستر پڑھے۔ اس کا ایشور خالق کائنات نہیں
بلکہ روح ازلی تھی جو مادے میں بتا انہیں ہوئی۔ ویدانت والے وحدت الوجو
د کے قائل تھے۔

عہد عتیق کے برہمن قانون ساز گوتم کے فلسفہ علم میں اس نے وجود اور عدم
وجود، بھاؤ اور ابھاؤ کی تفصیلات پڑھیں۔ گوتم نے ادراک، منطق اور استنباط کے
ذریعے چیزوں کا کھونج لگانے کی سعی کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا خلاء میں سے

پیدا ہونے کے بجائے ابدی ذرات، زمان و مکان اور ذہن و دماغ نے تخلیق کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ مٹی اور پانی کی طرح ساری مرکب اشیاء کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور رہا ہو گا کیونکہ وہ نتیجے کی حیثیت میں موجود ہیں۔ زمان و مکان اور ذرے لامحدود ہیں۔ کسی سبب کا نتیجہ نہیں لہذا مرکب اشیاء کا سبب کوئی ذہین محرک ہے۔ ورنہ مرکب جوہر کے مادی اسہاب یعنی ذرتوں میں وہ ضابطہ تنظیم نہیں ہو سکتی جس کے ذریعے ان کے نتائج کی تخلیق ہوتی ہے۔ اس ذہین محرک کو مادی اسہاب کا براہ راست علم ہو گا اور نتائج کی کافرمانی کی طاقت بھی۔ کوئی انسان اس علم اور طاقت کا حامل نہیں۔ لہذا برصغیر قانون ساز گورم نے کہا تھا کہ اس مرکب اشیاء کی دنیا کا سبب الاسہاب خدا ہے۔

وقت کے متعلق اس نے پڑھا کہ زمان و مکان اضافی ہیں اور محض ایسا خلائق نہیں جس میں حقیقت وقوع پذیر ہوتی ہے۔ وقت کے مسئلے پر مال بہت اگر بڑایا، یہ مسئلہ بھی سامی نظریہ کائنات سے یکسر جدا گانہ تھا جس میں ابتدائے آفرینش سے روز قیامت تک ایک مخصوص باضابطہ وقفہ تھا۔ جس کے بعد ابدیت ہی ابدیت ہو گی لیکن یہاں تو ابتدائے آفرینش کے بعد پھر ابتدائے آفرینش تھی اور کوئی ایسا مخصوص نقطہ نہ تھا جہاں سے وقت شروع ہوا ہو۔ یہ حکماء کہتے تھے کہ وقت کا الحمد مختلف انسانوں کے لئے مختلف ہے۔ انسانی وقت دیوتاؤں کے وقت کا سواں اور برہما کے وقت کا دس لاکھواں حصہ ہے۔ لہذا چھوٹے اور محبوس کرنے کی دنیا ہی وجود کی ساری ممکنات سلب نہیں کر لیتی۔ اس نے پڑھا: ”زمان و مکان حقیقت کی جہت ہیں اور حقیقت وجود میں آنے کی کیفیت کا دوسرا نام ہے اور ابدی ارتقاء اور

اشکال اور بیعتوں کے پر بیچ نمودا اور دنیا وؤں کے تسلسل کا ایک ایسا چکر ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔“

پھر ایک گروہ کا کہنا تھا کہ پہلے خلاء تھا اور اس میں کائنات کو ظہور ہوا۔ یہ وحی اور الہام کے قائل خدا پرستوں کا گروہ تھا۔ حقیقت پرستوں کا نظریہ تھا کہ فطرت خدا کے ساتھ ابد سے موجود ہے اور آزاد ہے۔ خدا محض صانع اور آفریدگار ہے۔ عینیت پرستوں کے نزدیک خدا کے علاوہ اور کوئی شے حقیقی نہیں تھی۔ بخ رات یوں کا عقیدہ تھا کہ وشنوؤات حقیقی ہے اور کاشمی بحیثیت کریم شکنی مشیت ایزدی اور بحیثیت بھوت شکنی کائنات کی ماں ہے۔ بدھ مت والوں کا قول تھا کہ خدا اور روح دونوں کا وجود نہیں۔

وہ کون سے مدرسہ فکر کا مطالعہ پہلے شروع کرے۔؟
ویدانت نے اسے اپنی طرف کھینچا اور وہ شنکراچاریہ کے مطالعے میں پھر سے جت گیا۔

پانچویں صدی عیسوی کے بعد سے ملک میں بدھ مت کو زوال آچکا تھا۔ گندھارا اور کاشمیر اور وادی سوات اور مکران اور بلوچستان اور مدھیہ پردیش ہر جگہ دوبارہ مجہد و رکی عبادت شروع ہو چکی تھی۔ ملایا اور سیام دیش اور چمپا کے دور دراز ملکوں میں نیل کنشہ شیو کی آرتی اتاری جا رہی تھی جس نے ساری کائنات کا زہر پی کر اپنے گلے کو نیلا کیا تھا۔

یہ تصورات بے حد لرزہ خیز تھے۔ مہابھیر و، آفاق کا خوفناک جوگی، جو اپنے ہاتھوں میں بڑھا کی کھوپڑی کا کشکول لیے ڈمرہ بجا تا، تین ڈگ بھر کے تینوں

دنیا دل کو عبور کر لیتا تھا اور فقیروں کی طرح اپنے بیل پر بیٹھا کائنات میں مارا مارا
پھرتا تھا۔ مہا کال۔۔۔ برہما و شنو بھیش کا تیسرا، تباہ کن روپ۔۔۔ شیونٹ راج۔۔۔
مدھیہ پر دلیش اور دکھن میں لنگم کے معبد تعمیر کر لیے گئے تھے۔ گپتا عہد میں
اب شہو مہاراج کی عمل داری تھی۔ عرب سیاح اپنے سفر ناموں میں اس عجیب و
غیریب مذہب کا تذکرہ کر رہے تھے۔ خداوں کی فوج کی فوج تھی جو ہر طرف کو دتی
چاند تی پھر رہی تھی، خوفناک عفریت نما دل باتھواں سیاہ فام ڈائنس، پریوں کی
اسی نرم و نازک دیسیاں۔ چاند اور سورج، آگ اور بادل، ہاتھی کی شکل والا اور
بندر کی شکل والا، ناگ اور کچھوے اور تیر تھا اور میلے اور یا ترا میں اور تھواروں کا نسل
غپاڑہ اور خوشنی قربانیاں اور جادو منتر اور ٹونے تو کھکے کا ایک ہنگامہ بیٹھا۔ سمندر پار
کمبونج دلیش اور یاوا اور نماڑا میں نئی برہمن شاہنشاہیت کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔ شیو
کی ڈرم و سارے میں بیج رہی تھی۔

ہندو مذہب کی تجدید اور نئی تنظیم میں اس اکیلے نوجوان کا کتنا بڑا حصہ تھا جو
آٹھویں صدی عیسوی میں مالا بار کے ساحل پر الورنی کے کنارے شوگرو برہمن
کے یہاں پیدا ہوا۔ علم کے راستے پر چل کر ایک طرف جس نے اپنے دوں اور گیتا
اور برہم ستر کی تفسیریں لکھیں اور دوسری طرف مذہب کو فلسفہ طرازیوں سے بے
نیاز کر کے عوامی بنایا جو سارے ملک میں مٹھ قائم کرتا اور مذہب کا پر چار کرتا پھر اور
بیس سال کی عمر میں مر گیا۔

ہندوستان کا عظیم ترین مفکر۔۔۔ شنکر اچاریہ! اس کے فلسفے کا مرکز خدا کی
وحدانیت تھی۔ خدا، جو خالص ذہن اور خالص وجود تھا۔۔۔ نرگن۔۔۔ اور دنیا جو

مایا تھی۔

لیکن جس طرح دنیا میں دو طرح کی تھیں۔۔۔ ایک حقیقی اور ایک غیر حقیقی، اسی طرح علم دو طرح کے تھے۔۔۔ اعلیٰ اور ادنیٰ۔ برہما اور ایشور۔ چنانچہ عوام، جو شنکر اچاریہ کے ذہن کی بلندیوں کو نہیں پہنچ سکتے تھے، ان کو اس نے پروہتوں کے حوالے کر کے برہمن عملداری کی جڑیں مضبوط کر دیں۔

نمیت۔۔۔ نمیت۔۔۔ یہ نہیں ہے۔ یہ بھی نہیں ہے۔ یعنی برہما کا تجربہ نہیں کیا جاستا۔۔۔ اپنے دوں میں لکھا تھا۔ شنکر اچاریہ نے اس کی تشریح کی۔۔۔ نمیت نمیت کا مطلب عدم وجود نہیں۔ ذات حقیقی مکمل بھرپور وجود ہے، اور ست، وجود، چوت، شعور جو کائنات کو منور کرتا ہے برہما ہے اور ابدی ہے۔ ست چوت اور آئندہ برہما کی صفات ہیں بلکہ خود اس کی ذات ہے۔ علم برہما کا جو ہر ہے۔ ساگن برہما یا ایشور زندہ خدا ہے۔ پراکرتی اور مایا کے ساتھ برہما ساگن بن جاتا ہے، وہ بیک وقت ایشور بھی ہے اور جیو یعنی شخصی خودی بھی، شنکر اچاریہ وحدت الوجود کا قائل تھا۔

فلسفی ماڈھوا چاریہ نے دوئی کے نظریے کا پرچار کیا۔ اس کے نزدیک برہما اور جیو کے علاوہ تیسری بستی دنیا کی تھی۔ رامانج نے کہا: برہما اور مایا الگ الگ نہیں بلکہ سب برہما ہے۔۔۔ برہم مایا۔۔۔

مال پنڈتوں سے برہم ستر کی تفسیر پڑھتا رہا۔ شنکر اچاریہ نے کہا کہ حقیقت کو دو مختلف معیاروں سے جانچا جاستا ہے۔ ایک راستہ یہ علم کا تھا جس پر مال خود گرتا پڑتا۔ ششم چلا آ رہا تھا، تیسرا راستہ بھی باقی تھا۔ جانے اس میں اتنی ہمت باقی

رہ جائے گی کہ وہ اس راستے کو بھی آزماسکے۔

”مدرسوں میں جزا و سزا اور خیر و شر کے منانے پر طویل بحثیں جاری تھیں۔ مسلمانوں کے بہتر کے بہتر فرقے بزعم خود صحیح راستے پر تھے۔ صوفی اور درویش اپنے اپنے حلقے پھیلائے بیٹھے تھے اور خدا کی محبت میں آہیں بھر رہے تھے۔ اس نے معتزلیوں سے مبارکت کیے جو ندہب کو عقل سے پہچانے کے مدعا تھے۔ شیعوں نے اسے اپنی جانب بلایا جن کا حلول کا فلسفہ اہل ہنوز کے فلسفوں سے متا جاتا تھا۔

لامتیوں کے قصے بھی اس نے سن رکھے تھے۔ گنگا کے کنارے کنارے آم کے درختوں میں چھپی ہوئی خانقاہوں میں اس نے ان اللہ کے بندوں کو دیکھا جو لاہوت سے ناسوت تک سارے فاصلے طے کر چکے تھے یا تصور شیخ میں گم بیٹھے تھے۔ نروان اور فنا کی تلاش میں اس نے یوگیوں اور صوفیوں دونوں کو مرابتے اور سما دھی میں کھوئے ہوئے دیکھا۔ علم کا راستہ وہ طے کر رہا تھا مگر اس کا دماغ چکر ارہا تھا، یہ راستہ بل کھاتا جانے کتنی دور تک جاتا تھا۔ ابھی تو وہ پیار کے دامن ہی میں پہنچا تھا۔ صوفیوں نے اسے اپنی اور بلایا۔ انہوں نے کہا: آخری حقیقت روشنی ہے۔۔۔ نور۔۔۔ نور۔۔۔ نور۔۔۔ جو نور نہیں اس کا و جو نہیں۔۔۔ چند اور درویشوں نے اسے بتایا: آخری حقیقت خیال ہے۔ خدا کے جلال و جمال اور مال کے ذکر کی گونج اس نے ان کتبجوں میں سنی۔ کیونکہ یہ ہندوستان تھا۔ یہ فرید الدین عطار اور بہجوری اور شیخ جلال الدین تبریزی اور بہاء الدین زکریا اور جلال الدین سرخپوش اور معین الدین چشتی اور قطب الدین بختیار کاکی کا ملک تھا اور کون

بد قسمت ہو گا جو اس ملک میں آ کر بھی وہ ناپا سکے جس کی اسے تلاش تھی۔

مگر ابھی تو وہ کپل اور شکر اچاریہ کے ابواب بھی نہ پڑھ پایا تھا۔ کیا وہ یونہی خالی الذہن خالی دماغ لے کر ان سننوں اور صوفیوں کے پاس چلا جائے۔۔۔؟
دل میں شہر رکھے اور ان معصوم لوگوں کو دھوکا دے؟

ایک رات وہ گھنٹوں بینھا منٹھ کی دیوار کے نیچے سوچا کیا۔ اندر روتھی ہو رہی تھی۔ پنڈت اشلوک پڑھ رہے تھے، وہ اندر نہ جاستا تھا۔ اسے یہ اشلوک بہت جبھی لگے۔ سارے جو نور کے علماء اور کاشی کے پانڈے اسے حلقہ باندھے دانت نکوستے نظر آئے۔ وہ ان سے علیحدہ نیچے موجود تھا۔ کوئی اس کی بات ہی نہ سنتا تھا، وہ دیوار کے نیچے بیٹھا رہا۔

صاحب مہربان۔۔۔ صاحب مہربان۔۔۔ اس نے پٹ کر دیکھا۔
رات کی ہوا میں خنکی آ چلی تھی۔ قریب سیر ھیوں پر چند پیہاڑی آن بیٹھے تھے اور وہ اکتارے پر الاپ رہے تھے۔۔۔ صاحب مہربان۔۔۔ صاحب مہربان۔۔۔
صاحب۔۔۔

اس نے انگڑائی لی اور انٹھ کھڑا ہوا۔ مال الدین۔۔۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔۔۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کبیر کا صاحب تمہیں واپس بلا رہا ہے، وہ جو بہت مہربان ہے۔ دونوں راستے تم نے دیکھ لئے، لیکن ابھی محبت کا راستہ باقی ہے۔
اس پر چل کر شاید تم اس تک پہنچ سکو۔ ہاں۔۔۔ ابھی محبت کا راستہ باقی ہے۔
اس نے دوبارہ گھاث کا رخ کیا اور انگناہی عبور کر کے کبیر کے کنج میں واپس جا پہنچا۔

اب تو لگتا تھا جیسے عمر بھر سے وہ انہیں فضاوں میں سانس لیتا آیا تھا۔ جہاں ڈھاک کے جنگلوں سے قرنے کی صدائیں بلند ہوتیں۔ جہاں گور کھنا تھکے جوگی شیر کی کھالیں اور ہر کانوں میں کندل ڈالے جیگئی اور نر سنگھے بجاتے جسم پر بھجوٹت ملے ان جنگلوں میں گھومتے تھے۔ جہاں ڈھاک پھولتی تھی۔ یہ کیسی انوکھی فضائیں تھیں جہاں نوے قسم کے ناخدا اور چوراکی قسم کے سدھ پہاڑوں کی گپھاؤں اور نیم تاریک مٹھوں اور لرزہ خیز معبدوں میں اپنے اپنے دائرے پھیلائے بیٹھے تھے اور کپالک اور کالا کھکھ بدن پر راکھے ملے، کھوپڑیوں کے ہار پہنے، کڑا بجاتے چاروں اور گھومتے تھے۔ ایک سے ایک پرم نہ اور یوگی مدیوں کے کنارے کٹیوں میں بیٹھا تھا۔

یہ سکون بخش ماحول جہاں گیت تھے اور ڈھول اور منجیرے کی صدائیں، بست رت آتی تو سارے میں زرد اور دھافی رنگ پھیل جاتے۔ گریکھم رت میں درختوں سے مہوہ ٹپتا اور آم کے درخت بور سے لد جاتے۔ رنگیلی برکھارت میں چند ریاں ہوا میں لہرا تیں، لاڈنیاں گائی جاتیں، بڑکیاں پکوان پکاتیں۔

بھادوں کے مہینے میں انگامانی کا جوش اور غصہ دیکھنے والا ہوتا۔ شروع کے موسم میں پہلی چاندنی سارے میں پھیلتی اور اداس سہاگنیں اپنے پر دیسی شوہروں کی یاد میں بردہا لاتیں، چپڑ کاتیں اور ساس نندوں سے لڑتیں۔

ہمیلت رت آتی۔ اگہن اور پوس کی سر دہوا کیمیں چلا تیں، الا وجنتے، آلحاء اول گایا جاتا۔ ماگھا اور پھاگن کے مہینوں میں کھیتوں پر پالا برستا۔ پنے اور ارہر کے پودوں پر اوس کے قطرے جگلاتے کسانوں کے جھونپڑوں سے چکی کی گھر گھر کی

صدائیں بلند ہوتیں۔

آوازوں اور رنگوں کی اس دنیا میں وہ مکمل طور پر رس بس چکا تھا۔

یہ سب تھا مگر چمپا نہیں تھی، اسے کون زمین نگل گئی؟ کون آسمان کھا گیا؟ کون چٹا کے شعلوں کی وہ نذر ہوئی؟ کس ندی کی لہروں نے اسے اپنی اور کھینچا؟ یہ کون بتا سکتا تھا؟ ان گنت تہوار آئے اور نکل گئے۔ رکھشا بندھن اور بھیا دوچ اور جنم اشتمی اور ہولی اور دیوالی اور محرم اور رام لیا۔ کسی ہنگامے کسی میلے کسی گاؤں کسی بستی میں وہ نظر نہ آئی، وہ سارے میں مارا مارا پھرا، ایک دوبارہ ایو وحصیا گیا، اس کا جی چاہتا تھا کہ عمر انہیں سبزہ زاروں، سر جو اور گنگا کے ان ہی ساحلوں پر گزر اردو۔

چمپا کی یاداں ایک عجیب حیثیت سے اس کے دل میں رہتی تھی۔ بھگتی مارگ میں اس نے دیکھا تھا کہ وشنو، اتر یا می ایسا خدا ہے جو دلوں کے اندر رہتا ہے، وہ باپ ہے، شوہر ہے، ماں ہے، دوست ہے، رادھا کے لئے کرشن ہے، کرشن کے لئے رادھا ہے۔ اس نے سوچا کہ عشق مجازی سے عشقِ حقیقی تک کافاصلہ تو بہت طے کرتے ہیں مگر چمپا ان گنت اندریوں میں میرے لئے اجالا کرتی جاتی ہے۔ جب وہ ساون کی راتوں میں اڑکیوں کے گیت سنتا تو دنیا بالکل نئی شکل میں اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتی کیونکہ اب اسے معلوم تھا کہ الفاظ کے معنی کیا ہیں۔ ویراگن جو پیا کی تلاش میں اندری رات میں نکل کھڑی ہوئی، وہا کی رات فراق تھی۔ جو گن، گوری، سہا گن، خدا کا بندہ تھا۔ پتی، منوہر، گردھر گوپال، خدا تھا جس کی کھوج میں گوری راج پاٹ چھوڑ بنوں میں ماری ماری پھر رہی تھی۔ عرب و

عجم کی شاعری کی تصوراتی کائنات سے جو اس کا رشتہ اب تک رہا تھا وہ اس رشتے سے بالکل مختلف تھا جو اس نے ان الفاظ، ان سروں مدھم رنگوں سے قائم کیا۔ خدا ساتی نہیں تھا، خدا پتیم تھا۔ ہری، شیام، کنهیا اور رام۔۔۔ مو ہے رام سے کوئی ملا دے۔ مو ہے رام سے۔۔۔ کوئی کہے وہ بے اودھ میں کوئی کہے بندرابن میں۔۔۔ کوئی کہے وہ بے اودھ میں۔۔۔

وہ ہمینوں یونہی ادھرا دھر پھرا کیا۔ ایک باروہ ایودھیا سے کئی مہینے تک واپس نہ آیا۔ کاشی میں اس کی ڈھنڈیا پھی۔ لا الہالی سیلانی آدمی ہے بغداد لوٹ گیا ہو گا۔ کسی نے کہا مگر اسے بغداد سے کیا مطلب؟ وہ تو گھاگرا کے کنارے کنارے گھومتا پھرتا تھا، جب وہ لوٹ کر آیا اسے جواہوں کی بستی واپس جاتے ہوئے ڈر سا لگا۔ گروائے ڈانٹیں گے تو نہیں کہ تم اب تک کس چکر میں بنتا ہو، لیکن میاں کبیر اسے دیکھ کر مسکرا دیے۔ تال سوکھ کر پھر بھیو، نہ کہیں نہ جائے۔ پچھلی پہیت کے کار نے کنکر چن چن کھائے انہوں نے کچھ دری سوچ میں ڈو بنے کے بعد کپڑے کا تانا تیار کرتے ہوئے کہا۔

مال و ہیں مٹی سے لپے ہوئے فرش پر پہنچ گیا اور کر گھے کی آواز سننے لگا۔ نہ کہیں نہ جائے نہ کہیں نہ جائے، وہ یہاں سے کہاں جاستا تھا پچھلی پر بیت کا ناطہ تو بہت گہرا ہوتا ہے۔ وفا کا مطلب اس کی سمجھ میں آیا۔ وفا کا راستہ تو اسے چمپا ہی نے سمجھایا تھا، وہ کبیر کے ساتھ ساتھ ایسے رہتا جیسے انگاکے جلو میں جمنا جی بہتی ہیں اور چمپا اس کے ساتھ ساتھ اس طرح تھی جیسے ستم کے ساتھ سوتی جو مادی آنکھوں کو نظر نہیں آتی۔

مگر یہ ساتھ بھی چند روزہ تھا۔ کاشی کے پنڈتوں اور مولویوں نے سلطان سکندر سے فریاد کی یہ بدعتی جو لہا عوام کو گراہ کر رہا ہے، اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر لوگوں نے انگا میں ڈبو دیا مگر وہ ضدی جو لہا، جل تھل را کھت ہیں رکھوں تھو، کاغذ کا تاپانی سے باہر نکل آیا۔

دلی کا سلطان بڑا دیالا اور دین دار مسلمان تھا، اس نے میاں بیبر سے کہلوایا کہ وہ شر سے محفوظ رہنے کے لئے کاشی سے کہیں دور چلے جائیں۔

۲۵

میاں بیبر بنا رہا سے جلاوطن ہوئے۔ شوپوری کا جنگل اجڑ گیا جہاں مولسری مہکتی تھی اور سدرش کے پھول کھلتے تھے۔ میاں بیبر کا کرگھا سنہاں پڑا تھا، ان کے مکان پر خاموشی چھائی تھی۔ مانی، ان کی چھوٹی سی بچی، بستی کی گلیوں میں روئی پھرتی تھی۔ کاشی نواسیوں کی آنکھوں سے آنسو پک رہے تھے۔ مال نے ایک بار پھر اپنا رخت سفر باندھا اور انگا کے گھاث پر پہنچ کر بنگال جانے والے جہاز پر سوار ہو گیا، اس کے ایک سرے پر یہاں سے سینکڑوں میل دور گوڑھا جہاں وہ آج سے کئی سال ادھر اپنے سلطان کو تھا چھوڑ کر چلا آیا تھا۔

چند ہفتوں بعد جہاز پہنچ پہنچا۔ پہنچے میں اسے معلوم ہوا کہ سلطان حسین شری گوڑ سے بھاگل پور آ گیا تھا اور یہاں چند سال گزرے اسی جلاوطنی کے عالم میں خدا کو پیارا ہوا۔

سلطان حسین شرقی جس نے موسیقی کی دنیا میں ایک بُنیٰ جہت کا اضافہ کیا تھا۔
جنگوں میں لڑا بھڑا، جنگلوں میں مارا مارا پھر تارہ اور ختم ہو گیا۔
لیکن حسینی پیا، جس کی سلطنت چند روزہ تھی اور جسے زندگی میں امن نصیب نہ
تھا، سر میں ڈوب کر زندہ رہا۔

سر کی لہروں پر بہتے ہوئے اب مال نے نئی نئی دنیاوں کی سیر شروع کی۔ نفحہ
جو سب سے پہلے پیدا ہوا۔ نفحہ حق جسے کبیر انہد ناد کہتا تھا۔ باجت انہد ڈھول
رہے۔ تجھے ہری ملیں گے، تجھے ہری ملیں گے، تجھے ہری ملیں گے۔

موسیقی کی یہ ساری دنیا اس کی اپنی تھی۔ جے دیو اور دیاپتی اور چنڈی واس
کے بھجن، ماہی گیروں اور کسانوں کے گیت، کوچہ گرد فقیروں کے لحن۔ اس دنیا میں
حملوں اور شب خونوں اور فوجوں کی بیلغار، سیاسی تلاطمیں، جلاوطنی اور بیوت کا کھٹکا
نہ تھا۔ موسیقی کی وحدت خدا کی وحدت تھی۔

بنگال پہنچ کر وہ گنگا کے کنارے ایک ایسے گھاٹ پر اترا۔ جس کا نام اس کو معلوم
نہ تھا۔ یہاں پان کی بیلیں پھیلی تھیں اور دھان کے کھیت تھے اور جھیلوں میں نیلے
پھول کھلے تھے۔ بر گد کے درخت کے نیچے کسی مرشد کی خانقاہ تھی، اس نے وہیں
رہنا شروع کر دیا۔ بنگال جو سریلی آوازوں کا وسیع بھنور تھا۔ باول گانے والوں کی
ٹولیاں اک تارہ بجاتی گلی گلی گھوتیں۔ داستان گوگا گا کر روپ کتھائیں سناتے۔
خانجھی اور پسیرے اور ہاتھی پکڑنے والے ہر سے گاتے رہتے۔ کرشن اور رادھا کی
محبت میں ہر انسان سرشار نت نے راگ الابا پھر تارہ۔ اس سحر انگیز سرزی میں کے
باسیوں کی رگ رگ میں موسیقی رچی تھی۔ مال ان کوچہ گرد شاعروں کے ساتھ

سارے میں گھومتا پھرا۔ پورب میں دریاؤں کی اہروں پر اپنی ناؤکھیتاوہ چانگام کی پھاڑیوں اور اراکان تک جا پہنچا۔ یا تریوں کے ساتھ وہ سیتا کندگیا جہاں اونچی پھاڑی پر، جس کے دونوں طرف گہرے کھڈتے تھے اور جن میں باگھوٹتے تھے، سیتا مہارانی کا مندر تھا۔ پھاڑی کے گھنے پر خطر جنگلوں میں صدیوں پرانے مٹھتے تھے اور پھاڑی کے دامن میں سنگ سرخ کے تالاب کے کنارے کنارے معبد بنے تھے اور بڑے درختوں کے نیچے لڑکیوں کی ٹولیاں بیٹھی کیرتن گاتی تھیں۔

چانگام کا علاقہ دغیریب تھا۔ بل کھاتے تند رو غظیم دریا، خطرناک بن، خوبصوردار پھول اور پھل، سر برز پھاڑی راستے، بانس کے گھنے جھنڈ جن کے اندر عمیق تاریکیوں میں خانقاہیں تھیں۔

ایک روز وہ ان جنگلوں میں سے گزر رہا تھا اسے ایک تالاب کے کنارے چند لوگ اکتارہ بجا کر گاتے دھلاتی دیے، وہ ان کے قریب پہنچا۔ یہ نظام ڈاکو گیت تھا جو وہ لوگ لہک لہک کر انتہائی عقیدت کے ساتھ گار ہے تھے، اس کی دھن کیرتن کی ایسی تھی۔ ایسی فتحت مال نے آج تک نہ سنی تھی، وہ دچپی سے کان لگا کر سننے لگا۔ اس گیت کا مصنف ان علاقوں کا بہت بڑا ڈاکو تھا جو سو سال گزرے یہاں لوٹ مار مچایا کرتا تھا اور پھر صوفیوں کی شگفت میں پڑ کر خود بھی بہت بڑا ولی اللہ بن گیا تھا۔

اگر محمد اوتار جنم نہ لیتے۔۔۔ کیرتن منڈلی نے گایا۔۔۔
تو اللہ کی حکومت تر لوک میں قائم نہ ہوتی۔

نمونہ ہے عبد اللہ اور آمنہ

جے ہو مکہ نگری کی اور سارے اولیاء کی اور بی بی فاطمہ کی جو سارے جگ کی
ماتا ہیں۔ جے ہواتر میں ہمایہ کی جس کے قدموں میں ساری کائنات پھیلی ہے۔

جے ہو پورب سے نکلتے سوریہ کی

اب میں وندراہن کے سامنے جھلتا ہوں۔

بھگوان کرشن اور شری رادھے کو اور چاروں کھونٹ مذیوں اور ساگروں کو میرا

پرnam

جے ہو مسلمانوں کے فرقوں کی

جے ہو دھرتی ماتا اور پوتہ سنکھا مذی کی

نوپاڑا کی مسجد کو میرا پرnam

کیونکہ وہ بڑا پیہا ایک بار ان خطوں سے گزراتھا
اب میں آگے بڑھ کر سیتا گھاٹ پہنچتا ہوں۔ آ درش استری سیتا دیوی اور ان

کے

مہاراج رکھنا تھا کو میرا پرnam

جے ہو۔۔۔ جے ہو۔۔۔ جے ہو۔۔۔

مال حیرت زدہ بیٹھا یہ عجیب و غریب نعت ستارہا اور پھر گانے والوں کی
آواز میں آواز ملا کر خود بھی گانے میں شامل ہو گیا، اب وہ بغداد سے ہزاروں
لاکھوں میل دور نکل آیا تھا۔۔۔ مذهب اپنے گرد و پیش، اپنے ماحدوں اور پس منظر
سے کس طرح متاثر ہوتا ہے، کس طرح اس کی جڑیں ایک اجنبی سر زمین میں پھیلتی
ہیں۔۔۔ مال گاتا رہا۔۔۔ جے ہو جے ہو۔۔۔ جے ہو۔۔۔

اب وہ ایک نئی زبان سیکھ رہا تھا، یہ بنگالی زبان تھی جو اور دھ اور بھار کی بولیوں سے زیادہ مختلف نہ تھی اور سنسکرت سے قریب تر تھی اور ملک کی دوسری جدید زبانوں کی طرح تیزی سے اس کی نشوونما ہو رہی تھی۔

یہ بڑی میٹھی زبان تھی۔ اب وہ اسے اپنی زبان سمجھنے لگا۔ اسی میں بات چیت کرتا، اسی میں سوچتا، اسی میں لکھتا۔

ایک زمانہ وہ بھی تھا جب وہ دربار جو پور کے ایک امیر کی حیثیت سے یہاں آیا تھا۔ گود وہ دربار اس وقت لٹ چکا تھا لیکن حسین شریقی اور اس کے ساتھیوں کی شان و شوکت بہر حال باقی تھی لیکن دنیا تو اب مدین ہوئیں جو پور کے ابوالمنصور مال الدین کو بھول چکی تھی۔ کسی کو کیا معلوم کہ یہ خوبصورت نوجوان، جس کے سر کے بال کنپیوں پر سے تھوڑے تھوڑے سفید ہو چکے ہیں اور جو چمپا کے درخت کے نیچے بیٹھا ایک باول سے کچن مالا کی کھانی سن رہا ہے۔ یا اک تارہ بجا بجا کر کبیر داس کی کوئی بانی الاپ رہا ہے یا کاغذ قلم لئے بنگال زبانی میں کوئی لوک کھانی قلمبند کرنے میں مصروف ہے، یہ کون ہے؟

گاؤں کے اور باول گانے والوں سے گیتی کھائیں سنتے اس سر زمین کے بہت سے مناظر اس کی نظروں کے سامنے سے گزرے۔ پال بادشاہوں کا بنگال جب گوتم بدھ کے پجاري یہاں موتی رولتے تھے۔ جب پدما اور بھاگیرتی اور مدھو متی پر میور پنکھی جہازوں کے بھرے تیرتے تھے۔ جب ان سایہ دار راستوں پر سے پھولوں سے ڈھکے پشپ رتھ گزرتے تھے جن میں بیٹھی چترنی ناریاں مدھر پہنچتی تھیں۔ جگہاں تے محلوں میں رہنے والی ملکہ بینا متی۔ زر زگار چتر ڈولوں کے

سرخ پر دوں سے جھانکتی رہنیں، وہ سب کہاں گئیں؟ وہ شان و شوکت کا زمانہ کیس ختم ہوا؟ بدھ بنگال جو ہیرے جواہرات اور سونا اور چاندی اور موتی رولتا تھا وہ سب کیا ہوا؟ اب تو سین بادشاہوں کے محلوں میں بھی الوبولتے تھے۔ گوتم بدھ اور دینی تارا اور درگا بھوانی اور وشنو کے پیجاری ^{دھڑا دھرم} مسلمان ہوتے جا رہے تھے۔ تاریخ کے نقشے کس طرح بدلتے ہیں، مال آنکھیں بند کر کے سوچتا۔

کئی سال تک وہ اسی طرح کہانیاں اور گیت لکھتا رہا، وہ سورخ، محقق، سیاستدان، سپاہی، حسوفی، بیسر کا چیلہ۔۔۔ اب گیت کارن چکا تھا۔

اسی طرح گھومتے پھرتے وہ سونارگاؤں پہنچا اور وہاں اس نے شادی کر لی۔ اس لڑکی کا نام شنیل تھا، وہ ذات کی شودرتھی۔ ایک روز جب وہ تالاب کے کنارے گاگر لے کر آئی تھی مال اس کے لمبے بالوں اور سیاہ پلکوں پر عاشق ہو گیا، یہ عمر اور زمینی پختگی عشق کرنے کی نہیں تھی لیکن روح اور دل کی کائناتوں کی ساری مسافتیں طے کرنے کے بعد اس نے اندازہ لگایا کہ زندگی میں اصل چیز سکون ہے، ایسا سکون جس میں پر خطر طوفانوں اور آندھیوں کی گنجائش ہی موجود نہ ہو۔ یہ سکون اسے اس سیدھی سادی ان پڑھ دیہاتی لڑکی سے شادی کر کے حاصل ہو گیا۔ گویا یہی اس کی منزل تھی۔ جونپور کی شہزادی ایک بہت دھندا ساخواب تھا جو اسے یاد بھی نہیں رہا تھا۔ ایو دھیا کی برہمن زادی اس کی روح اور دل کے اس تہہ خانے میں موجود تھی جس کے دوازے مقفل کر کے اس کی کنجی اس نے خود مدنی میں پھینک دی۔

کیونکہ یاد زندگی کا سب سے بڑا اعذاب ہے۔

شنبیلا اب اس کی بیوی تھی، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ شودر ہونے میں کیا قباحت ہے۔ اس نے شنبیل کا نام آمنہ بی بی رکھا اور اس کے ساتھ ایک خوبصورت بانس کے جھونپڑے میں رہنے لگا۔

گزر اوقات کے لئے وہ بھیتی کرتا، اس کے محیت میں دھان بوئے تھے اور اس کے جھونپڑے کے سامنے چھوٹا سا تالاب تھا جس میں سلگھائے تھے اور کنوں کے پھول اور جس میں روپیہ پروں والی طخینہ تیرتی تھیں۔ جب آسمان پر اندر کی سماں انکھی اور جوہی کے پھولوں پر بھوزرا گنگانا تا وہ اپنے چھوٹے سے مکان کے برآمدے میں اپنے ساتھی گیت کاروں کے ساتھ بیٹھ کر اندر لہری بجاتا۔ آمنہ اپنے لوچدار جسم پر تمیز جامنی یا تمیز بزرگ کی ساری لیٹیئے پیٹل کا گھڑا کمر پر سنجھائے تالاب کی اور جاتی نظر آتی۔

دن گزرتے گئے۔ دکھی بنگال نے، جس کے سلاطین ہمیشہ آپس میں کثتے مرتے رہتے تھے، اب چند دنوں سے چین کا سانس لیا تھا۔ گوڑ کے تخت پر سید السادات علاء الدین ابوالمظفر حسین شاہ بر اجمان تھا۔ وسط ایشیا کے شہر ترمذ سے آئے ہوئے خاندان کا یہ غریب سید، جو سلطان ابن سلطان نہیں تھا اور جس کی شرافت اور قابلیت کی بناء پر عوام نے اسے خود منتخب کر کے اپنا بادشاہ بنایا تھا، اس کے عہد میں دو دھکی ندیاں بہتی تھیں۔ قتل و غارت کے بازار سرد ہو چکے تھے، ایک نئی زبان کو پروان چڑھایا جا رہا تھا۔ بنگال کا یہ عظیم ترین مسلمان بادشاہ جس کے دور میں ودیا پتی ٹھا کر اور مہا پر بھو جیتن سری کرشن کے عشق کے سریلے نغمے الپ رہے تھے۔ راج محل کی پیاریوں سے پھر بہا بہا ک گوڑ لائے جا رہے تھے اور نئی

نئی خوبصورت عمارتیں تعمیر کی جا رہی تھیں۔ دربار میں علمی مجلسیں آرائشہ ہوتی تھیں۔

کئی برس بیت گئے۔ مال کے بچے جوان ہو چکے تھے، اس نے اپنے لڑکوں کے نام جمال اور جلال رکھے تھے، اس کی لڑکی کا نام سینہ بی بی تھا، وہ اپنی اولاد کی صورت دیکھ کر جیتا تھا۔ اس کے دونوں لڑکے ماہر تعمیرات تھے اور گوڑ اور سنار گاؤں میں عمارتیں بنوانے میں مصروف تھے۔ گوڑ کی چھوٹا سونا مسجد اور گن منڈ مسجد کا نقشہ جمال نے تیار کیا تھا۔ جمال گوڑ کا میر عمارت تھا۔ بڑا سونا مسجد کی بزر اور نیلی اور سفید اور زرد اور نارنجی پیچی کاری میں بنگال کے سارے رنگ سمیٹ لیے گئے۔ ان کے ستون، ان کی محرابیں اور گنبد خالص دیکی تھے۔ یہ عمارتیں بھی پال اور سین عہد کی تعمیرات کی روایت میں شامل ہو گئیں۔ یہ بنگالی طرز تعمیر تھا۔ مال کی لڑکی کی شادی بروان کے مرشدزادوں کے یہاں ہوئی تھی۔ اس کی بی بی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس نے آمنہ کو اپنے ہاتھوں سے اسی تالاب کے کنارے دفن کیا تھا۔ اب اس کے بال سفید ہو چکے تھے۔ اب بھی وہ دن بھر برآمدے میں بیٹھا مرشدی اور معرفتی نفعے لکھتا اور گاتا، اس کے بیٹے گوڑ سے اپنے گاؤں واپس آتے اور اسے ملک کی سیاست کی خبریں سنایا کرتے، لیکن یہ خبریں اب اسیں بالکل کسی دوسرے سیارے کی باتیں معلوم ہوتیں۔

کیونکہ بغداد کا ابوالمنصور مال الدین، جو پچاس سال ادھر عراق سے ہند آیا تھا، کوئی دوسرا انسان تھا۔ یہ کوئی مختلف انسان تھا جو بالوں کی لثیں اور داڑھی بڑھائے چارخانہ تہبد باندھے ہاتھ میں ایک تارہ لئے ویشنونگر الاپ رہا تھا۔

ابو المنصور مال الدین بنگالے کا باشندہ تھا۔ بنگالی تھا، چنانچہ جب دور پنجم
دہلی میں ایک بار پھر سلطنت بدی اور سلطان ابراہیم ہارا اور ترچھی آنکھوں والا
منگول ظہیر الدین جیتا اور دنیا کا بو جھ شہار نے والی گائے نے اپنا سینگ تبدیل کیا
تو اپنے بڑے لڑے جمال سے یہ سارے سنبھلی خیز واقعات سن کر اس نے ذرا سی
بھی حرمت کا اظہار نہ کیا۔ اس کے بیٹے جلال نے اس سے کہا کہ وہ مغلوں کے
لنے عمارتیں بنانے والی جا رہا ہے تب بھی وہ خاموش رہا، اس نے ساری دنیا گھوم
کر اپنی منزل تلاش کی تھی۔ اب دنیا اس کے بیٹوں کے سامنے پھیلی تھی، وہ بھی اپنی
منزیں خود تلاش کریں گے۔

مگر اب امن کے دن ختم ہونے والے تھے۔ بنگالے پر سید علاء الدین حسین
شاہ کے بیٹے ناصر الدین نصرت شاہ کی حکومت تھی۔ مغلوں سے ہارنے کے بعد
دہلی کے افغان، جو کل حکمرانی کرتے تھے، آج پناہ گزینوں کی حیثیت سے گوڑا اور
لکھنؤتی کے گلی کوچوں میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے
ایک مرتبہ جونپور کے حکمران انہی افغانوں سے مار کھا کے یہاں پناہ لینے آئے
تھے۔ یہ افغان مال کو ہر جگہ ملتے اور گوڑے کے بازاروں میں راستہ چلتے چلتے لوگوں کو
روک روک کر انہیں اپنی گزشتہ عظمت اور جاہ و جلال کے قصے سناتے۔ گوڑ کی گلیوں
میں مال نے ایک روز ایک پر تگالی دیکھا جوا کر تباہ ہوا ایک سمت کو چلا جا رہا تھا۔
مال اپنی لٹھی کے سہارے کھڑا اچنچھے سے اسے دیکھتا رہا۔ اسے برسوں پہلے کا
وہ اندھا برہمن یاد آیا جو ان سے ہارنے کے بعد کوچین سے کاشی آیا تھا۔ اس وقت
پر تگالیوں کا جہازی بیڑا چانگام کی بندرگاہ میں موجود تھا اور وہ لوگ گوڑ میں بھی

دنمار ہے تھے۔

وقت تیزی سے نکلا گیا۔ گوڑ کے سیاسی حالات بگڑنا شروع ہوئے۔ اب وہاں ناصر الدین کا بھائی غیاث الدین راج گدی پر بیٹھا تھا۔

ایک روز مال نے خبر سنی کہ بہار کے شیر خان نے غیاث الدین سے بنگال کا تحنت چھین لیا، پھر معلوم ہوا کہ دلی کے شہنشاہ ہمایوں اور شیر خان میں گھسان کا رن پڑا اور ایک روز چند بادلوں نے آ کر مال کو بتایا کہ مغل بادشاہ دھوم مچاتا گوڑ میں داخل ہو چکا ہے اور اسی کے نام کا سکنڈ مکال میں گھڑا جا رہا ہے۔ دور دراز ترکستان سے آئے ہوئے تاتاری پر بنگال نے ایسا جادو کر دیا کہ اس نے گوڑ کا نام جنت آباد رکھا ہے، یہ سب خریں مال کو بڑی عجیب بچپنے کی معلوم ہوئیں۔ بادشاہیں بدلتی ہیں تو جگہوں اور انسانوں کے نام بھی بدل دیے جاتے ہیں۔ انسان اپنے اقتدار کا سکنہ جمانے کا کس قدر شوقیں ہے؟ ہرے بھرے بنگال کی بد امنی بڑھتی گئی۔ شیر خان پھر گرتا ہوا آیا اور دلی کے مغل کو واپس دلی بھگا کر دوبارہ بنگال پر قابض ہو گیا۔ ملک سہا ہوا تھا۔ ہمایوں اور شیر شاہ میں بڑی خوزیر جنگ ہوتی۔ اسی لڑائی میں جمال گوڑ کی گلیوں میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ ایک رات شیر خان کے سپاہیوں نے اس گاؤں کا بھی محاصرہ کر لیا جہاں مال کی جھونپڑی تھی۔ سپاہی لوٹ مار مچاتے اس کے گھر تک آن پہنچے، باہر نکلو، وہ چلا رہے تھے۔ تم سب سے بڑے فسادی ہو، تمہارا کوئی بھروسہ نہیں، تمہارے بیٹھے دلی جا کر مغلوں سے مل گئے ہیں۔ تم غدار ہو، تم کو تو ہم جان سے مار دیں گے، تم کو گوڑ لے جا کر قید خانے میں ڈال دیں گے۔ ارے وہ گیت بنانے والا ابوالمنصور یہیں رہتا ہے تا۔

باہر نکل او بڑھے، اندر کس سازش میں لگا ہے۔ مال کا نپتے ہوئے ہاتھوں میں چپاغ اٹھا کر دروازے تک آیا اور حیرت سے سپاہی کو دیکھنے لگا، وہ غل مچاتے اس کی اور بڑھے، مال مضبوطی سے دروازے کی چوکھت تھام کران کے سامنے ڈٹ گیا، وہ بہت بوڑھا پھونس ہو چکا تھا اور اس کے ہاتھوں میں رعشہ تھا مگر وہ جم کر کھڑا رہا۔ اس کے پاس اپنی مدافعت کے لئے توار بھی نہیں تھی، وہ گوڑے لے جایا جائے گا؟ اس نے کس کا قصور کیا ہے؟ اسے انفانوں اور مغلوں کے چھڑوں سے کوئی دچکی نہیں، وہ صرف اتنا چاہتا ہے کہ یہاں اسے اُمن سے رہنے دیا جائے۔ یہاں کا ملک ہے۔ اس کا وطن! یہاں اس کے بچے پیدا ہوئے ہیں۔ یہاں اس کی بیابی کی قبر ہے، یہاں اس کے دھان کے ہرے کھیت ہیں، اس نے اس زبان کی آبیاری کی ہے۔ اس نے گیت بنائے ہیں، وہ یہاں رہے گا۔ اسے خدار کہنے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ یہ دارالحرب نہیں ہے دارالسلام ہے۔ اس لمحے سے انکشاف ہوا دارالحرب اور دارالسلام میں کوئی فرق نہیں، صرف رویے کا فرق ہے، اڑا یاں دوند ہبؤں کے درمیان نہیں ہوتیں دو سیاسی طائفوں کے درمیان ہوتی ہیں۔

سہرام کا شیر خاں اور دلی کا ہمایوں بادشاہ دونوں کلمہ گو ہیں لیکن ایک نے آ کر دوسرے کا قلع قمع کر دیا۔ دارالسلام بھی دارالحرب بن ستا ہے اگر اس میں شرکا وجود ہو۔

شیر خاں کی فوج کے اجڑ سپاہی یہ سب کہاں سمجھ سکتے تھے۔ انہوں نے زور سے مال کو دھکا دے کر گرا یا اور ملز مچاتے آگے بڑھ گئے۔

مال اپنے گھر کی دلیز پر اوندھے منہ گرا، اس کے منہ سے خون کی ندی بہہ گئی

اور چند گھنٹے تک سکتے رہنے کے بعد وہ اسی طرح پڑا پڑا خاموشی سے ختم ہو گیا۔

ہند پر اب مغل شہنشاہوں کا راج ہے، پرانا نظام بدل چکا ہے۔ گوڑا اور لکھنؤتی اور پٹنہ اب خواب و خیال ہوئے۔ ترکوں کی ولی کا بھی خاتمہ ہوا۔ ولی اب مغلوں کی ہے۔

لیکن وہ کسان موجود ہے، وہ جو گھننوں تک پانی میں جھکا دھان کی فصل بورہا ہے، وہ جو بیلوں کی جوڑی ہنکاتا میگھنا کے کنارے کنارے جا رہا ہے، وہ بھاگرتی کی سطح پر کشی کھیتا اور گیت گاتا ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کی سمت رواں ہے، وہ مرشدوں اور بھگتوں کے قدموں میں بیٹھا کیرتن اور معرفتی لغے الاپ رہا ہے۔

بنگال کا کسان ابوالمنصور مال الدین زندہ ہے اور زندہ رہے گا، وہ تو اپنے چھوٹے سے نوکے میں بیٹھا پدما کی تند رو مو جوں کا مقابلہ کر رہا ہے۔ فوکا پدما کی لہروں پر ڈولتا جا رہا ہے۔ آگے جدھر گھپ اندر ھیرا ہے اور فقاوں میں طوفان ارز رہے ہیں اور تاریک دھاراوں میں مہریب نا کے منہ چھاڑے بیٹھے ہیں اور ہوا میں بہت تیز ہیں مگر پدما کے اس بوڑھے فاقہ زدہ ملاج کی کشی بڑے مزے سے عناصر کا مقابلہ کر رہی ہے کیونکہ عناصر کی بے رحمی اور موت اور خطروں سے اس کی پرانی دوستی ہے۔

آخر جب ہوا کا زور زیادہ بڑھا اور کشی بار بار ڈولنے لگی تو سل نے لائیں اٹھا کر گھبراہٹ کے ساتھ چاروں طرف نظر ڈالی۔ ”پیٹر ہم طوفان میں تو نہیں کچھ گئے؟“ اس نے پریشانی سے سوال کیا۔

”نہیں، یہ تو معمولی سی ہوا ہے، پریشان مت ہو۔“ پیٹر نے جواب دیا۔ ”مگر

ذرا اس کا لے سو رہے ہو کہ اپنا بھوٹا گانا الائپنے کے بجائے پتوار کی طرف زیادہ توجہ کرے ورنہ اس طرح ہم گھاٹ پر صحیح تک نہ پہنچ پائیں گے۔“

”سو رہا ہے کیا بوڑھا کتا۔“ سرل نے چٹائی کی چھت پر جھک کر دوسروی اور جھانکتے ہوئے کہا۔ ماجھی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور صبر کے ساتھ پتوار چلانے میں مصروف رہا۔ ”یہ بڑے ذیلیں لوگ ہیں۔ جب تک ہنڑ نہ لگاؤ ان میں چستی نہیں آتی۔“ پیر نے کہا۔ سرل نے دور سے اپنی نظری موشہ کی چھپڑی بڑھا کر بوڑھے کی کمر میں چھوٹی۔

”اواؤ می۔ کیا نام ہے تمہارا؟“

”ابوالمنشور۔۔۔ صاحب۔“

”ابوالمنشور۔۔۔ اگر تم چاہتے ہو کہ اسی ہنڑ سے میں تمہاری کھال نہ ادھیر دوں تو تم ذرا زیادہ طاقت سے پتوار چلاو۔۔۔ سمجھے۔“

”جی صاحب۔“ وہ پھر پتوار پر جھک گیا، فوکا چلا کیا۔ کنارے پر دونوں طرف انناس اور کیلے کے جھنڈ تھے۔ دور گاؤں میں روشنیاں جل رہی تھیں۔ سرل نے نوکے کی چھت کے اندر جھانا کا جہاں ابوالمنشور کا مٹی کا دیا اور چٹائی اور جامنماز اور دو کانی کے برتن رکھے تھے۔ دیوار پر ناریل آؤزیاں تھاں، یہ اس بوڑھے پھونس سفید دار ٹھی وائل کی ساری کائنات تھی جو پدم کے طوفانی پانیوں پر ڈالتی تھی۔ سرل کو بڑا عجیب سالگا۔ اس نے آنکھیں ملیں اور خود کو یقین دلانا چاہا کہ یہ سب صحیح ہے کہ قسمت کے ایک انوکھے داؤ نے اسے کیمبرج کی گلیوں سے نکال کر یہاں اس نوکے میں لا بھلا دیا ہے۔ اس عجیب و غریب ملک میں جسے ”بنگال“ کہتے

ہیں جسے "انڈیا" کہتے ہیں۔

الشین اٹھا کر اس نے چاروں اور نظر ڈالی۔ روشنی سے لہروں پر راستہ سابن گیا۔ براہر سے ایک بڑا شمپان گزر گیا۔ چند بہت دور بید کے درختوں کے پیچھے سے آہستہ آہستہ کاہی کے ساتھ طلوع ہو رہا تھا۔

۲۶

جب سرل ہاورڈ ایشلے نے کونز کالج کیمبرج سے بی۔ اے کیا اس وقت اس کی عمر صرف میں سال کی تھی، اس کا باپ ایک بہت مغلوک الحال پادری تھا اور سرل بڑی مشکلوں سے اپنے قبے کے زمیندار کی مدد حاصل کر کے کیمبرج تک پہنچ پایا تھا۔ ڈگری حاصل کرنے کے بعد انہوں آ کر اس نے ٹول ٹمپل میں داخلہ لیا۔ یہاں پڑوں میں فلیٹ اسٹریٹ تھی جس کے قہوہ خانوں میں لکھنے والے اور اخبار نویس جمع ہو کر دنیا جہاں کی باتیں کیا کرتے۔ اکثر سرل بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان کی مغللوں میں شریک ہوتا ہیں ایک روز ایک شراب خانے میں سرل کی ملاقات پئی جیکسن سے ہوئی جو ہندوستان میں تجارت کرتا تھا اور ان دونوں ڈمن آیا ہوا تھا، وہ اسے مولیٰ آواز میں تفصیل سے بتاتا رہا کہ بنگال میں اسے نیل کی کاشت میں کتنے ہزار پاؤ نذر کا نفع ہوا۔ نیٹو کس قدر بے قوف ہوتے ہیں۔ ان کے امراء کتنے دولت مند ہیں۔ گلکتہ کس قدر دلچسپ شہر ہے۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ ہندوستان چلو۔ تم سمجھدار آدمی معلوم ہوتے ہو، اگر عقل سے کام لیا تو چار روز

میں وہاں سونے کے محل کھڑے کر لو گے--- کیا کہا؟ تم شاعری کرنا چاہتے ہو۔
ڈرامے لکھا کرو گے؟ وکالت بڑا نوبل پیشہ ہے۔ تمہارا دماغ خراب ہے۔ چند
روز بعد پیٹر اسے سُنی میں اپنے چچا کے پاس لے گیا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک
ڈائریکٹر تھا۔

سرل کو کلکتہ میں ملازمت مل گئی۔ ایک روز وہ ٹل بری سے ایک انڈیا مین پر
بیٹھا اور ڈور کی سفید چٹانیں اس کی نظروں سے اوچھل ہوتا شروع ہوئیں تو اسے
احساس ہوا کہ وہ انگلستان چھوڑ رہا ہے۔ انگلستان جہاں کینٹ میں اس کا قصبہ
ہے اور جہاں کیم بہتا ہے اور جہاں گولڈ اسٹنچ اور کوپ اور گرے اور برک نے جنم
لیا تھا، جہاں ہو گا رتحہ اور گیفر بردا اور رینالڈز نے تصویریں بنائی تھیں۔ ٹرنس کے
سورج کی روشنی میں ڈو بے ہوئے مناظر اس کی آنکھوں سے اوچھل ہوئے اور
لندن کی گلیوں میں سودا بخنے والیوں کی آوازیں اور قصباتی گرجا گھروں کے
گھنٹوں کی صدائیں اور بلند و بالا جارجیں محلات میں سے بلند ہونے والی چیمپر
موسیقی مدد ہوئی۔ انگلستان جہاں سکون تھا اور مکمل حسن۔ بنگال اور کینیڈ اور جنوبی
امریکہ سے آئی ہوئی دولت نے ملک کو مالا مال کر دیا تھا۔ نئے فیشن ایجاد ہو
رہے تھے، اونچے اونچے قصر تعمیر کیے جا رہے تھے، باغات سجائے گئے تھے، غریب
امیر ہو چکے تھے، امیر ہیرے موئی رولتے تھے، ہر طرف صرف ایک چرچا تھا۔
دولت۔ دولت۔ سرل جو ادب کا اسکالر تھا، جسے دولت سے غرض نہیں تھی، وہ بھی
اسی دھن میں جا رہا تھا، وہ مفلس طالب علم بنگال پہنچ کر امیر ہو جائے گا۔ لندن
میں اس کا بھی ایک محل ہو گا، یا کون جانے شاید وہ کسی وجہی ہندوستانی سردار سے

جنگ کرتا ہوا مارا جائے اور مدرس یا میسور میں اس کی گمراہ قبر بنے۔

اس نے ایک پھر یہی لی اور ڈیک سے ہٹ آیا۔ سمندر بہت بھی کم تھا۔ دنیا میں اس وقت کیا کیا ہو رہا تھا اور وہ دراصل خود کتنا حیرتی تھا۔ اس جہاز پر کیسے کیسے لوگ سوار تھے اور کیسے کیسے ارادے اور تمنا میں لیے اس اندر ہرے میں ایک منزل کی سمت روں تھے۔ ان سب کا حشر کیا ہو گا؟ کمپنی کے تاجر، ہمکار کوںسل کے وہ ممبر جو رخصت کے بعد واپس جا رہے تھے، مدرس کا چیف ہسٹس، اعلیٰ خاندانوں کی چند بن بیاہی اڑکیاں جو حسب معمول اس امید میں ہندوستان جا رہی تھیں کوہاں ان کی شادیاں ہو جائیں گی، جہاز کا کپتان حیدر علی کے معمر کے قصے سن رہا تھا، پٹنے اور ڈھانکے کے نیل کے تاجر ہر وقت اپنی کاروباری باتوں میں مگن رہتے اور سب کے سب متواتر ٹمپریا پیتے۔ کونز کانج کی سرخ کے خاموش کواڈرینگل سے نکلنے کے بعد سرل نے دیکھا دنیا دراصل یہ تھی۔

پھر جہاز جنوبی افریقہ کے ساحلوں سے پاس سے گزرتا ہندوستان کے قریب تر ہو گیا۔ راس امید تک پہنچتے پہنچتے سرل نے اندازہ لگایا کہ ایک بن بیاہی اعلیٰ خاندان کی اڑکی اس پر ڈورے ڈال رہی ہے، وہ ان سب میں معمولی شکل کی تھی اور کسی فوجی کپتان سے شادی کرنے جا رہی تھی جو فورٹ جارج میں تعینات تھا، مگر وہ سرل کی صورت پر تباہ گئی، پھر اس نے جہاز کے کپتان اور دوسرے ساتھیوں سے سرل کے مالی حالات کا پتا لگایا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ ابھی بہت غریب ہے اور کمپنی میں فیکٹر کی حیثیت سے ملازم ہو کر جا رہا ہے اور اڑکیوں کے بجائے فی الحال کتابوں میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔ اس کے بعد مس ازاںیل نے شورے کے ایک

مولے تاجر سے عشق لڑانا شروع کر دیا۔ جہاز کی اس چھوٹی سی دنیا میں یہ سب نہ ہوتا تو مہینوں کا سفر اجیرن ہو جاتا۔

دنیا بدلتی جا رہی تھی، وہ سکون، جس میں ڈوبا ہوا انگلستان وہ اپنے پیچھے چھوڑ کر آ رہا تھا، زیادہ دن اس حالت میں نہیں رہے گا۔ نئے نئے کارخانوں سے اجھتے ہوئے دھوئیں نے اس کے وطن کے پھولوں کی رنگت بدل دی تھی۔

پھول، بہاریں، پیرس، ہائے پیرس، وائے۔۔۔ سرل نے ایک گہری سانس لی۔ پیرس بھی تو ابھی ابھی خون میں نہایا تھا۔ انقلاب۔۔۔؟
روس۔ والیٹر۔ آزادی۔؟

امریکہ کی جنگ آزادی۔؟

جہاز اب مدد غاسکر کے پاس سے گزر رہا تھا۔ یہ مشرق تھا۔ جبشی غلاموں کا وطن اور مشرق سرل کا منتظر تھا۔ چین اور ہندوستان اور ایران اور مصر سب چلا چلا کر اسے پکار رہے تھے، او بھائی سرل آؤ ہم نے تمہارے سواغت کے لیے ساری تیاریاں کر کھلی ہیں۔ بھیلیں لے کر اور بندوقیں اور تلواریں لے کر آؤ اور آ کر ہماری کھال اتا رلو۔ کانپور اور ڈھاکے کے پرانے پاپیوں نے اسے بتانا شروع کیا:
سمجھ سے کام لو تو چند سال میں لکھ پتی بن جاؤ گے۔

”یہ سراج الدولہ کون تھا۔“ سرل نے پیٹر جیکسن نے پوچھا۔

”سراج الدولہ“ پیٹر نے ناک بھوں چڑھائی۔ ”میں تم کو اس کا سارا واقعہ تفصیل سے سناؤں گا۔ میں قاسم بازار میں رہ چکا ہوں، بڑا خت بیہودہ تھا۔ ظالم، مکار، مگر ہمارے وفادار دوست بھی ہیں۔ مثلاً اودھ کا موجودہ نواب۔

”وہ کون ہے؟“

پیٹر جیکسن نے سرل کو فیض آباد اور لکھنؤ کی الف الیلوی داستانیں سنانا شروع کیس، پھر میسور والوں کا اور ارکات کا تذکرہ کیا۔ بمبئی پہنچتے پہنچتے سرل پچھلے دوسو سال کے واقعات سے واقف اور ہندوستان کی پوری تاریخ کا ماہر ہو چکا تھا۔ ہندوؤں کی بربریت۔ ایک سرخ زبان والی مورتی کو پوچھتے ہیں۔ بیواؤں کو آگ میں زندہ جلاتے ہیں۔ ننگے پیر گھوٹتے ہیں۔ گائے اور بندرا اور سانپ کو خدا سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں کے مظالم۔ عورتوں کو پردے میں گھونٹ کر رکھتے ہیں۔ پندرہ پندرہ شادیاں کرتے ہیں۔ غرضیکہ پیٹر جیکسن نے جو کچھا سے بتایا وہ خاصا پریشان کرنے تھا مگر بہر حال حلقے سے کون چشم پوشی کر سکتا ہے اور یہ سب تاریخی حلقے تھے جن پر پیٹر جیکسن نے روشنی ڈالی تھی۔ یہ طے شدہ بات تھی کہ نیٹو بمحاذ نسل کمرت تھے۔ ایشیائی سارے اور ہندوستانی بالخصوص گھٹیا درجے کے انسان تھے۔ عثمانی ترکوں سے بھی بدتر کیونکہ عثمانی ترک کم از کم سفید فام تو تھے۔ ”نیٹو چونکہ نسل گھٹیا ہیں۔ لہذا ان کے دماغ بھی بے حد پست ہیں۔ بنگال میں ایک رائل ایشیائیک سوسائٹی قائم کی گئی ہے جو کھود کھود کر جانے کس زمانے کی بکواس نکال رہی ہے۔ سنسکرت اور فلما نا اور ڈھما کا۔ مردہ زبانیں جن میں جادو ٹو نے کے نئے لکھے ہیں۔ اس پر ہمارے چند محققوں نے یہ نظر یہ پیش کیا ہے کہ ہندوستانی بھی ایک زمانے میں مہذب تھے۔“ پیٹر نے بات ختم کی۔
سامنے بمبئی کا ساحل نظر آ رہا تھا۔

ہندوستان --- !!

جہاز بندرگاہ میں لٹک رانداز ہوا۔ مسافر اتر کر ساحل پر آ گئے۔ ڈیڑھ سال قبل تک سورت کی بندرگاہ پر مغل کشم افسر یورپیوں کا ناطقہ بند کر دیا کرتے تھے مگر اب اپنی حکومت تھی۔ سرل کے سارے ساتھی خاٹھ سے سیٹی بجا تے جہاز سے اترے اور بہت سے سیاہ فام انسانوں نے آ کر ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور دوڑ دوڑ کر ان کا اسہاب اتنا رنے میں مشغول ہو گئے۔ پر یہ یہ نئی محشریت کی پاکی پٹیر کے استقبال کے لیے آئی ہوئی تی۔ سرل اس کے ساتھ پاکی میں بیٹھ کر مالا بار مل کی طرف چلا۔

سرک کے دونوں طرف دولت مند پارسیوں کے مکان تھے، جن کی عورتیں لکڑی کی بالکنیوں میں سے جھانک رہی تھیں اور نیچے بچے کھیل رہے تھے۔ مضبوط جسموں والی مراثی عورتیں تیز رنگوں کی ساریاں پہنے ساحل کی ریست پر چل رہی تھیں۔ مالا بار مل پر بچوں کھلے تھے۔ بارش ابھی ہو کر تھی تھی۔ انگریزوں کی کوئیوں کی کھپریل کی چھتوں پر رنگ برلنگے بچوں کی بیلیں کھلی تھیں اور کیلے اور ناریل کے پتوں سے پانی کی بوندیں لپک رہی تھیں۔ پٹیر اور سرل کا میزبان چانک تک ان کا استقبال کرنے کے آیا۔ پھر انہوں نے لکڑی کے ستونوں والے برآمدے میں بیٹھ کر چاءپی۔ گوانیز خانہ ماں جو اپنے آپ کو پر تگالی کہتا تھا لپک کر مہمانوں کی خاطریں کرتا رہا، پھر بے ننگم ساسایہ پہنے میری باہر آئی جو صاحب خانہ کے بچوں کی کھلانی تھی۔

میری پہلی یورپیں لڑکی تھی جو سرل نے دیکھی۔ سرل اپنے کمرے کے در پچ میں کھڑے ہو کر سمندر کا نظارہ کرتا رہا۔ کونے میں جب شی لڑکا لپا جھپ اس کے

جنوں پر پاش کر رہا تھا۔ یہ لڑکا دوسرا گاموں کے ساتھ مدد غاسکر سے درآمد کیا گیا تھا اور جتنی دیر وہ کمرے میں رہا۔ سرل کو بڑی وحشت محسوس ہوتی رہی مگر بہر حال یہ شرق تھا۔ شام کو وہ سب ہوا خوری کے لیے نکلے۔ اردو شیر، صاحب خانہ کے پارسی کوچمیں نے جھک کر مودبا نہ لجھے میں پوچھا: ”کس طرف؟“

”چرچ گیٹ چلو“ پھر میزبان نے سرل سے کہا، ”نوجوان لڑکے ہمارا شہر تمہارے شامدار لکھتے کا تو مقابلہ نہیں کر ستا جہاں تم جا رہے ہو مگر بمبئی کی بھی کیا بات ہے۔“ اپالو سے لے کر چرچ گیٹ تک گھاس کے سر بزر قطعے تھے اور ناریل کے گھنے جھرمٹوں کے درمیان پانی کی جھیلیں جگمگاری تھیں۔ دور کولا باکے لائٹ ہاؤس میں روشنی چمک رہی تھی۔ بندرگاہ میں کئی جہاز کھڑے تھے۔ بڑی گہما گہما تھی، اس رات میزبان کے یہاں کھانے پر سرل کو دو پارسیوں سے ملوایا گیا۔ یہ دونوں جہاز سازی کے کارخانے کے مالک تھے اور فرفرا انگریزی بول رہے تھے۔ کس قدر بجانت بجانت کے باشندے اس ملک میں ہیں۔ سرل نے حیرت سے پوچھا۔

چند روز بعد وہ پیٹر جیکسن کے ساتھ فیکٹری دیکھنے کے لیے سورت گیا۔ مغربی گھاٹ کا خوبصورت علاقہ اور کلیان اور ناسک کا حسن اور سر بزر پہاڑی راستے جن پر نیلا کھڑا چھایا ہوتا اور تاپتی کے کنارے۔ مہا کجرات دیش کے سبزہ زاروں پر سورت بسا ہوا تھا۔ سورت۔۔۔ مغلوں کی بندرگاہ سو سال پہلے جس کی آبادی لندن اور بیرس سے زیادہ تھی اور جس کے باغوں میں فوارے چل رہے تھے اور جہاں نگلیں چڑیاں اور ہٹکیاں کاشمی کے آگے دیے جلانے کے بعد گربانا چتی

تحمیں۔

بہمیں لوٹ کر آئے کے بعد سرل دوسرے جہاز کا منتظر رہا جو اسے مدرس اور لکھتے لے جائے۔ پیغمبر جیکسون فی الحال یہیں تھہر رہا تھا، اب سرل کو تنہا سفر کرنا تھا۔ وہ ہندوستان کا ایک حد تک عادی ہو چکا تھا۔

جہاز نے لنگر انٹھایا اور کورومنڈل کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اب نئی نئی دنیا میں اس کی نظروں کے سامنے جھملدار بھی تھیں۔ ناریل کے جھنڈوں میں چھپی ہوئی مسجدیں اور مندر۔ بہمتوں اور مسلمانوں کی آبادیاں۔ شہراشہر گوا ولندزیوں کا سرنگا پشم جس کی عمارتوں کو دیکھ کر اسے ایک لمبے کے لیے ایکسٹرڈم کی یاد آئی اور اس کا دل بیٹھ گیا۔ یورپ۔ یورپ۔ کس قدر دور رہ گیا تھا۔ پانڈی چہری میں کئی فرانسیسی جہاز پڑ آئے، وہ دوسرے جہاز سے فرانس جا رہے تھے، ان میں تین راہبات تھیں اور ایک سوریون کا طالب علم۔۔۔ وہ فوراً سرل سے گھل مل گیا۔ وہ ماں باپ سے ملنے آیا ہوا تھا اور اب واپس جا رہا تھا، وہ جلدی جلدی کندھے اچکا کر اس سے باتیں کرنے لگا۔ پیرس کی باتیں۔ یونیورسٹی کی اور اتفاقاً ب کی باتیں۔ آزادی، مساوات اور اخوت زندہ باد۔ اتفاقاً ب زندہ باد۔ فرانس زندہ باد، وہ اسی طرح جوش سے بچوں کی طرح نعرے لگاتا اتر کر کشتنی میں بیٹھ گیا اور نظروں سے اوچھل ہو گیا۔ جانے اس کا کیا نام تھا اور اس میدان رستاخیز میں اس کا کیا حشر ہو گا، ہر طرف خوزیری تھی اور جنگیں۔ بنگال میں جنوب میں، یورپ میں پولین نے اودھم مچار کھلی تھی۔ سارا یورپ جل رہا ہے اور کئی مرتبہ اور جلتے گا اور اس ہنگامے میں کیمرج اور سوریون کے طالب علم آندھی کے پتوں کی

طرح کھوکرہ جائیں گے اور ایسا ہمیشہ ہوتا رہے گا۔

اور وہ سرل ہا اور ڈاٹسلے، خلیج بنگال کے پانیوں پر محسوس رہے اور ہر طرف موت
دانہ نکو سے کھڑی ہے۔ سامنے میسوری ہیں اور مریٹے۔ شمال میں چڑھی ہوئی
واڑھیوں اور گھیردار شلواروں والے افغان اور سکھ تلواریں چکار رہے ہیں اور
چاروں کھونٹ وحشت ہے اور تباہی اور دلی میں دکھ ہے۔ فیض آباد میں دکھ ہے۔
مرشد آباد میں دکھ ہے، یہ سب سرل کو نہیں معلوم، وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ دلی میں
شاہ عالمگیر ثانی اس وقت چند ابامی کا قصص دیکھنے کے بعد استاد تان رس کان سے
خیال چند رکونس ہمپت میں سننے میں مصروف ہیں۔ پھر مدرس نظر آیا۔ فوراً
سینٹ جارج۔ اور شہر کے مکانات جودھوپ میں چمک رہے تھے۔ بندرگاہ میں بیٹھ
پر سکون شکلوں والے ہندو سوداگر جہاز پر آئے۔ وہ باشون نے اسے گھیر لیا۔
سب مصر تھے کہ وہ انہیں اپنا گماشتہ بنائے۔ لندن اور بمبئی میں روستوں نے
مدرس کے گورنرا اور اعلیٰ طبقے کے افراد سے ملنے کے لئے جو تعارفی خط دے دیے
تھے ان کو جیب میں ٹھوٹنے کے بعد ذرا گھبراہٹ کے ساتھ سرل جہاز سے اترा۔
یہاں پیٹر جیکسن اس کی رہنمائی کے لیے موجود تھا۔

مدرس میں جہاز پانچ چھ دن ٹھہرا۔ اس نے والا جاہ نواب ارکاث کا محل
دیکھا۔ مندوں اور قاعوں کی سیر کی۔ سینٹ طامس روڈ کی انگریزی کی دکانوں پر
نظر ڈالی، ایک روز وہ ٹھہرا ٹھہرا یورپیں آبادی کی سمت نکل گیا۔

یہاں اسے ایک مکان کی سیر جیوں پر ایک اڑکی کھڑی نظر آئی۔ دو غلی نسل کی
حسین اڑکی۔ وہ اسے دیکھ کر اداسی سے مسکراتی اور اندر چل گئی۔ ایک سیاہ فام

عورت گود میں بچہ اٹھائے باہر نکلی اور دہلیز پر بیٹھ کر دال چال بینے لگی۔ سرل کو دیکھ کر تین چار بچے باہر آگئے، پھر ان کا باپ برآمد ہوا جو ایک بے حد مفلس یورشین معلوم ہوتا تھا۔ سرل ان کو دیکھنے سے دیکھتا رہا۔ ”اندر آؤ گے؟“ ایک بچے نے پوچھا، وہ سب تجیر تھے کہ انگریز صاحب ان کے محلے کی طرف کیسے آن ہکا۔ سرل کی قوم انگلستان میں طبقاتی کاست ستم کی شدت سے قائل تھی۔ ہند میں انہوں نے سیاہ اور سفید کی نسلی تفریق کی بنیاد ڈالی تھی۔ مدراس بلیک ٹاؤن، یورشین ٹاؤن اور وامٹ ٹاؤن میں بٹا ہوا تھا۔ سرل نے کیمرج میں رہ کر انہاروں میں صدی کی لبرل ازم کا بڑا پر چار کیا تھا مگر کالے اور گورے کی تقسیم اس کی سمجھ میں آتی تھی، اب اس نے دیکھا کہ ہند میں رہنے والے گورے کالوں کی چھوٹ لگ جانے کے بعد اپنے درجے سے گر چکے تھے۔ یہ یورشین وامٹ ٹاؤن کے قریب نہ پہنچ سکتے تھے، وہ ٹہلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اتنے میں وہ اڑکی اسے دوبارہ نظر آئی، وہ اپنے گھر کی باڑ پھلانگ کر آگے آگے جا رہی تھی۔ ایک بار اس نے سرل کو پہنچ کر دیکھا اور مسکرا دی۔ بخدا یہ یورشین اڑکی بے حد حسین تھی۔ ان بھورے بالوں والی سفید فام انگریز امیرزادیوں سے کہیں زیادہ دش جو گورنمنٹ ہاؤس میں شام کو پولکا ناچتی تھیں۔ اس اڑکی کی آنکھیں مرہشہ اور سمجھراتی اور مالا باری عورتوں کی لیکی تھی۔ سیاہ، اور باحیا اور رسیلی اور خوفزدہ سی۔ اسے یہ اڑکی بے حد اچھی لگی۔ ”ذرابات سننا۔“ اس نے بیوقوفوں کی طرح سوال کیا۔

”ہاں، تم نے ابھی میر امکان دیکھا تو ہے۔ تم گلکتے سے آئے ہو؟“

”نہیں، لکلتے جا رہا ہوں۔ لندن سے چلا تھا، یہاں بمبئی سے آ رہا ہوں۔“
”بہت سفر کرتے ہو۔“

”ہاں۔ اور بھی بہت سفر کرنا ہے، تم یہاں کب سے رہتی ہو؟“
”ہمیشہ سے۔“
”ہمیشہ سے۔“
”مگر تم تو عیسائی ہو۔“

”ہاں۔ کیا ہندوستانی عیسائی نہیں ہو سکتے؟“ پھر وہ ذرا جھگجھکی۔ ”میرا دادا
انگریز تھا۔ بالکل تمہاری طرح کا، میری ماں ہندوستانی ہے۔“

وہ گز بڑا گیا۔ پیٹر جیکن نے اسے جہاز پر نصیحت کی تھی کہ یوریشین قوم سے
میں جوں بالکل نہ بڑھانا۔ پچھلی صدی میں ہمارے ہم وطنوں نے یہاں آن کر
کافی عورتوں سے اتنی شادیاں کیں اور تعلقات قائم کیے کہ لے کے پوری نسل کو
سیاہ فام بنا دیا۔ تمہارا باپ زندہ ہے؟ کیا کرتا ہے؟ سرل نے پوچھا۔

”وہ کیا بیٹھا ہے سیڑھیوں پر، تم نے دیکھا نہیں۔ شراب کی دکان کرتا ہے۔“
”آؤ یہاں بیٹھ جائیں۔“ سرل نے ہمت کر کے ایک نیچ کی طرف اشارہ
کیا۔

لڑکی ذرا جھگجھکی اور پھر سر پر اپنا سیاہ جالی کاروں مال ٹھیک کر کے نیچ کی طرف
بڑھی جو سڑک کے کنارے پڑی تھی، یہ راستہ گرجے کو جاتا تھا۔ اس کی کلانیوں
میں سبک سی تسبیح لپٹی ہوتی تھی۔

”تم کیتھوں لکھوںک ہو؟“ سرل نے ایسے تجسس سے پہلے کسی سے سوالات نہ کیے

تھے۔

”ہاں“

وہ بڑے باوقار انداز میں اس کے سامنے کھڑا رہا۔ لڑکی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

پھر دفتاً جانے کیا ہوا کہ سرل بغیر جانے ہوئے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اسے مخاطب کر کے بولا: ”تم۔ تم مجھے بہت اچھی معلوم ہوتی ہو۔ میرے ساتھ گلکتے چلو۔“

لڑکی نے اسے اچنپھے سے دیکھا۔

”یہ کیسے ہو ستا ہے۔“ اس نے کہا۔

”کیوں نہیں۔“

”میرا باپ مجھے مار نہیں ڈالے گا، تم کی تھوک نہیں ہو اور اونچے طبقے کے انگریز ہو اور آج کے بعد شاید تم مجھے سے بات بھی کرنا پسند نہ کرو۔ تمہاری طرح کے بہت سے سیاح مدرس آتے ہیں۔“ اس نے اداکی سے درخت کا پتا توڑا۔ سرل کو احساس ہوا کہ وہ شدت سے اس لڑکی کے عشق میں بتا ہے۔ ”سنو۔“ اس نے بڑے جذبے سے کہا۔ ”سنو۔“ مگر وہ پھر ہڑ بڑا گیا۔ اس نے اب تک اس کا نام بھی معلوم نہیں کیا تھا۔

”مجھے ماریا ٹھیریزا کہتے ہیں۔“

”ماریا ٹھیریزا مجھے تم سے عشق ہے۔“

اس رات وہ گورنمنٹ ہاؤس کی بال میں جانے کی بجائے چپکے سے یورشین

ٹاؤن بھاگ آیا اور اس کی اگلی رات اور اس کی اگلی رات۔ چوتھے روز صبح جہاز کلکتے کے لیے لنگر اٹھا رہا تھا۔

سفر کی تیاری کرتے وقت اسے معلوم ہوا کہ یہ کیا زبردست حماقت تھی، وہ اس لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا۔ اب تک اس نے ماریا سے شادی کے لیے کہا بھی نہیں تھا مگر وہ بیوقوف لڑکی خاص ہندوستانی عورتوں کی مانند شاید دل میں اسے اپنا دیوتا تصور کرنے لگی تھی، جب وہ اسے خدا خافظ کہنے لگے جس کے باعث میں پہنچا تو یہ دیکھ کر اس کے پیروں تکی کی زمین نکل گئی کہ وہ ایک گھٹھڑی کپڑوں کی ہاتھ میں سنجھا لے اس کے ہمراہ کلکتے چلنے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔

انہی ساری قابلیت اور شاعرانہ انداز بیان اور ڈرامے کی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے اس نے ماریا ٹیریزا کو یقین دلایا کہ ابھی اس کا ساتھ لے جانا ممکن نہیں۔ وہ جلدی ہی اسے بلوانیجیح گا اور یہ الفاظ کہتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو انتہائی ذلیل اور کمیزہ محسوس کیا۔

اس چھوٹے سے جذباتی ایڈ و پچر کے بعد سرل پھر اپنی منزل مقصود کی سمت روانہ ہوا۔ خلیج بنگال کی نیلگوں و سعت میں داخل ہوتے ہوئے وہ اس لڑکی کو تقریباً بھول چکا تھا۔

جہاز اب کلکتے کے قریب پہنچ رہا تھا۔ ڈانمنڈ ہاربر میں داخل ہو کر جہاز نے لنگر ڈالا اور پانکٹ کے انتظار میں مصروف ہو گیا۔ مسافر عرش پر نکل آئے۔ سامنے بنگال کا ساحل تھا۔ پانکٹ کے ساتھ جہاز فلکار روانہ ہوا، وہاں مسافر اتر کر کشتوں میں بیٹھے۔ اعلیٰ افسروں کو لینے کے لیے ان کے ذاتی بجرے آئے ہوئے

تھے۔۔۔ سرل اس ہنگامے میں کسی کو نہیں جانتا تھا، وہ جلدی سے کوکرا یک کرائے کی کشتی میں بیٹھ گیا۔ ما جھیوں کی ایک پوری پلٹن نے چپو چلانے شروع کر دیے اور تھوڑی دیر بعد بندرگاہ کے شوروں سے نکل کر کشتی پر سکون کھلے پانیوں پر آ گئی۔ آس پاس مسافروں سے بھری دوسری کشتیاں چل رہی تھیں۔ پانی کے دونوں طرف درخت جھکے ہوئے تھے۔ دور گھنے جنگلوں میں سے کبھی کبھی شیروں کے گر جنے کی آواز اور گیدڑوں کی صدائیں سنائی دی جاتی تھیں۔ کشتی میں پھرروں نے بھنپھانا شروع کر دیا تھا۔ ملکتہ ابھی بہت دور تھا۔ محالات کا شہر۔ سونے اور چاندی کی بستی۔ مشرق کا لندن۔ اب رات ہو رہی تھی۔ بنگالے کا تحرانگیز چاند پانی کی سطح پر کشتی کے ساتھ ساتھ تیرتا جاتا تھا۔ ما جھی اپنی زبان میں گار ہے تھے۔ ان کی آواز سرل کو غیر معمولی طور پر سریلی معلوم ہوتی۔

پھر منتظر تبدیل ہونا شروع ہوا۔ کشتی گارڈن ریچ بیچ رہی تھی۔ ساحل پر دونوں طرف شاندار مکانات بنے تھے۔ دریا کے دائیں کنارے پر ملکتہ چاندنی میں جگمگا رہا تھا۔ ملکتہ جواب دنیا کے بہترین شہروں میں شمار کیا جا رہا تھا، بالآخر اس کے سامنے موجود تھا۔ گھاٹ پر بنگالی بننے مسافروں کی گھات میں موجود تھے۔ اعلیٰ افراد کو لینے کے لیے ان کے دوست احباب آئے ہوئے تھے۔ جن نوواروں کے دوست یہاں موجود تھے اپنا سامان قلیوں کے سروں پر رکھا کر پڑھکالی مسافر خانوں کا رخ کر رہے تھے۔ گھاٹ کے اس رنگارنگ مجھے سے باہر نکل کر سرل بھی ایک پالکی میں بیٹھا اور شہر کی گنجان آبادی سے باہر نکل کر پالکی بردار بارک پور کی طرف بڑھنے لگے جہاں سرل کو فی الحال قیام کرنا تھا۔

بارک پور میں انگریزوں کے کنٹری ہاؤس تھے۔ ولندیزیوں کے سیرام پور اور فرانسیوں کے چند رنگرستک ان مکانات کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ قلعے کے آس پاس سرکاری عمارتیں تھیں۔ شان دار گورنمنٹ ہاؤس جہاں چند سال پہلے کارنوالس دھوم دھام سے بر اجتا تھا اور اب جہاں سرجان شور فورٹ ویم کا گورنر جنرل بنے والا تھا، پھر رائٹرز بلڈنگ جس میں سرل کا ففتر تھا۔ چرچ کی عظیم الشان عمارت۔ آس پاس بیک ٹاؤن تھا۔ جس میں ہندوستانی، پرتگالی، ارمنی، یورپیین اور مفلوک الحال یورپین بستے تھے۔

چورنگی روڈ پر کلاسیکل طرز کی عالی شان عمارتیں تھیں۔ بڑے بڑے ہاں، پہلے پائے والے برآمدے، چوڑے زینے، تھلملیوں والے دروازے اور اونچے درتچے۔ دریا کے کنارے کنارے انگریز امراء کے گارڈن ہاؤس تھے، جن کے باخیوں میں ہندو اور چینی مالی کام میں مصروف تھے۔ کوئیوں کے عقاب میں شاگرد پیشے تھے۔ جہاں مرغیاں اور لخیں گھوم رہی تھیں۔ تالاب تھے جن میں واڑ کیلی کھلی تھی اور مچھلیاں پلی تھیں۔

چھ مہینے بعد سرل نے اپنے باپ کو خط لکھا کہ اب میں سیمیل ہو چکا ہوں اور خدا کی عنایات کا شکر گزار ہوں، میرا بنگالی گماشتہ اشوتوش ڈے جوفرائے سے انگریزی بولتا ہے میرے سارے معاملات کا نگران ہے۔ میرے عہدے میں بھی ترقی ہونے والی ہے اور میں منصل میں نیل کی تجارت شروع کر رہا ہوں، میں نے ایک مسلمان مشی نو کر رکھا ہے۔ جس کا نام ابوالکارم ہے، وہ مجھے فارسی اور بنگالی پڑھاتا ہے اور میں اپنی زندگی سے بہت خوش ہوں۔

کئی سال گزر گئے۔ سرل اب کلکتے کی اعلیٰ سوسائٹی میں رل مل چکا تھا اور اسی اشائل سے رہتا تھا جو اس سوسائٹی کی خاصیت تھی۔ اس کے پاکی بردار ہر وقت سرخ وردی میں مابوس رہتے۔ سونٹا بردار چاندی کے موٹھی کی چھپڑیاں لے کر چلتے۔ رات کو مشتعلی اس کی فینیس کے آگے آگے دوڑتے۔ خانہ ماں اور خدمت گار اس کے مطبخ اور کھانے کے کمرے کے نگران تھے۔ حقہ بردار اس کا چیپچوان بھرتا تھا۔ دفتر میں اس کا ٹکر ک یوریشین تھا جس کا نام رالف تھا۔ سرل کو اس کی موجودگی میں بڑی بے آرامی سی محسوس ہوتی۔ رالف، بلیک ٹاؤن کا باسی، بڑی وفاداری سے سرل کی خوشامد میں لگا رہتا۔ دفتر کے انتظام کے لیے بنگالی سرکار موجود تھا اور ان گنت ہر کارے اور پیادے اور چپڑاں۔ ایک تن تھا سرل یشلے اور اس کے ذاتی عملے میں چالیس پچاس آدمی شامل تھے۔ ان کے علاوہ اس کا مالی تھا اور گار اس کث اور سائیس اور چاپک سوار اور بہشتی دربان، چوکیدار، پھر اس کا بجڑہ تھا جس کے مانگھی اس کے ملازم تھے۔ درزی، دھوپی اور نالی ان سب سے علیحدہ۔ اس سلطنت کا، جو اس کی سفیدرنگ کی کوٹھی میں قائم تھی، سرل یشلے بلا شرکت غیرے مالک و مختار تھا، وہ چاہتا تو ان سب کو اٹالنکا کر پٹواستا تھا اور ایسا اس نے اکثر کیا، وہی سرل جو کچھ عرصہ قبل کیمرج کی گلیوں میں ولیم بلیک کی کتابیں لیے مشق سخن کرتا پھرتا تھا اور کسی پب میں جا کر چند پیس کے آلو کھاتا تھا، جو مڈل میپل کے پھائک سے نکل کر دریا کے کنارے ڈون اور گرے کی نظموں پر سر دھنما سنان سڑکوں پر ٹھلا کرتا اور رات کو کسی طالب علم ساتھی کے یہاں جا کر سورہ تھا۔

صح سات بجے دربان اس کی کوٹھی کے ہال کا دروازہ کھولتا۔ دھوپ چھلملیوں

سے چھن چھن کر اندر آئے لگتی، تو سرل اپنی مسہری سے اٹھتا۔ اس کے سر کار اور چپر اسی کانفڈاٹ لے کر فرشی سلام کرتے ہیڈروم میں داخل ہوتے۔ جام اس کا خط بناتا۔ وگ سر پر جمانے کے بعد وا سکٹ پہننا ہوا وہ کھانے کے کمرے کی طرف بڑھتا جہاں وہ چاء پیتا جاتا اور چیپوان کے کش لگاتا۔ کار و بار اور سر کاری کام کے سلسلے میں جتنے غرض مند صحیح سلام کرنے آتے وہ سب میز سے کچھ فاصلے پر مودبا نہ کھڑے رہتے۔ سرل بے نیازی سے احکام صادر کرتا۔ دس بجے کے قریب یہ سارا جلوس پاکی کی طرف بڑھتا اور پاکی اس کے فتر کی طرف روانہ ہوتی۔ چار بجے واپس آ کر سرل کلکتے کے قاعدے کے مطابق شام کے سات آٹھ بجے تک سویا کرتا، اسی کے بعد لباس تبدیل کر کے اور بن سنور کے خواتین سے ملنے کے لئے نکل جاتا، ہوشل کا لز کرتا۔ کورس میں ہوا خوری کرتا یا کہیں ڈنر پر چلا جاتا۔ کس قدر مکمل اور فرصت کی زندگی تھی اور اسی آرام اور آسانی کے ساتھ اس کا بند بیلنس بڑھتا جا رہا تھا۔ تجارت میں اسے بے اندازہ منافع ہو رہا تھا۔ گورنر جنرل اس سے بے حد خوش تھا۔ افواہ تھی کہ اسے شاید دوامی بندوبست کے انتظام کے سلسلے میں کسی اہم عہدے پر منفصل میں یا لکھنور یا یونیورسٹی تھیج دیا جائے۔ کلکتے میں وہ ماڈل کے لیے ایک مستقل موضوع گفتگو بن چکا تھا۔ بال روز میں اس کے ساتھ رقص کرتے ہوئے بن بیا ہی امیرزادیاں اکھرو چیزیں کہ وہ کون خوش قسمت لڑکی ہو گی جس سے امیر اور ہندو سم سرل ایشلے بیاہ کرے گا۔

مگر لیڈی میملا یا لیدی سنتھیا کے ساتھ شادی کرنے کے بجائے اس غیر معمولی ذہن اور دماغ کے مالک سرل ایشلے نے ایک بڑی ہی معمولی اور عام پیانہ

حرکت کی یعنی ایسی حرکت جو عام طور پر سمجھی دولت مندا انگریز کرتے تھے اور جو ہندوستان کے انگریز "نوایین" کا عام دستور تھا۔

یعنی سرل مشتعلے نے بھی ایک نیٹ عورت کو اپنے گھر میں رکھ لیا۔

انگریز "نوایوں" کا انگلستان میں بھی خوب مذاق اڑایا جاتا، وہاں کا جا گیردار طبقہ ان کو اپنے ہم پلہ سمجھنے سے منکر تھا۔ کل کی بات تھی کہ یہ لوگ سنی میں معمولی تاجر یا گرگے تھے۔ اور نو دولتیں تاجر سے پشتی زمیندار کی ہمیشہ سے الہی رہی ہے مگر ہندوستان میں ان لوگوں نے اپنے لیے ایک الف ایسلوی دنیا تخلیق کر رکھی تھی۔

پٹنہ، ڈھاکہ، قاسم بازار، بالا سورا اور ہنگلی کے تاجر، مرشد آباد، لکھنؤ، بنارس، گوالیر اور دلی درباروں میں سفارت کے فرائض انجام دینے والے ڈپلومیٹ، گلکھڑ، جو بنگال، بہار اور اڑیسہ کے ملعووں میں تعینات تھے۔ فوجی افسروں نے اودھ میں چھاؤ نیاں چھائی تھیں۔ فوجی ایڈی و نچر رز جو ہندوستانی حکمرانوں کی افواج میں اونچی بنتے دندمار ہے تھے۔ یہ سب اب سرل کے ساتھی تھے۔ سرل ان کا نقطہ نظر خوب سمجھتا تھا۔ پلاسی کے بعد سے کاشمی نے ہندوستانیوں نے روٹھ کر فرنگی کا گھرد کیکھ لیا تھا۔ انگریز کے یہاں ہن بر س رہا تھا۔ شہر کی چورگی میں ان کے ٹاؤن ہاؤس تھے۔

شہر سے باہر بڑے بڑے باغات میں انہوں نے بیکھے بنوار کئے تھے۔ اودھ اور مرشد آباد کی ریزیڈنسی میں رہنے والے انگریزوں کے یہاں دولت کی ریل پیل تھی۔ شورے اور نیل کے تاجر کروڑ پتی ہو چکے تھے۔ نوایوں کی طرح زندگی گزارنا ان کا آ درش تھا۔ حرم، حقہ، شعرو شاعری، ناج رنگ، مرغ بازی۔۔۔ یہی مشاہل ان فرنگیوں کے تھے۔۔۔ ہندوستانی نوایوں اور انگریز اونچے طبقے نے آپس میں

سمجھوتہ کر کے ایک انتہائی مہذب فضاء کی بنیاد ڈالی تھی۔ دیوالی ملنے کے بعد انگریز سو یلين بنگال میں منظر عام پر آیا، یہ لوگ بے حد کم عمر میں انگلستان سے یہاں آتے اور بہت جلد ساری ہندوستانی خصلتیں اختیار کر لیتے۔ لکنٹر کی حیثیت سے اضافے میں تعینات ہونے کے بعد اپنا وقت وہاں کے راجاؤں اور نوابوں اور زمینداروں کی صحبت میں گزارتے۔ بنگال کی جا گیردارانہ تہذیب میں فرنگی افسر بھی گھل مل چکا تھا۔ پلاسی کے بعد کمپنی کا فیکٹر فقط دولت جمع کر کے وطن واپس جانے کے بجائے اب نواب کھلانے کے خواب دیکھتا تھا اور اردو ادب میں دلچسپی رکھتا تھا اور حرم میں دس دس دلچسپی عورتیں رکھتا تھا۔

سرل بھی شنیلا کو اپنی کوئی تھی میں داخل کر کے گویا باقاعدہ نواب بن گیا۔ سیاہ لمبے بالوں اور نشیلی آنکھوں والی شنیل ڈھاکے کے قریب کے گاؤں کی رہنے والی تھی۔ انگریز نواب اور ہندوستانی نواب نے آپس میں سمجھوتہ کر لیا تھا اور اس سے تہذیب و تمدن وغیرہ کو تو خوب ترقی ہو رہی تھی مگر شنیلا دہنی کا باپ اسی طرح فاقہ کر رہا تھا بلکہ اس کے فاقوں میں زیادتی ہو گئی تھی کیونکہ ڈھاکے پر اقتصادی تباہی کے بادل منڈلار ہے تھے۔ شنیل کی سات بہنیں تھیں جن میں تین بال و دھوا تھیں اور چار کی ابھی شادی نہیں ہو سکی تھی، اس کا ایک بھائی تھا جسے کلکتے کے ایک گودام میں ملازمت مل گئی تو اس نے اپنی بہنوں کو ڈھاکے سے بلوا بھیجا۔ اس گودام کے مالک کا نام سرل صاحب تھا۔

سرل صاحب ابھی اڑکاہی ساتھا مگر کلکتے میں اس کا طوٹی بول رہا تھا۔ ایک روز شنیلا پوچا کے لیے کالی گھاث جارہی تھی کہ سرل صاحب نے کہیں اسے دیکھ لیا۔

سرل صاحب کے متعلق یہ بھی مشہور تھا کہ کافی دل پھینک واقع ہوئے ہیں، گوکلتے کی مسی بابا لوگ اس سے خفارہتی تھیں کہ وہ ان میں سے کسی ایک کو اپنی میم کیوں نہیں بنایتا۔ شنیلا کا بھائی اپنی مفلسی سے بگ آ کر سوچ رہا تھا کہ وہ سیرام پورجا کر عیسائی ہو جائے۔ سارے ولد رو رہو جائیں گے۔ اس کو اپنی بہنوں کے بوجھ سے نجات ملے گی۔ مشن والے آپ ہی ان کے شادی بیان کی فکر کریں گے، مگر اسی روز سرل صاحب کے سر کار نے آ کر اس سے کہا: ”صاحب نے تمہیں یاد کیا ہے۔“ اور اس کے اگلے روز شنید سرل صاحب کی کوئی پر پہنچادی گئی اور اس طرح اس کے خاندان کو انlass سے نجات ملی۔

ہر معاشرے کی اپنی اقدار بن جاتی ہیں، یہ اس وقت کا نام دستور تھا۔ نسلی تعصُّب ابھی زیادہ نہیں بڑھا تھا بہت سے انگریزوں نے اونچے مسلمان گھرانوں میں شادیاں کی تھیں۔ شاہ عالم ثانی کی بیٹی شہزادی فیض النساء اور کملے کی شہزادی ظہور النساء بیگم کی شادیاں انگریزوں سے ہوئی تھیں۔ گلکتے کے جوب چارنوک کی بیوی بھی ہندوستانی تھی۔

سرل صاحب نے شنیلا سے بیان نہیں کیا، مگر شنیلا ناخوش نہیں تھی، وہ شان سے کوئی میں رہتی تھی اور نوکروں پر حکومت کرتی تھی۔ اس کی مانند اور بہت سی دلیلی عورتیں اعلیٰ طبقے کے انگریزوں کے زنان خانے میں برآ جتی تھیں۔ ان کے بچے پڑھنے کے لیے والایت بھیجے جاتے تھے اور جب تک ان بچوں کے باپ زندہ رہتے تھے کم از کم اس وقت تک ان کا خاندان آرام سے گزر کرتا تھا۔

مگر سرل کو معلوم تھا کہ اس کی اور شنیلا کی اولاد کا مستقبل کیا ہو گا، وہ مدرس یا

کلکتے کے شیم خانے میں داخل کر دیئے جائیں گے۔ بڑے ہو کر ان کو اعلیٰ نوکریاں نہیں ملیں گی وہ رالف کی طرح ٹکر کر دیں گے یا کسی رجھٹ میں شامل ہو کر بینڈ بجاتے مرہٹوں سے لڑنے جایا کر دیں گے۔ اس کی لڑکی کو کسی انگریز نواب زادی کی آیا بنا پڑے گایا کسی فوجی افسر کی داشتہ۔ تب اسے اندازہ ہوا کہ یوریشین طبقہ کس قدر زبردست تریجندی کا حامل ہے، تب اسے خوبصورت ماریا ٹیریزیا دآلی جسے وہ مدرس میں ایسے کہیں پن سے چھوڑ آیا تھا۔

یوریشین طبقے کی بنیاد پر تنگالیوں کی آمد کے زمانے سے پڑی تھی، پھر فرنچ اور ولنڈریزوں نے آ کر اچھوتوں کو عیسائی کیا، جو شخص بوت اور ہمیٹ پہن کر گزری ہوئی پر تنگالی بول لے وہ یوریشین سمجھا جاتا تھا۔ فرانسیسیوں میں نسلی تعصبات نہیں تھا۔ ان کی آمد سے اس طبقے کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ یوریشین بڑے قابلِ رحم لوگ تھے۔ بے چارے کرانی، جو انگریز برہمنوں کے مقابلے میں شودرا اور چنڈال کی حیثیت رکھتے تھے۔ سرل کو یہ سب سوچ کر جھر جھری سی آئی تو کیا اسے لیدی سنتھیا سے شادی کر لیتا چاہئے، پھر شنیلا اپنی رسیلی آواز میں اسے پکارتی اور وہ ہڑ بڑا جاتا اور پاکی میں بینہ کر کو رس کی طرف نکل جاتا۔ اس کی زندگی بڑی مصروف اور بڑی ہنگامہ خیز گزر رہی تھی۔ گورنر جنرل کے بال اور پلک بریک فاسٹ، پیشنگ اسٹریٹ اور علی پور کے کانسرٹ اور رقص، گارڈن ریچ کے جشن اور تقریبات، پھر مفصل کے سفر۔ ڈھاکہ، چانگام، مرشد آباد، چوبیس پر گنہ، موگیر۔ سارا بنگال اور سارا بھارا اس کے قدموں میں بکھرا پڑا تھا۔ بنگال کے سارے آبی راستے اس کے لیے کھلے تھے۔ نیل کے ان گنت کاشتکاروں کی زندگیوں اور

قہمتوں کا وہ مالک تھا۔ دھانی شری اور ہری منگل اور کرنا فلی اور مدھومتی اور شوبنسری کی لہروں پر اس کی کشتیاں نیل کی بار برداری کر رہی تھیں۔ ڈھاکے کے مغلوں کا عظیم الشان ناؤواڑہ اب اس کے ہاتھ میں تھا۔

اس نے دور سے اپنی انقرانی موٹھ کی چھڑی بڑھا کر بوڑھے کی کمر میں چھبوٹی: ”ابو مونشواراً گر تم چاہتے ہو کہ اسی ہنتر سے تمہاری کھال نہ ادھیر دوں تو ذرا طاقت سے پتوار چلاو!“، اس نے کہا۔

بوڑھا زیادہ کوشش سے پتوار پر جھک گیا۔ سرل اسے خاموشی سے دیکھتا رہا، کس قدر رخت جان لوگ ہیں، اس نے سوچا۔ ابھی چند سال ہوئے کیسا ہولناک قحط صوبے میں پڑا تھا۔ دریاؤں میں اتنے طوفان آتے ہیں، وبا میں پھیلتی ہیں مگر یہ لوگ اسی بے حیائی سے جئے جاتے ہیں۔ حد ہے واقعی۔ اس نے گھری دیکھی، اب رات کے نوج رہے تھے، اسے آج ہی رات کو راجہ گریش چندر رائے کی زمینداری پر پہنچنا تھا۔ کلکتے میں حکومت میں بہت سی تبدیلیاں ہو رہی تھیں، ایک دو دن بعد جان شور جانے والے تھے اور نیا گورنر جنرل آ رہا تھا۔ یہاں سے لوٹ کر اسے گورنمنٹ ہاؤس بھی جانا تھا۔ آج کیا تاریخ ہے؟ اس نے پیٹر سے پوچھا۔ پیٹر خراٹے لے رہا تھا۔ سرل نے لاثین اٹھا کر بنگال گزٹ پر نظر ڈالی۔ کل کا اخبار تھا۔

آٹھ جون ۱۸۹۸ء سرل یک بیک چونک اٹھا۔ اسے ہندوستان آئے آج پورے پانچ سال ہو گئے تھے، ان پانچ سالوں میں وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ نیل کی تجارت دن دوئی رات چوگنی ترقی کر رہی تھی۔ سُجرات کی نیل کی صنعت دم

توڑ چکی تھی، اس کی جگہ کمپنی کے انگریز پلانٹرز دلی سے بنگال تک پھیل چکے تھے۔ بنگال کا کسان انگریز پلانٹرز سے قرض لے کر نیل بوتا تھا اور پھر مختلف طریقوں سے اس پر ظلم توڑے جاتے تھے۔ عدالتوں میں اس کی شناوائی نہیں ہوتی تھی۔ انصاف کرنے والے خود ان پلانٹرز کے بھائی بند تھے۔

بنگال کا کسان ابوالمنصور مال الدین جودن بھر نیل کے کھیتوں میں مشقت کرتا تھا اس وقت اپنے نئے آقا سرل ہا اور ڈایشلے کونوکے میں بٹھا کر اس پاریے جا رہا تھا اور چاند پدم کے پانیوں پر اتر آیا تھا اور ہوا میں خنکی آچکی تھی اور انناس اور کیلے کے جھنڈے میں گیدڑ بول رہے تھے۔ کیونکہ رات بہت ہولناک تھی۔

دلبی ذوق

۲۷

کنارے پر آ کر را دھے چرخ نے لاثین اونچی کی اور اس کی روشنی کو پانی پر چمکایا۔ دورافتہ پر سے ایک کشتی سبک روی سے تیرتی ہوئی گھاث کی طرف جا رہی تھی، انہوں نے لاثین زمین پر رکھ دی اور چادر لپیٹ کرو ہیں اکٹوں بیٹھ گئے قریب باشا کا جھونپڑا تھا جس میں گاؤں کے لوگ جمع تھے۔ بانس کے جھنڈے کے نیچے ان کا اپنا چھوٹا سامکان تھا۔ جس کے دروازے پر چراغ جل رہا تھا۔ سارے میں ایک بیبت ناک سنائا تھا جس میں صرف راجہ گریش چندر رائے کے محل کی طرف سے سازوں کی مددم آوازیں سنائی دے جاتی تھیں، سنائھا وہاں پٹھنے اور

لکھنؤ تک کی طوائفیں آئی تھیں۔ راجہ صاحب کولاث صاحب نے خلعت عطا کی تھی، اس کی خوشی میں جشن منایا جا رہا تھا۔ لگلتے سے صاحب لوگ اس میں شرکت کے لیے آ رہے تھے۔ چوپال میں عجیب طرح کی خاموشی طاری تھی۔

”کچھ بات کرو داوا۔“ پرمود نے چشم کی راکھ کریدتے ہوئے اداں آواز میں رادھے چرن سے کہا۔

رادھے چرن خاموشی سے گھاٹ کی اور دیکھتے رہے۔ ہوا میں بانس کے جھنڈ میں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔

ایسی ہی راتوں میں گھنگریا لے بالوں والے ستیہ پیر ستیہ زائن (گوڑ کے سلطان علاء الدین حسین شاہ کا صوفی نواسا جوبنگال کے مسلمانوں کے لیے ستیہ پیرا اور ہندوؤں کے لیے وشنو کا اوتار ستیہ زائن بن گیا۔) ما تھے پر صندل کا یکا لگائے ہاتھ میں بانسری لیے نارنجی لباس پہنے اپنی کمر کی زنجیریں جھنجھنھاتے پدماء کے کنارے کنارے جاتے نظر آ جاتے ہیں، اگر مجھے کبھی ستیہ زائن مل جائیں تو میں ان سے پوچھوں، تو میں ان سے کیا پوچھوں۔۔۔؟ رادھے چرن اکڑوں بیٹھے سوچا کیے۔

بہت سی زنجیروں کے جھنجھنا نے کی آواز نے سنائے کوتورا۔ رادھے چرن نے چونک کر دیکھا۔ سامنے ستیہ پیر تو نہیں ان کے چند فقیر موجود تھے۔ بانسوں کے جھنڈ سے نمودار ہو کر وہ رادھے چرن کے مکان کی طرف مڑ گئے تھے اور دروازے پر کھڑے حسب معمول صدائیں لگا رہے تھے۔

رادھے چرن نے بڑے کوفت کے ساتھ ان کو دیکھا۔ ستیہ زائن کے بھکاری

ان کے دوار پر کھڑے تھے اور ان کے پاس دینے کو کچھ نہ تھا۔ اچھی فصل کی دبی کاشمی کے بھجن گانے والے یہ مسلمان فقیر گاؤں گاؤں گھوما کرتے تھے۔ صد یوں سے یہ فقیر اسی طرح گاتے بجاتے آئے تھے۔ گاؤں کی ہندو عورتیں ان کی جھولی میں آٹا اور چاول ڈالتی تھیں اور ان سے دعائیں لیتی تھیں۔ یہ ان کو اچھے شکون کی باتیں بتاتے، سانپ کے کالے کا اپنے منتروں سے علاج کرتے، ان کے بغیر زندگی مکمل نہیں تھی۔ پچھلے سال انہوں نے شنیلا کے لیے کہا تھا، جب وہ دکھنا دینے باہر آئی تھی، کہ یہ بیٹی پرمنی ہے، پھر انہوں نے پرمنی کی ساری انشانیاں شنیلا کی ماں کو بتلائی تھیں۔ پرمنی جو چڑیوں کے جگنے سے پہلے جگتی ہے۔ شام پڑے گھر میں چماغ جلاتی ہے، اپنے شوہر کو کھانا کھلانے کے بعد خود کھاتی ہے۔ بیٹی بڑے نصیبوں والی ہے، انہوں نے بشارت دی تھی۔

ان کی آواز سن کر شنیلا کی ماں دلیز پر آئی، اس کے ملکے خالی پڑے تھے۔ فقیروں کو دینے کے لیے ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ یہ ستیہ پیر اور مانک پیر اور کاشمی اور چنڈی ان سب دبی دیوتاؤں کی قوم پر اسے بڑا غصہ آیا، یہ سب دھوکے باز ہیں، سارے دبی دیوتا۔ اس نے ساری کے آنچل سے آنسو خشک کرنا چاہے اور چپ چاپ کھڑی ان کو دیکھتی رہی، وہ حسب معمول سیتا اور چنڈی اور شیوا کا جاپ کیا کیے۔ شنیلا کہاں ہے۔“ بلا آخران میں ایک نے پوچھا۔

”کلتے۔“ رادھے چرن کی بی بی نے کہا۔

”وہاں کیا کر رہی ہے؟“

”اس کا۔۔۔ اس کا بیاہ بیاہ ہو گیا۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا، اس

نے یہ میں بتایا کہ شنیلا کو پر دے سے نظرنا پڑا اور وہ ایک فرنگی کی کوٹھ میں رہ رہی ہے۔ مسلمان فقیروں نے آشیر باد دی۔ ”میں نے اس کا ماتھا دیکھ کر بتایا تھا سجا گن کاشمی ہے۔ پرمی، ہمارا داماد کیا کرتا ہے۔۔۔؟“

”لکتے میں کام کرتا ہے۔“

”اچھا۔“ فقیروں نے اطمینان سے مزید دعا میں دیں اور واپس مڑنے لگے، اب ان کو ہر گھر سے یہی سننے کو ملتا تھا۔ ہمارے پاس دان کے لیے کچھ نہیں۔ ان کو اس تحفے سالی کی عادت پڑ گئی تھی۔ بڑے کال کو پڑے تقریباً تمیں سال گزر چکے تھے جب نا تھا کہ فرنگیوں کی راجدھانی لکتے کی سڑکیں فاقہ سے مرتے ہوئے انسانوں کی الاشون سے پٹ گئی تھیں، مگر اب لکتے کی سڑکیں دور دور تک پھیل چکی تھیں، اب گاؤں گاؤں لوگ مر رہے تھے۔

”خیبرو۔۔۔“ شنیلا کی ماں نے کہا۔ ”میں نے پرانا کو ہاٹ بھیجا تھا۔ شاید وہ کچھ لے آیا ہو۔“

مگر فقیر دعاوں کی بوچھاڑ کرتے اداں قدم اٹھاتے آگے بڑھ گئے۔ شنیلا کی ماں اپنے بھائی بھجے کا انتظار کرتی رہی۔

مگر وہ ہاٹ سے گھر لوٹنے کے بجائے سامنے چوپال میں جا بیٹھا تھا، اس کے سارے ساتھی منہ لٹکائے بیٹھے تھے، وہ تین دن سے تیل کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ تیل سونے کے بھاؤ بک رہا تھا۔ نمک عنقا تھا، چاول کی وہ صورت کو ترس گیا تھا۔ چھالیا اور تمبا کو اور چاول اور نمک اور ہرش کی تجارت پر کمپنی بہادر کے فرنگیوں نے قبضہ جمالیا تھا۔ دریاؤں پر ان کی کشتیاں مال سے لدی ہوئی چل رہی

تمیں مگر بازار میں قیمتیں آ سان تک پہنچ چکی تھیں۔ چوپال میں سات آٹھ آدمی اور آن کر بیٹھ گئے۔ آہستہ آہستہ باشیں شروع ہوئیں: ”اوجیت دادا تم بھی ڈھاکے سے آ رہے ہو؟“ پرمودرنے پوچھا۔ ”ہاں میں بھی اور دلیپ بھی اور سب۔ اب وہاں کھانے کو نہیں ملتا، سارے کر گئے ٹوٹ گئے، اب ہم بھی ہل چلائیں گے۔ تمہارے راجہ صاحب ہمیں زمین جوتے دیں گے؟“ اوجیت نے کہا۔

”بٹا نہیں۔“ پرمودر نے اکتا کر جواب دیا، وہ یہ سب سوچتے سوچتے عاجز آ گیا تھا مگر اس کا دامغ اب کام نہ کرتا تھا۔ لوگ جو حق درحقوق دیہات کا رخ کر رہے تھے۔ ازرعی زمین پر آبادی کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ ہندوستان جو دنیا کا سب سے بڑا صنعتی ملک تھا اب خالص زراعتی ملک میں تبدیل کر دیا گیا تھا، جہاں پیداوار کم تھی، لگان زیادہ اور روز قحط پڑتے تھے۔ ان آنکھوں نے کیا کیا زمانے پلٹتے دیکھے۔ رادھے چرن نے چوپال کے ہجوم پر نظر ڈال کر سوچا۔ کارنوالس کے نئے قانون نے بالکل ہی کمر توڑ دی تھی۔ تین چار فوجوں اڑکے ان کے قریب آن کر بیٹھ گئے۔

”دادا تمہاری نوابی میں بھی ایسا ہوتا تھا۔“ اشوتوش نے سوال کیا۔

”کیا؟“ رادھے چرن نے بے دھیانی سے پوچھا۔

”یہی سب مہنگائی۔۔۔ اور کال۔۔۔ دنگا فساد۔“

لبی سفید بکرے کی ایسی داڑھیوں والے دو ہندو بوڑھے ناریل کریڈ کراڑکوں کو دھنڈلی آنکھوں سے دیکھا کیے، یہ دونوں بکسر میں اڑتے تھے۔ گاؤں ان

پرانے وقتوں کے بڑھوں ٹھڈوں سے بھرا پڑا تھا۔ جو مغلوں اور نوابوں کے زمانوں کے گنگاتے تھے اور روتے تھے۔

”وہ زمانہ آنے والا ہے جب ہماری عورتوں کو پردوے سے نظرنا پڑے گا، ہمارے بچے گلیوں میں بھوکے مریں گے۔ ہمارے بادشاہ کا تاج گر پڑے گا۔ مہا بھارت میں لکھا ہے۔“ بودھے پھونس دھن گوپال مزدار نے کہنا شروع کیا۔

”ارے مہا بھارت کو چھوڑو دادا۔“ پرفلانے جل کر اس کی بات کائی۔ یہی تو ان بوڑھوں میں ایک عیب تھا۔ بات بے بات پر شراج الدولہ کو یاد کر کے روتے تھے۔ یہ دھن گوپال دادا بھی ابھی کچھ داستان شروع کرنے والے تھے۔ پرفلانے ان کو ہتھے پر ہی ٹوک دیا۔ ”کیا گزرے زمانے کی باتیں کرتے ہو۔۔۔“ اس نے کہا۔ ”کلکتے چلو۔ جہاں شیام واگئے ہیں (شیام رادھے چرن کا لڑکا تھا جو سرل صاحب کے گوداں میں ملازمت کر رہا تھا) اور لاث صاحب کی چاکری کرو۔ شراج کے زمانے لد گئے دادا۔“

رادھے چرن حیرت سے سنتے رہے، یہ لڑکا پرفلانے بالکل مارواڑیوں کی ایسی باتیں کر رہا تھا، یہ ذہنیت اس میں کہاں سے آگئی؟ ان کو مارواڑیوں سے نفرت تھی۔ رادھے چرن پرانے شرفاء کے اس طبقے میں سے تھے جو فارسی پڑھتا تھا۔ مغلوں کی سرکار کا اعظم و نق سنجھاتا تھا اور باتی وقت پوجا پاٹ میں اگارہتا تھا، مگر اب کلکتے کے مارواڑیوں کا ایک نیا متوسط طبقہ پیدا ہوا تھا جو کمپنی کے ساتھ تجارت کر کے اور مقامی حکمرانوں اور کمپنی کی ریشہ دوائیوں میں حصہ لے کر روپیہ بنا رہا تھا۔ یہ بنگال کے بنیوں کا نیا طبقہ تھا۔ جاگیردار اور کسان کے درمیان کا

یہ نیا سرما یہ دار طبقہ انگریز کا دوست اور دست راست تھا اور انگریز بنگال کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے میں مصروف تھے۔

”لاٹ صاحب کی چاکری۔“ دھن گوپال نے کھانے کے بعد جوش سے بولنا شروع کیا، اس کی وارثی لائیں کی روشنی میں ہتھی ہوئی مضمون خیز معلوم ہوئی، وہ خود بہت مضمون خیز معلوم ہو رہا تھا۔ ”لاٹ صاحب“ اس نے دہرا لیا۔ ”اس سے مطلب؟ ہمارا بادشاہ ابھی ولی میں موجود ہے، وہ تمہارے لاٹ صاحب کا دماغ ٹھیک کر دے گا۔“

”تمہارا بادشاہ اندھا کر دیا گیا ہے گوپال دادا۔“ پرانلا تھقہہ مار کر ہنسا۔ ”تم جانے کس دنیا میں رہتے ہو، تمہارے بادشاہ نے پہلے ہی دیوانی کلائیو کے حوالے کیوں کر دی۔ اب دماغ ٹھیک کرے گا۔“ پرانلا تھنچی سے ہنسا۔ دونوں بوڑھے چپ چاپ گھٹنوں میں سردے کر بیٹھ گئے۔ رادھے چرن نے کوفت سے پرانلا پر نظر ڈالی۔ ان بڑکوں کو کچھ سمجھانا بیکار تھا، یہ بھی بتانا بیکار تھا کہ بادشاہ نے اپنی مرضی سے دیوانی نہیں دی۔ کلائیو نے زبردستی حاصل کی تھی۔ اس فاقہ زدہ ملک میں پیدا ہونے والے ان نوجوانوں کو کس طرح یقین آستا تھا کہ یہی بنگال دیس کا زرخیز ترین صوبہ تھا۔ یہی بنگال فردوس ہند کہا جاتا تھا، اس وقت اس دیس میں پرانے ملک انگلستان کا زمینداری نظام رانج نہیں کیا گیا تھا۔ اس وقت ملک کی مصنوعات کی برآمد پر محصول نہیں لگے تھے۔ اس وقت لوگ ذاتی جائداد کے تصور سے آشنا نہیں تھے، یہ سب رادھے چرن کے دیکھتے دیکھتے ہوا تھا۔ چند روز قبل جب دوامی بندوبست کے سلسلے میں دورہ کرتا ہوا ڈھاکے کا انگریز لکھر یہاں آیا تو

اس نے اپنے دربار میں رادھے چرن کو بلا کر کہا تھا کہ ہم یہ سب تمہارے فائدے کے لیے کر رہے ہیں۔ مسلمان نوابوں نے تم لوگوں کو اپنی بدانظامی سے تباہ کر دیا تھا۔

”تم جھوٹ بولتے ہو صاحب۔ ہمارے نوابوں کے یہاں بدانظامی نہیں تھی، میں کہہ سمجھو ہوں، میرے پرکھ صدیوں سے مرشد آباد میں حکومت کا انتظام کرتے آئے ہیں۔ میں آج بوجھی انگاکے کنارے اس جھونپڑی میں رہ رہا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں نے اپنی خوشحالی کے ساتھ ساتھ اپنے ہوش و حواس بھی کھو دیے ہیں، مجھے معلوم ہے کہ تم جھوٹ بلکتے ہو۔۔۔ تم۔۔۔“ اور جب رادھے چرن غصے سے کانپنے لگے تھے تو ان کو لکھنور کے چپر اسیوں نے کمرے سے باہر دھکیل دیا تھا۔ اس روز اس کمرے میں ایک انگریز مشنری بھی موجود تھا جو اپنا سفر نامہ لکھ رہا تھا اور یہ مکالمہ سننے کے بعد اس نے قلمبند کیا تھا۔ ”بنگال کا ہندو مسلمان نوابوں سے نفرت کرتا ہے۔ مسلمان ہندوؤں کے خون کے پیاسے ہیں، اس ملک میں کوئی اتحاد نہیں۔ دراصل اسے ایک ملک کہنا ہی نہیں چاہیے، یہ بہت سی اقوام کا مجموعہ ہے۔ جس میں ہندو مسلمان ہمیشہ آپس میں دست و گریبان رہتے ہیں، یہ دونوں کبھی اکٹھے نہیں ہو سکتے۔“

رادھے چرن دریا کے کنارے گھاس پر بیٹھ رہے۔ کشتی اب ان کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ اس میں ایک بلند و بالا نوجوان فرنگی بیٹھا تھا جس کے وگ کا پاؤ ڈر اور تلوار کا دستہ چاندنی میں جھلما رہا تھا۔ منشور دادا ہانپتے کا نپتے نو کے کھے رہے تھے۔

رادھے چرن نے آنکھیں بند کر لیں۔۔۔ علی وردی نے مرتے وقت نوجوان سراج سے کہا تھا: فرنگیوں نے شہنشاہ کے ملک اور ان کی رعایا کی دولت کے آپس میں حصے بخڑے کر دیے ہیں۔ اس کی طاقت زبردست ہے، ان کو قلعے اور فوجیں حاصل نہ کرنے دینا ورنہ ملک ان کا ہو جائے گا۔ اس وقت چونہیں سالہ سراج مرشد آباد میں تھا۔ فرنگی اس کی توہین کے طور پر اسے قاسم بازار کی تجارتی کوٹھیوں میں داخل نہیں ہونے دیتے تھے۔ اس نے ملک کے ان تاجروں کا محصول معاف کر دیا تھا مگر خود نواب کے علاقوں سے جو سامان آتا، انگریز اس پر زبردست محصول گار ہے تھے۔ کلکتہ کی تنجیر کے بعد بھی سراج نے انگریزوں کے عہدناہے پر اعتبار کرتے ہوئے ان کو معاف کر دیا تھا۔ رادھے چرن کا باپ ان سب معروکوں میں سراج کے ساتھ ساتھ رہا تھا۔ انگریزوں نے ہنگلی میں قتل و غارت مچایا تو سراج نے لکھا: تم نے میری پر جا کوتا راج کیا ہے۔ تم اپنے آپ کو یہی سائی کہتے ہو، اگر تم اب بھی محض تاجروں کی طرح رہنے پر اکتفا کرو تو میں تمہاری ساری مراعات والپس کر دوں کیونکہ جنگ تباہ کن ہے، تم مجھ سے اُن کے معاملہ کرتے ہو اور پھر حملہ کر دیتے ہو۔ سراج نے لکھا: مر ہئے، جن کو کسی مقدس انجیل کا واسطہ نہیں ہے، اپنے معاملہوں پر قائم ہیں اور تم جو خدا اور عیسیٰ کی فسمیں کھاتے ہو اپنے وعدوں کو توڑ ڈالتے ہو۔

اور ایڈمِرل والسن نے جواب دیا تھا: ”میں ایسی آگ تمہارے ملک میں لگاؤں گا جسے گنگا کا سارا پانی نہ بجھا سکے گا، میں ایسی آگ لگاؤں گا۔ میں ایسی آگ۔۔۔“ یکا یک مشعلوں کی روشنی سے افق جگہ کا اٹھا۔ بوڑھی گنگا کی موجودیں

جملدار ہی تھیں۔ صاحب کی کشتوں گھاٹ پر پہنچ چکی تھی۔ راجہ گریش چند رارائے اور ان کے حوالی موالي گھاٹ پر استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ رادھے چن نے بڑ بڑا کسر اٹھایا اور اس کی روشنی میں ان کی آنکھیں چند صیائی گئیں، وہ چادر پیٹ کر آہستہ سے اٹھے اور اپنے نیم تاریک مکان کی طرف مزگئے۔

چوپال میں بیٹھے ہوئے سارے آدمی سہم کرایک ایک کر کے اٹھ کھڑے ہوئے کیونکہ راجہ صاحب کے پیادے رات کی دعوت کے لیے بیگار پکڑنے کی غرض سے چوپال کی سمت آ رہے تھے۔

۲۸

چھپیں سال گزر گئے۔

ڈھاکہ کے کارخانوں میں الوبول رہے تھے، سارے ملک میں لوہے کی بھیاں مد تمیں گزریں سرد ہو چکی تھیں۔ انگلستان کی ملوں سے ایسا دھواں اٹھا تھا جس نے ساری دنیا کو تاریک کر دیا اور اس تاریکی میں ہندوستانی جو لاہوں کی ہڈیاں ہندوستان کے میدانوں کی دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ ہندوستان سے لوٹی ہوئی دولت کی بنیاد پر انگلستان میں صنعتی انقلاب اور شیعی سرمایہ داری کی نیو اٹھائی جا چکی تھی، اب با ضابطہ شہنشاہیت کا دور تھا۔ مرشد آباد جو کبھی کلائیو کولنڈن سے عظیم تر دھلائی دیا تھا اب سنسان پڑا تھا۔ گلکتہ گنجان شہر بن چکا تھا، اسی کلکتے میں علی پور روڈ پر سرل ہاؤ روڈ لیسلے کی عظیم الشان عمارت کھڑی تھیں۔ سرل ہاؤ روڈ

لہشکے، پچاس سالہ، دنیا دار، کامیاب، جہاندیدہ، پرانا پانی، گھاگ جان کمپنی کا اہم ستون نئی اردو نشر کا مرتبی اور سر پرست، اودھ کے بادشاہ کا لٹوٹیا یار، اس سے اپنے شکاری کتوں سے ہلو ہلو کرنے کے بعد اب بوچے میں سوار ہونے کا ارادہ کر رہا تھا کہ حسب معمول ہوا خوری کے لیے نکلے، اس کے فرزیشین نے اسے تاکید کی تھی کہ وہ اپنی صحت کا زیادہ خیال رکھے، محنت کم کرے، غم کم کھائے، شراب اس سے بھی کم چے، روز باقاعدہ ہوا خوری کرے، ورنہ مر جائے گا۔ فرزیشین کی ان نصیحتوں پر اسے بھی آتی تھی اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ واقعی بے حد گھٹیا ہے۔ گھٹیا، کامیاب، دولت مند، اوسط قسم کا انسان جو پچاس سال کی عمر میں پہنچتا ہے تو اس کے طبیب اس کے آگے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں۔ سارے گورنرزوں، اعلیٰ حکام اور دوسرے بڑے آدمیوں کے طبیب بھی ان سے بھی کہتے تھے۔

وہ کس قدر گھٹیا آدمی تھا۔ سرل نے کوفت کے ساتھ اپنے شامد ار محل پر نظر ڈالی جس کے باغ میں فوارے چل رہے تھے اور کالے ملاز میں کی پلٹن کام میں مصروف تھی۔ خداوند۔۔۔ مجھے تو نے اتنا ذلیل کیوں بنایا؟ پھر اس نے چند اہل کاراپنی طرف آتے دیکھے اور وہ جلدی سے اپنا بڑے صاحب والا انداز چہرے پر طاری کر کے بوچے میں جا بیٹھا۔ قاصد گورنمنٹ ہاؤس سے آئے تھے، اپنے گلرک کے ذریعے چند کاغذات اسے لکھنؤ کے ریڈی ٹینٹ کے پاس بھجوانے تھے۔ بنگال کے حالات مخدوش تھے، اضلاع کے مسلمان کسانوں نے اودھ کے چند باغی مولویوں کی سر کردگی میں سراٹھایا تھا اور فتنہ فساد پھیلاتے پھر رہے تھے۔ دریائی اور خشکی کے راستے محفوظ نہ تھے۔ گورنمنٹ ہاؤس میں پریشانی تھی۔ اودھ

کے بادشاہ کے پاس ان کاغذات کا پہنچنا ضروری تھا، اسے مسدود کا سر کھلنے کے لیے ندیا کے ضلع بھی جانا تھا (ندیا کے ضلع میں پلاسی باغ تھا جس میں آم کے گھنے کنج تھے اور موسم گرم کے عروج پر جب آم میں بور آ رہے تھے وہاں کرٹل کلائیو، سراج سے لڑا تھا)۔ ندیا۔ گورنمنٹ ہاؤس سے آئے ہوئے اس سرکاری خط میں اس نام کو پڑھ کر اور بہت سی باتیں ذہن میں آ گئیں۔ ناموں اور لفظوں کے ساتھ یہ کیا مصیبت تھی، ہر چیز کا کسی نہ کسی شے سے تعلق تھا۔ ساری دنیا ساری کائنات اسے کوئی نہ کوئی افسانہ سنائے کے لیے تسلی بیٹھی تھی، اپنا افسانہ وہ کس کو سنائے گا؟

خط پر دخنط کر کے قاصدوں کو رخصت کرنے کے بعد وہ پھر چلنے کے لیے تیار ہوا۔ آسمان پر باول گھر آئے تھے، سامنے سڑک پر چند کالے مرگے آدمی ایک ارتھی اٹھائے ہری بول ہری بول کے ہولناک نعرے لگاتے جلدی جلدی قدم اٹھاتے مرگھٹ کی طرف جا رہے تھے۔ سرل کو ایک پھر ریسی کی آئی اور اس نے جھک کر ایک سو گوار سے پوچھا: ”کس کی ارتھی لیے جاتے ہو؟“

”ڈھا کیشوری کے راوے چون بابو۔“

سرل چونکا، راوے تو شنیلا کے باپ کا نام تھا۔

شنیلا کون تھی۔؟

دنیا میں ہزاروں راوے چون ہوں گے اور اس نے شنیل کے باپ کو کبھی دیکھا بھی نہ تھا جو سناتھا کہ کبھی کبھی اپنے بیٹے سے ملنے گاؤں سے آ جایا کرتا تھا اور کافی خبیثی اور بد دماغ بورٹھا تھا۔

سرل ٹوپی اتار کر سڑک کے کنارے ایک طرف کو کھڑا ہو گیا۔ ارتھی والوں نے

بڑی حیرت سے اس کو دیکھا۔ انگریز حاکم جوزندہ بنگالیوں کے ساتھ جوتے لات سے بات کرتا تھا مرے ہوئے بنگالی کی یہ عکریم کیوں کر رہا تھا؟
بے چارے رادھے چران بابو۔ کاش تم چند محبوں کے لیے زندہ ہو کر اپنی یہ عزت افزائی دیکھ لیتے۔

جلوس آگے نکل گیا۔ ہری بول، ہری بول کی آواز میں مدھم ہو کر غائب ہو گئیں۔ کہاروں نے ادب سے پوچھا: ”صاحب کہاڑ جائیے گا؟“
سرل پھر بوچے میں جا بیٹھا۔ ”جہاں چاہو چلو۔“

اس نے زندگی کی ہنگامہ خیزیاں دیکھی تھیں۔ موت کی گرم بازاری کا نظارہ کیا تھا، اس نے دنیا کے ہر رنگ کو ہر پہلو سے پر کھا تھا۔ انسان کس طرح جیتے تھے، کس طرح مرتے تھے، یہ گور کھدھندا کیوں تھا؟ گھری مددیا اگم جل زور بہت ہے وحار۔ کھیوٹ سے پہلے ملو جواترا چاہو پار۔ کھیوٹ کھاں تھا اور اس سے ملنے کی فرصت کے تھی، مگر روح کا یہم کیسا تھا جو مدتیں سے کھائے چاہا تھا۔ کسی دور، کسی حال میں اس کا پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ زندگی سے اسے جتنی توقعات تھیں ان سے کہیں زیادہ مہربانی سے زندگی اس سے پیش آئی تھی مگر زندگی کو اس نے اپنی طرف سے کیا دیا تھا؟ اس نے گھبرا کر چاروں اور دیکھا: یہ پررونق خوبصورت شہر، اس کی دولت اس کی آبادی، سب اس کے قدموں میں بکھری تھی، اسے چاروں طرف کے انسان اپنا منہ چڑھاتے نظر آئے۔ چورا ہے پر پہنچ کر کہاروں نے کندھا بدلنے کے لیے بوچہ زمین پر رکھا، سامنے ایک پر تگالی شراب خانہ تھا۔ ہنگلی کے بر طانوی اور اطا لوی ملاج دروازے پر بلڑا کر رہے تھے، اندر کوئی زور زور سے ہارپ بجا رہا

تھا۔ ایک عورت سر پر سیاہ جالی کاروں مال اوڑھے تیز تیز نظروں سے اسے گھوڑتی شراب خانے کے دروازے میں داخل ہو گئی۔

”مٹھبڑو، یہیں رکو۔“ سرل نے چلا کر کھاروں سے کہا، انہوں نے بوچہ دوبارہ زمین پر دھر دیا۔ سرل کو دکراں عورت کے پیچھے پیچھے دوڑا، وہ یہ قطعی بھول گیا کہ اس کو لکھتے کے اس گھنیا یورپین شراب خانے میں گھستاد کیجھ کر لوگ کیا کہیں گے۔

کاؤنٹر کے پیچھے ایک پیلی رنگت اور بمحبھی بمحبھی آنکھوں والا یورپین بیٹھا اونکھ رہا تھا۔ سرل کو دیکھ کر وہ ہڑ بڑا اگیا اور فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور مارے رعب کے اس کی زبان ہکلا گئی۔ ”سر۔ سر۔“ اس کے آگے اس کی آواز حلق میں ڈوب کر رہ گئی۔

سرل خاموشی سے اسے دیکھا کیا۔ ساری دنیا کے شراب خانوں کے کاؤنٹرز کے پیچھے بیٹھے ہوئے یا ان کے مالک کس قدر پر اسرار لگتے تھے، ان سب کی بڑی خاموش برادری تھی۔ یہ آوارہ اگردوں، چوروں، اچکوں، بدمعاشوں اور طوائفوں کی اپنی مخصوص اداں دنیا تھی۔

اتنے میں وہی عورت تیز تیز آواز میں بولتی تیزی سے قدم رکھتی ایک لکڑی کے زینے پر سے اتری، نیم تاریکی میں اس کے سفید دانت جھلملائے۔ اب وہ برتاؤں کی ملاح خل مچاتے اندر آ چکے تھے اور ان کے ساتھ دو بے حد حسین یورپیشین لڑکیاں تھیں، ان میں سے ایک لڑکی بہت زور زور سے قبیق ہے اگر ہی تھی۔

اس لڑکی کے چہرے پر سرل کو اپنی آنکھیں نظر آئیں، وہ ہڑ بڑا کر انٹھا۔ ”کدھر جاتے ہو سرل صاحب۔“ اس عورت نے، جس کے پیچھے وہ اندر آیا تھا، یک لخت اس کے سامنے آ کر دروازے میں اس کا راستہ روکتے ہوئے استہزاۓ سے

کہا۔ اس کے بندے جھلکوڑے کھار ہے تھے اور وہ خاصی بے تکلی نظر آ رہی تھی۔ دروازے کی چوکھت سے لگ کر اس نے بڑے اطمینان سے سرل کو گھورنا شروع کیا۔ ”سرل صاحب، اپنی لڑکی سے ملتے جاؤ، تم نے مجھے کلکتے بلا�ا تھا۔ میں پچیس سال سے تمہاری منتظر ہوں۔ میں اسے چار سال کا گود میں اٹھا کر یہاں لائی تھی مگر تمہارے چوبداروں نے مجھے آج تک تمہاری کوٹھی میں گھنے ہی نہیں دیا، میں کیا کرتی۔۔۔ تم نے تو میرے کسی خط کا جواب بھی نہیں دیا، تم جانتا چاہتے تھے کہ ہم لوگوں کی زندگیاں کیسے گزرتی ہیں۔ دیکھ لو، اس طرح گزرتی ہیں۔

”سرل صاحب، تم تو بنگال گورنمنٹ کے بہت بڑے افسر ہو۔ کچھ میرے لیے روپیوں کا بندوبست کر دو۔ سنا ہے نیو یورک توں نے تم سے بہت فیض حاصل کیا ہے۔ میں تو پھر ایک حد تک تمہاری ہم قوم ہوں۔“

سرل پسینہ پسینہ ہو رہا تھا، اسے محسوس ہوا بھی اسے دل کا دورہ پڑے گا اور وہیں کھڑے کھڑے ختم ہو جائے گا۔ اسی وقت سامنے سے ایک گھوڑا گاڑی گزری جس میں ملکتہ کرانیکل کے چند صحافی بیٹھے تھے۔ ان کو دیکھ کر سرل کی جان ہی نکل گئی، اگر کسی طرح ان کو اس معاملے کی خبر ہو گئی تو کل تک یہ سارا واقعہ کلکتے بھر کی سو سائٹی میں مشہر ہو گا۔ ولایت تک بات پہنچے گی اس کے چہرے کا رنگ بدلتا دیکھ کر اس کا چوبدار بھاگ کے اس کے پاس آیا: ”صاحب، آپ کا جی ماندہ ہے۔ چلنے۔“ پھر بوچے میں جا بیٹھا۔

عورت کمر پر ہاتھ رکھے دروازے میں کھڑی اسے دیکھتی رہی اور پھر اندر چلی گئی۔

”حضور گھر چلنے گا؟“ کہاروں نے پوچھا۔

گھر؟ اس کا گھر کہاں تھا؟ ”نہیں باغ والے بنگلے چلو۔“ اس نے غصے سے کہا۔ اپنے باغ میں پہنچ کروہ سوچے گا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔
بوچہ آگے بڑھتا گیا۔

جلدی۔۔۔ جلدی۔ اس نے کہاروں کو ڈالنا۔ زندگی کا سارا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرتا جا رہا تھا، یہ زندگی کافانوں تھا اور وہ خود تنہا اس میں مقید تھا اور اس کے چاروں طرف رنگارنگ تصویریں بنی تھیں اور اسے ان تصویریوں سے ڈر لگ رہا تھا۔ گورنمنٹ ہاؤس کے رفقاٹے کار، فورڈولیم کانچ کے مشی اور شار، ایشیا نک سوسائٹی کے محقق، اودھ کے شعرا، اور فن کار، حتیٰ کہ لکھنؤ کی چپا بائی۔ یہ سب مل کر اس کی روح کے غم کو نہیں مٹا سکتے تھے۔
اس کی روح کے غم کیا تھے؟۔۔۔ عورتیں۔۔۔؟

ہر گز نہیں۔ عورتوں کے مسئلے نے اسے کبھی پریشان نہیں کیا۔ کامیاب، مطمئن انسانوں کی زندگیوں میں ایک خاص خانہ ہوتا ہے جو صنف اطیف کے لیے وقف رہتا ہے۔ ان کی محبتیں، ناکامیاں، رومان، ازدواجی زندگی کی مسرتیں یا بے کیفیاں، یہ سب چیزیں اس لیبل کے تحت آتی ہیں جس پر ”عورتیں“ لکھا ہے۔ سرلیشلے، جس نے شاعر کی نظروں سے دنیا کو پہلی بار دیکھا تھا، اب شاعر کے بجائے ایک کامیاب انسان بن چکا تھا، اس کی روح کا دکھ یہ تھا کہ وہ کسی سے محبت نہ کر سکا۔ اس ملک سے، جس نے اپنی ساری جمع پوچھی اس کے قدموں میں ڈال دی۔ ان عورتوں سے، جنہوں نے وقت کے مختلف حصوں میں اسے چاہا۔ مدرس

کی ماریا ٹیریزا، ڈھا کیشوری کی ہنیلا اور بہت سی عورتیں جو اس کے غیر معمولی حسن سے متاثر ہو کر اس پر نچھا ور ہوئیں۔ سرل ایشلے نے دنیا سے سب کچھ حاصل کر لیا لیکن اس کے بد لے میں دنیا کو کچھ دیا نہیں، یہ بڑی بدصیبی کی بات تھی، اگر اس کے عہد میں مذہب کا چرچا ہوتا تو شاید وہ خدا میں پناہ ڈھونڈتا لیکن دنیا عقلیت پرستی اور سائنس اور مادیت کی طرف جا رہی تھی۔ بک آف انگلینڈ چرچ آف انگلینڈ سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ زندگی کے معنی تھے اور زیادہ سرما یا اور زیادہ تجارت، حکومت اور زیادہ ترقی اور اقتدار۔ اپنے گارڈن ہاؤس میں پہنچ کر اس نے اس ہفتے کی ڈاک دیکھی، کچھ دیر سویا پھر پیچوان کے کش لگانے کے بعد دوبارہ ففتر جانے کے لیے تیار ہوا۔ دل کی ویرانیاں بھی تھیں مگر فرض اسے پکار رہا تھا کہ نہیا کے ضلعے میں جا کر باغی کسانوں کی سرزنش کرے۔ قانون اور انصاف کا تقاضا تھا کہ ان باغیوں کو سخت ترین سزا میں دی جائیں، گودل کی ویرانی کہتی تھی لکھنؤ چلو، وہاں دربار کی رنگیزیوں میں سارے غم دھل جائیں گے۔

کوٹ پہن کروہ پھر بوچے پر سوار ہوا اور چورنگی کی طرف لوٹا، جدھر اس کا فتر تھا۔

نو جوان بنگالی ٹرک نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، وہ اب تک فائلوں پر جھکا ہوا تھا۔ گھنٹھریا لے بال اس کے ماتھے پر آن گرے تھے۔ میز پر چاروں طرف

ٹیکے کاغذات کا انبار تھا۔ باہر مددے میں اڑی ٹلی لڑکا اونچتا جاتا تھا اور پنکھے کی ڈور کھینچ رہا تھا۔ سرل کو فتر میں داخل ہوتا دیکھ کروہ ہڑ بڑا کر سیدھا ہو بیٹھا اور پنکھا زیادہ تیزی سے کھینچنے لگا۔

”گڈ آفرنون سر۔“ نوجوان نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے بڑے رسان سے کہا۔

”گڈ آفرنون۔ تمہارا نام کیا ہے؟“

”گوم نیلمہ درت، سر۔“

”میں نے تمہیں پہا کبھی نہیں دیکھا۔“

”میں کل ہی پر یہ یہ لئی مسٹر ہٹ کے فتر سے یہاں ٹرانسفر کیا گیا ہوں۔“

”کب سے کام کر رہے ہو؟ ابھی تو لڑکے ہی معلوم ہوتے ہو۔“ سرل نے دیکھی سے پوچھا، اس کا نیٹو لوگوں سے یہ دوستانہ انداز ایک زمانے میں کارنوالس کو بہت کھلا کرتا تھا کیونکہ جب سے جان کمپنی کو سیاسی اقتدار ملا تھا کارنوالس نے پالیسی تبدیل کر دی تھی۔ اب انگریز حاکم تھے اور ہندوستانی محکوم۔ انہیں کسی حالت میں بھی نیٹو لوگوں سے برابری کا برداشت کرنا چاہتے تھا۔ ہمٹن بہادر، وارن ہیٹنگر کے زمانے خواب و خیال ہو چکے تھے۔ کارنوالس کے عہد سے انگریز اور نیٹو کے درمیان سماجی خلیج و سیع ہوتی جا رہی تھی مگر سرل اولڈ سکول کا ”نواب“ تھا۔ اسی طرح شاعروں سے ملتا۔ مجرے سنتا۔ اودھر یہ یہ لئی میں رہ کر اس پر ہندوستانیت کارنگ اور بھی گہرا ہو چکا تھا، اسے کارنوالس یاد آیا۔ گڈ اولڈ کارنوالس جو غازی پور پہنچ کر ہیئے کاشکار ہو گیا، اب تو اس کی ہڈیاں بھی قبر میں گل گئی ہوں گی۔ اسے

موت کے احساس نے پھر گھبرا دیا، اس نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں اور پھر بنگالی ٹکر پر نظر ڈالی۔ ”تم نے کہاں پڑھا ہے؟“

”سنسرت کانج بنارس اور یہاں“ اس نے جواب دیا، ”ملکتہ کانج میں ایف۔ اے تک پڑھا ہے، اب بی۔ اے کرنا چاہتا ہوں۔“

”بڑی خوشی کی بات ہے،“ سرل نے واقعہ خوش ہو کر کہا۔ ”فتر کے بعد بھی مجھ سے ملتے رہا کرو۔“ پھر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

کچھ دیر بعد اس نے نیلمبر دت کو پھر بلایا۔

”سفر کرنا پسند ہے؟“

”جی ہاں۔“

”کبھی شاہ اور ہر کی عملداری میں گئے ہو؟“

”میں بنارس سے آگئے کبھی نہیں گیا۔“

”اب جاؤ گے۔؟ چند ضروری کاغذات ہیں، تمہارے ساتھ مسلح دستہ جائے گا، میں خود نہیں جاستا کیونکہ مجھے اضافے کا دورہ کرنا ہے۔ گھر جا کر سامان باندھو۔ ٹکلیش سے کہو جہاز میں تمہارے لیے کیمپن کا بندوبست کر دے۔“

”لیں سر۔ تھینک یوسر۔“ وہ اٹھے قدموں اپنے کمرے میں واپس آیا اور پھر کاغذات پر جھک گیا۔ سرل اسے بڑی محبت سے دیکھا کیا۔ انسانوں کو پہچاننے، ان کی روح کے اندر جھانکنے کی اس نے اس سے پہلے کوشش کیوں نہیں کی تھی؟ جہاز نے، جو کلکتہ سے بنارس جاتا تھا، ابھی لنگر نہیں اٹھایا تھا۔ بارشوں کا موسم آچکا تھا اور عموگیر اور پٹنے تک گنگا کی موجیں ہلاکت خیز تھیں۔ گوتم نیلمبر سامان

ڈوق

سفر درست کرنے کے بعد اب بادلوں کے چھٹنے کا انتظار کر رہا تھا۔ مانک تلہ میں اس کا چھوٹا سامکان تھا جہاں وہ اکیلارہتا تھا۔ اس کے ماں باپ،، ہن بھائی سب راج شاہی میں رہتے تھے اور کھیتی کرتے تھے۔

اس سے شام ہو چکی تھی۔ آنگن کے کونوں میں جھینگر بول رہے تھے۔ گلیوں میں بارش کا پانی بھرا ہوا تھا۔ ہوا بند تھی، وہ اپنے کمرے کے برآمدے میں، جس کی سیڑھیاں گلی میں اترتی تھیں، چٹائی بچھائے لائیں جلائے ایک موٹی سی انگریزی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا اور بار بار رُکشیری دیکھتا جاتا تھا، اتنے میں آہٹ ہوئی اور اس نے سفید ساری میں لپٹی ایک چالیس سالہ عورت سامنے کھڑی دیکھی، وہ جلدی سے اٹھا اور نمسکار کرنے کے بعد اس سے پوچھا:

”کیا بات ہے ماں؟ کس سے مانا چاہتی ہو؟“

”تم ہی سے۔“

”مجھ سے؟“

”ہاں۔ تم سرل صاحب کے ٹکر نہیں ہو۔؟“

”ہاں ہوں تو۔“

”میں شنیلا ہوں۔“

”شنیلا۔ ماں۔؟“ اس کے پلے کچھ نہ پڑا۔ ”تمہاری کیا سیوا کروں؟“

”میں۔ میں سرل صاحب کی بیوی ہوں۔“

”اچھا۔؟“ اسے یاد آیا دفتر میں اسے کسی نے بتایا تھا کہ سرل صاحب کے زنانخانے میں برسوں سے ایک ہندو عورت رہتی تھی جس کو کچھ عرصے سے انہوں

نے علیحدہ کر دیا تھا اور اس کے لیے وہ رامکان لے رکھا تھا۔

”تم کو صاحب بہت مانتے ہیں، میرا ایک کام کر دو گے، تم لکھنؤ جا رہے ہو نا۔؟“

”ہاں۔ ماں۔“

”تم نے چمپا بائی کا نام سنا ہے؟“

”چمپا بائی۔ وہ کون ہے؟“

”لکھنؤ کی بڑی مشہور طوائف ہے۔ صاحب جب بھی لکھنؤ جاتے ہیں اس پر ہزاروں خرچتے ہیں، میری اب بات بھی نہیں پوچھتے۔ میرا اب دنیا میں کوئی نہیں ہے، ایک بوڑھا باپ تھا وہ بھی مر گیا۔ بھائی اپنے کاروبار میں لگے ہیں۔ بھاونج اٹھتے بیٹھتے طعنے دیتی ہے۔ ”جاوہا پنے فرنگی کے پاس۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ”میری ایک بڑی بھی ہے، وہ دس سال کی ہوئی تو اسے صاحب نے اپنی بہن کے پاس بھیج دیا، وہ ولایت سے لوٹ کر آئی ہے تو مجھے پچانچی بھی نہیں۔ اسے لوگوں کو بتاتے شرم آتی ہے کہ اس کی ماں کا لی عورت ہے۔“

نیلمبر کی سمجھ میں نہ آیا کیا کہے، اسے یہ معلوم نہ تھا کہ صاحب کی ایک بڑی بھی ہے۔ ”تمہاری بیٹی کا کیا نام ہے؟“

”مارگریٹ اجابل، پر میں اسے بیلا پکارتی تھی۔“

”تم عیسائی ہو گئی ہو؟“

”نہیں، مگر بیلا ہمارے دھرم کو بہت بدراستی ہے۔ تم چمپا سے کہو وہ صاحب کا خیال چھوڑ دے، تم لکھنؤ سے آ کر مجھ سے ملوگے نا، تم مجھے بتاؤ گے تم نے چمپا سے

کیا کہا؟“

”میں تم سے ضرور ملوں گام۔“ گوتمن نیلہر نے کہا، پھر وہ اسے پہنچانے کے لیے گلی میں اتر آیا۔ ”تمہاری پالکی کدھر ہے؟“

”میں پیدل آئی تھی، تم میری فکرنا کرو۔“ گلی کے اندھیارے میں اس کی سفید ساری کچھ دیر تک جھلما تی رہی پھر وہ موڑ پر پہنچ کر وہ آنکھوں سے او جھل ہو گئی۔ گوتمن نیلہر برآمدے میں واپس آ کر دوبارہ اپنی ڈکشنری پر جھک گیا۔

۳۰

لکھنؤ کے روئی دروازے میں پھر دن چڑھے کی نوبت بجھنے والی تھی۔ نیل گاڑیاں اور شکر میں چرخ اچوں کرتی دیہات کی طرف سے شہر کے ناکوں میں داخل ہو رہی تھیں، ان نیل گاڑیوں پر ترکاریاں اور چھل لدے تھے اور مسافر سوار تھے۔ چوک اور نحاس میں چھل پھل شروع ہو گئی تھی۔ امراء کے محاذات کے پائیں باغ صاف کیے جا رہے تھے۔ ملاز میں باسی پھولوں کے گلدستے اور کجرے سمیٹ رہے تھے۔ مہریاں خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ سڑکوں کے کنارے ساقنوں اور عنبونوں نے اپنی اپنی دکانوں کی آرائش شروع کر دی تھی۔ لوگ آتے تھے، دو گھری ہنس بول کر، زردہ کھا کر یا جھنے کے دوکش لگا کر اپنے اپنے کاروبار میں مصروف آگے بڑھ جاتے تھے۔ میدان میں نجیسیوں کی پلٹنیں قواعد کر رہی تھیں۔ تلنگے، جھلنگے، جبشی سپاہی، راجپوت عہدے دار، محاذات شاہی کے پھرے پر مستعد

کھڑے تھے۔ رمنا کے جنگلوں میں چڑیاں چچپھا رہی تھیں۔ گومتی کے کنارے کشتیاں بندھی کھڑی تھیں، ابھی بھروس کے چلنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ ساحل دریا پر بنی ہوئی کوٹھیوں کا حصہ شفاف پانی میں جھملہ رہا تھا۔ ساون کے اودے باڈوں اور آس پا سکے بزرے کی وجہ سے گومتی بھی بزرہ رنگ ہو رہی تھی۔ حیات بخش، ٹیز ہمی کوٹھی، کنکروائی کوٹھی، سنگھائرے والی کوٹھی، خورشید منزل، سب جگہوں پر بادل جھک آئے تھے۔ باغوں میں پنکالگ گیا تھا۔ کنجوں میں جھولے پڑ گئے تھے۔ لکھنؤ ساون منانے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

پھر دوپہر کی نوبت بجی طعام خانوں کی رونق دو بالا ہوئی۔ بھیار نیں مصروف ہوئیں۔ لوگ اپنے اپنے کارخانوں سے کھانا کھانے کے لیے نکلے۔ دیوان خانوں میں دسترخوان بچھے۔ بیگمات نے خس کی ٹیوں کے پیچھے جو سر کی بساطیں بچھائیں۔ مہریاں اور خواصیں پانداں کھول کر بیٹھیں۔ لڑکیاں بالیاں چڑیاں رنگنے میں مصروف ہوئیں۔ کڑھائیاں چڑھائی گئیں۔ سوپہر کی نوبت بجی، دن ڈھلنا شروع ہوا۔ افریب باغات میں درختوں کے سامنے لمبے ہو رہے تھے۔ رمنا میں پلے ہوئے جنگلی جانور چنگھائڑتے پھرے اور ہر ان کلیلیں بھرا کیے۔ چریا جھیل پر بادل جھک آئے تھے۔ موئی محل پر بارش کی ہلکی ہلکی بوندیں برس گئیں۔

چوتھا پہر آیا۔ سورج ڈو بنے لگا۔ ہواویں میں خوشبوئیں امنڈ آئیں۔ شام اودھ اپنی پوری آب و تاب سے بزم آراء ہوئی۔ سارے شہر کو رنگ کی خوشبوؤں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چھپھر کاؤ کی ہوئی مٹی کی سوندھی خوشبو، گندھیوں کی دکانوں کی مہک، قتوں کے نیلے اور جونپور کے گلابوں کی خوشبو،

مندروں میں سے اٹھتے ہوئے عود کی لپٹ بادشاہ کے محل میں بہتی ہوئی عطر کی نہر کی خوبیوں، پھر گلی کوچوں کی کھڑکیاں اور دروازے کھلے، لوگ گلیوں اور سڑکوں پر آ گئے۔ انہوں نے باغوں کا رخ کیا۔ گلی کوچوں میں سے نغمے کی آوازیں بلند ہوتی شروع ہوئیں۔ خوش شکل اور خوش لباس کنجز نہیں، تیز و طراز تنبیثیں، حسین اور حاضر جواب بھیار نہیں ساون اور لاونیاں گاتی پھر رہی تھیں۔ گلی کے لڑکے بیت بازی کرتے جاتے تھے اور گولیاں کھلتے تھے۔ غریبوں اور امیروں کے مکانوں سے ستار اور جل ترنگ اور طنبوسے کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ ندی کنارے پیٹھے ہوئے جوگی تری بجاتے تھے۔ ٹی بیاہی لڑکیاں اپنے اپنے گھروں میں پیٹھی سڑک کی اور دیکھتی تھیں کہ ساون منانے کے لیے ان کا جہائی میکے سے ڈولی کب تھیجے گا۔ حلوائی پوریاں چھان رہے تھے۔ بچیاں پکوان بنا رہی تھیں، ہر شخص مسرورت تھا۔ لوگوں خوش ہو لو کہ دنیا فانی ہے، جانے کتنے دن کا چین تمہارے نصیبوں میں لکھا ہے۔ آپس میں نہ سبول لو، ثقیمت جان لو کہ یہاں دو چار ہم جنس مل پیٹھے ہیں۔ کل کیا جانے کیا ہو۔ کوچ زگار اسنس کا باجت ہے دن رین۔ باقی صرف خدار ہے گا جو کہیں بہت دور پیٹھا اس لیا اکاتما شاکرتا ہے وہ خدا جو صوفیوں کا ہے اور فرنگی محل کے مولویوں کا اور بالانا تھکے جو گیوں کا اور وہ کسی سے بھی اپنی انگلی اٹھا کر کہہ سنتا ہے: بس، اب ختم کیا جائے۔

ایے حقیر اور بے لس اور مصلحکہ خیز انسانو! تم سب ایک مکڑی کے غیر مری جال میں گرفتار ہو چکے ہو، مکڑی کو تم پہچانتے نہیں ہو کیونکہ تمہارا جال غیر مری ہے۔ کب تک تمہاری یہ مسرت رہے گی، بے چارے لوگوں! مسرت بڑی عظیم چیز

ہے۔ دوسروں سے ان کی مسرت نہ چھیننا۔

یہ لوگ جوان سڑکوں پر چل رہے ہیں، گارہے ہیں، خوش ہیں، انہوں نے جیسے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے۔ یہ باوقار، بانفاست، باوضع، پر امن زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں، یہ لوگ جوان باغوں میں جمع ہیں بڑے اہم لوگ ہیں کیونکہ یہ ایک بڑی تہذیب کے نمائندے ہیں۔ اٹھارہویں صدی کے فرانس کی مانند انہوں نے جیسے کے فن کو اعلیٰ ترین بلندی پر پہنچا دیا ہے۔ یہ نام، یہ صورتیں بڑی اہم ہیں، جب کوئی ان کا نام لیتا ہے تو دل پر چوت لگتی ہے۔ شجاع الدولہ، بہوبیگم، بنی بہادر، نگیث رائے اور اووھ کے یہ مرجان مرنج باشندے جو ہزاروں سال سے گھاگرا اور گومتی کے کنارے رہتے آئے ہیں۔ رام چندر کے زمانے میں بھی یہی لوگ تھے۔ شجاع الدولہ کے زمانے میں بھی یہ لوگ زندہ تھے۔ یہ کسان اور جوگی دریا کے کنارے وہ نازگا گوسائیں دھونی رہائے بیٹھا ہے۔ یہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ شجاع الدولہ کی فوج میں شامل ہو کر بکسر میں انگریزوں سے لڑا تھا۔ یہ پر امن کسان اپنا ملک بچانے کے لیے نواب کے سپاہیوں کی حیثیت سے مر ہٹوں سے نکر لیتے تھے۔ یہ مرجان مرنج ملوا ہے اور گوا لے عظیم آباد تک پہنچ کر انگریزوں سے بھڑ گئے تھے، اُن نبیمیں تھا۔ سندھیا کی فوج نے گنگا پار کا علاقہ تباہ کر رکھا تھا۔ الہ آباد میں کلائیو ڈنٹیبل پر شاہ عالم کا تخت بن چکا تھا۔

انگریزوں نے شجاع الدولہ کی زبردست فوج سے گھبرا کر عہد نامہ کیا تھا کہ پینتیس ہزار سے زیادہ فوج نہ رکھیں گے مگر حسب معمول وہ اس وعدے سے پھر چکے تھے اور جب فیض آباد کا شجاع الدولہ مرا اس کو صدمہ تھا کہ انگریزوں کو ملک

سے نکال نہ سکا۔ شجاع الدولہ جو مہاجی سندھیا کا گپڑی بدل بھائی بنا تھا۔ یہ نام اس داستان کے ہیں۔ داستان صحیح ہوتے ہوتے ختم ہو جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے فن داستان گولی کو اپنے عروج پر پہنچا دیا ہے کہ خود بھی یہ قصہ سناتے سناتے قصے میں تبدیل ہو جائیں گے۔

ان کا قصہ مضمون خیز ہے!

لکھنؤ پریوں کے شہر کی طرح جگہ گاربا ہے۔ یہ ماںوس گلیاں، سرکمیں، محلے، گنج، کٹرے، باغ، ناکے، باروں، آباد، بھرے پرے۔ یہ قلعہ چھپی بھون ہے۔ یہ معالی خان کی سرائے ہے۔ یہ آصف الدولہ کے جان ثار راجہ جھاؤ لال کا مل ہے۔

ذر اٹھرو، آصف الدولہ۔ یہ کس کا نام لیا کہ دل کے سارے تاریخ بخوبی اٹھئے، وہی آصف الدولہ جس کا نام لے کر ہندو و کان وار صحیح کو اپنی دکانیں بولتے ہیں؟ جس کو نہ دے موالا۔ اس کو دے آصف الدولہ، جو کہتا تھا ”جہاں میں جہاں تک جگہ پائیں، عمارت بناتے چلے جائیں۔“ جس نے قحط سالی کے زمانے میں پرچا کوروزی مہیا کرنے کے لیے امام باڑہ تعمیر کروایا تھا جہاں رات کو مشعلوں کی روشنی میں کام ہوتا تھا کہ شرفاء، کوئی ڈھوتے اور اینٹیں چنتے شرم نہ آئے۔ دیالو، جنی، دیوتا سماں آصف جس نے باغات، بارہ دریاں، شیش محل اور بھی دانت کے بنگلے بنواڑا لے جو غریبوں اور اہل مال کی پرورش اور قدر کے لیے نئی تجویزیں دماغ سے اتنا تھا۔ جری شجاع الدولہ کا جی بیٹا آصف۔ اس کے فرانسیسی جزل کلاڑ مارٹن کے قلعے کو شیشیا کے باغ میں بہار کے سارے چھوٹے کھلے ہیں۔ فرج بخش

کوئی کے نیچے سے مدنی سبک خرایی سے بہہ رہی ہے۔ طعام خانے کے درپھوں کے نیچے سے کشتیاں گزر رہی ہیں۔ برسات میں کوئی کی نچلی منزلیں نہ آب ہو جاتی ہیں تو جزل اور پر کی منزلوں میں چلا جاتا ہے۔ فرانسیسی معماروں کی بنائی ہوئی کوئیوں میں جھاڑ فانوس بجے ہیں۔ پیانور کھے ہیں۔ ولایتی فرنچ پر جھل جھل کر رہا ہے۔

یہ شہر ایودھیا اور بنا رس کی قدیم موسیقی کا محافظ ہے۔ یہاں کی بھیروی سارے ملک میں مشہور ہے۔ یہاں محرم کے زمانے میں بہاگ اور پیلو اور سونی گھل جاتی ہے۔ بیگمات کے محلوں کی چهار دیواری میں لے دار اور گلے باز ڈونیاں سال بھر جشن موسیقی مناتی رہتی ہیں۔ چوک کے کمرے اور مضافات کے باغ اور بارہ دریاں با آمال ڈیرے وار طوائفوں کی تانوں سے گوشختی ہیں۔ چاندنی راتوں میں کھار اور مزدور منڈروں پر بیٹھ کر بردہا گاتے ہیں۔ برج کے رہس دھاری راس لیا کا سوانگ رچاتے ہیں۔ برہمن رقص ایک گھنگرو بجا کر ناج رہے ہیں اور آس پاس سارے میں ہوت کا گھنگرو نج رہا ہے۔ پچھلے ستر اسی سال سے یہ ناٹک فیض آباد اور لکھنؤ کے رنگ بھوم پر کھیلا جا رہا ہے۔ ان کرداروں کی اہمیت باہروں نہیں سمجھ سکتے۔ ان سب نے مل کر اس دنیا کی تخلیق کی ہے جو اودھ کے باشندوں ہندو و مسلمانوں کی اپنی دنیا ہے۔ یہ لوگ کبھی رلاتے ہیں کبھی ہنساتے ہیں، ان جیسے نام اور کہیں نہ ہوں گے۔ ان کی جیسی زبان، مذاق، لباس۔ یہ لوگ، غریب امیر عورت مرد، جوٹھا کراماں بخش اور لا الہ حسین بخش، مرزا میندو اور نواب کمن کھاتے ہیں اور ام ان مہری اور مرزا جنگلی اور سکھ پچن لوندی اور

نواب بستی بیگم، یہ سب روتے ہیں، ہستے ہیں، گاتے بجاتے ہیں، لڑتے ہیں۔ شجاعت ان کا شیوه ہے، آن پر جان دینا۔ شرافت، احسان مندی، وفاداری، نیکی۔۔ اس کے علاوہ جا گیردارانہ سماج کی حقیقی اچھائیاں اور حقیقی برائیاں ہو سکتی ہیں وہ سب ان میں موجود ہیں، اسی لیے یہ لوگ بڑے جذباتی ہیں۔ بتاش اور کوڑی پر ناپنے والے رقص، کشمیری بھانڈ، جل تر گنئے، بین کار، بانپی برہمن، پلچی، شاعر، مرثیہ گو، داستان گو، کالیستھو، فوجی، بانکے، چند و باز، بھگلت باز، نقائ، بہروپئے، عالم، فاضل، کلاونٹ، یہاں رزم و بزم ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ یہ اصل روانی معاشرہ ہے۔

لکھنؤ سے ستر میل کے فاصلے پر بغلہ فیض آباد ہے۔ رام کا شہر ایودھیا جسے شجاع الدولہ نے دلی کا ہم پلہ بنایا تھا۔ جہاں گلاب باری ہے اور گھاگرا کے گھاث اور بڑے مغلوں کے زمانے کی مساجد۔ دلی میں اب بچارے چھوٹے چھوٹے مغل بیٹھے ہیں۔ یہ مضمکہ خیز چھوٹے مغل بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں۔ ان کو سر چھپانے کو جگہ نہیں ملتی۔

دلی کا ایک شہزادہ لکھنؤ میں پڑا ہے۔ بنا رس میں بنناہ گزین ہے۔ اودھ دربار سے اس کو دوا کھسا لانہ وظیفہ دیا جاتا ہے، یہ امیر تمور صاحب قران کی اولاد ہے۔ اور ایسی شیعوں کی اولاد اس سے اودھ پوری میں ڈگ وجہے رام چندر کے سنگھاسن پر بیٹھی ہے اور اس نے اپنی اس زبردست و راشت کا حق ادا کر دیا ہے۔ یہ بادشاہت ہندوؤں کے لیے ان کی قومی ریاست کے متراوٹ ہے۔ یہاں ہندو اور مسلمان کا اختلاف کوئی نہیں جانتا کیونکہ گڑھی کاٹھا کر اور محل کا نواب دونوں

جا گیر دارانہ اقدار کے مضبوط رشتے میں ایک دوسرے سے بند ہے ہوئے ہیں اور ان کی پر جا، جس میں ہندو اور مسلمان کسان دونوں شامل ہیں، ان کے سپاہیوں کی لاٹھیوں سے یکساں بُتھی ہیں۔ ان کے دکھ سکھ ایک ہیں۔

مذہبی تفریق کو پر جا کا خالص ذاتی معاملہ سمجھا جاتا ہے۔ محرم میں بلوئے نہیں ہوتے نہ مسجدوں کے سامنے باجہ بجا یا جاتا ہے۔ ہندو تعزیہ داری کرتے ہیں اور مسلمان دیوالی مناتے ہیں کیسا الٹازماں ہے۔ نواب بہو بیگم ہر سال ہولی منانے فیض آباد سے اپنے بیٹے کے پاس لکھنؤ آتی ہیں۔ ساری سلطنت میں ہندو راجاؤں نے مسجدیں اور امام بارڑے بنوار کھے ہیں۔ لکھنؤ سے اسی میل کے فاصلے پر بہراں چ ہے جسے ہزاروں بر س پہلے شراوی کہتے تھے۔ جہاں سالار مسعود غازی کی درگاہ ہے۔

ہر سال بڑی دھوم دھام سے ہندو مسلمان مل کر ان کی بارات نکالتے ہیں۔ جیٹھے مہینے میں ان کا میلہ لگتا ہے۔ سرخ نیزے اور جھنڈے اٹھائے ڈفلی بجاتے ہزاروں ہندو مسلمان دیہاتوں سے ان کے مزار کا رخ کرتے ہیں۔ بنگال کے مسلمان صوفی ستیہ پیر کی مانند جو ستیہ نرائن بن چکے ہیں۔ بہت شکن سالار مسعود عرف بالے میاں نے اودھ کے ہندوؤں کے لیے بالنا تھک کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ ان کے مقبرے کے قریب کا اگن کنڈ بالا رکھ کی دھونی کہا جاتا ہے۔ درگاہ کی مذر مجاور اور پوچا کے محاصل پنڈے حاصل کرتے ہیں۔ پنڈوں اور مجاوروں میں آپس میں اس آمدی کی تقسیم کے متعلق معاهدہ ہے۔ سرل ایشلے کے دوست بشپ ہمیر اور ان کے ساتھی، جو آج کل اس ملک میں چاروں اور گھوم کر اپنے سیاحت

نامے قلمبند کر رہے ہیں، لکھتے ہیں کہ اس ملک کا ہندو مسلمان ایک وہ رے کے خون کا پیاسا سا ہے اور ویسٹ مسٹر میں ہماری حکومت کو چاہتے کہ ان وحشیوں کو اپنے جہالت اور تعصّب سے نجات دلانے کے لیے جلد از جلد مزید انحصاریں اور مزید بندوقیں بھیجے۔

لکھنؤ کے باسیوں کو خبر نہیں کہ ان بے چاروں کے لیے بندوقوں سے لدے ہوئے جہاز کلکتہ کی اور آرہے ہیں۔ آغا میر شاہ زمُن کے وزیر اعظم ہیں۔ میانا بیگ کوتوال شہر کا حاکم ہے جس نے عہد سعادت علی خان کے دھومنی بیگ کوتوال کی انصاف اور اُن پروری کی روایت کو زندہ کر رکھا ہے۔ شہر میں مکمل سکون ہے۔ مشہور ڈاکو مجرم منانے کے لیے عارضی طور پر رہا کیے جاتے ہیں اور پھر جیل میں خود واپس آ جاتے ہیں۔ بانکے مفسدوں کی سر زنش کے لیے موجود ہیں۔ ہوا میں اشرفیاں اچھائتے چلے جائیں کوئی نہ پوچھے گا۔ بہو بیٹیوں کی عزتیں محفوظ ہیں، ایک کی بیٹی سارے محلے کی بیٹی بھی جاتی ہے۔ وضع داری اور شرافت پر جان دینے کا عام رواج ہے۔

یہ ابوالمنظفر معز الدین شاہ زمُن غازی الدین حیدر کا دارالسلطنت ہے جن کی شادی میں روپیوں یا اشرفیوں کے بجائے ہاتھیوں پر سے ہیرے جواہرات کی بوچھار کی گئی تھی جن کو لوٹ کر غریب غرباً دولت مند ہو گئے تھے، ان کے حرم سرا میں فرنگی کرnel ایش کی بیٹی مبارک محل برآ جتی ہے۔ ان کی بیٹی کی شادی بنگالے کے قاسم علی خاں کے لڑکے سے ہوئی ہے۔

اک ذرا مٹھرنا۔ کون قاسم علی خاں۔ بنگالے کا آخری خود مختار نواب، وہ سید

زادہ جوانی شکست کے بعد دلی جا کر جلاوطنی کے اس عالم میں مرا کہ اس کی شال فروخت کر کے اس کی تجیز و تخفین کی گئی۔

یہ شاہ زمکن کا دارالسلطنت ہے۔ شاہ زمکن نے گومتی کے کنارے امام بائزہ نجف اشرف تعمیر کرایا ہے۔ محرم میں اس میں چڑاغاں کیا جاتا ہے تو لگتا ہے طسم ہوش ربا کا ایک منظر ہے۔

بازاروں میں کھوے سے کھوا چھل رہا ہے۔ سودے والے اپنی اپنی شاعرانہ صدائیں لگا رہے ہیں۔ دکانوں میں دنیا جہان کا مال فروخت ہو رہا ہے۔ سعادت علی خاں کے عہد کی بنی ہولی عمارتوں میں قعیقہ گونج رہے ہیں، ان خوبصورت عمارتوں کی آرائش دیکھ کر جی بھر آتا ہے۔ اتنی خوبصورتی اور نفاست پامدار ہو سکتی ہے!

حسن پامدار نہیں ہوتا۔ شاکریہ منی گوتم سدھارتھ نے ایک مردجہ کاشی کے ہر نوں کے باغ میں کہا تھا۔ ہر شے فنا ہے، فنا سے بچو، دکھ سے بچو، سائے سے بچو اور وید انت میں لکھا ہے کہ ملیا کی مثال ایسی ہے گویا بانجھ عورت کا لڑکا سر اب کے پانیوں میں نہانے کے بعد آسمان پر اگے ہوئے پھول پھن کر ہرن کے سینگوں سے بنی آدم باتھ میں لیے باہر نکلے۔ مت بھولو کہ رام چندر کے ایودھیا اور پرسن جیت کے شراوی اور چندر گپت کے پائلی پتھر اور کالی داس کے اجمن اور حسین شرتی کے جو پورا اور علاء الدین حسین کے گوڑ میں بھی زندگی کا حسن اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا اور مت بھولو کہ ہر حسن میں موت پوشیدہ ہے۔

سرک پر سے ایک سکھ پال گزرہی ہے جس کے گنبد پر شہری کلس سجا ہے اور

شوخ و شنگ مہری جس کا چھٹکا پکڑے ساتھ ساتھ بھاگ رہی ہے۔ کہاروں کی
وردیاں سرخ رنگ کی ہیں اور ان کی سرخ پکڑیوں پر مچھلی کے طالبی نشان بنے
ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں چاندی کی موٹھو والی لاثھیاں ہیں۔ راہ گیروں کی نظریں
اس سکھ پال پر جھی ہیں، یہ اپنے وقت کی حسین ترین لڑکی چمپا کی سکھ پال ہے۔

وقت بڑی عجیب چیز ہے۔

وقت اور حسن اور موت۔

باغوں میں میلے ہو رہے ہیں۔ مرغوں اور بیسوں اور مینڈھوں اور ہاتھیوں کی
لڑائیاں منعقد کی جا رہی ہیں۔ انگریز ریڈ یونٹ بادشاہ کے ساتھ بریک فاست
کھاتا جاتا ہے اور سامنے ہاتھیوں کی لڑائی دیکھتا ہے۔ برآمدے میں انگریزی بینڈ
بنج رہا ہے، مشاعرے ہو رہے ہیں۔ دربار میں یکتائے روزگار رقص پر کاش جی
کتھک ناقچ رہا ہے۔ شوالوں میں بچوانی کی پوچھا ہو رہی ہے۔ آم کے کنجوں میں
ملہار اڑ رہا ہے۔ شمشان گھاٹ پر وہ جو اس ہنگامے سے نکل گئے ہیں پچونکے جا
رہے ہیں۔ نخاس میں داستان طرازوں نے اپنی محفلیں آ راستہ کر رکھی ہیں۔ علماء
اور حکماء کی مجلسوں میں مباحثے جاری ہیں۔ بھنگڑیے سبزی گھوٹنے میں محو ہیں۔ سر
سنگھار اور بخیرے اور پکھاوچ کے شور سے کان پڑی آوازیں سنائی دیتی۔
قبرستانوں میں قبریں کھودی جا رہی ہیں۔

فنا۔ فنا۔ ہر شے فنا ہے۔

وقت فنا میں شامل ہے۔

وقت کو مختلف حصوں میں قید کر لیا گیا ہے مگر وہ پل پل چھن چھن اس قید کو توڑتا

ہوا چپ چاپ آگے نکلتا جاتا ہے۔

اب رومی دروازے میں مغرب کی نوبت بجے گی۔

چار پہر دن گزر چکا ہے۔ چار پہر رات گزر جائے گی، ہر پہر میں آٹھ گھنٹیاں ہیں، ہر آٹھویں گھنٹی پر کھربجتا ہے۔ انسانوں کا جلوس اپنی قبروں میں اتر رہا ہے۔

وقت موت ہے۔

۳۱

عبد آصفی کے بنئے ہوئے رومی دروازے کی نوبت کی آواز گوتم نیلمبر کے کانوں تک پہنچی، اس وقت اس کی شکرم شہر کے ناکے میں داخل ہو رہی تھی۔ ناکے پر اس نے سپاہی کو اپنا پروانہ راہداری دکھایا۔ بادشاہ اور دھکے کے سپاہی نے پوچھا: ”قبلہ کہاں سے تشریف لاتے ہیں؟“ اس نے بتایا: ”کلکتے سے الہ آباد کے بنی گھاث تک جہاز پر آیا تھا، وہاں سے اسٹیچ کوچ اور شکرم پر جیٹھا بارش سے بھیگتا چلا آتا ہوں۔“

”کہاں کا قصد ہے قبلہ؟“

”رینڈیونی۔“

سپاہی نے ایک لمحے کے لیے اسے غور سے دیکھا۔ ”فرنگی سرکار سے جناب کا سلسہ ہے؟“

”ہاں“ اس نے ذرا جھینپ کر جواب دیا۔

”ہاں میاں“ رام دین دصرے سپاہی نے چلم سلاگاتے ہوئے کہا، ”خدا کسی نہ کسی و پلے سے رازق ہوتا ہے، فرنگی کی سرکاری سہی۔“

اس کے بعد رام دین نے پہلے سپاہی کو ایک باموع شعر سنایا اور گوتم نیلہر کو داد طلب نگاہوں سے دیکھا۔ گوتم نیلہر نے بچپن میں فارسی ضرور پڑھی تھی مگر ان لوگوں کی نگرانی اردو اس کے پلے نہ پڑی، یہ اس نے پہلی بار دیکھا کہ ملک میں ابھی ایسی جگہیں بھی ہیں جہاں نیٹو بادشاہ اب تک حکومت کرتا ہے۔ اسے یہ سوچ کر ایک لمحے کے لیے عجیب سی سرست کا احساس ہوا۔ شکر آگے بڑھی۔

یہ شہر کے مضافات تھے۔ سڑک کے کنارے چند اہم بھوپھل میں بھوری لگا رہے تھے۔ کھار جامن کے نیچے بیٹھے ستون گھولتے تھے۔ چھکڑوں پر منوں آمدے چلے جاتے تھے۔ ایک پتیل کے نیچے لکڑا سلگ رہا تھا۔ ایک بوڑھا جوگی دھونی رمانے بیٹھا تھا۔ پچھے بھوانی کا مٹھا تھا۔ نیلہر نے غیر شعوری طور پر مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ اپنی کالی ماں کو پر دلیں میں دیکھ کر اسے بڑی تقویت ہوئی۔ رینڈیلیں کی نواب سعادت علی خان مرحوم کی ایک اطالوی طرز کی کوٹھی تھی جسے فرنگیوں نے خرید لیا تھا، وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ صاحب نواب مال رضا بہادر کے یہاں دعوت میں گئے ہوئے ہیں۔ اس کی آمد کی اطاعت اور دھر کار کے سر رشتہ اخبار کو بھجوادی گئی۔ دوسرا ہر کارہ گولہ گنج میں نواب مال رضا بہادر کے مکان پر پہنچا۔

نواب ابوالمنصور مال الدین علی رضا بہادر نصرت جنگ (جو دراصل چوبیں

سالہ نواب کمن کا وہ نام تھا جو محض شاہی اور ریزیڈینٹ کی تقریبات پر لیا جاتا تھا) کھانے کے بعد ریزیڈینٹ کے ساتھ بیٹھے چور کھلتے تھے۔ یہ شہر کے ایک بہت بڑے گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ مرشد آباد اور لکھنؤ کے شاہی خاندانوں سے ان کی قرابت داری تھی، کافی بڑا تعلقہ کیاں پور میں تھا۔ خوش شکل تھے اور خوش آواز۔ مرثیہ خوانی پوری راگ داری سے کرتے تھے اور میر انیس کے ساتھ ساتھ مجلسیں پڑھتے تھے۔ شہر کی طوائف ان پر عاشق تھیں۔ شاعر تھے اور دیوان مرتب کرنے میں مصروف تھے۔ شادی سولہ سال کی عمر میں کردی گئی تھی، اب تک متعدد خانہ زاد لوٹیوں سے حصہ کر چکے تھے۔ ان دونوں چمپا جان پر لٹھور ہے تھے، مگر اب معلوم یہ ہوتا تھا کہ کلکتے والے سرل صاحب کی طرح یہ ریزیڈینٹ صاحب بھی اس کے رقبہ بننے پر تلمیز بیٹھے تھے۔ انہی خیالات میں غلطائی و پیچائی وہ چور کی چال بھی سوچ رہے تھے کہ چوبدار نے آ کر اطلاع دی کہ ایک بیگانی بابو ملکتہ گورنمنٹ سے کاغذات لے کر آئے ہیں۔ بیلی گارڈ میں باریابی کے منتظر ہیں۔

رنگ میں بھنگ پڑ گیا۔ برآمدے میں جلترنگ بج رہی تھی، ابھی چمپا آنے والی تھی۔ ریزیڈینٹ کو بڑا غصہ آیا۔ جب سے لارڈ ایم ہرست کلکتے میں گورنر جنرل ہو کر آیا تھا اس نے اپنے انتظامات اور مستعدی سے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اچھی خاصی ڈاک بھا دی تھی، ہر دوسرے تیرے کوئی نہ کوئی پیغام بر کلکتے سے یہاں پہنچتا رہتا تھا۔ دل چمپا کے ناج میں پڑا تھا مگر بر طانوی حکومت کی وفا داری اور فرض کے عظیم تصورات نے چمپا کے خوش آئند ہیوں کو دھندا دیا۔ ریزیڈینٹ صاحب فوراً بیلی گارڈ لوٹ گئے۔

”یہاں چمپا بائی کہاں رہتی ہیں؟“ دوسرے روز گوتم نیلمیر نے رینڈیلیسی کے ایک فرشی سے دریافت کیا۔ ہری شنکر زیر لب مسکرا کیا۔ یہ بنگالی بابو بھی اہل دل معلوم پڑتے ہیں، بھگی واہ ہم جانتے تھے یہ بیٹھے لکھا پڑھی ہی کرتے رہیں گے۔

”کیا آپ بی چمپا صاحب کے یہاں تشریف لے جائیے گا؟“

”ہاں“ اس نے گھبرا کر جواب دیا اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ہری شنکر اس کی گھبراہٹ پر بہت متعجب ہوا کیونکہ ہری شنکر کے اس معاشرے میں طوائف کا درجہ بہت اہم تھا اور باعزم۔ جس کے بغیر مہذب سوسائٹی مکمل نہیں تھی۔ فرشی ہری شنکر نے ہر کارے کے ذریعے چمپا کو اطاعت بھجوائی کہ سرل صاحب کے فرشی ملنا چاہتے ہیں۔ چمپا نے کہلوایا: زہے نصیب ضرور آؤیں۔

شام پڑے جب موتیا اور خس کی خوشبو ہوا میں امنڈی اور زمین پر کیوڑے اور گلاب کا چھپڑ کاؤ کیا گیا، چوک روشنیوں سے بقعہ نور بہن گیا تب گوتم نیلمیر دست کا ہوا دار چمپا جان کے سبز رنگ کے سہ منزلہ مرکان کے سامنے جا کر رکا جس کے رنگ برلنگے شیشوں والے دروازے تھے اور چھانک پروردی پوش چوبدار کھڑے تھے۔ گوتم جھجھکتا ہوا ہوا دار پر سے اتر اور دو شالہ کندھوں سے لپیٹا زینے پر چڑھا۔

کمرے پر بڑا جماو تھا۔ فرش پر سفید چاندنی کھنچی تھی۔ سفید چھت گیری میں جھاڑ آؤیں اس تھے۔ طاقتوں میں کنول اور گلاس روشن تھے۔ صحنی، جو چوک کے رخ کھلتی تھی، اس پر گلات کی بیل چڑھی تھی۔ دروازوں کے برادر پھولوں کے بڑے بڑے چینی کے گلے رکھے تھے جن سے سارا کمرہ معطر تھا۔ صحنی میں کسی نے مال گنج چھینر رکھا تھا۔ چاروں طرف قد آدم آئینے لگے تھے۔ ان آئینوں میں گوتم

نیلمبر کو عجیب عجیب شکل میں نظر آئیں۔ ایسے لوگ جن کو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، یہ کون لوگ تھے؟ کہاں سے آئے تھے؟ کدھر کو جائیں گے؟ یہاں اس معطر کمرے میں کب تک ان کا جماور ہے گا؟ یہ لوگ جو شرتی کے پنے ہوئے انگر کے اور گلبدن اور مشرع کے کلیوں دار پانچا مے اور دوپٹی اور نکے دار ٹوپیاں اور منڈیمیں پہنے شالی رومال اور ہے اطمینان سے گاؤں تکلیوں کے سہارے بیٹھے تھے ان کی انگلیوں میں فیروزے اور عقیق کی انگوٹھیاں تھیں، ان میں جوان اور دیہڑ اور بوڑھے بھی شامل تھے۔ متین، ثقة، سنجیدہ، مہذب، نہایت خاموشی اور اہتمام سے یہ لوگ بیٹھے بڑے تکلف اور اخلاق سے آہستہ آہستہ رک رک کر ایک دوسرے سے گفتگو کرتے تھے۔ ایک کونے میں راجہ شیو مار وفا کے کسی شعر پر بحث ہو رہی تھی، دوسری طرف چند حضرات موسیقی کے کسی لکنے پر تبادلہ خیالات کر رہے تھے۔

نیلمبر دت لمحے بھر کے لیے شرمایا سا دروازے کے پاس کھڑا اس منظر کو دیکھتا رہا، اس نے اپنا بہترین چونہ پہن رکھا تھا اور اس کے سر پر مندیل تھی مگر اس کی شکل و صورت ہی پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ پر دیسی ہے۔ حاضرین محفل نے اسے دیکھ کر تہذیب کی وجہ سے کسی اچنہجے کا اظہار نہ کیا۔ نواب کمن نے، جو صدر نشین تھے، اسے اپنے قریب بلا کر مند کے قریب جگہ دی اور اس سے خیریت مزاج دریافت کرتے رہے۔

”ہمارا بھی لکنے جانے کو بہت جی چاہتا ہے مگر معاذ اللہ بہت جو کھم کا سفر ہے۔“ انہوں نے کہا، وہ انگا جمنی گردگڑی پیتے جاتے تھے اور ان کے خوبصورت

چہرے پر فانوس کی روشنی آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ ”بنگال کے زمینداروں کا کیا کہنا، بڑے بڑے رفیع الشان روساء اس ملک میں ہیں۔ جناب کا تعلقہ بنگالے میں کس طرف ہے۔۔۔؟“ نواب کمن کے ایک مصاحب نے پان کی تھالی پیش کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”میرا تعلقہ کہیں نہیں ہے، ملازمت کرتا ہوں۔“

”ملازمت؟“

اب نیلمبر کو پھر وہی جھنجرا ہٹ محسوس ہوئی جس کا اسے ناکے پر سامنا کرنا پڑا تھا۔ ”میں کمپنی کی سرکار میں ملازم ہوں۔“

”خوب۔“ نواب ممال رضا نے پہلو بدلا۔ ”تب تو جناب انگریزی بھی پڑھے ہوں گے۔“

کسی اور نے دریافت کیا۔

”جی ہاں تھوڑی سی شدید ہے۔“

”اچھا بھلا کتئی۔ خط پڑھ لیتے ہیں؟“

نیلمبر دت مسکرا یا۔ ”جی ہاں“ اب ذرا اس نے آرام کا سانس لیا۔ یہ بڑے نیک طینت اور بھولے لوگ تھے، ان سے خائف ہونے کی کیا ضرورت تھی، گویا عجیب بات تھی کہ یہ بھی اسی دنیا میں رہتے تھے جس میں وہ زندہ تھا۔

نواب کمن اس سے نواب سعادت علی خاں کا تذکرہ کرتے رہے جن کے انتقال کو چند سال ہی گزرے تھے اور جنہوں نے لکھنؤ میں کلکتے کے طرز کی عمارتیں بنوا کر شہر کو یورپین رنگ دے دیا تھا۔ گوتم نیلمبر ان کو کلکتے کی باتیں بتلاتا رہا۔

اتئی دیر میں ساز ملائے گئے۔ ایک سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی نک سک سے درست، چمپی رنگت، سیاہ بھنورابال اور سیاہ آنکھیں، ناک میں ہیرے کی لوگنگ پہنے، اور گرنٹ کے فرشی پائیجامے میں مابوس گوندی کی طرح زیوروں سے لدی بڑے ٹھسے سے چلتی ہوئی آ کرو سط میں بینہ گئی اور بڑے لفڑیب انداز میں اس نے جھک کر نیلمبر دت کو تسلیم کی، پھر اس نے شہانا میں آصف الدولہ کی غزل شروع کی:

بتوں کی گلی میں شب و روز آصف
تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں
تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

تماشا خدائی.....

سامعین مسحور ہو کر اس کی آواز سنتے رہے۔ گوتم نیلمبر اس کی شکل دیکھنے میں محب تھا۔

کلکتے کا انگریزی دان بہمن ٹکر لکھنؤ کے جادو میں گرفتار ہو گیا، دن گزر تھے گئے۔ بارشوں کی وجہ سے کلکتے تک کے راستے بند تھے۔ جنم اشتمی کا تھوار آیا۔ بھادوں کا مہینہ آیا۔ اماوس کی رات میں جب چمپا اپنی صحنگی میں بیٹھ کر گوڑ ملہار گاتی۔ جب کنجوں میں کرشن کنہیا کے لیے جھولے ڈالے گئے۔ برج کے رہس دھاریوں نے کرشن لیا کے سوانگ تیار کیے۔ چمپا را دھابنی۔ کبھی چمپا کو گوتم نے ہر مجھنی شاہ زمکن غازی الدین حیدر کے دربار میں دیکھا جہاں وہ آواز کے شعبدے دکھانی تھی، اس نے چمپا کو جمعرات کے روز درگاہ حضرت عباس جاتے دیکھا۔ میلوں اور

باغوں میں دیکھا۔ گومتی پر بھرے میں تیرتے دیکھا، ہر طرف چمپا تھی۔

وہ شنیلا کا جو پیغام اس کے پاس لے کر آیا تھا کب کا بھول چکا تھا۔

اس رات جب وہ چمپا کے بیہاں سے لوٹا آدمی رات کا بھرنج چکا تھا، نیچے سڑکیں سفسان پڑی تھیں۔ گانا ختم کرنے کے بعد چمپا نے حاضرین سے اجازت چاہی تھی اور کوئی شبح جالانے کے بعد اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی، چلتے چلتے رک کر اس نے نیلمبر سے کہا تھا: ”آپ ہی بنگالے سے آئے ہیں نا، پھر بھی آتے رہتے گا، ہم غریبوں کو بھول نہ جائیں گا۔“ اس کے بعد محفل برخاست ہوئی تھی۔ اب گلیوں میں سائے پھر رہے تھے۔ سارا شہر سوتا تھا۔ صرف چوک کے بالاخانوں کی روشنیاں جل رہی تھیں مگر اب وہ بھی ایک ایک کر کے بجھتی جا رہی تھیں۔ نواب کمن اور دوسرے معزز زین اپنے اپنے ہواواروں، تما مجانوں، پالکیوں اور بوچوں پر سوار ہو کر اپنی محل سراویں کی طرف جا چکے تھے۔ سوتا ہوا شہر۔

اس سے گوتم نیلمبر حسب معمول جا گتا تھا، وہ تو اکثر اپنی راتیں جاگ کر گزارتا تھا۔ راج شاہی میں، جہاں اس کا جھونپڑا دھان کے کھیتوں میں تھا، وہ اپنی کوٹھری میں دیا جلا کر رات بھر بنگالی پڑھا کرتا تھا۔ بنارس میں رات گئے تک وہ یمپ کی روشنی میں منکرت کا مطالعہ کرتا تو عجیب باتیں اس کے دماغ میں آتیں۔ مابعد الطبيعیات، یہ جانے کس زمانے کی باتیں تھیں اور کس قدر غیر ضروری مگر کالی داس اور بھرتی ہری اور راج شیکھر پڑھ کر وہ سوچ میں کھو جاتا، کیا کبھی ایسا زمانہ بھی تھا جب ہم نیٹوگ ایسے قابل ہوتے تھے۔ اسے یقین نہ آتا۔

کلکتے میں وہ رات بھر پڑھتا اور پھر کتابوں پر سر رکھ کر سو جاتا، آج پہلی

مرتبہ رات کو ورڈ زور تھا اور شیلے اور کالی داس کے متعلق سوچنے کے بجائے اس کے دماغ پر چمپا کے تصور نے اپنا سلط جمالیا۔ اسے بڑا غصہ آیا، کوفت بھی ہوئی۔ عورتوں کے مسئلے پر اس نے بہت کم سوچا تھا۔ راج شاہی میں جب سترہ سال کی عمر میں اس کے ماں باپ اس کی شادی کر دینا چاہتے تھے وہ بنارس پہنچ گیا تھا۔ بنارس اور لکھنؤ کی طالب علمانہ زندگی میں ہزاروں مصروفیتیں تھیں۔ عاشقی کے لیے ابھی بہت وقت پڑا تھا، ابھی تو اسے بی۔ اے کرنا تھا۔ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرنا اس کا مقصد حیات تھا، پھر ممکن ہے وہ انگلستان بھی جاسکے۔

لکھنؤ کی اس ویشا سے اس سے مطلب؟ وہ سر جھکائے سڑک پر آگے بڑھتا گیا حتیٰ کہ کھاروں نے اسے آواز دی: فینیس ادھر ہے خداوند، وہ مژا اور فینیس پر سوار ہو کر اپنے جائے قیام کی طرف چل دیا۔ دوسرے روز سے بھادروں کے جھاٹے شروع ہو گئے۔ دن بھر وہ رینڈیوں کے ففتر میں بیٹھا رہتا، کبھی کانفذات لے کر آغا میر وزیر اعظم کے مکان پر جاتا، کئی باروہ شاہی محل بھی گیا اور ہنزیجی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جو انگریز بادشاہوں کا لباس پہنے (جو گوم نیلمبر نے ولیم چہارم کی تصویروں میں دیکھا تھا) مرصع کری پر بیٹھے تھے اور رینڈیوں کو جھک کر بڑے ادب سے ان کے کان میں کچھ کہہ رہا تھا، دن اسی طرح مصروفیات اور چہل پہل میں گزر جاتا، رات قیامت بن کر آتی۔

رات، جو چمپا کی راجدھانی تھی۔ اس رات میں گوم نیلمبر دت کا کوئی دخل نہ تھا۔ اس کی زندگی اور دنیا میں ویشا کا خیال ہی کراہت انگلیز تھا، پھر وہ سوچتا عورت جو دبی ہے۔ کاشمی، گوری، او ما۔ جو ماں ہے اور بہن اور بی بی اور بیٹی۔

اسے طوائف نہیں ہوتا چاہئے، یہ بڑی زیادتی ہے، پھر اسے خیال آیا کہا جاتا ہے عورت تو محض دکھنے کے لیے ہی بنا لی گئی ہے۔ اس میں عورت کی عظمت ہے جس کی ساری عمر مرد کی ٹھیل کرنے میں بیت جاتی ہے اور پھر بھی مرد اس سے خوش نہیں ہوتے۔ پتی و رتا عورتیں، بمال و ڈھوائیں۔ یقیناً لڑکیاں جن کو ورش نہیں ملتا۔ عورت جو گائے کی طرح بے زبان ہے، جوستی ہو کر جل مرتی ہے کہ اسی میں اس کی شان ہے مگر اس چمپا کو دیکھو جو خود جل کر مرنے کے بجائے دھروں کو جلا جلا کر مارتی ہے۔

نا استری سوتنتزم۔ منوہار ارج میں لکھا ہے۔ عورت آزاد نہیں ہے، بالکل صحیح تھا۔ رامائن کی چھٹی کتاب میں تو یہاں تک لکھا تھا کہ خطرے کے وقت، شادی کے موقع پر اور عبادت کے سے عورت باہر آ جائے تو قابل اعتراض نہیں اور یہ بھی لکھا تھا کہ عورت کے وید پڑھنے سے بڑا انتشار پھیل سبتا ہے۔

سنستے ہیں کہ کسی زمانے میں ولیس کی عورتیں با مال ہوتی تھیں، پڑھنا لکھنا جانتی تھیں۔ بے پرداز گھومتی تھیں اور جانے کیا کیا۔ اپنے گاؤں کی مسلمان عورتوں سے اس نے بھانومتی اور کنچن مالا اور کسم مالتی مالا اور رانی بینا متی کی جور و پ کتھائیں بچپن میں سنی تھیں ان سب میں بھی پرانے و قتوں کی عورتوں کی بڑائی کے قصے تھے، لیکن یہ سب گپ تھی۔ بھلا ہماری عورتیں جو اس قدر جاہل اور پس ماندہ ہیں کبھی بھی بہتر حالت میں رہی ہوں گی، یہ عقل میں نہیں آتا۔ نا استری سوتنتزم۔

شہنشاہی اور جاگیر دارانہ سماج میں عورت کو آزادی محض اسی وقت میسر ہوتی ہے جب وہ بازار میں آ کر بیٹھ جائے تب اس کو عزت بھی ملتی ہے دولت بھی، پھر

اس کے لیے شعرو شاعری کرنا بھی جائز ہے لکھنا پڑھنا بھی۔ ورنہ علیحدہ سے اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ چمپا بائی اسی نظام کی پروردہ تھی اور گوتم اس حیثیت کو سمجھنے سے قاصر تھا کیونکہ وہ خود ان نے متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا جس نے ابھی ابھی جنم لیا تھا اور جا گیردارانہ ڈھانچے سے ہٹ کر اپنی اقدار الگ بنارہاتھا اور متوسط طبقہ بڑی شدت سے اخلاق پرست ہوتا ہے۔

مشی ہری شنکر کے ساتھ وہ ایک روز کشتی میں مددی پار کر کے مینڈھوں کی اڑائی دیکھنے رمنا جا رہا تھا کہ معاً اس کی نظر سامنے پڑی، ایک شہر ابھرا آہستہ آہستہ تیرتا ہوا جا رہا تھا۔

”دہائی ہے کمپنی بھا درکی!“ اس کی کانوں میں ایک نقری آواز آئی، اس نے پٹ کر دیکھا۔ یہ چمپا کی آواز تھی جو دوسرے بھرے میں بیٹھی تھی۔ نیلمھر کو گھبرا کر اپنی طرف دیکھتے ہوئے وہ حلکھلا کر ہنس پڑی۔

اگر وہ اہل لکھنؤ کی صحبت میں ذرا زیادہ رہ لیا ہوتا تو جواباً کہتا کہ حضور یہ فقرے ہم پر تیز کرتی ہیں، مگر وہ بالکل ہڑ بڑا گیا۔ سامنے سے آ غاییر کا بھرا آ رہا تھا۔ چند اور مرصع اور منقش کشتوں میں امراء وزراء، صاحبان عالیشان، یعنی انگریز اور شہر کی نامی طوائفیں رمنا جا رہی تھیں۔ دریا پر مجھلی اور گھوڑے کی شکلوں کے بھروں کا میلہ سا لگا تھا۔ اتنے میں چمپا کی کشتی قریب آگئی۔

”ہماری کشتی میں آ جائیے۔“ اس نے کہا۔

”تاکہ آپ ان کو بھی لے ڈویے۔“ ہری شنکر نے جواب دیا، اس کے بعد دونوں میں ضلع گلت شروع ہو گیا، ہستے بولتے یہ سب گھاٹ پر پہنچے۔ بارہ دری کی

طرف جاتے ہوئے ہمت کر کے گوتم نیلمر نے طے کر ڈالا کہ جو فرض اسے شنیلا
دستی نے سونپا تھا اسے ادا کر کے کم از کم اپنے ضمیر کو ہلاکا کر لے۔ جس وقت چمپا

پا پنجھے اٹھا کر بیٹھ رہی تھی گوتم نیلمر نے اس سے پوچھا:

”تم سرل صاحب کو جانتی ہو۔“

وہ چپ رہی۔

”چمپا بائی جی میں نے تم سے جو سوال کیا ہے اس کا جواب دو۔“

”اچھا جانتے ہیں، پھر تم سے کیا۔“

”ان کی بی بی ہے، لکلتے میں۔“ اسے موقع تھی کہ یہ سن کر چمپا کارنگ فق ہو
جائے گا، عرق ست اس کی پیشانی پر حمکنے لگے گا مگر وہ اطمینان سے بولی: ”اچھا تو
پھر۔ جتنے لوگ ہم سے ملتے ہیں سب کی یہ بیان ہوتی ہیں۔“

”ان کی ایک لڑکی بھی ہے۔“ نیلمر نے اور زیادہ اہمیت کے ساتھ کہا۔

”سب کی لڑکیاں بھی ہوتی ہیں، تم اپنا مقصد بیان کرو۔“

”تم سرل صاحب سے قطع تعلق کرو، یعنی اب کے سے جب سرل صاحب
یہاں آئیں تو ان سے نہ مانا، وہ ریز یہ نہ بن کر یہاں آنے والے ہیں اگلے
مہینے۔“

چمپا ٹھہٹک گئی اور ایک لمحے کے لیے اس بڑی وجہ سے دیکھتی رہی۔ ”آپ
عجیب ہونق انسان ہیں۔ حضرت یہ کہتے کہ اب آپ کی ہم پر طبیعت آئی ہے!“
نیلمر کو چکر سا آگیا۔ حد ہو گئی بیہودگی کی، اس کا جی چاہا وہ ہیں سے اٹھے پاؤں
والپس چلا جائے مگر اب لڑائی شروع ہونے والی تھی۔ خلقہت جمع ہو چکی تھی۔ بادشاہ

سلامت اور اہل دربار اپنی کرسیوں پر فروکش ہو رہے تھے۔ بینڈ بجنا شروع ہو گیا تھا، وہ جا کر ایک طرف کو چپا کھڑا ہو گیا۔

واپسی میں اسے نواب کمن اور ریزیڈنٹ کے ساتھ ساتھ تک گھاٹ آنا پڑا۔ بھرے میں چمپا کا ساتھ ہو گیا۔ اس کشتی میں اور کوئی نہ تھا، وہ اسے بڑی محبت کی نظرؤں سے دیکھتی رہی۔ ”سنوجی“، اس نے دھنٹا کہا۔ ”ہم سرل صاحب کو ہزار دفعہ چھوڑ دیں گے، مگر تم ہم کو چھوڑ کر مت جاؤ۔ تم ہمیں بہت زیادہ بھاگنے ہو۔“ وہ خاموش رہا۔

چمپا کی رنگت سرخ ہو گئی۔ ”تم نے سنا۔ ہم۔ چمپا جس پر ایک عالم جان دتا ہے خود بے حیا بن کر تم سے یہ کہہ رہے ہیں، مغرو رآدمی۔“

وہ اسی طرح خاموش رہا۔ ڈوبتے سورج کی کرنیں اس کی آنکھوں میں تیزی سے جھلملانے لگیں، اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ بھر اب چھتر منزل کے پاس پہنچ چکا تھا۔

”ہم نے آج تک کسی سے یہ نہیں کہا، بد بخت مغرو رآدمی۔ اپنے آپ پر زیادہ نازار نہ ہونا، یہ وقت بہت جلد گزر جائے گا،“ کشتی گھاٹ تک پہنچ گئی۔

گوتم نیلمبر نے آنکھیں کھول لیں، وہ اسے تیوری پر بل ڈالے غور سے دیکھ رہی تھی، پھر وہ نہس پڑی۔ ”ہونق آدمی۔“ اس نے پیار سے کہا۔ ”بات کرنے کی تم کو تیز نہیں اور تم پر ہم عاشق ہوئے ہیں، یہ قدرت کا تماشا دیکھو!“ نیلمبر چپ چاپ بھرے پر سے اترा۔ چمپا نے اپنی سکھ پال کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”ہمارے یہاں آؤ گے نا؟ از برائے خدا ضرور آنا۔ میاں نیلمبر صاحب۔ تم کو کیا

کہہ کر پکاروں؟ پنڈت جی مہاراج۔ ورنہ پانڈے جی پچھتا میں گے۔ وال پنے کی کھائیں گے۔“

نیلمبر دوسری طرف دیکھ رہا تھا، وہ اپنی اور ہری شنکر کی پالکی اور کھاروں کو ڈھونڈنے میں مصروف تھا۔

”ہم سے ملوگے نا؟“

”دنبیں،“ نیلمبر نے مختصر سے جواب دیا اور جلدی سے جا کر اپنی پالکی میں بیٹھ گیا۔

اس کے بعد وہ تین دن تک نہیں سو سکا، اس دوران میں اس کے پاس چمپا کے متعدد پیغام آئے۔ اس قدر اچانک اس عورت نے یہ کیسا ناٹک کھیلا تھا، مگر عورت کے چہتر آج تک کون سمجھ پایا ہے۔ یہڑکی، بڑے بڑے ڈھنوان اور سورما جس کے ناز اٹھاتے تھے، اسے میری کون سی ادا بھاگئی۔ غشی ہری شنکر نے فائدوں پر سے سراٹھا کراس سے کہا: ”بھائی نیلمبر۔ ہمارے کاشی کے بیرون داں کہہ گئے ہیں۔

چھوٹی مولیٰ کامنی سب ہیں ہس کی بیل

بیرونی مارے داؤں سے یہ ماریں نہس کھیل

مگر تم اس کے یہاں چلے کیوں نہیں جاتے، اس میں کیا حرج ہے؟“

نیلمبر اودھ کے اس لالہ بھائی کو نہ سمجھا پایا کہ چمپا کے یہاں جانے میں کیا حرج ہے۔

”بھگوان نے ناری ہمارا جی بہلانے کے لیے تو بنائی ہے۔“ ہری شنکر نے پھر کہا۔ نیلمبر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”ناری تو بڑی مقدس چیز ہے، اسے تم دل کا

بہا اونچھتے ہو۔ ”اس نے کہا۔

”ارے میاں،“ ہری شکر نے تھتے کا کش لگا کر نہس کے جواب دیا، ”ہم نے اس کوچے میں بڑے بڑے جمادھاری برہمن چکر لگاتے دیکھے ہیں، تم کس کھیت کی مولی ہو۔“

نیلمبر انٹھ کر باہر آ گیا اور ریڈ یلٹی کے باغ میں بلا مقصد ٹھیلنے لگا۔ مالی مولی کی چھاؤں میں چشم پیتے تھے اور شاگرد پیشے میں کھاروں کی محفل میں کٹورا چل رہا تھا۔ گارڈ ہاؤس کے پرآمدے میں منڈیاون چھاؤنی سے آئے ہوئے دو گورے شراب کے نشے میں وصت ایک دوسرے سے لٹر رہے تھے، اتنے میں اسے ٹیکی کی ڈھلان پر زرورنگ کا دوپٹہ اوڑھئے جمنا مہری اور پرچھتی نظر آئی۔ جمنا مہری جو چمپا کی پیغام بر تھی، وہ خاموشی سے پھر اندر چلا گیا۔

کوارکا مہینہ لگ چکا تھا اور الہ آباد میں جہاز لکھتے جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ کاغذات کا پلندہ سنبھال کر وہ واپس لوٹنے کے لیے تیار ہوا۔

جب وہ ناکے کی طرف چارہا تھا، یک ایک اس نے گاڑی بان سے پوچھا: ”یہ سڑک کس طرف جاتی ہے۔“

”شخاں--- خداوند---“

”اہر گاڑی موڑلو۔“

”بہت خوب--- خداوند۔“

شکر م چمپا کے مکان کے سامنے جا کر تھہر گئی، وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتا اور گیا۔ چمپا چھپی میں بیٹھی تھی۔ نیلمبر کی آوازن کراس کارنگ سفید پڑ گیا۔

”تم آگئے۔“

”نہیں۔ میں جا رہا ہوں۔“

”دو گھری رک جاؤ، دودھ کھاؤ گے، شربت منگوادوں؟“ اس کا تامل دیکھ کر اس نے کہا۔ ”برہمن کی دکان سے جل پان منگوادوں؟“

”مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔“

”مجھے معلوم ہے تمہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔“

”میں۔ میں صرف تم کو خدا حافظ کہنے آیا تھا۔“

”خدا حافظ۔“

وہ دروازے میں ٹھٹھ کارہا۔

”ہمارے شہر کا ستور ہے دعا دیتے وقت کہتے ہیں: سواغم حسین کے خدا کوئی غم نہ دے، یہ دعائیں تم کو نہیں دے سکتی۔ تم حسین کا غم بھی نہیں جانتے، تم تو جانتے ہی نہیں غم کہتے کے ہیں۔“

”سنو، چمپا۔“ نیلمیر نے دھیرے سے کہا۔ ”تمہاری زندگی اتنی رنگیں ہے، بہت جلد تم مجھے بھول جاؤ گی، کس چکر میں پڑ گئیں۔ میرا اور تمہارا کیا ساتھ ہے۔“

”ہاں میرا اور تمہارا کیا ساتھ ہے بھلا، تم نے آج تک مجھے اپنا ہاتھ بھی نہیں چھوٹے دیا۔ ہمارے یہاں کے ہندو تو اتنی چھوٹت چھات نہیں کرتے۔“

”سنو۔“ اس نے چمپا کو پھر سمجھا نے کی سعی کی۔ ”تم کو میں اس لیے پسند ہوں کہ ان سب لوگوں سے مختلف ہوں جو تمہارے ماحول سے تعلق رکھتے ہیں۔ انوکھی چیز ہر ایک کو بھاتی ہے۔“

”کیا تمہارے دلیں میں لڑ کیاں نہیں ہوتیں۔“ اس نے سادگی سے سوال کیا۔

نیلمبر کو فہری آگئی ”ہوتی کیوں نہیں مگر تمہاری جیسی نہیں، اچھا بہ میں چلتا ہوں۔“

”اللہ۔ کس قدر طنز ہے، معلوم ہوتا ہے راجہ جہاؤ لال کے جانشین آپ ہی ہیں۔“ چمپا نے ہٹنے کی کوشش کی۔

اندھیرا تیزی سے پھیلنے لگا۔ شہر میں چاروں طرف بنخاشے چڑھائے گئے۔ فانوس جگہ گائے، قند میں جلیں، نیچے سڑک پر سے ایک بارات گزر رہی تھی تخت روائ پر ناچ ہوتا جا رہا تھا۔ ماہی مرابت کی قطار میں لڑکے بالے اور شہدے اچھلتے کو دتے چل رہے تھے، دوسرے تخت روائ پر سوانگ اور کرتب ہو رہے تھے۔ روشن چوکی نج رہی تھی۔ مشعلوں کی روشنی بالاخانے کی کھڑکیوں پر آ کر پڑی، اس روشنی میں چمپا کا کامدانی کا دوپٹہ جھک جھک کرنے لگا۔ نیچے ڈونیاں سوہا گاتی جا رہی تھیں۔ چمپا کھڑکی میں آ کر بارات دیکھنے لگی۔ ”جانے کس سجا گن کی بارات ہے۔“ اس نے کہا، نیلمبر نے پیٹ کرا سے دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”اس کی ماگنگ میں سیندھر ہو گا، پیروں میں مہندی، ناک میں سہاگ کی نتھ۔“ اس نے آہستہ سے اپنی ماگنگ کو چھوڑ جس میں افشاں چتنی تھی لیکن جو سیندھر سے عاری تھی، اب یہ پھرنا لٹک کھیل رہی ہے۔ گوتم نیلمبر نے پریشان ہو کر سوچا۔

”آدمی اس قدر کا کٹھور ہوتا ہے۔“ چمپا نے کہا۔

”ہمیشہ سے عورت اور مرد ایک دوسرے پر یہ اذام رکھتے آئے ہیں، یہ تکرار

بھی فضول ہے۔“

”تم ابھی جا رہے ہو۔“

”ہاں۔“

”صحیح ہوتے ہوتے لکھنؤ سے بہت دور نکل چکے ہو گے۔“

”ہاں۔“

”یہ دوہا سنا ہے۔“

بجن سکارے جائیں گے اور نہیں مرسیں گے روئے

بدھنا ایسی رین کرو کی بھور کبھی نہ ہوئے۔“

نیلمبر کھڑکی میں سے نیچے دیکھنے لگا۔ شہر کا شہر کسی میلے کے لیے ایک سمت کو رووال تھا۔ گلیوں میں سندے موچھوں پر تاؤ دیتے اکڑتے پھر رہے تھے۔ قلمان، جبشنیں، ہڑوں گیاں، چونے والیاں، قصباتی پاتریں چھمن کرتی ٹولیاں بنائے باغ کی طرف جا رہی تھیں۔ ہانکے اپنی تلواریں چمکا رہے تھے۔ مد کیے، چڑ سے، بھنگڑیے چند و خانوں میں جمع تھے۔ چو طرفہ غل مچا تھا۔ دنیا کس قدر رنگا رنگ جگہ تھی، اسی دنیا کو بھر تری ہری نے رنگ بھوم کہا تھا۔

اس رنگ بھوم پر ایک بے معنی ناٹک یہ بھی کھیلا جا رہا تھا، اندھیرا چھانے لگا۔
اس کی شکر میچے منتظر کھڑی تھی۔

بھاگومیاں، بھاگو یہاں سے جلدی۔ لکلتے کارستہ کھوٹا ہوتا ہے۔ لکلتے چلو۔
تمہاراٹھہا نہ ہیں ہے میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے قدم اڑ کھڑا رہے ہیں۔

پھر وہ جلدی سے اپنا کاغذات کا لقچہ سنبھال کر تیزی سے زینے سے اتراء، اس

نے ایک بار بھی پہنچ کرنے دیکھا اور سیدھا شکر میں پہنچ کر دم لیا۔

گاڑی کے پہلوں نے سڑک کے پختہ فرش پر سورج مچانا شروع کیا۔ بارات کا ہنگامہ بھی باقی تھا۔

بھیڑ میں سے انکتی شکر آغا میر کی ڈیوڑھی تک پہنچ گئی۔ نو عمر کو چیان، ہیٹھے گا مہربان، ذرا فجع کے قبلہ، کی ہائک لگاتا شہر کے باہر نکل آیا۔ اب وہ حضرت گنج کی مانوس سڑک پر سے گزر رہے تھے جس کے دونوں طرف اونچی گو تک وضع کی انگریزی عمارتوں میں کنوں جلتے تھے۔ سڑک پر سواری کی گاڑیاں اور گھوڑے اور ہاتھی اور پالکیاں گزر رہی تھیں۔

یہ راستہ نبتا سماں تھا، وہ ناکے پر پہنچ گئے۔ جامن کے نیچے چند بیڑاں گی بیٹھے تھے جنہوں نے پراسرار آنکھوں سے نیلمبر کو دیکھا، ان میں سے ایک وہی تھا جسے نیلمبر نے پہلے روز تا کا تھا۔ اسے بھوانی کے مٹھے کے سامنے عود سلک رہا تھا۔ گاڑی سے اتر کر وہ دو قدم آگے بڑھا اور اس نے مورتی کو غور سے دیکھا۔ ماٹا کو وہ کالی کے روپ میں جانتا تھا، اب وہ شکر گزار ہوا کہ ماٹا نے اسے اپنے جوگ مایا (جوگ مایا درگاہ کا ایک روپ Goddess of illusion) کے روپ کے بھی درشن کرادیے۔ ماں، میں نے تمہاری یہ لیا بھی دیکھ لی، اب واپس جاتا ہوں۔ اپنی شکنی سے اسی طرح میری حفاظت کرتی رہنا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر سر جھکائے ہوئے آہستہ سے کہا۔

ایک جوگی، جس نے پہلے روز اس سے بات کی تھی، اس سے گویا ہوا: ”بڑی جلدی واپس جاتے ہو۔“

”سراب کے ساحل پر تا خیر کرنا عظیم نہیں، یہ تمہارا شہر سراب کا شہر ہے۔“
نیلمبر نے لکھنؤ کی روشنیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ دور مچھی بھون میں
چوتھے پہر کا کجھ بجا۔ بیراگی نے اسے دیکھا: ”سراب کی حقیقت اتنی
آسانی سے سمجھ میں نہیں آ جاتی بچہ۔“

”بابا۔“ نیلمبر نے رُک کر کہا، ”جو لوگ مایا نے اپنے دوں ہاتھوں سے مجھے
انی اور سخنچنا چاہا، لیکن دیکھو میں صحیح و سالم واپس لوٹ رہا ہوں۔“

”ہم میں سے کوئی صحیح و سالم نہیں ہے، ہم سب کمہار کے کھلونے ہیں اور ہر
سے ٹوٹتے پھوتتے رہتے ہیں۔ انی مضبوطی پر نازاں نہ ہونا۔“ پھر اس نے تھوڑی
سی مٹی اٹھا کر اسے سونگھا۔

”دیکھو، اس میں کتنی خوبی ہے، اس مٹی کو لے جاؤ۔ کنک میں جوگ مایا کا
مندر ہے، اس میں چڑھا دینا۔“

نیلمبر نے ہاتھ بڑھا کر مٹی لینے میں پس و پیش کیا، یہ گور کھانا تھا کا جو گی پھر اپنے
گور کھو دھنے دکھارتا تھا۔

”لے لو۔۔۔ یہ لکھنؤ کی مٹی ہے، اسے اپنے ساتھ لے جاؤ کیونکہ اس شہر کا
جادو یہ ہے کہ چھٹ جائے تو بے طرح یاد آتا ہے۔“
جو گی بڑی شستہ زبان بول رہا تھا۔

”بابا۔۔۔ تم بیراگی کیوں بن گئے۔“ نیلمبر نے پوچھا۔

”تم۔۔۔ تم مجھے جانتے ہو۔۔۔؟“ جو گی نے ذرا گھبرا کر پوچھا۔
”نہیں۔۔۔ میں تو کسی کو بھی نہیں جانتا۔“

”ہاں، جاننا بہت مشکل ہے، اور جاننے والے کو کون جان گا۔“ جو گی نے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔

نیلمبر نے اپشید میں یہ جملہ پڑھا تھا۔ یہ راگی بہت پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا۔ نیلمبر کے جذبہ تحسیں میں اضافہ ہو گیا۔

”بابا--- میں پوچھ ستا ہوں تم کون ہو؟“

”کیوں۔ کیا تمہارا بھی اس راہ پر چلنے کا ارادہ ہے۔“

”ارے--- نہیں تو۔“

”کیوں جی۔ فرنگی کی جاسوسی کرتے ہو؟“

نیلمبر کے دل پر یہ بات موگری کی طرح جا کر پڑی۔ جو گی کے لجھے میں اتحاد حقارت تھی۔

”میں۔ میں فرنگی کی جاسوسی نہیں کرتا۔“ اس نے آزردہ لجھے میں کہا۔

”چج کہتے ہو؟“ جو گی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

”ہاں۔ باکل چج۔“

”اچھا تو سنو، میں راجہ بنی بہادر کا پیٹا ہوں۔ راجہ بنی بہادر کا نام سننا ہے؟ وہ مرزا جلال الدین حیدر نواب شجاع الدولہ کے نائب السلطنت تھے جو جناب عالی (نواب اودھ) اور عالی بیجاہ (نواب بنگال) کے ساتھ جی توڑ کر تمہارے صاحبان عالی شان کی فوج سے لڑے تھے۔ گنگا کے کنارے ایک طرف میرا بہادر بابا اور بنا رس کا راجہ بلونت سنگھ اور گوسائیں ہمت بہادر اور روہیلے تھے۔ دوسری طرف فرنگیوں کا لشکر۔۔۔ گوسائیں ہمت بہادر کے ناگے جان ہمچلی پر رکھ کر لڑ رہے

تھے۔ دادا سرو کی توپ چلتی تھی مگر فرنگیوں نے میرے باپ کی فوج پر اچانک حملہ کر دیا۔ گولیوں کی باڑھ اور تلنگوں کی یورش میں ہمارے لشکر کے قدم اکھڑ گئے۔ میرا باپ گھوڑے پر سوار ایک ایک کو پکارتا پھرا، ارے کم بختو کدھر بھاگ رہے ہو۔ جناب عالی نے لکار لکار کر سر اسیمگی سے کہا، تم مغل کہلاتے ہو اور میدان چھوڑ کر بھاگتے ہو۔۔۔ مگر ہماری فوج۔۔۔ درگاؤتی ندی پار کر کے بھاگ کھڑی ہوئی۔ ہزاروں ندی میں ڈوب گئے۔۔۔ ہندوستان پر قیامت گزر گئی۔۔۔ وہ ذرا کی ذرا دم لینے کے لیے رکا، جوش کے مارے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، پھر یہ سرخی ادا سی میں تبدیل ہو گئی۔ اس نے آہستہ سے کہا: ”تمہاری فرنگی سر کار نے اسی وقت دیکھ لیا کہ اس قوم میں اتفاق جاتا رہا۔ عالیجہا اور جناب عالی ہی میں آپس میں بچھوت پڑ گئی۔ فرنگیوں نے دیکھا کہ یہ سب لوگ دوسرے کی چغلی کھاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف شقے لکھ کر ایک طرف بادشاہ عالی گھر کو دلی بھیجتے ہیں دوسری طرف کلکتے سے شرائط کرنے پر آمادہ ہیں، یہ کیسا ذلیل ملک ہے۔ ان سب کا ایک دوسرے سے اعتبار اٹھ گیا ہے، میرا باپ جناب عالی کا سب سے زیادہ نمک حلال اور وفادار ملازم تھا، وہیوں کے بہکائے میں آ کر جناب عالی نے اس کو نمک حرام تصویر فرمایا اور اس کی سزا کے درپے ہوئے۔“

”ارے۔۔۔“ نیلمبر کے منہ سے نکلا۔

”جناب عالی نے منڈیاون چھاؤنی میں میرے باپ کے خیمے میں قیام فرمایا اور کھانے کے بعد میرے بابا سے کہا: ”راجہ تم بھی اس وقت شکار کو چلو۔“ انہوں نے عرض کی۔ ”غلام نے بدولت حضور بہت سے شکار دیکھے ہیں۔“ فرمایا:

”آج کاشکار بہت عجیب و غریب ہے۔ ایسا کبھی نہ دیکھا ہوگا، جو دم ہے غیرمت ہے۔“ وہ بابا کو اپنی خواص میں بٹھا کر اپنے لشکر کی طرف چلے، بابا سمجھ گئے کہ یہ میرا دام گرفتاری ہے مگر کیا کر سکتے تھے۔ حکم حاکم مقدم تھا۔ عالی جناب کے حکم سے بابا کی دلوں آنکھوں میں نیل کی سلائیاں پھیر دی گئیں۔ ان کا علاقوہ ضبط سر کار ہوا۔ تیرہ سو گھوڑوں، اٹھارہ ہاتھی اور پورے توپ خانے کے علاوہ ایک وسیع زمینداری کے میرے بابا مالک تھے، میں صرف اس مرگ چھالا کا مالک ہوں۔“
جو گی خاموش ہو گیا۔۔۔

نیلمبر مہوت بیٹھا قصہ سنتا رہا۔ جو گی نے آگ میں ایک لکڑا اور ڈال دیا اور اکڑوں پیٹھ کر کہنے لگا: ”سراب کی حقیقت تو میں نے جانی ہے، تم اس کی حقیقت کو کیا جانو! تم اسی چکر میں شامل ہو اور رہو گے۔ مجھے سلطنتوں کے بننے اور گزرنے، کمپنی کی خوشی اور ناخوشی، بادشاہ کے عتاب، کسی چیز کی پروواہ نہیں۔۔۔ میرے بابا کو اندھا کر دیا گیا تھا۔ مجھے اندھا کون کر ستا ہے، سوانے میرے خود کے۔ جاؤ۔ اب تم کو دریہ ہوتی ہے۔ لٹک میں جب جوگ مایا کے مندر میں جاؤ تو دیکھنا کہ اس کے چاروں طرف برآمدے ہیں اور ان گنت دروازے اور ایک دروازے کے بعد دوسرا دروازہ کھلتا ہے اس کے بعد تیسرا۔ اس طرح کی بھول بھلیاں اور غام گردشیں چاروں طرف بنی ہیں جن سے انسان نکل نہیں سستا، تم سمجھتے ہو کہ تم اس بھول بھلیاں سے نکل آئے ہو، مگر تم غلطی پر ہو۔۔۔ جاؤ۔۔۔“ نیلمبر اٹھا، جھک کر اس نے جو گی کے قدموں کے پاس سے مٹی اٹھائی اور بھاری بھاری قدم رکھتا شکر میں آن بیٹھا۔ گاڑی بان نے باگیں سیتا پور جانے والی

سرک کی طرف موڑ لیں۔

معاپل کے نزدیک شکر م رک گئی۔ گاڑی بان نیچے اتر، سامنے ایک انگریز فوجی گھوڑے سے اتر کر ایک راہ گیر کو گھوڑے لگا رہا تھا اور انگریزی میں گالیاں دلتا جاتا تھا۔

یہ منڈیاون چھاؤں تھی۔ چاروں طرف انگریزوں کی کوٹیاں تھیں اور فوج کا میس اور گرجا اور فوجی ہسپتال۔

گورا راہ گیر کو اچھی طرح پیٹنے کے بعد گھوڑے پر سوار ہو کر اندر ہیرے میں غائب ہو گیا۔

”سالے۔۔ ہمارا ہی کھاتے ہیں ہم ہی پر غراتے ہیں۔“ گاڑی بان نے، جس کا نام انگا دین تھا، غصے سے کہا۔ ”شاہ جھن کے وقت میں یہ اندر ہیرا۔“ وہ بڑبڑا تارہ۔ گومت نیلمبر پھر اپنے خیالات میں کھو گیا۔ رات گئے وہ راجہ نگیث رائے کی بنوائی ہوئی ایک دھرم شالہ میں اترے۔ انگا دین اب تک بڑبڑا رہا تھا۔ رینڈیڈی کے سپاہی اور ہر کاروں کو دیکھ کر، جو نیلمبر کے ساتھ شکر م سے اترے تھے، دھرم شالہ میں چہ میگویاں شروع ہو گئیں۔ بنگالی بابو ہیں۔ گلکتے جا رہے ہیں، انگریزی جانتے ہیں، ان سے پوچھو ہمری مال گجارتی میں کمپنی بہادر کب کمی کرے گی۔ سناء نے قانون لندن میں بنے ہیں، یہاں بھی لاگو ہوں گے۔ ان بے چارے کو کیا معلوم، کیوں نہیں بنگال اور او دھ میں ایکنے قانون لاگو ہوتے ہیں۔ اے بابو صاحب۔۔ مال گجارتی میں کمی کروائیں، ہمری تو کمیں نوٹ گئیں۔ آنکن کے پختہ فرش پنیلمبر کے چاروں اور مجمع لگ گیا، یہ سب آس پاس کے

دیہات کے کسان تھے جو اپنے اپنے مقدمے اور فریادیں لے کر دارالسلطنت جا رہے تھے۔ ایک بوڑھا پھونس قصباتی زمیندار لاٹھی نیکتا نیلمبر کے قریب آن کر بیٹھ گیا۔ ”کون جات ہو؟“ اس نے چراغ کی روشنی میں نیلمبر کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔
”برہمن۔“

بوڑھے نے نیلمبر کے پاؤں چھوئے۔ ”ٹھاکر میرے گاؤں چلے چلو تو تم ری سیوا کروں، میرا مکان ہیاں سے کوس بھر ہے۔“

”مجھے صبح سوریے ہی سفر پر روانہ ہونا ہے۔ بابا سیوا تو مجھے تمہاری کرنی چاہتے، میرے لائق کوئی خدمت بتاؤ۔“ نیلمبر نے کہا، اس کا دل بھرا آیا، یہ لوگ سب کے سب کتنے معصوم بھولے تھے۔ اسے دکھ ہوا کہ وہ اودھ پوری چھوڑ کر جا رہا ہے۔

”ٹھاکر۔“ بوڑھے نے چاروں طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا۔ ”اپنی انگریجی سرکار سے کہو ہم پر زیادہ جامن نہ توڑے۔“
وہ خاموش ہو گیا۔

”دنکھلو سے آتے ہونا۔؟“

”ہاں۔“

”ہواں ہمرے بادشاہ کے درشن کیے؟“

”ہاں۔“

”ہمرے بادشاہ کو کمپنی بھادر نے روپے کے لیے تگ کر رکھا ہے۔“
”پتا نہیں۔“

”ٹھاکر--- تم کو معلوم ہے۔“ اب بوڑھے نے زیادہ جوش سے بولنا شروع کیا۔ ”کمپنی بہادر نے وچن ہمارے بادشاہوں کو دیے اور ایک ایک کر کے سب کو توڑا۔--- تم کو معلوم ہے بکسر کی ہار کے بعد جناب عالیٰ سے۔“

اے لیجے۔ یہ پھر بکسر اور جناب عالیٰ کا قصہ شروع ہو گیا، بوڑھے نے نیلمبر کو لحظہ بھر کے لیے دیکھا۔

”تم کو ان قصوں سے دلچسپی نہیں ہو گی لیکن یہ گھاؤ ہمرے دلوں پر لگے ہیں اور یہ گھاؤ تازہ ہیں، ہمراویں کمپنی بہادر نے تاراج کر کے رکھ دیا ہے۔ تم کو معلوم ہے بکسر کی ہار کے بعد جناب عالیٰ سے انگریزوں نے لکھا پڑھی کی تھی کہ وہ پینتیس ہجار سے زیادہ فوج نہیں رکھیں گے، اب منڈیاوں میں عالم دیکھو۔ آ صفائی الدویلہ بیکشہ باشی کلکتے لکھا: انگریزی فوج سارے ملک کی آمدی کھا گئی۔ گھر کے آدمیوں کو کھانے کو نہیں بچتا۔ کھیت اجز گئے۔ فرنگی افسروں کو ملک کا مالک سمجھتے ہیں۔ کب تک میرے گلے پر یہ چھری رہے گی؟ کل اس کا نتیجہ کیا ہکا؟ ہم غریب سے غریب تر ہوتے چلے گئے۔ ٹھاکر ہم بہت دلکھی لوگ ہیں۔ جب منرو نے حملہ کیا ہمرے پاہی یا صیئن، یا صیئن کہہ کر وہ تجھے اور اڑتے تھے۔ اس طرح ہم نے فرنگیوں سے جنگ کی، مگر اس کا کچھ فائدہ نہیں، مقابلے کا کوئی فائدہ نہیں، پر اب ہمارے پاس کمپنی کے خزانے میں دینے کے لیے اور کچھ باقی نہیں رہ گیا۔“ وہ خاموش ہو گیا۔ نیلمبر چپ چاپ بیٹھا چراغ کی لوڈ پختار ہا۔ دوسراے حلقة میں چند کسان بیٹھے نواب سعادت علی خاں مرحوم کی خوش انتظامی کا تذکرہ کر رہے تھے جنہوں نے اپنے دور حکومت میں ملک کی گزری بنادی تھی، مگر شاہ زمن

بچارے اب کیا کر سکتے ہیں۔ اس کے بس میں کچھ نہیں۔” ۔۔۔ وہ کہہ رہے تھے۔

چراغ کی لوہوا میں جھلما لایا کی۔ نیلمبر دیوار سے پیٹھ لگا کر بینہ گیا۔ چاندنی رات تھی۔ منڈیر پر بیٹھے چند نوجوانوں نے برہا گانا شروع کر دیا۔

نیلمبر نے دیکھا کہ اس ملک کا بچہ بچہ، بوڑھا جوان، ہندو مسلمان اپنے بادشاہ پر جان چھڑ کتا تھا۔ جوگی، جس نے اپنے باپ بینی بہادر کا قصہ اسے سنایا، اسے بھی یہاں کے بادشاہ یا اس حکومت سے نفرت نہیں تھی، وہ تو غالباً شجاع الدولہ سے بھی خفافہ تھا۔ جس نے اس کے باپ کو انداز کروایا۔ اس کا محض یہ خیال تھا کہ دنیا میا جائی ہے اور اس میں یہی کچھ ہوا کرتا ہے، دوسرے یہ کہ ملک خدا کا تھا اور حکم بادشاہ کا اور بادشاہ کی اطاعت سب کا دھرم تھا۔ یہ سب لوگ اپنے بادشاہوں پر عاشق تھے، ہر زبان پر آصف الدولہ اور سعادت علی خان کے قصے تھے۔ آصف جس نے اپنی سخاوت سے کہاروں کو پالکیوں پر سوار کرا دیا اور سعادت جس نے حسن انتظام سے ملک کے خالی خزانوں کو دوبارہ پر کر دیا اور یہ سب لوگ، او وھ کے یہ سارے باشندے، جن سے نیلمبر ملا، فرنگی سے شدید نفرت کرتے تھے۔

کلکتے واپس پہنچ کر وہ پھر اپنی جانی بوجھی مانوس دنیا میں کھو گیا۔ فتر، کتابیں، انگریزی اور بنگالی اخبار، نیلمبر، وہ شنیلا سے ملنے دھرم تله گیا مگر وہاں پہنچ کر اسے

معلوم ہوا کہ وہ مرچکی ہے۔ برسات کے زمانے میں وہ پوچا کے لیے کالی گھاث جا رہی تھی، اسے سانپ نے کانا اور وہ مرگئی۔ سرل صاحب منفصل میں دورے پر گئے ہوئے تھے۔

نیلمبر نے اپنے برآمدے میں لوٹ کر سیتیں پائیں نکالی اور یہ پ جلا کر پھر ڈکشنری پر جھک گیا، مگر اب اس کا دل ملازمت میں نہیں لگ رہا تھا۔ مانک تلہ میں اس کے گھر سے ذرا فاصلے پر ایک بڑا خوبصورت گارڈن ہاؤس تھا۔۔۔ اس کے باعث میں پیچی کے درخت تھے اور یہاں بہت سے نوجوانوں کا مجتمع لگتا تھا، اس جگہ پر رام موہن بابو رہتے تھے۔

ایک روز وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ رام موہن بابو کا لیکچر سننے گیا۔ ندہب کے متعلق اس کے ذہن میں جوا بھینیں تھیں ان میں اضافہ ہو گیا۔ اب وہ کالی گھاث نہ جاتا، گھر میں بیٹھا بیٹھا سوچا کرتا: کیا سیرام پور والے ٹھیک کہتے ہیں؟ کیا رام موہن بابو صحیح راستے پر ہیں؟ کون کہہ سنتا ہے کون صحیح ہے کون غلط۔ ان سوالات سے جھنجھلا کر اس نے طے کر لیا کہ جب تک وہ خود بہت اچھی طرح مطالعہ نہ کر لے خود کوئی فیصلہ نہیں کرے گا۔ کمپنی بہادر کی ملازمت سے استغفاری دے کرو وہ ہندو کالج میں داخل ہو گیا، اسی کالج میں شہر کے ایک ریس پنس دوار کا ناتھ ہیگور کا لڑکا دیوندر ناتھ بھی پڑھتا تھا، وہ دونوں کلاس کے بعد اکٹھے بیٹھ کر مغربی فلسفے پر تبادلہ خیالات کرتے۔ خدا اور روح کی کھوچ لگاتے۔ دیوندر ناتھ میں ساری صوفیوں والی خاصیتیں تھیں جو نیلمبر کو بڑی دلچسپ معلوم ہوتیں۔ شام کو وہ رام موہن رائے کے گھر جا کر ان کی محفل میں شامل ہوتے اور عالموں فاضلوں کی

گفتگو سنتے یا موحدانہ بھجن گاتے یا نیلمبر دیوندرنا تھے سے حافظ کی غز لیں سنتا۔

جس سال نیلمبر دت نے لی۔ اے کیا اسی سال سے وہ رام موہن رائے کے برہمو سماج کا بڑا جوشیا اور سرگرم کارکن بن چکا تھا، جب ہی ایک روز اس نے اخبار میں پڑھا کہ سرسرل ہاؤڑا ایشلے کافائی گرجانے سے انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت ان کی میم صاحبہ، لیڈی ایشلے، جن سے انہوں نے صرف تین سال قبل شادی کی تھی مع انپنے دو سالہ اٹھ کے کے دارجلنگ گئی ہوئی تھیں۔

سرل کو بہار کے ایک اداس اور اجنبی ڈاک بنگے میں موت آئی، وہ دورہ کر کے لوٹا تھا اور بوٹا تار کر آرام کری پر لیٹا تھا۔ اسی وقت ہر کارے نے اسے اس کی بد مزاج، مغرور اور خاصی بد صورت بیوی کا خط لا کر دیا تھا جس میں اس نے دارجلنگ کی سوسائٹی کی تازہ خبریں لکھی تھیں اور یہ لکھا تھا کہ نخا سرل اب بہت شیطان ہو گیا ہے، آج اس نے ایک قلی کو اپنی نسخی سی چھڑی سے خوب پیا۔ خط پڑھنے کے بعد سرل نے اخباروں کے پلنڈے کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا یا کیا ایک اسے محسوس ہوا کہ وہ مر نے والا ہے، اس نے اپنے چوبدار کو آواز دینی چاہی مگر اس کی زبان میں لکھت آچکی تھی۔ دوسرے لمحے وہ ختم ہو گیا۔

کلکتہ کے اخباروں میں اس کے متعلق مضمون لکھے گئے، اس کی سوانح عمری شائع ہوئی۔ برطانیہ اور ہندوستان کی اس نے جو خدمات کی تھیں ان کا منفصل تذکرہ مضامین میں کیا گیا۔ اپنی عمر کے چالیس سال اس نے بنگال میں گزارے تھے۔ بنگال ایشیا نک سوسائٹی نے اس کی یاد میں خاص جلسہ کیا۔ کالجوں میں اس پر تقریریں ہوئیں، اس کے پندرہ دن بعد لوگ اس کو بھول گئے۔

لیڈی لیشلے، جو مرد راس کے چیف جسٹس کی بہن تھی اور شراب بہت پیتی تھی، اپنے اٹر کے سرل کو لے کر سارے ساز و سامان کے ساتھ انگلستان چلی گئی۔ سرل مرتے وقت لاکھوں کروڑوں کا آدمی تھا، اس کا روپیہ سُنی میں بھی لگا تھا اور کلکتے میں بھی۔ بڑے ہو کر اس کے بیٹے سرل ایڈون ڈیرک لیشلے نے اپنے باپ کے نامے ہوئے روپے سے زبردست کار و بار شروع کیا جس کی شان میں جنوبی امریکہ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ سلطنت برطانیہ اب ساری دنیا پر چھا چکی تھی۔ بہرما میں ٹین کی کانیں تھیں، ملایا میں ربوڑے کے جنگلات، چین میں افیم کی تجارت۔

ہندوستان ۱۸۵۷ء کے بعد اب باضابطہ طور پر وکٹوریہ کی ایمپائر میں شامل ہو چکا تھا، سارا مشرق اب مرحوم سرل ہاورد لیشلے کے بیٹے لا رڈ سرل ڈیرک ایڈون لیشلے کا تھا۔

لیڈی ڈوف

انقلام - حصہ اول

ایک دن پروفیسر گوم نیلمبر دت بند گھوڑا گاڑی سے اتر کر اپنے مکان کی
برساتی میں داخل ہوئے تو مالی نے ان کو اطلاع دی کہ میا بر ج والے نواب
صاحب آپ سے ملنے آئے تھے، بڑی دری آپ کی راہ دیکھا کیے، ابھی ابھی واپس
گئے ہیں۔ نیلمبر اٹے پاؤں باہر گئے اور سڑک پر آ کر جلدی سے چاروں اور دیکھنے
لگے۔ سامنے ایک بوڑھا سفید جامدائی کا انگر کھا پہنے جریب شیکتا سڑک کے
کنارے کنارے چلا جاتا تھا۔ نیلمبر دت نے لپک کر اسے جالیا۔

”اخاہ میاں نیلمبر صاحب“ بوڑھے نے خوشی سے کھل کر کہا۔ ”ہمارا خیال تھا
آپ سے ملاقات نہ ہو پائے گی۔“

”کیوں نواب صاحب، خیریت تو ہے۔ آپ سے تو یوں بھی برس گز رجاتے
ہیں ملنا نہیں ہو پاتا، اب آئیئے چل کر دو گھنٹی اندر بیٹھیے۔ میری نواسی سکول کے
بوڑھنگ ہاؤس سے لوٹ کر آئی ہے، آپ نے شاید ابھی تک اسے نہیں دیکھا۔“
نواب صاحب کا ہاتھ پکڑ کر وہ ان کو مکان کے اندر لے آئے۔

”اچھا میاں۔“ نواب صاحب نے ڈرائیور میں آ کر صوفے پر بیٹھتے
ہوئے کہا۔ ”تم کو دیکھ لیا، تمہارے بچوں کو دیکھ لوں، پھر جانے زندہ لوٹا نصیب ہو

نہ ہو۔“

”کیوں۔ کہاں کاقصد ہے۔ لکھنؤ۔؟“

”کربلا یہ معلمی جارہا ہوں۔ خداو ہیں یہ مٹی عزیز کرے، یہاں اب کیا رکھا ہے۔“ ان کی آواز بھرائی اور انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے مشہدی رومال نکال کر آنسو خشک کیے۔

نیلمبر دت ان کو محبت سے دیکھتے رہے۔ ملازم چائے لے کر آیا۔ ڈرائیگ روم ہمعصر و کٹورین طرز میں سجا ہوا تھا۔ دیواروں پر ان گنت تصویریں تھیں۔ مناظر اور فوٹو گراف، موتیوں کے پردے دروازوں پر پڑے تھے۔ فرن اور پام کے پودے پتیل کے گلوں میں رکھے تھے۔ برائی کے کمرے میں پیانونچ رہا تھا۔ پیانو کی آواز یکخت نیلمبر دت کو بڑی اوس معلوم ہوئی، انہوں نے آواز دی: ”نیلما بیٹی، باجہ بند کرو اور یہاں آؤ، دیکھو تمہارے میٹا برجن والے چاچا آئے ہیں۔“

ایک پندرہ سالہ لڑکی اندر آئی، اس نے جھک کر نواب صاحب کے پاؤں چھوئے۔

”یہ میری نواسی ہے نواب صاحب، اسکوں ہی میں رہتی ہے۔“ وہ دھنڈلی آنکھوں سے اسے دیکھتے رہے۔ پندرہ سالہ لڑکی جو شادی کر کے گود میں بچھ کھلانے کے بجائے اسکوں میں انگریزی پڑھ رہی تھی اور ارگن باجہ بجائی تھی۔ نواب کمن نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے دریچے سے باہر نظر ڈالی۔ گلکتے کی روشنیاں چاروں طرف جگہاٹھی تھیں۔ شام کا اندر ہمراچھارہا تھا۔ نیلمبر دت ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے دونوں کے پاس مشترکہ موضوع گفتگو کوئی نہیں

تحاسوائے ماضی کے، مگر ماضی کی یاد کو نیلمہ دت کہاں تک گھسیت سکتے تھے، ان کے سامنے مستقبل تھا۔ نواب کمن کے پاس صرف ماضی تھا۔ وضع داری نجھانے کے لیے دنوں بڑے تپاک سے ایک دھرے سے ملتے تھے، جب لکھنؤ اجزا اور گلکتے میں مہاراجہ برداں کی کوئی آباد ہوئی نیا برج میں دھر لکھنؤ بسا یا گیا۔ اس وقت نواب کمن نے، جو سلطان عالم کے ساتھ یہاں آگئے تھے، نیلمہ دت کو ملاقات کے لیے بلوایا، وہ اس سے گلکتے کا مشہور اخبار نویس، بن چکا تھا۔ اس نے اب تک کئی کتابیں لکھ ڈالی تھیں اور وہ برہموسانج کے پلیٹ فارم کا شعلہ بیان مقرر تھا۔ نیلمہ ان سے پابندی سے سال میں دو ایک بار ضرور مل لیتا تھا، جب راجہ سریندر موہن یگور کے یہاں موسیقی کی تجدید کی بنا ڈالی گئی اور ملک بھر کے موسیقار گلکتے میں جمع ہوا شروع ہوئے اس وقت بھی نیلمہ نے نواب کمن کو یاد رکھا اور نئی نگیت کی محفلوں میں مدعا کرتا رہا۔

اب کروں میں یہ پروشن کر دیے گئے تھے۔ باہر گلیوں میں بارش کا پانی جمع ہو گیا تھا جن میں مینڈ کڑاتے تھے مکان کی بالائی منزل پر نیلمہ بابو کے بیٹے منور نجح دت کے یونیورسٹی کے ساتھی تھیزروں میں ان دنوں چند بہت اچھے اچھے ڈرامے اٹھ کرے گئے تھے۔ منور نجح کے دوست مائیکل محسودن نے ایک نیا کیمپبل میڈیکل اسکول میں ایک لڑکا کھڑکی میں بیٹھا ہار مو نیم بجارتا تھا۔

منور نجح تو روتا کی نئی انگریزی انظم پڑھ رہا تھا۔ ہار مو نیم کے سر اور لڑکوں کے قہقہوں اور مکالموں کی آوازیں نیچے ڈرائیگ روم تک پہنچ رہی تھیں۔

نواب صاحب جریب پر انگلیاں پھیرتے رہے۔ یہ ایک دوسرا زمانہ تھا، دوسرا عہد، یہ ۱۸۷۱ء تھا۔ دنیا بورڈھی ہو چکی تھی۔ نواب مال رضا کی دنیا۔ نیلمبر دت بھی ان ہی کے ہم عمر تھے مگر ان کی دنیا اب جوان ہو رہی تھی، یک لخت نواب کمن کو احساس ہوا کہ اس نئی دنیا میں ان کی کوئی جگہ نہیں۔ دارالسلطنت کے اس جدید ڈرائینگ روم میں بیٹھے وہ خود کو بے حد مصحتکے خیز نظر آئے۔

”نواب صاحب! منور بھن لکھنؤ کے کیونگ کانج میں قانون کا یک پھر ار ہو کر جا رہا ہے۔“ گوتم نیلمبر دت کی آوازان کے کانوں میں آئی۔ یہ آواز بھی کسی دوسرے کرے سے آ رہی تھی، وہ چونک پڑے۔ ”اچھا۔ اچھا۔ ما شاء اللہ سے۔ انہوں نے ہٹ بڑا کر کہا۔“ جائیں، سدھاریں، ان کو امام ضامن کی ضامنی میں ۔۔۔ دیا۔“ پھر وہ جریب کے سہارے اٹھے اور نیلمبر دت کو خدا حافظ کہہ کر ٹیکا بر ج لوٹ گئے۔

رات گھبری ہو چکی تھی۔ نیلمبر دت نواب کمن کے جانے کے بعد تھوڑی دیر ڈرائینگ روم میں ٹہلتے رہے، انہوں نے گھومنے والی الماریوں سے ایک کتاب نکال کر اس کی ورق گردانی کی، مگر اس میں بھی ان کا دل نہ لگا۔ انہوں نے چاروں طرف دیکھا، الماریوں میں ہر طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ اخباروں کے مجلد فائل، قانون کے رسائل، کمیٹیوں کی رپورٹیں اور قراردادیں۔ ہر طرف مسائل تھے اور مسائل کا حل انہوں نے پالیا تھا۔

مسائل کا حل انہوں نے پالیا تھا؟ نیلمبر دت کا دم گھٹنے سا لگا۔ ہوا بند تھی اور رات گرم تھی، باہر سڑکوں پر یہ مددھم مددھم ٹمٹمار ہے تھے۔ دفعتاً عروں البا اولکتہ

ان کو بے حد خوفناک معلوم ہوا، وہ گھبرا کر باہر برآمدے میں نکل آئے۔ ایسی ہی راتوں میں دلکھی روحوں کی پرواز کی سنسناہٹ سنائی دیتی ہے۔ آنکھن میں کیلے اور پام کے پتے ساکن کھڑے تھے۔ پختہ حوض کے کنارے ایک کتابم نامگوں میں سمیٹے سورہاتھا، اگر ان کو آواگوں میں یقین ہوتا تو شاید وہ سوچتے کہ یہ کتاب کسی کی دلکھی روح ہے، وہ برآمدے سے اتر کر گیندے کے کنارے کنارے ٹبلتے رہے۔ اوپر منور بجن کے کمرے میں خاموشی چھا چکی تھی۔ کیمپبل میڈیکل اسکول کا بڑا کا بھی تک درستچے میں بیٹھا تھا، وہ بھی ہار مونہم کے پردوں پر سر رکھ کر سوچ کا تھا۔ منور بجن کے کمرے سے جوزینہ باغ میں اترتا تھا اس کی آخری سیر ہی پر بیٹھا کوئی تو رولتا کی نئی انگریزی اظہم آہستہ آہستہ پڑھ رہا تھا۔ چانداب دت ہاؤس کے عین اوپر آچکا تھا۔

برآمدے میں لڑکوں کا ایک گروہ بیٹھا تو رولتا کی اظہم پر سر و ہن رہا تھا:
محبت اور روشی اور نغمے کو تمہاری تلاش ہے۔

روشنی قمر مزی آسمانوں پر موجود ہے

لغے لارک گا رہا ہے

محبت میرے دل میں ہے

ایک دھرم سے جدا

ہم فطرت کے مقصد کو کھور ہے ہیں

اپنی قسمت کو دھوکا دینے کے لیے ہم کیوں کوشش ہیں

میری محبت تمہاری روح کے لیے تخلیق کی گئی ہے

تمہارا حسن میری آنکھوں کے لیے

اب جاگ اٹھو

میں منتظر ہوں اور روتی ہوں

تم کہاں ہو

اس دھرتی پر ایک بے آسرا،

بیمار، بد صورت اور حیر

بچے کی طرح میں پیدا ہوئی

پیدائشی بد قسمت لڑکی ۔۔۔۔۔

ہر ایک نے مجھے ٹھکرایا ہے

پھر میرے ہونتوں سے ایک نالہ بلند ہوا:

خدا یا ۔۔۔۔۔

اور خدا نے جواب دیا:

گائے جا ۔۔۔۔۔ بے چاری لڑکی ۔۔۔۔۔ گائے جا ۔۔۔۔۔

نیلمبر دت مبہوت اس اظہم کو سنتے رہے۔ انہوں نے آواز پہچانی، یہ ان کے بیٹے کی آواز تھی۔ منور نجمن اور وہ آہستہ آہستہ رو رہا تھا، وہ جس نے کلکتہ یونیورسٹی کے فلسفہ اور منطق کے امتحانات میں سارے ریکارڈ توڑے تھے، جو اگلے ہفتے کیتھگ کالج کا پروفیسر ہو کر پر دلیس جانے والا تھا۔

نیلمبر دت مسکرائے۔ مبارک ہیں وہ لوگ، انہوں نے اپنے آپ سے کہا، جو محبت کر سکے۔ خواہ اس میں انہیں ناکامی ہی ہوئی ہو، پھر انہوں نے چاند کو دیکھا جو

دلبی ذوق

تیرتا تیرتا دت ہاؤس کے عین مقابل میں آ چکا تھا۔ اس کی کرنیں حوض کے پانی میں منعکس تھیں۔ چاند نے ان کو بہت سی کہانیاں سنائیں، وہ پورن ماشی کی رات تھی۔

اس رات چیت پور روڈ سے واپس جانے کے بعد نواب ابوالمحصور مال رضا بہادر جب گارڈن ریچ پہنچے، جہاں میٹا بر ج میں ان کا مکان تھا، تو اپنے پلنگ پر لیٹتھے ہوئے ان کو خیال آیا: کیسی عجیب بات ہے کہ انسان صرف ایک مرتبہ دنیا میں آتا ہے اور پھر ختم ہو جاتا ہے۔ زندگی صرف ایک ہی دفعہ زندہ رہنے کے لیے ملتی ہے۔ انسان مر جاتا ہے، پھر کبھی اس دنیا کو نہیں دیکھ پاتا جیسے شاہ زمکن غازی الدین حیدر مرے تھے اور نصیر الدین حیدر اور محمد علی اور امجد علی، ان سب کو مرتے نواب کمن نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ لوگ، جو اودھ پوری کے راجہ تھے، یہ سب موت آئی تو پڑ سے ختم ہو گئے اور بے چارے سلطان عالم و اجد علی۔ پڑوس کی رادھا منزل میں اندر سجا منعقد کروائے خود کو یقین دلانے کی کوشش کرتے تھے کہ ابھی قیصر باغ ہی میں موجود ہیں، ایک روز وہ بھی ختم ہو جائیں گے۔ تخت شاہی ہو یا غریب الوطنی، انتہائی سرست ہو یا شدید رنج و غم، موت آ کر سارا قصہ ہی چکا دیتی ہے، جانے مر نے کے بعد کیا حشر ہوتا ہوگا۔ فشار قبر اور منکر نکیر اور اور۔۔۔ یہ سب سوچتے سوچتے نواب کمن کو بے حد ڈر معلوم ہوا۔ انہوں نے پلنگ سے انھنا چاہا مگر پتھر کو گر گئے۔

کیونکہ کربلاعے معلی کا سفر کرنے کے بجائے نواب مال رضا سفر آخرت

اختیار کر چکے تھے۔

۳۲

نواب صدر جنگ سے لے کر سلطان عالم تک نو حکمرانوں نے اور دھپوری پر راج کیا۔ سلطان عالم کے زمانے میں سلیمان صاحب آیا۔ صدر جنگ نے اپنی طاقت کے بل پر اس سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی، جودلی کے زوال کے بعد ہندوستان کی سب سے شامدار سلطنت تھی، جس کے بادشاہ فرانس کے لوئی چهار دہم سے زیادہ جاہ و جلال والے تھے۔ سلیمان صاحب چونکہ ان سب سے طاقتور تھا اس نے پل کی پل میں ایک اتنی بڑی پھونک ماری کہ یہ ساری دہیپ مالا جسم زدن میں بجھ گئی۔ ہیلوک جیتا۔ سلطان عالم ہارا۔ لکھنؤ کی اندر اپوری اجزٹ گئی۔ نوٹنگی ختم ہو چکی۔ قیصر باغ کی چاندی والی بارہ دری میں بزر پری کا ناج، عیش باغ کے میلے، محروم اور رام لیما کے ہنگامے۔ دل کشا محل اب سنسان پڑا ہے۔ ہیملی گارڈ کو تو پوں نے اڑا دیا۔ حضرت گنج میں انگریزی دکانیں ہیں۔ امین آباد میں کانچ اور اسکول۔ اخبار چھپ رہے ہیں۔ ٹیلیگراف کے تاریخ بھانتے ہیں۔ ایووصیا کے رام چندر کی گدی لٹ چکی۔ صحیح ہوئی اور آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ یہ سب عمر و عیار کا طلس تھا، آخری ایک شروع ہونے سے پہلے ہی راجہ اندر کو مع اس کے اکھاڑے کے دیلوک سے شہر بدر کر دیا گیا۔

کلکتے کے پروفسر نیلمبر دت اپنے بیٹے سے ملنے کی غرض سے لکھنؤ آئے ہوئے

تھے۔ ریل گاڑی جب آئیشن پر پہنچی اور وہ فٹن پر بیٹھ کر باہر آئے تو انہوں نے دیکھا کہ نقشہ ہی بدلا ہوا تھا، وہ آج سے اڑتا لیس سال قبل ۱۸۲۳ء میں لکھنؤ آئے تھے، وہ شاہی کا لکھنؤ تھا۔ یہ انگریزی کا لکھنؤ ہے۔ یہاں دھومی بیگ کو توال کے بجائے انگریز ڈپٹی کمشنر کا راج ہے جو سعادت علی خاں کی نور بخش کوٹھی میں بر اجتا ہے، یہاں پر سعادت علی خاں کی حیات بخش کوٹھی اب ٹینکس ہاؤس کہلاتی ہے، اس میں کمشنر ہتا ہے۔ قیصر باغ میں کینگ کانچ ہے۔ جس میں گلکتہ کا منور بخن دست قانون پر لیکھ رہتا ہے۔ شہر کی گلیاں اور محلے وہی ہیں لیکن زمانہ بدل گیا۔ نخاں چوک، معالی خاں کی سرائے، پاماناہ، چوپٹیاں، چوکھی، گولہ گنج، بارود خانہ، سعادت گنج، ڈالی گنج، حسین گنج۔ ساری جگہیں وہیں ہیں۔ مکان، انسان مگر وقت دوسرا ہے۔ تاریک محلوں، شکستہ مکانوں میں انقلاب کے مارے ہوئے لوگ سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ دولت مند لٹ گئے، غریب امیر ہو گئے۔ باغیوں کو چانسیاں اور وفاداروں کو تعلقے ملے۔ اختر پیا جب سے پر دیں سدھارے اب تو ان کے لیے روتے روتے آنسو بھی خشک ہو گئے، یہ اور ہم پوری ہے۔ یہاں سے رام کو بھی اسی طرح بن بس ملا تھا۔

فٹن آئیشن سے شہر کی طرف چلی۔ کوچبان نے سر پر انگوچھا لپیٹ کر نیلمبر دت کو دیکھا: ”بابو صاحب، پچھے سائیں بیٹھا ہے، اسے اوپر بلاؤ۔ بڑھو ہے گر کر مر جائے گا۔“

”ہاں بلاؤ۔“ انہوں نے جواب دیا۔ پچھے سے ایک بوڑھا کو دکر کوچ بکس پر آ گیا۔ فٹن پھر روانہ ہوئی۔

”بابو صاحب کلکتے سے تشریف لاوت ہیں۔“

”ہاں“

”ہم بھی سوچتے ہیں کلکتے چلے جائیں، یہاں اب جی نہیں گلتا۔“ نوجوان نے کہا۔

”کوہے؟“ بوڑھے سائیس نے نوجوان کے کان کے قریب منہ لے جا کر بڑے رازدار انداز میں پوچھا۔

”کلکتے کے بابو۔۔۔“ نوجوان نے، جس کا نام شمجو تھا، چلا کر کہا۔

”کلکتے۔۔۔؟“ بوڑھے نے، جس کا نام گنگادین تھا اور جو اونچا سنتا تھا، غیر یقینی انداز میں دہرایا اور پھر مژ کردہندی آنکھوں سے بنگالی بوڑھے کو دیکھا۔

”ہاں ہاں۔ سمجھ میں نہیں آوا؟“ شمجو نے کہا۔

”بابو صاحب“ گنگادین نے مژ کر بڑی حاجت سے نیلمبر دت سے کہا۔ ”ہم کا بھی کلکتے پڑھائے دیو۔“

نیلمبر دت کی سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی۔ نوجوان نے ہنس کر بوڑھے سے کہا: ”بابو صاحب تمہری بولی نہیں سمجھتے، اردو میں اپنا مطلب بیان کرو۔“

بوڑھے نے بہت سنبھل کر کہا: ”کھداوند، ہم کو کلکتے پڑھا دیجئے، وہاں ہمرے بادشاہ رہت ہیں۔“

نوجوان ہنس پڑا: ”حضور بابا کی بات پر دصیان مت دیجئے۔ یہ جو مسافر ریل سے اترتا ہے اس سے یہی بات کہتے ہیں، میاں مسافر تم کلکتے سے آئے ہو۔ ہم کو بھی وہیں پہنچا دو۔ پوچھو، ہمرے بادشاہ خود جو کھم میں ہیں، اوپر سے یہ بھی پہنچیں۔“

جائیں۔ جیسے بس انہی کی کسر ہے۔“

نیلمبر دت خاموش رہے۔ فتن اب امین آباد کی طرف بڑھ رہی تھی۔

”سرکار پہا بھی نکھلو تشریف لائے ہیں۔“ نوجوان نے پوچھا۔

”ہیں؟“ نیلمبر دت نے چونک کر پوچھا، ”ہاں“

”کب؟“

”بہت زمانہ گز راجب تم پیدا نہیں ہوئے تھے۔ غازی الدین حیدر کے وقت میں۔“

”بابا۔“ کوچوان نے پھر چلا کر بوڑھے سائیمس کے کان میں کہا، ”بابو صاحب تمرے گاہی الدین حیدر کے زمانے میں آئے رہے۔“

پھر کوچوان نیلمبر دت سے مخاطب ہوا: ”بابا کہا کرت ہیں کہ گاہی الدین حیدر کے چوبدار تھے۔ اس سے پہلے شکر مہانگتے تھے مگر کہتے ہیں کہ میں پہنچ کر انہوں نے بڑے اچھے دن دیکھے۔ سارے بادشاہوں کی ڈیورٹی پر نوکری کی ہے، سلطان عالم ان کو بہت مانتے تھے۔“

”کھداوند“ گناہ دین نے کہا، ”سلطان عالم کو آپ نے دیکھا ہے؟ کیسے ہیں؟ خیریت سے ہیں؟“ پھر وہ بچوں کی طرح رو نے لگا۔

نیلمبر دت بہت متاثر ہوئے، ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ لوگ اس قدر جذباتی بھی ہو سکتے ہیں۔ مدتوں وہ محض عقل کے پچاری رہے تھے، اب آن کر انہوں نے دل کی عظمت کو سراہا۔ فتن اب امین آباد کے چورا ہے پہنچ چکی تھی۔

دفعتاً کوچوان نے پکارا: ”ارے سامنے سے ہتھی نہیں بوڑھیا، کا ہے اپنی جان

کی لاگو ہوت۔ ”اس نے باگیں کھینچ کر فٹن روک لی۔ ایک ضعینہ دلائی میں لپٹی ہوئی سامنے آگئی اور اس نے ہاتھ پھیلا کر میکاگئی انداز میں اپے فقرے دہرانے شروع کر دیے: جناب امیر کا صدقہ، خدا تمہیں سو اغم حسین کے اور کوئی غم نہ دے۔

نیلمبر دت فٹن کے کشنوں سے پینچھے لگائے بیٹھے سوچ رہے تھے: لکھنؤ کیا بوڑھوں کا شہر ہے؟ یہاں کے جوان کہاں چلے گئے؟ ان کو معلوم نہ تھا کہ یہاں کے جوان ملکہ حضرت محل کے لیے اڑتے ہوئے مارے گئے تھے اور جواباتی تھے قبل از وقت عمر رسیدہ ہو چکے تھے، مگر زندگی کا ہنگامہ بدستور جاری تھا۔ امین آباد روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ پھول بیچنے والے صدائیں لگا رہے تھے۔ لوگوں کا جم غیر چاروں طرف موجود ہوتا تھا۔ شام اور دھنڈہ بدستور بزم آرا تھی۔ فقیر نی اسی طرح آنکھیں بند کیے کھڑی دہراتی رہی: خدا سو اغم حسین کے اور کوئی غم نہ دے۔ ایک لکا خالی ایک لکا۔

نیلمبر دت چونک پڑے۔
یہ آواز جانی پچھائی تھی، یہ آواز سینکڑوں ہزاروں برس کا سفر طے کرتی۔ ان کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ اس آواز نے بڑی خوبصورت باتیں کی تھیں۔ راگ سنائے تھے قبیلے لگائے تھے۔

انہوں نے ہڑ بڑا کر عینک درست کی اور فٹن سے باہر جھانکا مگر سڑک کے کنارے تو وہی فقیر نی کھڑی تھی جس نے اودے رنگ کی بوسیدہ دلائی اوڑھ رکھی تھی۔

”اے کچھ مت دیجئے گا خداوند۔“ شمجنے کوچ بکس پر سے جھک کر آہستہ سے مودبائے انداز میں کہا، ”اے کوئین کی لوت ہے، جو ملتا ہے اس کی کوئین کھا جاتی ہے نیک بخت۔“

نیلمبر دت نے اپنے رعشہ دار ہاتھوں سے ایک روپیہ جیب سے نال کرفقیرنی کی پھیلی ہوئی تھیلی پر رکھ دیا۔

فقیرنی نے اپنی چند ہمی چند ہمی آنکھوں سے اس بنگالی بوڑھے کو دیکھا جس کی لمبی سفید داڑھی تھی اور جو سفید برائق دھوتی پہنے اگرئی شال میں لپٹانا نگ پٹانا نگ رکھے فتن میں بیٹھا تھا۔

بڑھیا کو نیلمبر دت نے پہچانا۔۔۔

بڑھیا چمپا تھی۔

روپیہ مٹھی میں مضبوطی سے بند کرنے کے بعد ایک لحظہ کے لیے اے بڑی ہوئی، یہ کیسا دیا لوریمیں ہے جو نکامگتو تو چاندی کا روپیہ دتا ہے۔ سکے کو اپنی گرفت میں لے کر فقیرنی نے پھر رٹے ہوئے انداز میں دہرانا شروع کر دیا: سرکار، غریب پرور۔۔۔ آپ کو پوتوں، نواسوں کی خوشیاں دیکھنی نصیب ہوں۔ میں خدر کی ماری ہوں، بندہ نواز۔ شاہی میں میرے دروازے پر ہاتھی جھومتا تھا، اب کوئی دوروئی کا سہارا دینے والا نہیں۔ اللہ آپ کو۔۔۔ شمجنے گھوڑے کو چاک کا گایا۔ فتن آگے بڑھ گئی۔ شمجنے، جس کی دنیا کے واقعات پر رائے زنی کرنے کی عادت بہت پختہ ہو چکی تھی، نہس کر کہنے لگا:

”بڑھیا کی باتیں۔ درو جے پر ہاتھی جھومتا تھا، یہ گردی کا یار لوگوں کو اچھا بہانہ

مل گیا ہے جس سے سنو یہی کہتا ہے میں خدر سے پہلے یوں طریقہ تھا، فلاما تھا، ڈھمکا تھا۔ بابا ہی کو دیکھ لجئے، بابو صاحب، گردی سے پہلے بادشاہ کے خاص چوبدار تھے۔ اب سائیسی کرتے ہیں۔ ”وہ طفر سے ہنسا اور اسی طرح انہمار خیال کرتا ہوا موئی محل برج کی سمت رواں رہا۔

چپا نے روپے کو شام کے اندر ہیرے میں کئی بار الٹ پٹ کر دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتی ایک تاریک گلی میں مڑ گئی جہاں ایک زمین دوز دکان میں کوئی فروخت ہوتی تھی اور جہاں بھنگڑیے اور مرد کیے گھننوں میں سردیے بیٹھے تھے۔

اندر ہیرے نے سارے شہر کو اپنے آنچل میں سمیٹ لیا۔ جس وقت فتنہ امین آباد کے چورا ہے سے آگے بڑھی۔ نیلمبر دت نے ایک بار پچھے مژکر نظر ڈالی۔ چپا سڑک کے کنارے دلائی میں لپٹی کھڑی ان کا دیا ہوا روپیہ لیپ کی روشنی میں الٹ پٹ کر دیکھ رہی تھی جیسے اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا ہو۔ اس کے بال چاندی کی طرح چمک رہے تھے اور اس کے چہرے پر ان گنت جھریاں تھیں، اس کی دلائی میں جا بجا پوند لگے تھے۔ کہیں کہیں پر گوکھر اور بنت بھگی رہ گئی تھی جس کے تار انکھے ہوئے تھے۔

انہوں نے فتنہ کے کشنوں سے پیٹھ لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

کیونکہ گوتم نیلمبر نے ویشاوی کی امباپاٹی کو دیکھ لیا تھا۔

گومتی کے اس پارشاہ نجف کے مقابل میں سنگھاڑے والی کوٹھی تھی جس کو بابو منور نجف دت نے اپنے رہنے کے لیے کرائے پر لے رکھا تھا۔ فتنہ موئی محل کے پل پر سے گزر کر دریا کے کنارے والی کچی سڑک پر مڑ گئی اور کچھ دیر بعد سنگھاڑے

والی کوٹھی کے پھانک میں داخل ہوئی۔

اس رات جب منور بجن اپنے کمرے میں جا کر سو گیا اور مالک مکان کے کمروں میں یہ پنگل کر دیے گئے تب نیمبر دت برآمدے میں آ کر، جس کی سیڑھیاں ندی میں اترنی تھیں، بہت دیر تک ندی کے بہتے ہوئے پانی کو دیکھتے رہے۔ رات اب بھیگ چکی تھی، لیکن کمرے میں جا کر سونے کے بجائے وہ باہر نکل آئے اور گومتی کے کنارے کنارے سڑک پر چلنے لگے۔ چاروں اور مکمل سنانا چھایا ہوا تھا، ان کے پیچھے پیچھے بھوتوں کا ایک پورا جلوس ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ آگے آگے پچھل پیریاں رقصائ تھیں۔ سامنے کچھ دور پر پل کے نیچے کشتیاں بندھی تھیں اور چندی کا مندر نظر آ رہا تھا۔ درختوں پر سرخ آنکھوں والے بندروں رہے تھے، یہ بہت جانے پہچانے بھوت تھے جو ان کے پیچھے دانت نکوستے، لنگڑاتے اپھلتے کو دتے چلے آ رہے تھے۔

سارے شاہان اودھ، سعادت علی خاں اور جان بیلی، نصیر الدین حیدر اور ان کا یورپین جام اور قدسیہ محل اور بوڑھے محمد علی شاہ۔ سرل ہا اور ڈیشلے اور شنیلا۔ لارڈ میکالے اور بیشپ ہسپر۔ ان انگریز بھوتوں کو بھی وہ خوب جانتا تھا، جب زندہ تھے اور مر کر اب جانے کس جہنم میں گئے ہوں گے، مگر وہ تو بدستور سر پر سوار تھے۔ دنیا کا عروج وزوال گوتم نے دیکھ لیا تھا۔ اب اسے کون ساتماشہ دیکھنا باتی تھا۔ ندی روائ تھی۔ کنارے پر مکان بنے تھے۔ ان مکانوں کے نام تھے۔ ان مکانوں میں انسان سور ہے تھے۔ ان انسانوں کے بھی نام تھے۔ مکان پتھر کے بنے تھے۔ ساحل پر پتھر بکھرے تھے۔ وقت روائ تھا۔ وقت پتھر میں نحمد تھا۔ مرگھٹ میں

شعلے بلند ہو رہے تھے، آج کی رات جانے کون کون مرا ہوگا۔
نیلمبر دت آگے بڑھتے رہے۔

سامنے مر گھٹ تھا۔ مر گھٹ میں کالی ناج رہی تھی۔ کالی جو ساری کائنات کو اس کے خاتمے پر اپنے میں سمیٹ لیتی ہے، صرف وہی انسان اس سے خوفزدہ ہوئے بغیر اس کی عبادت کر ستا ہے جو اپنی خواہشوں کو ختم کر کے اس کی ذات میں فنا ہو سکے۔

مر گھٹ۔۔۔ یہاں ساری خواہشیں حل کر جسم ہو جاتیں ہیں۔۔۔ اور کالی۔۔۔ جو ذہن اور گویا تی سے ماوراء ساری جاندار کائنات کو فی میں تبدیل کر دیتی ہے، وہ۔۔۔ جو سو نیا کو پورا بناتی ہے۔ پورا۔۔۔ جو روشنی اور سکون ہے۔
کالی۔۔۔ جس کا لباس سماں وی ہے، وہ وحشت ہے کیونکہ لاحدہ ود ہے۔
عظمیں طاقت ہے۔ مایا سے بلند تر ہے کیونکہ خود مایا بن کر دنیا کی تخلیق کرتی ہے۔
مر گھٹ میں کالی، شیو کے سفید جسم پر کھڑی ہے۔

شیو۔۔۔ جو سفید ہے کیونکہ سروپ ہے۔ روشنی بخشتا ہے اور مایا اور خود پرستی کے عفریتوں کو تباہ کرتا ہے، وہ ساکت ہے کیونکہ تبدیلی سے ماورا ہے۔ کالی اس کی تبدیلی کی مظہر ہے۔

شیو۔۔۔ جو تبدیل نہیں ہوتا لیکن ہر تغیر میں موجود ہے۔ شعلوں کے دھویں میں کالی رقصائی ہے، وہ کالی ہے۔ تارا۔۔۔ دھوم و قی، وہ شانت رس کا ناج ناج رہی ہے اور کائنات جے کے نفرے لگا رہی ہے۔

نیلمبر دت جس نے کالی کوستی اور گوری اور جوگ مایا کے روپ میں دیکھا تھا،

انہوں نے مرگھٹ پر نظر ڈالی اور اسے پہچانا۔

کیونکہ مرگھٹ حیات کی اصلیت تھی۔

وہ کچھ دیر پل پر کھڑے مدھم شعلوں کو دیکھتے رہے، پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سنگھاڑے والی کوٹھی کی طرف واپس لوٹ آئے۔

صحح کے چار بجے تو گھر کی بی بی بستر سے اٹھیں اور انہوں نے جا کر مہری کو جگایا جو ایک طرف کو فرش پر چٹائی بچھائے سورہی تھی۔ ”چاء کا پانی رکھ دیو۔ چھٹی کا اسکول آج چھبجے سے لگیے۔“ مہری آنکھیں ملتی ہوئی اٹھی اور بالوں کا جوڑ اپیٹی پانی کے نل کی سمت چلی۔ اب وہ غسل خانوں میں جگدگاتی پیتل کی بالٹیاں پانی سے بھر کر رکھنے لگی۔ بڑے صاحب اور بھین صاحب کے شیوکا پانی پیالیوں میں لگائے گی، پھر چاء کا انتظام کرے گی۔

نیچے باغ میں مولسری کے درختوں پر چڑیوں نے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ دور پہنچی سڑک پر سے ایک بیل گاڑی چڑخ چوں کرتی گزر رہی تھی۔ دودھ والا المونیم کی بالٹیاں سائیکل کے ہینڈل سے لٹکائے لپکا ہوا بستی کی اور چلا جاتا تھا۔ گھر کی بی بی پوچا کے لیے ٹھا کر دوارے میں چلی گئیں۔ ٹھا کر دوارہ دوسرا منزل پر پر مشرق کے رخ کی برجی میں تھا۔ کمرے میں جس تھا اور برسات کی گرمی۔ دروازہ کھلا تو اندر کے اندر گھرے میں گوپی نا تھوٹھا کر حسب معمول اپنی خالی آنکھوں سے سامنے خلا میں دیکھتے نظر آئے، ان کی کیسری پوشاک پر جھوٹا گوٹا لگا تھا اور ان کے مکث میں مور کا ایک پر تھا جو ذرا ٹیز رہا ہو رہا تھا اور وہ اسی طرح ایک ٹانگ پر دوسرا ٹانگ رکھے بانسری اٹھائے پیتل کے چھوٹے سے مندر میں

کھڑے تھے۔ ساکت، نجمد، لاعلق، ان کے چہرے پر بڑی بھیانک سی مسکراہٹ تھی۔ کمرے میں پھر جنجنوار ہے تھے۔ اس برجی کے مقابل میں برآمدے کے سرے پر دوسری برجی تھی۔ برآمدے میں دونوں لڑکیاں سورہی تھیں۔ برآمدے کی چھت میں سیاہ رنگ کے شہتیر تھے۔ فرش جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا۔

پرانی وضع کی مسہریاں اور سخت چاروں طرف بچھے تھے۔ تلسی کا منقش گملہ عین وسط میں رکھا تھا۔ سامنے کی دیوار پر کسی موٹے سرمنڈے مہنت کی تصویر آؤزیماں تھی۔ برآمدے کے سرے پر دوسری برجی، جو چھتر منزل کے رخ پر تھی، اس میں لڑکیوں کا بھائی سوتا تھا، وہ مزرے سے ہلکی دالی تانے کھڑکی کے قریب سنارہا تھا۔ قریب میبل فین گھوون گھوون کر رہا تھا۔ برجی کے آٹھوں دروازے چوپٹ کھلے ہوئے تھے اور بڑی سخنندی ہوا اندرا آرہی تھی۔ کمرہ کافی وسیع تھا۔ الماریوں میں ڈھیروں کتابیں رکھی تھیں۔ فارسی، اردو اور انگریزی کی کتابیں۔ بلنگ کے نزویک والی میز پر دیوان غالب رکھا تھا اور کبیر کی گرنجھادی اور ایلیٹ کاویٹ لینڈ۔ ایک طرف کو اردو کے نئے ترقی پسند رسالوں کے انبار لگے تھے اور پانیر اور لیدر کے پرچے اور انگریزی کے ادبی رسائل جو کلکتے اور سبیٹی سے نکلتے تھے اور وشو اپھارتی میگزین دیواروں پر نہ لال بوس اور اور انیندرا نا تھے یگور اور حستیگر اور ایل ایم سین اور روی و رما کے واٹر کلر ز کے پرنٹ تھے۔ کمرے میں سخت بے ترتیب تھی۔ ٹینس کے ریکٹ پر نایاں پڑی تھیں۔ گیند کے ڈبوں میں موزے ٹھنکے تھے۔ مسہری کے سرہانے دیوار پر جواہر لال نہرو کی تصویر تھی جس میں وہ نینی جیل سے باہر نکل رہے

تھے، ایک تصویر کملانہروں کی تھی۔ آٹھوں دروازوں کے درمیان جو جگہ خالی بچی تھی اس پر یونیورسٹی کے گروپ فریم آؤینزاں تھے۔ ۱۹۳۷ء، ۱۹۳۸ء، ۱۹۳۹ء۔ آل انڈیا مباحثوں میں جو ڈرافیاں جیتی گئی تھیں ان کے گروپ۔ یونیورسٹی کے عہدیداروں کی تصویریں، ہشتری سوسائٹی اور انگلش ڈیپارٹمنٹ کے گروہ جس میں لڑکے اپنے پروفیسروں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ پروفیسر سعد حانت، ڈاکٹر راؤ، مسٹری۔ جی۔ رائے ایک کونے میں آشناں کے اوپر ایک گروپ تھا جواب بالکل پیلا پڑھ کا تھا۔ اس تصویر پر ۱۸۹۷ء کا صاحب، یہ گروپ بھی کینگ کالج کا تھا۔ یہ تصویر اس لڑکے کے باپ کے زمانہ طالب علمی کی تھی، اس میں اس لڑکے کا باپ گول کالی نوپی اور بند کالر کا کوت پہنے بڑی مستعدی سے فیکٹی آف آرٹ کے ڈین ڈاکٹر منور نجم دت مرحوم کے چچے کھڑا تھا۔ ڈاکٹر دت کی میگور کی ایسی یہ لمبی سفید دار ہمی تھی (یہ دوسری بات ہے کہ ہر دار ہمی والا بنگالی میگور کا ایسا نظر آتا ہے جس طرح ہر دار ہمی والا انگریز سنگ جارج پنجم معلوم ہوتا ہے) اور وہ اپنی چھڑی پر دونوں ہاتھوں کھے کیمرے کو بہت گھور کر دیکھ رہے تھے۔

اسی طرح گھر کے سارے کمروں میں ان گنت تصویریں آؤینزاں تھیں۔ کانگریس کے اجلاس میوزک کانفرنسوں کے گروپ جس میں پٹنے، مہاراشٹر، گوا یا راورالور کے استاد لوگ بڑے بڑے پگڑ باندھے بیٹھے تھے۔ چمپراوف پرنز کے گروپ۔ چھلی منزل میں ڈرائیور روم کے آشناں کے اوپر ایک روغنی تصویر لگی تھی جس میں ایک دیاناوسی بوڑھا سبز گوت کا جامہ اور چنا ہوا پانچ جامہ پہنے، سر پر مندیل اور ٹھیک منقش کری پر بیٹھا تھا۔ یہ تصویر شاہی کے زمانے میں انگریز

تصور نے ہنائی تھی اور اس کے نیچے اردو میں لکھا تھا: ”رائے زادہ بخشی مہتاب چند“ چند تصویریں پڑائے وقوں کی دہنوں کی تھیں اور ایسی یہاں جو اونچی سائزیاں باندھے، انگریزی جوتے پہنے، ایک ہاتھ میز پر نکالے کھڑی تھیں۔ میز پر موٹی مولی کتابیں یا گلداں رکھے تھے۔ اس کوٹھی میں تین بر جیاں تھیں۔ تیری بدھی میں لکڑی کا فرش تھا۔ یہاں ساز رکھے تھے اور لڑکیاں شام کو جب سورج بخش صاحب آتے تھے تو ان سے گانا اور ناج سیکھتھیں۔

یہ کوٹھی اس کے مکنوں کے لئے مرکزِ کائنات تھی۔ (ہر گھر اپنے مکنوں کے لئے مرکزِ کائنات ہوتا ہے)

یہاں سے اپنے پیاروں کی ارتھیاں نکلیں، دہنوں کے ڈولے آئے، براتمیں چڑھیں، یہاں وداع ہوئیں، بڑے بڑے تھواں منائے گئے۔ رام نومی اور جنم اشتمی اور دیوالی اور شورا متری۔ یہاں بچے پیدا ہوئے۔ اڑایاں جھگڑے ہوئے، لوگ ہنسے اور روئے، ہر گھر میں یہ سب ہوتا ہے۔ گھر خاموشی سے یہ سب دیکھتا رہتا ہے۔ اس کی داستان پر کوئی کان نہیں دھرتا۔ اس کی وقت سے ہمیشہ سُخنی رہتی ہے۔ دیکھتا ہوں تم میرا ساتھ کب تک دیتے ہو۔ تم میری نشان دہی کب تک کرتے رہو گے۔ وقت کہتا ہے۔ گھر پھر بھی خاموش رہتا ہے۔ برس گزرتے ہیں۔ صدیاں بدلتی ہیں۔ موسم پٹ پٹ کر آتے ہیں۔ گھر وقت کی ندی میں چھوٹے سے جہاز کی طرح لنگر انداز رہتا ہے، کبھی کبھی لہریں اسے بہالے جاتی ہیں، پھر اس کا نام نشان بھی نہیں ملتا۔

یہ کوٹھی نواب سعادت علی خاں کے عہد میں ان کے مقرب خاص اور اودھ کے

وزیر مالیات رائے زادہ بخشی مہتاب چند نے بنوائی تھی، اس وقت ان کے پڑپوتے اس میں برآ جمان تھے جو اوسط درجے کے بیرون تھے۔ ان کا ایک لڑکا تھا اور دو لڑکیاں، تینوں ابھی طالب علم تھے۔

بیرون صاحب کا سارا وقت کا نگریں کے چکر میں نکل جاتا یا وہ بیٹھ کر زمانہ فراغت میں اردو شاعری پرمضون لکھتے، پھر پریکش کی طرف توجہ کون دے، مگر گھر کی زمینداری تھی اس لیے آسائش سے بسر ہو رہی تھی۔ دونوں لڑکوں کے جھیز تیار تھے۔ لڑکے کو وہ کہبرج بھینے کی سوچ میں تھے، جہاں انہوں نے خود پڑھا تھا۔ اس سے وہ برساتی کے اوپر جو محلی چھت تھی اس پر محمردانی لگائے پڑے سوتے تھے۔ بی بی کی کھڑ پڑکی آواز نے ان کو جگا دیا۔ بی بی میں یہی تو ایک برقی عادت تھی کہ صحیح اپنی کھڑاوں کی آواز سے سارے گھر کو جگا دیتی تھیں، کبھی گودام کا دروازہ کھول رہی ہیں، کبھی نعمت خانے کی الماری بند کر رہی ہیں، کبھی اس کمرے میں جا رہی ہیں کبھی اس کمرے میں۔ اس کے بعد وہ پوچا کرنے بیٹھ جاتی تھیں اور زور زور سے رامائی پڑھتی تھیں۔

بڑی سہانی ہوا چل رہی تھی۔ سامنے ندی پر ابھی دھندا کا چھایا تھا، مکمل سکون سارے میں طاری تھا۔ مقابل میں ندی کے دوسرے کنارے پر چھتر منزل اور شاہ نجف اور موتی محل کے گنبد اور رنگ کے کھرے میں چھپے تھے۔ موتی محل برج پر ابھی سناتا تھا، پل کے نیچے مندر میں گھنٹے بجنا شروع ہو گئے تھے۔

پھر نیچے کی منزل کے دروازے کھلے۔ تراویجن نے جھاڑو لگانے پر کمر باندھی۔ بسترے پہنچنے گئے۔ صراحیاں اٹھا کر اندر رکھی گئیں۔ ”اٹھو بیٹا جلدی کرو۔

تمہر اسکول آج سے سیرے کا ہوئے گوا۔۔۔ ”جمنا مہری نے آن کر چھوٹی لڑکی سے کہا، لڑکی ہڑ بڑا کر انٹھ پیٹھی۔ جلدی سے اس نے تجھے کے نیچے سے کھڑی نکال کر دیکھی، پانچ نج گئے۔ ارے رام رے۔ آج سے اسکول کھل رہا تھا، وہ پنگ پر سے کو دکر تیزی سے غسل خانے کی طرف بھاگی۔

بڑی لڑکی نے کاہنی سے کروٹ بدل کر آنکھیں کھولیں اور ندی کی اور دیکھتی رہی، وہ ستراہ اخبارہ سال کی رہی ہو گی۔۔۔ کالج میں پڑھتی تھی اور اس کا کالج چودہ جولائی کو کھلتا تھا۔ جلد اس کی شادی ہونے والی تھی اور اسے کالج وانج کی چند راں پر واہ نہیں تھی، وہ اطمینان سے لیٹی ندی کو دیکھتی رہی۔

بر جی والے کمرے میں سے نکل کر اس کا بھائی چیل گھستا فنجیوں کی طرح باہر آیا اور وہ بھی برآمدے کے ایک ستون کے پاس نکل کر کاہنی سے ندی کو دیکھنے لگا، جدھر پل تھا۔ اس نے ایک زور دار انگڑائی لی اور تو یہ کانڈھے پر ڈال کر بے سری آواز میں گاتا غسل خانے میں گھس گیا۔

”اسکول میں اپنی گویاں سے کہہ دینا شام کو آ کر بڑکی کے لہنگے کی گوٹ ختم کر ڈالیں۔“ گھر کی بی بی نے مٹھا کر دوارے سے باہر نکل کر چھوٹی لڑکی کو آواز دی جو بالوں کی دو چوٹیاں گوندھے ہلاکا نیلا ٹیونک پہنے، جس کی پیٹھی سرخ رنگ کی تھی، کتابیں اٹھائے زینے کی طرف بھاگ رہی تھی۔ نیچے بر ساتی میں لامارٹینر کی بس نے ہارن بجا یا۔ ”اچھا۔ اچھا کہہ دوں گی۔“ اس نے سیرھیاں اترتے ہوئے مڑ کر جواب دیا۔

گھر کی بی بی خالص پور بی تھیں۔ شادی ہو کر لکھنؤ آئے ان کو پچھیں سال گزر

چکے تھے مگر اپنے لب والجھے پر انہوں نے لکھنؤ کی اور اپنی سرال کی نکسالی اردو کا ذرا اثر نہیں ہونے دیا تھا، وہ بڑی بیٹی کو بڑی کہتی تھیں، چھوٹی کو چھٹی، جیٹھے بڑی کو کہلاتے تھے۔ ماں مہتا ری، قیامِ منشی۔ بیر شر صاحب ان کو سمجھنی، نکلتے، کشمیر سب جگہ گھملائے تھے، ہر سال نینی تال اور مسوری جاتی تھیں مگر کیا مجال جوان کی وضع میں فرق آیا ہو۔

اتنے میں بڑی اڑکی نے برآمدے سے نیچے جھانکا، نیچے باغ کی سڑک پر اسکوں کی بس کھڑی تھی جس میں چند ہندوستانی اڑکیوں کے علاوہ سب انگریز اڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ہندوستانی اڑکیوں میں سے ایک نے کھڑکی میں سے سرناال کر رہا تھا ہلایا: ”ہم لوگ شام کو آئیں گے۔ میرس کانچ سے لوٹ کر۔“

”اچھا،“ بڑی اڑکی جواب دیا۔

بس پھانک سے باہر نکل گئی۔

اس کے بعد اڑکا سیٹی بجا تا نیچے اترا، بر ساتی میں اس کی سائیکل کھڑی تھی۔ اس نے ایک نوٹ بک بڑے اشائل سے سائیکل کے پینڈل میں انکائی اور بے فکری سے پینڈل چلاتا کچی سڑک پر آ کر یونیورسٹی کی طرف روانہ ہو گیا جس کی سنک سرخ کی برجیاں دور دھنڈ لکھے میں نظر آ رہی تھیں۔

سورج نکل آیا، اب دنیا اپنے کاروبار میں مصروف ہوئی۔ عدالتیں، دکانیں، کانچ، سرکاری دفاتر، اخبار کے پریس، ریڈیو اسٹیشن، کوسل چیمپر، کارخانے، جیل۔۔۔ خلق ت زندہ رہنے میں مصروف رہی۔

پھر شام ہوئی، روشنیاں جگمگائیں۔ بازار، محلے، کوٹھیاں، سینما ہاؤس، کلب،

بال روم، محل سرائیں، جھونپڑیاں۔

ندی کے کنارے اس کوٹھی کے برآمدے میں سے لڑکیوں کے قہقہوں کی آوازیں بلند ہوئیں، یہ چار پانچ نو عمر لڑکیاں برآمدے کے چنگلے پریٹھی اس طرح ہستی تھیں جیسے رنج سے نا آشنا ہیں۔ شاید وہ رنج سے نا آشنا تھیں۔

چھتر منزل کے پیچھے سورج ڈوبا۔ ندی کے کنارے کنارے کنارے ڈونگیوں میں چراغ جلے۔ ندی نے اپنا سفر جاری رکھا۔

۳۵

سورج جس سے جامنوں کے پیچھے پہنچا تب فتن میرس کالج سے لوٹ کر اپنی پی تلی رفتار سے چلتی ندی کے پل پر آ جاتی تھی، یہ وقت عموماً جھٹ پٹے سے ذرا بعد کا ہوتا تھا۔ ندی کے پل سے اتر کر ایک سیدھی شفاف سڑک یونیورسٹی روڈ کھلاتی تھی اور اس کے دونوں طرف دریا کے کنارے کنارے دو کچھ راستے جاتے تھے، ایک راستہ پل سے اتر کر یونیورسٹی یوت کلب، آرٹ اسکول اور ندوہۃ العلماء کی طرف جاتا تھا، دوسرا کچھ راستہ کاٹھ کے پل کی سمت۔۔۔ یہاں سے ندی کے کنارے کنارے چاند باغ تک نئی کوٹھیاں بنی تھیں۔ یہ علاقہ ٹرانس گومنی سول لائیز اور حیدر آباد کھاتا تھا، یہاں بے شمار نئے سینئٹ کے مکان تھے۔ بم بھادر شاہ کا دو منزلہ محل، چند پرانی کوٹھیاں بھی تھیں جیسے کالا کنکر ہاؤس اور سنگھاڑے والی کوٹھی اور آگے بڑھ کر نشااط نئے کی بستی تھی۔ رائے بھاری لاں روڈ،

جس کا ایک سرایونیورسٹی روڈ پر تھا۔ بل کھاتی اس علاقے سے گزرتی فیض آباد روڈ پر جا پہنچتی تھی جہاں ازابلا تھوبرن کالج تھا۔ یہ بڑا خاموش اور پر سکون علاقہ تھا، کبھی کبھار کوئی موڑنکل جاتی یا سائیکل سوار کالج کا لڑکا یا لڑکی۔ مضافات یا ذالی گنج کی طرف جانے والے ایکے فیض آباد روڈ پر سے گزرتے رہتے اور آگے مسلم گرلنگ کالج تھا۔ اس کے آگے ارہر اور گنے کے کھیت تھے اور ریلوے لائن اور ماہنگرا اور بادشاہ نگر کے چھوٹے چھوٹے آشیش اور شفاف تالاب اور امرودوں کے جھنڈ۔ اس کے بعد انگریزوں کا قبرستان تھا اور پیپر مل جس کی آواز وقت کی یکسانیت کو متواتر منتشر کرتی رہتی تھی۔ اسی طرف کاٹھ کا پل بھی تھا۔ ادھر سے راستہ چریا جھیل اور بھینسا کنڈ جاتا تھا۔ ادھر سے اور آگے سکندر باغ اور بنا ری باغ اور وہ سارا علاقہ تھا جہاں گورنمنٹ ہاؤس تھا، جس کے پیچھے غاذی الدین حیدر کی نہر تھی اور حضرت گنج اور لاما ریثیںر کالج اور لاما ریثیںر روڈ ہرے بھرے بخوبی سے انکنی دل کشا پلیس کی طرف جاتی تھی جس کے آگے جس کے آگے وسع سر بنر چھاؤںی تھی۔

موتی محل برج سے آگے بڑھ کر میرس کالج تھا اور قیصر باغ کی بارہ دری اور قیصر باغ۔ اس کے آگے امین آباد پارک تھا اور امیر الدولہ پارک، اور شہر۔۔۔ اور جھاؤالل کا پل اور پھر سڑکیں نخاس اور چوک کی طرف جاتی تھیں جہاں میڈیکل کالج تھا اور ہسپتال، شاہ بینا کی درگاہ اور امام باڑہ آصف الدولہ، پھی بخون اور امام باڑہ حسین آباد، وہیں اکبری دروازہ تھا اور گول دروازہ۔ یہ سارا علاقہ پرانا لکھنؤ تھا۔۔۔ یہ نئے لکھنؤ سے بہت دور تھا مگر نئے لکھنؤ میں بھی پرانا شہر ہر جگہ موجود تھا۔ شاہی کی ایک کوئی کی جگہ گورنمنٹ ہاؤس کھڑا تھا۔ ندی کے

کنارے موتی محل میں اپریل بنک تھا۔ حضرت گنج کے عین وسط میں بیگم کوٹھی تھی۔ چھتر منزل میں کلب تھا، یہ بڑا وضع دار شہر تھا۔ یہاں کی چیزیں نئی ہو کر بھی قدیم تھیں، نو دو لئے پن کا ظہار یہاں کی کسی عمارت سے نہیں ہوتا تھا۔ اس شہر میں وقت نے بڑی گمیبرتا اور ٹھیراؤ کے ساتھ گز رنا سیکھا تھا۔

اس طمینان اور آسائش کے ساتھ فتن شام کی کاسنی گلابی نارنجی روشنی میں خراماں خراماں چلتی موتی محل برج تک پہنچتی۔ یونیورسٹی روڈ پر اس وقت کاروں اور سانیکلوں کا ہجوم ہوتا۔ پل سے اتر کر اس سڑک پر جانے کے بجائے اکثر ایسا ہوتا کہ فتن باعیں ہاتھ والی کچی سڑک پر اتر آتی، جہاں راستہ بڑے بڑے سفید پھولوں کی جھاڑیوں سے گھر گیا تھا اور جدھر پرانے و قتوں کی چند کوٹھیاں تھیں۔

گنگا دین کو ج بکس پر بیٹھا مزے میں سر جھکائے چلا جاتا۔ ”بیٹا سنگھاڑے والی کوٹھی نہیں چلنے گا۔؟“ وہ جھک کر دریافت کرتا۔

یہ کہانی اب یہاں سے میں سن رہی ہوں۔ (طاعت نے کہا) داستان گولی کے مختلف طریقے ہوتے ہیں، میری سمجھ میں ایک طریقہ بھی نہیں آ رہا، کون کردار زیادہ اہم ہیں، قصہ شروع کہاں سے ہوا۔ جی ہاں۔ قصہ شروع کہاں سے ہوا، کلامیکس کہاں تھی۔ ہیر و کون کون تھی اور اس کا انجام کیسا ہوا چاہیے تھا۔ ہیر و کون تھا۔ اس داستان کو سننے والا کون ہے اور سنانے والا کون۔ میرا بڑا بھائی مال ایک زمانے میں کہا کرتا تھا کہ ایک دن بیٹھ کرو یہ سب طے کرے گا۔ مال اب تک کچھ بھی طے نہیں کر پایا، پھر چمپا باجی سے پوچھنے بھلا کون جائے۔ ہاں چلیں گے، میں گنگا دین کو جواب دیتی۔ فتن آہستہ آہستہ کچی سڑک پر رواں رہتی، یہاں ہوا کا

عالم تھا، مکمل ابدی سنایا۔ اسی راستے پر بہت آگے جا کر شمشان گھاٹ تھا۔ ندی کے پانی میں موتی محل کی روپیلی عمارت کے سائے لرزائ رہتے اور پھر منزل کا سنہرہ گنبد اور نجف اشرف کا امام باڑہ۔ ندی ان عمارتوں کی سیر ہیوں کے نیچے مودبانہ انداز میں بہتی رہتی۔ درختوں کی گھنی چھاؤں میں پانی کی موجیں گہری بزر و کھلائی پڑتیں، کبھی کبھی اس ہریالی میں سے تیرتی ہوئی کوئی ڈونگی نکل جاتی۔ سنک سرخ کے شامدار موتی محل برج کے نیچے مندر کے چبوترے پر بندروں کا اکھاڑہ جمع رہتا۔ سنگھاڑے والی کوٹھی کی سیر صیاں بھی پانی میں اترتی تھیں۔ یہ دو منزلہ عمارت تھی اور اپنی تین بہشت گوشہ بر جیوں کی مناسبت سے سنگھاڑے والی کوٹھی کہاتی تھی، یہ بر جیاں کالی کی وجہ سے گہرے ہرے رنگ کی ہو چکی تھیں۔ برسات کے مہینوں میں یہ کالی اور ندی کا پانی اور آسمان، درختوں اور گھاس کا سزہ، یہ سب مل کر ایک معلوم ہوتا۔ جاڑوں میں یہاں ہلکے پیلے رنگ کی روشنی پھیلی رہتی۔ کہہ آ لو درختوں کے پیچھے سے سورج نکلتا اور اس کی زرد لکیریں سارے میں تیرتی پھرتیں، جن میں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر دیکھو تو رنگ برلنگے ذرے اڑتے نظر آتے۔ چاند باغ جاتے ہوئے اور کوٹوں میں تاکیں چھپائے لڑکیاں جلدی جلدی صنوبر کے جھنڈ کی اور بڑھتیں اور گھاس پر شبتم کے بڑے بڑے قطرے پیروں میں آ کر ادھرا وہ لڑک جاتے۔ جاڑوں میں شام کو سورج بہت جلد غروب ہو جاتا۔ چنانچہ فتن بڑھتی ہوئی مدھم خنکی میں چھسات بجے پل پر آ جاتی۔

”بیٹا۔۔۔ نہ ملا بٹیا کے یہاں نہیں چلنے گا؟“، گنگا دین کوچ بکس پر بیٹھے

بیٹھے کاہنی سے پوچھتا۔

اور پھر فٹن سڑک کے نشیب میں اتر کر ایک دھپکے کے ساتھ سنگھاڑے والی کوئی میں داخل ہو جاتی۔

”یہ لو بھین تمہارا آمد نامہ دے گئے ہیں۔“ لاج بر ساتی کی چھت پر سے آواز لگاتی۔ بھین یعنی شنگر سو یو استو یونیورسٹی میں تھا اور فارسی میں ایم۔ اے کر رہا تھا۔

نر ملابر جی میں کٹھک کا کوئی نیا توڑا شروع کر دیتی۔ ”اے۔ ذرا آ کر جھپٹاں تو بجا دینا۔“

وہ بر جی کے کسی دوارے میں منڈنگاں کر کہتی۔ ان کی اماں ٹھاکر دوارے میں چراغ جلانے کے بعد دوسرا بر جی میں سے آواز دیتیں:

”اری باولیو۔۔۔ پہا کھانا تو بختر لیو۔۔۔“

نر ملکی بڑی بہن لاج اطمینان سے آلتی پالتی مار کر برآمدے میں ندی کے رخ بیٹھ جاتی۔ ”اب یہ بتاؤ کہ گیان نے کسم کو کیا جواب دیا؟“ میر س کالج کی سیاست شروع ہو جاتی، لاج وہاں سے فضیلہ ایر پاس کر چکی تھی اور اب لی۔ اے کے بعد اس کا بیاہ ہو جائے گا۔

”راجکماری شو پوری لا ہور جارہی ہیں۔“

”لا ہور۔۔۔؟ اے باپ رے باپ۔“

لا ہور بہت دور تھا، بالکل دوسرا کرہ کہتے۔ ایسا ہی تھا جیسے کہہ دیتے راجکماری

سنگاپور جا رہی ہیں۔

”افوہ۔“ گھنگرو باندھے باندھے باہر آ کر نر ملا اظہار خیال کرتی، پہلے وہ بھی میرے ساتھ میرس کالج میں تھی لیکن پچھلے سال جب وہ یکار پڑی تو ڈاکٹروں نے کہا کہ اسکول اور میرس کالج کی دہری محنت اس سے نہ کروائی جائے۔ اب ہماری دوست مالتی کے بڑے بھائی سورج بخش سو یواستوا، جو ناپینا تھے اور شمجوہ مہاراج کے اشاف پر تھے، شام کو آ کر اسے ایک گھنٹہ ریاض کرادیتے تھے اور شمجوہ مہاراج کے گھرانے کے ایک کٹھک سے وہ ناچ سیکھ رہی تھی۔ لا ما ریٹنر میں نر ملا میری ہم جماعت تھی۔ ہم دونوں دو سال بعد سینٹر کی برج کریں گے۔

”کتنی عجیب بات۔ یعنی ہم میں سے ایک لاہور جا رہا ہے۔ ارے واہ۔“ اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”میرا بھی بڑا بھی چاہتا ہے کہ انوکھی جگہیں دیکھوں،“ اس نے گویا اپنے خطرناک ارادوں کا اظہار کیا۔

”پنجاب ہے نا۔۔۔ وہاں ان کی یونیورسٹی بھی ہے، اس میں وہ ہونے والا ہے، وہ کیا ہوتا ہے۔ ارے بھی اس میں سنا ہے میوزک کی کلاسیں کھلنے والی ہیں۔ اس میں راجملاری اپنے پڑھایا کریں گی مگر ابھی تو وہ اندر جیت کی شادی میں شرکت کرنے جا رہی ہیں۔“

اندر جیت کو رد ہرہ دون کی ایک سکھ لڑکی تھی اور کچھ دونوں کے لیے اس نے میرس کالج میں پڑھا تھا۔

ویسے یونیورسٹی صرف ایک تھی۔ بھلکنڈے یونیورسٹی۔ باقی کہ جوانوں کی یعنی کینٹگ کالج تھا، جس میں ہم سب کے بڑے بھائی اور بہنیں پڑھتے تھے، وہ تو

ایک قسم کا اندر لوک تھا جہاں اپنا دماغ ہی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ الجھرے پر سے سراٹھا کراکٹر ہم لوگ حساب لگاتے: ایک دو تین چار پانچ۔۔۔ پورے پانچ سال بعد ہم اس اندر لوک میں پہنچ سکیں گے، ابھی تو ہم نے ہائی اسکول بھی نہیں کیا تھا۔

”بڑے آغا صاحب نے آج گاڑتی نگم کو پھرڈاٹ پلانی۔“

”تھیوری کی کلاس کے لیے لیا اوپری آئی تھیں؟“

”تنا ہے اب کے سے تھرڈ ایر کے ایکسٹریل ایگزامنروں تک راؤ پورہ من ہوں گے۔“

”ارے ہائے۔۔۔ وہ بڑے سخت آدمی ہیں۔ وائیوا میں انہوں نے میرا پڑا کر دیا تھا۔“

لاج کہتی۔

سارے ہندوستان میں میرس کالج کی طرح کا کوئی اور اوارہ نہ تھا۔ پانچ سال کا اس کا کورس تھا۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی طرح سخت۔ اس کے بعد کہیں جا کر بیچلر آف میوزک کی ڈگری ملتی تھی۔ اب اسے یونیورسٹی کا درجہ مل گیا تھا اور بھلکنڈے یونیورسٹی آف ہندوستانی میوزک کہلاتا تھا۔ گیان، راج، لیما، راجکماری، یہ سب لڑکیاں اب اشاف پر تھیں۔ تین سال قبل ریڈ یوائیشن کھلا تھا۔ یہ سب لوگ وہاں جاتے۔ کلاسیکل موسیقی اور ڈراموں کے لیے ریڈ یوائیشن سارے ملک میں مشہور تھا۔ گوہر سلطان ایک نئی دریافت تھی۔ یہ ایک پیاری سی نازک اندام قصباتی لڑکی تھی جو کوئی کی ایسی آواز میں گاتی، پھر نیاز فتح پوری کے داما دمجد نیازی تھے۔ طاعت محمود سے ابھی کوئی واقف نہ ہوا تھا۔ ارجمند ہری تھی اور بہت سی بنگالی

لڑکیاں۔ سورج بخش سر یو استواتھے۔ پرپل رتن جھنکر۔ الیاس خانے اور جانے کون کون۔۔۔ ایک سے پائے کا کلا کار پڑا تھا۔

”پر راجحہ کی ہم سے الگ اتنی دور جا کر بورنیں ہو جائیں گی۔؟“ نزلانے فکر مند ہو کر پوچھا۔

”جب بھیں اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جلسے کے لیے کراچی گئے تھے تو مجھے بھی سنگ لے گئے تھے۔ یاد ہے؟ لاہور تو اتنا دوزبھی نہیں ہے،“ لاج کہتی۔

”مجھے بھی دنیا گھونٹ کا شوق ہے۔“ میں فوراً اپنے سمندری سفروں کا حوالہ دیتی، مگر کراچی کی سیاحت کی بات ہی اور تھی۔ میں رشک کے ساتھ لاج کو دیکھتی۔ ”تم کو کیا پتا اونٹ گاڑی کیسی ہوتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے۔“ لاج رعب سے مطلع کرتی۔

ندی میں ڈوبتے سورج کی کرنیں اب رنگ بر گنگی لہروں پر چم چم کرتیں۔
ساری دنیا، کائنات، زندگی پیش منظر کا جو دھندا لاسا انکل پچھو خا کہ ہمارے ذہنوں
میں تھواہ ہمارے سامنے ان لہروں پر ناچتا رہتا۔ شاہی کے زمانے کی عمارتیں (ہم
خود شاہی کے زمانے کی ایک عمارت میں موجود تھے)، دور سنگ سرخ کا پل،
بوٹ کلب کی ڈونگیاں، سنگھائرے والی کوئی کی محفوظ کالی آلو دیٹری صیاں جغرافیہ
کے ماہرین کی طرح ہم دماغ پر زور ڈال کر سوچتے۔ اس کے آگے کیا ہے۔۔ اور
کیا کیا ہوتا ہے۔

”آپی بدا ہو کر کہاں جائیں گی؟“ اکثر نرملا کچھ سوچتے سوچتے عجیب سے سوال کر رہتی۔

”وہیں جائیں گی جہاں بھیا صاحب لے جائیں گے اور کہاں جائیں گی۔“
میں بھجن چلا کر جواب دیتی۔

”بھیا صاحب کہاں جائیں گے۔“

”کیا معلوم۔“ میں سٹ پٹا جاتی۔

(اب مال اپنے کونے میں سے انٹھ کر باہر آیا اور بالکنی کے ایک ستون سے
نکل گیا۔ گویا طاعت کی بات ختم کرنے کا انتظار کرتا ہو۔ اس کے بعد اس نے گویا
کیوں لے کر کہنا شروع کیا):

بھیا صاحب جو میرے چچا زاد بھائی تھے میرے بہنوں بھی ہو سکتے تھے۔ بچپن
سے میں یہی سنتا چلا آیا تھا۔ بھیا صاحب جب جوان ہو کر لکھ پڑھ کر بڑے آدمی
بن جائیں گے تو اپنی کوبیاہ کر لے جائیں گے۔ میرا کوئی سگا بھائی نہ تھا۔ میں
بچپن سے بھیا صاحب پر عاشق تھا، وہ میرے ہیر و تھے میرے لیے گیری کو پر اور
اشوک مار سے اوپھا درجہ رکھتے تھے۔ بھیا صاحب نے مجھے سینئر کیمبرج کے
امتحان کے لئے مار مار کر ریاضی پڑھائی تھی۔ ان کی دل سے اتری ہوئی نایاں
میں بڑے چاؤ سے خود پہن لیتا تھا۔ بھیا صاحب جو کتابیں پڑھتے وہی میں
پڑھتا۔ ان کو بیٹی ڈیوس سے نفرت تھی۔ میں نے بھی بیٹی ڈیوس کے فلم دیکھنے سے
تو بہ کر لی۔ پہلے وہ فارورڈ بلاک میں تھے۔ مجھے نیتا جی کا فلسفہ سمجھایا کرتے۔ میں
بھی ان کے ساتھ جلسے جلوسوں سے واپس آ کر رات کو سوتے میں انقلابِ زندہ باد
کے نعرے لگایا کرتا، پھر جب بھیا صاحب نے مقابلے کے امتحانوں میں بیٹھنا
شروع کیا میں نے اس کا اہتمام کیا کہ ان کی پڑھائی میں خلل نہ ہو، ان کے کمرے

کی طرف کوئی نہ جائے، وہ عموماً ان پر بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے، سیمل کے درخت کے نیچے۔

بھیا صاحب برسوں سے ہمارے یہاں رہتے آئے تھے۔ دراصل کسی کو اس کا احساس نہ تھا کہ ہمارے یہاں، ان کے یہاں، سے مختلف کوئی چیز ہے۔ جب بچا لبا کا سوئزر لینڈ میں اچانک انتقال ہو گیا وہ بھیا صاحب سے ملنے وہاں گئے ہوئے تھے۔ اس وقت بھیا صاحب لوزان کے ایک سکول میں پڑھتے تھے۔ ان کو سوئزر لینڈ سے واپس بلایا گیا۔ بھیا بھبھی سے سیدھے ہمارے یہاں المؤڑے پہنچے تھے۔ اب امیاں ان دونوں المؤڑے میں تعینات تھے۔ بر ساتی میں وہ فل بوٹ پہنکھ رہے تھے۔ اپنے سوکیں اسکول کے بیڑا اور سیاہ دھاریوں والے غلر میں ان کا چہرہ تقریباً چھپا ہوا تھا۔ ان کی آنکھوں کے پوٹ رو تے رو تے سونج گئے تھے اور ان کی ناک سرخ ہو رہی تھی۔ اپنے امنڈتے ہوئے آنسوؤں کو روک کر انہوں نے مجھے اور اپی کو اپنے قریب بلایا اور ہم دونوں کو اپنے بازوؤں کے حلقات میں لے کر پچھوٹ پچھوٹ کر رونے لگے۔ طاعت اس وقت بہت چھوٹی تھی اور گھر کے دوسرے بچوں کے ساتھ الاصحی کے درخت پر چڑھی ہوم و رک کر رہی تھی۔

الا اچھی کا درخت ہم لوگوں کی زندگیوں میں خاص اہمیت رکھتا تھا۔ یہ پہلو کے برا آمدے کے قریب تھا۔ اس کے سامنے لان تھا۔ اس درخت پر بیٹھ کر ہم اسکول کا کام کرتے۔ اکثر کھا بھی وہیں کھاتے۔ جاڑوں میں اسی کے نیچے اسنو میں بنایا جاتا۔

اس کے بعد سے بھیا صاحب مستقلًا ہمارے یہاں رہنے لگے۔ بابا ان کو دیکھ

کر جیتے تھے۔ مگر ان پر عاشق تھیں۔ ان کی امی کا انتقال بہت پہلے ہو چکا تھا۔ سارا کنبہ، ساری براوری، سارا قصبہ ان کے نام کی مالا جلتا۔

بھیا صاحب چچا ابا مرحوم کی اکلوتی اولاد تھے۔ ہمارے آبائی قصبے کالیان پور میں، جو گھاگھر کے کنارے آباد تھا، تالاب کے کنارے آیک پھونس کا بنگلہ تھا جس میں چچا ابا بھی سمجھی آ کر رہا کرتے تھے، بھیا صاحب بھی یورپ سے لوٹ کر جب قصبے پہلی بار گئے تو اس بنگلے میں جا کر رہے ہیں۔ یہ بنگلہ چھوٹی بارہ دری کہا تا تھا اور اس کے برآمدے میں بینہ کر بھیا صاحب موٹی موٹی کتابیں پڑھا کرتے۔ خاندان کوان سے بڑی بڑی امیدیں واپس تھیں۔ یہ بھی اپنے مرحوم بابا کی طرح نام پیدا کریں گے۔ بڑے آدمی کہاں میں گے۔

گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد بھیا صاحب الامارات نے کانجھ میں داخل کر دیے گئے جو ڈریٹھ سو سال قبل نواب آصف الدولہ کے مقرب خاص جنرل کلاڈ مارش فرانسیسی کے روپ سے یورپین لڑکوں کے لیے قائم کیا گیا تھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس داستان کے ہیرو کیا بھیا صاحب ہیں؟ میں کہانی سنانے بینھا ہوں تو کرداروں کے متعلق بھی تو طے کرتا چلوں۔ سوچتا ہوں، بھیا صاحب میں ہیرو والی ساری خصوصیات موجود تھیں۔ اب تک جو کچھ میں نے تمہیں بتایا ہے تم سمجھ دار ہو، خود ہی تم نے اندازہ لگایا ہو گا کہ ایسا رومانی پس منظر ہیرو کے علاوہ اور کس کا ہو ستا ہے۔ لازمی بات ہے کہ ہیرو لوگ چارلس بوائیں ہوتے ہیں، اگر تم قدامت پسند تماشائی نہیں ہو تو تم کو یہ جان کر بڑی چھنجھلا ہٹ ہو گی کہ بھیا صاحب بھی بہت خوبصورت تھے۔ مجھے ڈرتے ڈرتے نہایت افسوس

کے ساتھ اطلاع دینی پڑتی ہے کہ بھیا صاحب عین میں چارلس بوائیر تھے۔ فرانس اور سوئزر لینڈ کے اسکولوں میں پڑھنے کی وجہ سے شروع شروع میں ان کا لب و اہجہ بھی بالکل فرانسیسی تھا جب وہ نہ کے تنظیم کے ساتھ رک رک کر انگریزی بولنے تو مت پوچھو کہ کس طرح ازابلا ٹھوبرن کالج کی لڑکیوں کے دلوں پر چھریاں چلتیں۔

ربیں اپی۔ تو وہ اس افسانوی قسم کی عم زاد بہن قطعی نہیں تھیں جو اپنے اس طرح کے کزن لوگوں کے لیے پکوان بناتیں یا پل اوورنیتیں، وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے مشغله میں نے اردو افسانوں میں پڑھا ہے کہ مسلمان عم زاد بہنوں کے ہوتے ہیں۔ اپی اماڑیں گرلز ہائی اسکول میں پڑھتی تھیں۔ جونجف اشرف کے قریب ندی کے دھرے کنارے پر خورشید منزل میں تھا۔ پھاڑی کی ڈھلان پر خورشید منزل کی اوپنجی عمارت، جو نواب سعادت علی خاں نے ڈیڑھ سو سال گزرے اپنی بیگم خورشیدزادی کے لیے بنوائی تھی، اس کے چاروں اور خندق تھی اور یورپیں وضع کے کنگورے۔ سال کے بارہ مہینے پھولوں اور درختوں کی ہریالی میں چھپی رہتی۔

گہرے نیلے آسمان کے مقابل میں اس کے اوپنجے کنگورے اور بر جیاں دور سے بڑی واضح نظر آتیں اور ایسا جان پڑتا جیسے اٹھارویں صدی کے کسی لینڈ اسکی پ مصور کی مدھم خوشگوار شفاف رنگوں والی بڑی سی پینینگ منقش چوکھے میں جڑی سامنے دھری ہے۔ اکثر جب بنا ری باغ جاتے ہوئے پل سے اتر کر اس اسکول کے سامنے کی خاموش سایہ دار سڑک پر سے گزرتا تو اپی مجھے قلعے کے کسی در پچ میں کھڑی کسی لڑکی سے با تینی کرتی نظر آتیں۔ اس منظر میں بڑا ناقابل بیان

سکون رچا تھا۔

بھیا صاحب ہرے بھرے کنجوں، طویل بل کھاتی شفاف سڑکوں اور باغات کے اس سلسلے کے دوسری طرف لڑکوں کے لامارٹینٹر کانچ میں پڑھتے تھے۔ کانچ کے وسیع تالاب کے کنارے وہ اپنے انگریز ہم جماعتوں کے ساتھ کوئی کتاب ہاتھ میں لیے آہستہ آہستہ فرانسیسی لججے میں باتمیں کرتے یا شہلتے یا کبھی کبھی کسی بات پر ٹھکلکھلا کر نہ پڑتے۔ ان کی طبیعت میں جودھیما پن، جو کھوئی کھوئی ادا ہی تھی اس نے ان کو اور زیادہ رومنڈک بنادیا تھا۔

دیکھئے، میں عرض کروں، مجھے اس لفظ رومنڈک سے دلی نفرت ہے۔ یہ کوئی میں خواتین کے رسائل کے لیے بالاقساط ناول نہیں لکھ رہا ہوں جس میں سوا چاند نی رات اور گلاب کے شکوفوں اور والنس کی موسیقی کے اور کچھ نہیں ہوتا اور جن کا ہیر و اچھا خاصا ہسا نوی بل فاکٹر نظر آتا ہے۔ اسے حسن اتفاق کہنے اور بحیثیت قصہ گوی مری بد قسمتی کہ بھیا صاحب فرانسیسی لججے میں بات کرتے تھے اور لامارٹینٹر میں پڑھتے تھے اور دھمکی دھمکی آواز میں ہنستے تھے۔

سینٹر کیمبرج کے بعد بھیا صاحب اندر میڈیٹ کے لیے کالون تعلق دار کانچ میں آگئے جو ہمارا خاندانی کانچ تھا اور جہاں ہمارے گھرانے کے افراد کی پشتوں سے پڑھتے چلے آ رہے تھے۔ میرے اور ہری شنکر کے باپ دادا سب نے یہیں پڑھا تھا۔ یہاں بھیا صاحب دوسرے ڈیکیڈنٹ ریمیں زادوں کے ہمراہ شہسواری کرتے اور ستار بجاتے۔ سال بھر بعد وہ سڑک عبور کر کے کینگ کانچ میں داخل ہو گئے اور کئی برس تک یونیورسٹی کے ورنا بین کے کہیا بنے رہے۔

اپی اور بھیا صاحب ایک دوسرے کے معاملات میں دخل نہیں دیتے تھے۔ ان دونوں کی الگ الگ ٹیمیں تھیں۔ اپی بھیا صاحب کے دوستوں میں کیڑے ڈلتیں، یہ اپی کی سہیلیوں کی نقلیں اتارتے۔ ان دونوں میں ہمیشہ تلے اوپر کے بہن بھائیوں کی طرح لڑائی ہوا کرتی۔ لاج و قی سر یو استوا اپی کی سب سے پیاری گوئیاں تھیں۔ یہ میرے چھپتے جان کے لکڑے دوست ہری شنکر کی بہن تھی۔ جانے کیوں، پراکثر ایسا ہوا کہ چمپا بابا جی کا ذکر سنتے ہی لاج ایک دم چپ ہو جاتی۔ اپی بے پرواہی سے بیٹھی ہنستی رہتیں۔ ہری شنکر بے قوفوں کی طرح سگریٹ سالگانہ شروع کر دیتا۔ چمپا بابا جی ہم میں سے کسی ٹیم میں شامل نہ تھیں۔ یہ سب سے الگ تھیں۔ ہمارے لیے کافی اجنبی تھیں۔ ہم سب جنم جنم سے ایک دوسرے سے مسلک تھے۔ ایک ہی پس منظر اور ایک ہی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ چمپا بابا جی کے پس منظر سے ہمیں والقفیت نہیں تھی۔ مجھے اکثر یہ قوی شبہ ہوا کہ چمپا بابا جی مذل کلاس ہیں۔

جب بھیا صاحب لاء کر رہے تھے اس وقت چمپا بابا جی نے بنارس سے آکر ازابلا تھوبرن کالج میں داخلہ لیا۔
یہ سن انہیں سوا کتابیں بیسوی تھا۔

اپی لامارٹینر اسکول سے ازابلا تھوبرن کالج آچکی تھیں۔ بھیا صاحب ایک کے بعد معرکے سر کرتے رہے۔ یونیورسٹی کی محفلیں، ہوسائٹی کے ڈرائیگ روم، ہر میدان میں ان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ میں ان کے اے ڈی سی کی طرح ساتھ ساتھ لگا رہتا۔ نہایت عقیدت سے ان کی ہاں میں ہاں ملاتا۔

جس سال اپنی نے تعلیم ختم کی اسی سال بھیا صاحب اور اپنی کی شادی کی بات
لُوٹی۔

اب میں میں میں ایک بات سوچ رہا ہوں، وہ بات یہ ہے کہ جس طرح، جس تفصیل اور وضاحت سے میں اس زمانے کی یہ کہانی دہراتا چاہتا ہوں اس میں کامیاب نہ ہو سکوں گا۔ بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔ بادشاہ باغ کا شاہی کے وقت کا چالک جس میں یونیورسٹی پوسٹ آفس تھا۔ پھولوں کے تختے۔ سڑک پر سے گزرنے والی کہار نیں، وہ بوڑھیا جو سرخ لہنگا پہننے دو پہر کو سنان سڑک پر امیاں چنا کرتی تھی اور جو ایک روز ٹرین کے نیچے آ کر مر گئی۔

ان سب چیزوں کی میرے لیے بے اندازہ اہمیت ہے۔ تم کو یہ تفصیلات بے معنی اور شاید مضحکہ خیز بھی معلوم ہوں گی۔ جبھی تو کہانی سنانا کوئی آسان کام نہیں۔ پلاٹ کا توازن، مکالمات کی بر جستگی غیر ضروری جزویات سے احتراز۔۔۔ یہی سب تو فن افسانہ نگاری کی تکنیک کہاتا ہے اور کیا تکنیک میں کوئی ہاتھی گھوڑے لگے ہوتے ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ ایسا طریقہ ہو کہ جس سے اس فضا، اس ماحول اور اس وقت کا سارا تاثر، ساری خواب آگیں کیفیت دوبارہ لوٹ آئے، کسی طرح تمہارے ذہن میں منتقل ہو جائے۔ یہ کمیونی کیشن کہاتا ہے اور بڑی مشکل چیز ہے۔ میں آرٹسٹ نہیں ہوں، کمیونی کیٹ نہیں کر ستا۔ طاعت شاید ایسا کر سکے۔

بہر حال تفصیلات ملاحظہ ہوں:

یہ دیکھئے۔ یہ بینٹ ہال ہے۔ میں اس کی ایک اوپھی شہنشیں میں بیٹھا ہوں اور

ریڈ یو کے لیے کانو و کیشن کی کونٹری سنارہا ہوں۔ نیچے و سعیج و عریض کو اڈرینگل میں سیاہ کیپ اور سیاہ گاؤن میں مابوس مخلوق ادھرا ہر چل پھر رہی ہے۔ سر بزر گھاس کے قطعے اور سرخ اور زرد کینا اور الہ کے تختے۔ سنک سرخ کی عمارت کے سائے ساریوں اور سیاہ چخوں اور فیکٹشی کے زرتار منقش لمبا دوں کے سارے رنگ آپس میں گذہ ہو گئے ہیں۔ وقت تیزی سے اڑتا جا رہا ہے۔ اس کی پرواز کی سننا ہٹ میرے کانوں میں آ رہی ہے۔ نیچے گھاس پر بہت سارے لوگ جمع ہیں اور موڑوں کی قطاریں کھڑی ہیں۔ بھیا صاحب نیچے سرخ قالینوں والے طویل راستے کے کنارے کنارے چمپا باجی کے ساتھ ساتھ چلتے دھرے کو اڈرینگل کی طرف جا رہے ہیں جدھرا ہٹ ہوم کے لیے سفید میزیں پھیلی ہیں۔ لاڈ اسپلائر پر یک خفت نیوٹھیٹر زکانیا ریکارڈر گا دیا گیا ہے:

”یہ کوچ کے وقت کی آواز۔“ پھاڑی سانیال کی آواز سارے میں گوشیت جا رہی ہے۔۔۔ پھاڑی سانیال بادامی رشمیں کرتا پہنے، دھوتی کالمبا پلو ہاتھ میں سنجالے میرس کالج والوں کے ساتھ کرسیوں کی ایک قطار میں بیٹھے ہیں اور نہس نہس کر کسی بنگالی لڑکے سے با تمیں کر رہے ہیں۔ دوسری طرف ازابلا تھوبرن کالج کی لڑکیوں کا پر اپنے امریکن اسٹاف کے ساتھ گھاس پر سے گزر رہا ہے۔ سامنے سے واکس چانسلر حبیب اللہ آر ہے ہیں۔ ان کے ساتھ بہت سے جغا دری پروفیسر اپنی اپنی قبائیں پہنے راستے پر رواں ہیں۔ ایک دن ایسا ہو گا جب ان انسانوں میں سے ایک باقی نہ بچے گا۔

اب میں مائیکروفون اپنے پوچھے متھری شنکر کے ہاتھ میں دیتا ہوں۔

ہلو۔۔۔ میری آواز آرہی ہے۔۔۔ ہلو۔۔۔

ہلو۔۔۔ ہاں۔۔۔

(ہری شنگر نے، جو یہ پ کے پچھے اندر ہرے میں چھپا بیٹھا تھا، جواب دیا اور ایسا معلوم ہوا جیسے اشیج کے باہر سے اس کی آواز مانیک پر گوئی ہوئی آرہی ہو، وہ خود نظر نہیں آ رہا تھا۔)

ہلو۔۔۔ ہلو۔۔۔ میں، ہری شنگر، اب آپ سے بات کر رہا ہوں۔ میں ہری شنگر سر یواستوا، ممال کا ہمزاد۔ لاج اور نر ملا کا اکلوتا بڑا بھائی۔ چمپا باباجی کا رفیق۔ میرا کردار بھی خاصاً ہم ہے۔ میرے کردار کے بہت سے پہلو ہیں۔ میں کہانی میں اتنے سارے مختلف روں ادا کر رہا ہوں۔ میں بات کس طرح شروع کروں؟ اشیج پر کیسے داخل ہوں؟ یہ بڑا لگھا لیا ہے۔

سامنے وسیع سبزہ زار ہے۔ ہزاروں لاکھوں پچھول گھاس پر کھلے ہیں۔ گلب، لالہ، سوہیٹ پی۔ درختوں کی ہری تارنجی پتیاں جاڑوں کی شہری دھوپ میں جھلما رہی ہیں۔ اپی گاؤں پہنے اپنے ساتھ کی لڑکیوں کے ساتھ اگلی قطار میں جائیجھی ہیں۔ بھیا صاحب اور چمپا باباجی آم کے درخت کے نیچے کھڑے بڑی مصروفیت سے کسی دوست سے گفتگو میں محو ہیں۔ کینگ کانج کے وسیع کواڈرینگل میں چاروں اور قالیں بچھے ہیں اور صوفے اور سرخ قالینوں والے راستے ایک عمارت سے دوسری عمارت تک جا رہے ہیں۔ اب مجھ کم ہو گا۔ شام کو لڑکیوں کے غول اپنی تصویر یہیں کھنچوا نے حضرت گنخ جائیں گے۔ لڑکے قہوہ خانے میں اکٹھے ہوں گے۔ یہ یہاں کی پرانی ریت ہے۔ ہر سال یہی سب ہوتا ہے، پھر ان موقعوں کے

گروپ فریم کر کے دیواروں سے لکا دیے جاتے ہیں اور وقت گزرتا ہے اور ان کے کانفرنس پلیے پڑ جاتے ہیں۔

مال نے شاید آپ کو بتایا ہو گا کہ میں اس کا بڑا چھپتا دوست ہوں۔ اس کی بہن تہمینہ سے، جسے گھر میں اپی کہا جاتا ہے، مجھے اتنی بھی محبت ہے جتنی لاج اور زمل سے، لیکن میرا اور مال کا اپی کے لیے دوڑ بھاگ کرتے کرتے ناک میں دم آ جاتا ہے۔ ”اللہ، ہری شنکر ہمارے لیے بامات سے یہ جو توں کی جوڑی بدلواتے لانا۔“ اے میاں ذری آج امین آباد جاؤ تو حاجی صاحب سے کہنا ہماری ساری کتب تک رنگ کر دیں گے؟“ اے جناب! حضرت غنچہ جاتے ہیں؟ ذرا ہمارے اور لاج کے لیے ماری والوں کے دو بلکھ خرید لائیں گا۔“

”خدا کے لیے اپی آخر تمہاری وہ سائیکل کس مرض کی دوا ہے۔ ایسی کاہنی بھی کس کام کی،“ میں بعض دفعہ جھنجھلا کر کہتا، ”اور اتنی بڑی جہاز کی جہاز موزہ جو گیراج میں پڑی جھک مارتی ہے، وہ کس دن کام آئے گی۔ اتنی گھام میں ایسی ایسی بیگار کرو اکے ہم مزدوروں کا خون پسینہ ایک کرواتی ہو۔“

”اے بھین۔۔۔ میرس کالج جا کر گیاں سے مانا اور اس سے کہنا کہ نیڈل ورک کا وہ والا نمبر بھجوادے جس میں۔۔۔“ لاج کھڑی میں سے سر نکال کر حکم چلاتی۔

”لا حول ولا قوۃ۔“ غصے کے مارے دل چاہتا کہ ان دونوں چڑیوں کی چیزاں پکڑ کر گھینٹتا ہواندی تک لے جاؤں اور پانی میں ڈیووں۔

اگر مر گئیں تب بھی دونوں کے بھوت آ کر نیڈل ورک کے رسالوں اور سینما

کے ٹھوں کی فرماکش کیا کریں گے۔

میں ایک پیر سائیکل پر رکھتے ہوئے دوسرا برساتی کی سیڑھی پر نکا کر سگریٹ جلاتا اور اداسی سے دونوں کو دیکھتا ہے۔

”میرا انہر یہی کارڈ ہی کہیں گم ہو گیا۔ شنکر میاں، یکورا انہر یہی تک جا کر۔“
اپی اطمینان سے گھاس پر بیٹھے بیٹھے آواز دیتیں۔ اب وہ یونیورسٹی میں پہنچ چکی
تھیں اور ہماری مصیبتوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔

”بھیں، آج شام کو پکھر نہیں دکھاؤ گے۔“ لاج اپی کی شرپا کریوتی۔
”چپ رہ چڑیاں۔“ میں غراتا۔

”اچھا ہے۔ ڈامٹ لو غریب کو۔ بچاری چاروں کے لیے نہر میں مہمان
ہے۔“ اپنی بڑی رفت خیز آواز میں کہتیں۔

”اور کیا۔ کرلو کمیونیٹی پین۔“ لاج حوض کی منڈر پر بیٹھ کر پیر بہلاتے ہوئے سوں
سوں کرتی۔

”ہم کوئی چمپا باجی ہیں جو ہم کو کافی ہاؤس لے جا کر آنس کریم کھلاؤ۔ ہم تو
بچاری لاج اور اپی ہیں۔“

”چمپا باجی۔۔۔ ان کا کیا ذکر ہے۔“ میں ہڑ بڑا کر کہتا اور پیڈل پر زور سے
پیر مار کر زنائے کے ساتھ برساتی کے باہر نکل آتا۔

اکثر شام کو اپی اور مال کی چھوٹی بہن طاعت میرس کالج سے لوٹتے میں
میرے گھر میں رک جاتیں۔ میں اپنی برجی کی کھڑکی میں سے فٹن کو اپنی کوٹھی کی
طرف بڑھتے دیکھتا۔ سڑک پر عمیق سنانا طاری ہوتا اور اداسی اور موسم کے سارے

پھولوں کی مہک ندی کے پانی کی پر سکون ارزہ خیز موسیقی میرے کافوں میں پہنچتی اور جانے کا ہے سے میرا دل دھڑک اٹھتا۔ میرا ہزار دمال کہتا تھا کبھی وہ بھی چونک پڑتا ہے۔ اسے بھی بہت ڈر لگتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ہمارے دماغوں کی ایک ایک چوں ڈراؤ ڈھیلی تھی۔

جب ہم دونوں کسی سفر سے لوٹنے تو صحیح ہلکے خنک دھند لکے میں سندھیے کا چھوٹا سا آئیشن آتا تھا۔ (مال نے کہنا شروع کیا) ”یہاں لٹو ہوتے ہیں۔“

شکر نے خیال ظاہر کیا۔ عین اسی وقت ”لٹو سندھیے والے“ کی صدائیں دی۔ سرخ بھری کے پلیٹ فارم پر منتقل قصباتی شرفاء انگر کھے، دو پی ٹوپیاں، سفید ڈھیلے ڈھالے پاجامے، اجلی دھوتیاں پہنے، دوسری ٹرین کے انتظار میں اطمینان سے ٹھیلتے تھے۔ پلیٹ فارم کے کنارے چند پالکیاں رکھی تھیں۔

سفید پھولوں سے گھرا ہوا آئیشن جس کے عقب میں آم کے باغات تھے۔ باریک سرخ کانگنڈ میں لٹپی ہائڈیوں میں رکھے ہوئے لٹو بیچنے والوں کی صدائیں۔ دور سرخ چادر اوڑھے کوئی لڑکی بدا ہو کر جھکلو پھکو روئی آئیشن کے چائک کی طرف جا رہی تھی۔ اس کے آگے آگے تمیں چاروں یہاںی چل رہے تھے۔ دو لہانے ہلدی کے رنگ کا جوڑا پہن رکھا تھا۔

میں نے بر تھو پر لیٹے لیٹے ڈراسر اونچا کر کے کھڑکی سے باہر دیکھا، پھر گھری پر نظر ڈالی۔ اور پر کی بر تھو پر سے شکر نے آواز لگائی:

”میں ڈراؤ بھیرو کاریاض کرنا چاہتا ہوں، اگر تم ہر انہے مانو۔“

”میاں تم کو کون منع کر ستا ہے۔ تم بھیرو چھوڑ.....“

”آ۔ آ۔ رے۔ رے۔ دھاپا۔ گا۔ اوہو۔ ہو۔ جاگو
ارے۔ بھائی جاگو ہن،“ اس نے دھڑنا شروع کیا۔
”لا حول ولا۔ کس قدر ایلی مغربی بھیرو۔ یہ والا بھجن تو فرست ایری میں
سکھلا یا جاتا ہے۔“

میں نے کروٹ بدل لی۔ اور دوسری بات یہ کہ میں ذرا چند لذو کھانا چاہتا
ہوں۔“ میں نے اظہار خیال کیا۔

”اے میاں۔ اے بھائی۔ جہنم میں جائے تمہارا ریاض۔ تم خود کسی دن مجھ
سے یہی چیز درت میں سنبھال۔ اے بھائی۔“ میں نے آدمی بات شنکر سے کہنے کے
بعد پھر لذو والے کو آواز دی۔

”کہنے مہربان۔“ لذو والے نے کھڑکی میں سے اندر جھاکنکر کرنہا میت
شانتگی سے دریافت کیا۔

”جاگو۔ ہی ہی۔ اے کیا مر کیاں لیتا ہوں۔“ شنکر چلتگھاڑتا رہا۔
”وراد ماغ پر زور ڈالا اور تصور کرو کہ یہ ابو والے ڈبے سے ایک مدھرتان بلند
ہو۔ گوال بال سب گئین چراوت۔“

اس نے اترہ اٹھایا۔

”تمہرے درس کو بھوکے ٹھاڑے۔“ میں نے غصے کے ساتھ گرج کر آواز
ملائی۔ ”میاں شنکر یہ بتیں محض افسانوں میں ہوتی ہیں۔ تم نے کافی نیا فلم
دیکھا ہے۔ ”جوانی کی ریت۔“ کہ
موہے ان بن یہ جلسہ سہائے نہ۔“

”کہاں دیکھا۔ ہم تو مرزا پور میں بیٹھے جھینک رہے تھے۔“

”کیوں گپ مارتا ہے بے۔ مرزا پور میں جھینک رہے تھے۔ تم مجھے نہ بھجو وہاں جھینکنے کے لیے،“ میں نے غصے سے کہا۔

”چلا جا بھائی اللہ تو ہی چلا جا۔ اور میری جان بخشنی کر۔“ اس نے ہاتھ جوڑ کر اتھا کی۔

یہ مجھے معلوم تھا کہ گپ ہاں کتا ہے نامعقول۔ خود ہی خود برداھوے کے لیے وہاں پہنچ گیا تھا اور مجھ پر رعب جھاڑ رہا تھا۔ میں ساری چھٹیاں اکیلا سوری میں بو رہوتا رہا اور ہری شنکر سر یواستوا تھے کہ مرزا پور میں بیٹھے کبھریاں الاپ رہے تھے۔ اب پچھلے ہفتے اماں بیگم کا خط پہنچا کر فوراً لوٹو۔ کلیان پور سے اپی بھی لوٹ کر آ رہی تھیں۔ یونیورسٹی کھلنے میں ابھی ایک ہفتہ باقی تھا مگر گھر میں ایک کر اس درپیش تھا۔ اماں بیگم نے لکھا تھا کہ خدا خدا کر کے بھیا نے بیاہ کے لیے ہاں گردی تھی۔ سب کے ہاتھوں کے طو طے اڑ گئے کہ بھیا نے ہاں کی تو لڑ کی مدارو۔ اطلاع ملی کہ اپی نے انکار کر دیا ہے۔ اب گھر پر ہائی مائڈ کا اجلاس ہونے والا تھا۔ شنکر بھی مرزا پور سے لوٹ آیا تھا اور لاج کے میاں سے ملنے کے لیے دلی پہنچا ہوا تھا۔ میں نے سوری سے اس کو تار دیا۔ مراد آباد کے آشیش پروہ مجھ سے آن ملا۔

”بھیا کی شادی کا کیا ہو گا۔“

”بھیا نہیں۔ لاج ہرمل سے پوچھنا کوئی لوٹ دیا ہے ان کی نظر میں۔ یہ اس قدر اڑ کیاں دنیا بھر میں بھری ہوئی ہیں مگر وقت پر کوئی نہیں ملتی۔“

”چمپا باجی بھی لکھنؤ پہنچ گئی ہوں گی۔ کیلاش ہوشل ہی میں رہیں گی نا۔“ شنکر

نے یکخت بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”پتا نہیں۔“ میں چپ ہو گیا۔ ”لا اُ ایک بیڑی دیو۔“ میں نے کچھ دیر بعد خالص یکے والوں کے لجھے میں اس سے کہا۔ اس نے خاموشی سے سگریٹ کیس اور پر سے پھینک دیا۔ میں پھر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔ اب ہم تیزی سے شہر کی اور آرہے تھے۔ عالم باغ شروع ہو چکا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میرا دماغ دراصل ایک قسم کا بھان متی کا پتارا تھا۔ میں بہت سی باتوں کو الگ الگ کر کے ان پر غور کرنا چاہتا تھا مگر وہ پھر گذرد ہو جاتی تھیں۔

چمپا بابی اس میں ایک ڈسٹرپ کرنے والے غصر کی حیثیت سے آ شامل ہوتی تھیں۔ میں ان کو نظر انداز کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اس سے کسی چیز کی ضرورت نہ تھی۔ بجز ایک سندلیے کے لذو کے۔ میں نے شنکر سے کہا: ”لذو پھیلکو۔“

”سما پت ہوئے۔“ اس نے اطمینان سے منہ چلاتے ہوئے کہا۔ ”کیا چمپا بابی نے منگوائے تھے؟“

”وہ مجھ سے کون سی چیزیں منگواتی ہیں۔ میں کوئی بھی صاحب ہوں۔“ ”ہاں یہ بھی ٹھیک کہتے ہو۔“ شنکر نے عقائدی سے کہا۔ ”تم بھی صاحب نہیں ہو، میں مال رضا نہیں ہوں۔ اپی چمپا بابی نہیں ہیں۔ ہم سب الگ الگ ہستیاں ہیں۔ ہم اپنے اپنے دائروں میں زندہ رہیں گے۔“

”یہ ویدانت کاریکٹ مت چلا اُ سوریے سوریے۔“ میں نے غصے سے کہا۔

”اچھا۔ لذو لیو۔“

”تمہاری تو بڑی خاطریں ہوئی ہوں گی مر جا پور میں۔“ میں نے کروٹ

بدلتے ہوئے کہا۔

”ہاں آں۔ ہوئی تھیں۔“ اس نے بے عقلتی سے جواب دیا۔ ”مگر خاطر میں تو ہماری گورکھپور میں ہوئی تھیں پچھلے سال۔“

شنکر کا باقاعدہ کریز بنتا جا رہا تھا۔ ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں کہیں نہ کہیں برداخوے کے لیے بلایا جاتا تھا۔ تھاٹھتھے بھائی کے۔

”اب تواج کو بدآ کر کے بندہ چین کی بخشی بجائے گا۔“ اس نے آرام سے لیٹتے ہوئے انہمار خیال کیا۔

”کہیں۔۔۔ بہن کو بدآ کرتے سے بجائے اس کے کہرو، بیٹھے خوش ہو رہے ہیں کہ اب فرصت ہے لوٹدیوں میں گھومنے کی۔ یہ تمہارا اسمودنیس فیڈریشن کا ریکٹ فراڈ ہے سارے کاسارا۔ اس ہیراوی پانڈے کا کیا ہوا۔“

”اور میں تم سے سوال کر ستا ہوں کہ ابھور میں جو آپ وہاں کی ترقی پسند لڑکیوں سے بھائی چارہ کر رہے تھے پچھلے سال اور وہ اللہ آباد میں جو تھی شولیا بہادری۔۔۔ اور۔۔۔“

”میاں کیوں دل کو جلاتے ہو صبح صبح۔۔۔“

”اور کلکتے میں جو ہے وہ۔۔۔ کیا نام ہے اس کا۔۔۔ مدھر لیکھا مو جو مودور۔“

شنکر نے ہونتوں کی مخروطی شکل بنا کر بنگالی لبجے میں کہا۔

”جبھی تواج اور اپی کہتی ہیں کہ ہم لوگ سخت چپڑ قاتی ہیں۔“

میں نے اعتراف کیا۔

شنکر دھنٹا بڑا داس ہو گیا: ”دیکھو بہنیں ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”اوروہ بدآ ہو جاتی

ہیں۔“

ہاں میں چپ ہو گیا۔

لاج نے مجھ سے کہا تھا۔ ”مال بھیا: چمپا باباجی ایسی لڑکی ہیں مجھے لگتا ہے جیسے ان کی وجہ سے بہت سے لوگ بہت دلکھی ہوں گے۔“ لاج میں یہ چھٹا صس جانے کہاں سے آ گیا تھا۔ لڑکیوں کی تھاہ کون پاستا ہے بھلا۔
”شکر۔“

”ہاں یار۔“

”مزئین دریافت کریں گی اسکرپٹ مکمل کیا یا نہیں۔“

”اسکرپٹ چمپا باباجی کے پاس ہے۔ چلے جانا کیلاش ہوشل۔ کیا رکھا ہے۔“
جو بات میں ختم کرنا چاہتا تھا شکر معا اسی نقطے پر پہنچ گیا۔
”ہاں۔۔۔ نہیں۔۔۔ پتا نہیں۔“

یہ چار الفاظ ہم سب کی زندگیوں کا گویا مکمل عنوان تھے۔
ہاں۔۔۔ نہیں۔۔۔ پتا نہیں۔۔۔

ضرور جاؤں گا کیلاش ہوشل۔ واقعی اس میں رکھا کیا ہے آخر، وہ میرا کرہی کیا سکتی ہیں؟ وہ پہلی رنگت والی دلبی پتلی لڑکی۔ متوجہ آنکھوں والی۔ یو نین میں تقریر کرنے کھڑی ہوتی ہیں تو گھبرا جاتی ہیں۔ ابھی تک یہی طنہیں کر پائیں کہ مسلم لیگی رہیں یا کانگریس میں شامل ہو جائیں۔ ہر قسم کی عقل سے مخدور۔ ایک ہزار بار سمجھایا ہوائی جہاز ایسے اڑتا ہے، ریڈ یوائیسے بجتا ہے، گراموفون میں آواز اس طرح بھری جاتی ہے مگر ہر دفعہ مرغخ کی وہی ایک ٹانگ کے میرے پلے تمہارا

سامنے نہیں پڑتا۔ وہ کیا ادا ہے۔ جی ہاں میں ان سے کوئی ڈرتا ہوں۔۔۔ مطلق نہیں ڈرتا ہوں ان سے مجھ سے عمر میں ایک ہی آدھ سال بڑی ہوں گی مگر بزرگی پر اس قدر اصرار ہے کہ اگر بھولے سے با جی نہ کہا تو خفا ہو جاتی ہیں۔ میں بہت معمولی ہوں۔ انہوں نے بھیا سے کہا تھا۔ بھیا کون آئن شائن تھے۔ میں کون مارشل فوش ہوں پر بھیا صاحب چمپا باجی سے عشق فرمائے تھے تو لگتا تھا ہری پورہ کانگریس کا اجلاس ہو رہا ہے یا ہاؤس اوف لارڈز میں بحث کی جا رہی ہے یا سدھانت صاحب اٹھا رہا ہے میں صدمی کی نشر پر یک پھر دے رہے ہیں۔

اپی نے ایسا کیوں کیا۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ شادی سے انکار۔۔۔ شکر نے دھننا سوال کیا۔ میں نے غصے سے دامت پیسے۔ میں اس شکر سر یو استوا سے عاجز تھا۔ جو بات میں سوچتا تھا وہ بتا رہتی کی لہر کی طرح سے اس کے دماغ میں پہنچ جاتی تھی۔ یا پہنچے سے ہوتی تھی۔۔۔ ہمراو کی طرح کہیں اس سے مفرنہ تھی، اگر میں اس سے باتیں نہ بھی کرتا تھا تو بیکار تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا یہ ایسا پہنچا ہوا پرم نہ بن چکا ہے کہ اسے زبانی گفتگو کی ضرورت ہی نہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے بھگوان کرشن اور ارجمن کا درجہ رکھتے تھے۔ اکثر یہ درجہ ادلتے بدلتے رہتے تھے۔ جب سے چمپا باجی نے بنا رس سے آن کر لکھنؤ میں داخلہ لیا تھا اسے معلوم تھا کہ میں ان کے عشق حقیقی میں بتا ہوں۔ نہایت ڈھنائی سے وہ بھیا صاحب سے کہتا: ”چمپا باجی آپ کو بہت پسند کرتی ہے۔۔۔ ویسے آپ ہیں ہی پسند کے لاائق۔۔۔ مگر یہ کہ۔۔۔“

اور چونکہ اپی سے بھیا کی منگنی ہو چکی تھی اور اپی بھیا صاحب کو عام ہندوستانی

لڑکیوں کی طرح اپنا دیوتا تصور کرتی تھیں اور بھیا صاحب چمپا باجی پر دم دیے دے رہے تھے لہذا یہ پیشوائش نے انتہا گنگلک ہو گئی تھی اور یہ شکر کا بچہ نہایت خوبصورتی سے بھیا صاحب کو سمجھاتا رہتا تھا کہ وہ سخت غلطی پر ہیں اور چمپا باجی کی ایسی لڑکیاں تو ہر سال یونیورسٹی میں آتی ہیں، اپنی کا اور ان کا کیا مقابلہ، پھر اسے بھیا صاحب کے اس چپڑتالی پن پر غصہ آتا کیونکہ لاج کی مانند اپنی کو بھی وہ اپنی ذمے داری سمجھتا تھا۔

دراصل ہم لوگوں کی اور یجنل غلطی یہی تھی کہ ہم سب ایک دوسرے کو اپنی ذمے داری سمجھتے تھے اور زندگی کے متعلق نہایت سنجیدہ اور بھاری بھر کم اتصورات لیے بیٹھتے تھے۔

”اپنی کیا کریں گی؟ ابھی تو وہ ولایت بھی نہیں جا سکتیں۔“ اس نے فکر مندی سے کہا۔

”ولایت جانا ہی تو سارے دکھوں کا علاج نہیں ہے۔“ میں نے کہا، پھر مجھے ایک وحشت خیز خیال آیا۔ اپنی۔ کیا لاج کی طرح میں ان کو وداع نہیں کر سکوں گا۔ اپنی کی شادی کس سے ہو گی؟ ان کی زندگی میں خوشی کس طرح داخل ہو گی؟ بھیا صاحب کس قدر کہیئے، ذلیل انسان ہیں۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے، مگر بھیا صاحب تو شادی کرنا چاہتے تھے۔ اپنی ہی نے انکار کر دیا تھا مجھے معلوم تھا وہ کس قدر خوفزدہ ہیں۔ عزت نفس۔۔۔ خودداری۔۔۔ وغیرہ یہ الفاظ اس عمر میں مجھے، ہم سب کو بے حد اہم اور زور دار لگتے۔ ان کے الفاظ معنی بھی بدلتے رہتے ہیں۔ یہ ہمیں معلوم نہ تھا۔ نہ مجھے نہ اپنی کو۔۔۔ نہ غالباً چمپا باجی کو۔۔۔

کیونکہ ہم ابھی بہت کم عمر تھے۔

ٹرین اب مسافت میں داخل ہو رہی تھی۔ کھڑکی میں سے ہوا کا جھونکا کپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ اس میں آم کے پتوں کی مہک تھی۔ اب میلوں دور تک عالم باغ کا سلسلہ پھیلتا آ رہا تھا۔ بارش میں بھیگی ان گنت ریل کی پڑیاں۔ ریلوے ورکشاپ۔ کنارے کنارے پر پھولوں میں چھپے ہوئے بنگلے جن کے سامنے انگووانڈیں بچے کھیل رہے تھے، پھر ٹرین آہستہ آہستہ عالم باغ کو چھوڑتی ہوئی چار باغ جگنشن میں داخل ہوئی۔ ائمیشن کی سنک سرخ کی راجپوت، مغل طرز کی سینکڑوں نلک بوس بر جیوں، گندبوں، میناروں اور شہنشہنوں والی طویل و عریض عمارت کا سلسلہ جب ایک دم آنکھوں کے سامنے آ گیا تو دل ڈوب سا گیا۔ ہم لکھنؤ پہنچ گئے۔۔۔ میں نے دل میں کہا۔۔۔ گھر آ گیا۔۔۔ گھر۔۔۔

پلیٹ فارم کے شفاف سرمنی فرش پر لوگ زم روی سے ادھراً دھر چلتے پھرتے تھے۔ جیج پکار تھی لیکن اس شورو شغب میں تیرتے ہوئے جو جملے اور فقرے کانوں میں آتے تھے وہ سرشار نے اپنے نالوں میں لکھے تھے۔

ہم لکھنؤ پہنچ چکے تھے۔

ائمیشن کی برساتی میں موڑ داخل ہوئی۔ جسے قدر چار ہے تھے۔

موڑ میں بیٹھ کر ہم نے ٹرانس گومتی سول لائنز کارخ کیا۔ شنکر کو سنگھاڑے والی کوٹھی اتارتے ہوئے میں گھر پہنچ گیا۔

(اب خاموشی چھا گئی اور مکمل انڈھیرا۔ جیسے یہ سب کچھ یاد کرتے ہوں اور یاد نہ آتا ہو، پھر یہ ذہنی بلیک آؤٹ ختم ہوا اور مال نے دوبارہ کہنا شروع کیا):

تیرے پھر کا وقت تھا۔ آئیشن سے جب میں گھر پہنچا اپنے کمرے میں بیٹھی اکنا مکس کے نوٹس بنارہی تھیں۔ اماں بیگم اور خالہ تختوں والے کمرے میں بیٹھیں تھیں۔ قدر کی بی بڑی مصروفیت سے پان بنارہی تھیں۔ میں کوئی کے خاموش کروں میں ادھرا دھر گھومتا رہا، پھر میں نے آتا کر شکر کوفون کیا۔ معلوم ہوا آئیشن سے لوٹ کر نہانے اور کپڑے بد لئے کے بعد فوراً پھر باہر چلا گیا ہے۔

آخر میں نے سائیکل اٹھائی اور کیلاش ہوشل پہنچا، وہاں مزر و انچو سے معلوم ہوا کہ چمپا باباجی ابھی نہیں آئی ہیں، وہ اپنے ماموں میاں کے یہاں وزیر حسن روڈ ہی پر ہیں۔ میں بھینسا کنڈ کی طرف روانہ ہوا۔

چمپا باباجی کے ماموں میاں کے مکان میں لان پر ہمیشہ دھوپ کی سرخ اور سفید دھاریوں والی چھتریاں لگی رہتی تھیں۔ میں اندر گیا، وہ ایک چھتری کے نیچے بیٹھی تھیں، وہ بڑی بڑی مصروفیت سے اکنا مکس کے نوٹس بنارہی تھیں۔

دوسرا کرسی پر بھیا صاحب بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے۔ اے لیجے، وہ تو یہاں موجود تھے۔ مجھے آتا دیکھ کروہ اٹھئے اور ”ہلو مال، مسوی سے لوٹ آئے۔“ کہتے ہوئے بر ساتی کی طرف بڑھے جدھران کی سائیکل کھڑی تھی اور دوسرا لمحے وہ چالک سے باہر جا چکے تھے۔

مجھے بڑا عجیب سالاگا۔

آخر میں ایک ڈک چیز سائے میں گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

”بڑی گھام ہے۔“ چمپا باباجی نے بے وحیانی میں درختوں کی اور دیکھتے ہوئے کہا۔

”بھیا اتنی جلدی اٹھ کر کیوں چلے گئے۔“ میں نے کوشش کر کے ریڈیو کے اسکرپٹ پر دھیان دیتے ہوئے کہا جو میں ساتھ لیتا آیا تھا۔ ہوا پور یونیورسٹی کا کانووکیشن۔ میں نے بیدلی سے دیکھا۔

”اللہ بہتر جاتا ہے۔ یا تم۔ تم ان کے کزن ہو۔“

”بھیا۔۔۔ یہ اپنا پارٹ لیجئے۔۔۔“

”تمہارے گھر میں۔۔۔ انہوں نے کاغذات اٹھا کر کہا۔“ میں نے سنا ہے کہ ایک کرانس آگئی ہے۔“

”بھیا۔۔۔ یہ دوسرا اسکرپٹ کملاؤ دے دیجئے گا۔“

”تمہارا ہمزاد ہری شنکر۔۔۔ تم نے اسے کہاں روائہ کر دیا۔۔۔ آیا نہیں تمہارے ساتھ۔“

”پتا نہیں کہاں ہے اس وقت۔۔۔ دن بھر تو وہ بھیا صاحب کے ساتھ ہی گھومتا رہتا ہے۔“

”تم لوگ۔۔۔ کس قدر ڈرمیٹک ہو۔۔۔ چمپا نے کہا۔

میں نے ان کو غور سے دیکھا، وہ میز کے کنارے انگلیاں رکھے یوں بیٹھی تھیں جیسے وہ ان کا ہاتھ نہیں تھا کہیں اور سے وہاں آ گیا تھا۔

”کہاں گئے ہیں تمہارے بھیا صاحب۔۔۔“

”دہبی۔۔۔ کیا ادا س تھی۔۔۔ ہم سے سے خفاظتی۔“

اندر ریڈیو سے گیان و قی سمجھنا گر کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ دنیا میں حفاظت کا احساس تھا اور سکون اور شدید اضطراب اور جولائی کی دھوپ۔

(پھر طاعت نے کہنا شروع کیا): فتن موڑ پر سے اترتی ہوئی سڑک کے گرد ہوں پر سے گزر کر ایک دھچکے کے ساتھ سنگھاڑے والی کوٹھی میں داخل ہو گئی۔ یہ اس سال کی بات ہے جب اپنی

اختتام صفحہ نمبر ۲۲۳ از شہزاد رضا

دریا۔ صفحہ نمبر ۲۲۵ سے علی رضا صاحب کی منگنی ٹوٹی۔

ماج اندر سے نکل کر آئی۔ اس نے رعنفانی سارے باندھی ہے۔ اس کی شادی ہو چکی ہے۔ اس کے پاؤں میں بچھوے ہیں۔ اپنی اس کے ساتھ ساتھ بر ساتی میں آگئیں۔ اپنی نے ابھی بچھوے نہیں پہنچے۔ خالی وہ لڑکیا، جن کا بیاہ ہو جاتا ہے، یہ زیور پن سکتی ہیں۔ جب اپنی کا بیاہ ہوگا اور یہ بچھوے پہنہنیں گی تو ان کے بچھوئے پاؤں کتنے خوبصورت لگیں گے۔ برآمدوں کے ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں ساری کاپلو آگے ڈالے کنجیوں کا گچھا کمر میں اڑسائے وہ مصروفیت، تتمکنت اور گمینہ ہر تاکے ساتھ ادھرا ہر کام میں مشغول نظر آئیں گی۔ مگر بیاہ کی تو آج قدیر کی بیہی کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے مناہی کر دی ہے

میں گاڑی سے کو دکراند ر بھاگی۔

”اپنی آپ یہاں کب سے آئی ہوئی ہیں۔ اٹیشن سے آکر مال بھیا آپ کو پوچھ رہے تھے۔ ابھی جب میں شکلیہ کو اتنا رنے کے لیے بھینساکنڈ کی طرح سے گزری تو وہاں چمپا باجی کے لان پر دونوں کو میں نے بیٹھا دیکھا۔“

”کون دونوں _____“

”بھیا صاحب اور کمن بھیا _____ چھتریوں کے نیچے وہ امتاس کا درخت نہیں ہے چمپا باجی کے ماموں کے گھر میں وہیں۔ ہماری فنی سڑک پر سے گزرتی دیکھ کر انہوں نے بڑے زور سے ہاتھ ہلا کیا اور مسکرائیں _____ بے حد خوبصورت لگ رہی تھیں۔“ میں نے مستعدی سے ایک سانس میں سب بتا دیا۔ اپی اور لاج خاموشی سے روشن پر سے گزرتی بر ساتی اور بڑھ گئیں جیسے انہوں نے مرلی بات ہی نہیں سنی۔

میں چنیلی کی جھاڑی پھانگ کے نر ملا کی اور چل دی وہ اور ماتی رائے زادہ اوپر میوزک روم کی برجی میں پہنچی تھیں۔

”بھین تو مرزا پورا اور دلی گئے تھے تا۔“ ماتی نے پوچھا۔

”ہال صحیح ہی آئے ہیں مگر آتے کے ساتھ ہی سیدھے پہنچے چمپا باجی کے یہاں اس سے وسکس ڈالے ہوں گے۔“

”چمپا باجی کو اس روز میں نے گلیٹری کے گھر پر دیکھا تھا۔ لال ہری اہر یے کی ساری پہنچی اتنی سند رلگ رہی تھیں کہ کیا بتاؤں۔“ ماتی نے کہا۔

”بھین تو ہمارے لیے بھی اس قدر پیاری ہے پوری چجزی لائے تھے کہ بس۔ جب مال بھیا کے ساتھ راجپوتانہ گئے تھے۔ تب نرمانے لاج اور اپی کی لجھے کی تقلید کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے ایسا سند رہنگا بنوایا ہے دیوالی کے لیے۔ سیر بھر تو اس پر گوکھر وہی ہوگی۔ للوال جگل کشور کے یہاں سے۔“ نرمانے اطلاع دی۔

یہ گوکھر و اور بنت والے جوڑے سال کے سال ہی نصیب ہوتے تھے۔ دوالی، عید، بقر عید اور بس۔ اپنی وغیرہ کے مٹھائٹھ تھے کہ روز پارٹیوں کے لیے ایک سے ایک بڑیا ساریاں اور ڈھیلے پانچا مے اپنی الماریوں میں سے نکاتی تھیں۔ اپنی حالت تو یہ تھی کہ صبح کو نیلا یونک لادا اور پڑھنے چلے گئے۔ شام کو واپس آ کر دوسرا کوئی منحوس فرما کر پہنا اور تان پورہ سنبھالے میرس کا لج چلے جا رہے ہیں کتوں کی طرح۔ جب سے جنگ چھڑی تھی اور پڑل راشنگ ہوئی تھی فتنہ ہی اپنی قسمت میں لکھی تھی۔ موڑ صرف والدین کی سواری کے لیے مخصوص تھی۔ عید، بقر عید اس زیوں حالی پر ترس کھا کر جوڑا بنا دیا جاتا۔ اب اسے لادے ہاتھوں میں ڈھیروں پھما چم کرتی بنا رس کی ٹگوں والی چوڑیاں پہنے بیگمات کی طرح ٹھسے سے تخت پر چڑھے بیٹھے ہیں۔ کوئی نوش نہیں لیتا۔ یہ کیا فنسی ڈریس کیا ہے۔ مال دہاڑتا سناء ہے آج برمیلی کی ساری کاجل کی دکانوں میں ڈاکا پڑ گیا۔ بھیا صاحب فرماتے یہ کاجل کی لکیر کے ایکسٹشن کا کیا مقصد ہے۔ اگر ڈھیلا پانچا مہے پہنا ہے تو قرینے سے بیجوہ درختوں پر کیوں چڑھ رہی ہو، نیک بختو۔ خالہ بیگم کہتیں۔ تج تھوا رکا دن یوں فضیحتے میں لشنا، پھر نر ملا کی اجار (ازاریو۔ پی کی غیر شادی شدہ کا سعہنہ لڑکیوں کا پانچا مہے جو غرارے کی وضع کا ہوتا تھا) اور ہمارا ڈھیلا پانچا مہے اگلے تھوا رکے لیے اٹھا کر رکھ دیے جاتے۔ دوسرے دن سے پھر وہی موچی کے موچی۔

نر ملا اور مالستی جب چزیوں کا ذکر ختم کر چکیں تو اب نر ملا نے گہنوں کا قصہ نکالا۔ اس بھات پر تبصرہ کیا گیا جو دبے ماما لاج کے لیے لانے والے تھے۔ اس میں

زمرد کا جگنوکس قدر خوبصورت تھا۔ ہمارے مہماں بھی جو بحثات لے کر آئیں گے اس میں زمرد کا جگنو ہو گا، پھر اپی کو زبردستی سارے گھنے پہنچنے ہوں گے۔ بھیا صاحب ہاتھی پر بینہ کر آئیں گے، جیسے نر ملا کی کزن رامیشوری کا دلہا آیا تھا۔ اپی کے چہرے پر وہ سفید سفید بند کیوں والے نقش و نگار کرنے خوبصورت لگیں گے اور افشاں اور سیندور پھر چھاج میں سات قسم کا اناج رکھاں میں دیا جلا جائے گا اور اپی کے ہاتھوں میں چاندی کا گنگٹا باندھا جائے گا اور امام باندھی منگل گائے گی اور بھیا صاحب دلہابن کر کیسے لگیں گے

مگر اسی وقت مجھے قدیر کی بی بی کی بات یاد آئی۔ جب میں کانج سے وٹ کر چاء کی میز پر بیٹھی تھی تو قدیر کی بی بی نے مکھن والی سامنے رکھتے ہوئے بڑے پر اسرار انداز سے منہ لٹکا کر کہا تھا۔ بڑی بیٹھا نے بیاہ کے لیے منابی کراوی

”اپی کے بیاہ میں پہنچنے کے لیے میں تو بڑی بڑھیا ساری بناؤں گی کارچوپی۔“ نر ملا کہہ رہی تھی۔

پھر فلتا طاعت خاموش ہو گئی۔ دیکھو، اس نے مال سے کہا، میں نے محسوں کیا ہے کہ میرا ماضی صرف میرے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ دوسروں کے لیے، دنیا کے لیے اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ ان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔

”میرا ماضی محض میرا ہے۔“ مال نے طاعت کی بات دہرائی۔

”اور دنیا کو صرف حال سے دلچسپی ہے۔“ ہری شکر کی آواز گونجی۔

”لیکن ماضی حال ہے۔ حال ماضی میں شامل ہے اور مستقبل میں بھی۔ وقت

کی اس شعبدہ بازی نے مجھے بڑا حیران کر رکھا ہے۔ ” طاعت نے ادا سی سے کہا۔ ” میں وقت کے ہاتھوں عاجز آچکی ہوں۔ تم میں سے کوئی میری مد نہیں کرتا۔ ” ” تمہاری مد و طاعت ہیگم شاید آئن شائن بھی نہیں کر ستا۔ ” ہری شنکر نے کہا۔ ” میرے ماضی سے دوسروں کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ ” سال نے پھر ضد سے دہرا لیا۔

” وقت برابر موجود ہے۔ وقت مسلسل حال ہے۔ ” طاعت نے کہا۔ یہ لوگ، جو نندن کے ایک فلیٹ میں بیٹھے 1953ء میں یہ باتیں کر رہے تھے، ان کے سائے کھڑکیوں کے شیشوں پر منعکس رہے۔ باہر تیز ہوا میں چل رہی تھیں۔ موڑیں آ جا رہی تھیں۔ ریڈ یو میں سے وی آنا کے کسی کانسرٹ کی آواز آ رہی تھی۔

وقت کے اسی اندر ہیرے میں طاعت 1930ء کی جولائی میں سنگھاڑے والی کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھی نرملہ اور مالتی سے باتیں کر رہی تھی۔ اس طاعت میں اور اس لڑکی میں کوئی فرق نہ تھا مگر دونوں مختلف ہستیاں تھیں۔ جہا تما بدھشا کیہ منی نے کہا تھا کہ انسان ہر لحظہ بدلتا رہتا ہے۔ انسان بچپن میں کچھ اور ہوتا ہے اور جوانی اور بڑھاپے میں کچھ اور تم اس لمحے سے پہنچنے میں تھے۔ صرف تسلسل باقی رہتا ہے۔ پہاڑوں پر گلیشنر ٹوٹ ٹوٹ کر بہہ رہے تھے۔ ہوا میں۔ اندر ہیرا۔ وقت جو سیال تھا۔ وقت جو برف میں منجھد تھا۔

” ہم اپنا قصہ دہرا کر اپنا اطمینان کرنا چاہتے ہیں۔ ” ہری شنکر نے کہا، ” کیونکہ ہم بہت خوفزدہ ہیں۔ ”

”ہم وقت سے اور انڈھیرے سے خوفزدہ ہیں کیونکہ وقت ایک روز ہمیں مار ڈالے گا اور انڈھیرا ہماری آخری جائے پناہ ہوگا۔“ طاعت نے کہا۔

”اور گوم نیغمہ کا ذکر یہاں نہ کرنا۔ تم اصل موضوع سے بہت دور ہٹ رہے ہو۔ طے یہ کرنا ہے کہ زندگی میں اصل موضوع کیا ہے۔“ مال نے کہا۔

”میں چودہ سال قبل بھی موجود تھا اور اگر زندہ رہا تو چودہ سال بعد ہری شنکر ہی سمجھا جاؤں گا اور جب وقت کے سارے تجربے یہ اپنے اوپر کر لیں گے تو یہ جو چھوٹے چھوٹے تھیں یہ تینوں مرجانے میں گے اور ان کے علاوہ اور سب بھی جن کا اس کہانی میں ذکر ہے۔“
ہری شنکر نے کہا۔

(وقت کے پیڑن میں طاعت جہاں پہنچی تھی وہی طاعت اس پیڑن میں ایک جگہ اور موجود تھی اور دونوں نقطوں کے درمیان پرسوں کا فاصلہ تھا اور اس فاصلے پر انسان صرف آگے کی سمت چل ستا تھا۔ آگے اور آگے۔ پیچھے جانا ناممکن تھا۔ گوہزاروں طبقیں ان گنت غکروں میں منتشر ان گنت جگہوں پر موجود تھیں۔ جیسے آئینے کے نوٹے ہوئے غکروں میں ایک ہی چہرے کے مختلف عکس نظر آتے ہیں۔)

اب چراغ سارے میں روشن ہو چکے تھے۔ ندی کے کنارے ڈونگیوں میں
دیے جلے۔ ندی نے اپنا سفر جاری رکھا۔ برآمدے میں یہ پروشن کر دینے گئے
تھے۔ شید پر بر ساتی پروانے کے چکر کاٹ رہے تھے۔
لڑکیاں برآمدے میں بیٹھی رہیں۔

ستین پانی پر اولے دے رنگ کا کم خواب کا لہنگا پھیلا دیا گیا جس کی گوٹ
بڑے اہتمام سے طاعت تراش رہی تھی۔ گوٹ کاٹنے میں طاعت بڑی ماہر فن بیٹھی^ج
جاتی تھی۔ لاج ایک طرف کو ذرا بے نیازی سے بیٹھی یہ منظر دیکھتی رہیں۔ قریب
ہی ماتحت رائے زادہ بیٹھی تھی۔

پھر جب رات زیادہ ہو گئی تو نیشنے سے گنگا دین نے جواب تک حوض کی منڈیر
پر بیٹھا جمناہری سے با تمیں کر رہا تھا، آواز لگائی۔ بیٹھا چلنے
ماستی کو شہر جانا تھا، وہ بارود خانے میں رہتی تھی۔

”بھین آ جائیں تو موڑ سے تم کو پہنچا آ کیں گے۔“ لاج نے اس سے کہا۔
طاعت ان سب کوشب بخیر کہ کر نیچے اتری اور اب فتن نے رائے بھاری لال
روڈ کی طرف چلنا شروع کیا۔

چند فرلانگ چلنے کے بعد فتن ایک بڑی سیمنٹ کی کوٹھی میں داخل ہوئی جس
کے پائیں باغ میں رات کی رانی مہک رہی تھی۔ گھر کے سب لوگ پچھلے چبوترے
پر بیٹھے تھے۔ کریاں بیٹھی تھیں۔ پلنگ کے قریب نیبل فین رکھا تھا صراحیاں
گھڑوں پر دھری تھیں جن پر چنیبل کے سمجھے لپٹے ہوئے تھے۔ چبوترے کے سر
لے پر چھٹ والاراستہ تھا جو کھانے کے کمرے سے سیدھا باور چی خانے کی طرف

جاتا تھا۔ ادھر بگھاری کی خوبیوں آرہی تھی۔ برآمدے میں نماز کی چوکی پچھی تھی نیچے بہت سے بڑے لوٹے ایک قطار میں رکھے جائیں تھے۔

”کہو گوٹ تراش آئیں“ امال بیگم نے نماز کی چوکی پر سے پائیں پسیٹ کر چپلوں میں پیر ڈالتے ہوئے کہا۔

”اللہ رحم کرے لاج بے چاری کے جہیز کے کپڑے ہیں۔ ان کو اپنا تختہ مشق نہ بناؤ بے چارے رائے زادہ صاحب کے یہاں اتنے اللہ تملان ہیں ہیں کہ تم لاج کے کپڑے کاٹ پیٹ کر برادر کر دو تو نئے بخوا دیے جائیں گے۔

”مال نے کتاب پر سے سراٹھا کر آواز لگائی، وہ برآمدے میں در کے قریب نیبل یہ پچھپے پڑھ رہا تھا۔ اپنی کھانے کے کمرے میں پکھھر پڑ کر رہی تھیں۔ ہاتھ میں ایک ڈش لیے جب وہ باورشی خانے کی طرف جاتی نظر آئیں تو طاعت نے ان کو آواز دی۔

”اپی! کل لاج نے تم کو بلایا ہے۔“

”اچھا۔“ وہ باورچی خانے میں داخل ہو گئیں۔

”لاج باہر ہلکتی کیا ابھی سے ماں یوں بیٹھ گئی ہے۔“ خالہ بیگم نے پوچھا۔

”جانے ابھی سے اس کا بیاہ کر دینے کی کیا تک ہے۔“ مال بڑ بڑایا۔

”گونا تو اس کا بیاہ کے بعد ہوگا۔ کیا حرج ہے۔ میں تو کہتی ہوں بڑی بٹیا کا بھی اسی طرح بیاہ کر دینا چاہیے۔ نکاح ہو جائے۔ شخصتی اپنے جب دل میں آئے ہوتی رہے گی۔“ خالہ بیگم نے کہا۔

اپی کے بیاہ کا مسئلہ پھر سے چھڑ گیا۔ طاعت گنگاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

یہ مکان ”گلفشاں“ کہلاتا تھا۔ سامنے رائے بہاری لال روڈ بڑی خاموش سڑک تھی۔ دونوں طرف جو کوٹھیاں تھیں ان کے پھانکوں پر ناموں کی تختیاں خاموشی سے اپنی واقفیت کا اعلان کرتی رہتیں۔ نام، لوگ، خاندان، وجود کے تانے بازے، جھمیلے، گلفشاں کے پھانک کے اندر ایک حوض تھا اور سینٹ کی ایک نالی جو ستونوں پر بنی تھی، باغ کی سڑک کے ساتھ ساتھ پیچھے کے بڑے حوض تک جاتی تھی جس پر امرود کا ایک درخت جھکا ہوا تھا۔ اس حوض کے اوپر پانی کی موڑ لگی تھی۔ نالی کے ساتھ ساتھ چلو تو راستے میں کھانے کے کمرے کی فرنچ کھڑکی پڑتی تھی جس میں اشینہ پر آفتاب کھا رہتا تھا۔ اس میں روز تازہ پتے ڈالے جاتے تھے۔ اس فرنچ در پیچے میں سے جھانکلو تو اندر کھانا کمرہ نظر آتا اور اس کے آگے گول کمرہ جس میں بھی شیشے کے لمبے در پیچے تھے۔ گول کمرے کے عین طرف برآمدہ تھا۔ اس میں بھی شیشے کی کھڑکیاں لگی تھیں۔ اس میں بید کا صوفہ سیدھا پڑا تھا۔ برآمدے کے ایک سرے پر بھی صاحب کا کمرہ تھا۔ برآمدہ ساری کوٹھی کا چکر لگا کر پہلو کے چبوترے پر ختم ہوتا تھا جہاں بر ساتی تھی۔ اس کے آگے موڑ خانے کی طرف سڑک جاتی تھی۔ پھر عقبی حصے میں دولاں تھے۔ ان کے بعد شہوت کے درخت اور اس کے پیچھے سینٹ کا شاگرد پیشہ جو بڑی سی کاٹھ کی وضع کا تھا۔ یہاں سرکندے لگا کر ملازموں نے اپنے اپنے لیے آنگن بنایے تھے۔ گلفشاں کے ایک طرف کھلا میدان تھا جس کے اختتام پر دھویوں کی جھونپڑیاں تھیں اور پان والے کی گٹھی

ایک مرتبہ گلابی جاڑوں میں کیا ہوا کہ نشاطِ عجج کی بستی کے لوگوں نے اس میدان میں آ کر والی بال کے دو کھبے نصب کر لیے اور ایک شکستہ جانی ان کھبتوں سے باندھ دی۔ اب شام پڑے وہ غریباً غریباً، آ کر والی بال کھیل کرتے اور جھٹ پٹے میں ان کی آوازیں گونجا کرتیں۔ طاعت پچھے برآمدے میں تخت پر پیٹھی ان کی آوازیں سنا کرتی اور ہوم و رک کرتی جاتی عقیل لان کے وسط چوڑی سی روشن تھی۔ رام اوتار مالی گھنٹوں کھرپی لیے بے مقصد ادھراً دھر گھومتا۔ کبھی کسی درخت کے تنے میں کھرپی گھونس کر آسان کو دیکھتا رہتا اور طوطوں کو آم کے درخت سے اڑانے کے لیے عجیب و غریب آوازیں حلق سے نکالتا۔

نچلے طبقے کے لوگوں نے مہینہ بھر ہی والی بال کھیلا ہو گا کہ کوئیوں کے رہنے والوں نے میدان کے مالک سے شکایت کی۔ ان کی وجہ سے ماحدوں میں فرق آتا ہے۔ اس کے بعد سے والی بال کھیلنے والوں کا آنا بند ہو گیا اور میدان میں پھر ساناثا چھا گیا۔

احاطے کے پچھے ایک مندر بھی تھا صبح کو جس کے گھنٹے ڈانش بجا کرتے۔ مندر کے کنارے دھوپیوں کے چوبدھی کا پختہ دو منزل مکان تھا۔ اتوار کے روز صبح صبح ازا بلا تھوبرن کانج کی عیسائی لڑکیاں دھوپیوں کی بستی میں تبلیغ کے لیے آتیں۔ اردو بھجن گائے جاتے اور مٹھائی تقسیم ہوتی۔

برادر کی کوٹھی میں چکروتی صاحب تھے جو سپر ننڈنگ انجینئر تھے۔ ان کے لڑکے کے نام اوئیل تھا۔ لڑکی کا ریکھا جو سونے کے بنگالی وضع کے نوپ مینتی تھی جس میں جھا رلگی ہوتی ہے۔ یہ لوگ ڈھاکے کے رہنے والے تھے۔

اویل کانچ میں اپنے حسن کے لیے بہت مشہور تھا اور سن اگیا تھا کہ سجا تا سے اس کا بیاہ ہو گا۔ سجا تا اور نند بالا دو ہمیں تھیں جن کے لیے یونیورسٹی کے کسی اہم شعبے کے صدر اور بہت مشہور سائنس و ان تھے۔ سجا تا گلفشاں سے چوخی کوٹھی میں رہتی تھی۔ اس کے آگے ارچنا اور پر ناتی رہتی تھیں۔ یہ تو ام ہمیں تھیں اور ان کے باپ یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ کے صدر تھے۔ ان کے گھر میں پلنگوں کے بجائے تخت بچھے تھے اور ہر کمرے میں رام کوشنا پدم نہس کی تصویریں تھیں جو بنگال کے بڑے بھاری سنت گزرے ہیں۔ اس کے آگے بڑھ کر جپانی کوٹھی تھی جب کی اڑکیاں یونیورسٹی میں پڑھتی تھیں اور حسن و ذہانت کے لیے بے حد مشہور تھیں۔ اسی طرح اور بہت سی کوٹھیاں تھیں۔ ان میں ایک ہی طرح کے لوگ رہتے تھے۔ ان سب کے یہاں موڑیں تھیں اور ٹیلیفون لگے تھے اور صبح ہوتی تو ان کی اڑکیاں سائیکلوں پر اپنے اپنے چھانکوں سے نکل کر ازاں اپلا جھوپر بن کانچ یا یونیورسٹی کا رخ کرتی تھیں۔ یہ بڑا مستحکم اور مضبوط معاشرہ تھا۔ یہ بڑے شریف لوگ تھے۔ باوضع اور خوشحال اور باعزت۔ ان کے یہاں کے دستور بھی ایک سے تھے۔ رنج اور خوشیاں، مسائل یکساں تھے۔ ان کے فرنچس۔ ان کے باغوں کے پودے۔ ان کی کتابیں۔ لباس سب چیزیں ایک سی تھیں۔ ان کے ملازم، ان کے نام، ان کی دلچسپیاں۔

طاعت کے یہاں کا خانساں ماں بھی اسی قسم کا تھا جیسے اور سب کوٹھیوں کے خانساں ماں تھے۔ اس کا نام حسینی تھا۔

سارے باور شیوں کے نام حسینی، حسین بخش یا مدار بخش ہوتے ہیں۔ سارے

دھوپی نخواہاتے ہیں۔ سب کو چوان انگادیں ہیں۔ ساری فوکرائیوں کے نام بلقان، رسولیا اور حمیدن کی ماں اور مخور النساء ہوتے ہیں۔ سارے بیرے عبدال کہا تے ہیں۔ جس طرح طعام خانوں میں واکن فواز اور بدا کرنوں ہوتا ہے سارے باپوں کا نام خان بہادر ترقی رضا بہادر ہوتا ہے۔

ناولوں والے باپوں کا نام بھی بھی ہوتا ہے، اصلیت والے باپوں کا بھی۔ جبھی تو کہا جاتا ہے کہ ناول حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں۔ ویسے ادھرا ہر کی ہانکنے کی دوسری بات ہے۔

حسینی کو اماں بیگم نے طاعت کا ایک پرانا وورکٹ دے دیا تھا جس کے کالر پر فرگنی تھی۔ اب فر کافیش ختم ہو چکا تھا لہذا طاعت اسے کہاں پہنی اور حسینی صحیح صحیحی کی سمت جاتے ہوئے چھت والے راستے میں ہوں کرتا گزتا اور سو دے کے پیسے لینے کے لیے کمرے میں آتا۔ اب وہ فاظتی رنگ کا فرکوٹ پہنے کام کرتا اس قدر مسخرہ معلوم ہوتا کہ جس کی حد نہیں۔ قدر یہ اس پر خوشدنی سے ہستا۔ میم صاحب آوت ہیں۔ بہت جاؤ راستے سے۔

قدیر موڑ ڈرائیور، جب طاعت چار سال کی تھی، مال آٹھ سال کا اور بھیا صاحب ابھی سوڑ زلینڈ میں تھے، تب آن کران کے بیہاں فوکر ہوا تھا۔ قدر یہ مرزا پور کار پہنے والا تھا اور بے حد دلچسپ۔ اس کی بیوی کا نام قمر النساء تھا اور بچے کا پھدن۔ جب طاعت کے بڑے لبااناوے میں تعینات تھے تو ایک مرتبہ پھدن کو ضلع کے بیشوں میں لے جایا گیا اور اسے پہلا انعام ملا۔ اب پوچھنی کیا انعام ملا، ایک گاڑھے کی چھپی ہوئی چھوٹی لڑکیوں کے پہننے کی ساری اور ایک جھنجنخنا۔

قدیر کے یہاں اس روز عید ہو گی، پھر ایک روز قدر یہ کو کیا سو جھی کہ کیمرہ لوں گا۔ انگریزی رسالے گھر میں سب کو دکھاتے پھرے۔ اے بیٹا۔ اے بیگم صاحب۔ یہ کیمرہ کتنے کا ہے۔ پوچھو میاں قدر یہ تم کیمرہ کیا کرو گے؟ بیگم صاحب، پھلوں کھینچا کروں گا۔ خدائے سے مجھے پھلوں گرفی کا بہوتے شوق ہے۔ پھر قدر نے اپنی تختواہ میں سے پیسہ بچا بچا کر ڈیڑھ سورہ پے کا کیمرہ منگوایا اور تین نامگوں والا اسٹینڈ اور سورا اور محل والے پردے۔ اب دونوں میاں بی بی نے شرگرد پیشے کے آگے سر کنڈے کھڑے کر کے باقاعدہ اسٹوڈیو بنایا اور گھر بھر کی تصویریں کھینچی شروع کریں۔ بائی پورا اور یہ اور وہ جانے کون کون لوازمات منگوائے گئے۔ انہوں نے اپنی اور بھیا صاحب اور طاعت، مال اور سب کی سیکڑوں تصویریں کھینچ ڈالیں۔ تصیروں کے لیے قدر یہ کا بڑا ذردار تخلیل تھا۔ اپنی پیٹھی ستار بجارتی ہیں۔ پچھے پر دیپر سورا لاج رہا ہے۔ محل کے اوپر چاند نکلا ہے۔ حوض پر پریاں کھڑی ہیں۔ اپنی قلم ہاتھ میں لیے مغلکانہ انداز میں بیٹھی ہیں۔ مال اپنے سارے کپ اور ٹرافیاں سنجالے کھڑے ہیں۔ بھیا صاحب ٹینس کا ریکٹ ہاتھ میں لیے مسکراتے ہیں۔ خالہ بیگم اور اماں بیگم انتہائی سنجیدگی سے ہاتھ گھٹنوں پر رکھے بیٹھی سامنے کی اور دیکھ رہی ہیں۔ نزل اور لاج، رادھا اور کرشنا کے لباس میں کھڑی ہیں۔ نرملاء کے ہاتھ میں بانسری ہے اور وہ سخت پتھکل والا کرشنا کا پوز۔ ہری ٹنکر کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ تصویروں کے پوز کے متعلق قدر یہ کی اپنی اٹل تھیوریز تھیں اور اس معاملے میں وہ کسی کی رائے برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اپنی مانی کرتے تھے لہذا ان کے موڈانز کو بلا چون و چرا کیے ان کا حکم

ماننا پڑتا تھا۔ اب فرصت کے وقت میں میاں بی بی بیٹھے تصویریں دھور ہے ہیں، سکھار ہے ہیں۔ آٹھ آٹھ آنے کی لاگت میں ایک پوسٹ کارڈ سائز تصویریں بنتی بنتی تھیں۔

اپنا اپنا شوق ہوتا ہے۔

گرمیوں کی دوپہروں میں جب سارا گھر سو جاتا تو نوکروں کے کانچ سے قدری کے آہا گانے کی آواز باند ہوتی۔ کبھی جا کر دیکھو تو میاں قدریہ لیز پر اکڑوں بیٹھے پڑوں کا خالی ٹمن بخار ہے ہیں۔ قمرن ایک طرف کوئی بھی کروشیا سے جالی بنا رہی ہیں۔ آپ کو آتے دیکھا، فوراً پیٹل کی پن دنیا کھینچ کر پان بنانا شروع کر دیا۔ قمرن پور کی ساری عورتوں کی طرح بے حد سانوںی، سلومنی اور سبک بی بی تھیں۔ ہم وطن ہونے کی وجہ سے لاج اور زملا کی والدہ ہے ان کا بڑا یارانہ تھا۔ اکثر سنگھائرے والی کوٹھی بلواتی جاتیں یا جب مسزرائے زادہ گلفشاں آتیں تو فوراً قمرن کی طلبی ہوتی۔ نگین کنارے والی گاڑھے کی دھوتی باند ہے، جس کا پلوسے منے پڑا ہوتا، گھونگھٹ نکالے وہ روشن پر سے گزرتی چبوترے پر پہنچتیں اور ان کے پیروں کے جھا نجھن اطلاع دینے کے بہن قمر النساء آن پہنچتیں۔

ایک ریشمی ساری بھی تھی بہن قمرن کے پاس جو پورے اخبارہ روپے میں خریدی تھی اور وہ بھی لکلتے میں۔ جس روز کوٹھی میں کوئی تقریب ہوتی وہ ریشمی ساری اور اپنے سارے چاندی زیور پہن کر گھونگھٹ نکالے آن کر خاموشی سے کام میں مصروف ہو جاتیں۔ مہماں یہیوں کا استقبال کرتیں، ان کو سلیقے سے بٹھاتیں۔

قمر اور قدیر دونوں کمانوں کی اولاد تھے۔ ڈرائیور بننے سے پہلے قدیر اپنے
صلع کی کمان سمجھا میں شامل تھے اور چڑخ کا پر چار کرتے پھرتے تھے۔ یہ وہ
زمانہ تھا جب موتی لال کا ولایت پٹ بیٹا زمینداری کی بخش کرنے کے درپے
تھا، گاؤں گاؤں گھومتا تھا، کمانوں کی جھونپڑیوں میں رہتا تھا اور اودھ کے
کمانوں کا لیڈر بنا ہوا تھا۔ تعلقداری ستم نے کمانوں کی جو درگت بنارکھی تھی
اس سے قدیر سے بہتر واقف کون ہو ستا تھا؟ اسی لیے جب گلفشاں کے لان پر
مال کے دوست احباب سو شلزم پر لمبی چوڑی بجھیں کرتے تو قدیر بھی کسی نہ کسی
بہانے جا کھڑے ہوتے اور ان کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے۔ ان کی تو صرف
یہ معلوم تھا کہ ان کے گاؤں کے زمیندار، مٹھا کر صاحب کے سپاہیوں نے ایک روز
جب لگان ادا نہ ہونے پر ان کے باپ کو ڈنڈوں سے اس قدر مارا کہ وہ ختم ہو گئے
تو قدیر کو لکھتے جا کر کلیزی کرنی پڑی تھی اور ان کے گھر میں اب بھی روٹیوں کے
لائلے پڑے تھے۔ ان دونوں، یعنی ۳۱ کے لگ بھگ، کانگریس نے تحریک چلا رکھی
تھی کہ حکومت کو ٹیکس مت ادا کرو۔ گاؤں گاؤں یہ تحریک چل رہی تھی۔ حکومت اور
زمیندار ایک طرف تھے، کمان اور کانگریس دوسری طرف۔ قدیر کے گھر ایک
زمانے میں قالین بھی بننے جاتے تھے مگر سرکاری پالیسی اور مشینی مال کی درآمد کی
وجہ سے گھر یا صنعتیں تباہ ہو چکی تھیں۔ زمین پر بوجھ بڑھ گیا تھا اور زمیندار کو لگان
اواکرنا برق تھا۔ انہی حالات نے قدیر کے باپ کی جان لی، مگراب جو کچھ لکھنؤ شہر
میں ہو رہا تھا وہ قدیر کی عقل میں نہیں آتا تھا بے اطمینانی اور انتشار کی اصل وجہ
اقتصادی تھی۔ زمیندار اور کمان کا تصادم تھا۔ برطانوی حکومت اس بے اطمینانی کو

فرقہ وارانہ رنگ دے رہی تھی تاکہ عوام کا ذہن دوسری طرف متوجہ ہو جائے۔

شہر میں رہ کر قمرن کو اپنے مر جاپور کے گاؤں کی یاد بہت ستاتی اور سال دو سال بعد چھٹی لے کر دونوں اپنے گاؤں ہو آتے۔ دونوں میاں بی بی میں بہت محبت تھی۔ رام سیتا کی جوڑی اسکی۔

قمرابھی دس برس ہی کی تھیں کہ ان کا بیاہ، گوا سب ہو گیا تھا۔ یہ شاردا ایکٹ کے زمانے میں بھی غریب غرباً گورنمنٹ کی آنکھ میں کس طرح خاک جھونکتے ہیں! بی قمرن اب مر بھر کر پچیس سال کی ہوئی تھیں۔ قدریان سے دس بارہ سال بڑے تھے۔ ان دونوں کی محبت کو مثال کے طور پر دوسرے ملازموں بلکہ رشتے داروں تک کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ یہے بی قمرن دوسرے ملازموں کی نسبیوں سے میل جوں نہیں رکھتی تھیں کیونکہ موڑڑ رائیور کی الہیہ ہونے کی حیثیت سے ان کا سماجی رتبہ شاگرد پیشے کی سوسائٹی میں بہت اونچا تھا۔ ان کا قاعدہ تھا کہ دوپہر کو کھانا پکانے، جھاڑو بھارو سے فارغ ہو کر پھدن کو گود میں لیے کوٹھی میں آ جاتیں اور اماں بیگم کے بیڈروم میں محفل جمعتی۔ اماں بیگم تخت پر لیٹیں رسالہ نیرنگ خیال یا عصمت پڑھ رہی ہیں۔ خالہ بیگم نماز کی چوکی ہی آڑی آڑی لیٹیں ہیں۔ کوئی مہمان بی بی آئی ہوئی ہیں تو وہ بھی کسی مسہری پر نیم درواز ہیں۔ پاند ان سامنے رکھا ہے۔

”آ گئیں قدری کی بی بی _____ آؤ _____ بیخو“

قر بڑی مزاكٹ سے سب کو آداب تسلیم کر کے قالین پر بیٹھ گئیں۔ پھدن کو ایک طرف سلاویا۔ باجی اماں نے پان بنایا۔

”کہوں، آج کیا پکایا تھا۔“ خالہ بیگم پوچھتیں۔

”ارہر کی وال بھات اور منگو چیاں بیگم صاحب۔“

اس کے بعد کھانوں پر تبصرہ ہوتا۔ ترکاریوں کے بھاؤ اور بھی کے نزخ پر تبادلہ خیالات کرنے کے بعد گفتگو اپنے محبوب موضوع پر آ جاتی۔ شادی بیاہ کے قسم، کنبے کی سیاست، کس کی شادی کس سے ہو رہی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ قمرن ساری گفتگو میں پورا پورا حصہ لیتیں اور ان کی رائے کی قدر بھی کی جاتی۔ کبھی خالہ بیگم تخت پر لیٹے لیٹے کھریاں گنگنا نا شروع کر دیتیں۔ بھری گلری موری ڈھر کالی شام تو بی قمرن ان کے ساتھ ساتھ پنجی آواز میں گاتیں۔ ان کی آواز زیادہ اچھی نہ تھی پر علیین میں گا لیتیں۔

گانے میں میاں قدیر استاد تھے۔ نوئنکی کے گانے، تھیز کی غزلیں (میں فیش سے پوزیشن سے کھاؤ مٹن چاپ) کھریاں بارہ ماں سے، دادرے، بھریاں بہا، آہما اول۔ ہر چیز کے باڈشاہ تھے۔ ان کی پسندیدہ غزلیں مندرجہ ذیل تھیں:

انھاؤ نہ کھجو مڑے گی کلانی

گا کاٹو تاجک بدن دھیرے دھیرے

اور

شب غم کی آہیں بشر ہو رہی ہیں

مناتے مناتے سحر ہو رہی ہے

گانے میں قدیر اشعار کی صحت کا خیال رکھنے کا قائل نہ تھے۔ ان کے پڑوں کے میں پر آ کر سارے اشعار اور الفاظ ایک نیا روپ اختیار کر لیتے تھے جو صرف

ان کا فن تھا۔ ان کے چند پسندیدہ اشعار بھی تھے جو وہ شاگرد پیشے بھی تھے جو وہ شاگرد پیشے کی ادبی مخلوقوں میں پڑھا کرتے۔ ایک تھا:

عطر غاب خوبو لوڈرنے چھین لی
جنزی کی تمام کھریں ہلڈر نے چھین لی

قدیر گلکتہ پٹ تھے الہذا ان کا درجہ ویسے بھی بہت بلند تھا۔ جس نے گلکتہ دیکھا جا نو لندن، پیرس، ساری دنیا دیکھ لی۔ مال اور طاعت وغیر کے پچپن میں وہ اکثر اپنی وسیع معلومات سے ان لوگوں کو مستفید کیا کرتے اور بچے نہایت عقیدت سے ان کی باتیں گرہ میں بامدھتے جاتے۔ مثلاً ایک روز بنا رس کی ایک تارکوں کی سڑک پر قدیر پھوپھو کو موڑ میں بٹھائے کہیں لیے جاتے تھے۔ طاعت نے نہایت منکرانہ انداز میں ناخن کترتے ہوئے کہا: ”یہ پالش کی ہوئی سڑکیں تو بہت مہنگی بنتی ہوں گی۔ ہیں ناقدیر۔“

”جی ہاں۔ پیٹا۔“ قدری نے گلا صاف کر کے اسی منکرانہ انداز میں پچھپے مرتے ہوئے جواب دیا تھا: ”ایک روپیہ بھر جگہ مطلب سوا انچی سڑک پر پالش کرنے کا ایک ہی روپیہ خرچ بیٹھتا ہے۔“

افواہ۔ پچھلی سیٹ پر سے حیرت و استعجاب کا کورس ہوا۔

وہ کیسے قدری۔ طاعت نے پوچھا، وہ ہمیشہ کی بیوقوف تھی۔

”اب یہ دیکھ لیجئے۔“ قدری نے بڑی متانت سے جواب دیا، ”جیسے ایک ایک روپیہ کر کے سڑک پر بھاتی چلی جائیے، اتنے ہی روپے خرچ ہوتے ہیں۔“ اور وہ کھنکار کر غور و فکر میں ڈو بے موڑ چلاتے رہے۔

ایک بار انہوں نے بتایا کہ کلکتے میں صاحب لوگوں نے یہ ڈونڈیا تھی کہ جو دریہ موڑ سے مرغی مار دے اسے پچیس روپیہ انعام۔ بڑے بڑے دریہ آئے۔ مہاراجہ بھروسہ ان کا دریہ اور بنگال کے لاث صاحب کا دریہ مرغی سڑک پر چھوڑی گئی کوئی نہ مار پایا۔

نم نے مار دی ہو گی۔ طاعت نے اشتیاق اور عقیدت سے پوچھا۔

”جی ہاں۔ پیٹا،“ انہوں نے جواب دیا۔

”انعام کا کیا کیا،“ مال نے پوچھا۔

”دریہ کی بی بی کے لیے سونے (اس زمانے میں سونا پچیس روپیے تو لہ تھا) کے بندے بنوادیے،“

قرن چونکہ سارے میں ڈرائیور کی بی بی کہلاتی تھیں قدر بھی اسی نام سے مخاطب کرتے۔

تیرے پہر کو مال اور اپی اور طاعت اور بھیا صاحب اپنے اپنے کالجوں سے لوٹتے۔ گھر میں ایک دم چہل پہل شروع ہو جاتی۔ کھانے کے کمرے میں بڑن سکھنکھنا تے۔ چاء کی کشٹیاں تیار ہو کر مختلف کمروں میں بھیجا جاتیں یا سب اماں بیگم کے کمرے میں جمع ہو جاتے۔ ایک پیاری چاء قرن کو بنایا کر دی جاتی۔ اپی اور طاعت ان سے کچھ تبادلہ خیالات کرتیں۔ اتنے میں موڑ بر ساتی میں داخل ہوتی۔ قدری، خان بہادر صاحب کو عدالت سے واپس لاتے۔ موڑ کی آواز سن کر قرن گھونگٹ کاڑھ لیتیں اور پھدن کو گود میں اٹھا کر پھر اپنے کانج کی طرف روانہ ہو جاتیں۔

وہ بے حد وضع دار آدمی تھیں۔ برسوں اور دھن میں رہ لیں لیکن اپنی خوبیوں کے حصولی
۔ ایک مرتبہ حسینی خانہ مال کی بی بی نے ان سے کہا ۔۔۔ اے بہنی
کبھی کھڑے پائچے بھی تو پہن کر دیکھو۔ اور قمرن نے ہونٹ پچکا کر
جواب دیا تھا۔ ۔۔۔ ہم کوئی پتیراں ہوں ۔۔۔ جوای پہناوا پہنی ۔۔۔ الہذا
بہن قمر النساء اپنی گاڑھے کی سفید و حوتی ہی پہنا کیں اور اسی طرح گھونگٹ کاڑھے
گھومتی رہیں جیسے آج ہی بیاہ کر آئی ہوں۔ نہ کبھی شہر کی مہربیوں کی طرح انہوں
نے آتی ہوں، جاتی ہوں والی زبان سیکھی۔ جب انہوں نے پہلی مرتبہ لکھنو کی
لڑکیوں کی گفتگو سنی ۔۔۔ بڑی بیٹیاں اپنی کسی سہیلی سے کہہ رہی تھیں ۔۔۔ ”اللہ
آپ کہاں جاتی ہیں حضور، جائے آپ کا دین ایمان ۔۔۔ یہ اپنی گھن ادا میں تو
رسکھیے چھپر پر۔ میں کہے دیتی ہوں۔ ذری میرے دماغ میں بھی خناس ہے۔
” اور کوئی کی صاحبزادیوں ہی پر کیا موقوف تھا، مہربان اور ماما میں تک
ایک سے ایک فقرے باز پڑی تھیں ۔۔۔ تو قمرن حیران پریشان کھڑا سنا کیں۔
شاگرد پیشے میں واپس آ کر قمرن خوب نہیں۔ قادر یہ جب باہر سے کام ٹھدا کر آئے تو
ان سے ماجرا بیان کیا۔ شہر کی بیساں پتیرین ایسی ہوتی ہیں۔ سارا پہناوا بھی
پتیرین ایسا بائٹے۔ قادر یا کے اس بھولپن پر بہت نہیں اور ان کو دنیا کے حالات
سے آگاہ کیا کہ یہ پتیرین کی بولی نہیں، یہ مکملی اور بیگنا تی زبان کہلاتی ہے۔ تم بھی
اب اسی طرح بولا کرو: آتی ہوں، جاتی ہوں۔ اب تو خیران کو لکھنو میں رہتے دیں
سال ہوتے آئے تھے مگر اس کے باوجود حسینی کی بی بی کو اپنے خاص الخاص لکھنو
ہونے پر نا ز تھا۔ ان کے دادا پر دادا نوابی عہد میں شاہی رکاب دار تھے قمرن بے

چاری تو قصباتی بھی نہیں خالص دیہاتن تھیں لیکن قرن کی سماجی حیثیت (جس کا ذکر پچھلے صفحے پر ہو چکا ہے) حسینی کی بی بی سے بلند تھی۔ انہوں نے بھی موخر الذکر خاتون کا کبھی نوث نہ لیا۔ ان کی توز ملا اور راج کی والدہ مسز رائے زادہ کے علاوہ ایک گوئیاں اور تھیں۔ اس کا نام رم دیا تھا۔ ہم وطنی کا ناطہ بڑی چیز ہوتا ہے۔ کہاں رم دیا ذات کی اہیرن رام اوت ۵ ارمائی کی بی بی۔ صح شام اس کا آدمی اس کو پیٹے۔ نہ وہ طاعت کی آیا سون کی طرح فلمی گانے گا سکنے نہ حسینی کی بی بی کی طرح گھر سواں پائجامہ پہن کر نھک نھک چلنا اسے آئے، مگر وہی ہم وطنی۔ پر دلیں کی اس جبی دنیا میں رم دیا ہی قرن کا دکھ سمجھ سکتی تھی۔ شاگرد پیشے کی سوسائٹی میں مانی کا رتبہ بہت نیچے پہنچتا تھا مگر بہن قرن النساء کی چھوٹی تھی۔ تو رم دیا۔ رم دیا گور کھپور کی رہنے والی تھی قرن کی طرح نو دس برس کی عمر میں اس کا بھی بیاہ، گوناہب ہو گیا تھا۔ رام اوتار اس سے صرف تیس سال بڑا تھا۔ آج سے کئی سال قبل قرن کے میہاں آنے کے کچھ عرصے بعد ایک روز رام اوتار اسے ایکے پر بٹھانا آئیشن سے لائے تھے وہ رام بس کی سرخ ساری پہنے چہکو بیکو روئی اتریں۔ پہاڑ نہیں کوٹھی میں سلام کروانے کے لیے پیش کیا گیا۔ اس کے بعد شاگرد پیشے میں وہ دوسرے ملازمین کی بیبوں کے لیے موضوع گفتگو اور لڑکے بالوں کے لیے تماشا بنیں۔ چھوٹی سی دس سالہ دہن۔ سب سے آخر میں قرمن نے ان کے قریب جا کر ان سے باتمیں شروع کیں۔ معلوم ہوا یہ تو اپنے دلیں کی ہیں۔ ان کی بڑی بہن مسماۃ ہر دیا مرزا پوری میں قرن کے گاؤں میں بیاہی گئی تھیں۔ اے تجھے یہ تو بی رم دیا سے سہ صیانے کا رشتہ نکل آیا۔ بس اس دن سے رم دیا اور قرن گوئیاں تھیں۔

چھوٹ چھات کے باوجود اپس میں لین دین بھی رہتا۔ قمرن رم دیا کی جھلی پر چاء کی پتیاں اوپر سے رکھ دیتیں۔ لیو _____ کوٹھر یا ماجائے کے چاء بنا کے پی لو _____ اسی طرح پھل پھاری امر و دگنے سنگھارے سے ایک دوسرے کی تواضع ہوتی۔ جائزوں میں گھنٹوں شاگرد پیشے کے بھجوڑے پھلواری میں قمرن اور رم دیا کھاث پر بیٹھی باتمیں کیا کرتیں۔

ساریا ہر سنگھار میں رنگ کر منڈیر پر سکھائی جاتیں۔ چاول بینے جاتے قمرن دیا کو کروشیا سکھلاتیں۔ کبھی کبھی حسینی کی بی بی جوہی خانم ادھر انکھتیں اور دیکھتیں کہ دونوں پور بینیں بیٹھی چاول صاف کر رہی ہیں یا چادر پر منگو چیاں سکھاری ہیں تو حسینی کی بی بی ناک بھوں چڑھا کر سون یا زمرد سے کہتیں _____ دریبر کی بی بی نے بھی کیا! اہیرن سے پہننا پا گانہ نہ رکھا ہے۔

پھر جب پکار فلم نئی آئی اور اس کاریکار ڈکٹھی میں پہنچ تو ایک گاتا قمرن کو بے حد پسند آیا _____ دھویوں کا گاتا جس میں مرزا پور کا نام آتا تھا۔ مرجا پور میں اور ان ٹھورن کاشی ہمارو گھاث _____ قمرن طاعت کے کمرے کی دلیز پر اکڑوں بیٹھ جاتیں اور فرمائش کرتیں بیٹا وہ دھوبن والا تو اپھر بجائیے _____ اس کے علاوہ نگلن فلم میں قمرن کو ایک اور گیت پسند آیا تھا _____ ارے ارے بیہر سن رے بیہر۔ رمیا کی جورو نے لوٹا بجارت _____ اس میں رمیا کی بی بی کے بجائے قمرن، حسینی کی بی بی گاتیں ارو بہت خوش ہوتیں۔ جو باہمیں کی بی بی کسی دو ہے میں قمرن کا نام چپا دیتیں اور اسی طرح مزے مزے نوک جھونک چلاتی۔

اگنگا دین سائیس ابھی بچلر تھا الہذا کوٹھی سے لے کر شاگرد پیشے تک ساری

خواتین کو اس کے رشتے کی بڑی فکر تھی۔ خالہ بیگم نے ان گنت کھاریوں سے اس کی بات لگائی۔ رام اوتار تو اسے اپنا ہم زلف بنانے پر ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ اس کی ایک چھ سالہ سالی گور کھپور میں موجود تھی۔ رم دیا بھی اس کی بہت خاطریں کرتی۔ رم دیا کی بہن چھ سال کی تھی تو کیا ہوا؟ دو تین مرس میں بڑی ہو جائے گی، مگر مصیبت یہ ہوئی کہ گنجادین ضرورت سے زیادہ پڑھ لکھ گیا تھا اور شادی پر تیار ہی نہ ہوتا تھا۔

اس کے پڑھ لکھ جانے کی وجہ یہ ہوئی کہ گلفشاں میں میں اکثر مختلف النوع مشغلوں کی ہوا چلا کرتی تھی۔ ایک زمانے میں فی شخص نے میوزک سیکھنا شروع کی۔ بھیا صاحب برآمدے میں بیٹھے سورج بخش سریوں استوا سے فیض حاصل کر رہے ہیں۔ صبح صبح بھیروں اڑ رہی ہے: دھن دھن مورت کرشن مراری۔ تیسرے پہر کو چاء کی میز پر گانا ہو رہا ہے۔ سب آوازیں ملارہے ہیں۔ طاعت تو باقاعدہ میری کانج میں داخل تھی لیکن مال اور اپی سارے کزن لوگ پانچوں سواروں میں شامل تھے۔ خالہ بیگم ڈھولک کے گیت بہت اچھے گاتی تھیں امام باندی میرا سن مع اپنے خاندان کے تقریبون کے موقعے پر آ کر ہفتون گلفشاں میں رہتی تھی۔ سون اور زمر دووارے گاتی تھیں۔ قصہ مختصر بچہ بچہ رتن جھنکر بنا ہوا تھا، پھر جب قدری نے پھولو گرانی شروع کی تو فی کس ہر طرح کے کیمرے ہاتھ میں لیے گھوم رہا ہے۔ بیکتوں کی تصویریں کھینچی جا رہی ہیں۔ اس کا شوق بھی جلد ختم ہو گیا۔ اسی طریقہ سدھار کا سلسلہ کچھ عرصہ چلا۔ تعلیم باللغات کی تحریک ازابلا تھو مرن میں شروع کی گئی تھی۔ ہر اڑ کی پڑیوٹی لگائی گئی کوہ کم از کم دوان پڑھ لوگوں کو

زیور علم سے آرستہ کرے۔ خالی گھنٹوں میں لڑکیاں کمپس پر کانچ کے ملازوں کو پڑھاتی نظر آتیں۔ شام کو اس پاس غریب غرباء آ کر گلشنہاں کی برساتی کی سیڑھیوں پر پینچھے جاتے۔ برساتی کے بلب اور باغ کے لیپ کی روشنی میں الفاظ کے ہجے کرتے۔ گھر کی لڑکیاں اور لڑکے ان کو اردو اور ہندی سے فیض یا بکرتے۔ برساتی کا بلب اور باغ کا لیپ بہت مدھم تھا مگر غریب غرباء نہایت ذوق و شوق سے رات گئے تک پڑھتے۔ قدرِ سخت کندن ذہن ثابت ہوئے۔ دیسے بھی وہ بہت پسیر یہ تھے ان خرافات میں کیا پڑھتے۔ گنگا دین البتہ انگو چھاسر پر پیشتاب سے پہاڑ تعلیم بالغافل کی طرف لپکا۔ امین آباد کے پہنچ بھندزار سے ہندی کا قاعدہ خرید لایا اور سب سے زیادہ ہونہار شاگرد ثابت ہوا۔ اب تو خیر وہ بہت پڑھ گیا تھا۔ فرفر ہندی ناولوں کا مطالعہ کرتا تھا اور ارادہ کر رہا تھا کہ ہندی ٹڈل کا امتحان پاس کر ڈالے۔

چنانچہ گنگا دین چھ سالہ بچی سے بیاہ کرنے کی دقیانوںی تجویزیں سنی ان سے کر دیتا اور وہ کی طرح اس نے بھی بھیا صاحب کو اپنا آئندہ میل بنا رکھا تھا۔ جب بھیا صاحب ابھی بیاہ نہیں کرتا ہے تو ہم کا ہے کرمی۔ اسے طاعت نے یہ بھی بتا رکھا تھا کہ انگریزوں کے کوئی رڈیارڈ کپلنگ نے اس کا ذکر کیا تھا اور اس کے متعلق ایک فلم بھی انگریزی کے کوئی رڈیارڈ کپلنگ نے اس کا ذکر کیا تھا اور اس کے متعلق ایک فلم بھی انگریزی میں بن چکی ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ گنگا دین نہایت روشن دماغ ہستی تھی اور بھیا صاحب کا اصل جاں شارخادم لڑکپن میں وہ سائیمس کی حیثیت سے آیا تھا۔ شمبو کے مر نے کے بعد اسے کو چمچوں کا عہدہ مل گیا تھا۔ اسے اپنی فشن سے

بے حد محبت تھی اور اس کے مقابلے میں وہ قدری کی شیبور لے کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ فٹن بڑے ابا مر حوم کی تھی یعنی بھیا صاحب کے والد کی۔ ان کے انتقال کے بعد جب بھیا صاحب گلفشاں میں رہنے کے لیے آئے اور سارے ساز سامون کے ساتھ فٹن مع گنگا دین یہاں منتقل کر دی گئی۔ پڑول راشنگ شروع ہوئی تو فٹن گنگا دین کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ اب وہ قدری کو طمعنے دیا کرتے، چلا دنا اپنی موڑ یا ہمیں دیکھو۔ ٹلر کا کھانا نہ کچھ نہ کچھ۔ مزے سے دندناتے ہیں۔

گنگا دین بھیا صاحب کا رائق خاص تھا۔ ان سے اس کی وفاداری اس لیے زیادہ تھی کیونکہ وہ بہر حال ان کے مر حوم والد کا ملازم تھا اور ان کے گھر سے یہاں آیا تھا۔ اکثر بڑے سر کار کو یاد کر کے روتا۔ اپنی اور بھیا صاحب کے بیاہ کے سلسلے میں بھی وہ اپنی رائے محفوظ رکھتا کیونکہ گو دنیا کا کہنا تھا کہ یہ رشتہ ضرور ہونا چاہئے لیکن بھیا صاحب نے اپنی رائے محفوظ رکھی ہوئی تھی۔

بیر کا نام امیر خاں تھا۔ یہ بے حد نیک اور منجان مرنج فلسفی قسم کے انسان تھے۔ خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہتے۔ انتہائی مفصل سوالات کا صرف جی ہاں یا جی نہیں میں جواب دیتے۔ یہ بھی نہایت وضع دار آدمی تھے۔ بھلی تک کا ذکر بڑے احترام سے کرتے۔ آ گئیں۔ چلی گئیں۔ جی ہاں بیگم صاحب، دو دھ ابھی انہوں نے پیا ہے۔ ابھی کھڑکی میں سے کو دکر بھاگ گئیں۔

سنہ چالیس کے دسمبر میں طاعت کو جونیئر کمپریج کا امتحان دینا تھا۔ اسی سال ستمبر کے مہینے میں اسے ڈبل نمونیہ ہو گیا۔ روتے روتے اس نے براحال کر لیا ہمارا ایک سال بر باد گیا، ہمارا ایک سال بر باد گیا کی رٹ گلائے رکھتی۔ سارا گھر اس کی دلジョئی میں لگا رہتا۔ مال اس کے لئے کہیں سے ایک پرو جیکٹر انٹھالا یا، وہ نوابوں کی طرح تینی کے سہارے بیٹھ جاتی اور وہ سال پہلے کی خاموش فلمیں ملا خلطہ کرتی جو جانے کہاں سے حاصل کی گئی تھیں۔ دیوار پر گزرے ہوئے وقتلوں کے سامنے ڈولتے بڑے عجیب سے لگتے۔ روڈ ولف ویلینخو، ڈگس فیز نیکس، ٹھوریا سوان سن۔ دووس سال پرانی ہندوستانی فلمیں بھی تھیں جن میں سلوچنا گھوڑے کی سواری کرتی اور اپی بی بی موریہ تلوار چلاتا۔ اتوار کے دن اپی کی سہیلیاں جعلتی ہوئی آ جاتیں اور اس کے پاس بیٹھ کر چیں ہانکا کرتیں۔ یہ بڑی اسماڑت، باوقار اور سنجیدہ اڑکیاں تھیں۔

دن بھر طاعت پنگ پر لیٹی رہتی یا گنگا دین کو مزید ہندی پڑھاتی۔ اس نے مال، ہری شنکر، بھیا صاحب اور اپی کی مہیا کی ہوئی ساری دلچسپ کتابیں پڑھ ڈالیں مگر اس غم کا مد او اس کے پاس تھا کہ نومبر میں سالانہ امتحان تھے اور وہ بیکار پڑی تھی۔

ایک دن صبح صبح ہری شنکر اس کے کمرے میں آیا ”طاعت _____ انتیت مور کھکنیا استی“، اس نے بڑے ڈرامائی انداز میں سنکرت بولی۔
”کیوں۔“

”مت رو ہے نز بدھی _____ مت رو _____“

”کیوں نہ روؤں —“

”اس لئے نہ رو کہ تیرے گلیان کی ہم نے دیوستھا کر لی ہے — ہم تیرا داخلہ ہو والے اسکول میں کروار ہے ہیں۔ تو اپریل میں ہائی اسکول کا امتحان دینا اور مزے سے اگلے سال لامارٹینر کے نویں اسٹینڈرڈ میں گھس کرنے کے بجائے آئی۔ اُنی۔ کالج میں دندنا نا۔“

”رُجھیر ماما کے اسکول میں —؟“ طاعت نے سانس روک کر پوچھا۔
”ہاں۔“ ہری شنگر نے جواب دیا اور اسی ڈرامائی انداز سے دروازے سے غائب ہو گیا۔

نر ملا کو جب معلوم ہوا کہ طاعت ہائی اسکول کام امتحان دے کر آئی۔ اُنی۔ پہنچا ہی چاہتی ہے تو اس نے مہنا متحہ مچا دی۔ لہذا لامارٹینر چھوڑ کر طاعت کے ساتھ وہ بھی نئے اسکول میں بھیج دی گئی۔

ٹڑوالا اسکول اپنی جگہ ایک تاریخی اہمیت کا مالک تھا۔ لال باغ میں بیر روڈ پر ایک پرانی عمارت تھی جس میں شاہی کے وقت کا بڑا اپھانک برد جیاں، شہنشیں، غلام گردشیں اب تک موجود تھیں۔ اس کے آگے بڑا لان تھا۔ عمارت کے گرد اگر دیواری کی دیواریں کھڑا کر دی گئی تھیں جن پر نیلے چھولوں کی بیلیں چڑھی تھیں، یہ رکھو ماما کا سکول تھا اور بنا رس یونیورسٹی سے مسلک تھا اور گنی چنی لڑکیاں اس میں پڑھتی تھیں۔ بالکل گھر کا ساماحول تھا۔ برادر کے مکان میں رکھو ماما مع اپنے خاندان کے رہتے تھے۔ یہ بے حد فرشتہ صفت انسان تھے۔ پرانے مدرسہ فکر کے کائیں سمجھو۔ لڑکیاں، شہر کے چیزہ چیزہ خاندانوں کے سپریاں موڑوں میں بیٹھ کر آتیں اور

یہاں زیور علم سے آراستہ ہوتیں۔ یہاں اشاف اور لڑکیاں سب کا ایک دوسرے سے کوئی نہ کوئی ناط تھا۔ یہ رشتے خون کے نہیں بلکہ وضع داریوں کی وجہ سے قائم تھے۔ موئی ماما، باباجی، دیدی بھیا۔ اسی طرح حنفی مراتب کا خیال رکھا جاتا۔ بعض لڑکیاں بے حد لچک پ تھیں، مثلاً حمیدہ بانو جو وسط شہر کی ایک زبردست محل سرا میں رہتی تھی۔ شاعری کرتی تھی اور سخت رومینٹک روح تھی۔ پینا ماخڑ کھنک کی ماہر تھی اور ہر سال آل انڈیا میوزک کانفرنسوں سے یہ بڑے بڑے کپ اٹھاتی تھی۔ مہر آراء ایک ایسی نواب زادی تھیں جن کی خواص ان کی خاص دل ان لئے ساتھ رہتی اور چیچھے کھڑے ہو کر انہیں پنکھا جھلتی رہتی۔ یہ سب لڑکیاں ایک دوسرے کے خاندانوں کی سوپشن سے واقف تھیں۔ سب ایک طرح کے ماحول کی پروردہ تھیں۔ ان سب کی، اس شہر اور اس طبقے کی ساری سوسائٹی کی اس طرح جتنے بندی تھی جیسی چوروں کے یہاں ہوتی ہے۔

میوزک کلاس پھانک کے اوپر والے کمرے میں تھی۔ فرش پر نیلی دھاریوں والی دری چھپی تھی۔ اس کے پر ایر کی برجی میں تگ و تاریک زینہ تھا۔ برجی کے موکھوں میں سے ہلکی ہلکی روشنی اندر آتی۔ چھپنی کے گھنے میں لڑکیاں ان سیڑھیوں پر بیٹھ جاتیں اور حمیدہ بانو، جس کے یہاں ڈرامے کا احساس بے حد شدید تھا، اپنا سر ہلاکو بڑے پر اسرار انداز میں کہتی: ”شاہ زمِن غازی الدین حیدر کی انگریز سالی اشرف النساء بیگم یہاں رہتی تھیں۔ ان کی مہری کو باو شاہ کے آدمیوں نے اس زینے پر قتل کیا تھا۔“

”کیوں گپ مارتی ہو۔“ کسم بجٹ کرتی، ”اشرف النساء بیگم، وہ

جان ہا پکنے والہ زکی لڑکی؟“

”ہاں وہی۔“

”وہ تو بیگم کوٹھی میں رہتی تھیں۔“

”اپنی ماں سے لڑکر یہاں چلی آئی تھیں۔ مجھے معلوم ہے“

حمدیدہ بانو سے لکھنوی تاریخ کے متعلق کوئی زیادہ بحث نہ کر سکتا تھا۔ اسے دیکھ کر خواہ مخواہ یہ خیال آتا کہ یہ خود سو سال پہلے کے لکھنو کردار ہے جو اس پرانی برجی میں سے جھانک کر ہم سے با تمیں کر رہا ہے۔ ابھی زینے کا دروازہ بند ہو گا اور یہ غائب ہو جائے گی۔ طاعت کو یقین تھا کہ بڑی ہو کر حمیدہ بانو، بیگم عبدال قادر اور حجاب اقبال علی کی طرز کے افسانے لکھا کرے گی۔

پھر گھنٹہ بجتا اور گھوماما کی بی بی اپنے رسولی گھر سے نکل کر کمر پر ہاتھ رکھ کر چلاتیں ارے لڑکیوں چلو بانٹی پڑھنے یہ کاشتی دیدی تھیں اور ان کو دیکھ کر کسی کے سامنے وگان میں یہ بات نہ اسکتی تھی کہ یہ بی بی الہ آباد یونیورسٹی کی ایم۔ ایس۔ سی۔ ہیں اور اوپر سے گولڈ میڈل سٹ الگ۔ بوٹنی پڑھانے کے بعد وہ لپک کے پھر رسولی گھر میں جا گئیں اور گھوماما کے لئے کھانا بنانا شروع کر دیتیں۔

ایک مرتبہ کیا ہوا کہ اردو فارسی والے مولوی صاحب، جو ایک بہت بوڑھے کشمیری پنڈت تھے، بیمار پڑ گئے۔ گھوماما نے نرملاء کے کہا: ”ذری ہری شنکر سے کہہ دینا آکے اردو فارسی پڑھا جایا کریں۔“ چنانچہ اگلے روز ہری شنکر بہت رعب دا ب

سے کھنکھارتے ہوئے کلاس میں آئے اور نہایت سنجیدگی سے اردو پڑھانے میں مصروف ہو گئے۔ بنارسی یونیورسٹی کے مولوی گھیش پرشاد کا انتخاب اور ہری شنکر جیسے سخت گیر استاد کی پڑھائی۔ لڑکیوں کی جان نکل کر رہ گئی۔ اردو کے گھنٹے میں بُنگتی مہری باغ میں آ کر لڑکیوں کو مطلع کرتی ۔

”بیٹا چلنے ۔ ۔ ۔ چھوٹے مولی صاحب آئے گئے۔“

الہذا ایک ماہ تک جب تک انہوں نے اس جامعہ میں درس دیا یہ افیشل طور پر مولوی ہری شنکر کہاتے رہے اور اپنی سخت گیری اور بد مزاجی کی دھاک بٹھا کر واپس لوئے۔

صورت حال یہ تھی کہ کافی دیدی بوثنی پڑھاتی تھیں۔ ان کی خالہ زادہ، بن جو گشیوری دیدی سنسکرت کی استاد تھیں۔ ماتی رائے زادہ کے بھائی سورج بخش شعبہ موسیقی کے صدر تھے۔ ہری شنکر تو اردو فارسی پڑھائی رہے تھے۔ حالات قاوے باہر اس وقت ہوئے جب مس مونا داس کی شادی لال باغ کے میتھو ڈست چرچ کے آر گنٹ مسٹر جان فضل مسح سے قرار پائی اور انہوں نے مہینے کی چھٹمنی لی تو رگبیر ماما نے طاعت کو حکم دیا کہ وہ جغرافیہ کی کلاس لیا کرے۔ کس واسطے کہ وہ جغرافیہ میں بے انتہا ہوشیار تھی۔ یہ کلاس اس قدر پر لطف ثابت ہوئی کہ جب مزر فضل مسح علی ہستیوں والا نیا گرم کوٹ اور کانوں میں چھوٹے چھوٹے سونے کے بندے پہنے واپس آ گئیں تو لڑکیوں کو بڑا رنج ہوا اور انہوں نے گھڑوں پر چوں کے پاس ٹھنڈی زمین پر بیٹھ کر طاعت کو الوداعی پارٹی دی جس کے لئے رگبوماما کی رسولی میں پھلکیاں تیار کی گئی تھیں۔ اس موقع پر باقاعدہ تقاریر ہوئیں جن میں

طاعت کی استادانہ صلاحیتوں پر روشنی ڈالی گئی۔

وہ دن بھی ایک تاریخی اہمیت رکھتا تھا جب مسز فضل مسح نے اپنے نئے گھر میں لڑکیوں کی دعوت کی اور جب طاعت اپنی اکلوتی نیلی کارچوںی ساری پہن کر مقبرہ کمپاؤندھی کیونکہ اس روز سے پہلے طاعت نے ساری بھی نہیں پہنی تھی۔ آج اسے احساس ہوا کہ وہ واقعی بڑی ہو گئی ہے۔

حضرت گن میں انگریزی دکانوں کے درمیان ایک بڑا ساشاہی کے زمانے کا چھانک ہے جس کے اندر وسیع احاطے میں سامنے ہی او دھ کے دسویں حکمران احمد علی شاہ بادشاہ کا مقبرہ اور امام بارہ نظر آتا ہے۔ اس عمارت پر قیامت کی ویرانی اور خوست بر تی ہے۔ اس کے چاروں طرف احاطے کے کنارے کنارے جو کوٹھریاں بنی ہیں۔ ان میں اب نخلے متوسط طبقے کے عیسائی رہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے چھوٹے چھوٹے کمروں کے آگے صاف ستھرے با غیچے لگا رکھے ہیں۔ ان کمروں میں ننھے منے ڈرائیک روم ہیں۔ ان میں کانچ پیانور کھے ہیں کھڑکیوں میں جالی کے پردے پڑے ہیں۔ عیسائی عورتیں نیچے نیچے فرماں یا اٹنگی ساریاں پہننے اپنے با غیچوں میں کھڑی ہو کر اپنی اولاد کو کھیلتا کو دتا دیکھتی ہیں۔ یہ بڑے خاموش طبیعت اور شریف لوگ تھے اور ان کا اس قسم کی زندگی سے واسطہ نہیں تھا جس کے ساتھ عام طور پر اس فرقے کے افراد کو منسوب کیا جاتا ہے۔ مثلاً ان کی نوجوان لڑکیاں آوارہ نہیں تھیں اور ان کے لڑکے جیز پہن کرنا پتے نہیں تھے۔ اس وقت امریکہ لاکھوں میل دور تھا۔

مقبرہ سال بھرا جاڑ پڑا بھائیں بھائیں کرتا رہتا۔ خالی محرم کے زمانے میں

اس میں چہل پہل ہوتی۔ تب زبردست زنانی اور مردانی مجالس ہوتی تھیں۔ امام باڑے کے چبوترے کے نیچے کوٹھریوں اور تہہ خانوں میں عیسائی فقیر نیاں رہتی تھیں۔ بعض مرتبہ تو ایسا محسوس ہوتا کہ بے چارے امجد علی شاہ بادشاہ خود بھی ہندوستانی عیسائی تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب جنگِ اورڈم نے لکھنؤ پر قبضہ کیا تو اس امام باڑے میں انگریزی چرچ بنالیا گیا تھا اور لارڈ کینگ اس میں عبادت کرنے کے لئے تشریف لائے تھے۔

یہاں سابق مس مونا داس اور موجودہ مسز فضل مسح نے اپنے چھوٹے سے انہیانی نفاست سے بچ ہوئے ڈرائیگ روم میں اپنی طالبات کو چاء پلانی اور لڑکیوں نے ان کی شادی کا تحفہ، جو وہ راستے میں ایمن آباد سے خریدتی لائی تھیں، ان کو پیش کیا اور سب نے مل کر انگریزی گانے گائے۔

لامارٹینس کے خالص یورپین ماحول کے بعد ٹھرواں اسکول بالکل ایک دوسری دنیا تھی۔ طاعت اور ملما اپنے طبقے کے دوسرے افراد کی طرح دو رکنی فضاؤں کی پروردہ تھیں جسے انڈو یورپین تہذیب کہا جاتا ہے۔ اس طبقے میں بچے bilingual پیدا ہوتے تھے۔ انگریز گورنوں کے ساتھ ساتھ قصباتی کھلائیاں اور انہیں ان کی پروش کرتی تھیں۔ لڑکیوں کو کانونٹ اسکولوں میں پڑھایا جاتا تھا اور جب ان کی شادی ہوتی تھی تو وہ ہفتلوں مائیوں بٹھائی جاتی تھیں اور پرانے زمانے کی دہنوں کی طرح شرماتی تھیں۔ اکثر ان کی شادیاں ان کی خلاف مرض بھی کر دی جاتی تھیں۔ یہ لوگ موڈرن ہو چکے تھے لیکن اُڑا موڈرن نہیں بنے تھے۔ اخلاقی اقدار کے لحاظ سے یہ لوگ وکٹورین تھے اور اپنی نیٹور و ایات کے بھی بڑی

شودہ سے پابند۔ ظاہری طور پر انہوں نے مغربیت کارنگ قبول کر لیا تھا لیکن اصلیت میں بڑے سخت ہندوستانی تھے۔ ان لوگوں نے ایک بہت بڑے دورا ہے پر اپنے مکان بنارکھے تھے۔ یہ برطانوی نو آبادیاتی سماج تھا جو جا گیر دارانہ نظام کے تعاون سے بدلتے ہوئے ہندوستان میں پرانی بنیادوں پر کھڑا کیا گیا تھا۔ اس طرح کا معاشرہ مصر اور ترکی کے پاشاؤں کے یہاں بھی موجود تھا۔ رضا شاہ اور مصطفیٰ سال کے لائے ہوئے انقاب کے بعد ان ممالک میں سماج بالکل مغربیت زدہ ہو گیا تھا۔ اسی طرح کا دوغامہ ماحول ملایا اور انہوں نیز یا کے اوپری طبقے میں موجود تھا۔ شنگھائی اور ہانگ کانگ اور مکملہ اور سمبھی ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں تھیں مگر ہندوستان کے معاشرے میں یہ خصوصیت ابھی باقی تھی کہ یہاں کی اپنی دلیسی تہذیب کی اقدار اس قدر پائیدار تھیں اور ان کی کشش اتنی شدید تھی کہ یہ لوگ ترکوں یا مصریوں یا ایرانیوں کی مانند یورپ کی مکمل نقلی کرنے لئے تیار نہیں تھے انہیسویں صدی میں جو سیاسی شعور یہاں پیدا ہوا تھا اس کی وجہ سے ہندوستان تہذیب کی تجدید کی زبردست تحریک چلی تھی۔ اب ہندوستانی معاشرے پر زیادہ کانگریس کی تحریک چلی تھی۔ اب ہندوستانی آرٹ اور ہندوستانی معاشرے پر زیادہ زور دیا جا رہا تھا۔ اب مغرب زدہ کا لے صاحب لوگ کامداق اڑایا جاتا تھا۔ کانگریس کی تحریک نے اس تجدید کی روکوزیادہ تقویت پہنچائی تھی لیکن فرقہ پرست عناصر ہندو پر اچیس سنکرتی اور اسلامی عہد زریں کا ذکر کر رہے تھے۔ متحده قومیت اور خالص ہندوستانی تہذیب کے تصور میں رخنہ پڑ چکا تھا۔ اب یہ سوال سامنے آ رہا تھا کہ ہندوستانیت دراصل ہے کیا چیز؟ ایک سیاسی پارٹی کا کہنا تھا کہ مسلمان

علیحدہ قوم ہیں۔ ان کی روایات کے ڈنڈے مشرقی وسطی سے ملتے ہیں۔ ہندوستان سے انہیں کوئی مطلب نہیں۔ دوسری سیاسی پارٹی کا کہنا تھا کہ اس ملک کی اصل قوم ہندو ہیں، مسلمان غیر ملکی ہیں۔ ”گلفشاں“ کے شاگرد پیشے میں رہنے والی مرزاپور کی قمر النساء اور مردم دیا سے اس منسلک پر کسی نے رائے نہ لی کہ ہندوستان کے اصل باشندے تو تم لوگ ہو، تمہاری اس سلسلے میں کیا رائے ہے؟

بہر حال طاعت اور زمان اسی اوپری طبقے کی پروارہ لڑکیاں تھیں جن کو مغرب اور مشرق کے ملے جلے ماحول نے پروان چڑھایا تھا چنانچہ جب یہ دونوں امار ٹیکر سے نکل کر رکھوماما کے یہاں گئیں تو وہاں بھی اسی طرح گھل مل گئیں جس طرح وہ امار شیخ کی یورپیں فضاؤں میں گھلی ملی ہوتی تھیں۔

ہر تھوار کے روز رکھوماما کے آنگن میں ساری لڑکی جمع ہوتیں۔ کہاںی چڑھاتی جاتی۔ چھٹائیوں پر بیٹھ کر چھپی ہوتی ساریوں میں لچکا ٹانکا جاتا۔ ڈھولک پر جے اپنے گوری میا گایا جاتا۔ کیرتن اور قوالی ہوتی۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا کہ دروازے پر بارات آنے والی ہے اس خوشی باش خاندان میں میں چھپیں ہندو لڑکیاں تھیں، اتنی ہی مسلمان اور دو لڑکیاں عیسائی تھیں جن میں سے ایک لال باغ کے پادری صاحب کی بیٹی تھی اور فراک پر دوپٹہ اور ٹھکر آتی تھی۔ اس بشاش گھر یہ ماحول کے ساتھ ساتھ رکھبیر ماما کھلاوسے نے کانوالہ اور دیکھو شیر کی نگاہ کے نظر یہ میں یقین رکھتے تھے۔ پرانے مدرسہ فکر کے کاستھ تھے اور خود ان کو مکتب میں مولوی صاحب نے قچیاں مار مار کر پڑھایا تھا لہذا وہ بھی پڑھاتے پڑھاتے لڑکیوں کو ادھ موکر دیتے۔ بہت سخت قوم پرست تھے۔ ترک موالات کے زمانے میں جیل کاٹ چکے

تھے۔ اب منتظر بیٹھے تھے کہ کب مہا تما گاندھی حکم دیں اور کب وہ ستیہ گرہ شروع کریں۔ جنگ چھڑے ایک سال ہو چکا تھا۔ کانگریس کی حکومت مستحقی ہو چکی تھی۔ سیاسی حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔

مارچ کا مہینہ آیا اور لڑکیاں امتحان کے لئے بنارس جانے کو تیار ہوئیں۔ مال اور ہری شنکر، نرملہ اور طاعت کو اسٹیشن پہنچانے کے لئے آئے۔ تم چلو۔ ہمارے پرچے ختم ہو جائیں تو ہم بھی آتے ہیں چچھے پچھے بہت دونوں سے رام نگر کے آم نہیں کھائے۔ مال نے کہا۔ یہ ان دونوں کا پرانا وظیرہ تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں آئیں اور دونوں نے نکل گھر سے راہ جنگل کی لی سارے ملک کی خاک چھانتے پھرتے تھے جانے کہاں کہاں جاتے۔ اسٹوڈنس فیڈریشن کا جلسہ ہے، حیدر آباد دکن جا رہے ہیں۔ اندر رانہرو نے مینگ بلائی ہے۔ اللہ آباد کا قصد ہے۔ نلاں دوست کلکتے میں اکیلا بورہ ہو رہا ہے ذرا وہاں تک ہوا جائیں۔

”بنارس سے کہاں جاؤ گے؟“ نرملہ نے ہو چھا۔

”ارے ہم سنیا کی آدمی۔ ہمارا کیا پوچھتی ہو۔ جدھر منہ اٹھایاں نکل گئے۔“ مال نے منہ لٹکا کر کہا۔ لڑکیاں پلیٹ فارم پر اپنے سوت کیسون کے پاس کھڑے باشیں کر رہی تھیں۔ رکھوما اس فر کا انتظام کرتے بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔

”ایسے بڑے سنیا کی تو ہو۔ مغلہ بھگت کہیں کے۔“ نرملہ نے نہس کر کہا۔ ”کاشی کی پاٹ شالاوں میں بڑی منورہ کنیا کیں پڑھتی ہیں۔“ شنکر نے آنکھ بند کر کے کہا۔

”شرم کرو بھیں۔“ طاعت نے کہا۔ ”یہ سامنے تہاری اسٹوڈنٹ لوگ کھڑی

ہیں، کیا کہیں گی کہ مولوی صاحب ایسی افسونا کے باتیں کرتے ہیں۔“

ہری شنکر فوراً پیٹ کر بڑی سنجیدگی سے حمیدہ بانو کے پاس گیا اور نہایت رعب اور وقار کے ساتھ اس کو سمجھا نے لگا امتحان کے لئے غالب کی کون کون سی غزلیں پڑھے۔ ٹرین آئی اور یہ دلچسپ قافلہ بنارس کی طرف روانہ ہو گیا۔

۳۸

چمپا احمد نے بیسفٹ کالج کے کلس روم کے دریچے میں آکر نیچے نظر ڈالی۔ لو چل رہی تھی۔ دوسری کر پر ایک بگولہ اڑتا ہوا جا رہا تھا۔ سارے میں امتیاس کے زرد پتے تیرتے پھر رہے تھے۔ نیچے کالج کا وسیع بیرونی میدان گرمی کی ہے پہر میں پڑا تپتا تھا۔ جانے بارش کب ہو گی، چمپا نے سوچا۔ سفید کھادی کی ساریاں پہنے لڑکیوں کی ایک تو ٹلی کالج کی دوسری عمارت کی طرف جا رہی تھی۔ کلاس روم کے ڈاکس کے اوپر سے مزایی بیسفٹ کی بڑی روغنی تصویر مسکرا رہی تھی۔ یہ مسکراہٹ بھی چمپا کو بہت اوس معلوم ہوئی۔ گھنٹہ بجا اور لڑکیاں برادر کے کمرے سے نکل کر باہر آئی۔ لیا ابھار گوا کے ہمراہ اس نے زینہ طے کرنا شروع کیا۔ قریب کے ایک براہمی میں ہائی سکول کے امتحان کا کوئی پرچہ کیا جا رہا تھا۔ چھتری سنبھال کروہ اور لیا اسڑک پر نکل آئی۔ ابھی انہیں کسی پروفیسر سے ملنے یونیورسٹی جانا تھا۔ تا نگے پر پیٹھ کروہ یونیورسٹی کی طرف روانہ ہوئیں۔

یہ چمپا کی زندگی کا معمول تھا۔ بنت کالج، یونیورسٹی، گھر

‘جائزے، گرمیاں نہ سات’ پھر جائزے۔ بناres کا شہر اپنا مکان، محلہ، رشتہ دار، کتابیں وہ اٹھا رہے سال کی تھی لیکن بوڑھوں کی طرح سوچتی شاعروں کی طرح محسوس کرتی تھی؛ بچوں کی طرح نہستی یا رنجیدہ ہوتی تھی۔ کائنات کا سارا ابو جھاس کے کندھوں پر تھا۔ اس کے والد متوسط طبقے کے ایک شریف آدمی تھے۔ ماں بھی متوسط طبقے کی ایک شریف خاتون تھیں۔ ان کے یہاں کوئی گلیر نہ تھا، کوئی افسانے نہیں تھے، نہ کوئی روائیں۔ سید ہے سادے لوگ تھے جس طرح کے سید ہے سادے لوگ ہندوستان کے شہروں میں بستے ہیں۔ چمپا کے والد و کالت کرتے تھے۔ مراد آباد کے رہنے والے تھے۔ چمپا کی نہیاں بناres میں تھیں، وہیں چمپا کے والد پر یکیش کرتے تھے اوسط درجے کی آمدی تھی۔ ان کے یہاں نیلیفون نہیں تھا، نہ موڑ کار، نہ فریجندیر اور وہ لوگ کوئی میں نہیں رہتے تھے۔ چمپا اپنے ماں باپ کی اکلوتی اڑکی تھی۔ اس کا سارا راجہنیر تیار رکھا تھا۔ (ھڑا) ھڑا پیغام آرہے تھے۔ گھروالوں کا خیال تھا کہ چمپا بی۔ اے پاس کر لے تو اس کا بیباہ کر دیں گے۔ چمپا نے کسی کا نونٹ اسکوں میں نہیں پڑھا تھا۔ نہ وہ گرمیوں میں سوری جا کر روا رساکینگ کرتی تھی۔ اس کی نہیاں زیادہ خوشحال تھی، گودہ بھی مڈل کلاس ملازمت پیشہ لوگ تھے۔ چمپا کے ایک ماں بہت زیادہ خوشحال تھے اور لکھنو میں ہرتے تھے جہاں وزیر حسن روڈ پر ان کی کوئی تھی۔ چمپا کے والدیاست میں ہلکی چلکی دچپی رکھتے تھے۔ اس کے ایک پیچا مراد آباد سنی مسلم لیگ کے صدر تھے۔ ۱۹۳۷ء میں لکھنو میں جب دھوم دھام کا مسلم لیگ کا جلاس ہوا تو اس میں چمپا کے والد اور پیچا دونوں شرکت کے لئے گئے تھے۔ راجہ صاحب محمود آباد جب بھی بناres آتے

کے والدان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے اور پاکستان کے مطالبے پر تبادلہ خیالات کرتے۔ پاکستان بنا تو مراد آباد تک کاعلاقہ تو اس میں ضرور شامل ہوگا، کیا وجہ کہ مغربی اضاح میں مسلمان زیادہ طاقت ور ہیں۔ چمپا کے والد اظہار خیال کرتے۔

”اے واہ۔ مراد آباد پاکستان میں شامل ہو جائے اور ہم کاشی والے کہاں جائیں۔“ چمپا کی والدہ چمک کر کہتیں۔

”ابھی تم پوریوں کا کیا ہے۔ چلو تم کو بھی بلا لیں گے۔“ ان کے والد تھے کا کش لگاندا تھا جواب دیتے۔ ان مبہم اور جذباتی بنيادوں پر یہ لوگ سیاست سے کھیل رہے تھے۔

ویسے بھی بنارس میں روز کوئی نہ کوئی آل انڈیا قشم کا ہنگامہ رہتا۔ یہ شہر ہندو مہما سجا کا گڑھ تھا اور ہندی اتحاد ہندوستانی کی تحریک کا صدر مقام۔

اسی بنارس میں بیج گنگا کھاث تھا جہاں بیکر رہے تھے اور یہیں سارنا تھا۔ جہاں شاکیہ منہ گوتم نے ہرم کا چکر چلایا تھا اور یہیں وشویشور کا مندر تھا۔ یہ شو پوری تھی۔ شو _____ خدا نے سمرت کا شہر۔

چمپا بیسنٹ کانچ میں جوبنت کانچ کھاتا تھا، سینکند ایر میں تھی۔ اس سال اس نے اندر کا امتحان دیا تھا اور اب اسے ازابلا تھوبرن کانچ جانا تھا کیونکہ اس ادارے میں تعلیم حاصل کرنے سے اڑکیوں کی سماجی حیثیت یکخت بے انتہا بلند ہو جاتی تھی۔ چمپا کے والد والد ایک اچھے مسلم لیگی کی حیثیت سے اسے علی گڑھ بھیجننا چاہتے تھے مگر اماں نے کہا نہ۔ یہ ہرگز نہیں ہونے کا۔ پیٹا تو آئی۔ ٹی۔ میں پڑھیں

گی جیسے رانی پھول کنور اور رانی صاحب باری کی بیٹیاں آئی۔ اُنی میں پڑھت ہیں۔ چمپا کی اماں کو یہ بھی معلوم تھا کہ آئی۔ اُنی میں پڑھنے والی اڑکیوں سے آئی۔ سی۔ ایس لوگ شادی کرتے ہیں اور پھر ان کے بڑے بھائی لکھنو میں رہتے تھے اور وہاں کے سارے بڑے بڑے لوگوں سے واقف تھے۔

چمپا کا جس سے لوٹ کر آتی تو اپنے چھوٹے سے کمرے میں بینجھ کر، جو چھت پر تھا، افت تک پھیلے ہوئے شوالوں کے گلسوں کو دیکھا کرتی یا انگریزی ناول پڑھتی، وہ جیسیں آسمن پر عاشق تھی اور قرون وسطی پر اور انیسویں صدی کے کیشیں اور روزی نی وغیر۔ جب وہ یونیورسٹی لائزیری میں امیندرنا تھنگور اور نند لال بوس کی تصاویر دیکھتی تو اسے بے حد اچھا لگتا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ چمپا احمد بھی ایک رو میسخنگ روح تھی۔

لیا اپنے گوا کے ساتھ وہ یونیورسٹی پہنچی۔ یہاں بھی امتحان امتحان کا ماحول ہر طرف طاری تھا گہما گہما، چہل پہل۔ کچھ چہروں پر پریشانی تھی کچھ پر اطمینان۔ یہ سب جانے پہچانے چہرے تھے۔ یہ اڑکے اور اڑکیاں سب اسی کی دنیا کے باسی تھے۔ جمیع میں چمپا کو تقویت محسوس ہوتی۔ بھوم اس کے ساتھ ہے۔ بھوم اس کی حفاظت کرے گا۔ یہ لوگ سارے اس کے بھائی بند تھے۔ یونیورسٹی کے مختلف کالجوں کی طالبات، یونیورسٹی کیاں، مدرسی اور بناگلی بوڑھے پروفیسر، مہرائشتر کی سائنس دان خواتین، سنسکرت اور اور فارسی کے عالم فاضل۔ یہ سب جو تیزی سے اور مصروفیت سے ادھرا دھرا آ جا رہے تھے۔ یونیورسٹی علم کا گھر ہے۔ علم میں تعصب کس طرح داخ ہوتا ہے، یہ اسے معلوم نہ تھا۔ تعصب اور نفرت اور نگف نظری،

شکوک اور بہت دھرمی، ان بھتوں سے وہ ابھی روشناس نہ ہوتی تھی۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کے آس پاس کی دنیا میں بڑا زبردست شورچ رہا ہے اور یہ شورس کے دل کی اندر ولی خاموشی میں مخل ہوتا ہے تو بڑی تکلینف محسوس ہوتی ہے۔ سامنے ایک بڑے چبوترے پر شامیانے کے نیچے ہانی سکول کا میوزک کا پر چڑھ رہا تھا۔ چاروں طرف سے لڑکیوں کے ہلکے ہلکے گنگنا نے کی آوازیں آرہی تھیں۔ انہیں لڑکیوں میں تیز و طرار اور بیٹاش لڑکیوں کا وہ گروہ شامل تھا جو لکھنو سے آیا تھا۔ چمپا اور لیا اسز چھتا منی دیگر سے با تین کرنے مصروف رہیں جوان کی ہسری کی استاد تھیں سامنے سرسوتی کا مرمریں مندر تھا۔ ہندو لڑکے اور لڑکیاں فاؤ نشین پن اور کتابیں سنبھال لے آتے، دیوی کے سامنے سر جھکا کر دعا مانگتے اور اپنی اپنی امتحان گاہ کی طرف روانہ ہو جاتے۔

اتئے میں گھنٹہ بجا۔ شامیانے کے نیچے سے لڑکیوں نے نکلنا شروع کیا۔ دو لڑکیاں بچوں کی طرح اچھلتی کو دتی سیڑھیوں پر سے اتریں اور بھاگ کے ایک اور گروہ سے جا ملیں جس کے وسط میں ایک سور داس جی کھڑے تھے اور سب لڑکیاں جلدی جلدی ان کو بتلا رہی تھیں کہ تھیوری کے پرچے میں انہوں نے کیا لکھا۔ یہ دونوں لڑکیاں فرماک پہنچیں اور باقی کی ساری لڑکیوں کے مقابلے میں بہت کم عمر تھیں۔

اتئے دونوں جوان لڑکے، جوشکل و صورت سے ان دونوں بچیوں کے بھائی معلوم ہوتے تھے، مجھے میں کہیں سے نمودار ہوئے۔ رام نگرا شیٹ کی ایک کار آن کر کی اور یہ چاروں اس میں جا بیٹھے۔ دوسرے لمحے کا ردھول اڑاتی ہوئی نظروں سے

او جھل ہو گئی۔

لکھنو سے آئی ہوئی اڑکیوں میں ایک لیا ابھار گوا کو پہچانتی تھی۔ اس نے قریب آن کر کہا: ”نمیتے لیا دیدی۔ ہم لوگ امتحان کے بعد اپنے یہاں ایک پارٹی کر رہے ہیں۔ آپ ضرور آئینے گا۔“

”نمیتے پینا۔ یہ چمپا ہیں۔“

اس نے دوبارہ نمیتے کیا۔ ”آپ بھی آئینے گا چمپا دیدی۔“
”ضرور۔“

”تم لوگ تو میرس کالج والے ہو۔ تم سب کے ناج گانے کی اتنی دھوم سنی ہے۔ خالی پارٹی دے رہی ہو۔ تمہارا ناج خوبیں دیکھیں گے۔ چمپا نے پوچھا۔

”چمپا دیدی کاشی اور لکھنو کا مقابلہ کروانا چاہتی ہیں؟“ ایک اور اڑکی نے قریب آ کر کہا۔

”اچھا، یہ بات ہے۔“ بینا ماحتر نے جواب دیا۔ ”تو پھر ہو جائے فیصلہ۔ کہا کی بھیرویں بہتر ہے، کہاں کا دا اور، کہاں کا کٹھک چلنے آئینے میدان میں۔“

”رہی۔؟“

”رہی۔“

اب ان کے آس پاس اڑکیوں کا ہجوم لگ گیا۔ بنا رس کی اڑکیاں لکھنوا یوں پر چوٹیں کر رہی تھیں، مگر لکھنوا یوں سے باتوں میں کون جیت سنتا تھا؟ وہیں طے کیا گیا کہ بست کالج میں ان لوگوں کو بنا رس کا کٹھک دکھایا جائے گا مگر اس سے

پہلے وہ سب لکھنو کی بڑیوں کے ہوشی پر دھاوا کریں گی۔

ان سب خوشدی کی باتوں کے بعد چمپا اور لیما پھرتا نگے پر ڈھیس اور اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو گئیں۔

۳۹

بنارس پہنچ کر طاعت اور نر ملا اور ساری لڑکیاں جس جگہ پر تھیں تھیں وہ ایسی عجیب و غریب جگہ تھی جس کا ذکر آج سے دس سال بعد حمید بانو اپنے افسانوں میں کیا کرے گی (اگر اس نے افسانے لکھے)۔ یہاں پر یقیناً اس کی ہیر و نر ہے گی یا ہیر و اس کی چھت پر سے کو دکر گھوڑے پر سوار ہو گا، وغیرہ اور اس جگہ پر ایک ایسی ناقابل بیان دنیا آباد ہو گئی تھی جس کی طرح ناقابل بیان دنیا و سیع سیاہ سمندر میں گھرے ہوئے جہاڑ پر منتضا در راستوں کی سمت جانے والے مسافروں کے اکٹھے ہونے سے آباد ہو جاتی ہے۔

یہ ایک وسیع احاطے کے وسط میں بنا ہوا ایک بہت بڑا سنگ سرخ کا سہ منزلہ محل تھا جس کی مالکہ ایک لاولد برہمن رئیس زادی تھیں جو کانگرس ورکر تھیں اور مستقل یا تراویں پر جاتی رہتی تھیں۔ محل اسی طرز کا تھا جس طرز کے عام ہندوستانی محل ہوتے ہیں۔ وسط میں ایک زبردست آنکن تھا جس کے چاروں طرف دالان در دالان اور کمرے تھے اور بے شمار گلیاں اور کوٹھڑیاں اور صحیخیاں اور رتہ خانے اور ششین اور ان گنت طاق اور طاقیے مالکہ مکان نے جن کو سب پنڈ

تائن صاحب کہتے تھے، فخر یہ بتلایا کہ جب سلطان عالم قید فرنگ کے عالم میں لکھنو سے کلکتے لے جائے جا رہے تھے تو مہاراجہ بنارس نے ان کو اسی مکان میں بھد مکریم ٹھہرایا تھا۔ یہ بات سن کر حمید بانو بہت متاثر ہوئی اور اس نے پنڈ تائن کو سلطان عالم کے عہد سے تعلق رکھنے والی چند مستند حکایات سے مستفید کیا۔ پنڈ تائن سے حمید بانو کی خوب گلھی، وہ خود بھی بزبان ہندی افسانے لکھتی تھی مگر لڑکیوں کی آمد کے تیرے روزہی وہ ایک اور یا ترا کے لیے جگن نا تھ پوری چل دیں اور جاتے جاتے اپنی رہائش کے کمروں کی سنجیاں بھی لڑکیوں بھی لڑکیوں کے حوالے کرتی گئیں۔ اپنی قیمتی بنارسی ساریاں انہوں نے لڑکیوں کو زبردستی تھنے میں دیں صبح شام تک اس قدر خاطرداری میں لگی رہیں کہ اگر ان کا بس چلتا تو لڑکیوں کی طرف سے پرچے بھی خود ہی کر آتیں پنڈ تائن اگر ایسی عجیب و غریب نہ ہوتی تو بات نہ بنتی۔ اس افسانوی محل کی مالکہ کو بھی اتنا ہی غیر حقیقی ہونا چاہیے تھا۔

دن بھر محل میں ایسا ہنگامہ رہتا گویا بہت سی بار اتمیں ٹھہری ہوئی ہیں (محل کا نام ”چندن نوا“ تھا) ہر طرف لڑکیوں کی ٹولیاں نظر آتیں آنکن میں ٹہل ٹہل کر پڑھا جا رہا ہے، کسی شہنشیں میں اٹالیٹ کر مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ باغ کے ایک کونے میں ایک شکستہ مندر تھا۔ اس کی سیڑھیوں پر پینچھہ کر امتحان کی تیاری ہو رہی ہے۔ موسيقی کے پرچوں کے زمانے میں ہر کونے کھدرے سے گنگانے کی آوازیں آتیں۔ رُخو ماما ذمے داری کے شدید احساس کے ساتھ اوہر ادھر انتظامات کرتے پھرتے یا لڑکیوں کو ڈانٹتے پھٹکارتے پھر ہڑو نگے پن میں لگ گئیں، جائیں پڑھئے۔ کھانے کے لیے دستر خوان پچھتا تو برہمن رسولیا، جو بے انتہا

موٹا تھا، ہنکار ابھرتا اندر آتا۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کا اسٹمنٹ روئیا وہی کی بائی
اٹھائے ہوتا۔ پیلی کی ایک بڑی سی ڈولی میں وہی بھر بھر کر چیف روئیا لڑکیوں کی
پلینٹوں پر بہت باندی سے دی پکاتا، پھر تھالیوں اور کنوریوں میں کھانا پروسا جاتا۔
رات کو آنگن میں تاروں بھرے آسمان کے نیچے محفل جمعتی۔ جب امتحان شروع
ہوئے تو ہر روز پر پچے کرنے جاتے وقت جب لڑخیاں محل کے صدر دروازے
سے نکلتیں وہاں کافی دیدی دی اور ماش تیل لیے کھڑی ماتیں اور وہ ہر لڑکی کو باری
باری دبی مچھلی کا شگون کروا تیں۔

موسیقی کا امتحان بہت کڑا تھا۔ اس سے لڑکیاں تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ حالانکہ
مرس کاچ کا سینڈ ایر کا نصاب یہاں بھی تھا مگر بہر حال یہ دوسری یونیورسٹی تھی اور
متحن حضرات میں نارائن راؤ دیا شامل تھے جن کا نام من کر ہی ڈر کے مارے جان
نکلی تھی۔

(جس روز امتحان تھا تیز دھوپ پڑ رہی تھی۔ ایک سرخ رنگ کی اداس عمارت
کی چھت پر دو کمرے بنے تھے۔ ایک میں نارائن راؤ دیاں بیٹھے تھے۔ لڑکیاں
چھت کی منڈپوں کے سامنے میں کھڑی جلدی جلدی مشکل را گوں کو نیچی
آواز میں دہرا رہی تھیں۔ کمرے میں بیٹھے ہوئے ایک متحن اس قدر خفا معلوم
ہوتے تھے۔ گویا ابھی سب کچھ چبا جائیں گے۔ کسم سکینہ گھبرا گھبرا کر بٹوں کے
سنترے کھا رہی تھی کہ حلق خشک نہ ہو۔ منڈپ پر ایک پیل آنکھیں نیم واکے غنو دگی
کے عالم میں یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی جیسے سوچتی ہواں سب باتوں سے کیا فرق
پڑتا ہے؟ پھر وہ پیل سارنا تھی کی طرف اڑ گئی)

تھیوری آف میوزک کے پرچے کے روزَ مال اور ہری شنکر آن دھمکے۔ طاعت اور زملا پر چکر کے شامیا نے سے باہر نکلیں تو انہوں نے سرسوتی کے مندر کے نیچے دوڑکیوں کو مسز ڈیسکر سے باتیں کرتے دیکھا۔ ان دوڑکیوں کے قریب ہی سے کہیں سے مال اور ہری شنکر نمودار ہوئے۔ ان دوڑکیوں میں سے ایک کی بہت پیاری شکل تھی اور اس کا رنگ دھوپ میں کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ دونوں دوڑ کے رام نگر کے دیوان صاحب کے یہاں ٹھہرے تھے جو طاعت اور مال کے قرابت دار تھے، پھر تیز دھوپ میں دریا پا رکر کے وہ چاروں رام نگر پہنچے اور ”پا لش کی ہوئی سڑکوں“ پر سے گزرتے ہوئے طاعت کو ایک دم قدیر کا خیال آیا جو بچپن میں ان کو مختلف قسم کی معلومات سے مستفید کرتا رہتا تھا۔

”مجھے قمرن کے لیے ساری اور چوڑیاں خریدنی ہیں۔“ طاعت نے با آواز بلند کہا۔

”ابھی تمہاری خریداری کی مہم شروع نہیں ہوئی۔“ مال نے پیچھے مژکر پوچھا۔

”نہیں۔ پیسے لاو۔“

اب دونوں دوڑکوں نے غرا کر دونوں دوڑکیوں کو دیکھا۔

”تمہارا خیال ہے ہم مہاجن ہیں۔ کوئی چلتی ہے ہماری؟“ مال نے غصے سے کہا۔

”ہم تو دو مفلس فلاں برہمچاری و دیار تھی ہیں۔ خود دان پن پر گزر کرتے ہیں۔“ ہری شنکر نے کہا۔

”لیکن اس کے باوجود ہم دل بادشاہوں کا رکھتے ہیں۔“ مال نے کہا۔

”صحیح کہتے ہو۔“ ہری شنکر نے گلا صاف کر کے صاد کیا۔

”اور اگر تم ہم کو بتلا دو کہ وہ مہا سندروپ ونی کون ہے جو سرسوتی کے مندر کے سامنے میں کھڑی تھی تو ہمارس کی ساری چوڑیاں تم کو خرید دیں گے۔“ مال نے کہا۔

”کون مہا سندروپ وی۔“ طاعت اور نرملانے ایک دوسراے کو دیکھا۔

”تم نہیں جانتیں اس دیوی کو جو دیوی کے استھان کے پاس کھڑی مسکراتی تھی؟“ مال نے مایوسی سے پوچھا۔

”بالکل نہیں، مگر پیسے لاو۔“

”اگر تم اس کا پتا چلا دو۔“ ہری شنکر نے کہا۔

”بھیجن تھا رے لیے تو لڑکیوں کے پتے چلاتے چلاتے ناک میں دم آگیا ہے۔“ ترملانے جو عمر میں بڑی اور نسبتاً سمجھدار تھی چڑ کر جواب دیا۔

اسی طرح جھگڑا کرتے وہ رام نگر پہنچے اور دون بھرخس کی ٹیٹیوں کے پیچھے بینڈ کر انہوں نے دن گزارا اور آم کھائے اور رشتے داروں سے ٹپیں ہانکلیں اور دیوان صاحب کی بیگم صاحب نے فوراً کاشی کی بہت سی ریس زادیوں سے ہری شنکر کی بات طے کر دی اور سب بہت بثاش ہوئے۔

جب امتحان ختم ہوئے تو لڑکیوں نے گھومنے پر کمر باندھی۔ ماما اور کانٹی دیدی کی قیادت میں ان کے غول گلی کو چوں میں گھستے پھرے۔ چوڑیوں کی دکانوں کی دکانوں کے سامنے یہ لوگ دھرنادے کر بینڈ رہیں۔ انہوں نے ان

گنت چوڑیاں خرید ڈالیں۔ شام پڑے کاشتیوں میں بینہ کر جب وہ گنگا کے
دھارے پر دنیا بھر کے گانے گاتیں حمید بانو موقع و محل کی مناسبت سے پاٹ دار
آواز میں۔ اے آب رو گانگا _____ والی اظہم شروع کردیتی۔ سب لڑکیاں مل کر
اسے اٹھاتیں۔ انہوں نے شہر میں جا کر تازہ ترین فلم دیکھا جس کا نام
”خزانچی“ تھا، پھر ایک روز بھری دوپہر یا میں وہ سب سارنا تھے پہنچے۔ جہاں کے
ایک معبد کے مرمری فرش پر دیوؤں کی روشنی رقصان تھی اور ایوان میں چھوٹے
بڑے سنہری مجسمے پرنس گوتم سدھار تھے کے رکھے تھے اور ماحدوں کے تقدس سے
مرعوب ہو کر سب لڑکیوں نے دوپتوں اور ساری کے آنجلوں سے سر ڈھانپ لیے
اور سب نے بدھ کی موجودگی میں اپنے آپ کو بے انہتا پاکیزہ محسوس کیا۔

”یہاں کس قدر سکون ہے۔“ طاعت نے کہا، وہ سب ہاں میں دیوار سے ٹک
لگائے چپ چاپ بیٹھی تھیں۔

”ہاں آں۔“ حمید بانو نے سر ہلا کیا، پھر وہ بڑے پر اسرار طریقے سے مسکرانی۔
گویا اب کسی زبردست حقیقت کا انکشاف کرنے والی ہے۔

”بات یہ ہے۔“ اس نے کہا، ”کہ ہم سب اتنی گھام میں مارے مارے
پھرنے کے بعد یہاں آ کر بیٹھے ہیں اس لیے خواہ مخواہ سکون محسوس ہو رہا
ہے۔“ علیعے کو حمید بانو کی یہ حقیقت پسندی بہت کھلی۔

”مگر یہ واقعہ ہے کہ مہا تمابدھ کے چہرے کو دیکھ کر سکون ملتا ہے۔“ طاعت
نے سوچ کر کہا۔

”اجی تم کی اجنویہ باتیں۔“ حمید بانو نے بزرگی سے کہا، ”درachi hم

مسلمانوں کو یہ سب نہیں سوچنا چاہیے۔ ”پھر وہ سر جھکا کر غور و خوض میں محو ہو گئی، وہ پانچوں وقت کی نماز پڑھتی تھی اور بڑا رومان پرست تھی مگر اس دنی کش کمش کا حل تلاش کرنے کی اس کی عمر نہ تھی کہ جب وہ کلمہ گو ہے تو اسے بتوں سے بھی البت کس واسطے ہے۔ دری و حرم کے مسئلے پر وہ کچھ دیر اور غور کرتی مگر اتنے میں معا طاعت اٹھی اور اس نے بڑے مجسمے کے سامنے جا کر رقص کرنا شروع کیا، پھر بینا ما تھر بھی اس رقص میں شامل ہو گئی۔ چند لمحوں بعد سب اڑکیاں گھیرا باندھے ناج رہی تھیں اور ان سب میں حمید بانو پیش چیش تھی۔ دو جاپانی بھکشو جو ایک ستون کے پاس وزیر زر حشر کھولے بیٹھے تھے ذرا اچھبی سے یہ منظر دیکھتے رہے۔

باہر عمارت کے سامنے میں کھڑے کھڑے ہری شنکر مہایان بدھ اعظم کی تاریخ پر مال کو ایک پیچھرے رہا تھا اور مال نے قریب کے ایک ستوب کے پتھروں پر ہاتھ رکھ کر سوچا میں اس لمس کے ذریعے اس دوسرے وقت میں موجود ہوں وہ وقت جو گزر چکا لیکن اب بھی ہے۔ اسے یہ سوچ کر ایک لختے کے لیے چکر سا آگیا، پھر اس نے آنکھیں کھول کر ہری شنکر کو دیکھا جو بڑی اہمیت کے ساتھ ایک جاپانی بھکشو سے کچھ انٹ سنت اڑا رہا تھا اور جاپانی بھکشو ہری شنکر کی علمیت سے بہت معروب نظر آتا تھا۔ چاروں طرف سرخ ریت پھیلی ہوئی تھی اور دھوپ میں ستوب کے کھڑے تپ رہے تھے اور ایک راستہ چکر کا ٹانیچے سے اوپ جاتا تھا اور ستوب کے چاروں طرف گھوم کروہ راستہ پھر نیچے لوٹ آتا تھا۔ مال نے ہری شنکر کے ساتھ ساتھ اس پر چلنا شروع کیا۔ اب اڑکیاں باہر آچکی تھیں اور حمید بانو قریب سے کافی دیدی سے کہتی ہوئی گزر رہی تھی: میں خواب میں یہاں کئی بار آچکی ہوں۔

مجھے لگتا ہے میں اس جگہ سے واقف ہوں۔ پہلے بھی یہاں آچکی ہوں میں نے یہ سرخ ریت والا تپتا ہوا راستہ پہلے بھی دیکھا ہے۔

گذرا ولد حمید بانو _____ مال نے مسکرا کر دل میں کہا۔ یہ لڑکی بڑی ہو کر ضرور افسانہ نگاہ بن جائے گی اور روحانیات میں دچپی لے گی اور شاید تھیوسو فیکل سوسائٹی میں شامل ہو جائے۔

”حمید بانو _____ ظہر کا وقت ہے، چلو نماز پڑھ لیں۔“ رفیعہ باجی نے ستوب کی سیر ہیوں سے اترتے ہوئے آواز دی اور حمید بانو ہڑ بڑا کر سرخ ریت والے راستے پر سے اتری اور ایک آم کے درخت کی طرف چلی گئی جہاں چند لڑکیاں پہلے سے ستانے کے لیے جائی چکی تھیں۔

مال نے اس منظر کو دیکھا۔

ستوب اور میوزیکم کی عمارت اور بڑا مندر جس کا عظیم الشان شہرِ الحنفیہ دورے نظر آ رہا تھا اور لوگ چاروں اور پھر رہے تھے اور ان کے سامنے زمین پر لرزاز تھے۔

سائے قائم رہتے ہیں۔ انسان ختم ہو جاتا ہے۔ سائے میں بڑی طاقت ہے۔ ہم عمر بھر مختلف سایوں کا تعاقب کرتے ہیں مگر سایہ ہاتھ نہیں آتا، وہ اپنی جگہ امٹ ہے۔ سائے کی اور وقت کی آپس میں سازش ہے۔

”چارنج رہے ہوں گے _____“ گھبیر ماما نے پھاٹک کے سائے کو زمین پر دیکھ کر وقت کا اندازہ لگاتے ہوئے اظہار خیال کیا۔ ”اب واپس چلانا چاہیے۔“

”چلو اڑ کیو“ کانتی دیدی نے آواز لگائی۔

لکھنوا پس جانے کے دن قریب آئے اور روانگی سے ایک روز قبل چندن نواس کے آنگن میں صدر دالان کے نزدیک اٹیج بنانا اور اسے کیلے کے پتوں سے سجا یا گیا۔ محل کے ویسے لق و دق ایسی نوں کے فرش والے صحن میں چھپڑ کا وہوا تھا اور بڑی چاندنی بچھائی گئی تھی اور پچھلے دالان میں گرین روم تھا اور انگلے دالان میں جام جم ٹانگ کر پردہ بنایا گیا تھا جس کے پیچھے سازر کھے تھے اور پینا ماہر میوزک ڈائریکٹر بنی ٹیٹھی تھی اور سورج بخش سر یواستوا جلدی جلدی سب رکھے تھے اور پینا ماہر میوزک ڈائریکٹر بنی ٹیٹھی تھی اور سورج بخش سر یواستوا جلدی جلدی سب باجوں کے سڑھیک کروارے تھے۔ باقاعدہ ڈراما کرنے کی کسے فرصت تھی۔ وقت کے وقت طے کیا گیا تھا کہ راج رانی میرا ہوگا۔ یہ اس لیے کہ اس میں زیادہ ڈائیلا گ وغیرہ کی ضرورت نہ تھی۔ سارا کام میرا کے بھجوں کے ذریعے چل ساتا تھا اور اڑ کیاں ایسی ماہر فن تھیں کہ اٹیج پر ادھر سے ادھر چلتی رہی۔ طاعت جز ل روں ادا کر رہی تھی۔ جہاں ایکروں کی کمی پڑی وہاں یہ جھٹ سے موجود۔ ایک سین میں وہ اکبر عظیم کی وزیر بنی۔ دوسرے میں میرا کی سیپیلی۔ تیسرے میں جہاں میرا سے رانا کی شادی ہوتی ہے وہاں جلدی سے اکبر عظیم کی موچھیں مستعار لے کر وہ پنڈت بن گئی اور منڈپ میں جا کر اڑنگ بڑنگ اوم سواہا کہہ کر اس نے میرا بائی کی شادی کرادی۔

پھر بہت سی اڑ کیاں راس لیا اکے ناق کے لیے چھن چھن کرتی آئیں۔ انہوں نے دنیا بھر کے زیور پن رکھے تھے۔ حدیہ کہ رفیعہ بائی جیسی موئی خاتون بھی ماتھے

پر پندرہ بیوی بور سجا کر متھرا کی گوالن بنی تھیں۔ حمید بانو نقی موتیوں اور پنڈیوں کا مکث پہنچے بڑے اشائکل سے بانسری اٹھائے کھڑی رہی۔ نر ملاستار سنجھا لے دالان کے پچھے سے گویا بیک گراؤند میوزک دے رہی تھیں۔

سامنے آؤ نہیں تھا۔ کھلے آسمان کے نیچے جگمگاتے تاروں کی چھاؤں میں بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ جانے کون کون۔ بست کانج اور یونیورسٹی کی لڑکیاں، یکھر اور پروفیسر صاحبائیں، بہت سے لڑکے، انہی میں اگلی قطار کے سرے پر چمپا احمد اور لیا ابھار گوا بیٹھی تھیں۔ ہری شنکر اور مال چاندنی کے فرش پر بر اجتماع تھے۔ رکھوماما سلک کر ڈراما دیکھنے کے بجائے خوش خوش گھبرائے گھبرائے پھر رہے تھے۔

چمپا اور مال اور ہری شنکر تینوں اس سماں الگ الگ آنکھوں سے سامنے کا تماشا دیکھا کیے۔

لڑکیاں اس سے دنیا ما فیہا سے خبر صرف اس اسٹیچ پے موجود تھیں اور بے حد خوش تھیں۔

لڑکیاں سوانگ رپنے کے بے حد شوقیں ہوتی ہیں۔ بچپن میں وہ پنگ کھڑے کر کے ان پر پنگ پوش کے پردے لگا کر گھر گھر، کھیلتی ہیں۔ گھروند اسجا کر تصور کرتی ہیں یہ سچ مجھ کا مکان ہے۔ ہند کالیا ان کے نزدیک بڑا ہم دعویٰ کھانا ہوتا ہے۔ گڑیاں گذے ان کے لیے جاندار انسان ہیں۔ جب ذرا بڑی ہو جاتی ہیں تو اپنا بناو سنگھار کر کے کس قدر مسرور ہوتی ہیں۔ باہر جانے سے پہلے گھنٹہ پھر آئینے کے سامنے صرف کریں گی۔ جتوں اور کپڑوں کا انتخاب ان کے لیے آفاقتی اہمیت کا حامل ہے۔ بجناء بھروسہ بھرنا ان کے لیے بے حد ضروری ہے۔ رادھا اور کرشن کا

ناج ناچحتی ہیں تو اتصور کرتی ہیں کہ واقع درندابن میں موجود ہیں۔ ساری عمران کی اپنی ایک نازک سی دنیا بسانے میں گزرتی ہے اور یہ دنیا بسا کروہ بڑے اطمینان سے اس میں اپنے آپ کو پچارن یا کنیر کا درجہ تفویض کر دیتی ہیں۔ اول دن سے ان کے بہت سے چھوٹے بڑے دیوتا ہوتے ہیں جو ان کی رنگ بھوم کے سنگھاسن پر اطمینان سے آلتی پاتی مارے بیٹھے رہتے ہیں۔ باپ بھائی، شوہر خدا، بھگوان، کرشن، بیٹے، پرستش کرنا اور خدمت کرنا ان کے مقدار میں لکھا ہے۔ جب رنگ بھوم کا ڈامر میکٹران سے کہتا ہے کہ تم مہارانی ہو دل کی ملکہ ہو دنیا کی حسین ترین لڑکی ہو روپ و قی ہو تو یہ بے چاریاں بہت خوش ہوتی ہیں۔

لڑکیاں بے حد مضمون خیز ہوتی ہیں۔ ڈرامے کرتی ہیں۔

یہ کس مسخرے نے کہا ہے کہ عورت کا کام دلوں کو توڑنا اور دنیا پر حکومت کرنا ہے۔ سب جھوٹ ہے۔ گپ۔ بکواس۔ یہ تو کہیں سے کہیں پہنچ جائیں۔ کتنی ہی دو ان بن جائیں، کتنی ہی دو ان بن جائیں، کتنی ہی بڑی سلطنت کا تاج ان کے سر پر ہو ان کی اوقات وہی رہے گی۔ پچارن۔ کنیر۔

لاحول ولا قوۃ

مال راس لیا ادیختا رہا۔ سامنے گوپیاں اب کرشن کی آرتی اتنا رہی تھیں۔
دالان میں نر ملا اور پینا ما تھر زور زور سے گاتی رہیں:

”موہن سنادے میٹھی تان۔ مدھر، سبھری، رسیلی، پیاری پریم کی تان۔“

واہ — کیا بات ہے۔

اری مور کھڑکیوم کو خبر بھی ہے پریم کی تان کتنی بڑی مصیبت کا گھر ہے۔ کبیر

یہ گھر ہے پریم کا، خالہ کا گھر نا نہہ — مال کو بیرداں کا ایک دوہایا آیا۔
اس نے پہلو بدل کر سگریٹ سلاگا لیا۔

۲۰

بیسا کھا کا مہینہ گزرا، جیٹھ کا، اس اڑھ میں رزلٹ لکا۔ چمپا احمد پاس ہو گئی
تھیں اور حسب تو قع فرست ڈویژن انہوں نے حاصل کیا تھا۔ اب ان کے سفر کی
تیاریاں شروع ہوئیں۔ ساریاں خریدی گئیں۔ ہاؤس کوٹ تیار ہوئے۔ لکھنو
ماں میاں کو خط لکھا گیا۔ جولائی میں چمپا بیگم آرہی ہیں۔

ایک روز شام کو وہ لیلا بھار گوا کے ہمراہ بازار سے گھر جاتے ہوئے چندن
نواس کے سامنے سے گزری۔ اس کے قدم آپ سے آپ رک گئے۔ باغ پر
ہولناک سنانا طاری تھا۔ محل سمنان پڑا تھا۔ تیری کے ایک کمرے میں روشنی
ہو رہی تھی۔ شاید پنڈتاں اپنی یاترے سے لوٹ آئی ہوں گی۔ باقی ساری عمارت
اندھیرا اور خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جب وہ وہاں سے آگے بڑھی تو سے لگا جیسے
بہت سی آوازیں اس کا پیچھا کر رہی ہیں۔ لڑکیوں کے قہقہے، گھنگروں کی جھنکار
تنان پورے کی گونج اور سب سے بڑی سنائی کی آواز۔

اسے وقت کے بھوت نے ستانہ شروع کر دیا تھا۔

لیما کواس کے گھر پر اتنا نے کے بعد وہ حسب معمول اپنے مکان کی سمت
بڑھی۔ مہری نے تانگے سے اتر کو چھوٹا سا چھاٹک کھوا، وہ اندر داخل ہوئی اور آنکن

میں جانبھی۔ باہر گلی بی سنسان پر ہی تھی۔ برابر کے تین چار مکانوں میں کئی ریڈ ویو اسکھنے نج رہے تھے۔ لکھنؤ سے خبریں سنائی جا رہی تھیں۔ چمپا کے والد بیٹھک میں کسی موکل کے ساتھ مصروف گفتگو تھے۔

”ڈاک میں تمہرا یہ لفافہ آوارہا۔“ اس کی ماں نے ایک نیلے رنگ کا چھٹا سا لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور باورچی خانے کی سمت چلی گئیں۔

شام کے بڑھتے ہوئے اندر ہیرے میں اس نے خط کھولا، پھر برآمدے کی بھی جلا کر اسے پڑھنا شروع کیا۔ جبکی زنانہ لکھائی تھی اور کسی جبکی کا خط تھا۔ سوری سے آیا تھا اور انگریزی میں تھا اور مالی ڈیر چپا کہہ کر اسے بڑی بے تکلفی اور اپنا نیت سے مخاطب کیا گیا تھا۔ اس میں لکھا تھا مجھے یہ معلوم کر کے بے حد خوشی ہوئی کہ تم اس سال ہمارے کالج آرہی ہو۔ اس کے بعد اس کالج کے متعلق مختلف تفصیلات سے اسے مطلع کیا گیا تھا، اگر وہ نلاں نلاں چیزوں میں دلچسپی رکھتی ہے تو اسے نلاں نلاں کلب خوش مدد یہ کہیں گے، اگر وہ آؤٹ ڈور لڑکی ہے تو اسپورٹس کی ڈائریکٹر جے مالا اپا سوامی سے اسے مانا چاہیے۔ ٹینس کی سیکرٹری لیا اشری ناگیش بھی اس کی مدد کر کے بے حد خوش ہوگی، اگر وہ مغربی موسیقی کی شوقین ہے تو میوزک ورکشاپ اس کی منتظر ہے۔ ڈراما گلڈ اس کی ادا کارنہ صلاحیتوں سیمہرہ ور ہونے کی وہ خواہش مند ہے (اگر اسے اٹھج سے دلچسپی ہے)، وغیرہ وغیرہ۔ پھر اسے سارے ہوٹلوں کے متعلق انفارمیشن دی گئی تھی اور فیکٹری کے متعلق۔ اخیر میں لکھا تھا کی ٹئی لڑکی کی حیثیت سے مکتب الیہ کو اس کے چارج میں دیا گیا ہے اور مکتب الیہ کی وہ آفیشل ایڈ واائزر ہے۔ لہذا سولہ تاریخ کو جب وہ کالج پہنچ تو اسے رقم

الحرف فلورنس نکلسن ہاں کی سیر ہیوں پر ملے گی اور اس کے سارے پر ابھر کا حل
تلاش کرے گی۔

نیچے رقم الحروف کا نام لکھا تھا تہمینہ رضا، تارا ہاں، سوری۔

چمپا ہکابکا کھڑی سوچتی رہی کہ یہ تہمینہ رضا کون ہے اور اسے میرا بتا کس طرح
معلوم ہوا اور اس قدر دوستی کا خط اس نے کیوں لکھا ہے۔ یہ خط اسے بڑا افسانوی
معلوم ہوا، یعنی اس طرح کی باتیں محض ناولوں میں ہوتی تھیں۔ اسے اگا وہ اب
بڑی انوکھی فضاؤں اور بڑی عجیب و غریب دنیا کی طرح سفر کرنے والی ہے۔
اس کا یہ خیال غلط نہ تھا۔

۳۱

لے دوڑ

بنارس سے لوٹ کر ساری لڑکیاں اپنے گھروں کو چلی گئیں اور ایک ہفتہ بعد
سب آکری بار ملنے کے لئے اسکول میں جمع ہوئیں۔ بڑا کلاس روم محلوایا گیا۔
لارڈ مہری سب کی خاطریں کرتی آگے پیچھے دوڑتی رہی۔ لڑکیاں ڈیسکوں پر
چڑھ کر بیٹھ گئیں اور دفعتاً سب خاموش ہو گئیں، جیسے بولنا جانتی ہی نہ ہوں۔ ان میں
سے بڑا لڑکیاں سوچ ریتھیں، اب جانے ہمارا کیا حشر ہو گا۔ ان میں سے اکثر کی
شادی ہونے والی تھی۔ چند کو ابھی کانج میں پڑھنا تھا۔ دفعتاً حمید بانو نے، جو بے
حد ڈریمیک واقع ہوئی تھی، مس پر دھان کی نئی فلم کا گانا شروع کر دیا: نہس لے جی
بھر بھر کر نہس لے۔ جانے کون کہاں پھر جائے۔ اس کے بعد دوسرا تازہ فلمی گانا

گیا گیا: رک نہ سکو تو جاؤ تم جاؤ اور اس کے بعد تیرا جینے والے ہستے ہستے جینا۔ سورج بھی نہ ڈوبے تیرا وغیرہ۔ یہ سب گانے کی وجہ سے خوب رفت طاری ہوئی اور سب کی سب خوب چہکوہ ہکروئیں۔ واقعی لڑکیوں کی کس قدر بیوقوف قوم ہے۔

مگر کتنی عجیب بات تھی کہ ان میں سے دو تین لڑکیوں کے علاوہ ساری لڑکیوں کو طاعت نے عمر بھرنہ دیکھا، وہ سب جانے کہاں غائب ہو گئیں۔ جو اتنی اچھی بھولیاں تھیں۔

یہ ہمیشہ ہوتا ہے۔ جب ہم سب اکٹھے ہوتے ہیں تو کبھی خیال بھی نہیں آتا کہ الگ الگ ہو جائیں گے، اور جب پچھڑ جاتے ہیں تو لگتا ہے جیسے کبھی ملے ہی نہ تھے۔

دلبی دوق

۳۲

ہندوستان کا بہترین گرلز کالج !

از ابا تھو مران !!

”چاند باغ“ !!!

لکھنؤ کی فیض آباد روڈ پر ایک بہت بڑا پھانک ہے اور بہت دوری سے ایک بے حد طویل و عریض دمنزلہ عمارت نظر آ جاتی ہے جس کے یونانی طرز کے بلند و بالا پورٹکو کے ستون دور سے دکھلائی پڑتے ہیں۔ اس پورٹکو کا فرش مرمریں ہے۔

سامنے لام کے پرپام کے درخت لگے ہیں۔ اس عمارت میں چمکتے ہوئے شفاف
شیشوں والے طویل اور بڑے بڑے در تپے ہیں اور جھملاتے ہوئے فرش اور
چوڑے مرمریں زینے۔ اوپھی چھتوں میں جھاڑ فانوس آویزاں ہیں۔ اس
کا ”براؤز نگ روم“، جہاں لڑکیاں بیٹھ کر فرصت کے وقت میں علم چرتی چلتی ہیں،
اپنی آرائش کی وجہ سے کسی بر طانوی لارڈ کا ڈرائیور نگ روم معلوم ہوتا ہے۔ اس میں
بیش قیمت نوادرجے ہیں اور تایاب کتابیں رکھی ہیں اور مشہور پینٹنگز سے اس کی
دیواریں مزین ہیں۔ ساری عمارت میں جگہ جگہ ایرانی قالین بچے ہیں۔ یہ عمارت
ایڈمنیشن بلڈنگ کہلاتی ہے۔ اس کے عقب میں وسیع کمپس پر دور دور فاصلے پر
اتی ہی بڑی چار عمارتیں اور بکھری ہوئی ہیں۔ یہ سب عمارتیں ایک دوسرے سے
شفاف فرش والے کوریڈورز سے ملحق ہیں جن کے اوپر چھولوں کی خوبصورت بیلیں
پھیلی ہیں۔ یہ کوریڈور کی فرلانگ لمبے ہیں۔ ان عمارتوں میں سے تین میں ہوشیار
ہیں جو نشا ط محل، نونہال منزل اور میلٹری بھوون کہلاتے ہیں۔ یہ بھی اس قدر شاندار
ہیں گویا کسی بڑی ہندوستانی ریاست کے گیست ہاؤس ہوں۔ چوتھی عمارت فیکٹری
کی ہے جنہوں نے اپنے کمرے اور سینگ روم دہن کی طرح سچار کھیت ہیں۔
کمپس کے وسط میں ڈائیور کی عمارت ہیں اور ایک سرے پر ہسپتال ہے
جس کی اضلاع ایک نیگروزس ہے۔ پہلو میں کالج کا مشہور عبادت خانہ ہے جو
موڈرن طرز میں تعمیر کیا گیا ہے۔ جس طرح کے عبادت خانے سویڈن اور کیلے
فورنیا میں بنائے گئے ہیں۔ یہ بے انتہا اسٹریم لائند جگہ ہے اور اس میں بیٹھ کر خدا
سے لوگاتے وقت خواہ مخواہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ مسیح بھی کسی امریکن یونیورسٹی

کے پر یہ یونیورسٹی یا نیو انگلینڈ کے رحمل اور خلائق پروفیسر ہیں۔ اس کا جو کی عمارت کا طرز تعمیر اسی قسم کا ہے جیسا امریکن یونیورسٹیوں کا ہوتا ہے۔ بیروت کی امریکن یونیورسٹی کے بعد یہ مشرق میں امریکنوں کی بنائی ہوئی سب سے عظیم الشان درس گاہ ہے۔

چاند باغ !!

پورنماثی کی راتوں میں جب چاندنی کی پس پر برستی ہے تو لگتا ہے یہ سارا سماءں بے حد غیر حقیقی ہے۔ ہرے بہرے زار۔ پھولوں کے سنجھ سفید کے جھنڈ۔ عمارتوں کے روشن در تیج۔ اس وقت کمپ کے مختلف گوشوں سے موسيقی کے سر بلند ہوتے ہیں۔ یتھوون۔ شوپاں۔ ویبر۔ جارج گریشوں۔ یا کسی کوریڈور میں سے کوئی لڑکی سائے کی طرح گزر جاتی ہے۔ نیگروزیں ہسپتال کے شیشوں والے برآمدے کی کھڑکی کھول کر آسمان کو دیکھتی ہے جس پر بیت الحم کا اکیلا ستارہ کھرے میں چھپا جھملدار ہا ہے۔ چیپل میں سے بر قی آر گن کی گہری گوئی ہوئی آواز اور پر اٹھتی ہے۔ اندرون قربان گاہ یک اوپر منقش یمپ جلتا رہتا ہے۔ سنائی کے سارے پرتو قوس قزح کے رنگوں کی طرح سارے میں پھیل جاتے ہیں۔ سو اس سال ادھر یہاں رمنا تھا۔ یہاں کے باغات میں ہر کلیں بھرتے پھرتے تھے اور بارہ سنگھے اور نیل گائیں اور اودھ پوری کے حکمرانوں کے بھرے ندی کے اس کنارے پر آن کر لگتے تھے اور شہر کی اونچی سوسائٹی یہاں آن کر مینڈھوں اور ہاتھیوں کی اڑائی کا نظارہ کرتی تھی، وہ پرانا برگد کا درخت، جو کی پس کے اس کونے میں کھڑا ہے، اس کی پتیاں اس سے بھی پچھلے پھر کی ہوا میں اسی طرح سرسراتی ہوں گی۔

اسی سال سے یہ درس گاہ قائم ہے۔ ۱۸۶۲ء میں جو خوش بارش نوجوان اڑکیاں لمبی آستینیوں کے بلاوز پہننے اور گاؤں کی وضع سے ساریاں باندھے یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلی تھیں ان کی قبروں پر نئے قبرستان بن چکے۔ جو لڑکیاں کل یہاں آنکھوں میں خواب لے کر گاتی گلگنا تی آئی تھیں آج وہ دنیاں دادیاں ہیں یا دنیا کے بہت سے دکھانہوں نے اخھائے ہیں یا بڑی معمولی، عام زندگیاں گزار رہی ہیں۔

اس لئے بے چاری اڑکیو، تم جو ہاں میں گھس یو جیس اونیل کی ریہر سل کر رہی ہو خوش ہو لو کیونکہ کلم تم بھی مر چکی ہو گی۔ چونکہ زندگی کی جس جنگ میں حصہ لینے کے لیے تم یہاں سے نکلو گی اس کے محاذا پر کام آنے والوں کے لئے کوئی پیش کی تختیاں دیواروں پر نہیں لگائی جاتیں۔

اس چیپل کی سفید سیر ہیوں پر کھڑے ہو کر سوچوں کون کہتا ہے کہ سامی مذاہب کا نظریہ کائنات غلط ہے۔ صراط مستقیم صرف ایک ہے۔ سیدھی اور تنگ۔ ایک پیدائش سے ایک موت کی طرح جانے والی، جس کے بعد کوئی واپسی نہیں۔ اس لیے بے چاری اڑکیو، تم جو پھولوں کے سنج میں گر بانا ج رہی ہو، چاہے تم کسی خدا کی عبادت کرتی رہو (اور چونکہ تم عورت ہو الہذا ملحد مشکل ہی سے بنو گی) یاد رکھو کے جب تم چاندنی کی اس دنیا سے باہر چلی جاؤ گی تو پھر کبھی لوٹ کرنہ آؤ گی۔ دوسرے تمہارے جگہ لے لیں گے۔ ان سب جگہوں پر وہی سب ہو گا جو تمہارے وقت میں ہوتا تھا لیکن دنیا بدل چکی ہو گی۔ دنیا لحظہ بہ لحظہ بدلتی رہتی ہے۔

تم بدل جاؤ گی۔

کیا تم کو معلوم ہے کہ وہ تمہاری سوشیال او جی کی جھنٹی پروفیسر، بگلے کے ایسے سفید بالوں والی کمر خمیدہ بڑھیا، جو کھٹ کھٹ کرتی مسکراتی گیلری میں سے گزر رہی ہے، ۱۹۰۲ء میں تم سے زیادہ حسین تھی اور نلا ڈلفیا کا گلب کہا تی تھی؟

یہ سارے جشن، یہ ساری تقریبات، رسم، تہوار، کارنیول، مورس ڈانسگ کے مقابلے، اسپورٹس کے ہنگامے، یہ سب تم سے پہلے ہو چکا ہے اور تمہارے بعد بھی ہوتا رہے گا۔

یہ کہ پس اس کارگر شیشہ گری، جسے دنیا کہتے ہیں، ایک بے حد چھوٹا سا ماذل ہے۔

نشاط محل کے پچھے ڈج وضع کے باغ کے برادر سے ایک سایہ دار راستہ سونگ پول کی طرف جاتا ہے جو آم کے جھنڈ میں گھرا ہوا ہے۔ یہ جولائی کا گھینٹہ ہے اور بھانت بھانت کی لڑکیاں سارے میں پھیلی ہوئی ہیں: مرہٹی، کھجراتی، بنگالی، مداری، اڑی، نیپالی، پنجابی، پٹھان، یورپیں، اپریکن، برمنی، سنگھاری، ملک کا کوئی خطہ نہیں جہاں کی زبان یہاں نہ سنی جاتی ہو۔ نہ بھائی لڑکیاں ہندو ہیں اور مسلمان ہیں اور سکھ ہیں اور عیسائی ہیں اور بو دھ اور یہودی۔ دنیا کا کوئی عقیدہ نہیں جس کا پیر ویہاں موجود ہے۔

اس کا لج کی طالبات اپنی سادگی کے لئے مشہور ہیں۔ عام طور پر یہ لوگ سفید ساریاں پہنتی ہیں اور جس طرح کے فیشن یہ کرتی ہیں سارے صوبے میں ان کی نقل کی جاتی ہے۔

اس ارشو کریک کا لج میں سیاست کا تذکرہ بالکل نہیں ہوتا۔ محض دنیا میں

گرلیں فل اور متوازن طریقے سے زندگی بسرا کرنے کے فن پر توجہ دی جاتی ہے۔
”ہم دینے کے لیے لیے ہیں۔“ یہاں کاموڑو ہے۔

پہلے یہاں مغربیت کا بہت زور تھا لیکن قوم پرستی کی تحریک کے زیر اثر وہ زور
اب کم ہوتا جا رہا ہے۔ اب یہاں نیگور جینیق سنائی جاتی ہے اور عید اور دیوالی کا
مشترکہ تھوار بہت دھوم سے منعقد ہوتا ہے جب مسلمان لڑکیاں سارے میں
چڑاغاں کرتی ہیں اور ہندو لڑکیاں غرارے پہن کر اتراتی پھرتی ہیں۔

اس کالج کی بہت قدیم روایات ہیں اور رسوم اور ان کے اپنے گانے ہیں۔
ان کی ایک ایسی پر اسرار دنیا ہے جس میں کوئی باہر والا داخل نہیں ہو ستا۔

۲۳

دلی ڈاؤن

حسب وعده سولہ تاریخ کو تہینہ رضا، چمپا احمد فلورنس نکلس ہال کی سیر ہیوں پر
ملی۔ چمپا ذرا پریشانی سے چاروں اور دیکھ رہی تھی کہ اس کی ہم عمر ایک لڑکی نے
آگے بڑھ کر پوچھا: ”تم چمپا احمد ہو_____؟“
”ہاں“
”آؤ میرے ساتھ چلو۔“

اور دوسرے لمبے چمپا چاند باغ کی دنیا میں شامل ہو گئی۔ اس رات ہال میں ٹھیک
لڑکیوں کو کالج کی روایات کے متعلق ایک یتکھر دیا گیا۔ انہیں یہاں کی زندگی کے
مختلف پہلوؤں سے روشناس کرایا گیا۔ شروع کے چند ہفتے چمپا کو بریک ان

ہونے میں لگے۔ جبھی اس کو اس قاعدے کا علم ہوا کہ ہر سال کانچ کے فتر کی طرف سے نئی لڑکیوں کے پتے سینٹر طالبات کو بھیج دیے جاتے ہیں اور موخر الذکر ان کی ایڈ وائز رمقرر کی جاتی ہیں۔ کانچ میں داخل ہونے والی ساری لڑکیوں کو چندن خاص سینٹر طالبات کی طرف سے اس طرح کے خط ملے ہوں گے جیسا چپا کو ملا تھا۔

تہمینہ کی بہن طاعت آراء جو فرست ایر میں داخل ہوئی تھی بڑی بے تکلفی سے اس سے کہنے لگی: ”اے چمپا باجی، ہم نے تو آپ کو بناں میں بھی دیکھا تھا۔“ اور نر ماسر یو اسٹوانے سوچا کہ اب کمن بھیا اور بھیں صاحب کی تو پانچوں بھی میں اور سرکرد ابھی میں۔ ان کی دبی تو یہیں آن پہنچی۔

چمپا دوسرا لڑکیوں کے ساتھ گلفشاں، بھی گئی۔

یہاں سب اس سے بڑی اپنا نیت سے ملے۔ تہمینہ کے بھائی مال رضا نے جو یونیورسٹی میں پڑھتا تھا، بے حد اخلاق اور مودبانہ طریقے سے اس سے گفتگو کی اور طاعت کی تقلید میں اسے چمپا باجی کہہ کر منا طب کیا۔ سنگھاڑے والی کوئی نے بھی اسے خوش آمدید کہا۔ شکر سر یو اسٹوانے اس کے لیے خود چاء کی کشتنی اٹھا کر لایا۔

ایک کوتیرے پہرو گلفشاں پہنچی۔ تہمینہ اور طاعت پہچلنے برآمدے کے سامنہ روم میں کھڑکی کے پاس تخت پر چڑھی بیٹھی تھیں۔ پیاز ار مر چوں کا نوکرا نیچے رکھا تھا۔ نر ملا آلو چھیل رہی تھی۔ غالباً شام کو ان کے ہاں کوئی دعوت تھی۔

چمپا بھی تخت کے کنارے بیٹھ کر آلو چھیلنے میں مصروف ہو گئی۔ اسی وقت بھیا صاحب اندر آئے، وہ بھی روایتی ہیروں والی شان سے۔ ٹینس

ریکٹ ہاتھ میں لیے بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ بھیا صاحب عموماً گھر میں نہیں آتے تھے، خصوصاً جب تمہینہ کی سہیلیاں موجود ہوں کیونکہ تمہینہ کے کراوڈ سے ان کی کوئی خاص نہیں بنتی تھی۔ تمہینہ کے اصل کامریڈ تو مال اور ہری شکر تھے۔

مگر بھیا صاحب بہر حال بھیا صاحب تھے۔

چپا پیٹھی آلو چھلت رہی۔ اس نے اپنی انگلیاں نہیں کاٹیں۔

بھیا صاحب شام کے ڈنر کے متعلق تمہینہ سے کچھ پوچھنے آئے تھے۔ اس سے بات کر کے وہ اٹھ پاؤں واپس چلے گئے۔

مگر اپنے کمرے میں جا کر انہوں نے گنگا دین کو بیان کیا۔ ”یہی بٹیا کون ہیں جو اندر پیٹھی ہیں۔“

”پتا نہیں سر کار۔“ گنگا دین ہڑ بڑا گیا۔ بھیا صاحب نے آج تک اڑکیوں کے متعلق کوئی استفسار اس سے نہیں کیا تھا۔ آخری ہڑتی بٹیا سے ان کا بیاہ ہونے والا تھا۔ ”بڑی بٹیا کے پاس چاند باغ کی سپنے بابا لوگ آوت ہیں۔“

”اچھا جاؤ۔“

مال آیا۔ اس سے کیا پوچھتے۔ طاعت کی طبیعت کی تیزی سے وہ ذرا خاف رہتے تھے، اگر اس سے اشارتاً بھی معلوم کرنا چاہا تو وہ سارے میں ڈھنڈوڑھ جیٹتی پھرے گی۔ کیا مصیبت تھی کہ چونکہ وہ تمہینہ سے افیشیل طور پر منسوب تھے لہذا دنیا جہان کی کسی اور اڑکی کو نظر بھر کر دیکھنا ان پر حرام تھا۔ یہ کیسی قید تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ وہ بے حد تھا تھے۔

بھیا صاحب اپنی ذات کے رومنس میں آپ محصور ہو کر رہ گئے تھے۔

چمپا کو سجاتا نے بتایا: ”یہ مہاش تہینہ کے فیانے ہیں مگر تہینہ ان کو مستقل نو افٹ کیے رکھتی ہے۔“

اوہ۔ کس قدر پہل صورت حال تھی۔ دو کزن جواہیک دوسراے سے منسوب تھے۔ گلفشاں کی قسم کے ناموں والی کوچیوں کے باسیوں کے متعلق جتنے افسانے اس نے پڑھے تھے ان میں یہی ہوتا تھا۔

مگر یہ افسانے قریب سے دیکھو تو ان میں کچھ بھی نہیں رکھاتھا۔ جو دوسروں کی زندگی کو افسانہ سمجھتا ہے وہ دراصل خود بھی تو ایک کہانی ہے جسے دوسراے پڑھ رہے ہیں۔ یہ بات چمپا کو اس وقت معلوم نہ تھی۔

۲۲

دلو دلو

برسات نکلی۔ کاٹک پور نہ آئی، پھر ماگھ پوس کی ہوا تین چلیں، کمروں میں آتش دان جلنے باغوں پر کہہ چھایا، رات کے پھولوں پر شبتم کے قطرے جنے، چاند باغ میں کرسس کے تہوار کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ امیروں نے اس سال کے فیشن کے اوور کوت سلوائے۔ غریب غریبا پالے میں بھٹکر جان بحق تسلیم ہوئے۔ بڑے لوگوں نے شکار کے لیے کاپسی اور ترالی کا رخ کیا۔ کلکتے کی رونق دو بالا ہوئی۔ جاڑے نکلے۔ بست آئی۔ سرسوں بچوں۔ کوئیلیں بچوٹیں۔ بہار کی خوبیوں کے فضائیں مہکیں۔ اندر گریجوہیت شعرا نے انگریزی میں جدید طرز کی نظمیں لکھیں۔ گرمیاں آئیں۔ تھے خانے آباد ہوئے۔ خس کی نیاں لگیں۔

اضاءع کے کمپنی باغ چنبلی کے پھولوں سے مہکے۔ لمحوں کی کھانچیاں اتریں۔ لوچلی۔ گوتی کی ریت میں خربوزے پکے۔ ساون آیا۔ امریوں میں جھولے پڑے۔ اے بیجھے ایک سال نکل گیا۔ عمر عزیز کا ایک سال ختم ہوا۔ اب دیوالی آرہی ہے۔ کھانڈ کے کھلونوں کی نوکریں برآمدے میں لا کر رکھی گئی ہیں۔ نرملہ اپنے گھر کے آنکن میں رنگوں سے نقش و نگار بنانے میں جتنی ہے۔

طاعت پچھلے برآمدے کی سب سے بخوبی سیرھی پر لوٹ لگاتی رہی۔ یہاں سے باغ کا منظر بہت خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ آسمان کی تیز نیلا ہٹ سے آنکھیں چند صیا گنگیں۔ نیلا ہٹ، جو دور نیچے جا کر درختوں کی ہریانی میں کھجور گئی تھی اور شفاف سناٹا سارے میں پھیلا تھا۔ برابر کی کوئی میسز نیگور کے یہاں طبلہ نج رہا تھا۔ اندر شاید بھیا صاحب واںکن بخار ہے تھے۔ اس نے زمین پر کان رکھ دیا۔ یا جو ج ماجون کی طرح میں زمین پر کان بچھائے لیتھی ہوں۔ سخنداک۔ سکون (جو سارا ناٹھ کے مندر میں بھی ملا تھا) کیا جو ج ماجون تھے۔ یا کون تھے؟ بہر حال۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے کھٹ میٹھی تیپیا گھاس توڑی اور آرام سے اسے چباتی رہی۔ گملے، جو سیندوڑی رنگ میں رنگ گئے تھے، ان میں صبح پانی پڑا تھا اور اس کی وجہ سے ان کا رنگ بہہ کر نیچے آ گیا تھا۔

ایک سال نکل گیا۔ بھیا صاحب یونیورسٹی چھوڑ چکے تھے اور اب مقابلوں کی تیاری کر رہے تھے۔ مال اور ہری شکر ایم۔ اے۔ فائل میں آ گئے تھے۔ اپنے نبی۔ اے کر لیا تھا۔ طاعت اور نرملہ خود اب سینڈ ایر میں تھیں۔ بھیا صاحب کچھ سڑی ہو گئے تھے کیا۔ یہ چمپا باجی سے عشق کر رہے تھے اور وہ بھی ان کو پسند کرتی

تحمیں۔ چمپا باباجی پر تو ساری دنیا ہی جان دے رہی تھی۔ مال اور ہری شنکر کا ان کی تعریفیں کرتی تھیں۔ چمپا باباجی پر تو ساری دنیا ہی جان دے رہی تھی۔ مال اور ہری شنکر کا ان کی تعریفیں کرتے منہ نہ تھکلتا، وہ لوگ طاعت سے کہتے: جب تم بڑا ہو جاؤ گی تو تم کو حساس ہو گا کہ چمپا کیسی عجیب و غریب ہستی ہیں۔ اچھا بھائی ہوں گی۔ اپی کی ان سے اب بھی ولی ہی ملاقات تھی۔ اپی بڑی و خعددار آدمی تھیں۔ بہت خندہ پیشانی سے ملتیں۔ ان کا بہت بڑا دل تھا۔ زیادہ عجیب و غریب اور قابل قدر، ہستی کوں تھا۔ اپی یا چمپا، جی _____؟ مگر یہ ان لوگوں کو کون بتانے جائے۔ میں نے یہ حساب لگایا ہے، طاعت نے سوچا کہ زیادہ یہ بس ہے ساری بات یہ سوچ کر اسے بڑا دکھ ہوا۔ گویا حسن کی اتنی بھارت قیمت لوگوں نے لگا رکھی ہے۔ افسوس کے ساتھ اس نے اور کھٹ مٹھیا گھاس توڑی اور اسے چبانے میں مصروف رہی۔

مال و دہرہ دون کی ایک سڑک پر منہ لٹکائے چلا کیا، وہ حسب معمول دیوالی کی چھٹیوں میں چکر پر آکا ہوا تھا۔ اس کے پرانے لامارٹینٹر کالج کا ایک جوان سال انگریز پروفیسر، جو چند سال قبل اوکسفرڈ سے آیا تھا، سادھو ہو کر گھر سے نکل بھاگا تھا۔ اسے پکڑنے کے لیے مال کو بھیجا گیا تھا، کیونکہ مال اس کا پسندیدہ شاگرد رہ شکا تھا۔ اس نے ہری شنکر کے ساتھ ہر دوار کی ساری گپھائیں چھان ماریں، چکراتا اور رشی کیش اور ہری کی پوڑی کے مندر، ہمایہ کی پیاریوں کو خوب کھو جا۔ تب ایک روز جوگ مایا کے ایک مندر کے پاس پروفیسر صاحب اسے مل گئے اور انہوں نے ہاتھ جوڑ کر اس سے التجا کی کہ بھائی، اب کہ میں جنجال سے نکل

آیا ہوں، مجھے واپس مت لے جاؤ، مجھ پر رحم کرو میاں۔ میں بہت مزے میں ہوں اور مال نے کہا: ”لکھنؤ میں افواہ ہے کہ یہ پبلیٹی حاصل کرنے کا ایک ریکٹ چلایا ہے آپ نے۔“

”بھائی، وہ ہاتھ جوڑے مصروف ہے“ ”خدا کے لیے چلے جاؤ بھائی۔“ اور اس کے بعد بہمنوں کی طرح زور سے کھنکھا رتے ہوئے، اپنا گیرہ الباس سنجھاتے ایک چشے کو پھانگ کر جنگل غائب ہون گئے تھے۔ اب مال منہ لٹکائے موہنی روڈ پر چل رہا تھا۔ ہری شنکر حسب معمول اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ سامنے رپنا بہہ رہی تھی۔

”یار! ہری شنکر۔“ کملانے کہا۔

”ہاں یار۔“

”یار یہ پروفیسر ہمیں ٹھیک تو کہتا تھا۔ ہم لوگ کس جنگی میں گرفتار ہیں، خدا کی قسم،“ اس روز انہوں نے تیاگ کے مسئلے پر کافی غور و خوض کیا اور سخت فلسفیانہ موڈان پر طاری رہا۔

”اوکو ٹھیوں کے نام پڑھیں۔ ناموں کے انتخاب سے میکنوں کی سائیکلوجی آشکار ہوتی ہے،“ چلتے چلتے رک کر ایک پھانک کے قریب جاتے ہوئے ہری شنکر نے کہا۔

”ہم کبھی مکان بنا کر نہیں رہیں گے۔ کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ۔“ مال نے کہا۔

”ٹھیک کہتے ہو۔ دیکھو بورڑوای کس قدر افسوسناک طور پر sloppy ہے۔

ڈرائیور نام پڑھنا۔

”خوابستان لاحول ولا قوۃ“

”مگر تم خود بھی، گلفشاں اور خیابان میں رہتے ہو۔“

”جانتا ہوں۔“

”یار مال۔“

”ہاں یار۔“

”ڈر اسوجو۔ لوگوں نے مکان بنا رکھے ہیں۔ یہاں سے وہاں تک۔ ایک سے ایک خوبصورت ساری دنیا میں مکان بننے ہوئے ہیں۔“

”ہاں یار۔ بڑی عجیب بات ہے۔“

وہ دونوں ایک چھانٹک کی پلیا پر بیٹھ گئے اور پھر اس منسلک پر غور و خوض کرنے لگے۔ دراصل ان کو پروفیسر کے دنیا تج دینے نے بے حد مضطرب کر دیا تھا۔ ایک صحیح الدماغ غ انسان، سائنس وان اور لے کر چل دیا جنگل کو۔ حد ہے۔

”اس کا مطلب کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا۔“

اندھیرا پڑے تک وہ ڈالن والا کی خاموش معطر سر کوں پر مکانوں کے نام پڑھتے پھرے۔ ”بسترن“، ”دولت خانہ“، ”شیم روک“، ”آشیانہ“، ”راج محل“، ”مال کے والد کا مکان خیابان بھی سامنے موجود تھا۔

ان مکانوں کے باغوں میں لگے ہوئے پھاڑی بھکلوں کے درختوں کی مہک سارے میں اڑھی تھی اور دنیا بڑی حسین جگہ تھی۔

وہ دونوں منہ لکھا کر پھر ایک چھانٹک کی پلیا پر بیٹھ گئے اور نہر کے پامی کو دیکھتے

رہے جو سڑک کے کنارے کنارے بہہ رہی تھی۔ پانی میں ایک ٹوٹا پچھوٹا جوتا دھارے کے زور سے اچھلتا کو دتا بہتا چلا جا رہا تھا۔

چمپا احمد نے انشا محل ہوشل کے سبع ڈرائیک روم میں آ کر روشنی جلاتی اور کتاب کھول کر اشینہ رڈ لیپ کے نیچے بیٹھ گئی۔

تہمینہ رضا گلفشاں کی برساتی کی سیر ہیوں پر بیٹھی رہا م اوتار کو ہندی پڑھاتی رہی۔

انگریز سادھوا طمیان سے ٹانکیں پھیلائے ہماوت کے جنگل میں ایک چٹان پر پڑا سورہا تھا۔

۲۵

دو سال اور نکل گئے۔ ۲۲ اگست کا اندوں بھی پرانی بات ہو چکی۔ چندت جی اور مولا نا اور سارے نیتا قلعہ احمد نگر میں قید تھے۔ سارے میں برطانوی اور امریکن سپاہی گھومنتے نظر آتے تھے۔ حضرت گنج میں انگلو اندیں ویک آئی لڑکیوں کے پرے ٹھہلتے۔ دنیا کا رنگ تیزی سے بدراہا تھا۔ دیواروں پر سے 'کوٹ انڈیا' کے الفاظ مٹتے جا رہے تھے۔ سوسائٹی میں ہر طرف فوجی نظر آتے۔

گلفشاں کے سید ناصر رضا نے بھی امپیریل سروس کے مقابلوں میں ناکام ہونے کے بعد نیوی میں کمیشن لے لیا۔ تہمینہ ایم۔ اے۔ فائل میں آچکی تھی۔ چمپا ایم۔ اے پر یوں میں تھی اور کیلاش ہوشل میں رہتی تھی۔ طاعت اور نرمابڑ دھوم

دھام کی اندر گریجوہٹ طالبات تھیں۔ چمپا بھی اب عرصے سے اس ہجوم میں موجود تھی جو شہر کا فیشن سبل اسماڑ انخلکھول سٹ کہا تا تھا۔ اس ہجوم میں غفران منزل کی رخشدہ اور کنور پی چواور گنی کوں اور کرن بہادر کا ٹھو اور اکرم دلیشور اور فیض آباد روڈ کی میرا نانی راجوش اور ارون راجوش اور فوا اور راحل بلگرامی اور علی اور لیٹر ریکشن سمجھی شامل تھے۔ پھر گلفشاں اور سنگھاڑے والی کوٹھی کے افراد۔ چاند باغ اور یونیورسٹی۔ اتنے بہت سے نام اتنے بہت سے چہرے۔ ان سب لوگوں کی بہت بڑی جتنے بندی تھی۔ چوروں کا ذہنی باور پچی خاپہ۔ بلیک، سفید چوروں کا سمندر چاروں اور ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ان سب کے درمیان ان سب سے گھری ہوئی وہ تنہا کھڑی تھی، کیونکہ آخری تحریبے میں معلوم ہوتا ہے کہ انسان بالکل قطعاً تنہا ہے۔ اس کے باوجود ہم چاروں طرف انسانوں سے مختلف قسم کے ایکویشن قائم کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

جب یہاں کیویشن غلط ہونے شروع ہو جاتے ہیں تو یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ہم بے حد معمولی ہیں۔ یہی بات چمپا نے دفتار سید عامر رضا سے جو بھیا صاحب کہا تھے تھے، کہیں۔

اس روز بھیا صاحب مدرس کے لئے روانہ ہونے والے تھے، وہ اس سے ملنے کیا شہ آئے، وہ اس وقت لانبریری جا رہی تھی۔ اپنی سائیکل ہاتھ میں لے کر وہ ان کے ساتھ ساتھ سڑک پر نکل آئی۔ بھیا صاحب نے اس سے کہا: ”میں یہاں سے بھاگنا چاہتا ہوں اور شکر ہے کہ مجھے فرار کا موقع مل گیا۔ میرا تباہہ مدرس کا ہو گیا ہے۔ تم تم مجھ سے شادی کر کے میرے ہمراہ چلنے کو تیار

ہو؟“

بھیا صاحب ایک تویوں بے حد حسین و جمیل تھے، نیوی میں شمویت نے اور سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ گویا چارس بوائیکر کو یونیفارم پہنا دیجئے۔

چمپا کا چہرہ کسی نامعلوم جذبے کے تحت سرخ ہو گیا۔ یہ ایک بہت اہم بات تھی جو اس نے سنی۔ ایک آدمی اسے اپنی زندگی میں شامل ہونے کے لیے مدعو کر رہا تھا اور وہ اس آدمی کو بے حد پسند کرتی تھی۔

مگر اس نے کہا: ”نمال ہے۔ آپ کو یہ کہتے ہوئے شرم تو نہ آتی ہو گی۔“

”پھر تم نے مجھے باغ کے راستے پر کیوں چلا�ا تھا۔“ انہوں نے غصے سے کہا۔

”میں نے آپ کو کسی باغ باغ کے راستے پر نہیں چلا�ا۔“

”تم ایمانداری سے کہہ سکتی ہو کہ تم نے مجھ میں وچکپی نہیں لی۔ یہ جانتے ہوئے کہ تمہاری دوست تھیں سے میری شادی ہونے والی ہے۔“

وہ خاموش ہو گئی۔ یہ بالکل صحیح تھا۔ تب اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا اس میں بڑی خامیاں ہیں۔ اصول اور بلند خیالات اور فلسفے علیحدہ چیز ہیں اور ہم اصل زندگی میں اپنے خیالات سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ خالص فلسفہ اور اخلاق کے اصولوں کا جذبہ اسے کوئی ایکلویشن نہیں۔ ہم درحقیقت بے حد کمزور ہیں۔

بھیا صاحب نے گویا اس کے خیالات پڑھ لیے۔ ”تم بھی بے حد معمولی نگئیں۔“ انہوں نے کہا۔

”میں نے غیر معمولی ہونے کا کس روز دعویٰ کیا تھا۔“ اب وہ بادشاہ باغ کے چالنک تک پہنچ چکے تھے جس میں یونیورسٹی پوسٹ آفس تھا۔ ”مذہبیے آپ میرے ساتھ ساتھ کیوں چلے آرہے ہیں۔ مجھے اپنے کام سے جانا ہے۔ آپ گھر تشریف لے جائیں۔“

”میرا کوئی گھر نہیں ہے۔“

”گھر تو ہم میں کسی کا بھی کہیں نہیں ہے۔“ چھپانے آتا کر کہا۔ ”اب میں اس سے آپ سے فلسفہ نہیں چھانٹنا چاہتی۔ آپ کا مکان موجود ہے، جو گلفشاں کہا تا ہے۔ لا ہول ولا۔ کس قدر لوگس بوس نام ہے _____ اور وہاں تہمینہ موجود ہے۔ والپس جائیں۔“

”تم بے حد معمولی ہو اور عام عورتوں کی طرح مجھ سے لڑ رہی ہو۔ تمہارے سارے رو عمل بہت معمولی ہیں۔ تم بھی بالآخر نائب پر لوٹ گئیں _____ تمہارے جیسی ہزاروں لڑکیاں دنیا میں موجود ہیں۔ تم نے پہلے مجھ سے فلرٹ کیا اور اب آگے ساتھ دینے کی ہمت نہیں۔ حد ہے۔“

”عام مردوں کی طرح آپ بھی مجھ سے جھگڑہ رہے ہیں!“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”لہذا یہ نظریہ ثابت ہو گیا کہ ہم میں سے کوئی دیوی دیوتا کا درجہ نہیں رکھتا۔ خدا حافظ،“ وہ سائیکل پر بیٹھ کر تیزی سے ٹگور لانہ بھر پری کی سمت روانہ ہو گئی۔

”گلفشاں پہنچ کر بھیا صاحب تندہی سے پینگ میں مصروف ہو گئے۔ اسی روز تہمینہ ایم اے کا آخری پر چہ کر کے یونیورسٹی سے لوٹی تھی۔ سارے دن گھر میں کچھڑیاں کپتی رہی تھیں۔ بڑی بٹیا نے تعلیم ختم کر لی۔ بھیا صاحب نیوی کے افر

بن گئے، اب پوستنگ پر جا رہے ہیں، اب آخر بیاہ میں کیا دیر ہے۔ لوگو یہ بڑا اندر ہیں
ہے، خالہ بیگم نے کہا، کہ لڑکی اور لڑکا گھر میں موجود، تھیکرے کی ماں گ، اور شادی کا
کوئی نام نہیں لیتا۔ اسی کوکل جگ کہت ہیں۔“

رات کو بھیا صاحب خاموشی سے موڑ میں پینچھہ کرائشیں چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد گناہ دین بھی نظر وہ سے اتر گیا۔ نوکر چاکرا سے غصے
سے دیکھتے۔ بے مرود تھے دنوں جنے ۔۔۔ حسینی کی بی بی نے زردہ
پھانستہ ہوئے سون سے کہا اور اپنی لڑکی کی چھیاں گوندھنے لگیں۔ (ارے کمخت
چلی پینچھہ۔ انہوں نے لڑکی کو ایک چانوار سید کیا۔ لڑکی زور زور سے رو نے لگی۔)
سارے گھر پر بد مزاجی کا دورہ پڑ گیا۔ نواب تقی رضا بہادر نے اپنی بی بی سے
کہا ۔۔۔ اور ہنا صاحب اجز اوے کو اپنا بیٹا اور کرو لا ڈ۔ زمانے کا خون سفید ہو گیا
ہے۔ دنیا یہی کہے گی کہ لڑکی ہی میں کوئی خامی رہی، ہو گی جب بچپنے کے منگتیر نے
چھوڑ دیا۔

مال اور ہری شکر، تہینہ کے سامنے جاتے ہوئے کتراتے۔ گرمیوں کی
چھپیاں شروع ہو چکی تھیں۔ چمپا بنا رس لوٹ گئی۔ اب حسب معمول پہاڑ پر جانے
کا پروگرام بنا۔ سارے گھروالے نینی تال کے لیے روانہ ہو گئے۔ ہری شکر کو اپنے
بردھوے کے لیے مرزا پور جانا تھا۔ اس کے آج دھڑا دھڑ پیغام آرہے تھے۔ مال
اپنی پھوپھی کی دعوت پر سوری چلا گیا۔

جو لائی میں پھر سب لوگ پہاڑوں سے اتر نا شروع ہوئے۔ گلفشاں، کے
 دروازے کھلے۔ پروالی میں باغ کے پودے سرسرائے کہ ایک روز اچانک بھیا

صاحب آن پہنچے۔ تین دن وہ گلفشاں میں بھرے اور تینوں دن اپنے کمرے میں بیٹھ رہے۔ روانگی سے ایک روز قبل وہ اماں بیگم کے کمرے میں گئے۔

”مبارک ہو۔ آپ کی بیٹا ایم۔ اے پاس ہو گئیں۔“ انہوں نے تخت کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے بڑی پرسکون آواز میں کہا۔

اماں بیگم خاموش رہیں۔

”میرا خیال ہے اب آپ کو ان کی شادی کر دینی چاہئے۔“

”کس سے؟“ اماں بیگم نے زرائخی سے پوچھا۔

”مجھ سے اور کس سے؟“ انہوں نے بھی اسی تلغی سے جواب دیا۔

”تم کو میاں شرم تو نہ آتی ہوگی اب یہ کہتے۔ پچھا کی جیسی کوچھوڑ کر غیر اڑکی کے پھیر میں پڑ گئے۔ ہم جد ہر جاتے ہیں انگلیاں اٹھتی ہیں۔“

”یہ آپ نے کس طرح طے کر لیا کہ میں اپنے فرض سے غافل ہوں۔ میں پال پوس کراس گھر میں اسی لیے پروان چڑھایا گیا ہوں کہ تمہینہ بیگم کا شوہر کہاں اؤں۔ اب میں اتنا احسان فراموش بھی نہیں کہ آپ کی بیٹا کو جل دے جاؤں گا۔“ اتنا کہہ کر وہ بہر چلے گئے۔

سون نے جا کر تمہینہ سے کہا: ”بیٹا ہم تو امام باندی کو بلا نے جا رہے ہیں، گانے کے لیے۔ کچھ سننا نہیں آپ نے، آپ کا بیاہ ہو رہا ہے۔“

”سون تم جا کر سب لوگوں سے کہہ دو کہ چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے میں ہرگز ہرگز بھیا صاحب سے بیاہ نہ کروں گی۔“

اتنا کہہ کر تمہینہ پھوٹ پھوٹ کر وہ نے لگی۔ سون ہکا بکارہ گئی۔

گھر میں ایک جنسی کا اعلان کر دیا گیا۔ چاروں طرف فون اور ٹرنک کال ہوئے۔ مال کو سوری تار دیا گیا کہ وہ بہن کو آکر سمجھائے۔ ہر شخص نے اپنے بھر تہینہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ تم لڑکی ہو۔ ایم اے۔ پاس ہوتو کیا ہوا؟ اور بڑے گھر کی بیٹیا ہوتو کیا ہوا؟ ہوتو لڑکی۔ شادی کرو۔ اس کے بغیر گزرنہیں۔ رشتے ناطے کے معاملات میں ایسی اونچی نیچی ہوتی ہی رہتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

مگر تہینہ نے ایک نہ کے بعد ہاں کر کے ہی نہ دی، گو خاص لڑکیوں والے انداز میں وہ رات بھر روایا کرتی۔

چمپا بھی واپس آچکی تھی۔ یہ اس کا کیتیگ کانج میں آخری سال تھا۔ مال نے سوری سے آکر گھر کا یہ نقشہ دیکھا، پھر وہ چمپا سے ملنے کیلاش گیا، وہاں معلوم ہوا کہ چمپا بھی اپنے ماںوں کے یہاں ہیں، اگلے ہفتے ہوشل آئیں گی۔ چمپا کے یہاں پہنچا تو وہاں بھیا صاحب سے اس کی مذہبیت ہوتی۔ پتا نہیں وہ چمپا سے اب کیا کہنے گئے تھے، وہ انٹھ کر چلے گئے۔ اسی روز وہ مدارس کے لیے روانہ ہوئے۔

رفتہ رفتہ حالات پھر نارمل پر آگئے۔ تہینہ کے سامنے بڑا مسئلہ تھا کہ اپنے وقت کا کیا کرے؟ لڑکیوں کے لیے ملازمت کی کوئی راہیں نہیں تھیں سوائے ایک محکمہ تعلیم کے۔ تھگ آکر اس نے پھر یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور قانون پڑھنے لگی۔ چمپا اسی طرح اس کے گروہ میں شامل رہی۔ ان دونوں لڑکیوں نے نہایت رکھ رکھا اور سلیقے کے ساتھ ایک دوسرے سے اپنی دوستی بھائی۔ کبھی بھولے سے بھی بھیا صاحب کا ذکر نہیں کیا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ یہ سمجھتی رہیں کہ بہت سنجیدہ اور

باوقار خواتین ہیں۔ کوئی کل کی لوٹ دیاں ہیں کہ جذبات کے چھپھورے پن میں بتا ہوں!

اور یہ واقعہ بھی ہے کہ وقت طور پر جو باتیں ہم کو قیامت معلوم ہوتی ہیں وقت گزر جانے کے بعد خیال آتا ہے ہم کس قدر بیوقوف تھے کہ یوں مضطرب ہوئے۔

۳۶

خط کی ریلیف ورک کے سلسلے میں مال کلکتے جانے والا تھا کہ اسے جیجا جی کا خط ملا۔ اج کی شادی کو ایک سال ہو چکا تھا، وہ اپنے شوہر کے ساتھی دلی میں تھی جہاں جیجا جی گورنمنٹ آف انڈیا کے کسی مجھے میں انڈر سیکرٹری تھے۔ اب نر ملا کی شادی کی فکریں کی جا رہی تھیں۔ جیجا جی نے لکھا تھا: تم کلکتے جا رہے ہو۔ سردیم پ نرائن کا لڑکا گوم بھی آج کل وہیں ہے۔ اس کے لیے ہمارا ارادہ ہے کہ نرمل کی بات بھیجی جائے، وہ بھی تمہارے بنگال ریلیف اور اپنا وپنا کے چکری میں وہاں گیا ہوا ہے یا شاید وشو ابھاریت میں کچھ کر رہا ہے۔ بہر حال تم ذرا اس سے ملنا اور معلومات حاصل کرنا کہ کس قماش کا لڑکا ہے۔ کچھ سنجیدگی بھی ہے مزاج میں یا تم سب کی طرف غالی بوئیں ہی ہے۔

مال نے خط جیب میں رکھ لیا۔ مال کے آدمی ہیں جیجا جی بھی۔ انسان دیس میں مکھیوں کی طرح مر رہے ہیں، ملک تباہی کی اور جا رہا ہے، یہ شادی بیاہ کے قصے

لے کر بیٹھے ہیں۔ (وہ بڑا جو شیلا اسٹوڈنٹ ورکر تھا اور تمہینہ اور بھیا صاحب کے قصے کے بعد سے شادی کے منسلک سے شدت سے بور ہو چکا تھا) میں لکلتے میں قحط زدہ انسانوں کی لاشیں اٹھاؤں گایا نزل صاحبہ کے لیے دو اہم تلاش کرتا پھر وہ گا، اس نے جھنجھلا کر طاعت سے کہا، مگر بہر حال فرض کے طور پر اس نے ان صائزے کا پتائنوٹ کر لیا جو جیجا جی نے خط میں لکھا تھا اور سفر پر روانہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ یونیورسٹی کے اور بہت سے اڑکے بڑکیاں تھے۔ راستہ بھری یہ لوگ یگور اور نذر الاسلام کے دولہ انگلز گانے گاتے گئے۔ ٹرین کی کھڑکی میں سے وہ وطن کے لہبھاتے کھیت دیکھتا رہا اور سوچا کیا۔ یہ میرا ملک ہے ۔۔۔ یہ میرا ملک ہے ۔۔۔ ولنیت اور انقا بیت اور قومی جوش اور بر طانوی حکومت کے خلاف غم و غصے کے جذبات نے اس کے دل میں ایک عجیب و غریب کیفیت پیدا کر دی۔ اسی روز کے اخبار میں ایک بنگالی آرٹسٹ زین العابدین کے بنائے ہوئے قحط کے مناظر کے اسکچ چھپے تھے۔ رکھا نے اخبار اس کی طرف بڑھا دیا۔ مال نے نظریں اٹھا کر ریکھا کو دیکھا، وہ رو رہی تھی۔

سب نے مل کر پھر گانا شروع کر دیا: یہ جنگ ہے جنگ آزادی ۔۔۔ آزادی کے پرچم کے تلے ۔۔۔ ہم ہند کے رہنے والوں کی ۔۔۔ ریل کی چک چک گیت کی ہم آہنگ معلوم ہوئی۔ دوسرے کونے میں چند اڑکے زور زور سے بحث کر رہے تھے۔

مال نے آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کی۔ اس کے رفقاء اسی طرح بھیشیں کرتے رہے ۔۔۔ ٹرین بہار کے سر بزر علاقوں سے گزرتی بنگال میں

داخل ہو گئی۔

انگا کے کنارے ایک چھوٹے سے خوبصورت ضلعے کے آئیشن پر ڈین رکی۔ لڑکوں نے کھڑکی کے باہر دیکھنا شروع کیا۔ چاروں اور تالاب تھے اور بیزہ زار اور بانس کے جھنڈے۔ دور سورج انگا کی لہروں میں غروب ہوا تھا۔ آئیشن پر دو پالکیاں کھڑی تھیں۔ پلیٹ فارم پر دیپا تیوں کا مجھ تھا جو چاول کی تلاش میں کلکتے جانے کے لیے ڈین پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ پلیٹ فارم کی دوسری طرف مقابل میں فوجیوں کی ڈین کھڑی تھی۔ سکھ اور پنجابی سپاہی جو برما جا رہے تھے، اردو کے فلمی رسائلہ ہاتھ میں لیے ادھرا دھر شملتے پھر رہے تھے۔

ایک ہندوستانی میحر صاحب اپنی بیگم صاحب اور دوبل ٹیریکتوں کے ساتھ فرست کلاس کے ڈبے کے سامنے کھڑے ایک انگلریز کرنل سے مصروف گفتگو تھے۔

”جب تک یہ فوجی ڈین نہ چلی جائے آپ کی گاڑ روانہ نہیں ہو گی۔“ ایک گارڈ نے مال کو بتایا۔

”اس کا مطلب ہے۔“

”جی ہاں۔ کوئی چار پانچ گھنٹے لیٹ ہو گی آپ کی یہ ڈین۔ یہ وارثا نام ہے جناب۔“

لڑکے اور لڑکیاں پلیٹ فارم پر اتر آئے۔

اردو گونے بوچے مادول۔ انہوں نے مذر السالم کا ایک اور گیت شروع کر دیا۔ میحر صاحب کی بیگم صاحبہ دچپی سے ان لوگوں کو دیکھنے لگیں۔

”یہ کون لوگ ہیں۔ کتنی پیاری آواز ہے سب کی ____“

”کیونکہ ہیں سالے ____“ میجر صانے منہ پھیر کر جواب دیا۔ ”چلو۔

کرٹل ہمیں ریسوران کار میں مدعو کر گیا ہے۔“

وہ دونوں ٹھبلتے ہوئے ریسوران کار کی سمت چلے گئے۔

مال اور اس کے ساتھ اب گاتے گاتے بھی تھک گئے۔ ٹرین چلنے کا نام نہ لیا تھا۔

یہاں کا یک ریکھا جیخ کر ایک طرف دوڑی۔ اس کے ساتھی بھی اس کے پیچھے پیچھے لپکے۔ پلیٹ فارم کے سرے پر کسانوں کا ایک چھوٹا سا کنہہ ہے اور سکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ ایک نوجوان، جس کی چھوٹ سی چھدری سیاہ داڑھی تھی، مرا ہوا پڑا تھا۔ اس کی بیوی ایک سانوںی سلونی دلی پتلی لڑکی وحاظریں مار مار کر رو رہی تھی۔ اس کے دنوں پہنچ جن میں سے لڑکے کی عمر نو سال کی تھی، ساتھ ساتھ چلا رہے تھے۔

”مال ____“ ترینڈر نے آواز دی ”اہر اور ____ ہمارا

لاشیں اٹھانے کا کام تو میاں یہیں سے شروع ہو گیا۔“

سکیوں کے درمیاں اس نے بنگالی میں بتایا کہ وہ اور اس کا میاں ابوالمنصور رزق ڈھونڈ نے لکھتے جا رہے تھے۔ انہوں نے ایک ہفتے سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ آمنہ بی بی نے بھی ایک ہفتے سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ فوجیوں کے ٹرین میں سے پھینکے ہوئے دھمک اور توس کے چند لکڑے جو اس نے جمع کیے تھے وہ اپنے بچوں کو کھلا چکی تھی۔ اتنا کہہ کرو وہ بھی پلیٹ فارم پر لیٹ گئی اور ان سب کے سامنے اس نے بھی دم توڑ دیا۔

اینگلوانڈ میں آئیشن ماٹریان کی طرف آیا: ”آپ لوگ ادھر کیا گز برمچاتا ہے۔ آج کل روز سوچاں آدمی پلیٹ فارم پر مرتا ہے۔ ہم کس کس کا فکر کرے۔ یہ ریلوے آئیشن ہے اسپتال نہیں۔ یہ بنگالی ہمیشہ کا بھوکا ہے۔ بھوکا بنگالی! آپ کیوں لگر کرتا ہے۔“

”یہاں قبرستان کدھر ہے؟“ تریندر نے غصے سے ہونٹ چباتے ہوئے پوچھا۔

”ہم کو معلوم نہیں ____ کیوں کیا آپ ان لوگ کا کبھو دے گا۔ دیت ازویری فنی ____ !!!“

لڑکیوں نے دھاڑیں مارتے ہوئے بچوں کو ساتھ لیا اور بازاری کی طرف چل دیں ____ لڑکے قبرستان اور کسی مسلمان مولوی کی تلاش میں آبادی کی طرف روانہ ہوئے۔

مال لاشوں کے پاس بیٹھ گیا۔ اتنے میں فوجیوں کی ٹرین مہریب آوازیں نکلتی، دھواں چھوڑتی روانہ ہوئی۔ فرست کلاس کا ڈبپ پاس سے گزر جس میں سکھ میجر اور اس کی دہن بیٹھے تھے۔ ان دونوں کو لاشیں نظر نہیں آئیں کیونکہ انہوں نے کھڑکیوں کی جھلکیاں چڑھا دی تھیں۔ فوجی ٹرین کے جانے کے چند منٹ بعد اس ٹرین کو بھی جنبش ہوئی جس میں مال اور اس کے ساتھی سفر کر رہے تھے۔ گارڈ مال کے پاس آیا: ”ٹرین جاتا ہے۔ آپ لوگ ادھر کیا کرنے لگا۔ آپ کافرینڈ لوگ کدھر گیا۔“

”ہم اب کل صبح ہی جاسکیں گے۔“ مال نے جواب دیا اور تھرڈ کلاس کے

ڈبے میں جا کر سارا سامان نکال کر پلیٹ فارم پر رکھنے کے بعد لاشوں کے پاس آن بیٹھا۔ یہڑیں بھی چلی گئی اسٹینشنس فلت اسٹیشن ہو گیا۔

پلیٹ فارم کے سر پر اندر ہیرا تھا۔ گارڈ بہت نیک دل انسان معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ایک لاثین لا کر کمال کے پاس رکھ دی اور پھر اپنے دفتر کی طرف چلا گیا۔ کمال لاشوں کے پاس بیٹھا رہا۔ ہوا میں بانسو کے جھنڈ میں سائیں سائیں کرتی رہیں۔ کمال نے اپنے ہولڈال میں سے ایک چادر نکال کر لاشوں پر اڑھادی۔ آمنہ بی بی، جس نے سرخ ساری پہن رکھی تھی اور ابوالمنصور، جس کی نیلی چارخانہ دار تہہ میں بہت سے پیوند لگے تھے، دونوں اس چادر میں چھپ گئے۔ کمال اسٹینشنس میں اٹھا کر لاثین کی روشنی میں زین العابدین کے اسکچ دیکھنے لگا۔ اس دلیں کے مصور نے کیا اسی جوڑے کی تصویر بنائی تھی؟ چند قدم پر انگا بہہ رہی تھی۔ اس کی اہروں پر ایک اکیلانو کا چل رہا تھا جس میں چراغ جلتا تھا اور کوئی بڑی دلدوڑ آواز میں بھیایا گاتا جا رہا تھا۔ جس کے الفاظ مال کی سمجھ میں اچھی طرح نہیں آئے۔ درختوں کے پرے لارڈ کارنوالس کے عہد کی بنی ہوئی اونچے چل پاہپوں اور جھلملیوں کے برآمدے ولی ضلع کے لکنٹر کی عظیم الشان کوٹھی تھی۔ اس سے ذرا فاصلے پر ضلع کے سب سے بڑے ہندو زمیندار کا محل تھا جہاں ریڈ یونیورسٹی کا آواز تھا۔ رات کے نائلے میں ہواں پر تیرتی ہوئی بی بی کے لائٹ پروگرام کی آواز یہاں تک صاف سنائی دے رہی تھی۔ مال کا دل ڈوبتا چلا گیا۔ اس نے ۲۰ نکھیں بند کر لیں۔ یہ را بند رہا تھا اور سرو جنی دیوی اور سرت چندر کا دلیں تھاناوں نگاروں اور شاعروں کا محبوب موضوع۔

ہم سب مختلف قسم کی کتابوں کا موضوع ہیں۔ تاریخ کے ابواب، الفاظ، اعداد و شمار، پورٹیں، کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کی تقاریر۔ کیونکہ پارٹی کے منی فیسو۔ پچھلے ہفتے ڈاکٹر اشرف کہہ رہے تھے کہ قوموں کی خود مختاری کا مطالبہ دین لینن کے نظریوں کے مطابق ہے۔ پاکستان — تو کیا جو مسلمان ہے وہ آٹو مینک طور پر پاکستان ہو جائے گا — یا کیا ہوگا — لینن، اشائیں، گورکی، ڈاکٹر اشرف، سجاد ظہیر، جناح صاحب، مہاتما گاندھی، پنڈت جی —

مال کے دماغ میں واقعات اور ناموں اور شخصیتوں کا جلوس منڈلا یا کیا لیکن ساری دنیا کا مرکز اس وقت یہ دولاشیں تھیں۔ سارے واقعات اور نظریوں کے سلسلے کی کڑی آ کر اس مرکز پر ٹوٹ جاتی تھی۔ آمنہ بی بی اور ابوالمنصور دولاشیں۔

وہرے روز صحیح وہ سب پھر اپنے سفر پر وانہ ہوتے۔ شام کوڑیں ہوڑہ پہنچی۔ اڑکے اور اڑکیاں اپنے اپنے جائے قیام کی طرف روانہ ہوئے۔ پرمود مار کا گھر ان سب کا مستقر تھا جہاں ان سب کو وہرے روز جمع ہونا تھا۔ مال چیت پور روڈ کی طرف چلا جہاں اس کے ایک ماہوں ”ٹیکا برجن والے نواب“ رہتے تھے۔

چیت پور روڈ کے ایک مکان کے چھانک کے سامنے ایک بندگاڑی آن کر رکی۔ اس مکان کا طرز تعمیر کمپنی کے عہد کا تھا جس طرح کے مکان جا بجا کلکتے میں

نظر آتے ہیں۔ بڑے بڑے پیلے پائے۔ چوڑا برآمدہ۔ برآمدے اور دروازوں پر
لپشین تھلمیاں۔ اندر کمروں میں مرصع شہری فریموں میں انگریزی مناظر لگے
تھے۔ کشمیری کڑھت کے پردے دروازوں پر پڑے ہوئے تھے۔ پیتل کے گملوں
میں چینی پام سجا تھا۔ باہر باغ کی چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں بیلامہک رہا تھا۔

اوپر کی منزل سے لڑکیوں نے آواز لگائی: ”ارے کمن بھیا آگے لکھنو سے۔
”سارے گھر میں شور میش گیا۔ نوکر انیاں اور نوکر بآہر دوڑے۔ نیچے برآمدے میں
فرن کے پتے جھوم رہے تھے۔ نواب صاحب بھانجے کے استقبال کے لیے آرام
کرنی سے اٹھے۔

یہ مکان پچاس پچھپن سال قبل دت خاندان سے میا بر ج والے نواب مال
رضابہادر کے چھوٹے بہنوئی نے خرید لیا تھا۔ اس مکان میں ایک زمانے میں بڑی
دھوم دھام سے برہمو سماج کے جلسے ہوا کرتے تھے۔ اوپر کی منزل کے ایک کمرے
میں اب تک دت خاندان کے افراد کی دھندلی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ گروپ فوٹو
گراف جس میں مہارشی ہارمونیم پر بھجن گاتے تھے۔ مالک مکان بابو منور بھن دت
کے انتقال کے بعد جو کینٹگ کالج لکھنو میں پروفیسر تھے، ان کی اولاد نے یہ مکان
فروخت کر کے بابی گنج میں ایک بہت بڑی کوٹھی بنوائی تھی۔ ان کی اولاد میں اب کئی
آلی سی افسر تھے۔ کئی کمیونسٹ لیڈر۔ ان کی لڑکیاں زیادہ تر یورپ میں تعلیم
حاصل کرتی تھیں۔ بابو منور بھن دت کی ایک پوتی کی شادی اڑیسہ ایک مہاراجہ سے
ہوئی تھی۔ موجودہ مالک مکان اور دت خاندان کی کئی پشتاؤں کی دوستی تھی۔

موجودہ مالک مکان لکھنو کے اجزے ہوئے نواب تھے۔ وثیقہ پاتے تھے اور

کلکتے میں رہتے تھے۔ ان لوگوں کا مشغله زندہ رہنا تھا۔

نوابِ مال رضا بہادر سلطان عالم واجد علی شاہ کے ہمراہ میا بر ج آئے تھے۔ ان کے خاندان کے بہت سے افراد بھی ان کے ساتھ تھے۔ نواب علی رضا بہادر ان کی سب سے چھوٹی بہن کے میاں اور چچا زاد بھائی تھے۔ انیسویں صدی کے اوآخر کا گلکتہ بے حد موڑن شہر تھا جس میں ان گنت کالج تھے اور سیاسی اور تہذیبی تحریکیں اور پر لیں اور اخبار۔ نئے بنگالی ناولوں میں ہندوستانی موسیقی کی احیاء کا سلسلہ شروع کیا جا رہا تھا۔ راجہ سریندر مون یگور نے ہندوستانی موسیقی کی احیاء کا سلسلہ شروع کر دکھا تھا۔ سوامی و دیکا نند یہاں سے باہر جا کر یورپ اور امریکہ میں دیدانت فلسفے کا پروپریٹر ہے تھے۔ ملک میں ہر طرف سیاسی اور تہذیبی تحریکوں کا چرچا ہو رہا تھا۔ کانگریس بدراالدین طیب جی اور دوسرے لیڈروں کی قیادت میں بڑے بڑے اجلاس کر رہی تھی مگر نواب علی رضا بہادر کو ان سب ہنگاموں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ علی گڑھ میں ایم۔ اے۔ او کالج محل گیا تھا مگر نواب صاحب کو انگریزی تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کے سو شل تعلقات مرشد آباد اور ڈھاکے اور عظیم آباد کے نواب خاندانوں تک محدود رہے۔ ان کی اولاً اور خاندان والوں کی شادیاں لکھنو اور اودھ کے تعلقدار گھرانوں میں ہوا کیں۔ لکھنو میں یہ لوگ کلکتے والے نوب کہلاتے تھے۔ کلکتے میں انہیں لکھنو والے کہاں جاتا تھا۔ ان کی زندگی کے مرکز صرف تین تھے: کلکتہ، پٹنہ (عظیم آباد) اور لکھنو۔ اس سے آگے کی دنیا کی انہیں خبر نہیں تھی۔ ان کا سارا وقت لکھنؤ دلی اور عظیم آباد کی ادبی اور شاعرانہ نوک جھوٹک میں صرف ہوتا تھا۔ وشیقے کی آمدی کا درجہ سے بے فکری سے گزر رہتی تھی۔ سر پر

بر طانیہ کا سایہ سلامت تھار اوی چین لکھتا تھا۔

تب ان کے خاندان میں پہلی مرتبہ ایک عجیب بات ہوئی۔ نواب علی رضا کے داماد جو لکھنو میں رہتے تھے، سر سید کی نیچری فوج میں شامل ہوئے اور انہوں نے اپنے بڑے بڑے کو علی گڑھ بھیج دیا۔

نواب علی رضا کے داماد پٹنے کے رہنے والے تھے وہ بھی بے حد روشن خیال تھے۔ پٹنے میں قانون کا بہت چرچا تھا۔ ان گنت ہندو مسلمان قانون پڑھ پڑھ کر بیر بڑ بن رہے تھے اور بڑا نام اس پیشے میں انہوں نے پیدا کیا تھا۔ چنانچہ نواب علی رضا کے پٹنے والے نواسے کو بھی اتنا پڑھایا گیا کہ وہ بہت زیادہ پڑھ گئے اور بیر سری کے لیے ولایت چلے گئے۔ یہ اس خاندان کے پہلے فرد تھے جو انہیسویں صدی کے آخر میں ولایت گئے۔

نواب علی رضا کے لکھنو والے داماد انگریزی تعلیم کے تو قائل ہوئے ہی تھے اب وہ سیاست میں بھی دلچسپی لینے لگے۔ سر سید مسلمانوں کو تیجہ پلیٹ فارم پر جمع کر کے انگریزوں کا وفادار رکھنا چاہتے تھے۔ اس منسلک پر ان کا سر سید سے اختلاف ہو گیا، وہ کانگریس کے ہم خیال ہو گئے۔ اب ان کے یہاں لکھنو کے گولہ گنج والے مکان میں لا لہ بھائیوں کا مجتمع رہتا۔ یہ سب لوگ ابھی گورنمنٹ کے وفادار بھی تھے اور صرف سیاسی مراعات اور سوشل ریفارم چاہتے تھے۔ ان گنت مسلمان اس تحریک میں شامل تھے۔

ہندوستان میں مسلمان کی سیاسی حیثیت کا مسئلہ بہت ٹیز حابنما جا رہا تھا۔ ہندو جو سو سوا سو سال سے انگریزی تعلیم سے روشناس ہو چکا تھا، اپنے گنجلک مابعد

الطبیعتی ذہن اور خالص تحریری فلسفے کے باوجود پریکٹیکل تھا۔ مسلمانوں کے عہد میں فارسی پڑھ کر حکومت کے اظہم و ناق میں حصہ لیا۔ مسلمان حکمران اور صوبے دار صرف فرمانوں پر دخنخڑ کر دیتے تھے۔ وہی ایڈمنیسٹریشن ہندو چلاتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی آئی، تب بھی ہندو نے فوراً حالات سے سمجھوتہ کر لیا اور مغلوں کا کامستھونشی پل کی پل میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کلرک میں تبدیل ہو گیا۔ پچھلے سو سال سے ہندو اپنی ذات پات کے بندھنوں اور اپنے پراچین فلسفے کے باوجود مغربی تعلیم اور سائنسیک نظریہ فکر کے قریب تر ہو چکے تھے۔ سب سے پہلے مغرب کے فلسفے کا اثر کانہوں نے قبول کیا۔ جب قوم پرستی کی تحریک شروع ہوئی، اس کا تدارک کرنے کے لئے انگریزی حکومت نے فوراً ملک کے پس ماندہ طبقوں کو، جنہیں ۷۵ء کے بعد ہر طرح سے کچلا یا گیا تھا، اب اپنی عنایات سے نوازا شروع کیا۔ ہندوؤں کے میہاں ایک بورڑوازی بھی پیدا ہو شکی تھی جو لیڈر شپ اور لبرل سیاست کے لیے تیار تھی۔ مسلمان ابھی فیوڈل اسٹٹج سے آگے نہ نکلے تھے۔ ان کے ذہن میں اب تک شہنشاہیت کے تصور موجود تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب ان کی اپنی بادشاہت کا خاتمه ہوا تو اس کا جذباتی نعم البدل انہوں نے سلطان ترکی سے محبت میں ڈھونڈا، وہ ان کا خلینہ تھا جو قسطنطینیہ میں رہتا تھا، پھر حیدر آباد کن کے نظام سے ان کو عقیدت تھی کیونکہ اس گئے گزرے زمانے میں ایک اتنی بڑی ریاست کا مسلمان فرمائز رہا تھا۔ ان کی لیڈر شپ کے لیے جب ہزاری نس آغا خاں اور دوسرے نوابین آئے تو مسلمان عوام کو بہت اچھا معلوم ہوا کیونکہ نام اور خطط بات بہر کیف عہد رفتہ کی یاد دلاتے تھے۔

انگریز اور فوجوں طبقے کا گھٹ جوڑ بہت کامیاب ثابت ہو رہا تھا۔

بنگال میں مسلمانوں کے عہد میں معافی کی زمینوں کی آمدی سے مدرسے قائم تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان زمینوں پر اپنا قبضہ کر لیا تھا۔ مدرسے بند ہو گئے اور مسلمان پس ماندہ رہ گئے۔ ان کے مقابلے میں ہندو انگریزی پڑھر ہے تھے۔ مسلمان جا گیر دار ختم ہو چکا تھا۔ مسلمان صنعت کا رتبہ کرو دیا گیا۔ اس کی جگہ دوامی بندوبست کے نئے ہندو زمینداروں اور ہندو مذہل کلاس نے لی تھی۔ طبقاتی الف پھیر کے اس پس منظر کے ساتھ بنگال میں سب سے پہلے نشأۃ ثانیہ کی تحریک شروع ہوئی تھی۔ نئی ہندو بورڑوازی قیادت کے لیے تیار تھی۔ ملازمتیں حاصل کرنے کی ووڑ میں بھی ہندو مسلمانوں سے آگے نکل گئے تھے۔ مسلمانوں میں خوف کی سائکلووجی پیدا ہوئی شروع و پہنچی تھی۔ اس خوف کو اچھے موقعے پر انگریز نے ہوا دی۔

وفا دار انگریزی خواں مسلمانوں کا مذہل کلاس بننا شروع ہوا۔ مسلمان جو لہا اور کسان، جو ملک کی دھرتی پر محنت کر کے زندہ رہتا تھا، اس کے متعلق کسی نے بھی نہ سوچا۔ سب کو یہی فکر تھی اپنے لیے زیادہ سے زیادہ اقتصادی تحفظ اور ملازمتیں حاصل کر لی جائیں۔

پھر جنگ چھڑی اور ڈاکٹر انصاری آئے اور علی برادران اور خلافت تحریک چلی اور گاندھی آئے اور کانگریس نے علی الاعلان سواراج کا مطالبہ کیا۔ اب حالات تیزی سے بدلا شروع ہوئے کھادی کی تحریک اور قوم پرستی۔ ایک عجیب جوش سارے ملک پر طاری ہو گیا۔

نواب علی رضا بہادر کے داماد نقی رضا بہادر، جو تعلقے دار تھے، کھلے بندوں قومی تحریکوں میں حصہ نہ لے سکتے تھے۔ اودھ کے تعلقہ داروں نے ۱۸۵۷ء میں اودھ کو بچانے کے لیے جم کر انگریزوں کا مقابلہ کیا تھا مگر بعد میں یہی تعلقہ دار انگریزوں کے جان شارثابت ہوئے کیونکہ ان کے اور انگریزوں کے گھن جوڑ کے ذریعے کسانوں پر ان کا تسلط قائم رہ سنتا تھا۔ یہ لکھنو میں نواب سر ہار کورٹ ٹیلر کا زمانہ تھا۔ اس نے تعلقہ داروں والی عادتیں اختیار کر کھلی تھیں۔ یہ لکھنو کے تعلقہ داروں کا شہر ادوار تھا۔ ایک طرف آزادی کی آندھی چل رہی تھی دوسری طرف قصرباغ کی بارہ دری میں دھوم کے مشاعرے ہوتے تھے۔ جان عالم کے عہد کی تجدید ہوئی تھی۔ یہ مہاراجہ محمود آباد اور خاک نواب علی اور رائے راجیشور بانی کا لکھنو تھا۔

اسی زمانے میں ان کے علی گڑھ کے تعلیم یافتہ بیٹے نواب ابوالکارم نقی رضا بہادر کے یہاں بڑی اللہ آمین سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اپنی وادی اماں کے ماموں نواب مال الدین علی رضا بہادر کے نام پر مال رکھا گیا۔

مال کو اپنے بچپن کا زمانہ بڑے واضح طور پر یاد تھا جب وہ گھر میں بڑوں سے سیاست کے تذکرے سنتا۔ نواب ابوالکارم کا خاندان اب الگ و قتوں کا جیسا نہیں تھا۔ اب اس گھرانے کے افراد کاری ملازمتیں بھی کر رہے تھے۔ بڑے بچپن میاں یعنی بھیا صاحب کے والدیہ سڑ تھے اور کانگریسی لیڈر، مگر ان کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا۔ پٹنے والے ماموں بھی کانگریسی تھے اور آئے دن جیل جاتے رہتے تھے۔ مال کو ترک موالات کا زمانہ یاد تھا جب پٹنے والے ماموں اسے اپنے

ساتھ جلسوں میں لے جاتے اور وہ بڑے جوش و خروش سے استیج پر کھڑے ہو کر اپنی تو تلی زبان میں قومی انظمیں پڑھتا اور پولیس آکر لائھی چارج سے جلسے کو منتشر کر دیتی۔ سیاست اب محض اخباروں تک محمد و نہیں تھی، روزمرہ کی زندگی میں داخل ہو گئی تھی۔

جب ذرا اور بڑا ہوا تو اپنے ہندوستانی ہونے پر اسے ناز سامحوں ہونے لگا۔ اس ناز میں زیادہ تر اپنے ماضی پر فخر کرنے کا عصر شامل تھا۔ ہم یوں تھے۔ ہم وہ تھے۔ اسی قسم کی تقریریں لیڈر کر رہے تھے۔ سلرز سوت کے بجائے پٹنے والی مہانی نے اس کے لیے کھادی کی شیر و انی بنوائی۔ اس کے کزن جامعہ طیہہ میں پڑھتے تھے۔ اس نے بھی صد کی کام سے دلی بھیج دیا جائے مگر اس کی کسی نے نہ سنی۔ بہر حال کرنل براؤز دہرہ دون اور لاما رینر لکھنؤ کے برطانوی لڑکوں کے مقابلے میں وہ ہندوستانی تھا اور ہندوستان اس کا بہت پیارا وطن تھا۔

یہ ہندوستان کیا تھا؟ اس کا شعوری طور پر اس نے کبھی تجزیہ نہیں کیا۔ بچپن سے وہ اس ہندوستان کا عادی تھا جہاں وہ پیدا ہوا تھا، جہاں اس کے پرکھ پچھلے سات آنھسو سال سے پیدا ہوتے آئے تھے۔ اس ہندوستان میں رسولوں کے کھیت تھے اور رہٹ اور ستیا ادیوی کے مندر۔ ہندوستان بستی ضلع کا وہ مٹھا تھا جہاں وہ اپنے بابا کے ہمراہ گیا تھا۔ جہاں برآمدے میں تخت پر ایک موٹا بی۔ اے پاس مہنت بیٹھا تھا اور جس کو می نے دس کا نوٹ چڑھایا تھا اور جس نے آشی� با دوی تھی۔ ہندوستان اٹاوے کی وہ کالی آلو درگاہ تھی جس کی منڈیوں پر بہت سے قلندر اکڑوں بیٹھے رہتے تھے جن میں سے ایک نے مال کو بٹوں کے سفترے کھائے

تھے۔ ہندوستان قدر ڈرائیور کی بوڑھی ماں تھی جو پلیے رنگ کی دھوتی پہنے مرزاپور کے آشیش پرمال کے لیے مٹی کے کھلونے لے کر آئی تھی۔ ہندوستان سول اندر کی وہڑ کیس تھیں جن پر صاحب لوگوں کے ڈوگ بوائیز شام کو کتوں کو ہوا کھلانے کے لیے نکلتے تھے۔ ہندوستان بوڑھا حاجی بشارت حسین خانسا ماں تھا جو جب مال کو سیتا نگلی تھی تو، اپنی دوپنی ٹوپی اتار کر ایک ٹانگ پر ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا اور گرد کردا کر بولا تھا۔

”ماتا اب معاف کرو بھیا کو چھوڑ کر چلی جاؤ ماتا تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔“

یہ سوتیلا کے سامنے ہاتھ جوڑنے والا مسلمان بوڑھا ہندوستان تھا۔ اس کے علاوہ اس کی اماں اور خالائیں اور گھر کی دوسری بیویاں بھی ہندوستان تھیں۔ ان کی آپس کی بول چال، محاورے، گیت، رسمیں اور پھر پرانی کہانیاں، جو مغلانیاں سناتی تھیں: جو حصیا کے راجہ در تھے کی دو بیویاں تھیں۔ ایک کا نام تھا سیکنی، دوسری کا کوشیلیا۔ ہندو پرانوں اور دیو مالا کے قصے، مسلمان اولیا کے قصے، مغل بادشاہوں کے قصے۔ یہ سب مال کی ذہنی بیک گراوڈ تھی۔ ایک غور اپنے ماضی پر، ایک تاسف اپنے حال پر، ایک امید اپنے مستقبل کے متعلق ان تین عناصر سے اس کے ذہن کی تشکیل ہوئی تھی۔ گاندھی، جو دھوتی باندھے گھوتتے تھے اور ملک کے سنتوں، کبیر اور تمسی داس اور تکارام کی روایت پر پورے اترتے تھے، اس کسان کے لیے سمبل تھے جو خود بھی دھوتی

باند ہے نگا گھومتا تھا۔ نہرو اس ہندوستان کے بی فسل کے تمبل تھے جس کی دل میں
یہ سارے دریا امنڈر ہے تھے۔

اس ہندوستان میں ان گنت اسرار تھے _____ مذہب، فلسفہ، آرٹ،
رمزیت، تصوف، ادب، موسیقی _____ کیا کچھ یہاں نہیں تھا۔ ایک طرف یہ
زبردست عظیم الشان ورثہ تھا، دوسری طرف انگریزی تہذیب تھا۔ صاحب لوگوں کا
راج تھا۔ آسمبلی کے قانون تھے۔ گورنر کے دربار تھے۔ انگریز بڑی کے جو کرنل براؤز
اور لامارٹینگر میں اس کے ساتھ شہسواری کرتے تھے۔ انگریز افسر، جو گلفشاں میں
ڈنر کھانے آنے تھے، اس کی گولہ گنج والی حوالی کی شہنشیں میں پینچھہ کر مجرم کے جلوس کا
ناظراہ کرتے تھے۔ یہ انگریز، ہمیلی بری کے افسروں کے جانشین، جن کو سکھایا گیا تھا
کہ کن ہندوستانیوں کو جب وہ تمہاری کوٹھی پر سلام کے لیے حاضر ہوں توئہ آمدے
ہی میں بٹھاؤ، کن کوڑ رائگ روم میں بلانے کی عزت بخشنو، کن کو صرف کھڑے
کھڑے ہی ڈالی لے کر واپس کر دو، کن کے گھر خود بھی، جب وہ مدعو کریں تو چلے
جاو۔ مال اس خوش قسمت طبقے میں پیدا ہوا تھا جسے انگریزوں سے برابری سے
ملنے کا خیر حاصل تھا _____ ہندوستان کا فیوڈل طبقہ۔

۳۲۴ میں پنڈت نہرو نے یہ خوش آئندہ مید ظاہر کی تھی کہ گو مسلم سیاست پر فیو
ڈل عصر چھایا ہوا ہے، ان کا نچا متوسط طبقہ انڈسٹریل طور پر پس ماندہ ہے لیکن
چونکہ ان کے یہاں سماجی رشتہوں کا شعور زیادہ پختہ ہے اس لیے یہ لوگ ہندو لوہر
ڈل کلاس کے مقابلے میں سو شمسی راستے پر زیادہ تیزی سے گامزن ہوں گے۔
پنڈت نہرو یہ بھی کہتے تھے کہ ہمارے سرمایہ دار اور انڈسٹری کے کرتا دھرتا اور مل

مالک شدت سے رجعت پسند ہیں، وہ تو ابھی جدید زمانے کے سرمایہ دار بھی نہیں بنے ہیں۔ کانگریس پر ہندو اکثریت کا غالبہ ہے اور ہندو اکثریت فرقہ وارانہ ذہنیت کی حامل ہے۔ ایسے میں مسلمانوں میں خوف کی سائیکلووجی کا پیدا ہونا ناگزیر ہے اور اس صورت حال کو برطانوی حکومت خوب اچھی طرح اپنے فائدے کے لیے استعمال کر رہی ہے۔ ملک کا فیڈل عصر یہ بھی نہیں چاہتا کہ عوام اقتصادی طور پر آزاد ہوں لہذا انہوں نے برطانوی حکومت سے سازش کر رکھی ہے۔ مدل کلاس کی اٹل جنیسا میں فاشزم کے عناصر بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ ان خطرات کا مقابلہ کرنے میں ہمیں اپنی پوری کوشش صرف کرنا چاہیے۔ پنڈت نہرو بہت زبردست سو شلسٹ تھے ان کو گاندھی جی کی روحانیت اور بات بے بات خدا کا حوالہ دینا کھلتا تھا۔ مال اور اس کے ساتھ کی نواجون نسل کی پنڈت نہرو پوری پوری ترجیحی کر رہے تھے۔

اس نے باشور ہندوستان اور برطانوی ہندوستان کے علاوہ ایک اور الف لیلوی دلیس اسی ملک میں رہتا تھا جس کی جھلک مال نے حیدر آباد کن اور ریاست کشمیر اور بھوپال اور رام پور میں دیکھی تھی۔ یہ ریاستی ہندوستان تھا۔ یہاں سیاسی آزادی کے تصور کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ یہ راجہ مہراجہ برطانیہ کے فرزندان ملجندا کہلاتے تھے اور کمپنی سے انیسویں صدی میں جو معاهدے انہوں نے کیے تھے ان کی بناء پر مطلق العنانی سے حکومت کرتے تھے۔ ان ریاستوں میں خصوصاً حیدر آباد کن مسلمانوں کے لیے خاص جذباتی اہمیت کا مالک تھا۔ ہزار گزا لہڈ ہائی نس حضور نظام کی مملکت، تہذیب، شعرو شاعری نفاست، آداب محفل وغیرہ کا

مسلمہ چونکہ ایک خاص درباری اور جاگیردارانہ ماحول میں پھلتا چھوتا ہے لہذا یہاں پر مسلمانوں کی کلچر راجحی اپنی خالص حالت میں موجود تھی۔

جاگیرداروں، مل کلاس لیڈروں، ذہن پرستوں اور یونیورسٹیوں کے جو شیئے طالب علموں کی دنیا سے الگ ایک اور دنیا تھی جو اصل ہندوستان تھا۔ یہ دنیا آسام اور جنوبی ہند کے چاء کے باغات اور کانپور، بمبئی، لکھنؤ، احمد آباد اور نانا نگر کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں اور سارے ملک کے لاکھوں گاؤں میں رہنے والے کسانوں پر مشتمل تھی۔ کانگریس نے عرصے سے زرعی اصلاحات کے لیے ایجنسی ٹیشن کر رکھا تھا۔ کسانوں کے ملسلے میں برطانوی حکومت نے مختلف صوبوں میں حکمت عملی اختیار کر رکھی تھی۔ بنگال میں، جہاں انہوں نے مسلمانوں سے حکومت تھی، وہاں مسلمانوں کو اقتصادی طور پر بالکل تباہ کر کے ہندوؤں کو ان کی جگہ طاقتور بنایا تھا۔ پنجاب انہوں نے سکھوں کے ہاتھوں سے لیا تھا لہذا یہاں مسلمانوں کی انہوں نے بہت افزائی کی۔ جو صوبے سب سے زیادہ عرصے سے انگریزوں کے زیر نگمین تھے وہ سب سے زیادہ تباہ حال تھے۔ بنگال، بہار، اڑیسہ، مدارس۔ بنگال میں مستقل قحط پڑتے تھے۔ پنجاب انگریزوں کے ہاتھ میں سب سے آخری میں آیا تھا لہذا سب سے زیادہ خوشحال صوبہ یہی تھا۔ یو۔ پی، جو ہندوستان کا دل تھا اور ملک کی ساری قرون اولی، قرون وسطی کی تہذیبوں کا گھوارہ، وہیں کا کسان سب سے زیادہ مغلوک الحال تھا۔ کسان، جو کانگریس تحریک کی طرف آ رہا تھا، سمجھتا تھا کہ سوراج کا مطلب زرعی اصلاحات ہے۔ جب اسے جنم جنم کے ظلم اور قرضے کے بوجھ سے نجات ملے گی۔

شہروں میں ٹریڈ یونین قائم ہو رہے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں حکومت نے بنگال، بمبئی، پنجاب اور یو۔ پی کے مزدور لیڈروں کو پکڑ لیا جن میں کمیونسٹ بھی شامل تھے۔ میرٹھ ٹرائل شروع ہوا۔ کمیونسٹ یا ایک نیا غصراً سیاسی منظر پر ظاہر ہوا۔ یہ زیادہ تر یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھے ہوئے انخلکچوں تھے۔ ساری دنیا اقتصادی ڈپریشن چھایا ہوا تھا۔ ایک نئی جدوجہد بڑے پیمانے پر شروع ہو چکی تھی۔ اس طبقاتی جدوجہد میں امریکہ پیش تھا۔

پھر ۱۹۳۰ء میں، جب ممالک ابھی لامارٹینز ہی میں تھا، لکھنوں میں دو اہم واقعات ہوئے مسلم لیگ کا آل اندیسا سیشن اور کانگریس حکومت کا قیام۔

اسے اب تک یاد تھا کہ اسے بیگم شاہنواز کی شخصیت نے بہت متاثر کیا تھا جو بہت چوڑے نقریٰ بارڈر کی ساری اور لمبے لمبے بندے پہنچے ڈاکس پر کھڑی تقریر کر رہی تھیں۔

اسی سال کانگریس نے ۱۹۳۵ء کے آئین کے نکات منظور کر کے اپنی وزارت قائم کی۔ یہ ایک نیا انوکھا تجربہ تھا۔ پہلی مرتبہ ملک میں قومی لیڈر حکومت کے اعظم و نق میں شامل ہوئے۔ مزدوجے کاشمی پنڈت لوکل سیلف گورنمنٹ کی وزیر بنیں۔ سفید ساری اور چینی وضع کا بغیر آستین کا بلا وز پہنچے موڑ میں پہنچی وہ کوںسل چیمبر کی طرف جاتی نظر آتیں۔ اگلے سال جب ریڈ یو اسٹیشن کھلا تو انہوں نے اس پر افتتاحی تقریر کی۔ اسی زمانے میں گوتی کے کنارے صنعتی نمائش منعقد ہوئی۔ ممالک اندر اپنے گلفشاں کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوتا۔ شام کے نائلے میں ہواؤں کے ساتھ بہتی ریکارڈوں کی آوازیں اس کے کان میں پہنچتیں۔

ان میں سے ایک فلمی ریکارڈ اکثر بجتا

کایا ایک گھروندہ ہے۔ کایا ایک گھروندہ ہے۔

اسی زمانے میں کانگریس نے پیشن پلانگ کمپنی بنائی۔ زراعت، صنعت، تعلیم، بے روزگاری وغیرہ کے لیے دس سالہ منصوبہ تیار کیا گیا۔ تبھی کانگریس نے چین میڈیکل مشن بھیجا، پھر جنگ چھڑ گئی اور ہندوستان کی رائے لیے بغیر برطانیہ نے اس ملک کو بھی جنگ کی بھٹی میں جھوک دیا۔ انگریزوں کی خاطر پچھلے ستر سال سے ہندوستانی فوج دوسرے ایشانیوں سے لڑتی تھی۔ ہندوستانی سپاہی افغانوں سے اور چینیوں کو مارنے کے لیے بھیجے گئے۔ عراق میں ترکوں اور عربوں سے لڑے اور اب ان کو پھر یورپ میں امپیریلیزم کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ کانگریس حکومت نے استعفی دے دیا۔ اب پھر گورنر کاراج شروع ہوا۔ کانگریس نے عدم تعاون کو تحریک شروع کی۔ زوال فرانس کے بعد جب اتحادیوں کی حالت بے حد خستہ ہو گئی تب کانگریس نے ایک بار پھر پیش کش کی کہ اگر مرکز میں مکمل آزاد قومی حکومت قائم کر دی جائے تو وہ جنگ میں تعاون کرنے کے لیے تیار ہے۔ یہ پیش کش برطانیہ نے مسترد کی تب مہاتما گاندھی نے انفرادی ستیہ گرہ شروع کر دی۔ تیس ہزار مرد اور عورتیں جیلوں میں بند کیے گئے۔ ہری شکر اور مال بھی جیل گئے۔ کچھ عرصے بعد ان کو دوسرے طالب علموں کے ساتھ رہا کر دیا گیا۔

۷ اگست ۱۹۴۷ء کو کوئٹ ائٹیاریزولیوشن پاس کیا گیا۔ ملک میں بغاوت شروع ہوئی۔ احمد گرفورٹ پھر آباد ہوا۔ یونیورسٹی کے طالب علم اس میں پیش پیش تھے۔

وہ ہزار ہندوستانی پولیس فارنگ سے مارے گئے۔

اب بنگال میں قیادت کا سامنا تھا۔ چوتیس لاکھ انسان اب تک فاقہ سے
مر چکے تھے۔ چوتیس لاکھ انسان
چوتیس لاکھ آمنہ اور ابوا المصور
کمال دوسری صحیح جلدی ناشتمانی کے بعد چیت پور روڈ سے اکا اور
پرمود دا کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

۲۸

پارک سرکس میں پرمود دا کے گھر پر بہت سے لڑکوں اور لڑکیوں کا مجمع تھا۔
گلکتہ یونیورسٹی کے طالب علم اپنا کارکن پارٹی کے افراد کھنو والے بھی سب پہنچ
چکے تھے۔

پرمود دا گلکتہ کے اسٹوڈنٹ لیڈر تھے۔ اس وقت ان کے مکان کے بڑے
ہال میں بڑی سخت گہما گہما نظر آ رہی تھی۔ ریلیف ورک کا منصوبہ بنایا جا رہا تھا۔
چندہ اکھا کرنے کے لیے جو پروگرام اٹھیج کیا جانے والا تھا اس کی ریہر سل جاری
تھی کونے میں ہار موئیم رکھا تھا۔ ایک طرف دو لڑکیاں یگور کی چتر نگداکے گانوں
کی مشق کر رہی تھیں۔ ہال کے سرے پر شیشوں والا برد آمدہ تھا۔ اس میں پرمود دا کی
بہن کا اسٹوڈنٹ یو تھا جو شانتی نگین کی آرٹسٹ تھیں۔ اسٹوڈنٹوں میں ایک لڑکا سفید شال
اور ٹھیک ایزد کے سامنے کھڑا ایک پورٹریٹ پر آخری ٹھیک لگا رہا تھا۔ ڈرامے کے

بعد یہ تصور بھی ریلیف فنڈ کے لیے نیلا کی جانے والی تھی۔
پر مودا کی بہن ارونا دیدی ایک اور کیوں پر جھکی ہوئی تھیں۔
سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔

برش صاف کر کے ایک طرف کو رکھنے کے بعد ماتھے پر سے بال ہٹاتا ہوا یہ
تصویر لڑکا ہال کے دروازے میں آ کھڑا ہوا اور ہال کے منظر پر نگاہ ڈالی ان سب کو
اس تنہی سے کام میں جئے دیکھ کر اس کے ہونتوں پر ایک اداسی مسکراہٹ بکھر
گئی۔

”دوا ادھر آؤ____ ”ایک لڑکی نے اسے آواز دی۔ ”دیکھو اب
میرے قدم ٹھیک ہیں نا____ ”
”تمہارے قدم تو کبھی ٹھیک نہیں ہوں گے۔“ اس نے لڑخی کی طرف جاتے
ہوئے کہا۔ ”تم بنگالیوں کی رومان پرستی نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ تم خالص
کلاسیکل ڈانس کی آخر کیوں اہل نہیں۔“
”دوا یتو خالص بھرت ناٹیم کر رہی ہوں میں۔“
وہ اسے اسی اداسی سے کھڑا دیکھتا رہا۔

یہ لڑکا بھی یو۔ پی کار کیس زادہ تھا۔ فی الحال وشا بھارتی آیا ہوا تھا۔ ایم۔ اے
اور لاء اللہ آباد سے کرچکا تھا۔ ابھی اس کے دماغ میں واضح طور پر نہیں آیا تھا کہ
اسے کیا کرنا چاہتے۔ بہت سے پروگرام تھے: جرنلزم، سیاست، کتابیں لکھا کروں
گا نہایت عالمانہ، ایسی تھیوریز پیش کروں گا کہ دنیا عش عش کراٹھے گی، آرٹ
کا نقاب بنوں گا۔ سیاسی طور پر آپ بہت سخت اشتراکی واقع ہوئے تھے۔ باپ کا کہنا

تھا (اور سارے باپوں کی طرح) کہ آئی۔ سی۔ ایس میں پیغمبروں خود حکومت برطانیہ کے نام تھے اور بڑی چوٹی کے پیشہ۔ پچین میں اسے غمی تال پڑھنے کے لیے بھیجا گیا، پھر یونیورسٹی کی تعلیم ختم کرنے اور ادھرا دھرم اسے مارنے پھرنے کے بعد اس کے جی میں آئی کہ شانتی نیکتن چلو۔ اس نے باپ سے تجویز انہاں ہمیں وشو بھارتی بھیج دیجیے۔ باپ نے اسے گھور کر دیکھا۔ کیوں میاں صاحزادے، آرٹسٹ بنو گے۔ دماغ تو نہیں خراب ہو گیا؟ دنیا کے سارے باپ یہی بات کہتے مگر چونکہ اکلوتا لڑکا تھا اس لیے باپ نے ضدی پوری کر دی۔ اب وہ دوسال سے بولپور میں تھا اور وشو بھارتی کے دوسرے طلب علموں کے ہمراہ ریلیف کے کام کے سلسلے میں ملکتے آیا ہوا تھا۔

”یہ کھنو سے لوگ آئے ہیں۔ ان سے نہیں ملے۔“ کسی نے قریب سے گزرتے ہوئے اس سے کہا، وہ ہال عبور کر کے اس کونے کی طرف چلا جدھر مال دوسرے لڑکوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ دوسرالڑکا اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا اور گانا ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

چاروں طرف زور زور سے بنگالی بولی جا رہی تھی۔

مال نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا: ”نومشکار“

مال نے گانا ختم کرنے کے بعد ہار مونیم بند کرتے ہوئے اس سے کہا۔

”آداب عرض!“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

مال کی جان میں جان آئی۔ بنگالی بولتے بولتے اس کی حالت تباہ ہو چکی تھی۔

”گوتم نیلمہر۔۔۔ لڑخ نے اپنا تعارف کرایا۔۔۔“

”مال رضا۔۔۔“ اسے اطلاع ملی۔۔۔ دونوں نے ہاتھ ملایا۔

دونوں کا ایک ہی حلیہ تھا۔۔۔ سُنگ پانچاہمہ کرتا نہر و وا سکٹ اوپر سے کشمیری شال۔۔۔ یہ حلیہ اس گروہ کے تقریباً سمجھی نوجوانوں کا تھا۔

”میاں کہاں آپھنے۔۔۔ ان بگالی بول بول کر ناطقہ بند کر رکھا ہے۔۔۔ آج باہر چلیں۔۔۔“

دونوں نے باہر ایک ریسُوران میں جا کر قبوہ پیا اور پھر واپس آگئے۔

”آج تم کو اپنی تصویر دکھاؤں۔۔۔“ گوتم نے ارونا دیدی کے نگارخانے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”یا تم ہری شنکر سے نہیں ملے۔۔۔ مال نے کہا۔۔۔“

”ہری شنکر کون ہے۔۔۔“ گوتم نے بے خیالی سے پوچھا اور بڑے آرٹشوش والے انداز میں سگریت ہونٹ میں دبایا کہ تصویر مکمل کرتا رہا۔

”ہری شنکر۔۔۔ یا رہے میرا۔۔۔ بڑا باغ و بہار آدمی ہے۔۔۔“

”کہاں ہے بلاو۔۔۔“ گوتم نے نوابوں کی طرح کہا۔

”گھاس کھا گئے ہوؤہ یہاں نہیں ہے۔۔۔ لکھنو میں ہے۔۔۔ یکار پڑا ہے بے چارہ۔۔۔“

”تم سب لکھنو میں کیوں رہتے ہو۔۔۔“ گوتم نے برش ایک طرف رکھ کر مرتے ہوئے پوچھا۔

”اور پھر کہاں رہیں۔۔۔“

”ہاں یہ بھی ٹھیک کہتے ہو۔“

”تم نے اس کی تاک غلبہ بنائی ہے۔“

”ہونٹ بنانے بہت مشکل ہوتے ہیں۔“

”ماشاءالله کیا جواب دیا ہے۔ ماروں گھننا پھوٹے آئندہ“

”مسکریہٹ لو۔“

”کیا تم آرٹسٹ ہو۔“

”اور کیا تمہیں گر اس کٹ نظر آتا ہوں۔“

”ارے رے۔ تمہارا یہ ذکر جیجا جی نے کیا ہے خط میں۔“

”جیجا جی _____ وہ کون بزرگ ہیں۔“

”ہماری لاج کے میاں۔“

”تمہاری لاج کون ہے۔“

”حد ہے۔ جیجا جی تو تم کو جانتے ہیں۔“

”مجھ کو بہت سے لوگ جانتے ہیں۔“

”مغالطہ فائیڈ بھی ہو۔؟“

”ہاں۔ تم نہیں ہو۔؟“

”ہوں تو سہی۔“

”ٹھیک ہے۔“ گوتم تصویر میں لگا رہا۔

”اگرہ لیے شانتی نکسین میں چار پانچ سال تو شاید لوٹ پیٹ کر آرٹسٹ بن جاؤ۔ فی الحال تو اس کی کوئی امید ہے نہیں۔“ کمال نے تصویر کو غور سے دیکھتے

ڈوق

ہوئے اظہار خیال کیا۔

”خالی آرٹٹ۔ ارے میرا رادہ تو ہے کمدارس جا کر رام گوپال سے بھرت ناٹیم بھی سیکھوں گا،“ گوتم نے لشی میتم دیا۔

”یہ ارادہ تو ایک زمانے میں اس خاکسار کا بھی تھا مگر جب میں نے اس کا اظہار کیا تو میری بہنیں ہستے ہستے لوغ گئیں اور انہوں نے بے انتہا میری ہونٹ کی۔ اصل میں اڑکیاں بے حد بوگس ہوتی ہیں ۔۔۔ آرٹ کو سمجھنے کی ان میں صلاحیت نہیں۔“

تمہاری بہنیں بھی ہیں۔“

”ہاں ۔۔۔ تمہاری بہنیں ہیں۔“

”نہ“

”یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ بہنیں ہوں تو زندگی میں بڑے سکون اور رزمی کا احساس رہتا ہے۔“

”ہوں“ پھر کیا ہوا۔“

”کیا ۔۔۔ کیا“

”تم کہہ رہے تھے کہ ۔۔۔“

”یار گوتم تم کو معلوم ہے میں بدھٹ بھی ہو گیا تھا ایک زمانے میں۔“
”واقعی۔“

”چند سال گزرے میں سارنا تھا گیا تو وہاں مجھے بڑا سخت سکون ملا تو میں نے سوچا کہ یا ریہ بدھا زم میں کچھ نہ کچھ ہو گا ضرور۔“

”ہوں۔“

”تم پارٹی میں ہو۔“

”پارٹی؟____ نہیں۔ ابھی میں اس قابل نہیں بننا۔ اس کے لیے بڑا پتہ
مارنے کی ضرورت ہے۔“

”ہاں ٹھیک کہتے ہو____ ویسے تم کوئی ایسے ریوولیوشنری دکھلائی بھی
نہیں پڑتے۔“ مال نے کہا۔
گوتم نے غصے سے اسے دیکھا۔

”معلوم ہے جہا تما گاندھی نے تمہارے گروڈیو سے کیا کہا تھا۔ کہ گھر میں
آگ لگی ہے اور آپ بیٹھے چڑیوں کا گانا سنتے ہیں۔“ مال نے کہا۔

گوتم نے مرش جھٹک کر رکھا: ”بے قوفی کی باتیں مت کرو جی۔ کیا تمہارے
ہری شکر میں بھی تمہارا ہی جتنا بچپنا ہے____؟“

”تم بھیا صاحب سے بھی مانا۔“ مال نے اس کی بات کی سنبھال کر کے
کہا۔

”وہ کون ہیں۔“

”میرے چچا زاد بھائی۔“

”وہ بھی بہت قابل ہیں۔“

”ہاں۔“

”لکھنوہی میں رہتے ہیں؟“

”ہاں، مگر آج کل محااذ پر گئے ہوئے ہیں۔“

”لکھنور بڑا بڑا اہلِ مال پڑا ہوا ہے۔ اس کا مطلب ہے۔“

”اور کیا؟“

”چلو فرپو چل کر چاء پئیں۔“ گوم نے اٹھ کر تصویر پر کپڑا ذلتے ہوئے کہا۔

”فرپو _____ تم سخت بورڈ و معلوم ہوتے ہو۔“

”بکومت۔“

”اچھا ایک بات بتاؤ۔ میں ہر بات کے متعلق بہت واضح تصورات رکھنے کا قائل ہوں۔“ مال نے کہا۔

”شوٹ۔“

”کاس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے _____ تم پرولتاریکے مستقبل میں یقین رکھتے ہو۔؟“

”ہاں۔“

”ہاتھ ملاو۔“ انہوں نے ہاتھ ملیا۔

”تم سمجھتے ہو فیوڈل سماج اپنی موت آپ مر جائے گا؟“

”ہاں۔“

انہوں نے دوبارہ ہاتھ ملیا۔

”تم کو دشواں ہے کہ تم کو فیوڈل سماج سے سچی دلی نفرت ہے اور تم اس کی بخ کنی ہی کر کے دم لو گے۔“

”مجھے تو خیر دشواں ہے لیکن تم تو خود فیوڈل سماج سے تعلق رکھتے ہو۔“

”تم کو کیسے معلوم۔“ مال نے گھبرا کر پوچھا۔ گویا اس کی کوئی بہت بڑی

چوری پکڑی گئی۔

”مجھے اس طرح معلوم ہوا کہ ابھی بھائی میں کوئی ذکر کر رہا تھا کہ تمہاری نیا
برج والوں سے رشتے داری ہے اور تم چیت پور روڈوالے نواب صاحب۔“

”بھائی بھائی خیر خیر“ مال شرم سے پانی
پانی ہو گیا۔ ”وہ تو جو ہوا سو ہوا۔ تاریخ پر میرا کیا بس ہے، مگر اب میں پوری کوشش
میں لگا ہوں کہ خود کو مکمل طور پر ڈی کلاس کروں۔“

”تمہارا ہری شنکر بھی فیوڈل ہے؟“

”ہے تو سہی، مگر وہ بے چارہ بھی کیا کر ستا ہے۔“

”خوب گوتم مسکرا یا۔“ میں بڑا خت مڈل کلاس ہوں۔ ”اس نے اطلاع دی۔

”رنج نہ کرو،“ مال نے اسے دلاسا دیا۔ ”ہم لوگ تو دراصل اس نئے سماج
سے تعلق رکھتے ہیں جواب جنم لے رہا ہے۔ جتنا کا سماج۔“

اس طرح کی خالص طالب علامہ گفتگو کے بعد دونوں باہر آئے۔ مال پر گوتم کا
رعاب پڑ گیا۔ گوتم میں بڑی گہرائی تھی اور وہ بہت زیادہ سمجھ دار تھا۔ یہ حال سینرڈ کا
تھا اور مال ابھی متاثر ہونے والی اسٹیج سے نہیں اکا تھا۔

لکھنو اپس پہنچ کر مال نے جیجا جی کو جو خط لکھا اس میں گوتم نیلمبر کی تعریفیوں
کے دریا بہادیے۔

اسی سال گرمیوں میں گوتم لکھنوا آیا۔ اپنی جائے قیام سے اس نے گلفشاں فون
کیا، وہاں معلوم ہوا کہ سب لوگ ریڈ یو اسٹیشن گئے ہوئے ہیں۔ ریڈ یو اسٹیشن سے
اطلاع ملی کہ ابھی سب لوگ کمل اسپاٹ کے ہاں فیض آباد روڈ گئے ہیں۔ فیض

آبادروڈسوے پتا چلا وہ سب تو سنگھاڑے والی کوٹھی چلے گئے۔

سنگھاڑے والی کوٹھی - کیا بے تکام نام تھا۔ اب مکانوں کے ایسے نام ہونے لگے۔ جیسے خربوزے والی حویلی اور تربوز والا قلعہ یا گاجر منزل اور مولیٰ ہاؤس اسے بے حد بھی آئی۔ شاید لوگ

سنگھاڑے بہت کھاتے ہوں گے یا کیا ہوتا ہوگا۔

اس نے سنگھاڑے والی کوٹھی فون کیا تو وہاں چمپا نے رسیوا ٹھیکایا۔

”ہلو چمپا نے کہا،“

”ہلو آداب عرض۔ دیکھیے میرا نام گوتم ہے گوتم نیلمبر اگر آپ لوگ ابھی وہاں سے کہیں اور تشریف نہ لے جاتے ہوں تو میں حاضر ہوں۔“

”آپ ضرور تشریف لائیں۔“ چمپا نے جواب دیا۔ ”اور اگر آپ سو شلسٹ ہیں تو ذرا تیار ہو کر آئیں گا۔ آج ہم سب تسلی بیٹھے ہیں کہ کوئی سو شلسٹ ملے تو اسے کچا چبا جائیں۔“

گوتم نے اس روز کا اخبار ابھی تک نہیں پڑھا تھا مگر اس نے فوراً جواب دیا

”بہت خوب حاضر ہوتا ہوں آپ لوگ بھی تیار رہتے گا۔“

سنگھاڑے والی کوٹھی میں جب وہ سب لوگ جا کرندی کے رخ بر آمدے میں بیٹھ گئے تو گوتم نے سوال کیا ”طاعت آراء بیگم آپ سب میں سے کون سی خاتون ہیں؟“

”بھی میں ہوں فرمائیں۔“

”دیکھیے مس صاحب کوئی لکھنے بیٹھ۔ جائے تو اس کا قلم تھوڑا ہی پکڑا جائے۔“

ہے مگر یہ کہ آپ اگر ایمانہ کرتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔“

”آپ نے IPTA کی طرف سے جس قدر بوجس ڈرامے لکھتے میں پروڈیویس کیے ہیں ان کا احوال میں بھی مال کی زبانی سن چکی ہوں۔ میں آپ کو مار جن دیتی ہوں کہ پندرہ منٹ تک ہم سب پر اپنا عرب ڈالیے۔ اتنا ہی وقفہ ہم آپ کو مرحوم کرنے میں صرف کریں گے۔ اس کے بعد نارمل ہو جائیے کہاں مل رہنا ہی بہت مستحسن ہے۔ اچھا اب ڈالیے رعب شروع کیجیے۔ سنا ہے آپ وشوar بخارتی کو نواز رہے ہیں۔ یہاں بھی ایک سے ایک بڑا آرٹسٹ پڑا ہے۔ ہر قسم کا اور یہ سب باری باری فرداؤ اور مجموعی طور ہر آپ کو اپر لیں کرنا چاہیں گے۔ پہاڑ آپ اپنے پیشہ کل خیالات سے مطلع کیجئے۔“ ری ایکشن ری تو نہیں ہیں؟ یا مہا سمجھائی۔“

”آپ چیلے بناتے ہیں؟“ نرمانے پوچھا۔

”جی نہیں۔ کبھی کبھی بنایتا ہوں۔“

”گوتم۔ آپ کا تخلص ہے؟“ طاعت نے سوال کیا۔

”جی نہیں۔ مال باب پ نے یہی نام رکھا تھا۔ طاعت بیگم۔ میں پھر کہوں گا۔ آپ ابھی اور پڑھئے اس کے بعد لکھنا شروع کیجیے گا۔ آپ کے علم میں افسوسناک کمی ہے۔“

”بھیا صاحب نہیں پہنچے۔“ مال نے کہا ”انہوں نے فون کیا تھا کہ چاء یہیں پہنچے گے۔“

”بھیا صاحب اس وقت۔“ طاعت نے گھڑی دیکھ کر تندہی سے اعلان کیا۔

”رانیڈنگ کے لیے گئے ہوئے تھے۔ اب سوئنگ سے واپس آتے ہوں گے۔“ مجھ اپنی جگہ پر ذرا نادم ہوا۔

”خدا کی پناہ۔ یہ کون صاحب ہیں۔ کوئی فلم اشارہ ہیں۔ اشوک مار وغیرہ۔؟“ گوم نے سوال کیا۔

”بھیا صاحب _____ میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ ان سے ضرور ملنا۔“ مال بولا۔

”تعلق داران اودھ کے متعلق میری معلومات بہت محدود ہیں۔ کیا آپ سب یہی رانیڈنگ اور سوئنگ وغیرہ کرتے ہیں۔ میں دراصل سارے ٹڈل کلاس لوگوں کی طرح طبقہ امراء پر عاشق ہوں۔ جنگ سے پہلے ولایت گیا تھا، اپنے بابا کے ہمراہ تو بہلش لاڑکان کو دیکھنے کی تمنا میں گھوما گھوما پھرتا تھا۔ جہاں دور سے کوئی لاڑکان نظر آیا اور میں لپکا اس کی طرف بعد میں معلوم ہوا کہ وہاں کے اندر فیکر بھی وہی لاڑکان والا لباس پہنتے ہیں۔“

”ہم لوگ بھی اندر فیکرز ہیں۔“ مال نے کہا۔

”اور ماضی کی قبروں کے مجاور۔“ ہری شنکرنے کہا۔

”لیکن تمہیں ہم کو پسند کرنا پڑے گا۔“ مال نے دوبارہ کہا ”کیونکہ ہم لوگ اپنی دلکشی کے سہارے ہی پر زندہ ہیں۔“

”میں تم کو ضرور پسند کروں گا۔ میرے دل میں بڑی وعut ہے۔“ اس نے بڑی تملکت سے جواب دیا۔

چمپا اب گروہ میں شامل تھی۔ اس نے گروہ کے قوانین سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ گروہ بہر حال ہمدرد تھا، کیونکہ خود تہبا تھا۔ ہم کتنے قابلِ رحم طریقے سے سہارے کے متاثشی رہتے ہیں۔ گروہ محض ایک اور کردار تھا۔ جس طرح ماحول ایک کردار تھا۔ تصورات کی جسم شکل انسانی رشتے بڑے نازک، بڑی گنجک بندیاں پر قائم ہیں۔ برابر یہ رشتے ٹوٹتے بھی رہتے ہیں، اسی لیے میرا نیس نے کہا تھا: خیال خاطر احباب چاہئے ہرم۔ ہر طرف آگئیں تھے جوشیشے کے گھروں میں رکھے تھے۔ یہ ساری کارگہ شیشہ گری تھی۔ مال نے اس سے کہا ۔۔۔ چمپا باجی چوروں کے ذہنی باور چی خانے میں اپنی اٹھک بیٹھک رکھے۔ آپ ہمارا گھر رکھائیں، ہم آپ کا گھر رکھاتے رہیں گے۔ ہم کبھی آپ کو اکیلانہ چھوڑیں گے۔ اپنے ذہن کو ذرا سا ڈسپلن کیجئے۔ یہی اصل چیز ہے۔ مصیبت ساری یہ ہے کہ آپ رومنیک ہیں۔

مگر ڈسپلن کی زندگی میں گنجائش کہاں تھی؟ یہاں ہر طرف اس قدر انتشار تھا۔ مال نے کہا ”اگر آپ آرٹسٹ ہوتیں تو ٹھیک تھا۔ آپ اس افراتفری کو اظہار میں ڈھال لیتیں، مگر آپ نہ کھتی ہیں نہ کسی اور طرح سے اپنا اظہار کرتی ہیں۔ اسی لیے ڈسپلن آپ کے لیے بہت ضروری ہے۔“

”یہی تھک لوگ بڑے متوازن ہوتے ہیں؟“ چمپا نے پوچھا۔

”متوازن نہ ہوں مگر تحقیق کی Process کے دوران میں وہ اپنا آہنگ

ٹلاش کر لیتے ہیں۔“

چمپا باباجی آپ تصویریں ہی بنایا کیجیے۔

”تم نے تو مجھے بالکل وکٹورین رومان پرست سمجھ لیا ہے۔ نہیں مال ٹھیک ہے، میں بالکل خیریت سے ہوں۔ میں تم سب کے ساتھ رہوں گی۔ میں تھمینہ کے ساتھ رہوں گی۔“

”مگر ساتھ ہی یہ بھی طے کر لیجئے کہ جذبات اور ذہن کا آپس میں کیا ایکویشن ہوا چاہیے اگر یہ طے کریا تو بس سمجھنے کے بیڑا پار ہے۔“

”پھر وہی نظر یے!“

”اچھا تو آپ تجربے کرنا چاہتی ہیں۔ چمپا باباجی از خود تجربے نہ کیجیے گا۔ دنیا آپ کو خود ہی اتنے سبق دے گی کہ ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔“

اسی طرح لان پر بیٹھ کر سڑک پر شبلتے ہوئے یہ لوگ لمبی لمبی بمحضیں کرتے۔ چمپا اس یونیورسٹی ماحول میں بے حد خوش تھی۔ کیلاش ہوشل، جہاں وہ ایم۔ اے کے لیے رہ رہی تھی، ایک الگ مخصوص دنیا تھی۔ یہاں ایک بہت بڑے احاطے میں، جہاں یوکیپیڈس اور مولرمی اور سیمیل کے پروقار درخت کھڑے تھے، ایک پرانی وضع کی پیلے رنگ کی وسیع کوچی تھی جس میں ممزوا نچور رہتی تھیں۔ اس کے قریب ہی ایک جدید طرز کی سینٹ کی عظیم الشان دو منزلہ عمارت تھی۔ اس میں لڑکیاں رہتی تھیں، یہ جگہ چاند باغ سے بہت مختلف تھی۔ یہاں لڑکیاں، جوزیاہ تر پوست گریجویٹ طالب علم تھیں، بہت ہوشمند اور سینئر ہونے کے احساس کے ساتھ رہتی تھیں۔ چاند باغ میں سیاست کا دخل نہ تھا۔ یہ جگہ دھارے میں شامل تھی۔ چاند

بانگ میں بخوبی اور رامن کا راج تھا۔ یہاں ہر طرف مہاتما گاندھی اور نہرو اور قائد اعظم جناح اور کارل مارکس کا چپ چا تھا۔ امریکہ کے اعلیٰ طبقے کی لڑکیوں کے مخصوص برائیں مارا اور اسمعیل کالج کی وضع پر چاند بانگ کے ماحول کی تشكیل کی گئی تھی۔ وہاں سے نکل کر لڑکیاں جب یونیورسٹی میں آتیں تو کیلاش میں رہتے ہوئے خود کو ملک کی فضائل سے قریب تر محسوس کرتیں۔

اب چمپا اور تہینہ اور زملا اور طاعت عموماً کٹھی وقت گزرتیں۔ ایک روز تہینہ نے چمپا سے کہا: ”سنو۔ آڈولت“ سطح پر اس منسلک کو دیکھیں۔ بھیا صاحب ذہبی میں مدارس سے آرہے ہیں۔ اس سال تم ایم۔ اے کرلوگی۔ روحانی طور پر اس قدر مہم پسند اور دا اور بننے کا ارادہ ترک کر کے ان سے شادی کرلو۔“

”بکوست۔“

”لکھنے کا اس میں کیا سوال ہے۔“

”تم خودی ہی نہ کرلو ان سے شادی۔“

”میں تمہاری پر چھائیں بن کر زندہ نہیں رہنا چاہتی۔“

”بکواس۔“ تہینہ نے جواب دیا، پھر کچھ دیر بعد بولی: ”علاوہ ازیں بھیا صاحب ہی زندگی کا نصب العین نہیں ہوتا چاہیں۔ مرداں لاکن ہی نہیں کہ ان کو اتنا آسمان پر چڑھایا جائے۔“

”ظاہر ہے۔“

”زندگی کا نصب العین پارٹی ہے۔ کہو ہاں۔“

”ہاں۔“ چمپا نے ذرا توقف کے ساتھ جواب دیا۔

طاعت دوسرے کمرے میں پیٹھی تھی۔ یہ مکالمہ اس کے کانوں میں پڑا تو وہ بہت خوش ہوئی۔ ”خدائی کا شکر ہے ان دونوں کی سمجھ میں بات آگئی۔“ اس نے نرمل سے فون پر کہا۔ نرمل نے بھی خدا کا شکر ادا کیا۔

لیکن بھیا صاحب دمبر میں لکھنوا آئے اور چمپا کے سارے نے نظر یہ پھر ہوا ہو گئے وہ دن بھر خوش خوش پھرتی رہی۔

”وہ گلفشاں والے گفام آئے ہوئے ہیں آج کل۔“ ہوش میں اڑکیوں نے ایک دوسرے سے کہا۔

اسی اشنا میں گوتم نیلمبر بھی آن پہنچا۔ اس کو زراعت کے مکھے میں ایک بہت عمدہ ملازمت مل گئی۔ (اور لوگوں نے کہا: اپنے باپ کو بڑی حیثیت کی وجہ سے دیکھو کیسے ترنٹ ہی اسے فوکری مل گئی۔ بڑا کمیونٹ بنایا ہوتا تھا)

یہ زمانہ جوان لوگوں نے اکتحاگز اراؤں سب کی زندگیوں کا بہترین دور تھا۔ ایسا دو رجوا ایک بار چلا جائتے تو پھر کبھی واپس نہیں آتا۔

شانتا یہ بڑی پر سکون جگہ ہے۔ جھاڑوں پر کوئی بیٹھی ہیں۔ آموں کے باغ ہیں جن کے درمیان سے ایک مالینی کڑا بھاتی جا رہی ہے۔ بڑے شاستر ٹھاڑوں کلکڑوں، اوست درجے کے زمینداروں اور بیرسڑوں کی کوٹھیاں ہیں۔ گھات پر ڈونگیاں کھڑی رہتی ہیں۔ سایہ دار راستوں پر سے لمبے لمبے زرد پھود رختوں سے

نچے برستے ہیں۔ باریک نازک ٹھینیوں والے درختوں پر بڑے سبک پھول پتے کھلے ہیں جن کو دیکھ کر چینی پینٹنگز یاد آتی ہیں۔ اتوار کی صبح کو لڑکیاں برمی چھتریاں سنجھا لے ایک دوسرے کے گھروں پر جاتی ہیں اور گھاس پر بیٹھ کر رہنگی کرتی ہیں اور شدید انخلکھول گفتگو ان لوگوں کا دستور ہے۔ زندگی میں ہر طرف سلیقہ ہی سلیقہ ہے اور نفاست برآمدے کے سبز جنگل پر پھیلی ہوتی ہیں، خندے فرش پر سنتیل پائیاں ایک دیوار کے سہارے سے غاف میں محفوظ طور پر رکھا ہے۔ کروں کے اوپر نچے اوپر نچے دہرے دروازے ہیں جن پر جھلکیاں ہیں۔ چوڑی سیڑھیاں اوپر کریں بڑے سے گھاس کے سمندر میں یہ مکان ڈوبے ہوئے ہیں۔ جھسیں ڈاٹ کی ہیں۔ چھت کے اوپر چھوٹے چھوٹے اطالوی وضع کے ستونوں کے جنگلے ہیں۔ ایسے مکان سارے صوبے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کس قدر راستحکام ان کی بنیادوں میں ہوگا۔ برآمدوں کی سیڑھیوں پر کسی زمانے میں پنکھا قلی اونگھتے ہوں گے۔ بہرائچ میں جہاں میں پیدا ہوا، میرا مکان بھی عین میں ایسا ہی تھا۔ میں مکانوں کی کھالے کر بیٹھ گیا۔ شانتا میں تفصیلات سے متاثر ہونے اور ان پر دھیان دینے کی عادت سے عاجز آچکا ہوں مگر بتاؤ تو بھلا لوگوں نے مکان بنارکھے ہیں اور ذرا ان کے نام تو سنو۔

نام بھی عجیب چیز ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر چمپا بیگم۔ اچھا نام ہے، ہے نا۔ کہو شانتا میری رائے سے اتفاق کرو، دیکھو تم اتنی دور ہو تو میرا جی چاہتا ہے کہ ہر چیز میری آنکھوں سے دیکھو میری ساتھ ساتھ رہو۔ جب نئے لوگوں سے ملتا ہوں تو سوچتا ہوں شانتا ہوتی تو فلاں کے لیے یہ کہتی، فلاں کو پسند کرتی، فلاں کا مذاق

اڑاتی۔ شانتا تم نے مجھے ڈانٹا بھی نہیں بہت دنوں سے اب کیا میں تمہارے جذبہ مادری کو اپیل نہیں کرتا۔ بقول تمہارے بڑا ہو گیا ہوں۔؟ شانتا کاش تم یہاں ہوتیں اور ان سب سے ملتیں۔

بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ میں یہاں ایک قسم کے ان افسوسیں برداخوے کے لیے بلا یا گیا تھا۔ نسل رانی جو بی۔ اے فرم رہی ہیں بجائے اس کے کہ روایتی اڑکیوں کی طرح کچھ شرما تین بار مونہم پران سے گانا سنوایا جاتا، انہوں نے مطلق شرما کرنے نہیں دیا نہ شاید انہیں علم ہے کہ خاندان والے ان سے میراثتہ طے کرنا چاہتے ہیں۔ ہر حال، انہوں نے مجھے میں کسی دلچسپی کا انہما نہیں کیا۔ ان کو باتوں ہی سے فرصت نہیں۔ ان کے بہت زبردست پروگرام ہیں، ڈاکٹریٹ کریں گی۔ نرمل اور طاعت دنوں انہماں تیز ذہن اڑکیاں ہیں۔ خدا محفوظ رکھے، ہر وقت ٹرالی رہتی ہیں۔

”لکھ لی تقریر“

”نرمل نے برآمدے کے جنگل کے نیچے سے اچک کر پوچھا۔“

”لکھ رہا ہوں۔“

”دکھائیں۔“

”افواہ۔۔۔“ بھی اصل میں تقریر نہیں لکھی ایک ضروری خط لکھنا تھا وہ شروع کر دیا۔“

”یہ خط و کتابت کا کون وقت ہے۔ میں کہتی ہوں۔“

”نہ وہ چیز سے نکلنے نہ جاپاں سے نکلنے“

نہ ایران سے نکلے نہ انگلستان سے نکلے
محمد مصطفیٰ نکلے تو عربستان نکلے
محمد مصطفیٰ

کمریں سب نے مل کر اپنی پسندیدہ قوائی شروع کر لکھی تھی۔

”چلنے چل کر قوائی گائیئے۔“ ترملانے دوسرا حکم اگایا۔

گویا سنگھاڑے والی کوئی میں آ کر ”نہ وہ چین سے نکلے،“ گانا اس قدر را ہم اور ضرور چیز تھی۔ گویا اس کی زندگی کا نصب العین ہی صرف یہ تھا کہ وہ نہ چین سے نکلے گائے۔ اس نے ترملانے کو ادا کی سے دیکھا۔ بیوقوف لڑکی کس قدر رخوش ہے۔

”چلو میں مل میں آتا ہوں، مگر ایک شرط پر۔“

”وہ کیا۔“

”اپنے بھیا صاحب سے ملاؤ۔“

عین اسی وقت اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ بر ساتی سیڑھیوں پر بھیا صاحب کھڑے تھے، گھبرائے ہوئے مسکرار ہے تھے۔ ان کا خیر مقدم کرنے کے لیے سب برآمدے میں آگئے۔

”بڑے نر و نر طبیعت کے آدمی جان پڑتے ہیں،“ گوتم نے آہستہ سے کہا۔

”لڑکیوں سے گھبرا جاتے ہیں بے چارے۔ بڑے شریف آدمی ہیں۔“ ترملانے نے جواب دیا۔

”شریف آدمی ہیں تو ہم سب کیا لفگے ہیں۔“ واد واد۔“ ہری شکر نے احتجاج کیا۔

”ان کے لاشور میں کوئی پیچیدہ گی ہے۔“ گوتم نے وسرا اعلان کیا۔ ہری شنکر نے اسے مکا دکھایا۔

بھیا صاحب مجھے پر نظر ڈال کر چمپا کی طرف چلے گئے۔ چمپا نے کری چھوڑ دی اور فرش پر بینہ کران کے لیے چاہنا نہ لگیں۔

”یہ سلسہ بھی ہے۔“ گوتم نے دفعتاً بورہ کر پہلی بار سنجیدگی سے کہا۔

”بھیا صاحب ناپتے بہت اچھا ہیں۔“ نرملانے موقع کو سنبھالا چاہا، یہ تینوں باقی مجھے سے الگ برآمدے کی سیر ہیوں پر جا بیٹھے تھے۔

”لَاک ناچ یا کلاسیکل۔“ گوتم نے دچپسی سے پوچھا۔

”اویڈ والر کے استاد ہیں۔“ نرملانے مری ہوئی آواز میں کہا۔

”تب میں ان کو معاف کر سُتا ہوں۔“ گوتم نے سر ہلا کر کہا، میں بہت کچھ معاف کر دیتا ہوں، میرا بہت بڑا اول ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اندر کوئی اور بحث چھڑ گئی تھی۔ ہری شنکر زور زور سے نیل مچار ہا تھا۔

”افوہ تم لوگ کس قدر کی ٹرائگاتے ہو۔“ گوتم نے ایک آنکھ کھول کر کہا۔

”زندگی مختلف ادوار میں تقسیم ہے۔“ مال نے گوہ رافتانی کی۔

”خوب یعنی؟“

”یہ محض باتوں کا دور ہے۔“

”پھر عمل اور تحلیق کا دور کب آئے گا؟“

”میاں جب سے دنیا بنی ہے اگر پیغمبروں اور فلسفیوں اور سوچنے والوں نے باتیں نہ کی ہوتیں تو آج دنیا کی لائبریریوں میں گدھے لوٹ رہے

ہوتے شکر کرو کہ ہم باتیں کرتے ہیں تم سننے ہو۔ ایک سے ایسا آنے والا ہے۔ جب تمہارے کان ہماری آواز سننے کو ترس جائیں گے۔“ مال نے کہا۔

”تم وقت کی ہلاکت خیز کے قائل ہو؟“

”ہاں“

سورج ندی میں ڈوب رہا تھا اور چھتر منزل کے سہری گنبد کرنوں میں نارنجی نظر آرہے تھے۔ سامنے ہر دل پر سے ایک کشتنی سکون سے گزر گئی۔

”تم علامتوں کی رمزیت کے قائل ہو۔“ معاً گوم تے مال سے پوچھا۔

”ہاں“

”یہ سامنے جو ناؤ جاری ہے یہ بڑی رمزیت کی حامل ہے۔“ گوتم معمولی سی بات کو بے حد ڈرامائی اور فلسفیانہ رنگ میں ادا کرتا تھا اور اس کا یہ انداز لوگوں کو بہت اچھا لگتا۔ ہری شکر بھی اس کے پاس آن بیٹھا۔

وہ سیر ہیوں پر جا کر کھڑے ہوئے جو ندی میں اترتی تھیں۔

دریا بہتا ہوا وقت ہے۔ پتھر Timeless become کی علامت ہے۔ پتھر وقت کی نجد شکل ہیں اور کائنات کا خاتمہ چو ہے کی موت کی طرح یقینی ہے اور اتنا ہی غیر اہم دیدانت لکھا ہے کہ۔

”یہ ندی ہماری زندگیوں کا سمبل ہے۔“ ہری شکر نے آپ سے آپ سے کہا۔

”مجھے دریاؤں سے عشق ہے، تم کو دریاؤں سے عشق ہے؟“ اس نے مذکر مال سے بعد سنجیدگی کے ساتھ پوچھا۔

”ہاں۔“

”میں ندی کے پانی کے پانی میں ڈوب کر مر جاؤ گا۔“ گوتم نے دھرنا اور نہ سمعت کیا۔

”گوتم! تم کیا بھی بورڑا اور مان پرست ہوتے جا رہے ہو۔“ ان کے نزدیک آ کر آکر ٹوں بیٹھتے ہوئے طاعت نے تشویش سے دریافت کیا۔

”نہیں۔“ وہ چونک اٹھا۔ ”یہ وقت کا سحر ہے طاعت آ را بیگم۔“ اس نے انگلی ہوا میں لہراو جواب دیا۔ ”تم وقت کی طاقت نہیں جانتیں۔“

پل کے پار بہت دور سے نوبت بجھنے کی آواز آ رہی تھی۔ شام کے مناٹے میں وہ چپ چاپ یہ آواز سنتے رہے۔

”آؤ بھتوں کو ڈھونڈیں،“
”آؤ۔“

وہ چاروں لان پروالپس آئے۔

”چمپا بیگم بھیا صاحب اپی۔“ گوتم نے بڑے اخلاق سے جھک کر ان کو مخاطب کیا۔ آئینے ہم سب چل کر بھتوں کو ڈھونڈیں۔

وہ خاموشی سے موڑ کی طرف بڑھے۔ جھٹ پٹا وقت تھا۔ موڑاب کاٹھ کے پل پر سے گزر رہی تھی۔

”ایک موڑ ہوتا ہے جہاں سے انسان کبھی واپس نہیں آتا۔“ عامر رضا نے اپنے آپ سے کہا۔

سمال نے موڑ روک لی۔ ”آئینے ٹورا لہروں کو گئیں۔“ وہ پل کے اوپر نچے جنگلے

پر جھک گئے۔

ان کے نیچے ندی کی لہروں پر رنگ برلنگے بجروں کا ایک جلوس گزر رہا تھا۔ ان میں جو لوگ بیٹھے تھے انہوں نے عجیب لباس پہن رکھے تھے: مند یہیں جواہرات مالائیں، آب روائے کے دوپتے تلوں پانچا مے۔ جواہرات کی چھوٹ سے ندی کا پانی جگمگا اٹھا۔

ان لوگوں نے ہاتھ اٹھا کر ان لوگوں کو بلا ناشروعان کی آوازیں ان کی سمجھ میں نہ آئی۔ چڑیوں کی چہکار کی طرح سریلی، مہم، سارگنی کی چیخ کی مانند تیز، سریلی، ڈراؤنی۔ ساحل پر کتے اور گیدڑ چلا رہے تھے۔ شمشان گھاث کی لکڑیاں چہرے پر ابھی تھیں۔ قبروں کے تابوت کے تنخے تھیرے جارہے تھے۔

”یہاں سے بھاگو ۔۔۔ چلو آگے چلیں۔“ چمپا نے کہا اسے لگا جیسے اس کی اپنی آواز گھرے پانیوں میں سے آری ہے۔
”ان آوازوں سے بھاگ کر کہاں جاؤ گی؟ یہ آخری آوازیں ہیں۔“ گوتم نے جواب دیا لکڑیاں چہرے پر ایسا کیس۔

”میرا سر چکرا رہا ہے، مجھے بھتوں سے بچاؤ۔“ عامر رضا نے پل کے جنگل پر سر رکھ دیا۔ چمپا اس کے پاس کھڑی تھی۔

”خوبصورت آدمی، اگر میں تمہارے دل کو جان سکتی۔“

”تم نہیں جانوگی۔ مجھے کوئی نہیں جانے گا۔“ عامر رضا نے جواب دیا۔ موڑ پھر ایک دھمکے سے اشارت ہوئی۔ مال نے گانا شروع کر دیا تھا۔ چاندنی کی روشنی ایک دم بہت تیز ہوئی۔ اس میں ان سب کے چہرے دھلے

ہوئے سفید نظر آرہے تھے۔

”ہل ہر طرف پل بنار کھے ہیں۔“ گوتم غصے سے بڑا بڑا۔

”وہ سکندر باغ کی سڑک پر آ گئے۔ قریب سے ایک مفرق ہاتھی جھومتا ہوا گزر۔ اس پر شاہ زمکن غازی الدین حیدر سوار تھے۔ چمپا نے ان کی شکل کو غور سے دیکھا اور وہ بڑے مسخرے نظر آئے۔“ ان سے ہاؤڈو یوڈو ہی کر لوم از کم۔“

”یہ تو بڑے انگریز مشہور ہیں۔ دیکھو کیا والا یقی با دشاؤں والا جوڑا پہن رکھا ہے۔“ مال نے کہا۔

شاہ زمکن ہودے میں سر جھکائے بیٹھے بیٹھے رہے۔ موڑ پھر آگے نکل گئی۔ سب چپ چاپ تھے۔ گوتم اپنے پامپ کو ٹھونکتا بجا تارہا، اگر مجھے کوئی یہ بتا لادے کہ یہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں تو میں اس کو یہ بڑا انعام دوں۔ چمپا نے پھر اپنے آپ سے کہا۔ گھنٹوں میں نے ان سے دلیلیں چھانٹیں پر مجھے کبھی معلوم نہ ہوا کہ یہ لوگ چاہتے کیا ہیں۔ گروہ کی نگت بیکار ہے۔ تنہائی اصل حقیقت ہے۔

مال نے دفتا کار روک لی۔ سامنے لا رما ٹیز کا لج تھا۔

”یہاں انہوں نے مجھے کیا کیا نہیں پڑھایا۔“

مال اور عامر رضا اور ہری شنکر نے انگلیاں اٹھا کر یک زبان ہو کر کہا۔ ”تم اتنا پڑھتے کیوں ہو؟“ انہوں نے پٹ کر گوتم سے سوال کیا۔

”یہ عجیب بگڑے دل ہیں۔ ان کو سمجھانا بیکار ہے۔“ طاعت نے کہا۔ گوتم چپا رہا۔

وہ سب اتر کر عمارت کے قریب گئے اور کھڑکیوں میں سے اندر جھانکنے لگے۔ اندر کمرے اندھیرے اور سنسان پڑے تھے۔ صبح کو ان میں پھر پڑھائی ہو گی۔ چھتوں پر بنے ہوئے اطالوی Bas-relief کے گلابی، بزر اور نیلے رنگ نیم تاریکی میں جھلماڑا ہے تھے۔ دیوار پر زوفنی کا بنایا ہوا جزل ماڑن کی ہندوستانی بیگم کا پورٹریٹ آویزاں تھا۔ طاعت کھڑکی کے شیشے سے ناک چپکائے کھڑی رہی۔ باقی لوگ سر جھکائے جھیل کی اور چلے گئے۔

”آؤ۔۔۔ ادھر آؤ۔۔۔ میرے قریب“ طاعت نے مرکر دیکھا۔ جزل ماڑن کی ہندوستانی بیگم جھیل کے کنارے کھڑی تھی، اس نے اشارہ کر کے ان کو پھر بایا۔

”مجھ سے با قیل کرو“ اس نے کہا۔ ”مجھ سے کوئی با قیل نہیں کرتا۔“ دن بھر یہاں اتنا بڑا ہنگامہ رہتا ہے۔ کتابیں پڑھی جاتی ہیں۔ تیکھر ہوتے ہیں۔ میری طرف کوئی پٹ کر دیکھتا بھی نہیں۔ ”وہ سوں سوں کر کے روئے لگی۔ طاعت بڑی گھبرائی کر کے اس کو کس طرح چپ کرایا جائے۔“ سنو میری بات“ طاعت نے سمجھانے کی سمعی کی۔ ”تم ابدیت کے نقطے پر وصیان دیا کرو۔ وقت کے مختلف نکڑے دراصل۔۔۔“

” وعدہ کرو کہ کبھی نہیں پڑھو گے؟۔۔۔“ ”مال اوپنجی آواز میں گوتم سے کہہ رہا تھا۔

”یہاں سے ہمارا ایک انگریز پروفیسر کتابیں چھوڑ کر ہمایہ نکل بھاگا تھا، وہ اب بھی وہیں زندہ ہے یا اسے سکی شیر نے کھالیا یا چڑیوں نے اسے کی داڑھی میں

گھونسلے بنالیے ہوں اور وہ کسی کھوہ میں بینہار و منی کی موسیقی سنتا ہوگا۔ ”ہری شنکر نے کہا۔

”اوام۔ اوام۔“ یہ آواز اب سارے میں گونج رہی تھی۔ فضا میں اس آواز سے لرزائھیں۔ ہری۔ ہری۔ وہ جھیل کو پچھے چھوڑ کر سرخ بجری والے راستے پر چلنے لگے۔ چمپا نے ہاتھ بڑھا کر پھولوں کی ایک ٹہنی کو چھووا، ایک پتاٹوٹ کر راستے پر آن گرا۔

”شنو جو پتے کے گرنے میں نہاں ہے۔ ہری۔ ہری۔“ چمپا نے دہر لایا۔
تھ خانے میں جنرل مارٹن پڑا سوتا ہے، اس کے اوپر سے دنیا گزرتی جا رہی ہے۔

لانبریری کی چھت پر سے ایک اکیلا چندوں اڑتا ہوا نکل گیا۔ کتابوں کے الفاظ جلوس بنا کر چاروں اور سچیل گئے۔ لاطینی، فرانسیسی، انگریزی۔ بے معنی الفاظ۔ ان کے معنی اگیا بھتال کی مانند منہ چڑھا رہے تھے۔ بہت سے الفاظ یہیں پر رکھی ہوئی توپ پر چڑھ کر بینہ گئے اور اپنی پتلی پتلی، کالی کالی ٹانگیں ہلانے لگے۔ توپ نے گرج کر اطلاع دی ”میرا نام لارڈ کارنوالس، رکھا گیا تھا اور میں سر نگاہ تم میں استعمال کی گئی تھی۔“ یہیں پر بیٹھے ہوئے پتھر کے شیر اور اوپر چھت کی منڈیر پر ایستادہ مجھے زور زور سے قہقہ لگانے لگے، پھر طاعت کسی بات پر کھلکھلا کر بھنسی۔ آؤ دلکشا چل کر پدمنی اچاریہ کے یہاں کافی پہنیں۔ سوتی ہوئی معطر سڑکوں پر سے گزر کروہ دلکشا کی طرف بڑھے۔

کچھ دیر بعد مال، جو راستے میں سے کہیں غائب ہو گیا تھا، ان سے آن ملاؤہ

سب دلکشا کے پھانک میں داخل ہوئے۔

”تم کہاں چلے گئے تھے۔“ گوتم نے غصے سے پوچھا۔

”میں نے ساتھا کہ بادشاہ غازی الدین حیدر کے یہاں بستی کا تھوا رہت
دھوم سے منایا جاتا ہے، اسی کی سیر دیکھنے چلا گیا تھا۔ فرح بخش میں عجب منظر تھا۔
ایک طرف ڈاکٹر مخلوق بیٹھے فارسی میں گفتگو کر رہے تھے۔ کرے کے ایک کونے
میں ایک انگریز تپائی پر بیٹھا بیگ پاسپ بجارتا تھا۔ پھر جب علی فضل علی قوال نے
بستی کا خیال چھیڑا۔ برآمدے میں انگریزی بینڈ نجٹ رہا تھا، پھر لندن کے بادشاہ کا
جام صحت پیا گیا۔ بادشاہ کو انجینئرنگ کی وصت ہے۔ دنیا بھر کی مشینیں المعلم جمع کر
کر رہی ہیں۔ ایک وہ طاس ڈسکنٹ ان کو فنی چڑھاتا رہتا ہے۔ لیکے ایک اسٹر
گومتی میں چھوڑ دیا۔ رابرٹ ہوم آرٹسٹ ایک صحی میں بیٹھا تصویر ہنا رہا تھا۔ بشپ
ہمیر بھی موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر چھوٹتے ہی تبلیغ کرنے لگے۔ زینے کے سرے پر
کھڑے بادشاہ انگریز مہماں کو استقبال کر رہے تھے، پھر وہ سب کو اپنی پکھر گیلری
میں لے گئے۔ کھانا میز پر خالص انگریزی فیشن کا پیش کیا گیا۔ دربار میں بڑی
انگریزیت ہے بھی۔ میرا تو دم بولا گیا۔

پھر جب میں فرح بخش سے واپس آ رہا تھا تو راہ میں صاحب ریزی ٹینٹ ہے بھی۔ میرا تو دم بولا گیا۔

پھر جب میں فرح بخش سے واپس آ رہا تھا تو راہ میں صاحب ریزی ٹینٹ
بہادر جوڑی دار پگڑی سر پیچ گوشوارے پہنے پندوستائی جائے میں مابوس، جھالردار
پاکی میں بیٹھے چلے جاتے تھے۔ میں نے پوچھا: کہاں تشریف لیے جاتے ہیں؟
کہاں: بادشاہ کا جلوس ہے۔ کورونیشن۔

میں نے پوچھا: کون سے بادشاہ

کا؟ ایک کے دربار سے تو میں ابھی آ رہا ہوں گے تو مر گئے ان کے بیٹے نصیر الدین حیدر اب تخت پر بیٹھے ہیں، عجائب تماشا ہے۔ یار ہری شکر یہ بادشاہ لوگ مر بھی جاتے ہیں ۔۔۔ وہ خاموش ہو گیا۔

اب وہ سب دلکشا کے باغات میں داخل ہو چکے تھے۔ سارے میں پورنماشی کا اجالا سائیں سائیں کر رہا تھا۔ دور درختوں میں چھپی ایک پیلے رنگ کی کوئی تھی جس میں اندر ہیرا پڑا تھا۔ لان پر ایک سور سور رہا تھا۔ سامنے بڑے گھنے درخت کے نیچے بہت سے ڈبے اور کاغذ بکھرے پڑے تھے۔ آج یہاں چاند باغ کی بابا لوگ پکنک منانے آئی تھیں۔ مالی نے کہا۔ انہوں نے کوئی کے برآمدے میں جا کر پہ منی آغاز دی، وہ اور اس کامیاب باہر آئے۔ ہلو۔ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

”کافی ہنا وہ۔“ مال نے حکم چلا یا۔

کوئی کے پیچھے انگریز فوجیوں کی قبریں تھیں جو منہ ستاؤں میں یہاں کھیت رہے، وہاں جھاڑیوں میں کھس کر انہوں نے پچیسویں مرتبہ ان کے کنبے پڑھے۔ لفڑت پال، فور تھوڑا پنجاب رائلز۔ نواجوں کی پیشین مک ڈائلڈ، ۹۳۶ ہائی لینڈرز۔ لفڑت چارلی، ڈیش روڈ۔

”ہلو ہاؤ ڈو یو ڈو ۔۔۔“ ان تینوں نے سامنے آ کر بٹاٹ سے مصالخے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔

”ہلو چارلی۔ لو پا مپ پیو۔“ گوتم نے ان کو تمباکو پیش کیا۔

پھر نواب قیہ محل نے چنیلی کی جھاڑ میں سے نکل کر کہا: ”اگر کوئی مجھے دل کا چین دادے تو میں اسے اپنی پوری سلطنت بخش دوں۔“

”میں نے اکثر سوچا کہ تم نے زہر کیوں کھایا تھا۔“ چمپا نے نواب قدسیہ محل سے اس طرح بے تکلفی سے بات کی گواہ بھی کانج کی ہم جماعت لڑکی تھی۔ لڑکیاں سب ایک دوسرے کو جانتی ہیں۔ چوبیس سالہ اور خوبصورت ملکہ اودھ نزاکت سے اپنے پانچ سویٹ کرائیک پھر پر بینچئی۔ باقی سب لوگ ٹھلتے ہوئے دلکشا محل کے عظیم الشان کھنڈر کی طرح چلے گئے۔

”ایک روز یہاں ایک فرانسیسی اپنا غبارہ اڑانے لایا تھا۔ بڑی خلقت جمع ہوئی۔ میرے سرے شاہ زمکن بھی تماشاد بخشنے آئے تھے۔ دیکھو تو نامزد آیا کہ یہ فرانسیسی غبارے میں اڑی ہو؟“ ملکہ نے چمپا سے پوچھا۔

”نہیں مگر تم نے زہر کیوں کھایا تھا؟“ چمپا نے مصروفی۔ صاف ظاہر تھا کہ ملکہ بات ٹال رہی تھی وہ اپنی آرسی کو غور سے دیکھا کی۔

”تم تو بڑی سمجھی مشہور تھیں، تم سے زیادہ فیاض اور نیک دل بیگم لکھنؤ کے جنت پر نہیں پہنچی۔ لاکھوں روپے تم نے غریبوں کو بخش دیے۔ تم مجھے بتاؤ۔ کہ اس سخاوت اور محبت کے بد لے میں دنیا نے تم کو کیا دیا۔ اللہ بتاؤ نا بھی۔“

”جد ہر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے۔“ ملکہ بے دھیانی سے گنگزاری تھی۔ ”یہ میرے بادشاہ کاصرع ہے۔“ اس نے چمپا کو مخاطب کیا۔ ”تم کو شعر پسند ہیں؟“ باغ بست کے سارے بچوں کی خوبیوں سے مہک رہا تھا جیسے گندھیوں نے عطر کی ہزاروں شیشیاں انڈیل دی ہوں۔

”برکھارت تھی اور تم دلکشا محل میں تفریح کے لیے آئیں، اور چونکہ بادشاہ تم سے ناراض تھے، تم نے لے کے سنگھیا چھانک لی۔ ذرا بتاؤ تو اس کا کیا مطلب

ہے۔ کیا مرد اس لاکن ہوتے ہیں کہ ان کے لیے انسان جان پر کھیل جائے۔ ان کی تو اتنی سی بھی پرواہ نہیں کرنا چاہئے۔ اتنی سی بھی۔ ”چمپا نے انگلی پر اگلی رکھ کے بتایا۔

قدیمہ محل نے کوئی جواب نہ دیا۔

”اے لو۔ وہ راجہ غالب جنگ چلے آتے ہیں۔ آج پورنماشی ہے تا۔ باڈشاہ یہاں تفریح کے لیے آتے ہوں گے۔ مجھے دیکھا تو پھر خفا ہو جائیں گے۔ میں اب چل دوں۔“

”کہاں جاتی ہو۔؟“ چمپا نے گھبرا کر پوچھا۔

”کہیں نہیں۔ ہم سب یہیں موجود ہیں۔ ہم اور تم الگ الگ کہاں ہیں؟ بلکہ اب تم بھی چلی جاؤ۔ تمہارے اس وقت کے ساتھی تم کو بلا تے ہیں۔“

”چمپا۔ باجی چمپا باجی۔“ رات کے نائلے میں سماں کی آواز سنائی دی۔ وہ بھتر سے اٹھ کر دل کشا محل کی طرف چل پڑی۔ گھنڈر کی سب سے اوپری سیرھی پر کرنل اچاریہ بیٹھے گٹار بجارتے تھے، سب لوگ آس پاس بیٹھے تھے۔

”لڑ کیو، چلو کافی تیار ہے۔“ پدمی نے پکار کر کہا۔ اندر گھنڈر کے ایوانوں میں نصیر الدین حیدر کے حرم کی انگیز بیگمات بڑے بڑے جھال ردار سائے پہنے، کہنیوں کے بل بیٹھی بڑی محوبت سے گٹار سن رہی تھیں۔ پھر ان بیگمات نے مل کر پولکا شروع کر دیا، وہ سب سیرھیاں اتر کر پدمی کی کوٹھی کی طرف چلے گئے۔

چمپا پھر تنہارہ گئی۔

”ماد موزیل۔ وزریت تری شارماں۔ ماد موزیل۔“ اس نے

مذکر دیکھا۔ بادشاہ نصیر الدین حیدر کا فرنج جام سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ بڑے شولر انداز میں اس نے اپنا جھالدار و مال نکال کر پتھر پر بچھایا اور دوزانو جھک کر اس سے کہا: ”تشریف رکھیے۔“

چھپا گلکی باندھے سامنے دیکھتی رہی۔

”اموزیل۔۔۔ اپنے حسن پر جی بھر کے نازاں ہو لیجئے۔ جی بھر کر خوش رہئے۔ غم بیکار ہیں۔ آئئے میں آپ کو مرد عورتوں کا گیت سناتا ہوں۔“ اس نے ایک جھنکار کے ساتھ گٹار بجانا شروع کر دیا جو کرنل اچاریہ ہیں بھول گئے تھے۔

مردہ عورتوں کا بیلڈ:

”مجھے بتاؤ کہ لبیڈی فلور اور خوبصورت ہائی پلیشیا۔“

اور تائپس کہاں چھپ گئیں؟

جون کہاں گئی جسے انگریزوں نے جلا دیا تھا؟

ما در خداوند۔۔۔ ان سب کا کیا ہوا؟

”لیکن۔۔۔ پچھلے برسوں کی برف کس نے دیکھی ہے!!“

”اموزیل، یاد رکھیے، خوبصورت عورتیں دو مرتبہ مرتی ہیں۔ حسن پر نازاں ہو جئے دولت اور شہرت اور عزت پر نازاں ہو جئے۔ وقت بہت کم ہے، بہت جلد یہ سب آپ کے پاس سے چلا جائیگا۔ میری سئنے۔ میں پیرس کا جام۔ میں نے بادشاہ کی ایسی جامست بنا لی کہ پورے چوبیں لاکھ روپے سے اپنا گھر بھر لیا۔ سارے لکھنو پر میری حکومت تھی۔ بادشاہ میرے تابع تھے۔ ملک کا اصل حاکم میں تھا اور اب کسی کو میرا نام بھی یاد نہیں۔“ اس نے اپنے ساثن کے جو توں کو ادا کی سے

دیکھا اس کے خوبصورت چہرے سے پاؤڑ کی خوبی آ رہی تھی۔

چمپا سیرھیاں اترنے لگی۔ ”یہ گئار لیتی جائے ۔۔۔ کرٹل اسے یہیں چھوڑ گئے۔ اب میں جا کر کہیں اور منڈلاوں گا۔ بول فوئی ما دوزیل۔“ اس نے جھک کر بڑے اشائل سے کہا۔

پدمی کے لان پر بینہ کر کافی پینے کے بعد وہ ہوڑ کی طرف بڑھے۔ دور ہندر پر چگاڑیں اپنے پر پھیلارہی تھیں۔ ذرا فاصلے پر گومتی بہہ رہی تھی جس کے نزدیک مر گھٹ تھا۔ میلوں پھیلے ہوئے باغ کے چاروں طرف چھاؤنی کی خوبصورت کوٹھیاں تھیں۔ ذرا دور پر دل کشا کلب میں ناج ہوا تھا۔ ”آؤ چھتر منزل چل کرنا چیں،“ مال نے تجویز کیا۔

”آج تم لوگ کیارت جگامنا نے نکلے ہو۔“ پدمی نے ہنس کر کہا۔

”ہاں۔ ایسی خوبصورت رات کو سو کر بر باد کیا جائے؟“ ہری شکر نے جواب دیا۔ ”تم بھی چلو۔“

وہ پھانک سے نکل کر کا سلز روڈ پر آ گئے۔ کنگ غازی الدین حیدر کی نہر پر سے گزرتے وہ حضرت گنج میں داخل ہوئے، پھر قیصر باغ کی طرف مڑ گئے۔

سامنے چاندی والی بارہ دری روشنی سے جھک جھک کر رہی تھی۔

”ارے آج تو یہاں بست کا میلہ ہے۔“ طاعت نے خوش ہو کر کہا۔

”آج معلوم ہوتا ہے سلطان عالم اوپیرا بھی کر رہے ہیں۔“ نرمل نے کہا۔
”چلیں اندر ۔۔۔؟“

”کیسے چلیں۔ ہمیں مدعو تو کیا نہیں گیا ہے۔“ مال نے تذبذب کے ساتھ

کہا۔

”چلے چلو۔ چوداروں کے پیچھے چھپ کر کھڑے ہو جائیں گے۔“ شکر نے جواب دیا۔

وہ چپکے سے عمارت میں داخل ہو گئے۔ اندر بارہ دری کا چاندی کافرش جھل جھل کر رہا۔ اسٹیچ پر راجہ اندر کے دربار کے ستونوں پر چاندی چڑھی ہوئی تھی۔ ہر طرف آئینے جھلمدار ہے تھے۔ پکھراج پر پی گاری تھی:

رت بہار آئی بست بست

کھلے جرو پھوپھوں کے ہار

ہر کے دوار مالی کا چھورا

گر اڈارت گیندن کے ہار

وہ سب پنجوں کے بل چلتے اسٹیچ کے پیچھے آن کھڑے ہوئے۔ طاعت نے چپکے ساتھ ساتھ گنگنا نا شروع کر دیا۔

پھر دھن بد لی۔ اب پکھراج پر پی نے اپنی غزل شروع کی:

ہے جلوہ تن سے درو دیوار بستی

پوشک جو پہنے ہے مرا یار بستی

کیا فصل بہاری نے شکونی ہیں کھلانے

معشوق ہیں پھرتے سر باز بستی

ہال میں واہ واہ کے ڈونگرے برستے گئے، یہ سب چپکے سے ادھر سے نکل کر ایک دروازے میں آگئے۔ سامنے علی نقی وزیر اعظم بیٹھے تھے۔ انہوں نے ان

سب کو دیکھا نہیں۔

پکھراج پر می گائے جا رہی تھی:

موتی کانوں میں نہیں یار کی زلفوں کے قریں
جھالے بھاؤں کے وہ ہیں اور یہ لھٹا ساون کی
اوپیرا ہوتا رہا۔ یہ لوگ مجمع میں رل مل کر ادھر ادھر گھومتے رہے۔ ان سب کو
روشنдан میں سے جھانکتا دیکھ کر سبز پری نے، جو سنگھار کمرے میں کھڑی اشیج پر
جانے کی تیاری کر رہی تھی، گھبرا کر کالے دیو سے کہا: ”ادھر نظر
ڈالو۔ آنے والے وقتوں کے بحوث ہمیں گھور رہے ہیں۔“

مال نے ایک چوبدار سے پوچھا: ”سبز پری کون ہے؟“

”اے اس کوئی نہیں جانتے خداوند۔ چمپا بائی۔ شاہ زمکن غازی
الدین حیدر کے زمانے سے ان کی مانچہ ہمی ہوئی ہے۔ چالیس کے پیٹے میں
آگئیں مگر وہی آن بان وہی شان ہے۔ کیا قیامت کی حچب ہے کہ صلی علی۔ ان
سے بہتر سبزی پری کا سوانگ اور کوئی نہیں بھر ستا۔ اللہ نے گلے میں نور اتنا ردا
ہے۔ کیا گاتی ہیں۔ کیا آپ لکھنو کے باشندے نہیں؟“ مال جلدی سے وہاں
سے ہٹ گیا۔

اتنے میں کالے دیو کی گرجدار آواز آئی:

لایا شہزادے کو میں جا کر ہندوستان
تو اپنے معشوق کو سبز پری پہچان
تو اپنے معشوق کو۔

اب شہزادہ گفناں اسٹیچ پر آچکا تھا۔ اس نے لہک کر گایا:
محلوں میں رہتا ہوں میں، عیش ہے میرا کام
شہزادہ ہوں ہند کا، نام مرا گفناں
پھر اس نے بڑی دلدوز آواز میں کہا:

صحح ہوتی ہے مری جان کوئی آن کے بیچ
بھیرویں مجھ کو سنا چل کے پرستان کے بیچ
وہ لوگ بارہ دری سے باہر آگئے۔ اندر سے شاہزادے کی آواز آری تھی:
اڑ کے تو جائے گی اک پل میں پرستان کے بیچ
ہاتھ پھیلا کے میں رہ جاؤں گا ارمان کے بیچ
باہر جل پر یوں کا پھانک، چینی باغ، جلو خانہ — سب جگہیں روشنی
سے بقعا نور بنی ہوئی تھیں۔ کنج میں سری کرشن کارہس ہو رہا تھا۔ جان عالم گیر وا
کپڑے پہنے، دھونی رمائے، ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ میلے والے شہر کے
باشندے سب گیروا جوڑ پہنے تھے۔ درگا پر شادک تھک مولسری کے سامنے میں
پھول کی تھالی کے کنارے پر ناج ناج کر بھاؤ بتا رہا تھا۔ فواروں سے معطر پانی
ابل رہا تھا۔ باغ کی نشتمیں شہرے اور نقرتی روغن سے چمک رہی تھیں۔ ہر طرف
پھول ہی پھول تھے۔

بارہ دری سے جو گن کی بھیرویں کی تانیں بلند ہو رہی تھیں:

تارکشی دوپٹہ تو اوڑھے کرن جو ٹانک کے
ہو شب ماہتاب میں کیا ہی صنم جھلا جھلی

آئی، بہار ساقیا! جام شراب دے پلا
پھول کھلنے پھلنے شجر، ابر اٹھا، ہوا چلی
بجکے زمین شعر میں پاؤں امانت اپنا کیا
جب ہوئی لغزش اک ذرا، اکلا زبان سے یا علیٰ
جو گن کی آواز رفتہ رفتہ چاندی میں ڈوبتی گئی۔

یہ لوگ میلے والے کے ہجوم سے نکل کر پھر سڑک پر آگئے۔ موڑ میں بیٹھ کر
نواب سعادت علی خاں کے مقبرے سے آگے نکلے۔ جدھر روشن الدولہ کی سرخ
رنگ کی عمارت تھیں سڑک کے اس پارچھتر منزل کے محلات نیم تاریکی میں
استادہ تھے۔ اندر وہ لتس کی آوازیں آرہی تھیں۔ موڑوں کی قطاریں کھڑی تھیں۔
پھاٹک کے اندر جا کر انہوں نے کارروکی۔ لکھنؤ کا علی فیشن ایبل طبقہ بیڑ ڈے
نائٹ منارہاتھا۔

”آج شاید گورنر بھی آیا ہوا ہے۔ ابھی ایک اے۔ ڈی۔ سی کو میں نے اندر
جاتے دیکھا،“ ہری شنکر نے اظہار خیال کیا۔

”کون والا اے۔ ڈی۔ سی، وہی سی جو اطالب لوئی جھگلو معلوم ہوتا ہے۔“ طاعت
نے بے دصیانی سے پوچھا۔

”بکومت _____ تم ہر ایک پر اعتراض کرنے کو تیار _____ سی ہے
تو ہوا کرے، تم سے مطلب؟“ مال نے ڈانغا۔

وہ اندر جا کر لاونج میں بیٹھ گئے۔ عامر رضا نے مشروبات کا آرڈر دیا۔ مس
ایڈن نے لکھا تھا: ”الف لیلے کی زیبیدہ نے اپنے نشاط باغ کو خلیفہ کے تصویر

خانے سے ہارنے کی شرط بدی تھی، وہ نشاط باغ مجھے یقین ہے یہی رہا ہوگا۔ ”مال اکتاہٹ کے ساتھ ستونوں کے نارنجی نقش و نگار دیکھتا رہا۔

فلور پر مشہور نام تیر رہے تھے جو اون لکر، میں چھپتے تھے اور گرمیوں میں سوری، ننی تال، شملہ اور دارجلنگ میں جگمگاتے تھے۔

”ان کا بھی ایک زمانہ ہے۔“ گوم نے آہستہ سے کہا۔

باہر سیرھیوں کے نیچے گوتی آہستہ خرامی سے رواں تھی، وہ سب اٹھ کر باہر آگئے۔ ٹیرس سفان تھا۔ سیرھیوں پر نصیر الدین حیدر شاہ بادشاہ نسلگے پاؤ بیٹھے تھے، انہوں نے اپنا ایک جوتا ہرول میں چینک دیا تھا، جب وہ ذرا بہتا ہوا دری کل جاتا تو یہ تالی بجا تے تا کہ چوبدار آئے۔ جب کوئی چوبدار نہ آتا اور محض ہال روم کے قہقہیوں کی آواز سنائی ویتی رہتی تو خود اٹھ کر پانی پر جھکتے اور جوتا نکال لیتے، تھوڑی دری بعد دوسرا جوتا پانی میں چینک دیتے، اسی طرح وہ بیٹھے اپنا دل بہاناتا رہے تھے۔ دری تک یہی تماشا ہوتا رہا۔ آخر گوم نے آگے بڑھ کر ان کو بھی سگریٹ پیش کیا۔

”نہیں۔ ہم مشکلبوگرڈگڑی پیتے ہیں۔ کوئی ہے۔“

”معاف کیجئے گا۔ ہم لوگ ہیں۔“ گوم گھبرا کر کہا۔

”تم لوگ کون۔“ انہوں نے بے دماغ ہو کر پوچھا۔

”بس ہم ہی لوگ۔“ وہ خاموش ہو گئے۔

”ان کو یہیں چھوڑ دو۔“ کیا کریں گے ہم ان کا۔ آؤ چلو۔ یہاں سے۔

”مال نے چپکے سے گوم سے کہا۔

نصر الدین حیدر باشا کو پانی کے کنارے تھا اپنے جوتوں سے کھیلتا چھوڑ کر وہ پھر سڑک پر آئے اور پرانے شہر کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ یہاں کھار میں اور پالکی برا اور مہریاں اور یکے والے گھوم رہے تھے۔ سبزی فروش، بساطی، کمہار، شہر کی اصل آبادی، اصل اہل زبان، وہ میڈیکل کالج کے سامنے سے گزرے جس کے اندر انسان مر رہے تھے اور پیدا ہو رہے تھے۔ اس کے آگے گنجان پر اسرار شہر تھا۔ حویلیاں، پھانک، احاطہ، چھتے، بیچ دریچ، نگ، و تاریک گلیاں جن کے اندر ایک دنیا آباد تھی، آصف الدولہ کا چوک، نخاس، اکبری دروازہ، سبزی منڈی، حسین آباد، گول دروازہ، کنوریہ پارک، بڑا مام بارہ، چھپی بھون، رومنی دروازہ۔

آصف الدولہ کا لکھنؤ لکھنؤ کا دل، سڑکیں اور گلیاں اب سمسان پڑی تھیں۔ یک نخت بارش کی پھوار شروع ہو گئی۔ بھار کی بارش جو چند منٹ مدرس کر کھل گئی۔ آسمان پر سے اندر کے اپر اوت ہاتھی کی طرح ایک بارل جھومتا ہوا نکل گیا۔ سامنے ایک بالاخانے پر روشنی ہو رہی تھی۔

”میرا ہمیشہ جی چاہا کہ اوپر جا کر کمرہ دیکھوں،“ طاعت نے کہا۔

”اے یہ تو تنویر کا مکان ہے جو ریڈ یو اسٹیشن آتی ہے۔“ نرملانے کہا، نچے اس کی اسموڈی بیکر کھڑی تھی۔ ”اس کے پاس چلیں۔ بڑی پیاری لڑکی ہے بے چاری۔ سرمایہ دارانہ نظام کی شکار۔ چلو اس کے پاس چلیں۔“ طاعت نے مصر رہی۔

”بکومت۔“ چمپانے ڈالنا۔

”اے بجیا، آپ کو تو اس طبقے کو سو شیو لو جیکل نقطہ نظر سے۔“

”بحث مت کرو۔ خاموش رہنا سیکھو۔“ گوتم اور مال موڑ سے باہر اترے کھڑے تھے اور رات کی تازہ ہواناک میں داخل کر رہے تھے۔

دکانوں کے بہر آمدے میں سے ایک بوڑھا ہندو جامدالی کا انگر کھا پہنے لکڑی میکتا گزرا۔ ان نوجوان لڑکوں کو ایک بالاخانے کے نیچے موڑ روکے کھڑا دیکھ کر اس نے آہستہ سے لاحول والا قوتہ کہا اور آگے بڑھ گیا، پھر وہ لوہے کے پل پر سے گزرتے ڈالی گئی ہوتے فیض آباد روڈ پہنچے۔ سامنے چاند باغ تھا، دوسری طرف بادشاہ باغ۔

”اوپر ویسر بحر جی کے پاس چلیں۔“ انہوں نے نظر لگایا۔

وہ بادشاہ باغ کے شاہی پھانک میں داخل ہوئے جو کیلاش ہوشل کے پہلو میں کھلتا تھا۔ باغات میہاں بھی معطر تھے۔ نہر کے سرے پر سرخ بارہ دری چاندنی میں نہایتی کھڑی تھی۔ یگور انہری می کی عظیم الشان جدید وضع کی عمارت پر سکوت پر جلال نظر آ رہی تھی۔ الفاظ میں بڑی طاقت ہے۔ عمارت نے کہا میرے اندر آؤ، میں تمہارے دکھ بھا دوں گی۔

”الفاظ دکھ بھلاتے نہیں، دکھ اور گہرا کرتے ہیں۔“ گوتم نے جواب دیا۔

”خاموشی سب سے افضل ہے۔ اسی لیے لوگ منی ہو جاتے ہیں۔ خاموش رہے ہیں، ہری شکر نے کہا۔“

”وہ نہر کے پل پر جا کر بیٹھ گئے۔ یونیورسٹی کی عمارت پر چاندنی بر ساکی۔ نصیر الدین حیدر کا بادشاہ باغ۔“

بے چارے نصیر الدین حیدر۔

پھر انہوں نے پروفیسروں کی کوٹھیوں کی طرف چلتا شروع کیا، دور درختوں میں چھپے ہوئے اپنے لان پر پروفیسر بزرگی خاموشی سے ٹھل رہے تھے۔

”یہ جانے مسائل کا حل کس طرح سوچ لیتے ہیں؟“ مال نے منہ لٹکا کر کہا۔

”شب بخیر پروفیسر۔“ انہوں نے سڑک پر کھڑے ہو کر آہستہ سے کہا اور واپس آگئے۔ یونیورسٹی کا سارا فاصلہ طے کرتے کواڈرینگل میں سے گزرتے وہ اس سڑک پر پہنچ گئے جو یونیورسٹی روڈ کے متوازن شلتی ہوئی موئی محل بر ج پر جا گئی تھی۔ اس کے سرے پر جسرا رزا فس تھا۔ سامنے کبوتر والی کوٹھی تھی جس میں واکس چانسلر رہتا تھا۔ بر ج پر آن کر انہوں نے ایک بار چاروں اور نظر ڈالی اور پھر کچھ راستے پر اتر گئے جو سنگھاڑے والی کوٹھی طرف جاتا تھا۔

آدمی رات کا سمجھ بجا۔ گوتم نے ایک آنکھ کھول کرندی کے بستے پانی کو دیکھا، وہ سنگھاڑے والی کوٹھی کی سیر ہیوں پر برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا، چھپا، طاعت، نرمل اور تہینہ دوسری سیر ھی پر موجود تھیں۔ مال اور ہری شنکر اور عامر رضا پانی میں ٹالکیں لٹکائے ہوئے تھے۔ ندی بہہ رہی تھی۔ ندی کے سامنے دوسرے کنارے پر امام باڑہ نجف اشرف اور موئی محل اور چھتر منزل خاموش کھڑے تھے۔ کشتی سامنے سے گزر گئی۔

وقت کا حرزاں ہو چکا تھا۔

صحح ہوتی ہے مری جان کوئی آن کے بیچ
بھیروں مجھ کو سنا چل کے پرستان کے بیچ
گوتم نے آہستہ سے دہرا یا۔

”افوہ گوتم بھائی تم تو اندر سجا کے شعروں پر اتر آئے۔
کس قدر ڈیکھ دنٹ ہو!“ طاعت کہہ رہی تھی۔
وہ انگڑائی لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”چلو یاراب محفل برخاست کی جائے۔ ساری رات یہیں بیٹھے بیٹھے گزردی
، مال کی آواز آئی۔“

وہ سب منتشر ہو کر اپنی اپنی نیندوں کی طرف روانہ ہو گئے۔
میں شانتا کا خط بھی مکمل نہ کر سکا۔ گوتم نے اپنے جائے قیام کی طرف جاتے
ہوئے اداکی سے سوچا۔

۵۱

پروفیسر بزرگی میں الاقوامی شہر کے مالک ماہر اقتصادیات تھے، ان کی کوئی پر
بھی بڑی اداسی چھائی رہتی اور مکمل سکون۔ ان کا گھر چجع علم کا مسکن تھا۔
پر اسکی خوبصورت اور خاموش۔ سہہ پہر کو اکٹھ لڑ کے اور لڑ کیاں سائیکلیں لیے ان
کے گھر پہنچتے۔ پروفیسر ان کو سیمل کے درخت کے نیچے کری بچھائے بیٹھے نظر
آ جاتے یا اندر چاء کی میز پر بیٹھے ہوتے اور کھانے کے کمرے کے خیک اندر ہر
میں سائیڈ بورڈ پر رکھے چاندی کے برتن جھلمندایا کرتے، اس وقت وہ اپنے
شاگردوں سے بڑا اداس آواز میں باتیں کرتے۔ پروفیسر کے یہاں کی مجلسوں
میں گوتم نیلمبر خاص اہمیت حاصل کر چکا تھا، اس کے بغیر اب محفل مکمل نہ سمجھی جاتی۔

جائزوں میں لان پر دھوپ میں اور گرمیوں میں درختوں کے نیچے بیٹھ کر گھنٹوں باشیں ہوتیں مذہب، فلسفہ، سیاست، عمرانیات، آرٹ، ادب۔ ذہن کی دنیا وسیع تھی بڑ پکشش، بڑی تکلیف وہ اور انہیلی پر خطر۔

”پروفیسر——“ ایک روز چمپا نے پوچھا، ”ذہن اور جذبات کی کش کمش سے کس طرح نجات ملے گی؟ چاروں اور یہ سائے پھیلے ہیں۔ جس طرح جنگل میں جھکڑ چلتا ہے تو درختوں کے سائے آپس میں سمجھتم گتھا ہو جاتے ہیں۔ یہ کش کمش ہر سطح پر جاری ہے قومیں، حکومتیں، انسان، فرقے۔ ہر طرف یہ سب ایک دوسری سے الجھے ہوئے ہیں۔ میرے آس پاس چاروں کھونٹ خوف کی علمداری ہے اور بے اطمینانی، نفرت، کھنچاؤ، دہشت، وفاداریوں کی کش کمش، اندر ہرے جنگل میں چھپے ہوئے اگیا بھتال اپنے چراغ دکھاتے ہیں اور جب ان کی طرف دوڑو تو پک جھکتے میں غائب۔ مجھے بڑھ دید ڈنی کش کمش کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

”جب میں بنارس میں پڑھتی تھی میں نے دو قوموں کے نظریے پر کبھی غور نہ کیا۔ کاشی کی گلیاں اور شوالے اور گھاث میرے سمجھی اتنے ہی تھے جتنے میری دوست لیما بھار گوا کے، پھر یہ کیا ہوا کہ جب میں بڑی ہوئی تو مجھے بتا چلا کہ ان شوالوں پر میرا کوئی حق نہیں کیونکہ میں ما تھے پر بندی نہیں لگاتی اور تپلیشور کی آرٹی اتنا نے کے بجائے میری اماں نماز پڑھتی ہیں لہذا میری تہذیب دوسری ہے، میری وفاداریاں دوسری ہیں۔ میں نے بست کالج میں ترنگے کے نیچے کھڑے ہو کر جن گن من گایا ہے لیکن مجھے وہاں پر اکثر ایسا محسوس ہوا کہ مجھے اس ترنگے کے سائے میں اجبی سمجھا جاتا ہے۔ میں تو اسی ملک کی بادی ہوں، اپنے لیے دوسرا

ملک کہاں سے لا دیں؟ ہجرت کا فلسفہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ یہودیوں کو دیکھو کہ ان کا کوئی وطن نہیں ہے۔ وفاداریوں کی کش مکش کا سامنا کرتے ان کو ہزاروں سال بیت گئے وہ جرم کن ہوں تب بھی یہودی ہیں، امریکن ہوں تب بھی۔ جب یورپ میں جنگ چھڑی ایک نیا مسئلہ میرے سامنے آیا۔ غاصب قومیں ایک ملک کے باشندوں کو نکال باہر کرتی ہیں اور وہ لوگ سیاسی پناہ گزینوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور دنیا بھر میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ ان پر ترس کھایا جاتا ہے، چندے جمع ہوتے ہیں، ان کو حقیر سمجھا جاتا ہے کیونکہ ان کا کوئی گھر نہیں۔ وہ طرح کے پناہ گزین تھے: ایک وہ جنہوں نے اپنی مرحل سے ترک وطن کیا، وسرے وہ جن کو مجبور انٹھنا پڑا تب مسلم سیاست میں ایک نئی آواز سنائی دی، میں نے دیکھا کہ میرے ہم مذہب مسلمان بخوبی اور بڑے ارمان کے ساتھ ترک وطن پر آمادہ ہیں اور ایک نیا ملک بسانا چاہ رہے ہیں، مجھے اکثر یہ تصور بہت بھایا کیونکہ رومان اور عینیت انسان کی فطرت میں داخل ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا میں کسی نئے خیال پر عمل نہ کیا جاتا، نہ خواب دیکھے جاتے تھے مگر اس خواب کا دوسروں کے خوابوں سے تصادم ہو گیا۔ کش مکش اور تصادم کا مجھے پھر سامنا کرنا پڑا۔

”امن اور جنگ کا مسئلہ بہت سخت ہے، میں نے مالشائی پڑھا اور گاندھی اور وڈرو لہین، لیکن اس کے کیا معنی ہیں؟ وفاداریوں کے معنی طے کرنے والا کون ہے؟ سیاست میں مہاتما گاندھی کی روحانیت کا کہاں تک دخل ہونا چاہیے اور قائد اعظم جنائج کے اسلام کا کہاں تک؟ مجھے معلوم ہے کہ فرقہ پرستی ہلاکت خیز ہے۔ ایک دفعہ چھڑے تو کبھی نہ مل سکیں گے، مگر میرے کچھ ساتھی کہتے ہیں کہ ہم کبھی

ایک نہ تھے، یہ سب کا انگریس کافراڑ ہے وہ مسلمانوں کو غلام بنانا کچھ ساتھی کرتے ہیں
کہ ہم کبھی ایک نہ تھے، یہ سب کا انگریس کافراڑ ہے وہ مسلمانوں کو غلام بنانا چاہتی
ہے۔“

”تم نے کبھی غور کیا۔“ پروفیسر نے اوپر درخت کی شاخ پر پیٹھی ہوئی ایک گوریا
کو دیکھتے ہوئے دھمکی آواز میں کہا، ”تم ہسری کی طالب علم ہو_____ کہ
انگریزوں سے پہلے اس ملک میں ہندو مسلم فساوئیں ہوتے تھے۔ جنگیں ہوتی
تھیں مگر وہ سیاسی تھیں۔ ہندو حکمرانوں کی فوج میں مسلمان جزل اور ساہی ہوتے
تھے۔ مسلمانوں کی طرف سے ہندو لڑتے تھے۔ سیاسی گروہ بندیاں تھیں، پھر
انگریزوں نے دنیا پر یہ نیا نظریہ آشکار کیا کہ اس ملک میں ہزاروں زبانیں بولی
جاتی ہیں، ہزاروں قومیں بستی ہیں، ہندو مسلمان ایک دوسرے سے منفر ہیں، یہ ملک
ایک ملک نہیں ہے محض جغرافیہ کی ایک اصطلاح ہے۔ ان کی کمی ہوئی تاریخ
راجستان، ہی دیکھ لویا انیسویں صدی کے سفرنامے، لیکن تم کو ۵۰ یاد ہے جب
اکی لکھنؤ میں ہندو امراء اور رعایا نے یہ جیس قدر کی حکومت کو جو بہر حال مسلمان
حکومت تھی، بچانے کے لیے اپنی جانیں لڑائیں، مگر ہمارا موجودہ مذہبی جنون۔“

”مذہب آپ کے نزدیک بیکار ہے؟ آپ تو خود بڑے پکے ویشنو ہیں۔“
ویشنو بھگتی کا مذہب ہے، اس کی بنیاد خالص محبت ہے۔

پروفیسر ہرمذہب کی بنیاد خالص محبت ہے، یہ کوئی بات بات نہ ہوئی۔
ہاں، لیکن اصل چیز یہ ہے کہ میں دوسرے مذہب کو حیرانہ سمجھوں۔

”اب ہر ایک تو آپ کی طرح صوفی نہیں ہو ستا۔“

تم بڑی تلخ باتیں کرنے لگی ہو، ایمانہ کرو۔“

”پروفیسر یہاں چاروں طرف تلخی ہے اور نفرت، میں کیا کر سکتی ہوں،“ کل رات میں وہابی تحریک کا تذکرہ پڑھ رہی تھی۔ اس میں جو لوگ شام تھے ان کو نہ ہی دیوانے کہا جاتا ہے مگر اپنے نقطہ نظر سے وہ حق بجانب تھے وہ اسلام کی تجدید یہ کہنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک دنیا دو فرقوں میں ہی تھی: کفر اور اسلام انہوں نے کفر کے خلاف جہاد کیا۔ آخر کون یہ بتانے جائے گا کہ دوسرے انسان حق بجانب ہے یا نہیں۔ سب اپنے نقطہ نظر سے حق بجانب ہوتے ہیں۔ یہی تو سب سے بڑی مصیبت ہے پروفیسر کل رات ہم لوگ نرملاء کے یہاں رات گئے تک میٹھے رہے تھے، وہاں ہم ماضی کے متعلق سوچ رہے تھے اور وقت کے گور کھدھندے کے متعلق گھر واپس جا کر میں دری تک جگا کی، یہاں تک کہ سوریا ہو گیا، اس وقت میں سوچ رہی تھی۔ ہمارا واپس جا کر میں دری تک جگا کی، یہاں تک کہ سوریا ہو گیا، اس وقت میں سوچ رہی تھی۔ ہمارا تاریخ کا آخر آپس میں کیا رشتہ ہے اور کیا ہونا چاہیے، ہم مسلسل جرم و سزا کے منسلے کا سامنا کرتے رہتے ہیں۔ ماضی کی پرانچت ہم کو کتنا پڑتی ہے، میری قوم نے جو جرم کیے ہیں یا کر رہی ہے، بحیثیت فرد میں جو جرم کروں گی اس کا خمیازہ میری قوم کو اٹھانا ہو گا کیونکہ خیال میں بڑی طاقت ہے اور میں پروپیگنڈے کی مشینری کے ذریعے اپنے خیالات کا پر چار کر کے بہت کچھ کر سکتی ہوں۔ جو کچھ آج، اس لمحے تک ہوا اس کا اثر مجھ پر پڑا ہے۔ جو کچھ میں سوچ رہی ہوں اس کا خارہ آنے والی نسلیں ادا کریں گی۔ میری وجہ سے یاد نیاتباہ ہو گی یا پر مسرت۔ تاریخ میں نفرت اور تعصب کے مسائل پر میں جتنا غور کرتی ہوں اتنی ہی

مجھے وحشت ہوتی ہے، مجھے آپ سے ذاتی طور پر نفرت نہیں مگر کمیونٹی کا اسٹریو
 ٹائمپ کے نفرت اور تعصب کے تصورات کا بھی بہت تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے،
 میں تاریخ کی بات کر رہی تھی۔ پروفیسر کال میں نے زملا کے گھر سے لوٹ کر
 کتابوں کی الماری کھولی اور ایک پرانی کتاب میرے ہاتھ میں آگئی جس میں
 انہیسوں صدی کے مولویوں کے جہاد کا تذکرہ تھا۔ اس میں ایک اظہم بھی درج
 ہے۔ فیض آباد کا ماجرا ہے جو وجود صیاح کہلاتا ہے۔ لکھا ہے۔ مغل بادشاہوں اور ان
 کے صوبیداروں نے رام گھاٹ اور دوسری جگہوں پر مسجدیں بنائیں، جب مندر
 گرے تو بھیا یک ہندو جوگی اٹی کے درخت کے نیچے جہنڈی گاڑھے بیٹھا رہا۔
 واجد علی شاہ کے عہد میں ہندوؤں نے پھر اس جگہ پر ٹھاکر دوار بنانے کی کوشش
 کی۔ بڑا فسادرہا، فوج کشی ہوئی۔ فرنگی محل کے علماء نے جہاد کا فتویٰ دے دیا۔
 مجاہدوں کے لشکر پہنچے۔ بڑا خون خرا باہوا۔ مولویوں نے لشکر کشی سے پہلے سلطان
 عالم کو عرضی پہنچی جو ظلم کی صورت میں تھی، میں نے وہ اظہم نقل کر لی تھی۔ آپ کو سناتی
 ہوں۔“

اس نے بیگ کھول کر ایک کانڈ نکالا اور گھاس پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے
 پروفیسر کو سنانا شروع کیا:

مجاہدین کی عرضداشت بادشاہ اودھ کی خدمت میں
 قریب دیہ مہماں واجب التعزیز
 بننا تھی مسجد اسلام ہم چو بد منیر
 لگے بنانے بڑھا کر یہ کافر مقہور

سوار مسجد اقدس میں خانہ لنگور امید ہے کہ شہنشاہ قبلہ عالم
ابوا المنظر و منصور و خبر و اعظم
شہپر رفت و قدسی صفات والا جاہ
خدیو کشور ہندوستان، نلک درگاہ
زبان فیض مبارک سے یوں کریں ارشاد
کہ کافران اودھ پرستاب ہوئے جہاد
روانہ ہوگا شنبے کو لشکر اسلام
برائے نارت و تاراج شہر پچمن و رام
”یہ ندہب کا تعصب ہے اپنی خالص ہیئت میں گویہ ایک علیحدہ بات ہے کہ
سلطان عالم واجد علی شاہ نے بجائے اس کے کوہ عرض داشت پر کان دھرتے
انہوں نے ائمہ مجاهدین کی سرکوبی کے لیے شاہی فوج فیض آباد بھیجی اور مجاهدین
لڑتے ہوئے سرکاری سپاہیوں کے ہاتھوں مارے گئے یا شہید ہوئے اور ایو وحیا
میں امنقاوم ہوا۔ یہ واقعہ انتزاع سلطنت سے صرف ایک سال قبل ۱۸۵۵ء کا
ہے۔ یہ بھی ایک علیحدہ بات ہے کہ سلطنت کا انتظام اچھی طرح نہیں کرتے تھے۔
پروفیسر بتاؤ، میں کس کس سے نفرت کروں؟ انگریزوں سے جنہوں نے میرے
بے قصور بادشاہ کو معزول کیا یا اس کلمہ گوبادشاہ سے نفرت کروں، جو ہندو دیو مالا کا
عاشق تھا، کرشن اور راجہ اندر کا سوا نگ بھرتا تھا اور مسلمان مجاهدین کا قتل کرواتا تھا؟
ان مجاهدین سے تنفر ہوں جو پچمن اور رام کے پرامن خوبصورت شہر کو تاراج
کرنے جا رہے تھے؟ یا ان ہندو جو گیوں کو موردا لزم تھہراوں جو رام گھاث پر

دوبارہ ہنومان کا مندر بنانا چاہر ہے تھے اور میں کس کو حق بجانب ٹھہراوں؟“

”اب مال قریب آ کر گھاس پر بیٹھ گیا اور چمپا کے ہاتھ سے اُطم لے کر پڑھنے لگا۔ لان پر لڑکوں اور لڑکیوں کے گروپ مختلف نکڑیوں میں بھرے ہوئے تھے۔“

”اور پھر تم متوقع ہو۔“ مال نے کہنا شروع کیا، ”تم جو خیر یا اپنے آپ کو بت شکن کہتے ہو اور سومنات سے لے کر آج تک تم نے جو کچھ کیا ہے، اس کے باوجود ہندو تم سے محبت کریں گے۔ یہ اچھی دھاندی ہے۔“

”مال! تم تو بالکل مہا سجائی ہو۔ اچھے خاصے۔ تم سے کوئی بات کرنا بیکار ہے۔ تم نفرتوں سے آزاد بڑی وسیع انظری کا دعویٰ کرتے ہو لیکن تمہاری اس شدت کی قوم پرستی بذات خود ایک اور تعصّب ہے۔“ چمپا نے کہا۔

”اس منطق کا میں جواب نہیں دے ستا۔“ مال نے کہا، وہ دونوں اٹھ کر سرو کے درختوں کے کنارے کنارے ٹہلنے لگے۔

”اصل قصہ یہ ہے چمپا باجی کے مسلمان قوم کی سائیکلو لوچی عجیب و غریب ہے، تم کو کبھی اس سرز میں سے محبت نہیں ہوتی۔ چھوٹتے ہی میرے مولاد لے مدینے مجھے، کافر تم نے لگایا۔ رہیں ایک ہزار مریض یہاں تہذیبی اور روحانی ناطہ جوڑ رکھا گئم اور عرب سے پھر مجھے مہا سجائی بنا رہی ہو۔ واہ بھی _____ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ قومی جدوجہد میں ہر جگہ مسلمانوں نے بھانجی ماری اور فوراً غیر ملکی عناصر سے جا ملے۔“ اس نے ٹہلتے ٹہلتے رک کر جوش سے کہنا شروع کیا۔ ”کیا واقعہ نہیں ہے کہ ۷۳ء میں جب کانگریس گورنمنٹ نے صوبے میں شراب پر پابندی لگائی تو مسلمانوں نے فوراً اس کے خلاف ایجمنیشن کیا کہ ان کے مہذب

میں شراب پہلے ہی حرام ہے لہذا ان کے اوپر یہ قانون عائد نہیں ہوتا، انہیں اس مسئلے سے کوئی دچکپی نہیں۔ کیا تم اس کی تردید کروگی کہ جب لیگ نے یوم نجات منایا تو راجندر بابو نے کہا لیگ نے جوازامات۔“

”کیا گانگریں حکومت نے مسلمانوں پر ظلم نہیں توڑے _____؟“ چمپا نے بات کائی۔

”یہی عرض کر رہا ہوں _____ راجندر بابو نے کہا کہ لیگ نے جوازامات کانگریں حکومت پر لگائے وہ فیڈرل کورٹ کے سامنے انکو امری اور فیصلے کے لیے رکھے جائیں۔ لیگ نے یہ بھی منظور کر دیا اور کہا کہ یہ معاملہ رائل کمیشن کے سامنے البتہ پیش کیا جا سنتا ہے۔ اس پر بر طانوی حکومت تیار نہ ہوئی _____“

”ہاں، کیونکہ بر طانوی گورنر کو تم لوگوں نے پہلے ہی اپنی طرف ملا لیا تھا _____“

”تمہارا خیال ہے کہ طرطانوی گورنر وفادار مسلمانوں کو چھوڑ کر کانگریں کا طرفدار ہو گیا تھا۔ ہوش کے ناخن لو چمپا باجی۔ ۳۵ کے ایکٹ کے ذریعے ان کو اقلیتوں کے تحفظ کے مخصوص اختیارات دے دیے گئے تھے۔“

”چنانچہ یہ تم مانتے ہو کہ اقلیتوں کا مسئلہ ہندوستان میں موجود ہے۔“

”یقیناً _____“ مال نے گلا صاف کیا، ”لیکن یہاں روں کی طرح ملٹی نیشنل اسٹیٹ بن سکتی ہے۔“

”یہی تو مصیبت ہے کہ تمہارے ساتھ جو بات کروتاں جا کر ماسکو پر ٹوٹے گی۔“ چمپا نے کہا۔

”اور آپ کی تان جا کر کے مدینے پر ٹوٹی ہے۔ ایم کے عہد میں
قردن و سلطی کے مذہبی تصورات لیے پھر رہی ہیں۔“

”دیکھو۔ تم پنڈت نہرو کی کہی ہوئی باتیں نہ دہرایا کرو۔“

”کیوں نہ دہراوں؟ دیکھیے چمپا بابجی ساری باتیں یہ ہے کہ مسلمان سماجی طور
پر پسمند ہے اور مذہب اس کے لیے ایک بہت واضح تصور ہے
انتہائی شخصی اور ذاتی۔ ہندو کے یہاں مذہب ایک سماجی نظام ہے۔

ہزاروں لاکھوں دیوتا ہیں وہ جن کو چاہے مانے جن کو چاہے روکر دے۔ ایک
مخصوص قسم کی علگ نظری ہے، ایک مخصوص قسم کی آزاد خیالی، پھر اس کی انحلل جسیا نے
سانشیفک ہونا سب سے پہلے سیکھا وہ مہندب کے بارے میں جذباتی نہیں۔ اس
کا ذہن انتہائی ریشہ دوامی اور جوڑ توڑ کا ماہر ہے۔ حساب کتاب، جمع تفریق۔ ظاہر
ہے مسلمانوں کے مقابلہ میں وہ کہیں زیادہ چالاک ہے۔ مسلمان بے چارہ خدا
رسول کا عاشق۔ بات بات پر بھرت پر تیار تر کی میں کسی کو چھینک آئی، آپ
بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ افغانستان میں کسی کے پیر میں کانٹا چبھا، یہ بیکل ہو
گئے۔ ہندی ہو کر بھی ہند کانہ ہوا، مگر مصیبت یہ ہے کہ یہاں ابھیری پیا بھی ہیں
محبوب الہی بھی۔ یہاں تاج محل پر بھی بھائی کو بہت ناز ہے کہ ہمارے بادشاہوں
نے بنایا تھا مگر اس اسلامی میں القوامیت کے چکرنے اسے کہیں کانہ رکھا۔“

مال نے چلتے چلتے ایک میز پر سے اٹھا کر پانی کا گلاس پیا۔ ”مسلمانوں کی
ساری تاریخ اٹھا کر دیکھ لو۔“ اس نے تھوڑی دریہ بعد کہنا شروع کیا
”ہمیشہ ملک گیری اور ذاتی اقتدار کے لیے آپس میں اڑ کے۔ شان و شوکت اپنے

یہ زم کی جس قدر شائق یہ قوم ہے میں نے آج تک کہیں نہیں دیکھی۔ بنو امیہ، بن عباس، ایران کی حکومتیں، عثمانی ترک، ہندوستانی مغل، افغان، عرب، مصری سب نے آپس میں کیا کیا خوزیریں جنگیں کی ہیں۔ اس وقت ان کا اسلام کہاں گیا تھا؟ مار اسلام اسلام کی رٹ لگا رکھی ہے۔

”لیکن خافائے راشد کا زمانہ“

”چمپا بابی“ کیوں زخموں پر نمک چھڑکتی ہوا رسول خدا کی آنکھیں بند ہوتے ہی تو تمہاری ملت بیضا نے خانہ جنگی شروع کر دی۔ جنگ جمل بھول گئیں آج تک وہ زخم ہرے ہیں۔ تعصباً اور انفرات۔ تعصباً کے منسلک کو تو تمہارا اسلام بھی حل نہ کر سکا۔ میں لکھنوا شیعہ ہوں، مجھ سے پوچھو شیعہ اور سنی ایک دوسرے سے کس قدر تنفر ہیں۔ نہیں چمپا بابی مجھے مذہب نہیں چاہیے۔ فقہ اور حدیث اور امام غزالی اور ابن خلدون سب ٹھیک ہے مگر اس وقت میرے سامنے دوسرے مسائل ہیں۔ انسان کو اُن چاہیے اور روئی۔ اس کے بعد وہ یقیناً افکار غزلی پر غور کر ستا ہے۔ ”اب وہ پھر پارٹی لائیں چلا رہا تھا۔

مال موجودہ نسل کا نامانندہ اڑ کا تھا: ذہن پرست، باصول، ایمان دار شدید طور پر پر خلوص، تصور پرست۔ چمپا اسے غور سے دیکھتی رہی۔ عامر رضا، جنہوں نے اس سے صرف فرانسیسی پوشل شاعری اور وی آنا کی موسیقی کی باتیں کی تھیں کسی دوسرے دنیا میں نہیں بنتے تھے۔ مال اور گوتم اور ہری شنگر یہ لوگ ان سے کس قدر مختلف کتنے بلند تھے۔

مگر وہ تو گلابوں کی دنیا میں جانا چاہتی تھی، جہاں دیوار کے درختوں میں چھپے

ہوئے کانج میں اور جن میں شوپال کی موسیقی بھجتی ہے۔

”ہماری اڑکیوں اور عورتوں کو سنتیہ گرہ کی تحریک کے زمانے میں جیلوں میں کوڑے لگائے گئے۔“

اس کے کافنوں میں مال کی آورزاںی، وہ جوش کے ساتھ بولے جا رہا تھا:

”ہمارے لیڈروں نے پندرہ پندرہ برس کی قید تھائی کافی۔ تم جو جیل جانے والوں کا مذاق اڑاتی ہو، تو راسو چوڑنگی اور آزادی کے عزیز نہیں؟ عمر عزیز کے ان گنت سال جیل میں کاٹ دینا کسے پسند ہے؟ محض ایک اصول، ایک نظریے کی خاطر ہزاروں لوگوں نے جا کر قید خانے میں چکیاں چیس اور بر طانوی سپسیوں کے ظلم سہے۔ کیا یہ لوگ محض شہرت اور نام و نمود کے بھوکے تھے؟ کیا خالی جذبہ تیست کی بناء پر انہوں نے یہ قربانیاں دیں؟ انسان کو زندگی صرف ایک مرتبہ زندہ رہنے کے ملتی ہے اور اس زندگی کا بیشتر حصہ انہوں نے جیلوں میں گزار دیا۔ ہستقِ خوشی جا کر کال کو ٹھڑیوں بند ہو گئے۔ سیاکی جدوجہد بہت بڑی چیز ہے۔ اس کا مذاق نہ اڑانا۔ اس آگ میں تپ کر جو لوگ نکلتے ہیں وہ کندن کی مانند ہیں۔ جو لوگ آپ کی طرح آرام کر سیوں پر بیٹھ کر ان پر ہستے ہیں اور پھر بھی قوم کی ہمدردی کا دعویٰ کرتے ہیں وقت آنے پر خود ہی معلوم ہو جائے گا کون کتنے پانی میں ہے۔ گھٹیا لوگ اور بڑے انسان سب آپ ہی الگ الگ راستوں پر چلے جائیں گے، تم کو معلوم ہے دہرہ دون جیل میں پنڈت جی کی کوٹھڑی میں سانپ اور بچھو تھے۔ کن کن مصایب کا ان سب نے سامنا کیا، مگر اب بجائے اس کے کہ متعدد ہو کر ہم ایک عظیم طاقت بنتے ہم انگریزوں کے ہاتھوں کٹھ پتی بنے ہوئے ہیں۔ مال کا

چہرہ غصے سے تتما اٹھا۔

”تم بڑے پکے نیشنل سٹ ہو مال؟“ چمپا نے خاف ہو کر پوچھا۔

”ہاں ہر ایماندار اور ضمیر پرست انسان نیشنل سٹ ہو گا۔ کیا وجہ ہے کہ ملک کے اکثر مسلمان انخلکچوں قوم پرست ہیں؟ کیا وہ سب ضمیر فروش ہیں؟ کانگریس نے ان کی رشوت دے رکھی ہے۔ خدا کے غصب سے ڈور چمپا بابا جی اور ایک اور بات۔“ اس نے ٹھیکنے شہلتے رک کر کہا، ”تمہارے نزدیک سیاست صرف شہروں کی سیاست ہے، تم دیہات سے واف نہیں۔ شہروں میں رجعت پسند سرمایہ دار ہیں جو اپنا نظام قائم رکھنے کے لیے فرقہ وارانہ سیاست کا اچھا رہے ہیں۔“ کبھی کسی گاؤں میں گئی ہو؟ اگر ما دھو پور کی ہندوڑ کی بیاہ کر کرن گنج جائے تو ما دھو پور کا مسلمان کسان کبھی کرن گنج میں پانی نہیں پئے گا کیونکہ وہ اس کی جیٹی کی سرال ہے، یہ انسانیت کی اقدار چمپا جی جو نہ ہب اور سیاست سے بلند تر ہیں۔“

اب شام کا اندھیرا اچھا رہا تھا۔ لان پر درخت کے نیچے طاعت پڑھی گوتم اور چند اڑکوں سے با تینی کر رہی تھی، وہ اٹھ کر ان کی طرف آگئی۔ مال کہتا رہا ”ہماری ساری سیاست کی اصل بنیاد مرانعات حاصل کرنے کا مقابلہ تھا۔ مسلمانوں کو اتنی ملازمتیں مانا چاہیں، سکھوں کو اتنی، ہندوؤں کو اتنی۔ مُدل کلاس سیاست۔ مجھے بتاؤ مسلمانوں کی آٹھ کروڑ کی آبادی میں مُدل کلاس اور یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ کتنے ہیں اور کسان اور کارگروں کا تناسب کیا ہے اور ہنریائی نس دی آغا خان کیا ان کسانوں اور کارگروں کی نمائندگی کرتے ہیں؟ ان میں اور احمد آبادیا بمبئی کے کسی دوسرے سیٹھ میں کیا فرق ہے؟ وہ برلا اور ڈالمیا۔“

”افواہ ____“ چمپا نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے ”وہی کمیونسٹ پارٹی کے
گھے پئے دلائل۔“

”تم سے بحث کرنا بالکل بیکار ہے چمپا بابaji۔“ مال نے رنجیدہ ہو کر کہا۔
طاعت اب ان کے ساتھ ساتھ ٹھیل رہی تھی۔ ”تم نے آج کا اخبار پڑھا؟“
”ہاں مجھے معلوم ہے۔“ مال نے پنجی آواز میں جواب دیا۔
”کیا ہوا۔“ چمپا نے پوچھا۔

”میرے بابا“ خان بہادر نواب تلقی رضا بہادر آف کلیان پوریگ میں شامل
ہو گئے ____ یعنی دوسرے الفاظ میں یہ کہا مپ پر لوٹ گئے۔“
”ماما سے مایا ملے کر کر لمبے ہاتھ ____“ طاعت نے کہا۔
”تمسی داس گریب کی کوئی نہ پوچھے بات ____“ مال نے کہنا شروع
کیا۔

”بابا سمجھتے ہیں کانگریس تعلقداروں کو ختم کرنے کے درپے ہے۔ کانگریس
حکومت بننے ہی پھر وہی کھڑاگ شروع ہو جائے گا: زرعی اصلاحات اور یہ اور وہ
انہیں نیشنلزم سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ فیو ڈل اقدار کے آخری رکھوالے
ہیں، مجھے ان سے پوری پوری ہمدردی ہے۔ میں اپنے والد کا نقطہ نظر خوب سمجھتا
ہوں، میں گھر جا کر ان سے بحث نہیں کروں گا مگر مجھے صرف اس کا افسوس ہے کہ
اس سر زمین میں ان کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ وہ ترک وطن کر کے سندھ اور
بلوچستان کو اپنا ملک کیسے سمجھیں گے۔ بابا بولوڑھے آدمی ہیں، میں ان کو اس وقت دل
شکستہ نہیں دیکھنا چاہتا مگر اس وقت تیرمان سے نکل چکا ہو گا۔“

”مال و طینت اتنی بڑی چیز نہیں۔ تصور اصل چیز ہے، اگر وہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان ہی میں مسلمانوں کی بقا ہے تو تم اعتراض کرنے والے کون؟ کیا تم آزادی افکار کے قائل نہیں؟“ چمپا نے جواب دیا۔

”وطن کو پرانے کوٹ کی طرح اتار کر نہیں پہنچنا جاستا۔“ طاعت نے غصے سے کہا۔

”کیا وطن ہے یار! بکواس۔ مسلمان کا وطن سارا جہاں ہے۔“ چمپا نے کہا۔ طاعت اسے غور سے دیکھتی رہی۔ ”بجیا آئیے۔“ اس نے کہا، ”پروفیسر چاء کے لیے بدار ہے ہیں۔“

پروفیسر کے قریب ہی گھاس پر گوتم بیٹھا تھا۔ اس نے اٹھ کر چمپا کو نہستے کیا۔ ”چمپا باجی مسلم لیگی ہو گئی ہیں بڑی بھاری۔ آج لیگ کی طرف سے ایک بیان چھپا ہے کہ ہندوؤں کا سو شل بائیکاٹ کر دیا جائے لہذا کل سے وہ ہماری مخالفوں میں نہیں آئیں گی۔“ مال نے تلخی سے کہا۔

شام کی نیلگوں روشنی میں وہ درختوں کے قمقوں کے نیچے بیٹھے رہے۔ فضا کاغم گہرا ہوتا گیا۔

چمپا چلو، نوبجے سے ریہر سل شروع ہے،“ چھولوں کے پرے سے کسی لڑکی نے پکارا۔

”اچھا۔“ وہ سائیکل سنبھال کر چھائک کی طرف چلی گئی۔ گھاس پر بیٹھے ہوئے لوگ اسے روشن پر سے اُزرتا دیکھتے رہے۔

کیلاش ہوشل میں سالانہ ڈراما تھا۔ لڑکیاں ہنگوں سے تیاری میں جمع تھیں شام کو ہال میں یا گھاس پر ریہر علمیں کی جاتیں۔ موسیقی کمپوز ہوتی۔ ناج کی شق کی جاتی۔ کوٹیو مزے کے ڈیزائن تیار ہوتے۔ اسٹچ کے ڈیکور پر بحث ہوتی۔ فیروز جبیں نہایت تندی سے سب کو پارٹ یاد کرو رہی تھی۔ کمال انارکلی تھی۔ طاعت دلارام، ای مذکور، ایک اور سوانگ، پھر کواڈرینگل میں اسٹچ تیار ہوا۔ وائس چانسلر اور اشاف اگلی قطاروں میں آن کر بیٹھے۔ ریڈ یو اسٹیشن کے آرکیسٹر انے اسٹچ کے پیچے برآمدے میں اپنی جگہیں سنبھالیں۔ اب کسم محل سرا میں کنزوں کے ساتھ بیٹھی کارہی تھی۔

لب جو ہو فرش آب ہو، شب ماہ ہو، بادہ ناب ہو
ای مذدر پچے میں کھڑی کہہ رہی تھی۔ راوی کے نوجوان ملاح
انارکلی کہہ رہی تھی۔ ہندوستان کا شہزادہ اور کنیز سے
محبت کیسی بھی کی بات یہ سب خواب کی طرح گزرتا گیا،
پھر پر دھگرا اور لوگ با تین کرتے باہر نکلے۔

عامر رضا نے چمپا سے کہا: ”ڈائریکٹر صاحب آپ نے مال کر دیا۔“

مال نے کہا: ”چمپا باجی بس سوانگ رچتی رہے۔“ انارکلی سے بہتر کوئی موضوع نہ مل سکا آپ کو؟ رومان پرستی کی بھی حد ہونی چاہئے۔ ”پھر وہ مجھے میں غائب ہو گیا۔“

گوتم نے قریب آ کر کہا: ”چمپا باجی کیا آپ مال سے خفا ہیں۔ اس روز پروفیسر کے یہاں مال نے آپ سے کافی سخت باتیں کہیں، میں اس کی طرف سے آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ آپ اتنی خاموش کیوں ہیں؟ آپ بُشی ہوئی اچھی لگتی ہیں۔ زندگی میں اتنی اداکی ہے، اس اداکی میں اضافہ نہ کیجئے۔“

”دُنہیں۔“ اس نے گوتم کو جواب دیا، میں دراصل آج کل جینے کے مختلف روپے استاذی کر رہی ہوں۔

”میں اس مسئلے پر کچھ روشنی ڈالوں۔“ طاعت نے بیٹاشت سے قریب آ کر کہا، وہ ابھی تک دلارام کا لباس پہنچی۔

”آج میری اس قدر تعریفیں ہوئی ہیں تو میں نے سوچا کہ میں کس طرح کا ایکپر پشن اپنے چہرے پر قائم رکھوں: وقار بیٹاشت، سنجید گی صیبیت یہ ہے کہ اگر انکسار برتو تو سمجھا جاتا ہے یہ احساس کمتری ہے اور اگر انکسار نہ برتا جائے تو اسے غور پر محمول کیا جاتا ہے ہر ایک سے اچھی طرح باتیں کرو تو لوگ کہتے ہیں عجب چیلی اڑکی ہے رکھ رکھاؤ سے رہو تو بوریا بد دماغ سمجھا جاتا ہے یا یہ کہ بے چاری چار ڈمیوں سے بات کرنے میں گھبرا جاتی ہے، کونے گھوس ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ انسان جیسا ہے اس کو ویسا ہی رہنا چاہیے۔ کبھی ایسی چیزوں کی تمنا نہ کرو جو بس سے باہر ہوں۔ مثال کے طور پر بھائی گوتم کو دیکھیے۔ ان سے باتیں سمجھنے تو لگتا ہے ان لاطون کے ساتھ مکالمہ ادا کیا جا رہا ہے۔ یا خلیل جبران کا المصطفیٰ دیواروں کے باغ میں مصروف گفتگو ہے۔ نہیں چمپا باجی۔ جینے کے روپے کے

متعلق نہ سوچئے۔ ”پھر وہ بھی چھلاؤے کی طرح جمیع میں غائب ہو گئی۔

”گوتم نے نہ کر چمپا کو دیکھا۔ ”کس قدر راتی ہے یہ لڑکی _____

”مجھے اس پر رشک آتا ہے۔ اس کے ذہن میں کوئی ابھن نہیں۔ ” چمپا نے کہا۔

”ابھنوں سے ہم سب خود کو بچاسکتے ہیں۔ ”

”واقعی؟“

”ہاں چمپا بابaji۔ ”

”تم کبھی ابھنوں سے دوچار نہیں ہوئے۔ ”

”شاید _____ نہیں۔ ”

سرک پر مورانی کی شہنیاں جھکی ہوتی تھیں۔ ہواں کے راگ بہر سریلے تھے وہ دھلتا پھانک کی پلیا کے پاس ٹھٹھک گئی۔ ”نہیں گوتم، میں مال سے خفائنیں ہوں، مجھے کسی سے بھی خفا ہونے کا حق نہیں پہنچتا۔ ”

”آپ درجہ شہادت حاصل کرنے والی ہیں! یہ مظلوموں والا لاجہ کیوں؟“

”تم _____ تم لوگ بڑے کہیئے ہو،“ اس نے تلنگنی سے کہا۔

”ہم لوگ محض بے حد پر خلوص ہیں، مگر شاید خلوص کی ایک قسم اور بھی ہوتی ہے اور وہ بھیا صاحب کے پاس موجود ہے _____“

”تم _____ تم ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو _____ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں ایک طویل شفاف گیلری میں کھڑی ہوں اور میرے سامنے سے ایک کے بعد ایک فرائٹ سے پر دے انجھتے چلے جا رہے ہیں _____ وہ پر دے جن

پر خوبصورت تصویر یہ بنی ہیں اور مناظر۔ اب آخر صرف ایک سیاہ پرده باقی رہ گیا ہے۔“

”چمپا باجی، آپ کا پرائم بے حد ذاتی ہے۔ آپ کو بھیا صاحب سے بہت محبت ہے، بس ساری بات یہ ہے، باقی سب فروعات ہے _____ اور آپ کا دوسرا پرائم الفاظ ہیں۔“ گوت نے حسب معمول پہنچے ہوئے بزرگ کی طرح انکشاف کیا۔

انفرت سے چمپا نے اسے دیکھا: ”الفاظ“
”ہاں۔ صریحًا۔ میں نے یہی لفظ استعمال کیا تھا۔“

”اور جو کچھ ہے وہ بے معنی ہے؟“

”کوئی چیز بے معنی نہیں۔ خود اس لفظ بے معنی کے بھی معنی موجود ہیں۔“
”طاعت ٹھیک کہتی تھی، تم بھی پوز کرتے ہو۔ تم سے باتمیں کرو تو لگتا ہے غلیل جبران کے المصطفیٰ سے گفتگو کی جاری ہے۔“

”چمپا باجی۔“ وہ گھبرا گیا۔ ”اللہ خفانہ ہو جینے _____ چلنے مجھے اپنے گھر لے جا کر کافی پلا یئے، وہاں ہم ان مسائل پر مزید روشنی ڈالیں گے _____ اور اللہ افسردا نہ ہو جینے۔ انسان صرف ایک بار پیدا ہوتا ہے۔ اگلے جنم کی کسے خبر ہے _____ آئیں _____“

چمپا چاند باغ کی ایک پہاڑی پر ہر سیتا ڈکٹ کے ساتھ کانج کے پیچھے ایک چھوٹی سی کانج میں رہتی تھی، وہاں پہنچ کر وہ دونوں برآمدے میں بینہ گئے۔ سامنے امرودوں کے اندر ہرے باغ میں رکھوا لا سلوں کو اڑانے کے لیے آوازیں لگا رہا تھا۔

جورات کا بیسرا لینے کے لیے ٹھنڈیوں پر آن بیٹھے تھے۔

قریب ایک اور پروفیسر کوٹھی میں پیانونچ رہا تھا۔ چاند سوئمنگ پول کی لہروں میں تیرا کیا۔

گوتم بید کی کرسی پر بیٹھا کیلے کے جھنڈ کو دیکھتا رہا۔ چمپا کافی بنا کر لائی اور اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”چمپا بابaji۔ آپ بہت گریٹ آدمی ہیں خدا کی قسم۔“

”واقعی؟“

”چمپا بابaji۔ ایک بات بتلا یعنی۔“

”پوچھو۔“

”آپ بھی صاحب کو کتنے عرصے سے جانتی ہیں۔“

”کئی سال سے۔“

”اور اتنے عرصے آپ نے کیا کیا؟“

”پڑھا اور کیا کیا!“

”اس کے بعد؟“

”اور پڑھا۔“

”اس کے بعد؟“

”بس پڑھتی چلی گئی۔“ چمپا نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

”اور بھی صاحب کو اتنے عرصے سے برداشت کر رہی ہیں؟ جب پہلے ملی ہوں گی تو سترہ اٹھارہ سال کی رہی ہوں گی۔ ان کا خیال آپ کے لیے ایک بڑی

ریکسانہ عادت میں شامل ہو چکا ہے گو آپ خود رئیس نہیں ہیں۔ میں آپ کو ایک بات بتاؤں۔ آپ ذرا غور کر تیں تو معلوم ہوتا کہ آپ کا عشق _____ ”واہیات باتیں مت کرو۔“

”واہیات۔ غصب خدا کا آپ تو بڑی سخت بلا اسنونگ نہیں۔ ارے عشق میں کیا خرابی ہے؟ بڑی عمدہ چیز ہے، میں خود اس میں اکثر بتا ہو جایا کرتا ہوں مگر متوسط طبقے کی لڑکیوں کا قاعدہ ہے کہ اس طرح کے الفاظ کو بہت برا سمجھتی ہیں۔ چمپا باجی سوری۔ اتنا سہانا سے ہے، مجھے چاہتے تھا کہ آپ سے بجو اکستانتار پر گت باگی شری، تین تال اور یہاں میں نے آپ کے پر ابھر کا تجزیہ شروع کر دیا۔“

”یہ دوسروں کے پر ابھر کا تجزیہ کنا بھی بڑا زبردست ریکٹ ہے اور آپ بھولتے ہیں کہ آپ کے جیسے طالب علموں کو روز کانج میں پڑھاتی ہوں۔“

”میں جانتا تھا کہ آپ یہی کہیں گی۔ ہماری ساری زندگی ایک سے پڑائے جملے دہراتے گزر جاتی ہے۔“ وہ منہ لکا کر در پچ سے باہر دیکھنے لگا۔ ”میں یہ بھی جانتا ہوں کہ رومنیذک ہونے کے لیے آپ کے بیا صاحب کون سے میزازم استعمال کرتے ہوں گے، کون سے جملے دہراتے ہوں گے۔ سنا ہے، فرنچ بہت فرست کلاس بولتے ہیں۔“

”لیکن آخر تم بھیا صاحب سے اتنا چڑتے کیوں ہو؟“ چمپا نے کہا وہ دھڑا جھینپ گیا۔ اس قدر جھینیا کہ اس کا چہرہ ہر خ ہو گیا۔

”مجھے چڑ نے دیجئے، آپ سے مطلب؟“ وہ اپنے جارحانہ حربوں پر اتر آیا۔

اتنا مضبوط انسان اور اس قدر کمزور تھا، اچھا نے حیرت سے سوچا۔

”مطلوب یہ،“ اچھا نے کہا، ”کہ ہمارے گروپ کے سب لوگ بھیا صاحب کو بڑا بھائی سمجھ کر ان کی عزت کرتے ہیں۔ کم از کم تمہیں اس کا خیال تو کرنا چاہیے۔ تمیز بھی کوئی چیز ہے، یہاں آئے ہو تو ذرا تمیز بھی سیکھو۔ یہ کیا ہر سے بلز، دنگا، فوجداری۔ یہ چند و خانہ ہی کیا کم تھا کہ اوپر سے تم بھی نازل ہو گئے۔“

”بھیا صاحب سے اگر آپ بیاہ فرمائی ہیں تو یہ دوسری بات ہے۔ آپ کا فرض ہے کہ ان کو آسمان پر چڑھادیں، ہر ہندوستانی لڑکی یہی کرتی ہے۔“

”میں نے کب دعویٰ کیا تھا کہ میں امریکن لڑکی ہوں؟ اور دوسری بات یہ کہ۔“

”دوسری بات یہ ہے چھپا باجی کہ آپ ان سے بیاہ کرتی عجب مسخری لگیں گی۔ اپی کی اور بات تھی توہ تو پیدا ہی اسی لیے ہوئی تھیں، مگر آپ حد ہے۔“

اب اچھا جھینپھنی۔ ”میں آپ سے رائے نہیں لے رہی ہوں۔“ اس نے فی الفور بزرگی طاری کر لی۔

”میں رائے کب دے رہا ہوں؟ اگر آپ میں اتنی عقل ہوتی کہ مجھ سے رائے لیں تو یہ نوبت ہی کیوں آتی، مگر آپ ہیں کہ آہ اس بظاہر سمجھ دار تعلیم یا فتحہ لڑکی کو دیکھو۔“ اس نے ٹھیل ٹھیل کر تھیڑی یکل انداز میں کہنا شروع کیا: ”یہ معاشیات کی استاد، ڈاکٹر لفکس کی طالب علم، برس سے کس مصیبت میں گرفتار ہے اے رومانیت کی شکار نہ دان کنیا۔“

کمرے کے وسط میں کھڑا ہو کر وہ دہاڑا۔

”گوتم تم بالکل دیوانے ہو۔“ چمپا نے محظوظ ہو کر کہا۔

”اب یعنی آپ مجھے میری دیدی یا موسیٰ کی طرح پچکارا بھی کریں گی۔ میں کہتا ہوں، یہ تک کیا ہے؟ یعنی غصب خدا کا جو شخص پابندی کے ساتھ کلب جا کر اولڈ والنس ناچے پکنکوں اور پارٹیوں میں کانج کی لوڈیوں کی مووی سخنپتیا پھرے، خود لوڈیوں کی طرح حسین ہوا اور قیامت یہ کہ اپنے حسن پر نازاں بھی ہو۔ اس کی آپ پسند فرماتی ہیں، اگر آپ کو عشق ہی کرنا منظور ہے تو مجھ سے ہی کر ڈالیے یا مال اور ہری شکر ہی میں کیا برائی تھی۔ ویسے ان کے علاوہ ہزاروں ہیں گو یہ علیحدہ بات ہے کہ میں بے حد منفرد ہستی ہوں۔“ اس نے ذرا انکسار سے اضافہ کیا، پھر دوسرے لمحے اس نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ ”میں چمپا باجی مصیبت یہ ہے کہ آپ لوگ روایتوں پر جان دیتے ہیں۔ بس ایک دیومالا کا ہوتا ضروری ہے۔ آپ کی روایتوں پر جان دیتے ہیں۔ بس ایک دیومالا کا ہوتا ضروری ہے۔ آپ کی روایت، بھیا صاحب کے گلیمر کی روایت، گلفشاں اور سنگھائرے والی کوٹھی کی روایت، دلکشی، کشش، جذب دل۔“ مگر خالی دلکشی کا نتیجہ کیا ہے؟ کوئی تخلیقی کام ہی نہیں کرتیں۔“

”پڑھاتی جو ہوں۔“ چمپا نے خود کو اس قدر بے بس محسوس کیا۔ ایسا غیر متوقع، ایسا بے رحم حملہ اچانک اس پر کیا گیا تھا۔ اس کا زرہ بکترنٹ کرنکڑے نکڑے ہو گیا، وہ جو برسوں سے اپنے آپ کو اپنے جذبات اور احساسات کو بے حد اہم سمجھتی آئی تھی، پل کی پل میں وہ خود کو بے حد قابلِ افسوس معلوم ہوئی۔ ”اب ہر ایک تو کلا کار نہیں بن ستا،“ اس نے با آواز باند کہا۔

”کلا کار نہ بننے۔ آج کل کلا کاروں کی تو فوج کی فوج ہر جگہ گھوم رہی ہے۔ کوئی بندیا دی کام سمجھنے۔ اتنا کچھ کرنے کو پڑا ہے۔“ اس نے چاروں اور نظر ڈال کر تھکی ہوئی سانس لی۔ ”آپ کو نظر نہیں آتا؟“

”نظر آتا ہے،“ چھپا نے کہا، ”لیکن زندہ بھی تو رہنا ہے۔ ملازمت کرتی ہوں مسلم اسکول میں ت و تین سورو پے صینے کے ملتے ہیں، میرے لبا بہت معمولی حیثیت کے وکیل ہیں، میں تم رمیس زادوں کی طرح خالی غربت کی تھیوری سے واقف نہیں، مجھے تنگ دتی کی حقیقت معلوم ہے۔“

کسی اور موقعے پر اسے یہ گفتگو کرتے شرم آتی کیونکہ وہ خالص سفید پوش گھرانے سے تعلق رکھتی تھی لیکن گوتم اس کے سامنے فادر کنفیر کی طرح بیٹھا تھا۔ اس سے کون بات چھپائی جاسکتی تھی!

”اور بھیا صاحب سے بیاہ ہو گیا تو آپ بھی کلب جا کر اولڈ و اسٹس نا جیس گی اور رائڈنگ کے لیے جائیں گی؟“ اس نے معصومیت سے پوچھا۔

وکیا میں سرخ جھنڈا لے کر سڑک پر دوڑ پڑوں، کس قدر ایلی منظری با تیں کرتے ہو، جس طرح کی بحث تم مجھ سے کر رہے ہو۔ ایسی ہی بحثیں کرتے اسی لکھنو میں مجھے زمانہ گز رگیا ہے۔“

”تو گویا شادی آپ کے اقتصادی مسائل کا حل ہے۔ شادی ہندوستان کی ہر لڑکی کے ذاتی اور عمرانی پر ابھم کا حل تصور کیا جاتا ہے۔ چھپا بیگم میں تم کو اوروں سے مختلف سمجھتا تھا۔“

”انڈر گریجویٹ با تیں مت کرو۔“ چھپا نے غصے سے کہا۔

”اندر گریجو یہٹ آپ کے یہاں بڑا بھاری طعنہ ہے۔ صحیک ہے، لیکن اس سے یہ کب ثابت ہوتا ہے کہ آپ بھی صاحب سے لوگائے تباہی رہیں۔ بتائیے تو آپ کو یہ صاحبزادے اس قدر پسند کیوں ہیں؟“

”بتائیں۔“ اس نے کم عمر لڑکیوں کی طرح جھینپ کر کہا اور اسے سخت کوفت ہوئی۔ اسے اپنی زندگی میں آج تک اتنی شرمندگی نہیں اٹھانا پڑی تھی۔

”اچھا، آپ کو اچھی شکل میں پسند آتی ہیں؟ شاعرانہ طبیعت ہے آپ کی!“ پھر وہ ٹہلتا ہوا ہیئت ریک کے آئینے کے پاس چلا گیا اور بخوبی اٹھا کر غور سے اپنا چہرہ دیکھنے لگے۔ ”مجھ سے بھی کوئی لڑکی اتنا ہی اتم عشق کر سکے گی؟ اگر دیکھا جائے تو میں ایسا بد صورت نہیں۔“

”شاہنامہ سے اتم عشق نہیں کرتی؟“

اب گوتم اپنی جگہ بھونچ کا کھڑا رہ گیا۔ چمپا کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس کا زرہ بکتر ٹوٹ رہا ہے۔

”گوتم بہادر، تم بھی شیشے کے گھروں میں رہتے ہو، دوسروں پر پتھر پھینکنے سے پہلے یہ یاد رکھا کرو۔“

”تم کو شاہنامہ کے متعلق کیا معلوم ہے؟“

”تم اس کو چاہتے نہیں ہو؟ جو کوئی بھی وہ ہے، جو تمہارے کزن کی بیوی ہے اور تم سے پانچ سال بڑی۔ ہم کس کو ناصح سمجھیں اور خود کس کو نصیحت کریں؟ اور اب تم اس اپنی شاہنامہ نیلمبر کو بھولتے بھی جا رہے ہو۔ بہت دنوں سے تم نے اس کو خلط لکھ کر یہاں کی روپورٹ نہیں بھیجی، وہ تمہاری ذہنی رفیق ہے۔ تم اس سے شادی نہیں کر

سکتے۔ تم کسی سے بھی شادی نہیں کر سکو گے۔ نر ملے سے بھی نہیں۔ گوتم بہادر یہ بڑے ادق معاملات ہیں۔ یہاں تمہارے نظر یہ نہیں چل سکتے۔ میں بھیا صاحب کو پسند کرتی ہوں۔ ان سے میری کوئی ڈمنی رفاقت نہیں مگر گوتم بہادر مجھے تو تم بھی پسند ہو۔ بتاؤ اس کا کیا کیا جائے؟ انسانی رشتے بڑے انوکھے ہوتے ہیں۔ مجھے رفتہ رفتہ تم بھی اچھے لگ رہے ہو۔ کیا میں ذہر تا فلر ہوں؟ ہرگز نہیں۔ ذرا باہر جا کر پوچھو میری کس قدر عمدہ روپ ٹیشن ہے۔ مجھے دبی کہا جاتا ہے۔۔۔ یقیناً میری طبیعت میں آوارگی نہیں مگر انسانوں کو پسند کرنے کی اہمیت رکھتی ہوں۔ اب جو میں نے اتنا بڑا کنفیشنس کیا تو اس لیے کہ تمہارا شیشے کا گھر بھی ٹوٹ چکا ہے۔ اسے تم نے افسوس خود ہی مسما کر دیا۔ کچھ دن اور ثابت رہ لینے دیتے اسے۔ بڑا خوبصورت تھا۔ بلور کا مندر جس کے اندر گوتم سدھارتھ کی موتی بر اجھان تھی۔ سارنا تھے واقفیت ہے؟ سارنا تھے میری زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ میں کاشی میں پیدا ہوئی تھی۔ اس نے ادا کی سے بات ختم کی۔

اندھیرے میں وہ جس کشتنی پر سوار تھا وہ کشتنی طوفانی ریلے کے ساتھ کہاں سے کہاں پہنچ گئی، وہ در تپے میں چپ چاپ کھڑا رہا۔

چمپا کو اس پر بڑا ترس آیا۔ کیسا پیارالڑ کا تھا، اس میں ہری شنکر اور مال کی کس قدر مشابہت تھی، ان ہی کا جیسا سنجیدہ اور شیطان۔ یہ دونوں بھی کہاں سے ڈھونڈ کر اپنے اپنے جیسے کروک دستیاب کر لاتے تھے۔ اسی کو دیکھو۔ جنے کہاں سے بہتا بہاتا آنکلا۔ یا تھا کسی دلیں سے اک نہس بے چارہ۔ سلسلہ روز شب نقش گر حادثات۔۔۔ نقش گر حادثات۔۔۔ نقش گر۔۔۔ وہ اپنے

ذہن کو خالی کر کے بہت سی بے ربط باتیں سوچتی رہی تاکہ اس جذباتی لینڈ سائیڈ کو نظر انداز کر سکے۔

”تم کو شانتا کے متعلق کیا معلوم ہے؟“ گوم نے دریچے میں کھڑے کھڑے غرا کر پوچھا، وہ اس سے لٹر رہا تھا، یعنی اتنا زدیک آپ کا تھا کہ اسے ڈانے، اسے برا بھلا کہے اور اس سے لڑے، اس پر تنقید کرے۔ یگانگت کے اس احساس نے چمپا کو اور اداس کر دیا۔

”گوم!“ اس نے کہا، ”اس خوفناک، پٹے ہوئے جملے کو معاف کرنا مگر یہ کہ ہم سب کھلی ہوئی کتابیں ہیں۔ ہم میں سے کسی میں کوئی اسرار نہیں۔ تم مجھ سے کس قدر واقف ہو چکے ہو۔ ہر انسان بے حد exposed ہے۔ تیز روشنی میں ہے وہ نیہم تاریکی، وہ دھنڈ لکا تم کو کہیں نہ ملے گا۔ جس میں جا کر بالآخر تم خود کو چھپا سکو۔ جب میں تم کو دیکھتی ہوں تو مجھے لگتا ہے میں بھی اسی تیز روشنی میں کھڑی ہوں اور تم مجھ کو آرپا ردیکھ رہے ہو لیکن میں تم کو خود آرپا ردیکھ رہی ہوں، اسی لیے مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے۔“

”آرپا ردیکھ رہا ہوں ۔۔۔ چمپا الفاظ کو ختم کرو ۔۔۔ الفاظ میں کھا جائیں گے۔“

”الفاظ کو ختم کرو مگر معنی کے معنی موجود ہیں گے۔ بتاؤ ہم کیا کر سکتے ہیں۔“ چمپا نے بڑے بڑے کہا۔

بھیا صاحب کے لاشور کا حال تو اللہ بہتر جانتا ہوگا، البتہ یہ ضرور ہے کہ جب تک وہ اپنی رخصت کے زمانے میں لکھنؤ میں رہے انہوں نے بالکل موں بر ت رکھلیا۔ پہلے ہی وہ کون سی بات کر کے دیتے تھے مگر اب ان کی خاموشی کو مثال کے طور پر پیش کیا جاتا۔

”بھیا صاحب کو خاموشی میں بڑے افسانے چھپے ہوئے ہیں۔“ حمید بانو نے ایک روز انکشاف کیا۔

”واہ کیا بات ہے۔ افسانے نہیں جوتا چھپا ہوا ہے۔ لا حول ولا قوۃ، طاعت نے غصے سے جواب دیا۔ اس بورڑوارو مانیت نے ہر طرف اور ہم مچار کھاتھا، خود حمید بانوان دنوں بڑے زوروں پر شاعری کر رہی تھی۔ موضوع بخشن ایک بہم سا اور اس قدر مثالی کر دار تھا جو شاید یونانی دیومالا کے لیے بھی تخلیق نہ کیا ہوگا۔

”ہمیں اس بورڑوارو ذہنیت کے خلاف سب سے پہلے جہاد کرنا ہے۔ جا گیردارانہ سماج نے جس طرح ذہنوں کی تشکیل کی۔“ طاعت نے نرملا سے کہنا شروع کیا۔

”اور ذرا سنا۔ قسم خدا کی۔ دل چاہتا ہے ان سب سے ایک پندرہ دن سڑکیں کٹوائی جائیں تو یہ ساری افسانویت تشریف لے جائے۔ ساتھ نے یہ بھیا صاحب جو ہیں ہمارے مشہور و معروف۔ یہ گوتم سے جلتے ہیں۔“ طاعت نے ایک روز نرملا کو خبر دی۔

”گوتم سے ہائے رے۔ یہ تو بڑا طینہ ہے۔ کون جلنے گا اس بے چارے سے۔ اس قدر تو وہ Defenceless ہے۔“

”اے اپنے بچاؤ کی ضرورت ہی نہیں۔“ طاعت نے کہا، ”ہاں ہاں اور کیا مطلب یہ کہ وہ تو حد ہے بھی۔“

ٹھگوں کی منڈلی کی مانندان سب کو اپنی منڈلی سے شدکت کی وفاداری تھی۔ جو اس میں شامل ہوا باقی سب اس پر جان چھڑ کنے کو تیار۔

”مگر کیا چمپا بابی تو کہیں۔“ نرملانے دفعائی سوچ کر کہا۔ ”بہشت ایسی بچپنے کی باتیں مت کرو۔“

”اس میں بچپنا کیا ہے۔ وقت کی بات ہوتی ہے۔“ نرملانے بے حد بزرگی سے کہا۔

”غلط۔“ طاعت نے پر زوراً حتیاج کیا، ”چمپا بابی اب ایسی بھی ام میچور نہیں۔ اچھا تم گوتم سے کر سکتی ہو عشق؟“ اس نے خوفناک طریقے سے پوچھا۔ ”گوتم سے؟ حد ہو گئی، اتنی جان پہچان کے بعد اب اس کی گنجائش ہی نہیں رہتی عشق کرنے کے لئے میری جان تھوڑا سا اسرار چاہتے۔“

”اور اسی اسرار اور دھنڈ لکھ کے خلاف ہم لوگ جہاد کرنے والے ہیں۔“ طاعت نے کہا۔ ”اور کیا۔“ نرملانے صاد کیا۔

”دراصل چمپا بابی کے اس مسلسل عشق نے ہم سب کی سائیکلوجی خراب کر دی ہے۔ غضب خدا کا۔ جب سے وہ یہاں آئی ہیں یاد ہے ہم لوگ فرست ایر میں تھے۔“ تب سے یہ مسلسلہ چل رہا ہے۔ کس قدر تحریڑ کلاس بات۔“

”بے حد تحریڑ کلاس۔“ نرملانے دوبارہ صاد کیا۔

”اور سمجھ میں نہیں آتا کہ جب بھیا صاحب اتنے مصر ہیں تو یہ ان سے کر کیوں
نہیں لیتیں شادی۔“

شام کا اندر ہیرا بہت جلد چھا گیا۔ ندی کے کنارے مندر میں چراغ جل اٹھے
تھے۔ کشتی میں بیٹھا کوئی آرزو کی غزل گاتا جا رہا تھا۔ طاعت نے غور سے سننا چاہا
لیکن الفاظ سمجھ میں نہ آئے مگر ایک بات سمجھ میں آگئی۔ دور گیت کایا جا رہا ہوا اور
فاسلے کی وجہ سے اس گیت کے الفاظ سمجھ میں نہ آئیں تو کیسا لگتا ہے وہ سیرھیوں پر
سے اٹھ کر اندر آگئی۔ ”آڈرپ چال کھیلیں۔“ اس نے ہری شنکر سے کہا۔

”بھیا صاحب ابھی کلب میں ملے تھے۔“ اس نے صوفے پر سے اٹھتے
ہوئے بتایا۔ ”پھر وہی قصہ۔“ طاعت نے بور ہو کر سوچا۔

”وہ ہم سے خفا ہیں کہ ہم نے گوتم کو اتنا افت کیوں دے رکھا ہے، ہر سے
یہاں گھسارتا ہے۔“

”ماشاء اللہ سے۔“ طاعت نے کہا، ”کیا یہ ہمارے گارجیں ہیں۔“

”اب بہر حال _____ بڑے بھائی تو ہیں۔“ ہری شنکر نے طرف داری
کرنا چاہی۔ وفاداریوں کی کش مکش اس کے سامنے تھی۔ بھیا سے وفاداری، گوتم
نیلمبر سے وفاداری۔ غریب شنکر سر یو استو اکرے تو کیا کرے۔

”اور چمپا باجی کہاں ہیں۔“

”وہ تو کل سے ہسری کا نگریں کے لیے الہ آبادی گئی ہوئی ہیں۔“

اتنے میں سانیکل آن کر کی اور گوتم نیلمبر آموجود ہوا۔

”چمپا نہیں ہیں؟“ اس نے آتے کے ساتھی سوال کیا۔

”نہیں، مگر ہم لوگ تو موجود ہیں ۔۔۔ آؤ بیٹھو۔“

”یہ اطلاع دینے آیا تھا کہ خاکسار کا آب و دانہ یہاں سے اٹھ گیا۔“

”اب کہاں جاتے ہو؟“ طاعت نے پوچھا۔

”یہی ذرا ولایت تک۔ اخبار بھیج رہا ہے۔ یہ سوچتا ہوں دو تین سال اگر وہاں لک گیا تو ساتھ پچھہ پڑھ بھی لوں۔ بہت وقت بر باد کیا ہے۔“

”یہی ذرا ولایت تک۔“ طاعت نے نقل اتنا ری۔ ”کس قدر کار عرب ڈال رہے ہیں جیسے ہم لوگ تو ولایت کبھی جاہی نہیں سکتے۔ چلو تم، ہم سب آتے ہیں پچھے پچھے ۔۔۔“

”کیا وہاں بھی منڈلی سے چھکا رہیں ملے گا، اگر یہ بات ہے تو ولایت کا سفر منسوخ، بندہ جاپان کا رخ کرے گا۔“

”ہم جاپان بھی آئیں گے۔“

”قصہ مختصر یہ کہ اب فرار حاصل کرنا مشکل ہے!“

”ظاہر ہے، پہلے ہی تمہاری شامت آئی تھی تو شہر کا رخ تم نے کیا، اب بھگتو۔“

”ذرا چمپا کو بھی خدا حافظ کہہ لیتا مگر وہ حضرت چھلاؤے کی طرح غائب ہو جاتی ہیں۔“

”ارے تم پیرس ہی تو جا رہے ہو، تمہارا دیہانت تو نہیں ہو رہا پھر مل لینا ۔۔۔ شکر نے کہا۔“

”ہشتری کا نگر لیں کب ختم ہو رہی ہے۔“

”ہو جائے گی ختم ہفتے بھر میں، مگر اس کے بعد دہرات ہے، وہ سیدھی بنا رس چلی۔“

جائیں گی۔“

”یہ ہشتری کا نگریسون میں جانے لگی ہیں؟“

”اور کیا۔ اتنی قابل جو ہیں۔“

”یار بڑا افسوس ہو رہا ہے واقعی کہ تم جا رہے ہو۔“ ہری شنکر نے کہا۔

”ہاں سیار افسوس تو ہونا ہی چاہتے،“ میں اس قدر باغ و بہار آدمی تھا۔“

”طاعت ان دونوں کو با تینیں کرتا چھوڑ کر اندر نر ملکے پاس چلی گئی۔

”گرو جا رہا یہ۔“ ”اس نے کہا۔

”میں نے سنا ابھی۔“ وہ رورہی تھی۔ طاعت حیران رہ گئی۔

”اری کس قدر مہا بیوقوف لڑکی ہے۔ روتنی کیوں ہے؟ شادی کر کے تو بھی ساتھ چلی جا۔ تیر تو اس کے لیے جانے کب کا پیغام جا چکا ہے۔“

”وہ بھلا مجھ سے کرے گا شادی۔ چمپا باجی کا دم بھرتا ہے۔ عمر بھر میرا مقابلہ ان سے کرتا رہے گا۔ میں چمپا باجی کی پر چھا میں بن کر جیوں گی؟“

”چمپا باجی۔ چمپا باجی تم سے زیادہ براؤں ہو گا؟ اب جانے تم اور کس کس کی قسمت بر باد کرو گی۔“ طاعت دلیز پر اکڑوں بیٹھ گئی۔ ”مت روائے مہا بیوقوف۔“ اس نے روندھی آواز سے کہنا چاہا۔ برآمدے میں سے گوتم اور شنکر کے قہقہوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

طاعت چمپا سے اس روز سے زیادہ متنفر کبھی نہیں ہوئی۔

یہ گوگل بے حد خوبصورت جگہ ہے مدهوماتی ہوا میں جھوٹی ہے پروائی کے
جھوٹکے بچوں کی طرح کنج میں بلکاریاں بھرتے پھرتے ہیں۔ چپول ماں کی سوچ
کی طرح خوبصورت ہیں۔ یہ گوگل، یہ منظر کس کے جلوے کا عکس ہے؟ تمہارے
ماتھے کا تلک آسمان میں ڈوبتے سورج کے مانند جنمگاتا ہے۔ بل اس نے کہا تھا اور
میں، کمزور عورت، مجھے اپنی طاقت کا احساس ہوا۔ زمین خاموش ہے۔ ساری
کائنات جیسے دل ہی دل میں آہستہ آہستہ دعا مانگ رہی ہے۔ لڑکیاں گھاث پر
پانی پھینک رہی ہیں۔ ان میں سے ایک لڑکی چلا اٹھتی ہے: ہری _____!
ہری _____!! ایک لڑکی رورہی ہے: گوپala _____ وہ کہتی ہے۔ زندگی
میں اس کی وجہ سے راحت ہے، زندگی میں اس کی وجہ سے اتحاد دکھے ہے۔

ورندا بن میرے انگ میں رچ گیا ہے۔ صبح سوریے منڈپ پر رکھی ہوئی
گاگریں دھنڈ لئے میں جھلماتی ہیں۔ گایوں کی گھنٹیوں کی آواز۔ بہنگھاس کی گرم
گرم مہک۔ دودھ کے سفید جھاگ۔ جنگل کی ہریالی۔ میری آتما چین سے بھر گئی
ہے۔ رات کو ستارے ورندا بن پر جھک کر اسی چین کا جاپ کرتے ہیں۔ پرندوں
کے پروں کی مدھم سرسراتی آواز اوم اوم کا کیرتن کر رہی ہے۔ میرے اندر سکون
لہریں مار رہا ہے، جیسے چاندنی کی لہریں جمنا پر پھیل جاتی ہیں۔ رنگ _____ روشنی
موسیقی، کرشنا! کرشنا، موہن، ہری، مندالله، کانہا _____ اس کا ہر نام اس
الوہی راگ کے نئے سر کی طرح بجتا چلا جا رہا ہے، وہی اس کو جان سکتے ہیں جو اس
سے محبت کرتے ہیں۔

اور یہا کیک شہری موسیقی کی بوچھاڑ میرے کانوں پر آن گری جیسے ہر سر کے

کنارے ایک ستارہ جل رہا ہوا اور پھر یہ پھوار تیز رنگوں والی دھنک میں تبدیل ہو گئی اور اس کی تیز جگہ گاہٹ کی تاب نہ لا کر میں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے مجھے پرانہ چلا کہ میں موسیقی کو سن رہی ہوں یاد کیجھ رہی ہوں۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ سماں گی کا مطلب کیا ہے، وہ لمحہ جب روح پرم آتما کے رو برو کھڑی ہو کر کہتی ہے یہ میں ہوں۔

کائنات گہری نیلی روشنی میں تیر رہی ہے۔ زمین، آسمان، خلاء اوم کی
سمناہٹ سے گونج رہا ہے شرمیلا؟

میرا نام اب شر میلائیں۔ میں بھی کر شنا ہوں۔ ہر شے کر شنا ہے۔

میرے سامنے اک نیلا سورج طلوع ہوا اور ساری فضا جگہ گئی اور

اس نے کہا — اویوقوف گوپیو — تم جو پانچوں حواسوں کے جھمیلے میں
گرفتار ہو۔ سنو اور جانو کے ہر شے فریب نظر ہے، ایک مکمل و رندابن جس میں میں
آنکھ چھوٹی کھیلتا رہتا ہوں۔ درخت کے پھول نارنجی قلموں کی ماںند جگہ کار ہے تھے
اور رادھا کلی کا گچھا اس کی کالی لٹوں کے پاس جھکا تھا اور اس کی آنکھیں بھٹکی روح
کو راستہ دکھانے والے ستاروں کی طرح جھلما رہی تھیں، وہ سماں ہی میں کھو گیا اور
اس کے ہجتے ہی شاخیں دوبارہ سر سر ایں، ستارے چمکئے ہوا ایں بہن لگیں۔ کیونکہ
اس کے ساتھ ساتھ کائنات بھی سماں ہی میں کھو گئی تھی۔

اور کائنات سنگیت سے بھر گئی:

مراری — تینوں دنیاوں کے نور — جے جے کرشنا

کچھ کوتو اپنے حسن سے اپنی اور کھنچتا ہے

کچھ کو بانسری کی آواز سے

کچھ کوتو اپنے خداوندی جلال کے ذریعے اپنا بندہ ہنا تا ہے]

کچھ کو اپنے قہر و غصب سے متاثر کرتا ہے۔ گوپیوں نے کہا

کچھ کوتو میدان جنگ میں نیست و نابود کرتا ہے۔

کچھ کو اپنی آواز کے جادو سے سرشار کرتا ہے۔ گوپیوں نے کہا۔

مگر تیراسب سے بڑا تھیار محبت ہے۔

جے کرشنا۔ جے جے کرشنا

اوم شانتی! شانتی! شانتی!!!

موسیقی آہستہ آہستہ فیڈ آؤٹ ہو گئی۔ چمپا چونک اٹھی۔ اندھیرے

کمرے میں صرف ریڈ یوکا ڈائل روشن تھا۔ ”ریحانہ طیب جی کی انگریزی تصنیف، گوپی کے دل، کا ترجمہ آپ نے سن۔ اب آپ ماری گیان وتنی بھٹنا گر سے چندر کونس کا۔“ طاعت کی آواز آرہی تھی۔ چمپا نے ہاتھ بڑھا کر ریڈ یوسیٹ بند کر دیا۔

پھر وہ دریچے میں جا کر شام کے آسمان کو دیکھنے لگی۔ کرشا کرشا کرشا۔ اس نے دل میں دہرایا۔ برادر کی کوٹھی میں کیرتی ہو رہا تھا وہ کان لگا کر آواز سنتی رہی۔ وجہ ان کیا شہوتا ہے اور محبت اور جنون خیز عشق اور پسکون احساس رفاقت یہ سب کیا ہے؟ اور بھگتی ریحانہ طیب جی، اس مسلمان اٹھ کی نے بھگتی کے جس جذبے سے سرشار ہو کر یہ کتاب لکھی ہے اسے بڑے بڑے پنڈت بھگی نہ سمجھ پائیں گے۔ یہ کیا شہوت ہے؟ میں ڈائیلکلن میں اس کا چڑھوئدھوں گی۔

اور محبت

”خداوند!“

جے جے کرشا۔ بنت بناوں بن ناہیں آوے ہری کے بنا۔ ہری کے بنا۔ برادر کے کمرے میں کوئی اٹھ کی پوری کاخیاں گارہی تھی۔ دھننا اس کی سمجھ میں اس کا مطلب آگیا۔ محبت دراصل فراق کو کہتے ہیں۔

گھاس پر اٹھ کیاں ٹھیل رہی تھیں۔ سو شل روم میں پیانو بجا یا جا رہا تھا، ہر طرف

گوپی کا دل نظر آ رہا تھا۔

”بجیا____ کیا کر رہی ہیں۔“ حمید بانو نے کھڑکی میں سے ڈال کر اندر جھانکا____ ”پروفیسر برجی کے یہاں آپ کا انتظار کیا جا رہا ہے۔“

”ارے۔“ اس نے چونک کر گھری دیکھی۔ سارے میں جنم اشمی کا تھوا رمنایا جا رہا تھا۔ ہوا میں طوفان لرزائ تھے۔ باغوں میں جھولے پڑے تھے جن میں کہیا کو جھلایا جا رہا تھا۔ درستک پر ایک ٹولی کیرتن کرتی جا رہی تھی۔ اوم جے جلدیش

ہرے____ بھگت جنو کے سکٹ____ چھن میں دور کرے____
وہ اتر کر نیچے آئی اور سائیکل اٹھا کر حمید بانو کے ساتھ بادشاہ باغ روائے
ہو گئی____ پروفیسر کے یہاں بہت بڑا مجمع تھا۔ اسے ذرا حیرت ہوئی۔ شاید
جمنم اشمی کی تقریب منائی جائے گی۔ اس نے سوچا۔ وہ ابھی تک وندابن میں
حکوم رہی تھی____ ڈائریکٹ ایکشن____ کملتہ____ دو ہزار موتیں۔

”یہ کیا باتیں ہو رہی ہیں؟“ خواب سے اس کو کسی نے جھنجور دیا، سامنے دیکھا گوتم بھی موجود تھا اور چند کاغذات پر جھکا جلدی جلدی کچھ لکھ رہا تھا۔
”کیا ہو گیا۔“ اس نے گھبرا کر پوچھا۔

طاعت نے غصے سے اسے دیکھا۔ ریڈ یو اسٹیشن سے وہ بھی سیدھی وہی پہنچی تھی اور اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ ”جو کچھ ہو گیا چمپا باجی وہ آپ کو خود ہی معلوم ہوا جاتا ہے۔“

”ہم اُن چاہتے تھے، ہم اُن چاہتے ہیں، ہم اُن ٹانگیں چاہتے ہیں، ہم ہرگز نہیں

لڑیں گے۔ ” گوتم آہستہ بڑی گمپیہر آواز میں کہہ رہا تھا۔ اس نے نظر انھا کر چمپا کو دیکھا بھی نہیں، وہ اپنے کام میں مصروف رہا۔

” لیکن ڈائریکٹ ایکشن۔ ” کسی نے جوش سے کہا۔

” بکواس مت کرو۔ ” ہری شنکر نے کہا۔

” ذرا اپنے لیڈروں سے جا کر پوچھو چمپا بیگم، اب یہ کیا ہو رہا ہے۔ ” کسی اور نے اس کے قریب آ کر کہا۔

چمپا نے ہر بڑا کر چاروں طرف دیکھا۔ میرے لیڈر اس کا حلق سوکھ گیا۔

” ہاں ہاں۔ تمہارے لیڈر بڑے زوروں سے لیگ کو ووٹ دینے گئی تھیں۔ ” زریندر نے کہا۔

” یہ غلط ہے۔ ” اس نے آہستہ سے کہا، اس نے گوتم کی طرف دیکھا لیکن گوتم نے چہرہ دوسرا طرف پھیر لیا۔

” اگر غلب ہے تو کل اخبار میں بیان دو گی؟ بتاؤ۔ ” زریندر نے گرج کر کہا۔

” چلو یہاں سے چلیں۔ ہمارے گھر چلو۔ ” وہاں بینہ کر طے کریں گے۔ ”

” طے کریں گے کہ چمپا بیگم کو پھاؤںی پر چڑھایا جائے یا نہ چڑھایا جائے۔ ” چمپا نے تلخی سے کہا۔

” مجھے نے اسے گھور کر دیکھا۔ ”

” رشیدہ آپا کے یہاں چلو۔ ”

”رشیدہ آپا کیا کر لیں گی اور تم۔“ ایک اور شخص (یہ سب پھر سفید بلینک چہرے تھے) ہری شنکر کی طرف مڑا۔ ”بڑے کیونٹ بنے پھرتے تھے بے چارے۔ پاکستان کا مطالبہ عوامی مطالبہ ہے۔“ وہ پھر اخبار پر جھک گئے۔

”اب خالی امن کی اپلیکیشن پر آج تک دنیا میں کسی نے عمل کیا ہے؟“

”ہم نہیں لڑیں گے۔“ گوتم نے دہر لیا۔

”ہونہہ۔ گاندھی دادیوں سے زیادہ بڑا فراڈ کہیں نہیں دیکھا۔“ تیرے نے کہا۔

وہ پھر واپس لوٹی۔ کیلاش ہوشل میں یونیمن کا ہنگامی سیشن ہو رہا تھا، وہ وہاں سے آگے بڑھی۔ چاند باغ کے چیل سے آرگن کی آواز بلند ہو رہی تھی اور ہال میں ”جنگلی بخش“ کی رسیٹر سل کی جا رہی تھی۔ رائے بھاری لال روڈ پر سے گزرتے ہوئے اس نے مکانوں پر نظر ڈالی۔ اس کو خوش آمدید کہنے والا دروازہ کہیں موجود نہ تھا۔ اپنے کمرے میں واپس پہنچ کر اس نے گوتم کو فون کرنے کے لیے ریسیور اٹھایا۔ ”کون ہے؟“ گوتم کی تنگی ہوئی آواز سنائی دی، وہ شاید ابھی ابھی اپنے گھر لوٹا تھا۔

”ہلو۔ میں نے سوچا تم سے بات کروں۔“

”کیا بات۔“ گوتم نے ذرا جھنجھلا کر پوچھا۔

”تم۔“ تم بھی سمجھتے ہو کہ میں رسی ایکشنری ہوں۔“

”میں کچھ نہیں سمجھتا چمپارانی۔“ یہ وقت ذاتی مسائل اور الجھنیں حل کرنے کا نہیں ہے، اگر تم اپنے مسائل کے باوجود دھارے کے ساتھ رہنا چاہتی ہو

تو یہ بہت بڑی بات ہے اور اگر نہیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟“

ہم — گوم گروہ کی طرف سے بول رہا تھا، وہ پھر تھا تھی۔

”لیکن میں تمہارے ساتھ چلنا چاہتی ہوں۔“

”میرے ساتھ؟“

”ہاں۔“

وہ بڑا متوجب ہوا۔ ”چمپا میں پیرس نہیں جا رہا ہوں۔“

چمپا کو بڑا اختت صدمہ ہوا، وہ اسے کس قدر غلط سمجھنے پر تلا ہوا تھا۔

”گوم نیلمبر تمہارے ساتھ پیرس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا،“ میں کہہ رہی ہوں تم لوگ ریلیف ورک کے لیے کلکتے جا رہے ہو گل، میں بھی ساتھ چلنا چاہتی ہوں۔“

”کہاں ماری ماری پھر وگی؟ جان کا خطرہ الگ ہے! اور تمہارے اباہنارس سٹی مسلم لیگ کے صدر ہیں، کیوں ان کا نام ذیوقی ہو۔“

”تم بھی مجھے طعنے دیئے شروع کیے۔“

”میں نے بھی!! کیوں، مجھ میں کوئی خصوصیت ہے؟ میں اور سب کی طرح ہوں، ان کے ساتھ ہوں۔ چمپا رانی یہ سمجھو لو — سنگھ بڑی چیز ہے ار آخری حقیقت ہے۔ تنہا فرد واحد کی حیثیت سے تم اپنے خول میں جا گھسو تو اس کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں۔“

”تم نے پھر نظریاتی بحث شروع کر دی۔ اچھا، شب بخیر گوم — ، چمپا نے جھنجھلا کر فون بند کر دیا۔

دوسرا صبح اسے معلوم ہوا کہ گروہ سر پر کفن باندھ کر لکھتے روانہ ہو گیا۔
نرملہ، طاعت تہمینہ سب چلی گئیں، صرف وہ اکیلی رہ گئی۔
مہینے اگر زر گئے۔

گروہ لکھتے کے بعد اب بنگال اور بہار کی سارے علاقوں میں امن امن کی
رستگاریاں پھر رہا تھا۔ رات کو گاندھی جی کے ساتھ بیٹھ کر گروہ رام گھوپتی را گھورا جہ رام
الاپتے، دن میں زخمیوں کی مرہم پئی کرتے۔ لڑکیاں واپس آچکی تھیں۔ لکھنؤ کی
زندگی معمول کے مطابق جا رہی تھی۔ مزید ڈرامے مزید پارٹیاں مزید کافرنیں۔
ایک روز چمپا نے اخبار میں پڑھا کہ بہار میں ہلالگو ندی کے کنارے بلاںیوں نے
چندور کر روز پر حملہ کر دیا۔ جو لوگ زخمی ہوئے ان میں مال اور شنکر اور گوتم بھی شامل
تھے۔ چمپا نے گھبرا کر سائکل اٹھائی اور گلفشاں روانہ ہو گئی۔ چنانکہ پر سے اس
نے دیکھا کہ آشیش و یگن میں سامان لدر رہا ہے۔ تہمینہ اور طاعت اور نرملہ سفر کے
لیے تیار کھڑی ہیں۔ میاں قدر گھبرائے گھبرائے پھر رہے ہیں۔ اخبار کی اطلاع
دو تین روز پرانی تھی۔ تہمینہ نے اسے بتایا کہ خوش قسمتی سے شنکر کے چاچا اس وقت
گیا میں موجود تھے۔ اور ان تینیوں کو موڑ پر لاد کر گور کھپور لے گئے جہاں کے وہ
سول سو جن تھے اور اب وہ تینیوں بھی گور کھپور جا رہی تھیں۔

”خیریت سے ہیں وہ لوگ۔“ چمپا نے تشویش سے پوچا۔

”گوتم کی آواز تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔ ابھی میں نے ٹرک کال کیا تھا۔“

”حالانکہ چوت سب سے زیادہ اسی کو آئی ہے، چاچا کہہ رہے تھے فون پر۔

”نرملانے اضافہ کیا۔“

”چمپا تم بھی چلو۔“ تہینہ نے کہا، وہ مصروفیت سے جھکی اور اپنی کیس بند کر رہی تھی۔

”تم پچھلے دنوں اتنی الگ تھلگ رہیں کہ ہم تجھے بہت مصروف ہو۔“

”میں نہ تم سب کی طرح کتابیں لکھتی ہوں نہ گاتی بجائی ہوں، ووائے پڑھانے کے میری مصروفیت کیا ہو سکتی ہے۔“

”کافی تو بند ہے تمہارا، چلو ہمارے ساتھ چلو، ہم واپسی میں تم کو ہناس پھوڑتے آئیں گے۔“ تہینہ نے کہا
چنانچہ چمپا کو گروہ نے پھر واپس بلا لیا۔

تینوں لڑکے سول سو جن صاحب کے بنگلے کے پچھلے چوڑے برآمدے میں
لیٹے ہوئے گلا پھاڑ پھاڑ کر گارہے تھے ۔۔۔ لوچلو ہے نا گوری
جوں پائے گوری دھامے ۔۔۔ تینوں بہت زخمی ہوئے تھے
لیکن بے حد بشا بش تھے۔ دن بھر وہ پڑے دنیا بھر کے گانے گایا کرتے: اپنا کے
گیت، بنگالی کورسوار جستھانی اور سمجھراتی لوک گیت، فلمی گانے۔ لڑکیاں پہنچ گئیں تو
اب دن بھر میں کھیلی جاتی۔ شکر کے چاچا نے حکم دے رکھا تھا کہ روزانہ اخبار ان
لوگوں کے نزدیک نہ آنے پائے، ریڈ یوکی خبریں ان کے کان میں نہ پڑیں۔ بڑے
اهتمام سے کوئی لڑکی رات کو اخبار اسمگل کر لاتی۔ گوتم روز خبروں کے ساتھ ساتھ
اپنے مستقبل کے پروگرام بدلتا رہتا۔ اس کے باعث میں ہاتھ کی انگلیوں پر ابھی پلاسٹر
چڑھا ہوا تھا۔ ”پتا نہیں میں اپنی یہ تین انگلیاں استعمال کر سکوں گایا نہیں۔“ وہ بعض
دفعہ اداسی سے کہتا۔ ”چمپا،“ ایک روز اس نے چلا کر کہا، ”ذراسوچ سکتی ہو کہ اب

میں پیا نو بھی نہیں بجا سکوں گا۔“

”کیوں نہیں بجا سکوں گے؟ یا رمور بد نہ بنو۔ کیا ڈریامہ کھیل رہے ہو۔“ مال نے کہا، اس کی اپنی ناگنگ کی ہڈی توٹ چکی تھی۔

”اب بہر حال، کیا ہو ستا ہے۔“

جب وہ تینوں چلنے پھرنے کے لائق ہوئے تو واپسی کی تیاری شروع ہوئی۔

”چلو پہلے ذرا آوارہ گردی کریں، جانے ادھر پھر کب آنا ہو۔“ مال نے کہا۔ مال کو اب چپ لگ گئی تھی، وہ بیٹھے بیٹھے بالکل مراتبے میں چلا جاتا مگر گوتم کو مور بد نہ بننے کی نصیحت کرتا۔

”ہم کو یہاں کے دیہات کے حالات دیکھنے چاہیں، ہم مرزا پور بھی جائیں گے جو ہماری کمرن کا گھر ہے۔“

”مرجا پور میں اور ان ٹھون رن کاشی ہمارو گھاٹ گوتم نے ہنس کر چمپا کو دیکھا، وہ اداسی سے مسکراتی۔

یہ علاقہ بڑا اغیریب تھا۔ سر بز اور پر سکون۔ یہاں کے لوگ بے حد دلکش تھے۔ معصوم اور پر امن۔ رام دیا اور رام اوتار اور کدریہ اور کمرن کا دلیں۔ یہاں چاروں طرف جواہوں اور ٹھاکروں کی بستیاں تھیں اور قصبات میں زمینداروں کی حوالیاں اور شہروں میں پیلے رنگ کی اداس کوٹھیاں جن میں مرنجاں مرنج ڈپٹی کلکٹر رہتے تھے۔

وہ چھوٹی لائن کی ایک ٹرین پر سوار ہو گئے۔ برج مان گن اسٹیشن پر گاڑی رکی، یہاں ہری شنکر کی موی ڈھیروں پھل پھاڑی اور ناشرے کے انبار لے کر

پلیٹ فارم پر موجود تھیں۔

”یہاں سے ذرا آگے کپل و ستو ہے۔ چلو وہاں ہوتے آئیں۔“ چمپا نے تجویز کیا۔

”میں ایک زمانے میں بدھست تھا بڑا بھاری“ مال نے اداسی سے کہا۔

”کہاں جنگلوں میں ماری ماری پھروگی چمپا بیگم____“ گوم نے اکتا ہے ہوئے لبجھ میں کہا۔

بہت لمبا سفر باڑے____، شنکر کی موی نے کہا۔ ”یہاں موڑ و نہیں ملتے ہے۔“

وہ خود بھلی پر آئی تھیں۔ یہاں صرف ہاتھی سواری کے لیے ملتے تھے____ ترائی کے ہاتھی اور ہاتھیوں پر بینچ کر کپل و ستو پہنے، گاؤں والے ان کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

دور ہماوت کی گلابی چوٹیاں دھوپ میں جھملما رہی تھیں۔ چاروں اور سرخ چھتوں والے مکان تھے اور آم کے باغ اور بانس کے جھنڈ۔

کپل و ستو کے کھنڈروں میں پہنچ کر چمپا نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ مال بڑی سے ایک پتھر کو رو مال سے صاف کرنے لگا، اس پر لکھا تھا:

”مہاراجہ پیا داس نے اپنے جلوس کے اکیسویں سال پہ نفس نشیں یہاں آکر عبادت کی کیونکہ اس جگہ بدھ شاکیہ منی پیدا ہوا تھا۔ کیونکہ یہاں بدھ نے جنم لیا اس وجہ سے اس گاؤں کی مالگواری معاف کی جاتی ہے۔“

اب یہاں وہ کنوں کے تالاب اور شہرے ہرنوں کی ڈاریں اور درختوں کے

کنج اور چنیبلی کے پھولوں سے گھری ہوئی بارہ دریاں کہاں ہیں؟ چمپا نے اپنے آپ سے پوچھا، وہ ان سب سے ذرا الگ ایک پتھر پر بیٹھی تھی۔ یہاں تو ویرانہ ہے اور یہاں گیدڑاتوں کو چلاتے ہیں۔ یہاں فصیل کی نوئی پھونٹی دیواریں تھیں اور مٹی کے ٹیلے اور شکستہ چوکور تالاب۔ مہارانی مایا دیوی کے محاذات سرخ اینٹوں کے ایک بڑے سے ڈھیر کی شکل میں چاندنی میں نظر آ رہے تھے۔ قریب رومنی مددی اس سکون سے گنگنا تی ہوئی بہہ رہی تھی گویا کوئی بات ہی نہیں۔

”یار بڑا سناٹا ہے۔“ کمال نے یکاخت گھبرا کر کہا۔

”بڑا شدید سناٹا ہے۔“ ہری شکر نے جواب دیا۔ ”چلو اب واپس چلیں۔

ہاتھی ہمارے منتظر ہیں۔“

گوتم نے کیمرا اتر کر ہاتھ میں لے لیا۔ ”دن کا وقت تو تصویریں ہی کھینچتا۔

”اس نے اور زیادہ بور ہو کر کہا۔

کمال منہ لنکائے بیٹھا رہا۔

”شکر یار تاریخ بڑا زبردست فراڈ ہے۔ تاریخ ہمیں برا بر دھوکہ دیتی ہے۔“ اس نے کہا۔

”ہاں۔ ٹھیک کہتے ہو۔“ شکر نے حسب معمول اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہاتھیوں کی طرف آئے، ان کے سامنے چاندنی میں مہارانی مایا دیوی کے محل کے کھنڈروں پر سے گزرتے بڑے عجیب لگے۔

واپسی میں چمپا بنا رہ اتر گئی۔ کینو نمنٹ کے انسٹیشن پر پہنچ کر اس نے ساتھیوں کو خدا حافظ کہا اور تانگے میں بیٹھ کر گھر کی سمت رو انہ ہوئی۔ درگا پوچھا اور رام لیما کا ہنگامہ شروع ہو چکا تھا، اس نے اپنے شپر پر نظر ڈالی: تپلیشور اس نے کہا۔ ابدی کاشی کاشی مجھے اپنی پناہ میں رکھ۔

اپنے محلے میں پہنچ کر اسے دور سے اپنے گھر کا چھونا سا پھاٹک دکھائی دیا۔ گلابی جاڑوں کی رات تھی۔ اس کے مکان میں روشنی ہو رہی تھی، جس طرح اندر ہیرے سمندر میں جہاز روشن ہوتا ہے وہ اندر پہنچی۔ ایک رشتہ کی بہن کی شادی کا ہنگامہ تھا۔ چوڑھنے والے مجھ رہا تھا۔ دالان میں روئی کے پردے چھٹے تھے۔ اندر رخت پر میرا سنیں چڑھی بیٹھی تھیں، وہ جا کر ایک نیم تاریک صفحی میں کھرے پنگ پر لیت گئی جس کی پائیتھی کسی مہمان بی بی کا بچہ دلانی میں لپٹا بے خبر سورہا تھا۔ دالان میں سے بوحسین باندی کی پارٹ دار آواز بلند ہو رہی تھی:

اس نے کہا: تو کون ہے؟

میں نے کہا: شیدا ترا

اس نے کہا: کرتا ہے کیا؟

میں نے کہا: سودا ترا

ہنگن کی دیوار پر عورتوں کے چلتے پھرتے سائے لرزائ رہے، کسی نے زور سے آفتاب چوکی پر رکھا۔ چوکی میں کوئی بچی سوتے میں روئی۔

میرا سنوں نے گانا گایا:

اس نے کہا: کرتا ہے کیا؟

میں نے کہا: سودا ترا

ان کی آواز بہت سے بے معنی الفاظ دہراتی رہی، پھر ایک نوجوان میراسن نے گناہ شروع کیا: اڑیا پر چور، بھوجی دیا تو جلاو، پھر سمندر ہنوں کی گالیاں شروع ہوئیں۔ اس کے بعد سہاگ گایا گیا، وہ آنکھیں بند کیے یہ ساری آوازیں سنتی رہی۔ باور چی خانے میں تیل کا چراغ جل رہا تھا۔ چاروں طرف دھوئیں کی کالوں پتھری اور بھگار کی مہک۔

گھر گھر اپنا گھر

پھر رات کا سناٹا چھایا اور ایک تیل گاڑھی کھڑکی کے نیچے سرک پر چرخ چوں کرتی گزری۔ اس کے پیسوں سے وہ عجیب و غریب سمع خراش آواز نکل رہی تھی، اسے یاد آیا بچپن میں جب وہ انگلکاپا را پنے نانا کے گاؤں شہم پور جایا کرتی تھی تو ایک مرتبہ رسول مہری نے کہا تھا: جانو جئے اسی گاڑی ما سے اسی آواز نکلی جانو بھوائی خفا ہوئیں ہوشگون ہو بہتے ہوشگون

دفعتاً اس کا دل دھڑ کنے لگا۔ کیا ہوگا؟ کیا ہونے والے ہے؟ اور اس کے منطقی وجود نے اسے سمجھایا: کچھ نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب ایسا بھی اندر ہیر نہیں مچا ہے کہ مگر مال کی انس تو یہ ہے اونہہ مال کو مارو گولی کیا اس کی انس صحیح ترین ہے اور یہ کیمونٹ کیا کہتے ہیں ہونہہ ان کی بھلی چلائی سوچتے سوچتے گوتم نیلمبر کا فلسفہ مال کا جوش و خروش، طاعت کی تیز گفتاری، تہینہ کی پر سکون شخصیت سب ایک ایک کر کے اس کے ذہن میں آئیں اور وہ خود کون تھی؟ کیا

تھی؟ اس کو لوگ کیا سمجھتے تھے؟ گوم اس کو کیا سمجھتا تھا؟ گوم کی رائے اس قدر عزیز
کیوں ہے؟ جنم میں گیا وہ — اور عامر رضا — عامر رضا —
صحح کو وہ دن چڑھے تک سوتی رہی۔

دن گزرتے گئے۔ سروپ نکھا کی ناک کٹی۔ راون جلا۔ بھرت ملاب پ ہوا۔
دبلے پتلے لڑکے منہ پر سیروں غازہ اور سفید پوتے، پنی کے نقشی تاج پہنے، رام اور
چھمن بنے بڑی تمکنت کے ساتھ تخت روائ پر سوار ہوئے۔ انسانوں کو ان میں خدا
کا جلوہ نظر آیا۔ چھٹیاں ختم ہونے پر وہ لکھنو والیں آگئی۔ زندگی جاری رہی، پھر کوار
کے مہینے میں اماوس کی کالی راتوں کو دیمپ مالیکا نے روشن کر دیا چھوٹی اور بڑی
دیوالی منائی گئی۔ گھر گھر لاشی کی تقدیس کی گئی۔ آج لوقا چماری کی عملدرائی ہے۔
غلغشاں کے برآمدے میں خالہ بیگم نے اظہار خیال کیا۔ بچوں باہر مارے مارے
مت پھرو۔ آج کی رات جانے کتنے جادو نونے ہوں گے؟ سامنے چورا ہے پر
ایک دو نے میں مٹھائی رکھی تھی اور چراغ جل رہا تھا۔ جانے کون وہاں رکھ گیا تھا۔
یاد ہے ایک مرتبہ جادو کی ہندیا اڑتی ہوئی آئی تھی اور ہماری احاطے میں گری تھی۔
طاعت نے کہا، وہ گھاس پر آ کر آسمان کو دیکھنے لگے۔ آج کی رات لاشی اپنی سواری
کے الو پر بیٹھی ساری دنیا پر پرواز کرتی پھر رہی ہے۔ جانے وہ کس کس کے
 دروازے میں داخلہ ہوگی۔

”باہر گھاس پر مت جانا بچو۔“ خالہ بیگم نے پھر آواز لگائی۔ ”برسات کا سانپ
دیوالی کا دیا چاٹ کر بلوں میں جاتا ہے۔“
جلگہ جگہ چورا ہوں اور گلیوں میں جوا ہوا۔ رام اوتار اور قدیر جو اکھیلنے گئے۔

(ارے اگر آج جوانہ کھیلا تو اگلے جنم میں چھپھوندر کی جوں ملے گی رام اوتار نے کہا) پھر بھیا دوچ کا تھوا ر آیا۔ ہری شکر قالین پر چڑھایا بیٹھا تھا اور نر ملا اس کے ماتھے پر تلک لگا کراس کے سامنے مٹھائی پوس رہی تھی۔ گنگا کے بھائی یم کی طرح میرا بھیا امر رہے۔ اس نے منتر دہرایا پھر اگہن اور پوس کے پالے نے درختوں پر چاندی کے پتھر چڑھا دیے۔ گاؤں میں نو تکیوں کے گیت گونجے۔ چوپالوں میں مہابھارت کے قصے دہرائے گئے۔ سفید اٹنگی ساریاں پہننے عیسائی عورتیں گاتی چھریں: او، ہو سچ آیا سر آسمان سر آسمان کچڑی کا تھوا ر آیا تو لوگ ماگھ میلانہ نے تربیتی چلے۔ بست پنچی میں گھر گھر سوتی پوچا کی گئی انسانوں نے اپنے تخیل میں دیکھا کہ گورے رنگ کی دینی سفید ساری پہننے سفید کنوں پر بیٹھی شفاف الوہی پانیوں پر تیر رہی ہے۔ کھاروں کے ہاتھ کی بنا تی ہوئی مٹی کی مورت میں بھی انہیں خدا کا جلوہ نظر آیا، پھر چھاگن کی رت آئی۔ شور اتری کی تیاریاں کی گئیں۔ نر ملا نے سنگھاڑے والائی کوٹھی کے ٹھاکر دوارے میں بلوا کی پتیاں، دھتو رہ اور چاول تھاٹی میں رکھ کر شوکی آرتی اتنا ری محروم کا ہنگامہ ہوا۔ گھر گھر گھاس اور مووم ارکان غذ کے تعزیتے تیار کیے گئے۔ انسانوں نے اپنی ساری صنائی ان پر ختم کر دی۔ ان کا غذ اور پنی اور ریشم کے گھواروں، تابوتوں اور تعزیوں میں بھی انہیں خدا کا جلوہ نظر آیا۔ امام باڑوں میں چڑا غاصہ ہوا۔ گلی کو چوں سے پیلو اور سونی اور درگانوہ خوانی کی آوازیں بلند ہوئیں۔ ساری فضائے غم کا لبادہ اوڑھ لیا ہر شخص حسین کا سو گوار بنا۔ (سبطین اباد کے امام باڑے میں آٹھویں کی مجلس کے بعد ایک عیسائی فقیر نے چمپا کا دامن پکڑ کر کہا۔ بولا کے نام

پر ایک ڈبل دیتی جائیئے۔) شاہ نجف کے امام بائزے میں چڑاغاں کے روز حسب معمولی بر قی قمقموں سے بننے ہوئے حروف میں ”ہنر مجھنی لگنگ عازی الدین حیدر“ کا نام جملگا کیا۔ مارچ کے مہینے میں ساری فضا گلاں اور عبیر سے سرخ ہو گئی۔ کرشنا کی سورتی کو جھولوں میں بٹھالا یا گیا۔ صحیح بون فائز میں راکھشی ہو لکا جلی۔ ہمیارے سڑکوں پر بے گاتے پھرے۔

یہ سب دماغ کا دھوکا تھا، ذہن کافریب، طر کا بہالوا۔ کسی چیز کے کوئی معنی نہیں تھے صرف ذاتی مسرت اصل چیز تھی۔ جہاں ملے، جس قیمت پر ملے ذاتی مسرت حاصل کرو۔ تمہارے اصول، تمہاری جیل یا تراہیں، تمہاری کانگریس، تمہاری مسلم لیگ۔ سب بکواس ہے تم لوگ جوانسانیت کی قسمت کا فیصلہ کروانے چلے ہو۔ مارا ماری میں انسانوں کا منوں خون بہہ گیا۔ نہیں مجھے صرف ذاتی مسرت چاہتے۔ گھر، سکون، بچے، شوہر کی محبت۔

تم کیا افسونا ک با تینیں سوچ رہی ہو چپا بیگم۔ شرم کرو۔ اس کی منطقی وجود نے جو کھڑکی میں ناٹمیں لٹکائے بیٹھا تھا، پٹ کر اس سے کہا۔ شرم کرو۔ شرم کرو فضاؤں میں آواز بازگشت گونجی۔ بھادوں کے جھالے اسے یہی ناتے ہوئے معلوم ہوئے۔ سیاہ بادلوں نے چاروں اور سے بڑھ کر اسے اپنے میں سمیٹ لیا۔ اس قدر زبردست ریلا آیا کہ زمین آسمان ایک ہوئے، ندی تالے جل سے بھر گئے، گوز مہار کی تانوں میں دنیا بھر کا دردست آیا، پرواں کے جھونکوں نے دل کو کاٹ کاٹ ڈالا۔

وہ درختوں کی ٹہنیاں سامنے سے ہٹاٹی سڑک پر آگئی۔ سامنے پر ویس بزرگی

کی کوٹھی تھی۔ ان کے ڈرائیور میں بہت بڑا مجمع تھا۔ آج کے دن دنیا میں بڑے اہم فیصلے ہوئے تھے۔ (یہ لوگ فیصلے کرتے وقت میرے متعلق کیوں نہیں سوچتے؟ میں چمپا احمد جو یہاں تنہا کھڑی ہوں)۔ ڈرائیور کے پروپریوٹر کے پیچے وہ سب موجود تھے، وہ آہستہ آہستہ چینیلی کی بھیگی جھاڑیوں میں سے گزرتی درتپچ کے نیچے آ کر کھڑی ہو گئی اور اس نے اندر جھانکا۔ پروفیسر سفید دھوتی اور کرتے میں مابوس سیٹی پر چپ چاپ بیٹھے تھے۔ گوتم بھی تھا اور مال بھی۔ گوتم نے ہندوستانی سفارت خانے کے ساتھ ماسکو جا رہا تھا۔ مال فلیٹ اسٹریٹ میں پاکستان کے نظریے کے خلاف پروپریئنڈہ کرنے کے لیے لندن بھیجا جا رہا تھا کہ آج معلوم ہوا کہ پاکستان کا مطالبہ منظور کر لیا گیا۔ مازمت پیشہ لوگ اب اس فکر میں غلطائی پیچاں بیٹھے ہیں کہ اپنی نوکریاں کہاں منتقل کروائیں۔ یہاں رہے تو نقصان ہے۔

”ان کا خیال ٹھیک بھی ہے۔“ گوتم کہہ رہا تھا۔ ”پاکستان مسلمانوں کا اقتصادی مسئلہ حل کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔۔۔ تمہارے بابا کا کیا ارادہ ہے؟“

”بابا کیسے جا سکتے ہیں؟ زمینداری نہیں چلی جائے گی ساتھ۔ بھیا صاحب نے البتہ اوپٹ کر دیا ہے۔“ مال نے جواب دیا۔

دلی، شملہ نمبر ۱۰۔ اور نگ رزیب روڈ، انسر یگل لاج، بھنگی کو لوئی یہ الفاظ اس کے کافوں میں آتے رہے، وہ درتپچ سے ہٹ آئی اور چلتی ہوئی پھر سڑک پر آگئی۔

اب اس کے سامنے دو دنیا نئی تھیں۔

ایک طرف یہ لوگ تھے ان کے دل و دماغ ان کے تصورات، ان کی جدوجہد مگر یہاں مستقبل بے حد بھم تھا۔ دوسری طرف سکون تھا اور حفاظت۔ ذاتی مرت عامر رضا پاکستان جا رہے تھے۔ کیوں نہ جائیں، آخر وہ کمال کی طرح سر پھرے تھوڑا ہی ہیں۔ یہاں ان کا مستقبل کیا ہے؟ نئے ملک میں وہ ترقی کر کے کہیں سے کہیں جا پہنچیں گے۔ ذاتی مرت ذاتی ترقی، ذاتی مقاصد، آخر کیوں نہیں۔ سیاست ہی تو ساری زندگی نہیں۔ دوسروں کے لیے میں کیوں سوچوں؟ دوسروں نے مجھے اب تک کیا دیا۔ چنانچہ اس نے تفصیل سے سوچنا شروع کیا۔ میں عامر رضا سے شادی کر کے پاکستان چلی جاؤں گی، کتنی آسان بات ہے۔ یکخت ایسا لگا جیسے بلآخر تم ہو گیا، سکون سارے میں چھا گیا۔ اس نے تصور میں اپنا نام پڑھا۔ نیکم عامر رضا۔ کراچی وہ بھئی، مگر یہ لوگ گمخت بہت یاد آئیں گے۔ پر اب انسان کو دنیا میں ہر چیز تو حاصل نہیں ہو سکتی تم کیک او بھی اور اسے کھاؤ بھی۔ ناممکن ہے وہ شاہی چائک تک پہنچ گئی، اس کے پیچھے پیچھے گوتم آرہا تھا۔

”چمپا باجی خدا حافظ“ اس نے کہا۔

”جاتے ہو ما سکو۔“

”ہاں۔“

”کمال کا کیا ہوا؟“

”وہ جاتو رہا ہے جولائی میں چلا جائے گا۔ طاعت اور نرمابھی جا رہی ہیں، ان

سب کو کیمیرج میں داخ مل گیا ہے۔“

”بہت خوب۔“

”آپ بھی کیوں نہیں باہر چلی جاتیں، چمپا باجی۔ یہاں بیکارا پنا وقت گنواری ہی ہیں یا اگر شادی کر رہی ہوں تو دوسری بات ہے، مجھے یقین ہے کہ آپ پاکستان چلی جائیں گی۔“

وہ بادشاہ باغ کے چاندک کے پرانے گوں سے پیٹھ نکال کر کھڑی ہو گئی۔ گتم اس کے سامنے موجود تھا لیکن وہ بالکل تھا تھی۔ ”آخر تم بتاتے کیوں نہیں مجھے کیا کرنا چاہتے؟“ اس نے تقریباً چیخ کر کہا۔

”آپ کس سلسلے میں مجھ سے رائے لے رہی ہیں؟ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ کون کس کو رائے دیگا، کون کس کا ناصح بن سنتا ہے۔ میں کمیونیٹی میں ہوں چمپا باجی، محض حقیقت پرست ہوں۔“

”تمہارے پاس میرے لیے صرف یہی الفاظ ہیں؟“

”آپ تو الفاظ میں معنی نہیں دیکھنا چاہتیں، اس لیے کیا فرق پڑتا ہے، میں جو بھی کہوں وہ بے معنی ہو گا۔ خدا حافظ۔ گلفشاں جائیں تو اپی کو بتا دیجیے گا میں صح دلی روانہ ہو رہا ہوں۔“ وہ آگے طا گیا۔

طاعت اور نر ملابات میں کرتی قریب سے گزریں۔

”دل نہیں مانتا، ملک کو اس حالت میں چھوڑ کر ہم انگلستان بھاگ جائیں، حالانکہ تعلیم بھی بڑی سخت ضروری ہے۔ گویہ بہت سخت بورژوا موقع پرستی ہوتی ہے۔“ طاعت کہہ رہی تھی۔

”باقل۔ حالانکہ کیمبرج میں اتنی مشکل سے داخلہ ملتا ہے، اگر اب نہ گئے تو سمجھو کئی سال بر باد گئے۔“ نرمانے جواب دیا۔

”ہاں یہ بھی ٹھیک کہتی ہو۔“ وہ دونوں بھی اسے ہو کہتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔
اب مال قریب سے گزرا۔

”چمپا باجی مبارک ہو، تمہارا پا کستان بن گیا۔“ اس کے لمحے میں جس قدر تلخی، نفرت اور شکست دلی چھپی تھی اس کا احساس کر کے چپا رزا تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اب مال ایک اور تقریر کرے گا، اسے برا بھلا کئے گا مگر یہ کیا ہوا کہ مال اب بالکل خاموش تھا۔ گویا اب مزید کچھ کہنے ممنونے، خفا ہونے، بحث کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔ با توں کا دور ختم ہوا اب ایک حقیقی دنیا سامنے تھی، فیصلے اور عمل کی منتظر مال ایک لختے کے لیے خاموش کھڑا چھانک کو دیکھتا رہا۔ جس کے ایک اندر ہرے طالقے میں چوکیداری کی لائیں جل رہی تھی، اس کے بعد وہ بھی چپ چاپ آگے چلا گیا۔
وہ اکیلی وہاں پھولوں کی نیسم تاریکی میں کھڑی رہی۔ یہ سب اس کا ساتھ چھوڑ کر اپنے راستے پر چلے گئے، وہ چھانک سے نکل کر سڑک پر آگئی۔ سارے میں سناٹا چھایا تھا۔ مکانوں اور درختوں کے پرے گلفشاں میں روشنیاں جل رہی تھیں۔ گلفشاں، جو اس کے لیے اجبی تھی مگر اس میں وہ موجود تھا۔
جو اس کا باتھ تھا میں گا، وہ اس کے راستے پر چلے گی۔ آخر زندگی میں رومان اور محبت اور گلاب کے شکوفوں کا وجود ہے کہ نہیں! انسان کہاں تک محض سایوں کا تعاقب کرے، وہ اس سے کہے گی: لو بھئی میں یہاں ہوں۔ ہنگامے ختم ہوئے۔ اب سکون اور آرام کا وقت ہے۔ ان لوگوں کو جدوجہد اور مصائب کی

وادی میں دیوانوں کی طرح اپنے بال نوچنے اور خاک چھاننے دو۔ ایک وقت آئے گا جب یہ بھی تھک جائیں گے اور منہ لٹکا کر اپنی جائے پناہ تلاش کریں گے۔ لو میں آن پہنچی۔ خالص رومان کا مطلب میں پوری طرح نہیں سمجھ پائی جس کے تم سمبول ہو۔ (یہاں ہر چوز کا سمبول موجود ہے۔ ان لوگوں نے سمبولوں میں ساری زندگی کو تقسیم کر دیا تھا)۔ مگر اب میں تمہاری اور آتی ہوں۔

چالک پر اسے رام اوتار ملا۔

”بھیا صاحب ہیں؟“ اس نے دفعتاً محسوس کیا کہ اس کی آواز کا نپ رہی ہے، وہ چوروں کی ماں ند خوفزدہ ہے، وہ گلفشاں میں سیند لگانے آئی ہے۔

”بھیا صاحب تو ابھی ابھی چلے گئے۔“

”کہاں۔“

اب اندر ہیرے میں سے نکل کر گناہ دین بھی سامنے آگیا۔

”کہاں چلے گئے بھیا صاحب؟“ چھپا نے دہرا دیا

”وہیں _____“ رام اوتار نے تلخی سے جواب دیا، ”مسلمانوں کے پاکستان۔ اب آپ بھی چلی جائیں گا۔ سب جنے چلے جائیں گے۔ ہم اکیلے رہ جنہیں _____“

گناہ دین، رام اوتار کے قریب آگیا، وہ بڑا پڑھا لکھا آدمی تھا اور روزہ ندی اخبارات کا مطالعہ کرتا تھا۔ بھیا صاحب بڑے بے و پھانکتے۔ چھپا بیٹا کو چھوڑ کر چلے گئے چپے سے۔ انہوں نے ہمیں بھی چھوڑ دیا۔ بھیا صاحب نے گناہ دین سے دغا کی۔ بڑی بے و پھا بے مرودت قوم ہے _____ اسے صبح کا ہندی اخبار کا

اٹیوریل یاد آیا جس میں مسلمانوں کو غدار بتایا گیا تھا۔

بھیا صاحب سمجھنے گئے ہیں ہواں جہاں کا بٹوارہ ہوت ہے۔ اپنے مسلمانی جہاج لے کر کراچی چلنے جنہیں۔ کدریہ بتاوت رہے۔ ”رام اوٹار نے اطلاع دی، ”ہو لا لا لا لا“ اس نے طوطوں کو اڑانے کے لیے چلوں کے درختوں پر ایک پھر پھینکا۔

گناہ دین اور رام اوٹار کو اپنی سوچ میں ڈو بآچھوڑ کروہ واپس لوئی۔ بھیا صاحب چلنے گئے کیونکہ گھوڑوں اور تیز رفتار موڑوں اور لڑکیوں کے علاوہ اب ان کی زندگی میں ایک نئی دلچسپی پیدا ہو چکی تھی: نیا ملک، نیا عہدہ، ترقی، نئے مسائل۔ مردوں کی دنیا تھیں بالکل علیحدہ ہوتی ہیں۔

”اس آدمی کے لیے میں نے اتنا وقت برداود کیا؟ ارے میں کتنی مورکتھی۔“ پھر اسے احساس ہوا۔ ساری بات یہ تھی کہ بھیا صاحب بے حد خوبصورت تھے اور اس نے بھیا صاحب کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارا تھا۔ یادوں کے خزانے میں ایسے وقت کی ضرورت بھی ہوتی ہے لیکن مجھے ان سے محبت نہیں تھی۔ ہرگز نہیں سامنے ان کی سابقہ کائنات پھیلی ہوئی تھی۔ گلفشاں کالان جس کے سرے پر یوکلپیٹس کے درخت کھڑے تھے۔ ان کے مصادیں: مال، گناہ دین، ان کا خاندان۔ ان کی کمزون تھیں جواند ریٹھی ہو گی۔ وہ بھی ان پر جان دیتی تھی۔ بھیا صاحب خوبصورت تھے۔ اور مغرور۔ ان کو غرور جانے کا ہے کا تھا۔ چمپا کو سوچ کر نہیں آگئی۔ اس کا جی چاہا خوب ذوروں کا قہقہہ لگائے۔ انسانوں کو عآخر غرور ہوتا کس بات پر ہے؟ اپنی شخصیت پر؟ شخصیت؟ گوتم نیلمبر اپنے ذہن پر نازاں ہے۔

کمال کو اپنی اصول پرستی کا ذمہ ہے۔ تمہینہ اپنے انکسار اور مزاج کی نرمی پر فخر کرتی ہے۔ لوگ اس قدر خود پرست کیوں ہیں؟ چمپا نے چلتے چلتے آسمان کی طرف دیکھا۔ بارش آ رہی ہے۔ ہواوں میں آزادی تھی۔ پیسوں کی سرسر اہمیت میں عجیب قسم کی طہائیت پہاڑ تھی۔ محض میں ہی محسوس کر رہی ہوں یا اور لوگ بھی اس آزادی کا احساس کر سکتے ہیں۔ مثلاً تمہینہ اور گوم جو اپنے کمز کی بیوشاستا پر عاشق ہے۔

”ہا۔۔۔ ہاؤ فنی۔۔۔ اس نے دل میں کہا۔“

پھر اس نے بے تحاشا بھاگنا شروع کیا۔ وسیع، بھیگلی خوشبو دار زمین چاروں طرف پھیلی تھی۔ باغوں کے گلے راستے جن کے دونوں طرف اونچی بائزیں تھیں، روشنیں۔ گھاس جس پر سرخ بیر بہوٹاں چل رہی تھیں۔ آم کے درختوں پر اودے گہرے بادل جھکے تھے۔ زمین میں سے نہیں اور خوشبو کی لپیٹیں اٹھ رہی تھیں۔ شفاف پانی کے بر ساتی نالے کے برابر جو پلڈندی ایسی بن گئی تھی اسے الانگ کروہ برسوں دوسری اڑخیوں کے ساتھ یونیورسٹی جاتی رہی تھی۔ سامنے مولسری والی سڑک پر سیک زرتے اب بھی اڑکیوں کے پرے ہوشل کی طرف جا رہے تھے۔ گلفشاں کے احاطے کا چکر کاٹ کروہ پچھوڑے والی سڑک پر آگئی جدھرا سے ایک کچارستہ سلگھاڑے والی کوٹھی اور ندی کی سمت جاتا تھا۔ سامنے سرکنڈے کی ٹپی لگی تھی۔ چاروں اور پچھولوں کی بیلیں جھکی ہوئی تھیں۔ ہرے طوٹے شور مچا رہے تھے، ہر چیز وہی تھی۔ سامنے لوکی کی بیل میں سے اسے قمرن کا آنچل نظر آیا۔

”کابات ہے بیٹا۔۔۔“ قمرن نے دفتار سامنے آ کر پوچھا۔

”کچھ نہیں درسیر کی بی بی۔۔۔“ اس نے کہا۔

قمرن چپ کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

”ہم یہاں بیٹھ جائیں درسیر کی بی بی۔۔۔“

”جی ہاں۔۔۔ آئیں۔۔۔ ضرور بیٹھئے۔۔۔ باش آری ہے بیٹا
اوسرے میں آجائیں۔۔۔“

وہ شاگرد پیشے کے برآمدے میں آگئی۔ برآمدے کافرش خنک تھا۔ منڈپ پر
مرتن رکھے جلگ جلگ کر رہے تھے۔ دیوار پر قدیر کی گول کالی ٹوپی کھونٹی پڑ گئی تھی۔ چادر
پر پاپڑ پھسلیے تھے۔

”پاپڑ سکھائے خاطر تنکو گھام انہیں ملت ہے۔۔۔“ قمرن نے بات شروع کی۔
اسے معلوم تھا کوئی بات ضرور ہے۔ اندر کوٹھی میں بھی سنا تھا۔ ”بیٹا آپ لوگ منی
کی طبیعت نہیں جانت ہیں ہم فیض تو ای جانت ہن کی منی چیزے خوش رہت ہے
جب برابراو کی ٹہل کیے جاؤ او کے لیے اپنی زندگی تج ڈالو۔ ویسے ای لوگ کے
خوش ناہیں ہوتے ہیں۔ ہم تمہانہ بیٹا کو کیسے سمجھائیں کہ اڑکیں کا اپنی اوکات پہچانے
کا چاہی، وہ بھیا صاحب سے بگڑ گئی رہن، وہ ان سے ایک بھو بات کیے بغیر ہی
پاکستان چلے گئے۔ اب بیٹا صاحب رووت ہیں۔
چمپا خاموش رہی۔

”اڑکی کا اوکات ہے۔۔۔“ قمرن اداسی سے کہتی رہی۔ ”مہرا رو بن جائے تب
بھی منی کی نوکر۔ مہتا ری بن جائے تب بھی اور جب بڑھوتی کے جمانے میں بہو

بیاہ کر لائے اوکی دھونس الگ سبے — کا آپ ہو بلایت جاری ہیں؟“
”بلاشاید۔“

”اچھا ہے۔ پیٹا۔ مل اگر ان کو چاہت ہیں جی کا چیں ان کا چھوڑ کر بھی نہ ملے۔“

”بھیا صاحب نہ سکی کوئی اور سکی۔ سب منگی ایک سید تھوڑا ہی ہوت ہیں دریبر کی بی بی۔“ چمپا نے ذرا گھبرا کر کہا۔ پروانی کا ایک جھونکا آیا۔ بارش کے قطرے ٹپ ٹپ چھر پر برس گئے۔

”سب منئی ایک سے ہوت ہیں بیٹا۔ قرن نے کہا۔“ پان بنائی؟
”نہیں قرن رہے دیو۔ اب ہم ہو چلیا۔“ چمپا پیر ڈھنی پر سے اٹھ کھڑی
ہوئی اور چھتری سنجدال کی گلڈنڈی پر سے گزرتی درختوں میں غائب ہو گئی۔
قرن چھپر میں سے باہر آکے اداکی سے اسے دیکھتی رہی۔ ”ایک بیٹیاون بات
کا ہے نہیں سمجھ پاوت ہیں۔“ اس نے چھٹلی رم دیا سے کہا
”بیٹیاون میں ہمت نہیں۔ ڈرت ہیں۔ سمجھت ہیں تھوڑا سا انگریجی پڑھ لیں تو
دنیا جان گئیں۔ بیٹیاون میں ہمت نہیں۔“ چھٹلی نے سر ہلا کہا۔

طاعت طنبورہ اٹھا کر برآمدے میں آئی بیٹھی۔ اس نے اب کے ساون گھر آجا
الا پنا چاہا مگر آواز اس کے حلق میں انک گئی۔ تہجینہ کمرے میں بیٹھی مشین پر بلا و

زکی رہی تھی۔ بارش بند ہو جانے سے ایک دم جس طاری ہو گیا۔ طاعت انھ کر کرے میں آگئی۔

بھیا صاحب کو گئے کئی دن گزر چکے تھے۔ اب وہ کراچی میں ہوں گے۔ ایسا لگتا تھا گویا وہ بھی یہاں تھے ہی نہیں۔ یہ بالکل صحیح تھا کہ اس ہماری دنیا میں ان کی کوئی جگہ نہ تھی، وہ پاکستان نہ جاتے تو اور کہاں جاتے۔ فکر ہر کس بقدر بہت اوسٹ طاعت نے سوچا۔ ان کا جانا بالکل لوجیل تھا۔ ان کے جانے سے گویا پہلا ایک اپنی تخلیل کو پہنچا، وہ بھلا کیا کھا کر ہمارے ساتھ ہمارے طوفانوں کا مقابلہ کرتے بھگوڑے کہیں کہ وہ تہمینہ کی مدد کے لیے مشین کا ہینڈل گھمانے لگی۔ ”چھپا بامی نے بڑے خوبصورت لھن پیس خریدے ہیں۔“ اس نے محض کچھ بات کرنے کی خاطر کہا۔

تہمینہ نے سر اٹھا کر اس طرح دیکھا گویا وہ بڑی پر اسرار ہستی تھی۔ پنکھا گھوون گھوون کرتا چلتا رہا۔ باہر درختوں میں ایک کوئی مستقل کواو کواو کیے جا رہی تھی، بہت دور سے رام او تار کی آواز آرہی تھی۔ طاعت میں یکخت خود اعتمادی واپس آگئی۔

”درachi آپی یہ سب جذبات کی بات ہے۔ جذبات اور قسمی ہمدردی اور ایکو یشن،“ اس نے عالمانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔ اتنا عرصہ گوتم وغیرہ کی سنگت میں گزار کر اسے ان الفاظ پر یقین آگیا تھا۔

”اب تم نے بھی یہ چار سو بیس شروع کی۔“ تہمینہ نے آکتا کر کہا۔ ”چار سو بیس؟“ طاعت نے دہشت زدہ ہو کر کہا، ”آپی یہ اصلیت ہے۔“

پر اہم کامیابی بن جاتا ہے۔ تمہارا پر اہم بھیا صاحب یا چمپا باجی کا پر اہم اور ان سب کا انٹرائیشن یعنی کہ تمہینہ نے اسے غور سے دیکھا۔ ”تم ڈاکٹریٹ کے لیے کیمبرج جا رہی ہوئے؟“ طاعت بر امان گئی، مجھے بیوقوف سمجھتی ہیں، قسم خدا کی اپی مجھے بیوقوف سمجھتی ہیں۔

”آپ کے نزدیک میں چند ہوں؟“ اس نے دکھ سے پوچھا۔

”نہیں۔ تم بے حد خلمند ہو مگر عورت بھی ہو۔“

”اپی طاعت دھاڑی“ اپی تم نے حد کر دی، تم اس قدر بورزو ہو گئیں، تم نے پڑھ لکھ کر گدھے پر ادا دیا۔ اس کا جی چاہا اپی کی ذہنیت پر دھاڑیں مار مار کر روئے۔ ”ہائے اپی۔“ اس نے تمہینہ کو الماری میں سے رنگیں دھانگے کی ریلیں نکالتے ہوئے دیکھ کر کہا، اور تم تو مو و منٹ میں شامل تھیں، تم نے بڑے بڑے معمر کے سر کیے تھے، وہ ۳۲ء کا واقعہ یاد نہیں جب ولی یونیورسٹی کا مارس گائیئر آیا تھا اور تم نے کالی جھنڈیوں کے جلوس کی قیادت کی تھی۔ رشیدہ آپا کی تم لفڑی رہیں۔ کیا کیا تقریریں تم نے یونین میں کر ڈالیں۔ چمپا باجی جیسی روی ایک شری کو تم نے ابھوکیٹ کرنے کی کوشش کی اور اب تم عورت کا لیبل چپا کر قانع ہو گئیں۔ ارے اڑو کام کرو بھیا صاحب چلے گئے تو کیا ہوا؟ جہاں مرغ نہیں ہوتا وہاں سوریانہ ہو گا؟ بھیا صاحب کی قوم کے سینکڑوں موجود ہیں اور یہ اسرار میرے پلے نہیں پڑتے کہ ان سے بیاہ کرنے سے شدت سے انکار بھی ہے اور اب بیٹھی روتی ہیں۔ جہنم میں جائیں بھیا صاحب۔ ارے ان کا دماغ بھی

تم ہی نے خراب کیا تھا۔ نر ملابا اکل ٹھیک کہتی ہے، مردوں کو اتنا منہ ہی نہ لگانا چاہیے
ورنہ ان کا دماغ خراب ہوتے کیا دریگتی ہے۔ ارے پوچھو، آپ ہیں کون چیز؟ نہ
شکل نہ صورت۔ گورانگ، مولی کا ایسا۔ ہر ایک لیں اور اسی شکل کا ہوتا ہے۔ ایسے
ایسے کسی تین سو سانچھے ہر جگہ مارے مارے پھرتے ہیں اور پورے چھ سال تک
عین تمہاری ناک کے نیچے چمپا بائی سے فلرٹ کیا کیے اور اب تشریف لے گئے تو
بیٹھی چہکو چہکو روئی ہیں۔ ارے لگتا تین ایک جوتا بھیا صاحب کی ناک پر

”

”طاعت وہ تمہارے بڑے بھائی ہیں، بد تیزی مت کرو۔“

”ہاں اور کیا، اب اسی کی کسرہ گئی ہے کہ تم ان کی طرفداری بھی کرو۔ پرانوں
میں یہی لکھا ہے، ہر پتی ورتا استری کا یہی دھرم ہے۔ لا حول ولا قوۃ۔ میں کہتی ہوں
تم میں اور جھٹکی میں کیا فرق ہے؟ وہ بھی رام اوتار کے ہاتھ سے روز بیٹھنے ہے۔ حسینی
کی بی بی نے کل اس کی ہمدردی میں رام اوتار کو بر ابھا کہا تو اے لوؤہ تو حسینی کی بی
بی کی جان کو آگئی کہ خبردار جو میرے آدمی کو کچھ کہا۔“

اتنا کہتے کہتے غم و غصے سے طاعت روہانی ہو گئی۔ بھیا صاحب کے بجائے
اسے اپی پر غصہ تھا، اگر عمر میں بڑی نہ ہوتی تو ان کی اتنی ٹھکانی کرتی کہ ساری
وفا داری اور محبت اور بورڑا رومانیت ہوا ہو جاتی۔ ہائے ہائے۔ اس نے دل ہی
دل میں بیچ وتاب کھانا شروع کیا۔ آخر وہ اٹھ کر کمرے سے نکل بھاگی۔ سائیکل
انٹا کروہ نر ملا کے گھر پہنچی، وہاں جا کر اس نے چند رکی بھجیا کھا کر پیا اور نر ملا اور
مالتی اور ہری شنکر کے ساتھ بیٹھ کر ترپ چال کھیلیتib جا کر اس کا غصہ ذرا لختدا

طاعت کے جانے کے بعد تمہینہ مشین پر سے اٹھی اور درپیچ میں جا کھڑی ہوئی۔ پہلا ایکٹ ختم ہوا، اس نے دل میں کہا۔ ہوا میں طوفان لرزر ہے ہیں اور گلفشاں کی بنیادیں ہل چکی ہیں، ہم سب کے ذاتی طوفان۔ اگر ڈراما لکھا جائے تو کردار کی تشریح یوں ہوگی:

نواب زادی تمہینہ بیگم، عمر پچیس سال۔ فرست کلاس ایم اے سانوی، دلی، حاس، اندر ہی اندر غم کھاتی رہتی ہے۔ گھر میں اپی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ خلیق اور منکر المزاج، مغفر و ر۔ اس حقیر و ضاحت کے بعد اور کیا باقی رہ جاتا ہے؟ ڈرامے کے پانچویں ایکٹ میں ہوگا:

دس سالہ کا وقفہ۔ تمہینہ، جواب ذرا موئی ہو گئی ہے۔ پیچے کو گود میں لیے گنگنا رہی ہے: میں کھاؤں، مور بالا کھائے، بالے کا جھنہہ کوونہ کھائے۔ بالے کا چہرے پر معصومیت اور اشتیاق کی جگہ صبر اور سکون آگیا ہے۔ صبر اور سکون لا حول ولا قوۃ وہ برآمدے میں آگئی۔ بارش ہٹھم چکی تھی۔ چبوترے پر بہت سے رشتے دار پیچے "کوڑا جمال چاہی،" کھیل رہے تھے۔ درختوں کے پرے سون، طاعت کی چیزیاں رنگ کر پھیلا رہی تھی۔ مال نے چبوترے کی منڈیر پر سے جھانکا، واہ کیا سہانا منتظر ہے۔ وہ پٹے رنگے جا رہے ہیں۔ اپی مشین چلا رہی ہیں۔ برآمدے میں تخت پر تین چار خلا میں مصروف گفتگو ہیں، وہ بھی اندر آ کر نہایت ذہانت سے ان کی باتوں میں حصہ لینے لگا۔ جی ہاں، چھوٹی خالہ صحیک کہت ہیں۔ ضرور پاکستان جائیئے، وہاں

بڑے ٹھاٹھر ہیں گے، وہ بیچ بیچ میں اقمه دتا جا رہا تھا۔ تمہینہ نے اسے درپیچے میں سے دیکھا، یہ سب ڈرامے کے کردار تھے جو خواب میں چل پھر رہے تھے۔ اس بیچ پر وہند لکا چھا گیا تھا۔ وہ بھی باہر آگئی۔

مال نے بچوں کو کوڑا جمال شاہی کھانا شروع کیا۔

”کوڑا جما شانی۔ پیچھے دیکھا مار کھائی۔۔۔۔۔ پیچھے دیکھا ہو۔۔۔۔۔ اپی۔۔۔۔۔“ اس نے دوڑتے دوڑتے کہا۔ ”سل گئے بلاوز کوڑا جمال شانی۔۔۔۔۔“

تمہینہ برآمدے کے ستون سے بک کر اسے بک کر اسے دیکھنے لگی۔

”کوڑا جمال شانی۔ اپی چمپا باجی تشریف لے جا رہی ہیں، بلکہ لے گئیں تشریف۔۔۔۔۔ پیچھے دیکھا مار کھائی۔۔۔۔۔“

”کیا ہوا؟ کہاں؟“ تمہینہ نے چونک کر پوچھا۔

”فرانس۔۔۔۔۔ کوڑا جمال شانی۔۔۔۔۔ اس نے زور سے ایک چھوٹی سی بچی کو پہنے ہوئے دوپٹے سے مارا، وہ ھلکھلا کر نہس پڑی اور اس کے پیچھے دوڑی۔۔۔۔۔“

”کیسے؟“ تمہینہ نے آواز دی۔

”یونیورسٹی اسکالر شپ۔۔۔۔۔“ مال نے کہا۔ بچوں نے تیزی سے گھومنا شروع کر دیا۔۔۔۔۔ یہاں تک کہ مال دوپٹے کی کنڈلی گھاس پر پھینک کر باہر بھاگ گیا۔

سرک پر آ کر مال نے گلفشاں پر ایک نظر ڈالی اور جیبوں میں ہاتھ ٹھونس کر

سنگھاڑے والی کوٹھی کارخ کیا۔

اگست کی بارشیں اب کے ایسی نوٹ کر بر سیں کہ زمین آسمان ان میں ڈوب گئے۔ سنگھاڑے والی کوٹھی کارخ کیا۔ ستیل پانی بچھا کروہ سب بیٹھے بادولوں کو دیکھتے رہے۔ موقع کی مناسبت کے لحاظ سے طاعت نے دوبارہ تان پورے کو ٹیون کر کے ملہار شروع کرنا چاہا مگر ساری آوازیں ڈوب چکی تھیں۔

بارش کا پانی جوشغاف تھا، شرون کی الہی وحدت جو کائنات پر تیرتی تھی، اس میں خون ملا تھا۔ خون کی بد کھارت، خون کی بیچڑ، خون بر سانے والے بادل۔ خون کی اس فراوانی سے طاعت عاجز آگئی۔ نر ملا کیئی کیوس کے قرمی رنگوں میں اسے خون نظر آیا۔ گومتی خونی ندی تھی جو بہہ رہی تھی۔ (حالانکہ یہ صرف ڈوبتے سورج کا عکس تھا)۔ پھولوں پر خون تھا۔ انسانوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اس نے سہم کر نر ملا اور ہری شنکر کو دیکھا۔

۵۷

اور اب دونوں بھائیوں میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو ارجمن نے اپنی مان اٹھا کر کر شنا سے کہا:

او جنا دھن! میرا رتھو دونوں فوجوں کے درمیاں کھڑا کر دوتا کہ میں دیکھوں کہ مجھے کون سے فریق کا ساتھ دینا چاہئے۔

اور کر شنا نے رتھو ہاں لے جا کر کھڑا کر دیا اور ارجمن نے دیکھا کہ دونوں فوجوں

کے درمیان کھڑا کر دوتاکہ میں دیکھوں کہ مجھے کون سے فریق کا ساتھ دینا چاہئے۔

اور کرشنا نے رتھ وہاں لے جا کر کھڑا کر دیا اور ارجمن نے دیکھا کہ دونوں فوجوں میں ایک دوسرے کے پرکھبآپ، دادا، پچا، بھائی، بھتیجے، بیٹے، دوست، استاذِ فیق ایک دوسرے کے خلاف صاف آراستہ کیے کھڑے تھے۔

تب کنتی کے بیٹے نے دکھ میں ڈوب کر کہا: اور کرشنا! یہ منظر دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں شل ہیں۔ میرا احقر سوکھ رہا ہے۔ میرا جسم تحریر کا نپتا ہے۔ میرے سر کے بال کھڑے ہو گئے ہیں۔ میری مان میرے ہاتھ سے گری جا رہی ہے۔ میرا بدن تپ رہا ہے۔ اوکیشو! میں سیدھا کھڑا نہیں ہو ستا۔ میرا دماغ چکرا رہا ہے۔ مجھے بردے شگون و کھلانی دے رہے ہیں۔

او ما دھو! میں اپنے ہی کنبے اپنے دوستوں اور اپنے استادوں کو مارنا نہیں چاہتا کیونکہ کنبے کی تباہی سے قدیم روایتیں ختم ہو جاتی ہیں اور روحاںیت کے خاتمے کے ساتھ کنبہ بھی تباہ ہو جائے گا۔ عورتیں نیک نہ رہیں گی اور پرپھوں کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ پرپھوں کی تقدیس کرنے والا کوئی نہ رہے گا۔

او مدھوسوون! میں نہیں جانتا کہ ہم دونوں میں سے کون بہتر ہے۔ میں یا میرے دشمن۔ ہمیں ان کو زیر کرنا چاہئے یا نہیں ہمیں۔ او گوندا! میں نہیں لڑوں گا۔

سرل ڈیرک ایڈون ہاورڈ ایشلے نے پھر وقت پر نظر ڈالی اور پکیڈلی کے ٹیوب اسٹیشن میں گھری کے نیچے، جس میں ساری دنیا کا وقت معلوم ہو جاتا تھا، ہلنا شروع کر دیا۔ اسے سخت کوفت محسوس ہو رہی تھی۔ اس قسم کے راں دے دو سے اسے ہمیشہ سے انفرت تھی مگر وہ چمپا احمد سے وعدہ کر چکا تھا کہ اسے تھیڑ لے جائے گا اور وعدہ نبھانا بہر حال ضروری تھا۔ ٹنگ آکر اس نے نیو سٹیشن! یئڈ نیشن کو دوبارہ پڑھنا شروع کر دیا۔ اس میں گوتم نیلمبر کا جو خط تقسیم ہند اور جنگ اور امن کے منسلک کے متعلق چھپا تھا سرل بیتاب تھا کہ سریکھا کے گھر پہنچ کر اس پر پر دوستوں سے بحث کرے۔

سرل دوسرے لارڈ بارن فیلڈ کا چھوٹا بیٹا تھا۔ اس کے دادا پہلے لارڈ سرل ڈیرک ایڈون ایشلے نے اس ارسٹو کریٹ خاندان کی بنیاد رکھی تھی جواب سئی میں رہر اور جوٹ کی تجارت پر چھایا ہوا تھا۔ سرل کے پر دادا سرل ہاورڈ اپنے ایک مفلوک الحال پادری کے بیٹے تھے جو اٹھار ہویں صدی کے اوآخر میں ٹکر کی حیثیت سے بنگال گئے تھے جہاں انہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کے دروازے نیل کی تجارت سے لاکھوں روپے مانے۔ روایت تھی کہ شاہ اودھ کے دربار میں انہوں نے خوب ہاتھ رکھے اور جو لاکھوں پاؤ نڈ کی مایت کے ہیرے

جو اہرات شاہ اودھ نے ان کے تھنے میں دینے وہ علیحدہ، وہ کسی صوبے کے گورز بن چکے تھے جب ان کا انتقال ہوا اور ان کے اکلوتے لڑکے نے جوان ہو کر انگلستان میں رہر کی تجارت شروع کی، گاؤں اور محالات خریدے، لاڑ کا خطاب حاصل کیا، پارلیمنٹ میں بیٹھا اور با قاعدہ ارشٹو کر لی میں شامل ہو گیا۔ یہ پہلا لاڑ بارن فیلڈ تھا۔ اس کی تجارت بڑھتی اور پھیلتی ہوئی سلطنت برطانیہ کے ساتھ ساتھ سارے مشرق میں پھیل گئی۔ اس کا پیٹا دوسرا لاڑ بارن فیلڈ ایمپاری کا اور بھی زیادہ قابلِ خیر فرزند ثابت ہوا اس نے برطانیہ کی فاران سروس میں بڑے بڑے کار ہائے نمایاں انجام دینے۔ ترکوں اور افغانوں کا قلع قمع کیا۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کے خلاف پارلیمنٹ میں قانون وضع کیے۔ گلکتے سے ایک کنز روپیوں اخبار نکلا۔ ایک صحیح النسب ٹوری کی حیثیت سے اسے کالوں خصوصاً نیم وحشی ہندوستانیوں سے دلی نفرت تھی۔ چند اعلیٰ خاندان محمد نز کو البتہ وہ گوارا کر لیتا تھا جن کے ساتھ جب کبھی وہ ہندوستان جاتا تو گریٹ ایسٹرن گلکتے یا امپریلیل ہوئی دلی کی لاڈنچ میں بیٹھ کر اپنے دادا ”نباب“ سرل المیشلے کا تذکرہ کر لیا کرتا تھا۔ اس کے دادا نباب سرل المیشلے فی الواقع بڑی رومینک ہستی رہے ہوں گے جوار دو میں شعر کہتے تھے اور مرغ نے لڑاتے تھے کتھک ناج دیکھتے اور حقہ پیتے تھے۔ ان کی ایک تصویر رائل اکیدمی کے مصور زوفنی نے بنائی تھی۔ جس میں وہ ایک بڑے بڑے ستونوں والے برآمدے میں آرام کری پر بیٹھے پیچوں آڑ گڑا رہے ہیں اور کالا بھجنگ نیٹو ملازم پیچھے کھڑا مور چھل چھل رہا ہے۔ پس منظر میں تاڑ کے پتے ہیں۔ یہ تصویر میز کے وسطیٰ ہال میں لگی تھی۔

دوسرا لارڈ بارن فیلڈ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں جرمنوں کی بمباری کا نشانہ بنے۔ ان کے دوڑ کے تھے: بڑا اڑ کا تیر الارڈ بارن فیلڈ خاندانی کا رہا اور ریاست کا مالک تھا۔ سرل چھوٹا اڑ کا تھا۔

بارن فیلڈ خاندان کا ستارہ اب گروٹ میں تھا۔ ملایا میں ان کے رہ کے جنگلات میں کیونٹ چھپے بیٹھے تھے۔ کینیا میں ماڈ ماڈ نے اودھم مچا رکھی تھی۔ ہندوستان کو جب سے آزادی مل تھی ملکتہ کی مارکیٹ بھی ڈاؤن ہو رہی تھی۔ لارڈ بارن فیلڈ اب مشرق پاکستان میں روپیہ لگا رہے تھے اور اتوار کے روز اپنے خاندانی محل بارن فیلڈ پر نکٹ لگا کر پیک کواس کی سیر کرتے تھے۔ محل میں قیمت نوادر سے پٹا پڑا تھا اور اس کے چاروں طرف سینکڑوں ایکڑ پارک پھیا ہوا تھا۔ لارڈ بارن فیلڈ کو تجارت اور زمینداری کی پریشانیوں اور اقتصادی مشکلات نے قبل از وقت بوڑھا کر دیا تھا۔

لیکن سرل ان سب مادی جھگڑوں سے بے نیاز کیمبرج میں فلسفہ پڑھتا تھا۔ چھوٹا بیٹا تھا لہذا اسے ہر صورت میں اپنی روزی خود ہی مانا تھی۔ ایک اور مصیبت یہ تھی کہ جب سے اس نے روزماری سے شادی کی تھی بڑے بھائی لارڈ بارن فیلڈ نے اس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ لیڈی ستحیا سے اس کا بیاہ رچا میں گے۔ چاہی خاندان کے افراد اس میں شریک ہوں گے۔ ایک ڈیوک کا سرل داماد بنے گا۔ انگلستان کی ارثوار کی کچھ افراد کو چاہئے کہ اس نا زک دور میں ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑیں مگر سرل، اس سر پھرے اڑ کے نے تو لٹیا ڈبو دی۔ ایک پہلے ان کا خیال تھا کہ لوٹا کیونٹ ہو گیا ہے لیکن ان کا شبہ غلط نکلا۔ اس اڑ کے کو

سیاست سے چند اس دلچسپی نہیں تھی، وہت و خدا کے فضل سے فلسفی تھا۔ جنگ کے زمانے میں تعلیم اور ہوری چھوڑ کا اس کو پائٹ بننا پڑا تھا۔ مہاتما گاندھی کی اہنسا کا پرستار تھا اور برلن اور کولون پر جا کر بجم گرا تھا۔ جنگ کے بعد وہ کیمبرج واپس لوٹا۔ روز میری، جس سے اس نے شادی کی، متوسط طبقے کی ایک لڑکی تھی جس سے اس کی ملاقات آرٹسٹوں کی ایک پارٹی میں ہوئی جہاں آرٹسٹ لوگ رت جگا منا رہے تھے۔ یہ لڑکی خوبصورت نہ تھی۔ مجھ سے بنا تی تھی۔ بیت چاری کامیاب سختراش بھی نہیں تھی اس لیے سرل کو بہت اچھی معلوم ہوئی۔ مکمل، ماہر فن لڑکیاں اسے سخت ناپسند تھیں۔ یہ لڑکی بالکل نامکمل تھی۔ اس کی تکمیل ضروری تھی سرل نے سوچا۔ لہذا اس سے شادی کر لی اور لندن سے فون پر اپنے بھائی اور بھاونج کو مطلع کیا۔ لاڑڈ بارن فیلڈ نے فن الفور اس کا جیب خرچ بند کر دیا۔ ایک تو روز میری گمنام اور مفلس، اور پر سے رومن کی تھوک۔ لاڑڈ بارن فیلڈ آگ بگولا ہو گئے، لیکن سرل نے پرواہ نہیں کی، وہ ہیگل کے مطالعے میں جٹا رہا۔ سرل کیمبرج میں پڑھتا رہا۔ اس کی بیوی اسٹیفر ڈی شاہر کے چیزیں کے کھلو نے اور برتن بنانے کے ایک کارخانے میں نوکر ہو گئی۔ سرل کو بعض دفعہ اپنی انگلی پر شادی کی انگوٹھی دیکھ کر بردا تعجب سالگتا، پھر اسے دفعتاً یاد آتا کہ وہ شادی شدہ ہے اور اس کی ایک بیوی بھی ہے جو بڑی پیاری لڑکی ہے۔

مہینے میں ایک آدھ بار اس کی روز میری سے ملاقات ہو جاتی۔

ایک روز اسے بے حد لطف آیا جب وہ چند ساتھیوں کے ساتھ ایک چلنگ کا نکٹ خرید کر خود اپنے "اسٹیبلی ہوم" کی سیر کرنے کے لیے جا پہنچا۔ اس کے بھائی

اور بھاونج جنوبی فرانس گئے ہوئے تھے۔ ہاؤس کیپر اور اشاف کے لوگ محل کی سیر کر رہے تھے، وہ نئے لوگ تھے، کسی نے سرل کو نہیں پہچانا، وہ سارے میں پھرا اور سوچتا رہا، کیسی عجیب بات ہے، میں یہاں پیدا ہوا تھا۔

سرل کا محل قبے کے اختتام پر تھا۔ چار پانچ سو سال قبل تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کی کھڑکیاں اصل blown-glass کی تھیں۔ ان گنت کرے اور ہال اور غلام گردشیں۔ سرے پر لیڈی چیپل تھا۔ مارٹنگ روم میں ہمیشہ دھوپ آتی تھی۔ باغ میں حوض تھے اور روک گارڈن اور ڈچ وضع کی چمن بندیاں اور اطالوی سنک مرمر کے مجسمے پھولوں میں ایستادہ تھے۔ ایک زمانے میں وہ باغات میں خالص کثیری اسکواڑ کی مانند ٹوئینڈ کا سوت پہنچنے چہل قدمی کیا کرتا اور شبلتے شبلتے محل کے مغربی حصے کی سمت چلا جاتا جہاں بارہویں صدی کی دو راہبات کی قبریں تھیں۔ قبریں اب خالی پڑی تھیں۔ ان کے تابوت کی جگہ جو پختہ گڑھا سا بننا ہوا تھا اس میں اکثر بارش کا پانی جمع ہو جایا کرتا۔ ان قبروں کے پاس بیٹھ کر سرل نے اڑکپن میں گھنٹوں زندگی اور موت کے گور کھدا ہندے کے متعلق سوچا تھا۔

باہروں کے لیے اس محل کے چیزیں میں افسانویت کی افراط تھیں۔ سرل کو یہاں کوئی خاص بات نظر نہ آتی، سوائے اس کے کہا تا بڑا کھڑاگ جو امراء کے طبقے نے پھیلا رکھا تھا، کس قدر مضحكہ خیز ہے۔ اسے تو اپنے پردادا نبایب سرل ہا ورڈ بیشلے کی ذات میں بھی کوئی رومان نظر نہ آتا۔ جانے کتنے غریب ہندوستانیوں کا خون چوں کر انہوں نے یہ دولت حاصل کی ہوگی، وہ سوچتا۔ اس قسم کے خیالات اس کے دماغ میں کمیوزم کے زیر اثر نہیں آتے تھے بلکہ وہ کچھ صوفی منش واقع ہوا

تھا۔ ڈبلیو ای۔ میٹس کا اس نے کافی مطالعہ کیا اور قرون سلطی کے کیتوں فلسفیوں کا۔ تو اس نے کہا کہ دنیا کے فانی ہونے سے کون منکر ہو ستا ہے؟ اسی مارے جب وہ خود اپنے ہی محل میں اجنبی تماشا یوں کی طرح داخل ہوا تو اسے ایک عجیب سے سکون اور طہانیت کا احساس ہوا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں وہ دوسرے جدید انخلکچو لز کی طرح رومن کیتوں کہ نہ بن جائے لیکن وہ کسی ایک مسلک کا پابند ہونے کے بجائے آزاد رہنا چاہتا تھا۔ خود وجودیت کے پرستاروں کی اس اصطلاح آزادی کو بڑے زبردست معنی پہنانے جا سکتے تھے۔ یہاں پہنچ کر اپنے دوں کے معنی بھی سمجھ آ جاتے تھے۔

خاص بات نظر نہ آتی، سوائے اس کے کہ اتنا بڑا کھڑاگ جو امراء کے طبقے نے پھیلا رکھا تھا، کس قدر مضمون کے خیز ہے۔ اسے تو اپنے پردا دانباپ مرل ہا اور ڈیشلے کی ذات میں بھی کوئی رومان نظر نہ آتا۔ جانے کتنے غریب ہندوستانیوں کا خون چوس کر انہوں نے یہ دولت حاصل کی ہوگی، وہ سوچتا۔ اس قسم کے خیالات اس کے دماغ میں کیوں نہ کیوں زیر اثر نہیں آتے تھے بلکہ وہ کچھ صوفی منش واقع ہوا تھا۔ ڈبلیو۔ ای۔ میٹس کا اس نے کافی مطالعہ کیا اور قرون وسطی کے کیتوں فلسفیوں کا۔ تو اس نے کہا کہ دنیا کے فانی ہونے سے کون منکر ہو ستا ہے؟ اسی مارے جب وہ خود اپنے ہی محل میں اجنبی تماشا یوں کی طرح داخل ہوا تو اسے ایک عجیب سے سکون اور طہانیت کا احساس ہوا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں وہ دوسرے جدید انخلکچو لز کی طرح رومن کیتوں کہ نہ بن جائے لیکن وہ کسی ایک مسلک کا پابند ہونے کے بجائے آزاد رہنا چاہتا تھا۔ خود وجودیت کے پرستاروں کی اس

اصطلاح، آزادی، کو بڑے زبردست معنی پہنانے جا سکتے تھے۔ یہاں پہنچ کر پسندوں کے معنی بھی سمجھا آ جاتے تھے۔

سرل ایشلے صحیح معنوں میں جدید انسان تھا۔ اس عہد کی ساری قسمی الجھنوں، روحاں نا آسودگیوں اور جذباتی بے اطمینانیوں اور شہوں کا شکار۔

رورنگ ٹونیز کا زمانہ اس کا بچپن تھا۔ ۲۰۳۹ء کے دور میں اس نے ہوش سنھالا۔ لندن میں اس کے ٹاؤن ہاؤس میں اکثر آرٹسٹوں وغیرہ کا مجتمع رہتا جو اس کی سوتیلی ماں لیڈی الین سے ملنے آتے جو اس قدامت پرست خاندان میں شادی کرنے کے باوجود ساری جدید تحریکوں کی زبردست حامی تھیں۔ یہ بڑا عجیب و غریب دور تھا۔ ڈیلی ورکر اور بائیں بازو والوں کا دور۔ بلومز برگی والے انشٹ فاشٹ تھے۔ اوڈن اور ڈے لوکیس اور اپنڈر ترقی پسندوں کے گرو بنے ہوئے تھے۔ لندن کے یونیورسٹی میں کمیونٹوں کے ڈرامے ہوتے تھے۔ دیست منٹر تھیز والے مک نیس اور اوڈن اور اشر و ڈ کی تمثیلیں اٹھ کر رہے تھے۔ بائیں بازو سے تعلق رکھنا وہنی فیشن میں داخل تھا۔ یہ کرسنفر ووڈ اور سیڈر ک مورس اور بن نکلسن کی پینٹنگر کا زمانہ تھا۔ آرٹ، ادب، ڈراما، موسیقی، بیلے انٹیریور ڈیکوریشن ہر چیز میں جدیدیت کی تحریکیں چلائی جا رہی تھیں۔ مشرق کے فلسفے میں

اسے مزربینٹ اور ڈبلیو۔ بی۔ ہیٹس اور کرشنامورتی اور اوسفور ڈیونیورسٹی کے پروفیسر رادھا کرشمن کے مطالعے کی وجہ سے دچکپی پیدا ہوئی۔ میں۔ ایلیٹ اور ایڈ راپاؤٹ نے بار بار چینی اور سنسکرت حوالے دیے۔ شانتی شانتی شانتی کے الفاظ نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ سرل و چستر سے (نہیں۔ میں لشکن کبھی نہیں گیا۔

وچھر بھی اتنا ہی خوفناک تھا)۔ کیم بر ج بھیجا گیا (میں کیم بر ج نہ جاتا تو کیا گروکل کا گزری جاتا؟) وہاں پٹیر ہاؤس میں اس کا داخلہ ہوا اور پھر مسلسل تفریح، مسلسل تفریح، مسلسل ڈنی ڈسپشن اور خیال پرستی کا دور شروع ہوا، لیکن فوراً ہی جنگ چھڑ گئی اور بمبارپا نکت بن کر چند خوبصورت جسم شہروں کو جہاں اس کے محبوب فلسفی اور شاعر اور موسیقار پیدا ہوئے تھے، اس نے صفحہ ہستی سے منادیا۔

اس کے بعد وہ پھر کانج واپس آیا اور ہیگل کا مطالعہ پھر اسی صفحے پر سے شروع کر دیا جہاں سے ادھورا چھوڑ کر وہ ایئر فورس میں بھرتی ہونے کے لیے چلا گیا تھا یہ جنگ کے بعد کی دنیا تھی۔ کل کے دشمن آج کے ساتھی تھے اور کل کے ساتھی آج خطرناک ترین دشمن تصور کیے جا رہے تھے۔ ایشیا کا نقشہ تیزی سے بدل رہا تھا۔ اُن کے نعرے لگائے جا رہے تھے۔ تیسری جنگ کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ کل کے ترقی پسند آج شدت کے رجعت پسند بن چکے تھے۔ کسی ولیو میں کوئی استحکام باقی نہ رہا تھا۔ وقت غیر حقیقی ہے۔ سارا وقت غیر حقیقی ہے۔ کیم کے کنارے کنارے ٹھیلتے ہوئے وہ آئیں بلکل اور جیسے جو اُس کی طرح سوچتا۔ اب ڈنی ڈسپشن کا دور از سر نو شروع ہوا۔ جنگ کی تباہ کاریاں اور انسان کی ریا کاری دیکھنے کے بعد اس میں زیادہ تلنخی آگئی تھی۔ ماںیکل اور ڈنیس اس کے ساتھی تھے۔ ماںیکل یہودی تھا ڈنیس بھی ماںیکل کی طرح مڈل کلاس تھا۔ ان دونوں سے سرل نے بہت امید کی کہ ذرا ان میں اسنوبری کی جھلک دکھائی دے جائے مگر اس ضمن میں دونوں نے اسے بہت مایوس کیا۔ ڈنیس کو شاعری کی سودا تھا۔

ان کے علاوہ اور بہت سے لڑکے تھے۔ کالے لڑکے، یورپین لڑکے۔

اور لڑکیاں۔

سرل کو اس کی اپنی ہم قوم لڑکیوں نے کبھی زیادہ متوجہ نہ کیا، بوجہ ان کی یکسانیت کے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد کی دنیا ایک ایسا عظیم عہد تھی جس میں دنیا میں الاقوامی دوستی اور بھائی چارے اور کلچر مفاہمت (یہ سب بہت عظیم الشان فراڈ تھا) کے دور میں واضح ہو رہی تھی اور کہی کیسی لڑکیاں دنیا کے سارے کونوں سے انگلستان تعلیم کے لیے آ رہی تھیں۔ کالی لڑکیاں، پیلی یعنی مشرق بعید کی لڑکیاں (یاد کرو پرل بک کے ناول)، نیگر لڑکیاں جن کو دیکھ کر جدید سنتراشی اور پیرس کی نئی تحریکوں اور نئی موسیقی کا خیال آتا۔

اپنی ہم قوم لڑکیوں میں جون کا رہ تھی۔ جدید ناولوں میں برطانوی یونیورسٹی وومن کا جو حیہ درج ہوتا ہے اس پر وہ پوری اترتی تھی۔ سیاہ فریم کی ہیلدر بینا عینک لگائے سر پر جھووا یہے بال، انتہائی انحصارشوں۔ یہ مامپ اب پچھیس تیس سال پر ادا ہو چکا تھا اور اس میں مزید ترقی کی گنجائش نہ تھی۔

روز میری تھی لیکن اس سے سرل نے شادی کر لی۔

اب مختلف قوموں کلچرل اینڈ گر کا دور شروع ہوا جب مختلف ایشیائی قوموں کے طلباء جمع ہو کر بڑی شدید کوشش کرتے کہ سفید فام طالب علموں کو اپنی اپنی تہذیب کے قدیم ترین ہونے کا ثبوت دے سکیں۔ ”اور مشیل ناج“ ہوتے (جو زیادہ تر بکواس تھے سوائے سریکھا کے ناج کے)، ”نظمیں پڑھی جاتیں“ بے سرے ساز بجائے جاتے۔ ساتھا امریکہ میں یہ ریکٹ نہایت اعلیٰ پیانا پر چلا یا جا رہا تھا۔ بہت جلد اس فارائیشن اور ٹڈل ایشن تماشے سے اس کا جی آکتا گیا۔ اب وہ

اپنے کمرے پر لوٹتا اور کوئی اس سے کہتا کہ تھائی لینڈ والے انڈونیشیا والے کلچرل ایونگ کر رہے ہیں تو اس کا جی چاہتا کہ کھڑکی میں سے کو دکوباہر بھاگ جائے۔ ”جانتے ہو سرل ایشیا سے اپنی مدافعت کر رہا ہے۔“ ڈنیس نے ایک روز بڑے خوفناک طریقے سے انکشاف کیا۔

ایک روز ایک نیا گروپ کالج میں داشت ہوا۔ یہ لوگ ہندوستانی تھے اور دور دراز لکھنؤ سے آئے تھے۔ (بڑی ادائی کی بات یہ تھی کہ لوگوں کے گروہ آتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ ایک روز یہ گروہ بھی چلا جائے گا۔ اسے یہ سوچ کر بڑی پیشہ مانی ہوتی)۔ نئے لوگوں سے وہ بہت کوشش کر کے چھپاتا کہ لاڑنلاں کا بیٹا ہے۔ کسی نے اسے ڈی کیٹیٹ کہا تو وہ جھٹ لڑکے مرنے پر آمادہ ہو گیا۔ تازہ وارد کالوں سے اس کی کافی دن ملاقات نہ ہوئی گواہے معلوم تھا کہ یہ بڑے انگارے نگلنے والے لوگ ہیں۔ کیمبرج میں وہ صرف ایک کالی لڑکی کو جانتا تھا جس سے وہ دیر تک ہندوستان کی تعریفیں کرتا رہا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ پاکستانی ہے۔ اس لڑکی کا نام روشن آ را تھا۔ اس ہندوستانی پاکستانی پاکستانی جھڑے نے اس کا الگناک میں دم کر کھا تھا گوہ اس منځ کا زیادہ نوٹس نہ لیتا تھا۔

وہ ویک اینڈ پر شہر گیا ہوا تھا۔ چند دوستوں کے ساتھ وہ ایک جگہ گیا جہاں ایک اور کلچرل ایونگ ہو رہی تھی۔ یہ ایونگ انڈیا والوں نے منعقد کی تھی، وہ جوتے اتار کر بڑے ادب اور احترام سے فرش پر بیٹھ گئے۔ شاید یہ گورجینتی منائی جا رہی تھی۔ ڈنیس فوراً مرائبے میں چلا گیا۔ مجھے پر بہت سخت روحانی کیفیت طاری تھی۔ سرل اپنی پتلوں کی کریز کی فکر میں غلطان رہا۔ اس سے الٹی پالتی مار کر ہرگز نہیں بیٹھا جا

رہا تھا۔ اس نے اداکی سے ان انگریزوں کو دیکھا جو بڑے اطمینان سے فرش پر سادھوؤں کی طرح بیٹھے تھے۔ یہ کون لوگ ہیں؟ بکر زہوں گے شاید، اس نے کافی سے سوچا ڈنیس ان سب کو جانتا تھا۔ ابھی پروگرام ختم ہونے کے بعد ڈنیس ان سب سے پھر ملے گا اور اس کا ان سب سے تعارف کرائے گا۔ یہ سوچ کر اسے پھر یہ آگئی۔

اتنے میں ایک بُلی پتلی لڑکی اسٹیچ پر آئی اور پکھانا دنس کیا۔ اس کے پلے کچھ نہ پڑا کیونکہ بڑے زور سے تالیاں بھیں۔ سرل نے چیچھے مرکز کر دیکھا۔ سارا ہاں، جو چھوٹا اور گھریلو ساتھا اور جو دراصل ہندوستانی طالب علموں کا تہذیبی سنٹر وغیرہ تھا، اسی طرح کی لڑکیوں سے بُنایا تھا اور قسم قسم کے لڑکے۔ سب بڑے کامریڈا نہ اور کنبے برادری کے سے انداز میں فرش پر بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ لندن کی ہندوستانی کمیونٹی۔

اس لڑکی کو سرل نے غور سے دیکھا۔ روشن کی طرح ایک اور لڑکی۔ باقی اور ہندوستانی لڑکیوں کی طرح موئی ریشم کی ساری باندھے بالوں میں پھول لگائے۔

اب ان لڑکیوں میں سرل کے لیے کوئی انوکھا پن نہ رہا تھا، اگر یہ لوگ روم وغیرہ چلی جایا کریں تو زیادہ بہتر ہو۔ اٹلی اور فرانس میں ان کے لیے زیادہ موقع ہیں، اس نے یونہی سوچا کیونکہ کوئی اور خیال اس کے ذہن میں نہیں آ رہا تھا اور مگر کے متعلق وہ کچھ سوچنا نہ چاہتا تھا۔ رومان پرست مُدل کلاس، جذبات زدہ یوگی اس نے بڑی عیاشی سے سوچا۔ (ان دونوں وہ مغربی عیسائیت اور

یورپ میں تہذیب کا حامی بنا ہوا تھا)۔

اتنے میں سیاہ ساری پہنے ایک گدازی بی بی اسٹچ پر آئیں۔ یہ بی بی پینتیس اور چالیس سال کے درمیان رہی ہوں گی اور پندرہ سال قبل حسینان نسلتہ میں ان کا شمار ہوتا ہوگا۔ ان کی بنگالی شکل تھی۔ بڑی بڑی سرگیں، بچوں کے پھولے گال، کانوں میں سونے کے پھول، بڑا ساجوڑا۔ سیاہ سائزی کے نیچے سفید پہنچ کوٹ پہنچتیں، جو البتہ بڑا عجیب معلوم ہو رہا تھا۔

ان بی بی نے بڑی جادو بھری آواز میں گانا شروع کیا اور بعد گانے کے اس کا ترجمہ انگریزی میں سنایا۔

پھر ایک عدد تقریب میں انہوں نے بتایا کہ نیگور دنیا کا عظیم ترین شاعر تھا۔

”جانتے ہو یہ کون ہیں؟“ ڈنیس نے بڑے رعب سے سرل کو مطلع کیا۔ ڈنیس ساری ہندوستانی کمیونٹی کا شہر خبر رہا۔

”اگر نہ جانتا ہوں تو کیا حرج ہے۔ یہ تھیا سوفیٹ ہوں گی یا ہندوستانی کلچرل کی نلمبردار جو بتلا میں گی کہ atomic تھیوری کو سب سے پہلے شکر اچاری نے پیش کیا تھا۔“ سرل نے بورہ کر کہا۔

”یہ میز شیا امکر جی ہیں۔“ ڈنیس نے بڑے پاس ارادہ میں کہا۔

”لیعنی؟“

”ان سے ملتے رہنا۔ اس میں بڑے فوائد ہیں۔ ان کا یہاں صحافی حلقوں میں بہت اثر ہے، اگر تم او بزرور کے نمائندے بن کر ہندوستان جانا چاہتے ہو تو ان کو کلٹی ویٹ کرو۔“

سرل کے سامنے جو گوناگوں مسائل تھے ان میں سے ایک روزی کا بھی تھا۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ کیا کرے گا؟ بی بی سی؟ وہ پہلے ہی اس کی طرح کے انخلکھواز سے اٹاؤٹ بھری ہوئی تھی۔ کسی فلم کمپنی میں اسکرپٹ رانگنگ؟ اس کی بھی گنجائش کم تھی کیونکہ برطانوی پروڈیوسر امریکن اشتراک سے فلمیں بنارہے تھے اور سرل کو ہر صحیح النسب انگریز کی مانند امریکنوں سے دلی نفرت تھی۔ ملکہ تعلیم؟ وہ بھی کانچ کے لوڈوں کو نہ پڑھائے گا۔ کوئی نیل سروں؟ یعنی میں سرل بیشلے، انسانیت پرست، کنیا یا ملیا یا ویسٹ انگریز میں نوکری کروں گا، سوالا ہیئت پہن کر دو روں پر جاؤں گا، شام کو کلب جا کر گوف کھیلوں گا؟ ہرگز نہیں۔ صرف صحافت ہی آخری جائے پناہ تھی لیکن یہاں بھی سخت مقابلہ تھا۔

پروگرام کے خاتمے پر مجمع تتر ہوا اور لڑکے اڑکیاں لکڑیوں میں منتشر ہو کر زور زور سے با تمیں کرنے لگے۔ ڈنیس اٹھ کر شرمیتی شیا، دہنی کے پاس گیا جو اویز روکے کالم نگار بدل کر گیک سے با تمیں کر رہی تھیں۔ ”نہیلو ڈنیس،“ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

”مسز مکرجی ہمیں اپنے گھر لے جا کر کافی نہیں پلائیں گی؟“ ڈنیس نے اپنی بچوں والی ادا سے ذرا مچل کر کہا۔

”ضرور۔ سب لوگ چلو۔“

ایک خاصا بڑا گروہ ان کے ہمراہ چلنے کو تیار ہو گیا۔ یہ سب لوگ قاضی مذرا لا سلام کی جیتنی کی تیاریوں کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ سرل کو یہ مجمع بڑا لوچ پر معلوم ہوا۔ ان لوگوں نے اپنی مخصوص دنیا تخلیق کر رکھی تھی۔ ان کی اپنی گوپ تھی،

اپنی مصروفیات۔ ان کی آپس میں شادیاں بھی ہوتی تھیں۔ اکثر یہ شادیاں بڑی سمنی خیز ہوتی تھیں یعنی اس لندن میں ایک اور ہندوستانی لندن آباد تھا۔

”چلو۔ چلو۔“ وہ سب شور مچاتے باہر آگئے۔ گلی نیم تاریک تھی۔ لڑکے سگریٹ خریدنے کے لیے ایک پب میں چلے گئے۔ لڑکیاں کہنے لگیں: ”شیا دیدی جھوڑی سی تر کاری خرید لیں۔ آپ کے یہاں چل کر کھانا بنائیں گے۔“

مز مکر جی کافیٹ چیلیسی کی ایک بہت شاندار رہائشی عمارت میں تھا۔ جس میں افت لگے تھے اور گلریوں میں دیزر قالین بچھے تھے اور وردی پوش پورٹر تھے، وہ سب فلیٹ میں داش ہوئے لڑکوں نے سرل سے بڑی بے تکلفی سے باقی میں شروع کر دیں۔ یہ لوگ روشن کی طرح tense نہیں تھیں۔ بڑے گھر میلو اور سیدھے اسادے انداز میں بات چیت کر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک کا نام طاعت تھا اور دوسری کا نز ملا۔ لڑکوں کے نام اسے یاد نہیں رہے۔ یہ لڑکیاں، اسے معلوم ہوا، اسی سال کیمبرج میں داخل ہوئی تھیں۔

مز شیا مکر جی فریڈ پور مشرق بنگال کی رہنے والی تھیں۔ ایک مشہور زمیندار خاندان کی چشم و چراغ، کلچر جن کے یہاں پانی بھرتی تھی۔ انہوں نے خود وشور بھارتی میں پڑھا تھا مگر شادی کے بعد اپنے میاں سے ان کی نہ بنی۔ (شادی مالی ڈیئر، ایک جوا ہوتا ہے۔ گرو ویونے کہیں پر لکھا ہے کہ ---) ان کا ایک لڑکا نلائنگ آفیسر پر فلامکر جی پندوستانی فضائیہ میں ہوا باز تھا۔ خوبصورت لڑکا تھا۔ مز مکر جی اب مدتوں سے یورپ اور لندن میں رہ رہی تھیں۔ ان کے میاں کے متعلق کسی کو علم نہ تھا کہ کہاں ہیں۔

”لیکن اب وہ ایسی بھی قیامت خیز نہیں کہ تم ان پر لٹو ہو جاؤ۔“ وسرے روز ڈنیس نے برا مان کر کہا، وہ لوگ کانج کے ڈائنگ ہال میں ناشتے کی میز پر بیٹھے تھے۔ دو روپیہ سیاہ عباوں کی قطاریں چھری کانتوں کا شور۔ ہال کے سرے کی میز پر پروفیسروں کی دھمی دھمی آوازوں کی بھجنہنا ہٹ۔ اونچے دریچے میں سے باغ کامنٹر ٹرزر کی کسی چینگ کی مانند دکھلانی دے رہا تھا۔

”ایں؟“ سرل نے ذرا جھنجھلا کر کہا۔

”لیکن وقتاً وقتاً ان سے ملتے ضرور رہا کرو، وہ اوپر رور کی کورس پیونڈ منٹ شپ۔۔۔“ ڈنیس نے کاغذ ہوا میں لہرا کر جواب دیا۔

سرل اگلی بار جب لندن گیا تو ان کے فلیٹ کے پورٹر نے اسے بتایا کہ وہ جنیو اجا چکی ہیں، وہ باہر نکل رہا تھا تو اسے ایک اور لڑکی زینے پر ملی اور اسے پیچان کر فرار سا مسکرائی۔ ”ہلو۔“ اس نے کہا۔

سرل نے شانتگی سے جھنگ کر اسے سلام کیا۔ اسے یاد آیا، یہ وہی لڑکی ہے جو اس روز یگور جینیتی میں استیج پر آنا و نسمٹ کر رہی تھی۔

یہ وہی لڑکا ہے جو ڈنیس نے بتایا تھا کہ کسی لارڈ کا بیٹا ہے، چمپانے یاد کیا۔ ”میں بھی مز کمر جی سے ملنے آتی تھی۔“ اس نے سیرھیاں اتر کر سڑک پر آتے ہوئے کہا، ”مگر وہ جنیو اگئی ہوئی ہیں۔“

”آپ یہیں پڑھتی ہیں؟“

”بھی نہیں۔ میں پیرس میں ہوں۔ آپ نہ ملا سر یو اسٹو اکو جانتے ہیں؟ وہ گرشن میں ہے؟“

”جی ہاں۔ میں مس سر یو اسٹوا سے یہیں ملا تھا۔“

”اور مال رضا؟“

”سریکھا دیوی سے ان کا ذکر نہیں ہے۔ ملنے کا اتفاق ابھی تک نہیں ہوا۔ آپ روشن آراء کو جانتی ہیں؟“

”جی نہیں۔ میں پیرس میں ہوں۔ آپ نہ مل سر یو اسٹوا کو جانتے ہیں؟ وہ گرٹن میں ہے؟“

”جی ہاں۔ میں مس سر یو اسٹوا سے یہیں ملا تھا۔“

”اور مال رضا؟“

”سریکھا دیوی سے ان کا ذکر نہیں ہے۔ ملنے کا اتفاق ابھی تک نہیں ہوا۔ آپ روشن آراء کو جانتی ہیں؟“

”جی نہیں۔ میں نے بھی سیکھا اور ڈنیس ہی سے ان کا ذکر نہیں ہے۔“

شروع کے پندرہ بیس منٹ ہمیشہ اس طرح صرف ہوتے ہیں کہ آپ فلاں کو جانتی ہیں اور آپ فلاں سے واقف ہیں اور جی ہاں فلاں بھی میرا کلاس فلیورہ چکا ہے۔

”آپ زرگیش کاؤس جی کو جانتے ہیں؟“ چمپا نے باواز بلند اسفار کیا۔

”جی نہیں، میں کسی کو بھی نہیں جانتا۔ میرا مطلب ہے میرا حلقة احباب ڈنیس کی مانند و سمع نہیں ہے۔“

چمپا کھلکھلا کر نہیں پڑی۔ ”میرا خیال تھا آپ شاید یونگ اشوتوش سے مل چکے ہوں۔“

”میں ینگ اشوتوش سے نہیں ملاؤ کون ہے؟“

”مسز مکر جی کا چھوٹا لڑکا وہ بڑا اچھا آرٹسٹ ہے۔ پیرس میں رہتا ہے۔“

چیلنسی کا انڈر گراونڈ آگیا۔

”اچھا اب آپ سے شاید کبھی کیمبرج میں ملاقات ہو، اگر آپ کبھی وہاں آئیں۔“

”یا شاید نہ ہو!“

”بہر حال اس موہوم امید پر کہ آپ سے کبھی دوبارہ ملاقات ہو میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔“

”خدا حافظ!“ وہ ایک اخبار خریدنے کے بعد تیز تیز قدم رکھتی سرعت سے ایکسلریٹر پر اتر گئی۔ ایک مکمل پر اعتماد جدید ہندوستانی لڑکی۔

اور اب آدھ گھنٹے سے وہ پکیڈلی کے انڈر میں چمپا کے انتظار میں ہیل رہا تھا۔ پچھلے دو سال میں چمپا سے کئی بار اس کی ملاقات ہوئی تھی اور آج چمپا نے اسے اطلاع دی تھی کہ وہ پیرس سے لندن آئی ہوئی ہے اور سریکھا کے یہاں سب جمع ہو کھانا کھائیں گے۔ سرل بیتاب تھا کہ سریکھا کے یہاں پہنچ کر گلشن سے بجٹ کرے۔ خط کے مصنف گوتم نیلمبر نے تقسیم ہند کا سارا الزام انگریزوں اور مسلمانوں پر ڈالا تھا اور لکھا تھا کہ سر د جنگ میں غیر جانبدار رہنے کا جو رویہ اس کے ملک نے اختیار کیا ہے اینگلو امریکن بلڈک، ظاہر ہے، اس کو پسند نہیں کر ستا، وغیرہ وغیرہ۔ سریکھا نے بتایا تھا کہ یہ گوتم نیلمبر بڑا انگارے اگنے والا انسان ہے۔ حال ہی میں ما سکو سے تبدیل ہو کر یہاں آیا ہے۔ سرل کو فوس تھا کہ آج شام کو وہ اس

شخص سے نہیں مل سکے گا کیونکہ سریکھا کی اطاعت کے مطابق وہ لندن سے باہر گیا ہوا تھا۔

سرل بین الاقوامی وقت کے نیچے ہملنا رہا۔

۶۰

کیمبرج میں ایک دکان سے نکل کر نر ملا لائبریری کی طرف جا رہی تھی کہ اسے گوتم نیکبر دکھلائی پڑ گیا۔

”نرمل _____ میں تو تم کو سارے میں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔“ گوتم نے لپک کر اس کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ”ایک انگریز مجرد خاتون تمہارے کانج میں ملیں جو شاید عربی فارسی پڑھاتی ہیں۔ انہوں نے مجھے ڈانٹ کر پھٹکا دیا، پھر مال نے کہا شاید اس وقت تم لائبریری میں ہو _____ کیسی ہو _____ کیا حال چال ہیں؟“

نرمل نے ہنکھیں بند کر لیں۔ یہ گوتم تھا جو اس کے سامنے کھڑا اس سے جلدی جلدی با عنیں کر رہا تھا۔

”تم یہاں کیسے آ گئے؟“

”لندن سے آیا ہوں، تم لوگوں سے ملنے۔“

”سنا ہے تم اب با قاعدہ فارن سرویس میں ہو۔“

”ٹھیک سنا ہے۔“

”مزے میں ہو؟“

”ہاں۔“

باتیں ختم ہو گئیں۔ گوم نے دیکھا کہ نر ملابڑی ہو گئی تھی: سمجھیدہ باؤقار، کم گو۔
”لائپریمی گول کرو۔ مال اور طاعت نے کہا ہے کہ نور میں ٹیکے گے۔ چلو۔“
نر ملابڑی سے اس کے ساتھ ہوئی۔ برادر سے سیاہ عبا میں پہنے طالب
علوم کی ٹولیاں گزر رہی تھیں۔ نر ملابڑی کو بتاتی جا رہی تھی۔ یہ ڈنیس ہے، وہ
روشن جا رہی ہے، وہ سرل لیشلے ہے، اوہر والا بلومڈ لڑکا۔ یہ بھی اپنے وقت کے
اکیلے ہیں۔ ان کا جواب نہیں۔ یہ بھی چمپا باباجی کے چیلے بن چکے ہیں۔“

”اچ چھا چھا سے تم لوگوں کا مانا ہوتا رہتا ہے۔“

”اکھر۔“

”خوش ہیں؟“

”کیا پتا خوش تو بڑی اضافی چیز ہے۔“

گوم خاموش رہا، وہ کنگز کانج کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ ہلکی ہلکی بارش
شروع ہو چکی تھی۔

”مجھے لگتا ہے، ”نر ملابڑی تھی، ”کہ چمپا باباجی چند سال بعد مز مر جی کی ایسی
بن جائیں گی کتنے دکھ کی بات ہے۔ تم جانتے ہو مز مر جی کو

”

”ہاں۔“

”وقت چوٹ دے کر چپکے سے آگے نکل جاتا ہے۔ کتنے دکھ کی بات ہے۔“

”نرملانے دہر لیا۔ گوتم اب بھی خاموش رہا۔

”شیا ادمی پندرہ بیس سال پہلے کیا چیز ہوں گی۔ لوگ ان سے دو باعثیں کر لیں بھی فخر سمجھتے تھے۔ اب بے چاری اپنے بیٹوں کی عمر کے لڑکوں کو گھیر گھیر کر لے جاتی ہیں اپنے یہاں کافی پلانے۔ کتابیں لکھتی ہیں۔ فلیٹ اسٹریٹ میں مشہور ہیں، مگر کیا ان کی کتابیں اور ان کی شہرت زندگی کی ذاتی صرفت کا بہتر معاوضہ ہے؟ چمپا باجی بھی ایسی ہی بن جائیں گی حالانکہ قصور ان کا نہیں تھا۔ وقت نے ان کو چوٹ دی۔ انہوں نے دوسروں کو چوٹ دینے کی کوشش کی تھی۔“

گوتم چونک اٹھا۔ اس نے نرمل کو غور سے دیکھا۔

نرمل کی آنکھوں پر بارش کی ایک بوند آن پڑی۔ اس نے اپنا چہرہ رومال سے صاف اور کھتی رہی:

”یہرل کا دور ہے کیونکہ وہ لارڈ ایشلے کا پیٹا ہے جس طرح تم سر دیپ نرائن اور بھیا صاحب سرذ کی رضا بہادر کے فرزند تھے۔“

”نرمل تم چمپا کے ساتھ بہت بے انصافی بر تر رہی ہو۔“ گوتم نے آہستہ سے کہا۔

”نہیں گوتم، یہ واقعہ ہے۔ چمپا باجی نے علاوہ اس کے کوہ خود مایوس ہوئی ہیں ہمیں بھی مایوس کر دیا ہے۔ کل مال کہہ رہا تھا کہ کیا بات ہے چمپا باجی کا سحر رفتہ رفتہ بالکل زائل ہو گیا۔ اس پر طاعت نے بھی ٹھیک بات ہی کہی تھی۔ اس نے کہا کہ چمپا باجی وہی ہیں، ہم لوگ بڑے ہو گئے ہیں۔“

گوتم نے اداسی سے دیکھا۔ نرمل نے بات جاری رکھی۔

”پیرس میں تھیں مگر کام ادھورا چھوڑ کر انگلستان آ گئیں۔ اب سنا ہے لندن میں کہیں نوکری مل گئی ہے اور اب یہاں بھی داخلہ لینے والی ہیں۔ اپنے متعلق کوئی فیصلہ بھی تو نہیں کر سکتیں۔ حد ہے۔ گوم، چمپا ان لوگوں میں سے ہیں جن کو ہمیشہ کسی نہ کسی جذباتی سہارے کی تلاش رہتی ہے۔“

جیہرے لین میں سے ڈرمیٹ کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ گوتم ٹھہر گیا۔

”جانے کون ہے۔ اکثر بڑی غمگین دنیں بجا تا ہے۔“ نرملانے کہا۔ بارش کی پھوار میں اس کے بال بلکل بھیگ گئے۔ ”بھیا صاحب بھی لندن میں تشریف رکھتے ہیں۔ پاکستان ہاؤس میں ڈپلومیٹ ہیں۔ آج کل وہ بہن روشن کو اپنی قینٹنگر دکھاتے رہتے ہیں۔“

اب وہ کوہ نور تک پہنچ چکے تھے۔

”گوتم،“ نرملانے سوچتے ہوئے پوچھا، ”لوگ اتنے پھٹکر کیوں ہوتے ہیں؟“

وہ خاموش رہا۔ قریب سے طباء کا ایک غول گزر گیا۔ سڑک کے کنارے لا تعداد زرد پھول کھلے ہوئے تھے۔ بارش کی بوندیں کیم کی سطح پر جلتے گے بجارتی تھیں۔

”نرملانے۔“ گوتم نے رُک کر کہا۔

”فرمائیے۔“

”تم مجھ سے شادی کرو گی؟“

”ہرگز نہیں۔“

”کیوں نزل“ آواز اس کے حلق میں آئی۔

”اس لیے“ نرملانے بڑی صاف اور گہری آواز میں کہا، ”کہ تم بھی بھلپھل ہو۔

آؤ اندر چلیں بیاش میں مت بھیگو۔“

نرملانے بڑی ہو چکی تھی۔

وہ طعام خانے کے اندر داخل ہو گئے۔

۶۱

صحیح بجھے چمپا اٹھ پڑھی۔ سورج کی ایک تیز اور گرم کرن عین اس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہی تھی، وہ دو بجے تک سریکھا کے یہاں پیس ہائکتے رہے تھے۔ آخر لوگ اتنی باتیں کیوں رکتے ہیں؟ غسل خانے میں سے جون نے سرناکال کر جھانکا۔ ”آج تمہاری ملازمت کا پہلا دن ہے۔ جلدی تیار ہو جاؤ۔“ چمپا نے بستر سے اتر کر الماری کھولی اور بڑی کوفت سے ساریوں کو دیکھا، پھر اس نے جون کو آواز دی: ”میں ورنگ کلاس لڑکی ہوں۔ بتاؤ کون سی ساری پہنوں۔“ پھر ناشتا کر کے وہ بس میں پڑھی اور سینٹ جانز ووڈ پہنچی۔ بل کے فلیٹ پر جا کر اس نے گھنٹی بجائی۔ ”کم آن ان“ کسی نے اندر سے بیاش آواز میں کہا، وہ مزید ہمت کر کے اندر پہنچی۔ کمرے میں آتش دان کے سامنے صوف بچھا تھا۔ پنج تپایوں اور اثر اماڈران آڑھک طرز سے کمرہ سجا گیا تھا۔ دیواروں پر جدید آرٹ کی تصویریں ٹھکی تھیں۔ ہندوستانی مجسمے رکھے تھے۔ ایک ایشنا تابے نیازی کی شان

سے آگ کے سامنے بیٹھا تھا۔ بل صوفے پر لیٹا کچھ پڑھ رہا تھا۔ ”ہلو مائی ڈینر کیا پیو گی؟“ ”کچھ نہیں۔ شکریہ، چمپانے کہا۔ پیرس میں رہ کر اسے معلوم ہو چکا تھا کہ بولنیکیا کے افراد کس اپنا نیت اور بے تکلفی سے ایک دوسرے کو مخاطب کرتے ہیں۔

”پروف ریڈ کرنا آتا ہے؟“ بل نے بے پرواںی سے ایک پلندہ اس کے سامنے ڈال دیا اور باورچی خانے میں جا کر کھڑپر کرنے لگا۔

شانتا کشمیری ریشم کی سیاہ سبز اور سرخ ھولوں والی ساری اور سیاہ کارڈیگن پہنے زینے پر سے اتری جو کمرے کے ایک کونے میں تھا۔ شانتا، چمپانے دیکھا کہ بے حد حسین تھی۔ بڑے برسک انداز میں وہ ٹائمپ رائٹر پر جا کر بیٹھ گئی۔ پرانی میں اپنے میاں سے طلاق لینے کے بعد گوتم سے شادی کرنے کے بجائے اس نے بل سے شادی کیوں کی۔ عجب ٹھپا ہے زندگی۔ چمپانے تعجب سے سوچا۔ ”گذمارنگ مزکر گیگ۔“ اس نے اخلاق سے کہا۔ سنا ہے مرہٹی میں بڑی عمدہ کہانیاں لکھتی ہے۔ اب میں اس کی کہانیاں پڑھنے کے لیے مرہٹی سیکھنے سے تو رہی۔ اس نے سرل سے کہا تھا۔ ہاں۔ مرہٹی مت سیکھنا۔ اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ سرل نے جواب دیا تھا۔

”میں گوتم سے تمہارا بہت مذکرہ سن چکی ہوں۔ یہ بڑی مختصر دنیا ہے۔“ شانتا نے ٹائمپ کرتے ہوئے اظہار خیال کیا۔

بل کافی کی کشتی اٹھالا یا۔ چمپانے محسوس کیا کہ شانتا خاصی مغرور ہے۔ بل اتنا ہی خلائق تھا۔

فرینک وہ کاغذات کا پلنڈہ اٹھا کر پر لیں جانے کے لیے تیار ہوئے۔ چمپا کو بل کے پیشگز ہاؤس میں پروف ریڈر کی ملازمت کرنے کا یہ پہلا دن تھا۔

”تمہارا کیا پروگرام ہے زندگی کا۔“ بل نے اس سے لمحے کے وقے میں پوچھا، وہ انسانوں کو بھی پروف ریڈ کرتا تھا۔

”یہ تو بڑا ذریعہ سوال ہے۔“

”کیا تم بہت کنفیوزڈ ہو؟“

”ہاں۔“

”تم بھی جال میں گرفتار ہو؟“

”ہاں۔“

بل مشکل کر خاموش ہو گیا۔ سب جال میں گرفتار تھے، وہ خود اور اس کی بیوی شانتا جو پہلے شرکتی شانتا نیلمبر تھی اور انگریزی اور مرہٹی میں تاولِ لکھتی تھی اور سرلِ لمشکلے اور سارے مصنفوں اور ادیب اور ذہن پرست سارے مغربی انسان، اور مغربی یورپیں تہذیب، اور نیا ایشیا، جس کے نمائندے یہاں موجود تھے، مختلف جہنموں کے درمیان معلق تھے۔ انہیں اب معلوم ہوا کہ پل صرار پر چلنا کیا معنی رکھتا ہے۔ ان کی مسلمان اور ہندو اور بدھ روحوں کو بہت سی تکالیفِ لاحق تھیں۔ یہ لوگ جن کے متعلق ٹولنی نے وس کتابیں لکھ دی تھیں اور اب تک کسی اطمینان بخش نتیجے پر نہ پہنچ سکا تھا۔

اور نیا ہندوستانی اپنی روحانی بلندی اور اپنی تہذیب کی برتری کے سلسلے میں جارحانہ بنتا چا رہا تھا۔ یہ پلبھی کی دنیا تھی۔ رسالوں اور کلچرل پروپیگنڈے کے

پھلٹوں اور کتابوں میں چھپنے والے کروڑوں الفاظ کی دنیا اور بل الفاظ کا تاجر تھا اور الفاظ کی طاقت اور الفاظ کے کھو کھلنے پر میں یقین رکھتا تھا اسی لیے وہ شام کو اپنے اسموڈ یوفلیٹ لوٹ کر شانتا کو تلقین کرتا کہ وہ گیتا کا دوسرا ادھیائے پڑھے اور شانتا ہنستی تھی، وہ بھی جال میں گرفتاری تھی۔ ان سب کی پرائیویٹ جمیں، ذاتی تھے خانے اور نجی کائنات میں زیادہ تکلیف وہ اس لیے تھیں کہ ان میں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔

ایک راستہ تھا مگر وہ بے حد ہولناک تھا۔ بل نے چمپا کو دیکھا۔ ”کیونت کبھی نہیں بنیں؟“

وہ چپ چاپ پیٹھی آلو کھاتی رہی۔

”تم افسانے لکھا کرو۔ میں تم کو لڑاپ کروں گا۔ ہندوستان کے متعلق ناولوں کا اس وقت انتہائی زبردست اسکوپ ہے۔ آر۔ کے فرائیں اور ملک کو دیکھو۔ تم بھی لکھو، سمجھیں۔“ اس نے فیصلہ کرنے انداز میں کہا۔

”افسوں کے میں تمہارا مطالبہ پورا نہیں کر سکتی۔ مجھے لکھنا بالکل نہیں آتا۔“
”اچھا؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ تمہارے گروپ میں تو ایک سے ایک لیکھک موجود ہیں۔“

”مجھے گروپ سے مماثل مت کرو۔“

”اچھا۔ تو آپ کا fad یہ ہے کہ آپ انفرادیت پسند ہیں۔ اچھا ہے یہ بھی۔“ بل نے جواب دیا، پھر وہ لمبے ڈگ بھرتا فتر کی طرف چلا گیا۔ چمپا طعام خانے کی میز پر پیٹھی رہی۔

یہ چوزے کی سرائے تھی جہاں بہت سے جانے والے دوپہر کے کھانے کے لیے جمع ہوا کرتے تھے۔ قریب ہی بی بی سی کے اسٹوڈیو تھے، وہ دیورس کا انتظار کرتی رہی تاکہ پیسے چکائے۔ چند لڑکیاں کمرے میں داش ہوئیں اور اس کو دیکھنے بغیر کاؤنٹر کی طرف چل گئیں۔ ”یہ چمپا احمد ہیں۔ دوسروں کے ملکیت پھانٹاں کا کریز ہے، اگر تم سمجھو کر میں اکینڈل مونگر نگ کر رہی ہوں تو نر ماسر یا استو اسے پوچھو جئے ٹی بی ہو گئی ہے۔“ ایک لڑکی نے کاؤنٹر پر سے ٹرے اٹھاتے ہوئے کہا۔

”نر ملا کوئی بی ہو گئی؟“ دوسری نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں اور وہ مدد ہر سو سنبھی ٹوریم جانے والی ہے۔“ پہلی لڑکی نے جواب دیا۔ دونوں باتیں کرتی ہوئی اپنی اپنی ٹرے اٹھا کر کمرے کے دوسرے سرے پر چل گئیں۔

تب چمپا نے چاہا کہ دوڑکران کے پاس جائے اور ان سے پوچھے: نر ملائیسی ہے؟ اسے ٹی بی کس طرح ہوئی؟ مگر وہ سکتے کے عالم میں ویسی بیٹھی رہ گئی۔ در پچے کے باہر سڑک پر سے رنگارنگ ہجوم لگز رہا تھا، پھر اسے بہت سی جانی پہچانی شکلیں اپنی اور آتی نظر آئیں۔ بہت سے سفید ما سک جن کے اوپر ان کے نام لکھے تھے: زریشہ، سریکھا، طاعت، زگیش، کملہ، فیروز۔ یہ سب دوسرے دروازے سے طعام خانے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے اسے ہلو ہلو کہا اور دوسری طرف چلے گئے، وہ سب نر ملائی بیماری کا تذکرہ کر رہے تھے اور بے حد پر بیشان نظر آتے تھے۔

پھر تیسرے دروازے سے عامر رضا داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ سرل کی ہم جماعت روشن آراء تھی۔ عامر رضا کو چمپا نے آج اتنے برسوں بعد دیکھا۔ ان میں

کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی سوا اس کے کہ پہلے سے زیادہ قیمتی سوت پہنے تھے اور زیادہ اعتقاد سے قدم رکھ رہے تھے۔ انہوں نے چمپا کو دیکھا۔ ذرا ٹھہر کر بڑے اخلاق سے آداب عرض کیا اور دو روکونے کی میز پر جا بیٹھے۔

”یہ دونوں ہم سب سے دور رہی رہنا بہتر سمجھتے ہیں۔“ طاعت کی میز پر کسی نے نہ سکر کر کہا۔

”اچھا ہی ہے۔ ہماری تنگت میں ان کے خیالات خراب ہو جائیں گے۔“ کسی اور اڑکی نے جواب دیا۔

”اورا یمان جو خراب ہو گا وہ الگ۔“

”وہ الگ۔“

چمپا نے خلاف ارادہ سر اٹھا کر ان کو دیکھا: سید عامر رضا، گل فشاں والے لا مارٹینز کانج والے بھیا صاحب۔ انسان جن لوازمات اور الیسوی ایشنز کا مرکب ہوتا ہے وہ پل کی پل میں کیسے بدلتے ہیں! اور یہ روشن نہ جانے کون تھی۔ بے چاری اڑکی۔ جو نہ سکر ان سے باعثیں کر رہی تھی۔ دنیا کے اندر اور کتنی دنیا میں ہیں۔

چمپا نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ بیگ اٹھا کر طاعت کی میز کی طرف گئی اور ان لوگوں سے نرملائی خیریت دریافت کرنے کے بعد اپنے ففتر کی طرف روانہ ہو گئی۔

سامنے دیودار کا جنگل ہے۔ سرخ پتوں نے چاروں اور آگ لگا رکھی ہے۔
وادی میں ٹرینیں مکانوں کے پیچھے الگنیوں پر پھیلے کپڑوں میں سلہراتی اتر کی اور
جاری ہیں۔

پارک میں زرد پتے اڑ رہے ہیں۔ جھیل میں ایک اکیلی کشتی ڈالتی ہے۔ آرام
کرسیوں پر عسرت زدہ پیش یافتہ بوڑھے اپنی بے یار و مددگار آنکھوں سے سامنے
کا دھنڈ لکا دیکھتے ہیں اور کا نیچتے ہاتھوں سے کاغذی لفافوں میں سے بن نکال کر
کھار ہے ہیں۔

آج کا دن ایک اور دن ہے۔ مل پر سے انسانوں کے گروہ یونیورسٹی، لاء
کورٹس ٹھیکی اور جارہے ہیں۔ میں کون ہوتی ہوں کہ اس اہمیت میں شامل رہنے
سے انکار کروں۔ ہاں یہ بالکل صحیح ہے۔ مجھے ڈرگلتا ہے۔ چوزے کی سرائے میں
وہ سب سرخ میزوں کے گرد جمع باتوں میں معروف ہیں۔ یہ کون لوگ ہیں؟ کیا یہ
zero-hour ہے۔ مجھ سے بہت فاصلے پر اڑا کیاں اڑتی جا رہی ہیں اور سال ختم
ہوا جاتا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے کہ ایک کراسن آ کر گزر گیا؟ میں کیوں فکر کروں جبکہ آج
کی تہلکہ خیز خبریں کل روای میں بکتی ہیں۔

گوینٹ سیستیاں اپنے تیر کے انتظار میں کھڑا ہے۔

روشن نے سوچا۔

دیودار کا جنگل شفق کی سرخ روشنی میں چھپ گیا۔ اس جنگل سے میں بھی
گزری ہوں۔ ہم سب گزرے ہیں۔ میں نے اس میں بیدر کے چھوٹے چھوٹے
شگونے جمع کیے تھے۔ (طاعت نے کہا۔)

کانچ میں چھٹیاں ہیں۔ صولت روم سے آئی ہوئی ہے اور شکنستا کے یہاں
ٹھہری ہے۔ ہم سب کملاء کے گھر میں محفوظ بیٹھے ہیں۔ گھر نیچے صوف،
فرش پر بکھری ہوئی کتابیں، کھڑکی میں رکھی ہوئی انناس کی توکری ٹیوٹن اور سرل کی
بنائی ہوئی کیوبس تھا ویرپرانے مبوسات۔ تم چوالہا سلاگاڈ میں پورٹر کوفون کرتی
ہوں، دودھ کی بوتلیں کہاں رکھ گیا؟ مسٹر جنکز یہاں
مس نومس۔ ایک کمرہ ساری کائنات کا مرکز ہے۔

اوفوہ روشن ڈیئر، آج اتنا کام تھا۔ کملاء کہہ رہی ہے، چند روز بعد دولت مشترکہ
کے وزراء عظم کی کافرنس ہے اور پھر سارا انفرمیشن ڈویژن۔ کشمیر کا مسئلہ، کوریا
کا مسئلہ، کمیونٹی پروجیکٹس، آسام کے لوک ناج، پبلیٹی پبلیٹی۔

گیلری میں اوپر کی پانچویں منزل سے افت آن کر رکا۔ نرگیش اندر آئی، وہ
سب مل کر شکنستا کے یہاں پہنچے جہاں ڈرائیگر روم میں شانتا اور مل موجود تھے اور
سیکھا، رام گوپال کی پارٹر سیدھی سادی، دلچسپ، خلیق اور ذہین چنگی لڑکی جو
دیکھنے میں مرہٹی نظر آتی تھی اور زرینہ بلونڈ نفت زبان، آرٹسٹ جو فرائٹ سے روئی
بول رہی تھی، وہیں ڈلن طامس بھی بیٹھے تھے۔ ان سب کا روشن سے تعارف کرایا
گیا۔ ایک دنیا کے اندر اور کتنی دنیا میں ہیں، اس نے سوچا۔

پیرس میں ایک روز عامر رضا نے اسے مادوز میل دوپاری گا کر سنایا تھا اور اس
سے کہا تھا: متیس کی تصویریوں کے پیچھے گھوما گھوما پھرتا ہوں۔ میں صریحاً متیس پر
عشق ہوں۔ آپ کی شکل بھی متیس کی پینینگ کی ایسی ہے اور اس نے کہا تھا:
”حسین خاتون، میں سکون کی تلاش میں ساری دنیا میں گھومتا ہوں۔ جہاں سایہ ملا

وہاں بیٹھ گیا۔ کسی روز میں آپ کو اپنی کہانی سناؤں گا۔ ”وہ کہانی کیا ہوگی؟“ کہانی لکھنے والا کون ہے اور سننے والا کون؟ جی ہاں، میں نے پروفیسر رادھا کرشن کے یہ پھرائندہ کیے ہیں۔ جی نہیں _____ میں ہیگل پرمونوگراف لکھ رہی ہوں۔ اس نے مزکر بل سے کہا۔ جی نہیں مجھے دیانت سے دلچسپی نہیں۔ مغربی فلسفہ میرا موضوع ہے، وہ بتیں کرتی بالکنی کی طرف چلی گئی جہاں چاند مکانوں کی چمنیوں میں الجھا ہوا تھا۔ نیچے شفاف سڑک پر سے بسیں گزر رہی تھیں۔ تھیزوں میں تمثیلیں اسٹیچ کی جا رہی تھیں۔ دریا پر سے جہاز گزر رہے تھے۔ نیم تاریک اسموڈیوز کے دریچوں میں سے بھی یہ چاند اندر رجھا نک رہا تھا جہاں ناکام مصور اور گمنام اویب اور دلتمد مصور اور مشہور اویب اپنی اپنی کائنات میں گھرے بیٹھے تھے۔ حد نظر تک مکان تھے جن میں لوگ رہتے تھے۔ ان کو روشن نہیں جانتی تھی۔ عالیشان مکان اور مدل کلاس مکان اور غریبوں کے مکان اور قلعے اور محل اور کانٹھ۔ ان سب جگہوں میں دکھ اور سکھ اور محبت اور نفرت اور امید اور نا امید اور کامرانی اور شکستہ دلی کے ڈرامے ہو رہے تھے۔ بالکنی سے شہر ڈی نیرو کی ایک پیننگ کی طرح نظر آ رہا تھا: سرخ اور زرد اور سیاہ و چبوں اور لکیروں کا ہیئت ناک مجموعہ۔

جون کا رہر کا مکان ایک ٹنگ و تاریک گلی میں تھا جس میں دکٹورین عہد میں اصطبل تھا۔ اصطبل کے اوپر کو چمین کے کمروں میں جون اور نیل اور او جیت رہتے

تھے۔ نیل انجینئر ہونے کے علاوہ اس محلے کی اشتہانی جماعت کا سیکرٹری تھا۔ اوجیت قانون پڑھ رہا تھا۔ جون کی برج میں سرل سے دو سال سینئر رہ چکی تھی اور یہاں یونیورسٹی میں منگرین زبان پڑھاتی تھی۔ کوچمیں کے کمرے بہت خستہ حالت میں تھے۔ باورچی خانے میں کتابوں کی الماریاں تھیں اور نیل کی ورکشاپ جس میں وہ گھریاں اور بچوں کی موڑیں بنایا کرتا۔ اس کی بیوی نے اسے طلاق دے کر کسی مشہور ریٹائر سے شادی کر لی تھی بوجہ نیل کی سیاسی مصروفیات کے۔ اس کے دو بچے تھے جو گاؤں میں اپنی دادی کے پاس رہتے تھے۔ فرصت کے وقت میں بے حد انبہاک اور تندہی سے کوئی میکینکل کھلونا تیار کرتا اور مہینے کے آخر میں اسے اپنے بچوں کو دے آتا وہ بے حد کم گوانسان تھا۔ باورچی خانے میں ایک ٹوٹا صوف بھی پڑا تھا۔ ایک شکستہ اسموو کے اوپر ریڈ یور کھا تھا جو اکثر بند رہتا تھا۔ نیل اسے ہمیشہ اور ہال کرتا رہتا تھا۔ فتحت خانہ عموماً خالی رہتا۔ برتن وہوںے کا حوض برتنوں سے بھرا رہتا کیونکہ اس مکان کے تینوں مکین بے حد کالیں تھے۔ الماری میں سے کبھی کبھار ایک آدھ پنیر کا لکڑا یا باسی ڈبل روٹی نکل آتی کیونکہ اس گھر کے مکین بے حد مفلس تھے۔ اوجیت غریب طالب علم تھا اور نیل اور جون اپنی تختوں پر کام کرتا۔ بیشتر حصہ پارٹی کو دے دیتے تھے۔ اوجیت کے کمرے میں ایک نیچا سا پلنگ پڑا تھا جو بیک وقت اس کی سنگھار میز، ڈریک، کپڑوں کی کھونٹی اور بک شیلف کا کام دلتا۔ بہت سے خیرخواہوں نے کمرہ مت باندھ کر اوجیت کے کمرے میں تھوڑی سی تنظیم پیدا کرنے کی کوشش کی مگر وہ ان سب کوششوں کو کامیابی سے رایگاں کرتا رہا۔ غسل خانے کی چھت کے باہر ٹیرس تھا جس پر تام چینی کے ٹوٹے برتن اور لکڑی کا

صدوق پڑا تھا جس کے پیچھے محلے بھر کی بلیاں رات کو آ کر لڑتی تھیں۔ نیچے گلی میں صح صبح لمبی ایسا لوں والے گھوڑوں کی گاڑی آ کر رکتی اور دودھ والا دودھ کی بوتلیں دروازے کی دلیز پر رکھتا۔ اسی گلی کے نکڑ پر چارلس ڈکنز کا مکان تھا۔

جون کا رٹ کا کرہ اس فلیٹ میں گویا ہر میجھی کو نہیں ایلز بھکے کمرے کا درجہ رکھتا تھا۔ الماریوں میں ان گنت کتابیں ٹھنڈی تھیں کیونکہ، ہن جون کا رٹ اللہ کے فضل سے چھ سات یورپین زبانوں کی ماہر تھیں۔ آتشدان پر رنگ برلنگی لڑیاں اور مشرقی یورپین ممالک کے نوا درجے تھے کیونکہ جون ہر سال مشرقی یورپ میں منعقد ہونے والے نوجوانوں کے میلوں میں جایا کرتی تھیں اور وہاں سے تھنوں کے انبار ساتھ لاتی تھیں۔ اس کمرے کے دریچے میں سرخ جرنیم کے پودے تک موجود تھے۔ پلنگ کے برابر نیلیفون لگا تھا۔

چپا احمد چند ہفت قبل پیرس سے آ کر جون کے یہاں ٹھہری تھی جس سے اس کی ملاقات سرل نے کرائی تھی، وہ پبلشنگ ہاؤس سے لوٹ کر یہاں پہنچی تو اسے جون دروازے میں کھڑی ملیں۔ میں ذرا ایک من کانگریس کے لیے وارسٹک جا رہی ہوں۔ میرے آنے تک تم یہیں رہو۔ راشنکے کوپن آتشدان پر رکھے ہیں اور اوجیت سے کہے جا رہی ہے کہ وہ ہشڑی آف سوویٹ کیونٹ پارٹی تم کو با قاعدگی سے پڑھاتا رہے۔ اتنا کہہ کروہ غائب ہو گئی۔

صح سویرے دودھ کی بوتلیں گیلری میں سے اٹھا کروہ باورچی خانے میں گئی اور ناشہ کیا اس کا خیال تھا کہ دونوں لڑکے ڈریںگ گاؤں پہنے اپنے کمروں میں سے نکل کر گذ مارنگ کہتے چاء پینے کے لیے آ جائیں گے مگر وہاں کا باوا آدم

ہی نرالا تھا۔ دیر تک انتظار کرنے کے بعد ان نے ان کے دروازوں پر جا کر آوازیں دیں مگر جواب ندارد۔ فوجی اوجیت سو کرائھے۔ معلوم ہوا کلاس گول کر دی ہے، ارادہ ہے پلٹ پر لیٹ کر ہی مطالعہ کریں گے۔ نیل چھوڑی دیر بعد برآمد ہوئے۔ خندی چاءپی کر بڑےطمینان سے کوٹ کندھے پر جھلاتے لمبے ڈگ بھرتے زینے پر سے اتر گئے۔

فرانسیسی امداز میں کندھے اچکا کر چمپا مسکرا لی اور بر ساتی اوڑھ کر اس نے بھی اپنے دفتر کا رخ کیا۔ یہ دستور العمل اسے ناپسند نہ ہوا۔ جس کی موڑ ہوئی دوسرے سے بات کر لی ورنہ اپنے اپنے کام میں مگن رہے۔ دیک امنڈ پر فیروزیا سیکھا کے یہاں محفل جمی اور رات گئے تک ہنگامہ رہتا۔ چمپا بنا رس اور لکھنو اور پیرس کے بعد زندگی کے اس پیٹران کی بھی عادی ہو گئی۔

گوتم، چمپا سے کہیں نہیں ملا۔ سنا تھا کہ اب وہ بے حد اہم آدمی بن گیا ہے، بے انہیا مسروف رہتا ہے، انہیا ہاؤس کا سب سے زیادہ کار پرواز افسر ہے۔ مال کی بہرج میں تھا۔ ہری شکرامر یکہ میں۔

ایک روز وہ اور اس ب کے ساتھ ہندوستانی طالب علموں کی کافرنس میں گئی جوایں کے سو بڑے زاروں میں منعقد کی گئی تھی۔ یہاں وہ سب دن بھر ناپتے اور گاتے اور سپوزیم اور مشاعرے منعقد کرتے۔ ایک رات جب وہ ایک چیری کے درخت کے نیچے کھڑی نوجوانوں کے اس ہنگامے کو دیکھ رہی تھی جو چاند کے تلے بزرے پر پا تھا، اسے محسوس ہوا کہ وقت پانی کی طرح سر سراتا اب بہت تیزی سے بہہ رہا ہے، جس طرح سکرامنڈی پر خطر پھائیوں اور گھائیوں میں پہنچ کر تندرو

ہو جاتی ہے اور وہ ایک چٹاں پر علیحدہ اور تنہا کھڑی ہے۔ نوجوان اڑکوں اور اڑکیوں کا بہت بڑا اگر وہ اندر نیشنل گارہاتھا، بیک وقت اس کے الفاظ انگریزی، اردو اور فرانسیسی میں ادا کیے جا رہے تھے، وہ کان لگا کر سنتی رہی: دنیا بھر سے ایک ہوئے نوجوان ایک آ درش مہمان لیے۔

One great vision unites us, tho} remote be the

1 a n d s o f o u r

birth.

Foes may threaten and smite us, still we live to

b r i n g p e a c e

to the earth.

Ev'ry country and nation stirs with youth's

a s p i r a t i o n .

Young folks are singing, happiness bringing,

f r i e n d s h i p t o

all the world.

Ev'ry where the youth is singing freedom's song,

f r e e d o m s

song, freedom's song.

یہ سب یہاں سے جا کر کیا کریں گے، ان کے ساتھ کیا ہوگا، باہر کی دنیا کے

ساتھ ان کو کیسے سمجھوتے کرنے پڑیں گے؟ برادر سے بڑانوی لڑکوں اور لڑکیوں کی ایک نویں دیلش لوک گیت گاتی گزری۔ دور فارم ہاؤس کے ہال میں ڈرامے کی مشق کی جا رہی تھی۔

میں نے یہ سب پہلے بھی دیکھا ہے۔ میں نے یہ سب پہلے بھی دیکھا ہے۔ اس نے ایلیٹ کے کردار کی طرح دہرا�ا۔ اس کے قریب سے دو لڑکیاں اور ایک بوڑھا آدمی با تین کرتے گزرے۔ اس نے چاندنی کے دھنڈ لکھ میں غور سے دیکھا۔ لڑکیاں فیروز اور طاعت تھیں جو پروفیسر لیوی سے با تین کرتی بزرے کی طرف جا رہی تھیں اور اس ماحول اور ان فضاؤں میں مکمل چطور سے گھلی ملی معلوم ہو رہی تھیں۔ میں ہمیشہ ہر جگہ علیحدہ رہوں گی، اس نے اپنے آپ سے کہا، حالانکہ اوجیت مجھے ساری ہستیری آف سویوٹ کیونٹ پارٹی پڑھا چکا ہے۔ آخر میں وہ سب کیوں نہیں کر سکتی جو دوسرے کرتے ہیں؟ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی جا کر سمجھراتی لڑکوں اور لڑکیوں کے گر بار میں شامل ہو گئی جو باغ کے ایک حصے میں جا رہی تھا:

ہے گوند را گھو چن اب تو جیون ہارے
سندھ کے کنارے، سندھ کے کنارے
لڑکیوں نے دہرا�ا۔

الا اُسرد ہو چلا تھا، وہ سب گھاس پر بیٹھے رہے۔ چاند فارم ہاؤس کی چمنی پر پہنچ گیا۔ باران میں سے اکارڈین کی آواز آرہی تھی۔

پروفیسر لیوی باتیں کیا کیے۔ ان کی کتاب 'ٹریپر ان دی آف سائنس'، ایک گھنٹے سے زیر بحث تھی۔ ان کے برف کے ایسے بال چاندی کی روشنی میں چاندی کی مانند چمک رہے تھے۔ ہوا میں خنکی آچکی تھی۔

"مجھے کچھ اپنے متعلق بتاؤ۔" انہوں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اپنے متعلق؟" طاعت نے جواب دیا، ہم لوگ _____ ہم لوگوں میں کوئی خاص بات نہیں _____ بالکل ذرا سا بھی کوئی اسرار نہیں۔
قطعًا _____"

پروفیسر لیوی کے اور ان لڑکیوں کے درمیان کتفا بڑا فاصلہ تھا۔ پروفیسر کی اور ان کی عقولوں اور ععروں میں نصف صدی سے زیادہ کا تفاوت تھا لیکن اس کے باوجود ان کی فرشتوں کی الی شفقت کی وجہ سے، اگر ماکی اس خنک رات کو دھنٹا کیسی یگانگت محسوس ہوئی وہ اتنے بڑے مل آسمی تھے دنیا کے چوٹی کے دماغوں میں سے ایک، اور کتنے خلوص سے وہ کہہ رہے تھے: "جب تم لوگوں نے مجھے بلایا تو، حالانکہ میرے پاس وقت نہ تھا، پر میں نے سوچا، میری قوم نے اتنی صدیوں یک جو برداشت تھا میرے ساتھ کیا ہے ذاتی طور پر ایک اکیلے فرد کی حیثیت سے اپنی جگہ اس کا غارہ اسی طرح ادا کر ستا ہوں کہ تم لوگ جب بھی کہو میں تھا ری محفل میں آشمل ہوں۔" بلعut نے ایک خلک ٹھہنی آگ میں پھینکی اور اس نے ہائی میں لیوی سے کیا: "ہم تو اتنے ہوئے سے لوگ ہیں اور غالباً سخت خوف زدہ جو طامس

بیکٹ کے کورس کی پیجاری عورتوں کی طرح چلا رہے ہیں:

”فضا کو دھوؤ۔ آسمان کو دھوؤ۔ پتھر کو پتھر سے علیحدہ کر کے دھوؤ۔ زمین ناپاک ہے۔ پانی ناپاک ہے۔ ہمارے جانوروں کے گئے، ہم خود خون میں لت پت ہیں۔ خون کی بارش نے میری آنکھیں اندھی کر دی ہیں۔ میں خشک پتھروں کی سر زمین پر گھومتی ہوں اور اگر میں ان پتھروں کو چھولوں تو ان میں سے بھی خوب بننے لگتا ہے۔ میں جنہے موسم بہار اس کی طرف کس طرح لوٹوں؟

”فضا کو دھوؤ۔ آسمان کو دھوؤ۔ پتھر کو پتھر سے علیحدہ کر کے دھوؤ۔ ہڈیوں کو دھوؤ۔ دماغوں کو دھوؤ۔ روحوں کو دھوؤ۔

بارن میں یکنخت گثار کی آواز بلند ہوتی۔ ایوان مکال کی صاف، گہری آواز سارے میں چھاگٹی۔

”اب رات زیادہ آگئی ہے۔ میں اگر تیز تیز چلوں تو قریب کے کسی آتشیش سے شہر کے لیے ڈین پکڑاؤں گا۔“ پروفیسر لیوی نے پتھر پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”آپ آپ پیدل جائیے گا؟“ غیر ورز نے گھبرا کر کہا۔

”کیا حرج ہے؟“ انہوں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”پیدل چلنا کوئی بری بات ہے۔ ابھی تو شاید بس بھی یہاں سے کوئی میل بھر کے فاصلے پر مل جائے گی۔“

لڑکوں اور لڑکیوں کی نولیاں مختلف یورپیں زبانوں کے کورس گاتے فارم ہاؤس کی طرف چارہ ہے تھے۔

سامنے سیب کے جھنڈ میں آیک کار آن کر رکی۔

”الو“، عامر رضا نے آواز دی۔

”الو_____“ اوجیت نے خالص فرانسیسی لجھ میں انفرہ باند کیا۔

”آئینے آئینے بھیا صاحب۔“ طاعت نے کہا۔

وہ سب بارن میں داش ہو گئے۔

”میں جلدی میں ہوں۔ دور سے گانوں کی آوازیں سنیں تو ٹھک گیا۔“ انہوں نے طاعت سے کہا، پھر وہ ایک اطالوی لڑکی سے نہایت گی وائٹ انداز میں جھک کر مناطب ہوئے: ”مجھے اپنا سیسکوفون دو۔“

”بھیا صاحب، آپ ایوان سے ملے ہیں؟“ فیروز نے لکھنوں کے ناطے سے ان سے اخلاق برتنے کی سعی کی۔ ”یہ اس ملک کے سب سے بڑے بیلڈگانے والے ہیں_____ اور بہترین ڈرامائسٹ۔“

”مجھے اپنا سیسکوفون دو_____ میں تمہیں ویپس کی نہروں کا ایک گیت سناؤں گا۔“ عامر رضا نے فرانسیسی انداز میں اطالوی لڑکی سے کہا۔

”لاحول ولا قوۃ_____“ فیروز نے جھنجھلا کر ان سے سو شل گفتگو کی سعی ترک کر دی۔

”آئینے بھاں بیٹھئے عامر بھائی۔“ وند نے ان کے لیے پرال پر جگہ بنائی۔ سب لوگ ان سے طاعت اور مال کے کزن کی حیثیت سے واقف تھے۔ اطالوی لڑکی بھی اپنا باجہ سنبھال کر ان کے قریب جا بیٹھی۔ ”ترقی پسند عوامی محاذا خطرے میں ہے۔“ سریکھانے چکے سے زرینہ کے کان میں کہا۔

”بھائی عامر کی حالت پہلے ہی ناگفتہ ہے۔“ فیروز نے سرگوشی میں تشویش ظاہر کی۔

”اور بہن مریباً گرزوں اتنی دور روم سے ڈیلی گیٹ بن کر اس لیے آئی تھیں کہ بھیا صاحب ان کو ویس کے گیت سنائیں! یا اللہ تو ہی رحم کر۔“ طاعت نے جل بھن کر کہا۔

”یہ بھی تو اپنے وقت کے روپ و ملکیتیوں ہیں۔“ شیانے اظہار خیال کیا۔ لڑکوں نے پرچھتی پرچھتہ کرایک اسمنیش گیت شروع کیا۔

”اچھا بھی ہوں نوئی۔“ کچھ دیر بعد عامر رضا نے پرال پر سے انتھتے ہوئے کہا۔

”ہوں نوئی۔“ کورس ہوا۔

بارن سے باہر نکل کر وہ سب لوگوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئے۔

”_____؟“ ایوان نے مجھے کی طرف استفسارانہ نظریں اٹھائیں۔

”یہ کم کال صاحب _____ ایک ایسی منزل مقصود ہیں جس کی طرف بہت سی لڑکیاں سفر کر چکی ہیں یا کر رہی ہیں یا کرنا چاہتی ہیں۔“ غیر ورز نے کھڑکی میں سے کہا۔

”ماشاء اللہ سے کس قدر پروفاؤنڈ بات کہی ہے۔“ طاعت نے داد دی۔

سب نے مل کر امریکن جوشیوں کا یہ لذت شروع کر دیا:

For if you are white, you're all right;

If you are brown stick around,

But if you are black,

Oh, no! Brother, get back, get back, get

back.

گیت کی آواز دیر تک کھیتوں کے وسیع نہائے میں گونجتی رہی، پھر سب لوگ اپنے اپنے خیموں اور کیمپوں کی طرف جانے کے لیے اٹھے۔

کوگ کی بن میں ساری لڑکیاں آچکلی تھیں اور سونے کی تیاری کر رہی تھیں۔ یہ ہندوستان کے سارے صوبوں سے آئی تھیں اور بیرونی شری پڑھ رہی تھیں اور ڈاکٹر ہیٹ کے لیے کام کر رہی تھیں اور اخبارنویسی اور ڈاکٹری کی ٹریننگ حاصل کر رہی تھیں۔ سائنس و ان تھیں اور آرٹس تھیں اور گاتی اور ناچتی تھیں اور پچھلے ایک ہفت سے کانفرنس میں نہایت مدلل تقریریں کر رہی تھیں اور رات کو فارم ہاؤس کے باور پچی خانے میں مندو بین کے لیے کھانا تیار کرتی تھیں۔ رفتہ رفتہ رات کا سناٹا آسمانوں سے اتر کر سارے میں پھیل گیا۔ وادی میں کچھ دور پر خانہ بدھوں کا قافلہ ٹھہرا ہوا تھا۔ ساری کائنات اس برستے ہوئے احساس کے دھارے میں کہیں بہہ گئی۔

۶۵

اے ہمارے آسمانی باپ، ہمیں آج کے دن ہماری روزانہ کی خبریں عطا کر۔ طاعت نے کانفرنس سے لوٹ کر شہر کے اشیش میں پہنچتے ہوئے آنکھیں بند کر کے دعا مانگی اور سر پٹ دفتر کی طرف دوڑی۔ آج کلکل وہ ایک اخبار کے دفتر میں کام کر رہی تھی۔

نیوزروم میں وہی گھما گئی تھی۔ اس نے اپنی میز پر جا کر کاغذات کو اٹا پلنا۔
انتہے میں تیلیفون کی گھنٹی بجی۔

”ہلو ہلو“

”ہاں کون ہے بھائی۔“

دوسرا سرے پر فیروز دھاڑ رہی تھی۔

”ساجدہ آپا کسی میں الاقوامی کانفرنس سے لوٹی ہیں۔ چچا نے کہا ہے فوراً
اسٹوڈیو پہنچ کر ان کا انٹرو یوکرو“
وہ سپہر کو اسٹوڈیو پہنچی۔

لبی لبی کی کنھیں میں حسب معمول شور قیامت مچا تھا۔ یورپین، مدل ایشرين
اور ایشرن ہروسز کے لوگ اپنے اپنے دفتروں سے نکل کر لنج کے لیے آ رہے تھے۔
ہسپانوی، اسرائیلی عرب، ایرانی، فرانسیسی، ہندوستانی، پاکستانی
ان سب کی عجیب و غریب برادری تھی۔ بہت سی میزیں برادر
برادر لگا کر ہندوستانی اور پاکستانی کراوڈ اکٹھا بیٹھا کرتا۔ یہ تقریباً سارے یک
سارے اولاد ناگمرز تھے: صدیق احمد صدیقی جو علی گڑھ برادری کے ہجت چچا اور
اپنی ذات سے انجمن تھے، یا ورعباس، اعجاز بٹالوی، تقی سید، آل حسن، عطیہ، زرینہ۔
”اور وہ وفد آگیا جس کا انٹرو یو ہے۔“ طاعت نے اندر آ کر فیروز سے
پوچھا۔ کنھیں میں ایک طرف کو ساجدہ آپا قناعت سے بیٹھی پیالی میں کاٹا بجا رہی
تھیں۔ ”اب چلو ان کا انٹرو یو کرنے۔“ زرینہ نے چکپے سے کہا۔

”ان کا ان کا“

”اور وہ وفد کہاں گیا جو جانے کہاں سے ہو کر آ رہا ہے؟“

”یہی تو وفد ہیں“ زرینہ نے اس انداز سے کہا گویا اب دنیا کا کوئی رنج نہم اس پر مزید اثر نہیں کر سکتا۔

”بس ہر وقت ہاتھ ہلا کر اور کندھے اچکاتے ہوئے طرح طرح کی شکلیں بناتے سڑکوں کے کنارے بیٹھے کافی پینے رہتے ہیں“ ساجدہ بیگم ہیز ری سے فیروز سے مخاطب تھیں۔

”جی ہاں____ بڑے بیہودہ ہوتے ہیں۔ اب یہی دیکھنے سڑک پر بیٹھ کر کافی پینے کی کون تک ہے۔“ زرینہ نے کامل اتفاق ظاہر کیا۔

”کون؟“ طاعت نے چپکے سے پوچھا۔

”اطالوی یا غالباً فرنچ____ ان میں سے ایک قوم سے یہ بہت خفاہی ہیں۔“ زرینہ نے بتایا۔

”پیچ پیچ____ پورڈیز۔“ طاعت نے کہا۔

”بوش“ ساجدہ آپانے بات ختم کی ”مجھے ہر دفعہ انگلینڈ دو۔“ اسٹوڈیو میں پہنچ کر ساجدہ بیگم مائیک کے سامنے بیٹھیں : ”جب میں میڈرڈ میں تھی تو اہلیہ اہن برگ سے میں نے کہا۔“

”بوش“ ساجدہ آپانے بات ختم کی ”مجھے ہر دفعہ انگلینڈ دو۔“

اسٹوڈیو میں پہنچ کر ساجدہ بیگم مائیک کے سامنے بیٹھیں : ”جب میں میڈرڈ میں تھی تو اہلیہ اہن برگ سے میں نے کہا۔“

طاعت نے مذھاں ہو کر اسکرپٹ ایک طرف رکھ دیا۔

”دیکھو ساجدہ آپا، گپ نہ ہانگو۔ مجھے معلوم ہے تم میدرڈ بھی نہیں گئیں۔“

”چلو میدرڈ کے بجائے اسلوک رو فرق کیا پڑتا ہے؟“ زرینہ نے اطمینان سے رائے دی۔

”اور اہلیہ اہن برگ کون ہیں؟“ غیر ورز نے طاعت سے مطالہ کیا۔

”یہ اہن برگ صاحب کے گھر میں سے ہیں۔“ زرینہ نے جواب دیا۔

”دوسری بات یہ کہ یہ میدرڈ میں کر رہے تھے؟“ غیر ورز نے مزید جو ج کی۔ ”کہاں میدرڈ کہاں غریب اہلیہ۔“

ساجدہ بیگم نے کھسرو پھرسنی تو اسکر پٹ پر سے سراٹھا کر ادھر متوجہ ہوئیں اور ایک لختے کے لیے زرینہ کو دیکھ کر چوکیں کہ یہ بزرگراک میں مبوس بلوڈ لارڈ کی یہاں کیا کر رہی ہے۔ پھر غالباً ان کو یاد آگیا کہ یہ زرینہ ہے۔ ”کیا پوچھنا ہے آپ کو؟“

”ہاں پیاری بہن۔“ پتہ نہ مارو۔ جو پوچھنا ہے پوچھ لو۔ پھر یہ وقت ہاتھ نہ آئے گا۔“ زرینہ نے طاعت سے کہا۔

ساجدہ بیگم نے جو مانی ہوئی زمانہ لیڈر تھیں، کہنا شروع کیا: ”مجھے یہاں کا طریقہ تعلیم بہت پسند آیا۔“

”کتنی خوشی کی بات ہے۔“ غیر ورز نے کہا۔

”ہالینڈ میں جہاں میں ابھی گئی تھی، ہر جگہ لا الہ کھلا ہوتا ہے اور لوگ لکڑی کے جوتے پہنتے ہیں۔“ انہوں نے مزید انکشاف کیا۔

انعرویو ہوتا رہا۔

چند روز بعد ناگیا کہ ساجدہ آپ نے طلباء کی انجمن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ جب میں وطن کی نمائندگی کرنے کو پن ہاگن گئی تو ڈنمارک کی بی بی سی سے ایک تقریر کے دوران میں نے بتایا کہ باقی دی گریں آف اللہ _____
اس کے چند روز بعد اطلاع میں کے سید عامر رضا نے ساجدہ بیگم کو استانبول کھانے پر مددو کیا ہے۔
یہ دعوت ساجدہ آپ کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی۔

۴۶

وقت کالے بھتوں کی طرح آگے آگے بھاگ رہا ہے۔ اس کے لرزہ خیز سائے چاروں کھونٹ منڈلاتے ہیں۔ وقت جو گزر رہا ہے، آخر مجھے ختم کر دے گا۔

خداوند کی ماں مریبہا۔ جس کا دل سات بار زخمی ہوا۔ مجھ پر حرم کر۔ میرے پرانے دشمن۔ روشن سیبوں کے سائے میں چلتی رہی۔ جیرس لین میں کسی نے ٹر مپٹ پر ایک پرانی دھن بجانا شروع کر دی۔ پتھروں پر سے ندی کا پانی بہتا جا رہا تھا۔ ایک کتابہستا ہوا اسے عبور کر رہا تھا۔ تلی ٹھینیوں والے درخت پانی کی سطح پر جھکے ہوئے تھے۔ ان کی چھاؤں میں ایک انجن تیر رہی تھی۔
وہ کواڑ رینگل میں داش ہوئی۔

”روشن۔“ کسی نے در تپے میں آ کر اسے آواز دی۔

”روشن۔ اندرا آؤ۔“ کیا تم بھی اس کانفرنس سے واپس آ رہی ہو جس میں دنیا کے مستقبل کے بارے میں تجویزیں پاس کی گئی ہیں؟“ سرل نے دروازے میں آ کر کہا۔

”ذینمیں۔“ اس نے اپنے پیروں کو دیکھا۔ ”ذینمیں۔ میں محض ہیزل میر تک گئی تھی۔“

”وہاں کیا ہے؟“

”کچھ نہیں۔“

”ڈینمیں نے ایک نئی افظم لکھی ہے۔“

”ہلوڈارلنگ۔“ سریکھانے آتش دان کے پاس سے اٹھتے ہوئے اس سے کہا۔

”تم کب آئیں۔“

”میں؟ مجھے کیمبرج مجلس نے مدعو کیا تھا۔“

”میں اپنی نئی کتاب تمہارے نام معنوں کروں گا۔“

ڈینمیں سریکھا سے کہہ رہا تھا۔ روشن در تپے میں کھڑے ہو کر ان سب کی گفتگو سنتی رہی۔ (پھر یہ سب لوگ اٹھ کر چلے گئے۔ ان میں سے کچھ ملایا اور کوریا اور کینیا میں مارے گئے۔ کچھ کار کے حادثے میں زخمی ہو گئے یا حلق میں کینسر نکل آئے کی وجہ سے ختم ہوئے۔ چند کو اعلیٰ ملازمتیں مل گئیں۔ کچھ نے کتابیں لکھیں، شہرت پائی اور دنیا ان کے قدموں کے نیچے آ گئی۔ چند ایک یونہی رہ گئے)۔

”ہونہہ خدا۔“ ڈنیس کہہ رہا تھا۔

”خدا۔“ سریکھانے کہا۔ ”جب میں ناچی ہوں، مجھے لگتا ہے، واقعی شیو نے تلانا کے سروں پر کائنات تخلیق کی تھی۔ وہی احساس اگر مستقل محمد کر دیا جائے تو شاید خدا ہوگا۔ تلانا کی دھن کا احساس پتا نہیں۔“

”ابھی شاید دروازے میں داخل ہوگا جس کا کوئی نام نہیں۔ ویکھو باہر ایک منہوس چاند پر اپنی قند میل کی طرح ڈول رہا ہے۔“ سرل نے کہا۔

”ویک انڈ کے لیے شہر چلوگی۔ میں رات کی گاڑی سے واپس جا رہی ہوں۔“ سریکھا، روشن سے بات کرنے کے لیے دریچے کی طرف مزی مگر روشن باہر جا چکی تھی۔

”چلو ہم سب روشن کے ساتھ ہیزل میر چلیں۔“ سرل نے سگریٹ روں کرتے ہوئے تجویز کیا۔

”کیوں ہیزل میر کس لیے اور کوئی جگہ کیوں نہیں؟“ مانیکل نے سوال کیا۔

”سب جگہیں ایک سی ہیں۔ کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ ڈنیس نے کہا۔

”اہنا ہیزل میر چلو،“ سب نے مل کر نعرہ لگایا۔

”روشن۔ ہم تمہارا تعاقب کر رہے ہیں۔ ہم تمہارے دشمن ہیں ہم تمہارے دوست ہیں۔“ سرل نے کہا۔

وہ رات کی مدھم روشنی میں جنگل کی طرف جانے والی سڑک پر آگئے۔ یہ وسط گرمائی کی رات ہے۔ چڑیاں اور بھتنه اور آگیا بھتال درختوں کی چھاؤں

میں دوڑتے پھر رہے ہیں۔

سندیشور؟ روشن بھاگتے بھاتے تھک کر ایک گلڈنڈی پر بیٹھ گئی۔

تمہاری حقیقت دھنڈ لکھ میں چھپی ہے۔ عامر رضا نے انگلی اٹھا کرواضح کیا۔
میں اس کے سفر میں شامل رہوں؟ اس نے کہا اور گھاس پر بیٹھ کر غور و فکر میں ڈوب گیا۔

پیاریوں پر روشنیا جل رہی ہیں۔ جنگلوں میں سرخ کوت پہنے شکاری ویبر کی
دھنس بجارتے ہیں۔ اتوار کے دن ہمیں ہمیشہ کورٹ اور سرل میشلے کے محل میں
داخ کیا جاتا ہے۔ ماں سیکل نے کہا۔

لیکن ہم بھوکے تھے لہذا اپنی کتابیں بیچ کر کھا گئے۔ اس شخص نے کہا جس کا
کوئی نام نہیں۔

جنگل میں وہ سب خرگوشوں کی طرح اچھلتے پھر رہے ہیں۔ ڈینس سر کے بل
کھڑا کھلا کو اپنی اُظہم سنارہا ہے۔ سریکھانٹ راج کے ایک انداز میں مخدود ہو گئی
ہے۔ ڈلن طامس جھیل کے کنارے بیٹھے گینتا کا پاٹھ کر رہے ہیں۔

”سنو۔ کیا تمہیں بھی کسی دور کے فالے کی فون کال کا انتظار ہے؟“ سرل نے
قریب آ کر عامر رضا سے دریافت کیا۔

”ہاں _____“ عامر رضا پھر گھاس پر بیٹھ کر سوچ میں مبتا ہو گیا۔
ہمارے خواب مختلف ہیں۔ خالص خیال خوناک ہے۔
ٹھہرو _____ تفصیلات کی دنیا میں ہمارا صہون کہاں ہے؟
جلد بتاؤ _____ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ اس نے ایک لخت

گھبرا کر روشن سے پوچھا۔ وہ روشن کے سامنے گھاس پر جھک گیا وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ
چمپا ہے!

ہمیں دیر ہو رہی ہے - - - - - جلدی
کرو - - - - - جلدی - - - - - چول - -
چول - - - - - چول - - - - - پہاڑیوں پر گھنٹیاں بجنا شروع ہو
گئی ہیں۔ میرے دماغ کے ویرانے میں جو ہوا تھیں سننا رہی تھیں اب وہ آندھی
بن کر سارے میں پھیل گئی ہیں۔ چمپا نے کہا جو دراصل روشن
تھی میں تمہارے تھکے ہوئے پاؤں دھوؤں گی۔ تم گرم قالین پر
آگ کے سامنے بیٹھے رہنا جلدی جلدی دیر ہو رہی
ہے۔

شور میں اضافہ ہو گیا۔ چلو چلو ہیز ل میر چلو دلی
چلو چڑچل کے گھر چلو دنیا بھر سے ایک ہوئے نوجوان۔ ایک
آورش مہان لیے خطرہ ہو بلیدان کا پھر بھی ہم لائیں گے
سکھ چین لائیں گے سکھ چین

ان بستیوں کو جگدا ہے سدا ان کھیتوں کو لہلہانا ہے
سدا ہم کیا گورے کیا کالے۔ سب ایک ہیں ایک
ہیں ہم موت پر ہنسنے والے سب ایک ہیں ایک
ہیں کہہ رہے ہیں ہم ہیں شکنی مان اور روشن مانتا یہ سب
گان خطرہ ہو بلیدان کا خطرہ ہو بلیدان

کا جوانیاں ہیں گارہی ہنسی خوشی منا رہی دنیا بھر سے ایک ہوئے نوجوان نوجوان کارروائی تو ہو کو پاٹ بھگ رے بھنگ کور رے لوپاٹ آزادی میں ہیں نہر و جنیوا میں ہیں۔ ایشیا کا سب سے بڑا اسٹیڈیم بہاول پور میں ہے۔ روشن، عامر رضا کے چکر میں ہے۔ مسٹر کھنہ یہ ساری سرمایہ داری کی سازشیں ہیں۔ معاشرے کی خرابیاں۔ کل میں نے ایک نیا کوت خریدا۔ دماغوں کو دھوؤ۔ روحوں کو دھوؤ۔ آلوکو دھوؤ۔ پتیلی کو دھوؤ۔

رفتہ رفتہ بھیر چھٹی۔ خاموشی چھا گئی۔ چاند عین اوپر آگیا۔ عامر رضا نے دھنٹا ایک چھلانگ لگائی اور پھولوں کے دھند لکھ میں غائب ہو گیا۔

وہ پکنڈ نہ دی پہنچھی رہ گئی۔ سرل اور ڈنیس مائیکل دلدل کے کنارے چلتے ہوئے اس کے پاس آئے اور متنہ لٹکا کر ادھر ادھر پیٹھے گئے۔ یہ تھنڈے اور اداس دن روشن نے سراٹھا کراس سے کہا۔

بھیکے، نم خورده، خوفناک دن سرل نے کہا۔

بھاری، گھسنے والے، لٹکڑے، اپانچ دن ڈنیس نے کہا۔

یوں ہماری زندگی بتتی ہے۔ انہوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

ہمارے لیے کٹھن آزمائیں ہیں۔

تکلیفیں

دل کارخ

نماد مت

پیشمنی
وہ ممکن ہیں

ہم روتے ہیں —

ہیزیل میر کا جنگل آہستہ آہستہ دھند کئے میں مجھ ہو گیا۔

۹۷

دن بھر بارش ہوتی رہی۔ وہ سب آگ کے سامنے بیٹھے تھے۔

”ساجدہ آپ نے قوم کو صحرائی چوہے دیکھنے کے لیے مدعو کیا ہے۔“ طاعت نے اطلاع دی۔

”صحرائی چوہے کیوں۔ صحرائی اور مڑی کیوں نہیں؟“ سر کیکھانے پوچھا۔

”دراصل ساجدہ آپ کو رچرڈ برٹن کی ذات سے بہت عقیدت ہے۔“ طاعت نے کہا۔

”تو پھر کرا دو ان کا انترو یور رچرڈ برٹن صاحب سے۔ وہ تو اکثر براد کا سٹنگ ہاؤس آتے رہتے ہیں۔“

”دراصل ان کی شکل ایک اور بزرگ سے ملتی ہے جو اور یکجہل ہیں۔“

”اوہو — یہ بات ہے۔“ غیر وزنے کہا۔ پھر دفعتا وہ چلانی۔ ”ارے یہ تو واقعی بڑی ایکٹوٹی ہو گئی۔“

انھا لاو کھنجو ، کرو قتل ہم کو

بڑی دیر سے موڑی جھکائے ہوئے ہیں
طاعت نے کہا۔ (یہ قدیر کا پسندیدہ شعر تھا)۔

”یہ بات ہے تو آدمیدان میں۔“ بسم اللہ الرحمن الرحيم کی جگہ ہر بڑا کرفیروز نے کہا: ”السلام علیکم لایئے میم کا۔“

اشعار کس کو یاد تھے الہذا پہلے غلط پڑھے گئے، پھر حسب ضرورت ان میں ترمیم کی گئی۔ نہ کہ ہم نہیں بے وقوفی کی باتیں۔ میں بھولانہیں ہوں وقوفی کی باتیں۔ خود شعر گھڑے گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کی فلمی گانوں کے بول نہایت بے تکلفی سے استعمال کئے جانے لگے۔ ”یاد رکھنا چاند تارواں سہانی رات کو۔ لا او وا او کا۔“ طاعت نے کہا۔

”واہ، کٹ کٹ کر رہی ہیں مرغیاں۔“ کملانے کہا۔

”یہ فاؤل ہے۔“ طاعت دہاڑ۔

”ہر گز نہیں۔“

”اٹھوو گرنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا۔“

”طاعت نے میز پر مکہ مارا۔“

”آہ کٹ کٹ کر رہی ہیں مرغیاں۔“ کملانے گرج کر جواب دیا۔

جب دوبارہ کملانے کی باری آئی تو اس نے اطمینان سے جواب دیا: ”ہائے کٹ کٹ کر رہی ہیں مرغیاں۔“

”یہ سب ہو چکا ہے۔“ طاعت چلائی۔

”یہ دوسری مرغیاں ہیں۔“ کملانے اطمینان سے جواب دیا۔

وہ روز ساجدہ آپا نے طاعت کو ویز پر لیں کلب میں فون کیا۔

”سنوا ساجدہ بہن۔ میں صحرائی چو ہے دیکھنے سے معدود ہوں۔ میرا سارا دن تو بہت سے اصلی چو ہے دیکھنے میں گزر جاتا ہے۔“ طاعت نے کہا۔

”نہیں۔ مجھے تم سے رائے لیما ہے۔ ایک نہایت ضروری بات ہے۔“

”اچھا تم سیدھی بیہیں آجائو اور لجخ بھی بیہیں کھاؤ۔ طاعت نے زور سے رسیو رٹخ دیا۔ شہر کی ان محبت زدہ خواتین نے اور جان آفت میں کر کھی تھی۔“

آدھ گھنٹے بعد ساجدہ بیگم کھانے کی چھوٹی میز پر طاعت کے سامنے بیٹھی تھیں۔

وہ اپنی چیزوں کی طرح ساجدہ بیگم کو دیکھا کی۔

”کل میں عامر رضا سے ملی۔“ انہوں نے کہنا شروع کیا۔

”یہ چوڑے کی سرائے کا ذکر ہے جہاں آپ بی بی والوں کے ساتھ گئی تھیں؟“ طاعت نے دریافت کیا۔

”نہیں۔ ہم دونوں استانبول میں کھانا کھار ہے تھے۔“

”اوہ۔“

”اور پھر انہوں نے بتایا۔“

انہوں نے بتایا کہ وہ مجھے سے کتنا گھبرا تے ہیں؟ کہ وہ سائے کی تلاش میں ساری دنیا میں گھوتتے ہیں۔ جہاں سایہ ملاو ہیں بیٹھ گئے۔ یہ تیز ڈھوپ ان کی آنکھوں کو بری لگتی ہے؟

”ہاں کہا تو تھا۔ بالکل یہی کہا تھا انہوں نے۔“

”خدایا____ لو یہ گو بھی کھاؤ۔“ بلعت نے پلیٹ ان کی طرف کاٹی۔

”میرا خیال ہے اس ملک کے بارے میں جو میرے تاثرات ہیں ان پر ایک افسانہ لکھوں،“ ساجدہ بیگم نے سوچ کر کہا۔

”ضرور اس سے عمدہ بات کیا ہو سکتی ہے!“ طاعت نے ویٹر س کو بلانے کا اشارہ کیا۔ ”کافی لوگی ساجدہ،“ اس نے اوپھتی آواز میں پوچھا، یا ہنس کریم؟

برادر کی میزوں پر بر طابیہ کی مشہور اخبار فولیس خواتین ٹوپیوں کے تازہ ترین فیشنوں پر تبادلہ خیالات کر رہی تھیں۔

طاعت اداکی سے ساجدہ بیگم کو دیکھتی رہی۔ اس کا جی چاہا کہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔

دلبی ذوق

۲۸

چمپا نے زرگیش کے کمرے میں آ کر نظر ڈالی۔ مانوس کمرہ۔ صوفہ۔ تصویریں۔ نیلے بچوں۔ میرے لیے ایک ساری نکال دینا۔ زرگیش نے غسل خانے میں سے آواز دی۔ دوسرے کمرے میں شاہ نتا ایک ہی ریکارڈ بار بار بجائے جا رہی تھی۔ اسی روز اس کی ایک نئی کتاب چھپ کر آئی تھی۔ بل نیچے کوڑ یا رڈ میں گلشن کے ساتھ ٹہل رہا تھا۔ چمپا نے الماری کھوئی۔ ایونگ کاؤں اور ساریاں اور جوتے اور بیگ۔ ایک تختے پر ہاتھی دانت کا ایک چھوٹا سا مندر تھا جس میں ایک ننھا سا بست رکھا تھا۔

پارسی کس کا بات پوچھتے ہیں؟ وہ سوچتی رہی یا شاید زرتشت یا جانے کیا۔ اسے پارسی مذہب سے واقفیت نہ تھی۔ اسے کسی مذہب سے واقفیت نہیں تھی۔ ہم سب کہ نہایا خانوں میں ایک چھوٹا سا شرائی ہے۔ جس میں ایک گنام بٹ رکھا ہے۔ اس بٹ کا نام مجھے معلوم نہیں۔ یسوع۔ یعنی طاوس۔ کرشنا نارائن۔ زرتشت۔ یہ بت آخر وقت تک گنام رہے گا۔ انت سے جب انسان کی آنکھیں آخری بار ہمیشہ کے لیے بند ہونے لگتی ہیں، اس وقت اسے جانے کیا نظر آتا ہے، وہ گنام بٹ کون سی شکل اختیار کرتا ہے۔ یہ کے معلوم۔

شانتا نے اندر آ کر زرگیش کے لیے ایک سرخ ساری نکالی۔ ”الماری بند کر دو۔ الماری بند کر دو۔“ چمپا نے با آواز بلند کہا۔

”ہیں؟“ شانتا نے کمرے میں آ کر پوچھا۔ ”کس سے کہہ رہی ہو؟“ ”کچھ نہیں میں سوچ رہی تھی کہ دن میں کتنی بار زرگیش یا الماری کھوتی ہے۔“ ”ہاں؟“ شانتا بالکل نہ سمجھی۔

”اور اس میں سے رنگ برلنگے کپڑے نکلتے ہیں۔“

”ہاں۔ ہاں۔ تو؟“

”اور نیلی گھاس کا عطر۔ اور پیرس کی ٹوپیاں۔“ چمپا کہتی رہی۔ ”اس کا بات شرائی میں رکھا رہتا ہے اس کو نے میں۔ اس نے یہ الماری بنائی اور اب اسی میں چھپا بیٹھا ہے۔ تمہاری الماری بھی کوئی بٹ ہے؟“

”میری الماری میں ڈھانچے ہیں،“ شانتا آتشدان کے قریب آ کر بیٹھ گئی اور اسے غور سے دیکھنے لگی۔ ”تم۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ تم تھوڑی

سی دیوانی ہو۔

”ہاں تم نہیں ہو؟“

”تمہاری باتی معرفت کی حدود کو چھوڑتی ہیں۔ اس طرف مت جانا۔ بڑی فوسنا کی بات ہوگی۔“ شانت نے جواب دیا۔

سریکھا سفید ساری پہنے بال تو لیے میں پیٹنے باہر آئی اور در پچے میں کھڑی ہو کر تیرس گارڈن کو دیکھنے لگی۔ باہر جدھر پھول ہی پھول تھے اور بہار کا روشن آفتاب جنمگار ہاتھا۔

”زندگی _____ زندگی“ سریکھا نے خوشی کا گہرا سانس لے کر ہوا میں بازو پھیلائے۔

”سریکھا میرے لیے زندگی کی علامت ہے۔ بشاش۔ رقصان۔ تم علامتوں کی رمزیت کی قائل ہو؟“
چھپا نے مژ کر شانتا سے پوچھا۔

شانتا آتشدان میں بجلی کے مصنوعی سرخ انگاروں کو دیکھا کی۔
زندگی میرے سامنے کہی کھڑی ہے۔ سفید ساری میں مبسو۔
ہنسی، گنگناتی، خوفزدہ، نذر، بہت بزرد، ہر لفظ کے مختلف متصاد معنی ہیں۔ زندگی اس نے شانتا کو دیکھا۔ میں نے ایک مرتبہ گوم سے کہا تھا _____ میں اور تم، ہمیشہ مختلف رہیں گے۔

کئی سال قبل گلفشاں کے باورچی خانے میں ترکاری بناتے ہوئے طاعت نے کہا تھا۔ چھپا باجی گوم ہر وقت ہر چیز کا تجزیہ کرنے پر تلاار ہتا ہے۔ اس بات

سے خبر اور رہیے گا۔ وہ کسی کو بخششے والا نہیں چاہے آپ ہی کیوں نہ ہوں۔

”مجھے ایسے لوگوں سے سخت چڑھتے ہے جو بات بے بات، ہر فقرے، ہر لفظ، ہر لکھے ہوئے جملے میں نفیا تی الجھنوں کے اشارے تلاش کرتے ہیں۔ لا حول ولا۔“ اس نے جواب دیا تھا۔“

”گوتم بھی یہی سب کرتا ہے؟“ ترملانے تجھاں عارفانہ سے پوچھا تھا۔

”بالکل۔“ طاعت نے جواب دیا تھا۔

”تب تو گوتم بہت برا آدمی ہے۔ ہم اسے منع کر دیں گے کہ لوگوں کی باتوں میں نفیا تی الجھنوں کے اشارے نہ تلاش کیا کرے، خصوصاً آپ کی باتوں میں۔“ ترملانے کہا تھا۔ یہ لڑکیاں اب صریحًا بد تیزی پر اتر آئی تھیں۔ ترملانے مجھ سے جلتی ہے۔ کس قدر واہیات بات۔ تہمینہ کی طرح لا حول ولا میری باتوں سے اسے مطلب! اس نے غصے سے سرخ ہو کر بنا آواز بلند کہا تھا۔ چار بار تو اس سے ملاقات ہی ہوتی ہے۔ دوسرے لمجھے اس نے اپنے غصے کو چھپا کر گفتگو کو مزاحی رنگ دینا چاہا: ”اور وہاں اس نے باتوں کو ایسی نوچ پھوڑ رکھی تھی کہ کسی کو بو لئے ہی نہ دے۔ ہر سوال کا جواب اسے آتا ہے، ہر علم میں وہ ماہر ہے تو بہ۔ آدمی نہ ہوار کھش ہو گیا، دس سروالا۔“

”ہے۔۔۔ ہے۔۔۔“ تہمینہ نے بڑی مہارت سے مہارت سے پیٹر کاٹتے ہوئے باور پھی خانے دوسرے کونے سے کہا تھا، گوتم نے تم پر بہت رعب ڈالا ہے اور آنکھیں تم اس کے رب میں۔“

”میں نہیں آئی اس کے رب میں۔“ اس نے بگڑ کر کہا اور اس کی آنکھوں میں

آنسو آگئے اور وہ جلدی سے پیازوں کے ڈھیر پر جھک گئی۔

”پھر اس کا اس قدر لمبا چوڑا ذکر کیوں ض کر رہی ہو؟ ہم لوگ تو بے چارے گو تم کو ایسا قابل ذکر نہیں سمجھتے۔ نہ راکھش نہ دیوتا۔ تم نے اس چکر میں چاءبھی نہندی کر دی۔ اے لو مصالحہ جلا جا رہا ہے۔ بھن گیا مصالحہ لے اب گوشت ڈال دو بلی طاعت۔“

آوازیں ماضی کے آبشار کے شور میں ڈوب گئیں۔ یہ زرگیش کا فلیٹ تھا اور سر میکھا پھولوں میں کھڑی بال سکھاری تھی اور شانتا صوفے پر ناگیں رکھے پڑتی تھیں۔ چہرے وہی تھے، ماسک نئے تھے۔

”گوتم اب تک سرکولیشن میں ہے۔“ شانتا نے پاواز بلند پوچھا۔

کیا؟ وہ چونکی

میرا مطلب ہے، شانتا نے سگریت جلاتے ہوئے اس طرح پوچھا گویا جمپا ایک کھلی کتاب کی طرح سامنے رکھی تھی جسے وہ پچھلے چند منٹوں سے پڑھ رہی تھی، ”“ وہ اب بھی سرکولیشن میں ہے یا اسے لانبریوی کے بک شیلف پرواپس رکھ دیا گیا۔

”پتا نہیں۔“

”تمہاری ممبر شپ کی میعاد ختم ہو چکی؟“

شانتا کر گیک علاوہ مغروہ ہونے کے، کمینی بھی تھی۔

”یہی سوال غالباً میں تم سے کر سکتی ہوں۔“

شانتا اسی سے مسکراتی۔ اس کا پر غرور تبسم، اس کا انداز، اس کا طرز لباس۔ چمپا کس دصیان سے ان دونوں اس کی تقلید میں مصروف تھی۔

خوبصورت، کامیاب، ہر لمحہ زیر، کریرو من۔ وہ بھی شانتا نگہبر کی طرح کیوں نہیں بن سکتی؟ شانتا نے اطمینان سے اسے دیکھا: ”میں اس کے الوزن تباہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مصیبت یہ ہے کہ وہ شاعر ہے۔“

”واقعی یہ مجھے معلوم نہ تھا۔“ پچپا نے طفر سے کہا۔

”تمہیں یہ معلوم نہیں ہو ستا۔ تم خود اپنے اتصورات میں ضرورت سے زیادہ بتتا ہو۔ آدمی قربانی چاہتے ہیں بغیر اپنی قربانی دینے۔ تم ان کو حاصل نہیں کر سکتیں۔ تم پھر س سے یہاں کیوں آگئے؟ اپنا اکیڈمیک سال ادھورا چھوڑ کر؟ اس لیے کہ وہ یہاں ہے۔“

”بکومت۔۔۔ یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟“ پچپا کو بے حد غصہ آیا۔ اب وہ اپنی مزید توجیہ نہیں کروائے گی۔

”لیکن یہ جنگلی بخش کا تعاقب ہے،“ شانتا اپنی سریلی آواز میں کہتی رہی۔ (وہ احمد آباد اور سمبی سے مرہنی گانے براث کاست کیا کرتی تھی)۔

”تم افسانہ نگار ہونا اسی لیے میرے متعلق تم نے اپنے تخیل کو بے لگام چھوڑ رکھا ہے۔“

”اب بل تم کو بلڈ اپ کرنا چاہتا ہے۔“ شانتا نے اپنی سریلی آواز میں بات ختم کی اور پھر اطمینان سے آتش دان پر رکھی ہوئی اتصویر وہ کو دیکھنے لگی۔

”تہمینہ رضا، تر ملا سر یو استوا، شانتا کر گیگ۔“

”چھا، یہ بات ہے۔“ پچپا نے اپنا کوٹ اور دستا نے الٹا کئے۔ ”میں قابل

نفرت ہوں۔ میں قابل نفرت ہوں۔ اچھا بھئی اب چلا جائے۔
زگیش سریکھا شانتا خدا حافظ۔“

”کل ففتر آؤ تو وہ نیلی اون لیق آنا جو ہم لوگوں نے اس دکان پر دیکھی تھی۔“
”شانتا نے اسی اطمینان سے کہا۔

”میں شاید کل ففتر نہ آؤں۔“ دروازے تک پہنچ کر اس نے دوبارہ پٹ کر کہا۔ ”کل کیا معنی؟ میں شاید کبھی تمہارے ففتر نہ آؤں۔ زشب بخیر۔“
باہر چیلسی کی سڑک پر آ کر اس نے دیکھا مکانوں کے درستے بارش کے سہانے دھنڈ لکھے میں چھپ گئے تھے۔ نکڑ کی بوڑھی عورت، جو پھول پیچتی تھی، بارش سے پیچنے کے لیے برساتی اوڑھے، کرسی پر، دیوار کی طرف منہ کیے پیٹھی جانے کیا سوچ رہی تھی۔ درپھول میں سے مویقی کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اپنے گھر پہنچ جو بہت دور مضافات میں تھا۔ اپنے کمرے کی دہنیز میں اسے سرل کا خط ملا۔ اس نے لکھا تھا: ”تیو ہم میں تمہارا داخلہ ہو گیا ہے۔ ستمبر میں تم یہاں آ رہی ہو۔ یہ گرمیوں کے چند مہینے کسی اداس اور رومنی نک اطالوی یا ہسپانوی شہر میں گزار آؤ۔ میں شمال جا رہا۔ روزماری بیکار ہے۔“

روزماری؟؟

کوہ نور کی ایک میز پر، جو درستے کے پاس پیچھی تھی، گوتم، نرملہ کے مقابل

بیٹھا بہر برستی ہوئی بارش کو دینکھتا رہا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی نولیاں آؤ کر پینچھرہی تھیں یا اٹھاٹھ کر باہر جا رہی تھیں۔ مال معاف کرنا، کہہ کر کسی دوست سے بات کرنے کے لیے ایک دوسری میز کی طرف جا چکا تھا اور بڑے جوش و خروش دے کسی بحث میں مصروف تھا جس میں بار بار ماڈ اور پیپلز چاننا کا نام دہرایا جا رہا تھا۔ گوتم نے اس سی مسکراہٹ کے ساتھ اس پر نظر ڈالی۔

”مال کتنا پیارالٹکا ہے۔“ اس نے کہا۔

”ہاں۔ کمن بھیا کے ہونے سے مجھے بھی لگتا ہے کہ بھیں یہاں موجود ہیں۔ اگر کمن بھیا اور طاعت نہ آرہے ہوتے تو اماں مجھے ہرگز اکیلا ولایت نہ بھیجنیں۔“ ترملانے کہا۔

”تم نے مجھے جو باتیں چمپا کے متعلق بتائیں مجھے سن کر بڑا دکھ ہوا۔“ گوتم نے کہا وہ ابھی تک چمپا کے متعلق سوچ رہا تھا۔ ترملانے اپنے ہنسوپینے کی کوشش کی۔ چند منٹ قبل اس شخص نے پروپوز کیا تھا۔ ہے چپ پیٹھی رہی۔

”تم سب نے ہم سب نے ان کے ساتھ انصاف نہیں برتا۔ ہم نے ان کو برا بر غلط سمجھا ہے۔“ مثال کے طور پر اس نے ذرا جوش سے دہرایا اور کاشٹا اٹھا کر نرملا کو سمجھانا شروع کیا۔ ”انہوں نے کبھی بھی صاحب کو اپی سے، یعنی کہ چھیننا نہیں چاہا تھا۔“

”بہر حال، میرا خیال ہے اب ہم چمپا باجی پر مزید بحث نہیں کریں گے۔“ ترملانے کہا اور مصروف نظر آنے کے لیے بیگ میں کوئی چیز تلاش کرنے لگی۔

”تمہارے نزدیک چمپا باجی مکمل ہیں مگر شاید تم بھولتے ہو کہ ہم چمپا باجی کو اپنے بچپن سے جانتے ہیں۔“

”یہ بچپن سے جانے کی دھونس اچھی ہے!“ گوم نے کہا۔ ”تمہارے یہاں ہبڑ سے بچپنے کا راگ کیوں الا پا جاتا ہے۔ جو لوگ تم کو یا چمبا احمد کو بچپنے سے نہیں جانتے وہ گدھے ہیں؟“

اب گوم پر چاروں طرف سے بڑی تیز روشنی پڑ رہی تھی جس طرح وہ خود گوم کے سامنے تیز روشنی کی زد میں تھی لیکن دیکھو کیا ہوا کہ گوم نے ہاتھ بڑھا کر دھنٹا سوچ بند کر دیا۔

گوم: انسانی کردار کا بے رحم فنادیہ انت کا گرو، چمپا جیسی فراڈ کو مکمل سمجھتا ہے۔ بھگوان تیری لیا انیاری ہے۔ لیکن وہ کہہ رہا تھا:

”نسل۔ میں تمہاری غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے چمپا سے کیا مطلب؟ میں بہت بھثپھر ہوں، تم نے ٹھیک کہا، مگر میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“
”نعم البدل؟ نہیں، سوری گوم۔“

”نسل - - - - - مجھے سمجھنے کی کوشش کرو اور نسل“ اب وہ پھر اندر ہیرے میں چلا گیا۔ وہ بہت قابل رحم تھا۔ اسکوں کے لڑکوں کی مانند۔ کون کہتا ہے مرد سمجھدار ہوتے ہیں۔ ارے ان سے زیادہ سورکھوں ہو گا۔ میز پر بیٹھے بیٹھے نرمل اکوا حساس ہوا۔ وہ بیل کی طرح، درختوں کی طرح، بیر و میز کے پارے کی طرح اوپنجی ہوتی جا رہی ہے۔ اس میں گیان ارہا یہ۔ اب مصنوعی روشنیا بجھا کرو وہ بھی اس اندر ہیرے میں چلی جائے

گی جو سب کیفیتوں سے اتم ہے۔ اس میں بیٹھی وہ باہر جھانکا کرے گی۔ اب وہ سلیمانی نوپی پہن لے گی جس کی کہانی پچپن میں اسے گلفشاں کے شاگرد پیشے میں قدری ڈرائیور نے سنائی تھی۔

یہ سلیمانی نوپی ہر ایک کو دمیاب تھوڑا ہی ہوتی ہے۔ میں تمہاری شکرگزار ہوں شری نیلمبر، کہ تم نے میرے بڑے ہونے میں میری مدد کی اور سلیمانی نوپی پہننے کا راستہ دکھایا۔ کاش میں تم سے بیاہ کر سکتی۔ مگر مجھ میں بہت زیادہ گیان آگیا ہے چمپا احمد کی پستش کیے جاؤ گوتم جی۔ شاید تم کو بھی راہ نجات مل جائے۔

اسی رات فرملا کی ایکسرے روپورٹ میں معلوم ہوا کہ اسے پھیپھڑوں کی دق

ہے۔

لبی ڈوف

انقلام حصہ دو

جس سال جہما کی برج پہنچی طاعت اور نر ملادہاں سے جا چکی تھیں۔ (میں ہمیشہ مذہب رست جانا چاہتی ہوں لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آتی۔ سرل، اب کے ویک انڈپر ضرور مذہب رست چلیں گے، بے چاری نر ملاد کو دیکھئے) اب وہ اونچے طبقے کی بر طانوی اٹھ کیوں کے لجھے میں گفتگو کرتی۔ کی برج کی بدد مائی بھی اس نے پوری طرح اوڑھ لی۔ کچھ طور طریقے اس نے اوپر جوں کے گروہ میں رہ کر اندر میں سیکھ لیے تھے۔ س کے علاوہ رکھ رکھا تو سیلیقہ، نفاست، بردباری، ایک خاص سطح کا دھیما دھیما مزاج۔ رات کو آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ فاختا سوچی: چمپا احمد کہاں رہ گئی! چمپا احمد جو ایک دیومالاً ایک حکایت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ وہ بست کان لجھ بنا رس والی اٹھ کی کہاں گئی یا وہ اٹھ کی

جس کو عامر رضا نے گلفشاں کے سانیدھ روم میں ترکاری بناتے دیکھا تھا۔ عامر رضا کا خیال اب اسے بہت مضمکہ خیز لگتا۔ وہ فلم اشاروں کے جلیے والا ڈپلو میٹ جس کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ شام کو کون سا سوت پہن کر اور کون سی اٹھ کی کوئے کرتھیزد دیکھنے جائے۔

پھر ایک روز کی برج میں فلسفی اٹھ کی روشن سے اس کی ملاقات ہوئی۔ وہ

لانبریوی کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے ایک پلیا پر بیٹھی مائیکل سے باشیں کر رہی تھی جو سائیکل پر سوار ایک پاؤ پلیا سے لگائے یہودیوں کی جلاوطنی کی نفیات پر روشنی ڈالنے میں مصروف تھا۔ دفتراً اس نے نہ لگایا۔ روشن مگر روشن سوق میں ڈوبی سامنے سے نکل گئی۔ چمپا احمد نے کندھے اچکائے۔

ہاں ڈون اسپنوزا۔ مائیکل نے کہا۔ دھرمے روز روشن سیاہ فریم کی پڑھنے والی عینک لگائے بڑے غور و خوض میں ڈوب کر سگریٹ پیتی کیم کے کنارے بیٹھی نظر آئی۔ چمپا کو وہ بہت اچھی لگی۔ اب چمپا اپنی دانست میں اس اسٹیچ پر بیہقی چکی تھی جب انسان خود غیر متعلق ہو کر دوسروں کا مطالعہ کرتا ہے اور فراغ دلی سے دوسروں کو معاف کرتا رہتا ہے۔

روشن نے چمپا کو بڑے شک و شہبے کی نظروں سے دیکھا۔ کسی لڑکی نے اسے بتایا کہ یہ چمپا احمد عامر کی اولڈ فیم ہے۔ چمپا اگر یہ لفظ سن لیتی تو سوچ کر رہی اسے بڑی وہشت ہوتی۔ وہ بے حد تو ہے تلاکرتی اور کہنے والے کو صلوٰاتین سناتی کیونکہ اس قدر جدید بن جانے کے باوجود تھوڑا سا کھر پھنے کے بعد وہ وہی خالص یو۔ پی کی باعزت مذل کلاس لڑکی تھی جس کے تصورات اس قسم کی باتوں کے سلسلے میں بڑے قدامت پسندانہ ہوتے ہیں اور بہر حال وہ خود کو کسی کا اولڈ فیم کہانا پسند نہ کر سکتی تھی۔

اس نے اس کے باوجود ایک گھنٹے تک روشن اسپنوزا کے متعلق تباہی خیالات کیا۔ روشن حکومت پاکستان کے کسی بہت اعلیٰ افسر کی لڑکی تھی اور اسے طرح طرح

کے ونڈاں ملے تھے اور یہاں بھی بہت قابل اور سنجیدہ مشہور تھی۔ قصہ مختصر وہ ان ہونہار طلباء میں سے تھی جو بیروفی مالک میں وطن عزیز کے نام میں چارچا نداگاتے ہیں اور پہنچی کے رسالوں میں اکثر جن کی تصویر یہ پہنچتی رہتی ہیں۔

ایک پہنچی کے روز وہ دوسرے لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ ایک دیہاتی چاء خانے کے بااغ میں پہنچی تھی۔ ایک اطالوی طالب علم اسنجلو سیب کے نیچے گئار بجارتا تھا۔ قریب کی آرام کرسی پر مائیکل نیم دراز بڑی اداسی سیب کی کلیاں سونگھنے میں مصروف تھا۔ اس روز اس نے ادانس کیا تھا کہ وہ ترک وطن کر کے اسرائیل جا رہا ہے۔ وہ کئی گھنٹے سے وطینت کے مسئلے پر بحث کرتے کرتے تھک کر اب خاموش بیٹھے چاء کا انتظار کر رہے تھے۔ میں یہ پیارا ہر ابھر اخوبصورت انگلستان چھوڑ دوں گا اور اسرائیل کے ریگ زاروں میں پتھر کوٹ کر سڑکیں بناؤں گا۔ اس نے کہا۔ سرل اسے دیکھا کیا۔ باں، مائیکل، تم ضرور ایسا کرو گے۔ مجھے معلوم ہے۔ اس نے کہا۔ یونیورسٹی کے کئی پروفیسر، سائنس دان، موسیقار اس وقت اسرائیل میں پتھر کوٹ کر سڑکیں بنارہے تھے۔

”وژن میں بڑی طاقت ہے۔“ ڈنیس نے کہا۔ ”ذر شاعروں کی شاعری دیکھو۔“

”طاقت تباہ کن ہوتی ہے۔“ سرل نے منہ لٹکا کر کہا۔ سامنے چاء خانے کے چھائیک پر ایک کار آن کر رکی۔ گوتم نیلمبر، مال اور طاعت اور چند اور لوگ اتر کر چاء خانے کی طرف بڑھے۔ انہوں نے اور چڑھیں بیٹھے ہوئے لوگوں کو نہیں دیکھا۔ گوتم نیلمبر بھی بڑی تباہ کن طاقت ہے کیونکہ اس کا وژن سب سے زبردست

ہے۔ نہرو کا ہندوستان۔ ” ”خلو نے کہا۔

”جدید تصورات میں شاونڈ مخطرناک ترین تصور ہے۔“ سرل نے مائیکل سے کہا۔ ” تمہاری صیہونیت پاکستانیوں کا اسلام ہندوستانیوں کی گپتا عہد کی تجدید یہ ہے۔“

” گوتم شاؤنسٹ نہیں ہے۔“ سرل یکھابولی۔ ” وہ صرف امن کا خواہاں ہے جس میں ہندوستان کی اقتصادی ترقی ہو سکے۔ ہم مذہب ہو سکے۔ ہم مذہب کی لائز پر نہیں سوچتے۔ ہمارا پڑھا لکھا طبقہ اور وہ لوگ جن کے خیالات کی اہمیت ہے، پہلے پانچ سالہ منصوبے کی کامیابی کے درپے ہیں۔ ہند کا کسان اس وقت ہمارا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ زمینداری کے خاتمے کے بعد سے، آکر دیکھو، اس کی حالات کتنی سدھرتی جاری ہے۔“ ہمارا

” تم تو انڈیا پاؤں کے کسی پھلفٹ کی زبان میں گفتگو کر رہی ہو۔“ سرل نے مسکرا کر اس کی بات کاٹی۔

” اقتصادی ترقی سے مذہب کا کیا تعلق یہ بات پاکستانیوں کی سمجھ میں نہیں آتی،“ گلشن نے کہا۔

” امریکہ اسلام کا سب سے بڑا خیرخواہ ہے۔ آج کل تک میں قرآن شریف کے نئے چھاپ چھاپ کر تقسیم کر رہا ہے۔ جس طرح پولین اور مولینی اسلام کے بڑے زبردست خیرخواہ تھے۔“ ڈنیس نے کہا۔

” پاکستان کا اسلام۔“ مائیکل نے کہا۔

” تم تو مسلمانوں سے نفرت کرتے ہو۔“ روشن نے مائیکل سے کہا۔

”نفرت کی نفیات——“ ڈنیس نے کہنا شروع کیا، ”آج کی دنیا نفرت کے تانے بانے پر زندہ ہے۔ جیرس نے بالکل غلط کہا تھا کہ دنیا محبت پر قائم ہے۔ اصلیت یہ ہے کہ ہم سب درندوں کی طرح ایک دوسرے کو کھار ہے ہیں۔“

”میں درندہ ہوں؟“ مائیکل نے اداسی سے پوچھا۔ ”میں صرف حیفہ جا کر سڑ کیس کوٹی چاہتا ہوں۔“

”تم سب کو کراکرز سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ گاندھی کا مطالعہ کرو،“ ڈنیس نے کہا۔

”ڈراغو تم کو بلا کر پوچھو جو ہر وقت پاکستان کے خلاف پروپیگنڈہ کرتا ہے۔“ روشن نے جذبے سے کہا۔

”اور پاکستان اس کے خلاف پروپیگنڈہ کرتا ہے۔“ سریکھانے جواب دیا۔

”اگر صرف ایک روز کے لیے ساری دنیا میں پروپیگنڈے کی مشینزی رک جائے تو کتنا سکون ملتے۔“ چمپا نے آہستہ سے کہا۔

”یہ کس طرح ممکن ہے۔ ہم سب کو تو صبح شام گوببلو کی تصویر پر پھول چھپانے چاہیں۔ تم گاندھی کی بات کرتے ہو، ہمارے عہد کا سب سے بڑا بغیر گوببلو تھا۔ ڈاکٹر گوببلو زندہ باہ،“ گلشن نے کہا۔

”درادصل،“ ڈنیس نے بات شروع کیا، ”ہم سب غیر شوری طور پر فاش ہیں۔ ہم سب تباہی اور موت کے خواہاں ہیں۔ میں رومان پرستوں کی موت کی خواہش کے معنی خوب سمجھتا ہوں۔“

”میں تو نہیں چاہتی کہ یہ خوبصورت اور چڑھتا کر دیا جائے۔“ چمپا نے

دہشت کے ساتھ کہا۔

”ہم سب چھپے ہوئے فاشت ہیں۔ ہم سب کے ہاتھ میں غیر مری مشین گنیں ہیں جن کا رخ ہم نے دوسروں کی سمت کر رکھا ہے۔ خیالات کی مشین گنیں صرف بوڑھی عورتیں اس کا چاہتی ہیں لیکن دنیا کو بوڑھی عورتوں کی ضرورت نہیں۔

”اس نے چپا کو دیکھا۔ وہ اسے ایک بوڑھی رنجیدہ ماں کی طرح نظر آئی۔

”مجھے ہمیشہ تباہ کیا گیا۔“ مائیکل نے سراٹھا کر کہا۔ ”لیکن میں نے اپنے عزیزوں کی لاشوں کے انبار میں بیٹھ کر تمہارے لیے موسیقی کمپوز کی اور خیالات کی قذیلیں روشن کیں۔ میں درندہ ہوں؟ میں صرف

”سر کیس کوٹنی چاہتے ہو۔“ ”ڈنیس نے بات کاٹی۔“ ”ہم تم کو اس کی اجازت دیتے ہیں مائیکل۔ تم اپنے وزن کے راستے پر چلو۔“

”دوسروں کے وزن میں مخل ہو کر اس کو بر باد کرنے کی خواہش سب سے بڑا گناہ ہے۔ دس احکام میں اس گناہ کا کہیں ذکر نہ تھا۔“ سرل نے کہا۔ ”میں تم کو اس کی اجازت دیتا ہوں۔“

انجلو نے گثا رائیک طرف رکھ دیا۔ مائیکل تم یہودی ہو لیکن تم انگریزی بھی ہو۔ تم نے اپنے بمبار طیارے پر آ کر میرے خوبصورت شہروں کو بر باد کیا تھا لیکن میں تم کو معاف کرتا ہوں۔

”مائیکل،“ سر بیکھانے کہا، ”تم یہودی ہو لیکن تم انگریز بھی ہو لہذا خود کو ہم سے برتر سمجھتے رہے۔ اب تم بڑے ذوق و شوق سے ایشیائی بننے جا رہے ہو کیونکہ تمہارا خیال ہے کہ تمہاری جڑیں فلسطین میں ہیں۔ حالانکہ تمہاری جڑیں دراصل ہم پسیڈ

میں ہیں۔ لیکن ہم تم کو معاف کرتے ہیں۔ روشن! ماں سیکل ایشیائی بننے جا رہا ہے، اسے خوش آمدید کہو۔“

”میں اسے خوش آمدید نہیں کہہ سکتی کیونکہ میں مسلمان ہوں لہذا مجھے اسے قابل نفرت سمجھنا چاہیے۔ یہ سب زبردست گھپا ہے۔“ اس نے میز پر پاناسر کا دیا اور پیالیوں کے نقش و نگار کو دیکھنے لگی۔

”تمہیں سریکھا سے نفرت کرنا چاہیے کیونکہ یہ ہندو ہے۔“
”ہاں۔“

”لہذا روشن مجھ سے ہاتھ ملاو۔“ ماں سیکل نے سنجیدگی سے ہاتھ بڑھایا۔
”ہندوؤں نے تم کو ہندوستان سے نکالا۔“

”میں نے نہیں نکالا یہ خود نکلی۔“ سریکھا نے احتجاج کیا۔
ماں سیکل سنی ان سنبھال کر کے کہتا رہا: ”تمہاری طرح ہم نے بھی ایک نیشنل ہوم لینڈ بنا لیا تو ہم کیوں قابل گرد نہیں ہو گئے؟“

”تم ——— تم نے عربوں کو ان کے وطن سے نکالا جہاں وہ سینکڑوں سال سے رہتے آئے تھے۔“

”تم نے بھی ہندوؤں کو ان کے وطن سے نکالا جہاں وہ ہزاروں سال سے رہتے آئے تھے۔“

پھر بڑی غمگین خاموشی چھا گئی۔ درختوں کے جھنڈ میں تیریاں اڑ رہی تھیں۔ سامنے ندی پر سے ایک کشتی گزر گئی۔ انجلو نے پھر گٹار کا بجانا شروع کر دیا۔

گوتم نیلمہر اور اس کے ساتھی کار سے اتر کر چاء خانے کے اندر چلے گئے۔ لاؤچ میں بیٹھ کر انہوں نے لسر کی ورق گردانی کی اور چاء منگوائی اور گوتم نے چند خط و یہیں کو پوسٹ کرنے کے لیے دیے۔ وہ لندن سے آرہے تھے اور مدد ہرست جارہے تھے۔ ان کے ساتھ بیل تھا اور خوبصورت برتاؤ جو اسکول آف اکنامکس میں استاد تھا اور شانتا، طاعت اور زرگیش۔ وہ لوگ بھی کوئی آفاتی مسئلہ حل کرنے میں مصروف تھے۔ مال نے درپچے سے باہر جہان کا جہاں سے باغ کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ ڈھلان پرندی بہہ رہی تھی۔ بید مجنوں اور پرم روز کے پتوں میں سے ایک سفید لانچ نظر آ رہا تھا جس پر اس کا نام ”کلاراجین“ لکھا تھا۔ امکن امکن۔ مال نے دہرا لیا۔ گوتم نے اسے دیکھا۔

”باہر چمپا بابجی اور سرل وغیرہ بیٹھے ہیں۔“ طاعت نے درپچے میں آ کر کہا۔ نر ملا کے لیے میں اسنگس و سن کی کتاب و سن کی کتاب لانا بھول گیا،“ بیل نے کہا۔ شانتا پیالیوں میں چاء انڈیل رہی تھی۔ اس نے سفید سارہی پہن رکھی تھی اور بے حد حسین لگ رہی تھی۔ وہ لوگ نر ملا کو دیکھنے جا رہے تھے اسے اب سینی نوریم میں تیسرا سال تھا۔ اس کے ایک بھی ٹھہرے کا آپریش ہو چکا تھا اور اس کے معانج سرروندہ گرے کا خیال تھا ق کہ ممکن ہے اب وہ مکمل طور پر صحت یا بہوجائے ہفتے کے روز اس کے دوست لندن سے اسے دیکھنے کے لیے آتے گوتم بھی برادر، جب اسے فرصت ملتی، کمال اور طاعت کے ساتھ اسے دیکھنے کے لیے جاتا اور پابندی

سے اسے رسالے اور کتابیں بھیجتا۔ اس کے آپریشن کے موقعے پر ہری شکر بھی واشنگٹن سے وہاں پہنچ گیا تھا۔ گوتم بڑی لگن سے نرملہ کا خیال کرتا اکثر جب مال ہفتے کے روز مذہبی ہرسٹ نہ پہنچ سئتا تو گوتم کوتار دے دیتا۔ گوتم سب کام چھوڑ کر وہاں چلا جاتا۔ وہ اور نرملہ چمپا کا ذکر بھی نہ کرتے۔ زندگی اس قدر جنگلک، اتنی مصروف، اتنی بے رنچ اور غیر منطقی تھی کہ انسان سارے شناساؤں اور جانے والوں کے ساتھ نباہ نہ کر سئتا تھا۔ اتنا وقت ہی نہیں تھا۔

گوتم اب بہت مشہور ہو چکا تھا۔ اس نے ہندوستان کی فارن پالیسی، اس کے اقتصادی مسائل اور ملکی سیاست پر دو کتابیں لکھی تھیں جن کی دھوم مج گئی تھی۔ وہ اب بہت بڑا سے لے بریئی تھا۔ کامیاب اور ہر لعزیز متوازن اور سلسلجھے ہوئے خیالات کا مالک۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ لوگ جذباتی کس طرح ہو سکتے ہیں۔ ”۲۷ء میں ہم نے کیا کیا۔ ہم یہاں لوگ تھے۔ اب ہم اپنے دنی عارضوں کا علاج کرنا چاہ رہے ہیں۔ ہم کو اتنی مہلت دے دو کہ ہم تند رست ہو جائیں۔ پھر ہم سے مذہب اور روحاں نیت اور گیتا کی گفتگو کرنا۔ مجھے بھی گیتا بہت پسند ہے لیکن مجھے فی الحال پانچ سالہ پلان زیادہ پسند ہے۔ اس کی رپورٹوں کی تلاوت سے مجھے نسبتاً زیادہ سکون حاصل ہوتا ہے۔“ وہ کہتا ہے مارکیٹ کے رائٹرز کلب میں بیٹھے ہوئے اکثر کوئی برطانوی جرنلسٹ اس سے سوال کرتا! ” گوتم تمہاری کوئی ذاتی زندگی بھی ہے یا نہیں۔ تم تو بالکل کرشنا میں نہ بننے جا رہے ہو۔“

”مجھے خطرہ ہے کہ گوتم لیدر بن جائے گا۔“ سرل کہتا۔

”گوتم لیڈر نہیں بننے کا بہت بڑا اٹیٹھس میں بننے گا، وہ ایک بے حد صاحب نظر انسان ہے۔“ مال خزر سے کہتا۔

۲۷ء نے ذہنوں کی دنیا ہلا کر رکھ دی تھی۔ گوتم اور مال بد لے ہوئے عالمگیر حالات میں الاقوامی سیاسی جرائم اور ریا کاری اور بے ایمانی اور ضمیر فروشی کے اس عظیم الشان دور جدید سے سمجھوتہ نہیں کر سکتے تھے۔ گوتم کے سیکولر خیالات کی وجہ سے ہندو شاؤنٹ اور مہا سمجھائی نظریات کے لوگ اس سے خفاقتھے۔ مال کی قوم پرستی اور صاف گولی نے اسے کہیں کہ نہ رکھا تھا۔ اس کے پیشتر مسلمان دوست اور رشتہ دار پاکستان جا چکے تھے مگر وہ مصر تھا کہ انگلستان سے ہندوستان ہی واپس جائے گا۔ لندن اور کیمبرج کے پاکستانی طلباء اسے اندر یا باہر اس کے گوتم نیلمبر کا استھونج کہتے۔ یہ سب سن کر اس کے دل پر چھریاں چل کر رہ جاتیں۔

مزملائیکی بیماری نے جو اسے طاعت کی طرح عزیز تھی، زندگی کے متعلق سال کا سارا رو یہ بدل دیا تھا۔ اسے دفعتاً احساس ہوا تھا کہ زندگی اور موت میں بال سے زیادہ بار یہ حد فاضل قائم ہے۔ زندگی ایسی ٹھنڈیں کہ اس سے مذاق کیا جائے۔ انسان بہت عظیم ہے۔ اس کا دل کائنات کی سب سے قابل قدر چیز ہے۔ پھر اسے خیال آتا کہ عیسائی یسوع مسیح کی تصاویر میں ان کے دل کو کیوں اس قدر نمایاں کرتے ہیں، دل کی تصویریں کیوں بناتے ہیں جس میں کائنے چھینے ہیں۔ ہاں دوسروں کا دل دکھانا کیوں سب سے بڑا گناہ ہے!

مزملائیکی بیماری نے گوتم کی ساری کائنات میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ نجی جہنم، جو انسان کی روح ہے، اس میں کیسی کیسی دنیا کیں آباد تھیں،

ان میں کون لوگ بنتے ہیں؟ آفاق کے اس کے اس کو نے میں جہاں پر ”گوتم نیلمبر“ کو بورڈاگا ہے، کیسی کیسی آندھیاں چلتی ہیں، اس گھر میں (جس طرح کا گھر ہر نوجوان کے دل میں ہوتا ہے) کون اڑکی بیٹھی ہے۔ ہر نوجون جو صرف ایک بار اس کے گھر کے دروازے واکر کے صرف ایک لڑکی کی مانگ میں سیندھو رکتا ہے۔ مگر اس نوجوان کا اسرار کون جانے جس کا نام گوتم نیلمبر ہے۔ اس کے دل میں دراصل کون ہے، شاید اس کو بھی معلوم نہیں، یا شاید معلوم ہو۔ وہ مرے جانے والے کون!

اور اس بال سے زیادہ بار ایک پل پر، جسے زندگی کہتے ہیں، ”زملاء کھڑی تھی۔ زندگی سے مذاق نہیں کیا جا سکتا۔ دل جو بہت عظیم ہے ہے اس سے مذاق نہیں کیا جا سکتا۔

گوپی کا دل جو ساری کائنات کا مرکز ہے۔

”چھپا باہمی باغ میں بیٹھی ہیں۔“ طاعت نے در تپے میں جا کر دہرا یا۔ ”چلو ان سے ملتے چلیں۔ عرصے سے ان سے ملاقات نہیں ہو سکی۔“ گوتم نے گھڑی دیکھی۔ ”نہیں۔ اب سیدھے مذہرست چلو۔ ورنہ ہمیں واپسی پر دیر ہو جائے گی۔“

وہ سب چاہئے کی لاڈنخ سے نکل کر کار میں جا بیٹھے اور مذہرست کی طرف روانہ ہو گئے۔

چمپا نے دیکھا کہ کارزن سے چاءخانے کے چھانک سے باہر نکل گئی۔ اشجو درخت کے نیچے بیٹھا گئا۔ روشن، مائیکل، ڈنیس، سریکھا اور گلشن میز سے اٹھ کر ٹہلتے ہوئے ندی کی طرف جا چکے تھے۔ چمپا نے آرام کر سی پر سے جھک کر گھاس کی ایک پتی توڑی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ سرل نے پوچھا۔ وہ دھوپ سے بچنے کے لیے ایک رسالہ چہرے پر رکھے مقابل کی آرام کر سی پر بیٹھا تھا۔

”کچھ بھی تو نہیں۔“

”وہ تمہارے دوست لوگ جا رہے تھے، کار میں۔“

”ہاں۔“

”میں نے دیکھا ہے کہ تم کراوڈ سے خود کو مہائل بھی نہیں کرنا چاہتیں مگر کراوڈ کی چاہت بھی بہت ہے۔ ایک عجیب قسم کی وفاداری۔ اس لیے کہ تمہارا اور ان کا ماضی مشترک رہا ہے۔ تم عجیب مجموعہ اضداد۔۔۔“ سرل نے رنجیدہ آواز میں کہا۔ ”میں تم کو دیکھتا ہوں تو بہت اداس ہوتا ہوں۔“

”اطالویوں کی طرح باتیں مت کرو۔“ چمپا نے کہا۔

”یہ بھی تمہارے ساتھ ایک اور مصیبت ہے۔ ذاتی سطح تک پہنچتے ہی تم زور سے دروازہ بند کر دیتی ہو۔۔۔ بزدل۔۔۔ تمہیں اپنی بزدلی اور کمزور ریوں کا علم ہے؟“ وہ کرسی اتر کر درخت کے تنے سے نکل کر پیٹھ گیا۔ ”اکثر جھوٹ بولتی ہو۔ حاصل ہو۔ دوسروں کی مسرت کو رشک سے دیکھتی ہو۔ دوسروں کو مرعوب کرنے کی کوشش میں ہر وقت مصروف رہتی ہو۔ دوسروں کو خود سے بہتر نہیں

دیکھنا چاہتیں۔“ وہ کہتا رہا۔ ”مثال کے طور پر _____ تمہیں روشن پسند نہیں کیونکہ وہ یونیورسٹی میں تم سے زیادہ مشہور اور ہر لمحہ زیز ہے۔ تم لکھنؤ میں مشہور رہی ہو گی مگر وہ ۱۹۷۲ء تھا اور تم بھوتی ہو کہ اس بات کو دس سال گزر چکے ہیں اور روشن تم سے دس سال چھوٹی ہے چمپا۔ وقت کا سب سے بڑا اکمینہ پن یہ ہے کہ ہم ابھی اس چیز کے لیے تیار نہیں ہو پاتے کہ ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا زمانہ نکل چکا۔ چمپا! خدا کرے تم شنیلا مکر جی کبھی نہ بنو۔“

”شنیلا مکر جی؟“

”ہا۔ میں تم کو ایک انسٹی ٹیوشن میں تبدیل ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا۔ چمپا احمد جو آج سے دس سال بعد جیلسی کے ایک فلیٹ میں آرٹسٹوں اور ذہن پرستوں کی سر پرست اور گرو ہو گی۔ خداوند _____ یہ بڑا دہشت ناک خیال ہے۔“

”میں اس قدر قابلِ رحم ہوں؟“

”نہیں۔ ہم سب قابلِ رحم ہیں۔ تم ان ساری باتوں کے باوجود بہت پیاری ہو۔ تم نیک دل ہو۔ یہ بہت بڑی چیز ہے۔ اور شاید تم میں دوسروں کو معاف کرنے کی امداد بھی ہے۔ ہے نا؟“

”ہاں شاید۔“

وہ خاموش ہو گیا۔ بلکی بلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر چاء خانے کے لاڈنخ میں آگئے۔ روشن اور مائیکل اور ان کے ساتھ دور لانچ پر بیٹھے نظر آرہے تھے۔ لاڈنخ کے ایک صوفے پر چند روی کاغذ اور اخبار رکھے ہوئے تھے جو گوتم نیلمبر وہاں بھول گیا تھا۔

”تم دوستی کر سکتی ہو۔“ سرل کہتا رہا۔ ”ورنہ باقی تم سارے میں لکڑے لکڑے ہو کر بکھری ہوئی ہو۔ اس کاغذ کے لکڑے کی طرح۔“ اس نے بے دھیانی سے خالی لفافہ اٹھایا جس پر گوم کا پتا لکھا ہوا تھا۔ اس نے لفافے کو توڑ موڑ کر آتشدان میں پھینک دیا۔

”سرل، میں اتنی تیز روشنی میں ہوں، جتنی تم نیا بھی ظاہر کی؟“

”ہم سب اسی تیز روشنی میں موجود ہیں۔“ اس نے صوفے پر سے ایک رسالہ اٹھایا۔ اس پر بھی گوم کا نام چھپا تھا۔

”تم اسے بہت زیادہ چاہتی ہوئی؟“ اس نے رسالہ چھپا کی طرح پھینک دیا۔ ایک وقت تھا خود گوم نے اس سے عامر رضا کے متعلق اسی قسم کے امتحانی سوالات کیے تھے۔

”لیکن وہ تم سے ملتا کیوں نہیں؟“ اس نے دوبارہ کہا۔

”پتا نہیں۔ مجھا اس سے ملنے کی فرصت کہاں ہے۔“

”تم پھر جھوٹ بول رہی ہو۔“

وہ ایک اوپنجی چوٹی پر کھڑی تھی اور ساری دنیا اس کے رتی رتی احوال سے واقف تھی۔ میں نے اپنے آپ کو اس طرح کیوں بکھرنے دیا۔ اب بہت دری ہو

چکی ہے۔ اب کیا ہو ستا ہے۔ سارا زمانہ نکل چکا سارا زمانہ

باہر بارش میں چند اور موڑیں آ کر رکیں۔ چند مشہور شیکسپیر یں ادا کار لاڈنخ میں داش ہوئے وہ اپنی تمثیل لے کر کسی تھوار کے لیے برابر کے گاؤں میں آئے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک ایک سرل کو جانتا تھا۔ وہ سب آتشدان کے قریب

جانبیٹھے۔ دوسری باتیں شروع ہو گئیں۔

۲۳

مذہرست کا عظیم الشان اور پرفکٹ سائنسی نوریم سینکڑوں ایکٹر پر پھیلے ہوئے معطر جنگلوں اور باغوں میں گھرا، سکون سے بارش میں بھیگ رہا تھا۔ اس کے بشاش اور خوبصورت ماحول میں ہر طرف پھول ہی پھول تھے اور مسکراتے ہوئے ہمدرد چہرے۔ شفاف، طویل گیلریاں۔ حسین ڈرائیور۔ جھلمالاتا ہوا اوڈی نوریم جہاں مشہور تھیز کمپنیاں آ کر مریضوں کے لیے تمثیلیں استج کرتیں۔ اس دل آویز جنت میں لوگ آرام سے نیلی ویژن دیکھتے ہوئے اپنے خاتمے کا انتظار کرتے یا کسی دوسری طرح کے خاتمے تک کے وققے کے لیے پھر باہر کی دنیا میں واپس چلے جاتے۔ عمارت کے ایک ونگ میں سرے پر نرملہ کا کمرہ تھا جس کے قریب طرف باغ تھا۔ یہ میرا کمرہ آئی اٹی نشاط محل ہوشی کے کسی کمرے کا ایسا ہے نہ نرملہ نے طاعت سے کہا تھا۔ یہ لوگ ہر شے ماں سے مسلک کرتی جاتی تھیں۔ (سویٹر رلینڈ نہیں تال تھا۔ ایک ڈسٹرکٹ دہرہ دون کی طرح تھی لندن میں بمبی کی جھلک تھی)۔ مااضی محفوظ تھا کیونکہ اس میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہ تھی، کسی حادثے کا امکان نہ تھا۔

نرملاتکیوں کے سہارے نیم درازخوشی سے سب کچھ دیکھتی رہی۔ ”اب مجھے لندن کی تازہ خبریں سناؤ۔“

”اچھا۔“ طاعت اچک کر در پچ میں بیٹھ گئی۔ اس نے تفصیل سے بتانا شروع کیا۔

شانتا، مال اور بل کے ساتھ نر ملا کے پنگ کے دوسری طرف بیٹھی تھی۔ گوم پھولوں کے بڑے واز کے نزدیک کونے میں بیٹھا برناڑ سے با تین کر رہا تھا۔

”گوم جی،“ نر ملانے اسے مخاطب کیا، ”اب ہندی سماچار ہو جائیں۔“ وہ انھ کراس کے سامنے در پچ میں جا بیٹھا۔

”مجلس میلے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔“ نر ملانے طاعت سے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

”بڑے زوروں میں۔“ طاعت نے کہا۔ پھر ایک لمحے کے لیے وہ سب خاموش ہو گئے۔ ہر سال نر ملانے مجلس کے سالانہ میلے کی تیاریوں میں پیش پیش رہا کرتی تھی میلے میں اس کی غیر موجودگی کا یہ تیسرا سال تھا۔

”بس صرف اس اگست میں تم ہمارے ساتھ نہیں ہو۔“ مال نے کہا، ”اگلے سال انشاء اللہ تم پھر میلے کی لیدری کر رہی ہوگی۔“

”انشاء اللہ،“ نر ملانے مسکرا کر کہا۔

”کل بھیا صاحب سے ملے تھے۔“ گوم بولا۔ ”کہتے تھے کہ شاید آج تمہارے پاس آئیں۔“

”وہ تو مجھے کئی بار دیکھنے کے لیے آچکے ہیں بے چارے۔“ نر ملانے کہا۔ ”ان کی لڑکیوں کی صورت حال کیسی چل رہی ہے۔“

”ٹھیک چل رہی ہے۔ روشن آرا_____“ طاعت نے کہا۔

”پھر اسکینڈل شروع ہوئے۔“ مال نے ڈانٹا۔

”نہیں۔ میں تو اس کے بعد ابھی پروفیسر لوئن بی کا ذکر کرنے والی تھی۔

”طاعت نے ذرا سہم کر کھا۔

”تم نے ان کو میلے میں بلایا ہے۔“ گوم نے پوچھا۔

”ہا۔“

”یہ اچھاریکٹ ہے۔ برطانیہ کے ان سب جغادوی انخلکھو لز کو اپنی محفلوں میں بلا بلا کر دی بڑے کھاتی ہوا اور اس طرح ہندوستان کے لیے ان کی موافقت حاصل کرتی ہو۔ وہی بڑا اڈیپولیسی۔“ بل نے نہس کر کھا۔

”وہی بڑا اور بھرت ناطیم۔ انہی حرکتوں سے پاکستان ہاؤس والے جلتے ہیں۔“ گوم نے کہا۔

”اب رام گوپال کے مقابلے میں انہوں نے بلبل چوبدری کو کھڑا کیا ہے۔“ مرناڑیوں۔

”تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے کہ بہت بڑا اکھاڑہ ہے اور رام گوپال اور بلبل اس میں کشتنی لڑنے کے لیے اتر رہے ہیں۔“ طاعت نے اداسی سے کہا۔

”تمہاری یہ تشبیہ،“ گوم نے کہا ”بالکل صحیح ہے۔ سب سے بڑی ٹریجذی وہ ہے جب فن کاروں کو غیر فنی اغراض کے لیے استعمال کیا جائے۔“

”ہم نے میلے میں اسپنڈر کو بھی بلایا ہے۔“ طاعت نے منہ لٹکا کر کھا۔

”یہ بکے ہوئے اور خریدے ہوئے انخلکھو رکا دور ہے۔“ گوم نے کہا۔ ”اس عہد میں آرٹسٹ کی بڑی بھاری قیمت مقرر ہو چکی ہے۔ کون کہتا ہے کہ دنیا

آرٹسٹ کی قدر نہیں۔ دیکھو ایشیا کے فن کا راگ کسی طرح فل برائٹ اور طرح طرح کے ٹیفیوں پر دھڑا دھڑا امریکہ چلے جا رہے ہیں۔“

”ایشیا کے فن کا راگ تو دھڑا دھڑا سو ویٹ یونین اور چین بھی جا رہے ہیں،“ بل نے کہا۔ وہ بڑا سخت غیر جانبدار تھا۔

باہر دیوار کے جنگل پر شفت کی روشنی چھا گئی۔ عمارت کے مختلف کمروں سے موسیقی کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

”اب چلیں۔“ گوتم نے کہا۔ ”لندن واپس پہنچ پہنچ بہت رات ہو جائے گی،“

”تم سب جا رہے ہو،“ نرمل نے یک لخت دہشت زدہ ہو کر پوچھا۔ ”میں پھر اکیلی رہ جاؤں گی۔“

”تم اکیلی نہیں ہو زمل،“ نرمل نے اس کے پنگ پر جھک کر کہا۔ ”ہم سب ہر سے تمہارے ساتھ ہیں۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ اس نے انکھیں بند کر لیں۔

”اگلے ہفت تک کے لیے خدا حافظ نہ مل،“ طاعت نے اس سے کہا۔

”زمل، شاید میں اگلے ہفتے نہ آسکوں۔ پنڈت جی کسی کانفرنس کے لیے دلی سے آ رہے ہیں۔ بڑی سخت مصروفیت رہے گی۔“ گوتم نے نرمی سے کہا۔

”ہاں گوتم، تم میرے کارن اپنے کام میں حرج نہ کیا کرو۔“ نرمل نے رسانے سے جواب دیا۔

وہ سب گیلریاں عبور کر کے باہر آگئے۔ دور و نگ کے روشن در تپے میں سے

نر ملائکہ کو دیواروں کے اندر ہیرے میں اوجھل ہوتا ہوا بیکھتی رہی۔

۲۸

طاعت کا فلیٹ سینٹ جانز ووڈ میں تھا۔ اس کے نزدیک ہی شامستا اور بل رہتے تھے۔ آس پاس اور بہت سے مشہور مصنفوں اور اداکاروں کے مکان تھے۔ بہار کا موسم آتا تو ان مکانوں کے پائیں باغ پھولوں سے بھر جاتے۔ شفاف سڑک پر سرخ رنگ کی ڈبل ڈیکر زسکون سے گزرتی رہتیں۔ چورا ہے کی گرو سر اور تمباکو فروش کی دکانوں میں خریداروں اور دکانداروں کے درمیان پی تلی گفتگو جا رہی رہتی۔ آگے بڑھ کر ایک چھوٹا سا اطاالوی ریشوران تھا۔ اس میں ایک داڑھی والا پوش یہودی آرٹسٹ اپنے کونے میں بیٹھا اسکچ بناتا نظر آتا۔ وہ ہمیشہ متوجہ رہتا کہ کوئی اس سے اس کے اسکچ خرید لے گا۔ کوئی اس سے اس کی تصاویر نہ خریدتا۔

سینٹ جانز ووڈ کے ان خوبصورت مکانوں میں رہنے والوں کی قسمی زندگیاں بڑی طوفانی تھیں۔ محبتوں، طاقوں، نفیاقی الجھنوں، کشمکشوں اور سیاہ قبوے پر یہ لوگ اپنی زندگیاں بتاتے تھے۔ ان کے نشست کے کمرے انتہائی آرٹی انداز میں بجے تھے۔ بڑکیاں بالوں کی پونی ٹیلیں بناتی تھیں اور سیاہ رنگ کی ٹنگ موری والی پتلوں میں پہنچتی تھیں۔ اپنے والدین سے نفرت کرتی تھیں۔ اور اپنی سائیکلو ان لس کرواتی تھیں۔ اکثر مرد اداکار اور ادیب ہومو تھے۔ یہ کامیاب اور دولت مند

فکاروں کا محلہ تھا۔ یہ لوگ قدیم ایشیائی تہذیبوں، بازنطینی، رومان کی تھوڑکچرچ اور گپتا عہد کے آرت میں دلچسپی رکھتے تھے۔ یہ بر طائفی کی قسمی اسنٹو کر لی تھی۔

چند فرلانگ پر سریکھا کامکان تھا۔ اس کا شوہر گلشن آہوجہ اسکول آف اکنامکس میں تھا۔ یہ دونوں میاں بیوی لاہور کے شرناр تھی تھے اور ولی سے یہاں تعلیم کے لیے آئے ہوئے تھے۔ سریکھار قاصہ کی حیثیت سے بہتر شہرت حاصل کرچکی تھی اور رائل اکیڈمی آف آرت میں کریوگر فی سیکھ رہی تھی۔ اس کے قریب میاں بی بی چوپڑہ رہتے تھے۔ اشانگٹر اش تھی۔ سیمیش چوپڑہ بی بی سی کے ہندی سیکشن میں تھا۔ بدھ کے روزان کے یہاں ہندی کے حلقة ارباب ذوق کا جماعت ہوتا۔ چیلنسی کی ایک عالیشان موڈرن بلاک میں کملہ کا لشرا ماؤن فلیٹ تھا۔ کملہ طاعت اور نرملہ کی بچپن کی ساتھی تھی۔ قیامت کی ذہین اور بڑی زبردست، انخلکھول تھی اور بے حد خوش شکل اڑکی تھی کلاسیکل رقص کی ماہر، وہ فارز سروں میں تھی۔ نرگیش بمبی کے کسی کروڑ پتی کی اڑکی تھی۔ کیمپرچ کی تعلیم یافتہ۔ وہ سری پارسی اڑکیوں کی طرح مغربی لباس پہنتی۔ وہ بھی کہیں ملازم تھی اور کسی انگریز سے شادی کرنے والی تھی۔ کملہ کی بڑی بہن شکنستا کا مکان نائیٹس برج میں تھا۔ یہ بھی ایک غیر معمولی ذہانت کی مالک اور بہت اونچے پائے کی انخلکھول تھی اور بے حد دلکش اور پیاری اڑکی تھی۔ اس کے شوہر انڈیا ہاؤس میں پلک ریشنر آفیسر تھے۔ فیروز جہیں یونیورسٹی میں اردو میں ریسرچ کر رہی تھی اور ریجنٹ پارک میں رہتی تھی۔ زرینہ بھی یونیورسٹی میں تھی اور اوٹر لی میں اپنید الدہ اور بھائیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کے والد دلی میں تھے۔ ان سب کی بڑا مصروف اندگیاں تھیں۔ یہ سب اپنے

اپنے مقاصد کی تکمیل میں جائے تھے۔ صرف نر ملا سر یو اسٹو اس ہنگامے سے الگ مد ہرسٹ میں پلنگ پر پڑی تھی۔ اس کا خیال کر کے طاعت کا دل ڈوب جاتا۔ اس کو سرت اب کس طرح حاصل ہو گی؟ نر ملا، جس کو اور سب کی طرح زندگی سے بڑی بڑی توقعات تھیں۔ خوشی بے حد عظیم چیزیں ہے لیکن بے حد اضافی۔

طاعت دوسروں کی خوشی سے خوش ہوتی تھی۔ سریکھا کے ڈانس کے بعد کئی مرتبہ آنکھوں ہوتا یا گوم کی کتاب کا نیا ایڈیشن لکھتا یا کملائی کسی اخبار میں تعریف چھپتی تو اس روز طاعت کی عید ہو جاتی وہ دوسروں کے غم سے غمگین ہوتی تھی۔ وہ چمپا کا خیال کر کے بھی کافی ملوں ہوتی۔ اکثر وہ انگریزی میں ایک زبردست نالوکھنے کا وقا فو قتا اعلان کرتی رہتی مگر کافی اور مختلف مصروفیات کی وجہ سے یہ ارادہ کبھی شرمندہ تکمیل نہ ہو پاتا۔ دن بھر اور اکثر رات گئے اخبار کی روپرٹنگ کے سلسلے میں دوڑنا دھوننا پڑتا اور اس میں طرح طرح کے ایڈ و پچر ہوتے۔ اسے عموماً سے لے برٹیز کے انزو یو کے لیے بھیجا جاتا جو قریب سے دیکھنے کے بعد پتا چلتا کہ بے حد معمولی انسان تھے۔ غیر معمولی انسانوں سے بے حد معمولی حالات میں ملاقات ہوتی۔

طالب علموں نے طرح طرح کی مصروفیات بنارکھی تھی۔ ایک ایشین فلم سو سائٹی قائم کی گئی تھی جس میں ایک سے ایک بوگس ہندوستانی فلم دکھائے جاتے۔ انہیاں کلب میں نیٹو آرٹسٹوں کی نمائشیں ہوتیں۔ فیروز کے گھر کے پاس ہمراز بھائی رہتے تھے۔ ان کا مکان علی گڑھ کا ایکسشن تھا۔ یہاں ہر وقت مشاعرے ہوا کرتے۔

لبی بی والوں کی ساری زندگی با تین کرتی گزرتی تھی۔ بعض اوقات یہ لوگ سارا سارا دن کنھیں میں بحثیں کرتے بتاویتے۔ ہر ایک اپنی اپنی ہائکٹا۔ آل حسن اور اس کی بی بی کرشنہا کا مکان بھی ایک اور گپ کا سفر تھا۔ کرشنہا قانون پڑھ رہی تھی۔ آل بی بی کے ہندو سیکھیں میں تھا۔ ترونا اور فیروز کے مکانوں پر لڑکوں اور لڑکیوں کا جھمگٹ رہتا۔ اس میں زیادہ تر بنگالی شامل تھے۔ یہی لوگ لندن مجلس کے روح و رواں تھے۔

طاعت مڈ ہرسٹ سے لوٹ کر اپنے فلیٹ پر پہنچی۔ اسی وقت اوجیت کافون آیا: ”ہلو سنو۔“ وہ دہاڑ رہا تھا۔ ”دیکھو یہ میگور یگور کا ہر وقت بنگالی شور مچاتے ہیں۔ اب اقبال ایونگ ہونا ضروری ہے۔“ (اوجیت خود بنگالی تھا۔ اسے ایک لفظ اردو کا نہ آتا تھا۔ پر اگ میں اس نے انجینئرنگ پڑھی تھی۔) طاعت نے رالف رسمل کو فون کیا۔ یہ علی گڑھ سے اردو پڑھ کر آئے تھے اور یونیورسٹری میں اردو کے استاد تھے۔ ”اقبال سنگھ سے کہہ دیا ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔ ”ہاں،“ طاعت نے جواب دیا۔ ”اور اوجیت نے تو انگریزوں کے جگر مراد آبادی کو بھی بلا یاہ۔“

انگریزوں کے جگر صاحب انگریزی کے غزل گو شاعر تھے۔ جگر مراد آبادی ان پر کچھ ایسا چیک گیا تھا کہ ان کا اصل نام اب کسی کو یاد ہی نہ رہا تھا۔ یہ انگریزی کے اچھے خاصے دوسرے درجے کے شعراء میں شمار کیے جاتے تھے۔ روحانی طور پر سخت مسلمان تھے اور مشرق کے انسانوں میں ان کو خدا کی قدرت اور روحانی برتری نظر آتی تھی۔

اب پھر ریہر ملیں شروع ہوئیں۔ ڈھاکے کا عطاۓ الرحمن، اقبال کے کلام

کے لیے موسیقی کمپوز کرنے میں مصروف ہو گیا۔ فیروز اسکرپٹ تیار کرنے میں جست گئی۔ تروا، شیا، پرمودا، اوجیت اور سارے بنگالی اور کشمیری اور کھراتی اثر کوں اور اڑکیوں نے گانے کے لیے صحیح تنظیمی پر کیش شروع کی۔

طاعت اور میش سنگوی مڈل میپل کی لائبریری میں اقبال کی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کرنے میں مصروف رہے۔ اقبال ایونگ منعقد ہو چکی تو میلے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔

۷۵

لندن مجلس کا سالانہ میلا شروع ہوا۔ ہال کے اوپر کے زینے پر آ کر روشن نے نیچے کا منظر دیکھا۔ اڑکیوں نے دکانیں لگا رکھی تھیں۔ ایک کمرے میں دہی بڑے اور کچوریاں بک رہی ہیں۔ بالکل امین الدولہ پارک کا نظارہ ہے۔ ”ہاکرز“ اپنے اخبار پیچ رہے ہیں۔ کیونکہ اپنا لائز پر فروخت کرنے کے لیے آواز لگا رہے ہیں۔ سو شکشوں کا ایک گروہ اپنے پہنچت لیے کھڑا ہے۔

بل ایک ستون سے نکاچپ چاپ کھڑا تھا۔ ”ہوروشن“ اس نے کہا۔

وہ شبکتے ہوئے دوسرے ہال میں چلے گئے جہاں مختلف ایشیائی ممالک کے اشال تھے۔ تصویروں کی نمائش۔ ایک طرف ڈوکومنٹری فلم دکھائے جا رہے تھے۔ دفلتا خاموشی چھائی اور وہ سب گاتے ہوئے اسٹیچ پر آئے۔ پرمودا حسب معمول آرکیسٹرا کندہ کٹ کر رہے تھے۔

لائی سال چھے پیار بھرے ناواں
”کشمیر؟“ ایک انگریز تماشائی نے پوچھا۔

”کشمیر۔ یہ ہمارے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے۔“ روشن نے کہا۔
”یہ لوگ جو گارہے ہیں کون سے کشمیر سے آئے ہیں؟ مقبولہ یا
ازاد؟“ تماشائی نے سوال کیا۔

پوش مالہ کرتا داں جھس
شاہی مار گوشن جھس دورا داں

”دونوں طرف کا کشمیر ایک دوسرے کے لیے آزاد اور مقبولہ ہے۔“ گلشن
نے کہا۔

بل خاموشی سے پامپ پیتا رہا۔
روشنہ رو شہریاں وچھ پوش کارواں
پوش مالہ کر

پھر بنگالی گاتے ہوئے آئے۔

”یہ اتنے جوش و خروش سے گارہے ہیں۔ کیا یہ دہشت پسندوں کا گروہ ہے؟
“ ایک ٹوری اخبار کے نمائندے نے پوچھا۔

”یہ؟ ہاں یہ دونوں بنگالوں کے رہنے والے ہیں۔“ طاعت نے قریب اکر
بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

پون گھنٹہ گزر گیا۔ ٹوری اخبار نو لیں خفا بیٹھا تھا۔

”تم لوگ ہر وقت سیاسی گفتگو کیوں کرتے ہو؟“ ایک برطانوی ادیب نے

آہستہ سے کہا۔ اب تک وہ بڑی ادا کی سے ان منظر کو دینتھا رہا تھا۔

”ہم لوگ بے حد بد قسمت ہیں اس لیے۔“ طاعت نے مول آواز میں جواب دیا اور پھر کسی کام سے اٹھ کر اٹیج کے پیچھے چلی گئی۔
اب ڈھولک نج رہی تھی۔

”پنجاب؟“ ایک اور اخبارنویس نے پوچھا۔

”ہاں۔ پنجاب بھی ود ہیں۔“ قریب بیٹھے ہوئے سریکھا کے میان گلشن آہوجہ نے اسے تلخی سے جواب دیا۔ ”اور سوال اکرو، میں تمہاری معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کروں گا۔“

دھرتی پھی آئی ہی لے کر بھاگوں _____ دھرتی۔

شینا اور جادویا۔ سنگاتی گادویا _____ رانو پاکھر
یہ مرہنی گیت تھا۔
پھر کھراتی کورس شروع ہوا:
ہے کھڑتی واڑی وتی _____ جنگل تی جھاڑی وتی
ساگر تھی گرو رتھی

سوئی ساد آویا _____ اوہ میں سوئی ساد آویا

فلیٹ اسٹریٹ کے نماندے اٹیج کے قریب فٹ لانٹس کے اندر ہرے میں فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھے سامنے کے جگہ کاتے منظر کو دیکھائیے
اٹیج پر وہ گارہے تھے۔

ہمیں جگ جگ کیرا کنگال

بھائی گنی مزکونہ دوار

دیتا ڈگ ایک تال

دھرنی پر آؤ یا — اوہ میں دھرنی پر آؤ یا —

دیکھ دیکھ اورے اندرھ

کار سین آؤ یا

کار سین آؤ یا —

پھر ہال کے وسط میں وہ سب گھیرا بنا کر کھڑے ہوئے اور انہوں نے انٹر نیشنل
شروع کیا۔

ہر جگہ جوانیاں ہیں گاری

ہنسی خوشی مناری

اور لاری و شومنتر تا

دنیا بھر سے ایک ہوئے نوجوان ایک آ درش مہان لیے

خطرہ ہو بلید ان کا — پھر بھی ہم لا میں گے سکھ چیں

سکھ چیں — سکھ چیں —

ان کی آوازیں دور ہوتی چلی گئیں۔ روشن باہر آگئی۔ یہ سب کیا بکواس ہے۔

ہجوم میں سے نکل کرتیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے اس نے سوچا۔ یہ درست ہے

کہ اس طرح کے گیتوں سے خون میں ایک لمحے کے لیے جوش سا پیدا ہوتا ہے۔

یہ لوگ اس قدر بلڑکیوں مچار ہے ہیں کیونکہ سب فنا ہے اور انسان ایک دھرے

سے مختلف ہیں۔ انسان کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کا پیچھا

لندنی ذوق

کر رہا ہے۔

”مس کاظمی“ کسی نے پیچھے سے آواز دی۔ وہ ٹھنڈک گئی۔ یہ تزوہ نا تھی۔ پھر اڑکیوں کے ایک ریلے نے اسے آیا جن سے فتح کروہ اب باہر نکلی تھی۔

”روشن فیروز نے کہا“ ”مزدعل دادا آگئے ہیں۔ اس وقت ہم لوگ وہیں جا رہے ہیں۔ کل صبح سے بھج ان کے لیے چندہ جمع کرنے نکلیں گے۔ تم کو لینے کے لیے آٹھ بجے پہنچ جائیں گے۔ سمجھیں، تیار رہنا؟“

طلعات اس کے نزدیک آئی۔ ”یہ کنجی یعنی جاؤ میں شاید دیر سے آؤ۔ یا شاید سریکھا کے یہاں رہ جاؤ۔ صبح کو ضرور چلننا ساتھ۔ گذراست۔“

وہ سب دوسرا سڑک پر مزگئیں۔ وہ حسب معمول مصروف معلوم ہوتی تھیں۔ مصروفیت، تکمیل مقاصد کا ہنگامہ۔ ہجوم ندی کے پانی کی مانند چاروں طرف بہا کیا۔ کالج میں ج ٹھیاں تھیں اور وہ یورپ جاتے ہوئے چند روزوں کے لیے طاعت کے یہاں تھہر گئی تھی۔ مید اویل کے آشیش پر پہنچ کروہ اور پر آرہی تھی کہ اچانک اسے عامر رضامیل گئے۔ وہ کار میں اسی کی تلاش میں ادھر آرہے تھے۔

”تم کہاں تھیں؟ میں تمہارے سارے ٹھکانوں پر تمہیں ڈھونڈا آیا۔“

”میلے میں۔“

”میلے؟ وہ ہاں۔ میلے ٹھیک ہے۔ آؤ۔“

وہ نکڑ کے اطالوی ریسٹوران میں داخل ہوئے۔ یہودی آرٹسٹ انہیں دیکھ کر فوراً اپنے کاغذ پر جھک گیا۔

”روشن“ عامر نے میز پر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا، تم بڑی غلبی

کر رہی ہو۔ تمہارے ابا کو تمہاری روپورٹ پہنچ جائے گی۔

”اوہ“ _____ وہ نہ سڑی۔ ”لیکن عامران لوگوں میں بہت سے میرے عزیز دوست ہیں۔ ان کے سیاسی خیالات یا ان کی قومیت دوستی کے راستے میں تو حائل نہیں ہو سکتی۔“

”یہ تمہارا نظریہ ہے۔“ عامر نے کہا ”لیکن زیادہ پریکاریکل بنو اور اپنے نفع لفظان کا دھیان رکھو۔ تمہاری سرگرمیوں سے تمہارے والد کی ملازمت پر بھی اثر پڑ سکتا ہے۔“

”اور شاید میری اور تمہاری دوستی پر بھی۔“ روشن نے معادل میں کہا۔ ”لیکن عامر _____ میری کیا سرگرمیاں ہیں؟“ اس نے چڑ کر کہا۔ اس آدمی کو سمجھانا بیکار تھا۔ پہلی مرتبہ اسے محسوس ہوا کہ یہ انسان، جسے وہ اتنے عرصے سے اپنا دیوتا تصور کر رہی تھی، ایک مختلف، ہستی تھی ایک دوسرے جزیرے پر بیٹھا تھا، اسے نہیں سمجھ سکتا تھا۔ مگر وہ تیار ہو گئی کہ اس کے خیالات کی تابعداری کرے گی مرد کی تابعداری عورت کا فرض ہے۔ فلسفے یہاں بیکار تھے۔ مرد ہر حالت عورت کی مکمل اطاعت کا خواہاں ہے۔ یہ کامریڈ و امریڈ سب غلط بات ہے اور یہ عامر رضا بہر حال کا میرڈ نہیں تھا۔ اب یک لخت اس کی سمجھ میں آگیا کہ چمپا احمد سے اس کی کیوں نہ بھسکی۔ چمپا، اپنے خیالات میں خواہ وہ کتنے ہی گنجلک کیوں نہ رہے ہوں، خود مختار رہنا چاہتی تھی لیکن شاید چمپا بھی مکمل طور پر خود مختار نہ تھی۔ کاش وہ چمپا سے پوچھ سکتی کہ وہ اب کس کے خیالات کی اطاعت میں مسروف ہے۔ وہ خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ باہر یسٹوران کے دروازے پر چینی ہڑوں میں مابوس ایک

ہنگرین سازندے نے والمن پر ”ہسپانوی باغ میں ایک رات“ بجانا شروع کر دیا تھا۔

”اسپن چلوگی؟“ عامر نے پوچھا۔

”ہاں۔“

”جرمنی؟“

”ہاں، جہاں کہو گے چلوں گی۔ اس نے دل میں کہا۔ فلسفہ اور آزادی افکار لغو بات ہے۔ اگر اس وقت طاعت یا کملائی کو اس کے ان خیالات کا پتا چل جائے تو وہ فوراً اسے پھاؤں پر لٹکا دیں۔ یہ سوچ کروہ اداہی سے مسکرائی۔“
عامر رضا نے اس کی مسکراہست نہیں دیکھی۔

دوسرے دن وہ لڑکیوں کے ساتھ قاضی مذرالا اسلام کے لیے چندہ جمع کر کے طاعت کے فلیٹ واپس پہنچی تو اس نے ایک اجنبی کو موجود پایا جو اس کے انتظار میں نیچے باغ میں ٹہیں رہا تھا۔

”آپ کے خلاف رپورٹ پہنچی ہے کہ آپ کمیونٹیوں کے جلسوں میں شریک ہوتی ہیں،“ اجنبی نے کہا۔

”جی؟“ وہ ہکا بکارہ گئی۔

”یہ غلط ہے؟“

”بالکل۔ وہ لوگ کمیونٹ قطعی نہیں ہیں۔“

”آپ کو برابر ایک خاص گروہ کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ“

”

”مگر یہ تو محض طالب علمانہ ہنگامے ہیں۔ ہر جگہ ہوتے ہیں۔“

”جی!“

”آپ کا مطلب ہے، وہ وہیں مکان کی سیر ہیوں پر بیٹھی، دس کہ میں انسانی رشتؤں کو سیاسی مصلحتوں پر قربان کر دوں؟ ان لوگوں میں سے بہت سے میرے عزیز ترین دوست اور ساتھی ہیں۔“

”انسانی رشتے؟“ جبکی نے جیرے سے پوچھا۔ ”وہ کیا چیز ہے؟ رشتے صرف سیاسی ہوتے ہیں۔ انسانی رشتے کس چیز کا نام ہے۔ اس بے تکلفی کو معاف فرمائیں گا میں کاظمی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ فلسفوں اور آئینہ میں نے آپ کو کہیں کاندھ رکھا اسی لیے میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ فلسفہ اور ادب عالیہ کی تعلیم آج کی دنیا میں بالکل لغو اور بے معنی ہے۔ آپ نے بزرگ ایڈنٹریشن کیوں نہ پڑھا؟“ روشن غصے سے تلمدار ہی تھی لیکن نہ پڑھی۔

”تشریف رکھے،“ اس نے دوسری سیر ہی کی طرف اشارہ کیا۔

”میں نے آپ کا بہت ذکر نہ ہے۔“ جبکی نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی قابلی کیدھوم مجھی ہوئی ہے۔ لیکن افسوس کہ _____“

”کہ میں غلط راستے پر پڑ گئی؟! میں آپ سے عرض کروں مسٹر _____“

”خان _____“

”مسٹر خان کہ میں کیونٹ نہیں ہوں؟“

”نہیں ہیں؟ اس کا ثبوت آپ کے پاس کیا ہے؟“

یہ بڑا ٹھیڑھا سوال تھا۔ خیالات جیسی غیر مرئی چیز کے متعلق کس طرح کوئی

ثبوت پیش کیا جاسکتا تھا۔ وہ فلسفہ اور خیالات کی طالب علم، اس بے بھی پر بے حد تملکاً۔

اب امریکہ جانا گول سمجھو۔ اس رات پنگ پر لیٹے ہوئے اس نے سوچا۔
(اے آئندہ سال ہاروڑ جانے کے لیے فل برائٹ وظیفہ مل چکا تھا) دیر تک کروٹیں بدلتے رہنے کے بعد نیند آئی۔ صبح جب وہ موکر اٹھی تو اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ عدالتیں، سزا میں، جیل، بندوق، گولہ باروڈ نظرے رات بھر اس نے اس قسم کے خوفناک خواب دیکھے تھے۔

”آخر جن کو جیل بھیجا جاتا ہے وہ آسمان سے تو نہیں اترتے ہیں۔ ہماری تمہاری طرح ہی کے انسان ہوتے ہیں۔“ ناشستہ تیار کرتے ہوئے اس نے طاعت سے کہا۔

طاعت نے اس کی رائے سے اتفاق ظاہر کیا۔

”تم مذاق سمجھ رہی ہو۔“ روشن نے جھنجھلا کر کہا۔

”بالکل نہیں۔“ طاعت نے سمجھی گی سے جواب دیا۔

”سوال یہ ہے،“ روشن اندرے پھینٹتے ہوئے آہستہ آہستہ بولی، ”کہ ایک طرف روپیہ اور عزت اور شان و شوکت ہے اور سیکیورٹی اور دوسرا طرف مخفی دھندا کا ہے، اور دھندا کے میں خواب نظر آتے ہیں۔“

”ہاں۔ ایک طرف سیکیورٹی ہے، دوسرا طرف سیکیورٹی ایکٹ، فیصلہ تمہیں خود کرنا ہے۔“ طاعت نے کہا۔

سریکھا نے جلدی جلدی چاءپ میں کے بعد گھنٹروں باندھ لیے۔ وہ سب مذرا اسلام کے پروگرام کی ریہرسل کے لیے صحیح طاعت کے یہاں جمع ہو چکے تھے۔ ”روشن“ گوم نے اسے غیر معمولی طور پر خاموش دیکھ کر سوال کیا، تمہارا پروبلم کیا ہے؟ وہ حسب معمول پیغمبرانہ شان سے آ کر دیوان پر بیٹھ گیا۔

”ذین کلکش۔“ بیعت نے مختصر اجواب دیا اور تو سینکڑے میں مصروف رہی۔ ”تو کیا ہوا؟ اپنے وطن واپس جاؤ۔ چند سال بعد وہاں رویولیشن آئے گا۔ اس میں تمہاری بڑی ضرورت ہوگی۔“ گوم نے اس قدر یقین اور اعتماد کے ساتھ کہا کہ روشن کو نہیں آگئی۔

”ایکن میں رویولیشن نہیں چاہتی،“ اس نے کہا۔

”وہ تو میں جانتا ہوں۔“ گوم نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”میں نے صرف یہ کہا تھا کہ جب رویولیشن آئے گا تب تم کام کرو گی۔“

”اسے غلط راستے پر مت لگاؤ۔“ طاعت نے کہا۔ ”پہلے ہی اس کی رپورٹ ہو چکی ہے۔ اسی طرح تم نے چمپا باجی کو انجو کیٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔ فیل ہو گئے اور دیکھو ان کا کیا ہوا؟“

”کچھ بھی تو نہیں ہوا، یہی افسوس ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کا کچھ نہیں ہوتا۔ معلق رہتے ہیں، کہیں نہیں پہنچ پاتے، بہتے رہتے ہیں،“ گوم نے آہستہ آہستہ کہا۔

کیا اس وقت یہ چمپا کو یاد کر رہا ہے۔ طاعت نے سوچا۔

”ایکن روشن تم اس سفارت خانے جا کر کہہ دو کہ تم کو ہم لوگوں سے کوئی

مطلوب نہیں۔ ”گوتم“ روشن کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔

”میں غلط بیان نہیں کر سکتی۔ مجھے اپنی ضمری پرستی پر اب تک بہت ناز رہا ہے مجھے تم لوگوں سے بہت بڑا مطلب ہے۔ تم لوگ میرے دوست ہو۔ میں دوستی کا مطلب صحیح ہوں، اس کی قدر و قوت۔“

”مطالب صحیح کی کوشش نہ کرنا۔ بہت دلکھی ہوگی۔“ گوتم نے دفعتاً بڑی رنجیدہ آواز میں کہا۔ طعلن نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ یہ اس وقت چمپا کو یاد کر رہا ہے، اس نے دل میں دہرایا۔

”اجی انکار کرنے میں کیا رکھا ہے۔“ اس نے گوتم کا دھیان بٹانے کے لیے شفقتگی سے بات شروع کی۔ ”ایک سے ایک لوگ ایک زمانے میں ترقی پسند تھے۔ اعلان کر دیا کہ اب ترقی پسند نہیں ہیں اور دیکھو کیا مزے کر رہے ہیں۔“ اس نے روشن کی طرف مڑ کر کہا۔ ”اور تم تو کبھی بھی ترقی پسند نہیں تھیں۔ نہ کل نہ آج۔“

”بھیا صاحب نے بھی تو مضمایں لکھے تھے؟ فیروز نے سوچ کر کہا۔“

”مگر اب تو وہ بہانگ دل کہتے ہیں کہ تائب ہو چکے ہیں۔“ طاعت نے جواب دیا۔

”بھیا صاحب کل شریپر میں بھی دصل تھا؟“ گوتم نے پوچھا۔

”جی ہاں، ایام جہالت میں۔ اب انہیں گیان حاصل ہو چکا ہے۔ ورنہ فارن سروس میں یونہی لے لیے جاتے۔“ طاعت نے کہا۔

”یہ ایام جہالت کب تھے؟“ گوتم نے سوال کیا۔

۳۹، غیرہ میں۔ طاعت نے جواب دیا۔ ”ارے تم کو کیا معلوم۔ بہت بڑے انقلابی تھے ایک زمانے میں لکھنؤ کے اندر۔ چمپا باجی بھی سب کے ساتھ ساتھ لگی رہتی تھیں۔ رشیدہ آپ کے یہاں بیٹھ کر یہ سب آزاد نہیں لکھتے تھے۔“

”چمپا باجی اتنی پرانی ہیں؟“ روشن نے چونک کر پوچھا۔

”معلوم نہیں ہوتیں،“ ترونا نے کہا۔

”سدابہار ہیں،“ فیروز نے جواب دیا۔

”دوستی محبت سے بلند تر شے ہے۔“ گوتم نے آہستہ سے کہا۔ ”بہت سے لوگ یہ بات نہیں سمجھ پاتے۔“

”تم بھی اعلان کر دو جی،“ طاعت نے پھر جکلڈی سے گفتگو کر رکھا۔ اصل موضوع کی طرف موڑا، ”کہ مجھے ان موئے سرخوں سے کوئی مطلب نہیں۔“

”تم کہہ دو کہ تم سرخ اسرار خ فرخ آبادی کبھی نہ تھیں، نہ ہونے ہو گی۔“ فیروز نے کہا۔

”دست صبالائیے؟“ کورس ہوا۔

”جی ہاں۔“ انہوں نے کہا۔

سب آگ کے پاس جا بیٹھے اور ”دست صبا“ عقیدت سے ہاتھوں ہاتھ لی جانے لگی۔

”سمجھیں تم؟“ گوتم نے کتاب کے صفحے پلٹے ہوئے بے دصیانی سے کہا۔ ”بس تم جا کر کہہ دو، آئندہ ہم سب سے قطع تعلق کرلوگی۔ کیا تم کو معلوم نہیں کہ قطع تعلق کرنا دراصل بے حد آسان ہوتا ہے۔“

”تم سٹیون اسپنڈر کی طرح“، طاعت نے کہنا شروع کیا۔

”یہ بے بات انگریزی اویسوں کا ذکر کیے بغیر تمہارا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔“
”غیر وزبولی۔“

”کیا کیا جائے۔ اپنی اپنی کمزوری ہے۔“ طاعت نے کہا اور بات جاری رکھی۔ ”تم ایک کتاب لکھنا کہ کس طرح تم کو ڈوب بنانے کی کوشش کی گئی مگر تم صاف فتح گئیں۔“

”تم نے فریڈم کا انتخاب کیا۔“ غیر وزنے اتفاق دیا۔

”وغیرہ وغیرہ۔۔۔“ سریکھا نے کہا۔ اب تک وہ کمرے کے سرے پر کھڑی تھا تا کی پریکش کر رہی تھی۔

”کیا یہ قوی کی باتیں کر رہی ہو تم لوگ۔“ روش نے پیانو پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”روشن تم جرمنی جا رہی ہو کل؟“
”ہا۔“

”تو ہمارے ساتھ ہی چلو۔ ہم لوگ بھی یو تھو فیسوں کے لیے کل جا رہے ہیں
مشرقی بر لین۔“

”مشرقی بر لین میں کیسے جاسکتی ہوں؟“ روش نے کہا۔

”کیوں؟“ ”تم میں کیا سر خاب کا پر لگا ہے۔ ساری دنیا کے لوگ جاسکتے ہیں،
تم نہیں جاسکتیں۔“

”سمال یہ بھی“، غیر وزنے سر ہلا کر کہا۔ ”ساری رامائی ہو گئی، آہ پوچھتی ہیں
سیتا کون تھی؟ ارے یہی تو قصہ ہو رہا ہے۔“

”بکواس“ سریکھانے کہا۔ چلو روشن یہ ایسا تجربہ ہے جو زندگی بھر کبھی حاصل نہ ہوگا۔

”دنیمیں“

”ارے، کیا رکھا ہے؟ واپس آ کر سو یہت یونیٹ اور مشرقی یورپ کے خلاف تین چار مضمون لکھ دینا۔ سب یہی کرتے ہیں۔“

”یہاں اتنی بے ایمانی ہے، اتنی ضر弗روشی ہے۔ روشن بیگم جس کا تم کو اندازہ نہیں ہو ستا۔“ گوتم نے کہا۔ ”آج کی دنیا میں تم اپنے ضمیر کو بچائے نہیں رکھ سکتیں۔“

وہ کوٹ پہن کر باہر جانے کے لیے تیار ہوئی۔

”ہم تم سے بر لین میں ملیں گے۔“ روشن نے مسکرا کر کہا۔

”مغربی بر لین میں۔“ روشن مسکرا کر کہا۔

”دنیمیں ہم تم سے مشرقی بر لین میں ملیں گے۔“

”یہ تقسیم شدہ دنیا ہے۔ ملک انسان، نظریے، رومیں، ایمان، ضمیر ہر شہزادوں کو سے کاٹ کاٹ کر تقسیم کر دی گئی ہے۔ یہاں ہر طرف سرحدیں ہیں۔ اس تقسیم شدہ دنیا میں ہم ایک دوسرے سے سرحدوں ہی پر مل سکتے ہیں۔ روشن“ گوتم نے کہا، ”ہم تم سے مشرقی اور مغربی بر لین کی سرحد پر ملیں گے۔“

”اگر اس وقت تم کو جیل نہ بھیج دیا گیا۔“ طاعت نے نہس کر کہا۔

بازش ختم ہونے پر چمپا اور سرل دیہاتی چاءخانے سے باہر نکلے۔ لانچ پر بینہ کروہ سب کیمیرج واپس پہنچ گئے۔ راستے میں ندی ہرے بھرے کنجوں میں سے گزری جہاں گھنی شاخوں نے پانی پر چھت سی بنا رکھی تھی۔ یہ ڈرم کا آخری دن تھا۔ کل سے چھٹیاں شروع تھیں۔ چمپا نے سرل پر نظر ڈالی۔ ہر چیز کہی جا چکی تھی۔ اب کہنے کو کیا باقی تھا؟ ہر شے میں گھسا پاپن آگیا تھا سرل اسٹلے میں بھی۔ وہ اسے اتنی اچھی طرح جانتا تھا اور وہ اس سے اتنی اچھی طرح واقف تھی۔ کتنے رنج کی بات تھی۔ اب وہ کن جنگلوں میں جا کر چھپے گی۔ اپ بن اپ بن میں چیچل مورے میں میں کیمن کن پھرے شام وہ ریلنگ پر جھک کر ایک بہت پرانا گیت گنگتاتی رہی۔ سریکھا نے ندی کی سطح کو دیکھا جو بہت پر سکون تھی۔ کنارے پر پہنچ کروہ لندن کی طرف روانہ ہو گئی۔

اسے واپس پہنچ کر مجلس میلے کی تیاری کرنا تھی۔ اس کے بعد وہ بر لین جا رہی تھی۔ وہاں سے بوٹ کر اسے اُنی وی پر نا چنا تھا۔ پھر وہ رام گوپال کے ساتھ سارے یورپ کا دورہ کرنے والی تھی، ”گریٹ سریکھادیوی اندیا اینا پاولووا۔ سرل نے تمثیر سے کہا۔ ”خدا حافظ“

”خدا حافظ“ سریکھا نے اپنے خلائق عبسم کے ساتھ جواب دیا۔ وہ اسے رخصت کرنے کے بعد لکڑی کے بوٹ ہاؤس کے نیچے آ کر بینہ گئے۔ سرل کے شہرے بال ہوا میں اثر رہے تھے۔ وہ چمپا کو اس قدر مانوس معلوم ہوا گویا کاشوہر تھا۔ اسے

ایک پھر یہی سی آئی۔ وہ اس کا نہیں کسی اور لڑکی کا شو ہر تھا۔ اس لڑکی کو چمپا نے آج تک نہ دیکھا تھا۔ منظر پر سائے پھر پھیل گئے۔ کشمکش کنارے سے بندھی کھڑی تھیں اور موسم کی ساری خوبیوں میں اکٹھی ہو کر گلابوں کی چھاؤں میں پانی پر تیرہی تھیں۔ آسمان پر سے مرغابیاں گزریں۔ گایوں نے آ کر پانی میں اپنا عکس دیکھا اور مطمئن ہو گئیں۔ بوٹ ہاؤس کی بالکنی پر ایک لڑکی آ کھڑی ہوئی۔ بہت سے لوگ پرم روز کی بیلوں کے کنارے کنارے بنیاں اٹھائے پانی کی اور جا رہے تھے۔

”چمپا۔۔۔“ سرل نے ایک اٹی ڈونگی پر بیٹھ کر کہا، ”مجھے اپنے پس منظر کے متعلق بتاؤ۔“ اس نے دیکھا کہ دور دیس سے آئی ہوئی یہ لڑکی اس کے سہارے وہاں بیٹھی تھی۔ وہ بعد غیر محفوظ تھی۔ اپنے پس منظر میں شاید وہ محفوظہ سکے لیکن اس کی اپنی دنیا جانے کوں کی تھی۔ دنیا میں برا بر بدلتی رہتی ہیں۔ یہ لڑکی اسے بے انہتا مانوں نظر آئی۔ روز ماری اس کے لیے اجبی تھی۔ وہ یک لخت بہت گھبرا گیا۔ اسے معلوم ہوا کہ وہ اس لڑکی چمپا احمد سے ایک غیر مرلی بندھن میں بندھا ہوا ہے۔ اسے اپنے آپ پر اور اس لڑکی پر بڑا ترس آیا۔

”کیا تم بھی میرے متعلق ناول لکھو گے؟“ چمپا نے پوچھا۔

”نہیں اور کون لکھنے والا تھا؟“

”بل۔۔۔ ولیم کر گیگ“

”نہیں۔ میں ناول نہیں لکھنا چاہتا۔“

”کیا میں تم کو بہت عجیب معلوم ہوتی ہوں؟“

”تم عجبہ روزگار نہیں ہو۔ تمہاری طرح کی بے شمار لڑکیاں موجود ہیں۔ ذہین، حس اور دلکش۔“

چنانچہ ان تین الفاظ سے میری وضاحت ہو جاتی ہے۔ چمپا نے دل میں کہا۔
اس نے آنکھ بند کر کے اپنا پس منظر یاد کیا۔ بنارس کا محلہ، گھر۔ آنکھ میں کھری
چار پائیاں پڑی ہیں۔ بابا چیپوان لی رہے ہیں اور مقدموں کی مسلیں دیکھتے جاتے
ہیں۔ سرل کو یہ منظر دکھانا سے اچھا نہ لگا۔ وہ اسے چھانگ کر آگے بڑھ گئی۔ لکھنو۔
ہلی ٹی کانج۔ کیلاش۔ گلفشاں۔ لیکن گلفشاں اس کا گھر نہ تھا (ہوسنا
تھا)۔

”یہ دیکھو کون آرہا ہے تمہارے پس منظر سے نکل کر۔“ سرل نے کہا۔
چمپا نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ کنارے پر دور تک بکھرے ہوئے تعطیل
منانے والوں کے مجمع سے نکل کر مال بوت ہاؤس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ گھاس پر
اس کا سایہ آگے آگے چلتا رہا۔

”ہلو چمپا باجی۔ ہلو سرل۔“ اس نے قریب آ کر کہا۔

”ہلو۔“

”کل صحیح ہم نے آپ کو ایک روڈ ہاؤس میں دیکھا تھا۔“

”ہاں۔“

”مگر ہم لوگ ذرا۔۔۔ جلدی میں تھے۔“

”ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں۔۔۔ بیٹھو۔“

وہ بھی ایک ائٹی ہوئی ڈوگنی پر بیٹھ گیا۔

”میں سرل کو کھنو کے متعلق بتا رہی تھی۔“ چمپا نے کہا۔

”واقعی۔“ مال نے اخلاقاً وچکپی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ یہ بھی تک دیں پڑھی ہیں دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی۔ مال نے تاسف سے سوچا۔

چمپا نے مال کے لجھے کے رنج کا اندازہ لگایا۔ تم مجھے بھی نہیں سمجھ سکو گے مال۔ اس نے کہا۔ تم نے مجھ پر ہمیشہ چیزوں کی پستش کا اذنا م لگایا ہے لیکن گرمی کی دوپہروں میں بھوسے کے ڈھیر کی مہک اور گھوڑوں کے چھٹھنانے کی آواز اور خاموش سڑکوں پر سے گزرتی ہوئی بیل گلا۔ مجھ میں شاید زیادہ عقل نہیں لیکن میں ان سب چیزوں کو محسوس کرنا اور اپنے پاس رکھنا چاہتی ہوں، اگر میں بہت زیادہ عقائد ہوتی تو تمہارا فلسفہ پڑھتی اور مضمون ہو جاتی۔

اویجیت ندی میں سے نکل کر آیا اور مال کے نزدیک بینہ گیا۔

”سرل کا شتم نے بارش کے بعد چاند باغ کے کنجوں پر جور نگ بکھر جاتے تھے وہ دیکھے ہوتے۔ یا رام نگر کی وہ آرڈاؤنڈر سڑک جس میں گرمیوں کی بھری دوپہر کے سنائی میں ایک چھوٹا سا اس ہندو بچہ لمبی سی چوٹی رکھائے ایک منڈیر پر تھا بیٹھا سوانیوں کا پیارا یاد کر رہا تھا۔“ نہیں سرل میں تم کو اپنا پس منظر نہیں بتا سکتی۔ بہت مشکل ہے اور تم سمجھ نہیں سکو گے۔“

”میں تم کو بتاؤں گا۔“ مال نے آگے جھک کر کہنا شروع کیا، وہ معاں دنیا میں داش ہو گیا جو یہاں سے بہت دور تھی، جس پر وہ عاشق تھا۔ ان مناظر کی روح کو مال سے بہتر کون جان ستا تھا، وہ اس کا پیارا ہندوستان تھا۔

”لو سنو: گیا ن و تی کندھوں پر بال چھکا کر ایمن کا خیال گاتی تھی

آل نبی اولاً علی پرواری واری جاؤں زہرا کے فرزند حسن
حسین اب میں اس کا ترجمہ کیسے کر ستا ہوں اور ماتی گاتی
تھی کانہامو ہے آساوری راگ سناؤ اور شادیوں کے مقعوں پر
کیاں پور میں والان کے پردے گردیے جاتے تھے ارتوختوں کے چوکے پر بیٹھ
رک میرا شنیں الاقنی تھیں۔ اس بنے پر سایہ علی کا۔ مورا شیام سندر ہنا۔
کون مغربی سو شیولو جست اس منظر کے حسن کو سمجھ ستا ہے مورا
شیام سندر ہنا۔

”اور ”چمپا نے کہا ”میرے گھر کی میرا شنیں گاتی تھیں
منگل گاؤں چوک سجاوں کبھرا چنیلی کا لاؤ ری
چنیلی کا سمجھا تم نے دیکھا ہے سرل؟“
”اور گھر اکے کنارے کنارے میرے گاؤں کے کمان کھیتوں کی منڈیر
پر بیٹھ کر چاہدی رات میں آہما اول کی تانیں اڑاتے تھے علی علی کر
کے سید دوڑیں آہما کھیچ لیں تلوار اور قدیر کا بھانجنا نوٹنگی میں
چہرے پر سفیدہ پوت کر گایا کرتا تھا:

خدا کا سکر ہے لیلی ترے دربار میں آیا
کہ جس سرکار کا تھا میں اسی سرکار میں آیا
”چمپا باجی وہ نوٹنگی تم کو یاد ہے ہم تمہیں کرم کے
زمانے میں اپنے گاؤں لے گئے تھے اور رات بھر کمبلوں میں لپٹ کر ہم نے لیلی
مجنوں ملاحظہ کیا تھا اور گاؤں کے اکار ہم کو خوش کرنے کے لیے اپنا سارا آرٹ

صرف کیے ڈال رہے تھے۔“

”ہاں۔“ چمپا نے جو اس وقت لکھنؤ سے چھپیں میل کے فاصلے پر کلیان پور میں موجود تھی اور ہیں سے جواب دیا: ”ہاں۔ اس نے ہوا میں ہاتھ لہرا کر کہا تھا:
تیرا چہرہ مرا قبلہ تری جلفیں میرا ایمان
طواف کعبہ کرنے کو ترے دربار میں آیا۔“

”ہاں۔“ مال نے کہا، وہ بھی کلیان پور میں موجود تھا، وہ سب نہنگی میں
منڈپ کے نیچے شال اور کمل اوڑھے بیٹھے تھے۔ شکستہ حال اٹیج پر صرف مدھم سا
گیس کا ہند روشن تھا۔ پردے پر ایک فوارہ بنا ہوا تھا اور چار پریاں جو کہنیوں کے
سہارے بیٹھی تھیں۔ قدیر کا بھانجا ماشٹر پھر یہ جو اپنی تیز پاٹ دار آواز کی وجہ سے
جھنگر واکھا تاتھا، لیلی کے سامنے کھڑا دھاڑ رہا تھا۔ گاؤں کا آرکسٹرا زور شور سے ہار
موئیں اور طلبہ بجانے میں مصروف تھا۔ ماشٹر پھر یہ نے گایا:

زیلخا کی طرح جب ترا عاسک ہوا لیلی
تو یوسف کی طرح بننے ترے بازار میں آیا
برابر کے موئذن ہے پر گوتم نیلمبر بیٹھا تھا۔ اس کے برابری ہری شنکر موجود تھا اور
ساتھ کی ساری لڑکیاں اور گوتم آگے جھک کر بڑی سنجیدگی کے ساتھ چمپا کے
سامنے فوک کلپھر کے منسلے پر روشنی ڈال رہا تھا، وہ سب صبح چار بجے تک نہنگی کے
منڈپ میں بیٹھے رہے تھے اور انہوں نے مٹی کے کورے کلہڑوں میں اور ک والی
چاء پی تھی اور گنے کا رس ————— یہ مال کے والد نواب تقی رضا بہادر کا
موروثی گاؤں تھا۔ یہاں مال کی موجودگی میں اس کی رعت میں صرف سید اور

مرہمن پنگ پر بینہ سکتے تھے۔ باقی لوگوں کے لیے حکم تھا کہ کھڑے ہو کر باتمیں کریں۔ اب اسٹچ پر ماشر مراری لال، جو گلکتہ تک تھیز کپنیوں کے ساتھ گھوم آیا تھا، سونی میں گارہا تھا:

یاس کا عالم نہ تھا، یوں بے کسی چھاتی نہ تھی
اب تو لیلیٰ تھی تماشا، خود تماشائی نہ تھی
وہ سب موئذھوں پر بیٹھے نوٹکی دیکھتے رہے۔ باہرام کے جھرمٹ میں پوس کی
ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی گرم اور محفوظ، وہ منڈپ میں بیٹھے طبلے پر کھروانستے
رہے۔ دھنٹا ایک موڑ لانچ آیک انگریزی ریکارڈ بھاتی ہوئی تیزی سے کم کی
لہروں پر سے گزر گئی۔ چھپا اور مال واپس آگئے۔

”ہمارے گاؤں کی نوٹکی میں نل دینیتی اور اندر سجا بھی بہت فرست کلاس ہوتا
تھا۔“ مال کی ملوں آواز سنائی دی، وہ جھک کر سرل کا سگر بیٹ جلا رہا تھا۔

”اور تم کو جو تحریکارائے یاد ہے مال۔“ چھپا نے آہستہ آہستہ کہا۔ ”اور ونیت کا
وہ گیت: جو گن کھو جن نکلی ہے۔“

”ہاں“ مال نے اس کے ساتھ تعاون جاری رکھا۔

”اور جاڑوں کی دھوپ میں بیٹھ کر ہری شنکر گاتا۔“ اگر دینی تھی ہم
کو حور و جنت تو یہاں دیتے۔ اور پیامن کو جات تھی میں، سچ دھج سیس گند
حائے۔ لوگ کہت میں باوری۔ سب جگ ہنسی اڑائے۔ تم
کو کیا پتا،“ اس نے غصے سے سرل کو منا طب کیا، ”کہ نکن ملک کون ہے، پیاڑی
سانیاں اور آرزو لکھنوی اور نراائن راؤ دیاں اور کانن دیوی۔“ ان لوگوں کا

ہماری زندگیوں میں کیا مقام ہے۔“

”تمہیں کیا پتا____،“ چمپا نے اس کی خفگی کا کیوں لے کر کہنا شروع کیا۔ ”تم جو مجھ سے میراپس منظر دریافت کرتے ہو____ کہ پیار و قوال کی کیا ہستی ہے اور فیاض خال اور دیپا لی تعلق دار____ اور____“

”اور تم کو کیا معلوم کہ کھنو اور علی گڑھ کے مشاعرے کیا ہوتے تھے اور جگر صاحب کی ہمارے لیے کیا اہمیت ہے اور فراق صاحب کی اور آئندہ روزائیں ملا کی۔“ مال نے کہا۔

”اور تم کو کیا پتا،“ اب چمپا کی آواز میں غصے کی جگہ اتحاد رنج نے لے لی، ”کہ کافی داس کے اس شعر کے کیا معنی ہیں____ یہ شعر____ نزوندھیا اور سندھو پر سے گزرتا بگلوں اور بٹخوں کی معیت میں باول پیغام لے کر چلا۔“

”اور تم کو کیا معلوم کہ ہالدر کی بنائی ہوئی تصویر: اشوک کے جھنڈ میں سیتا، ہمیں کیوں اتنی خوبصورت لگتی ہے۔“ مال نے کہا۔ ”نہیں سرل، یہ بڑا مشکل کام ہے۔“

”اور یاد ہے مال،“ چمپا واپس جانے پر مصر رہی، ”ہم سنگھاڑے والی کوٹھی کے لان پر بیٹھ کر پندرہ پندرہ سال پرانے ریکارڈ بجا لیا کرتے تھے۔ کملاجھر یا اور جانکی بائی اور ہری متی____“

”ہا۔“ مال نے کہا۔ ”او محمد حسین ساکن گلینہ کاریکارڈ و ہوئیں کی گاڑی اڑائے لیے جا____“

”ہاں۔“ چمپا خوش ہوئی کہ مال کو واپس لے جانے میں کامیاب رہی، مگر اب مال حال میں آکر ماضی سے پیچھا چھڑا کر نکل بھگنا چاہتا تھا لیکن چمپا اس کے سامنے وقت کے ضمیر کی طرح بیٹھی تھی۔

دفعاً مال کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ وقت کی آندھی میں پتے کی طرح ادھرا ڈھول رہی ہے، اڑی جا رہی ہے اور وہ اس کو اپنی گرفت میں نہیں لاستا، وہ گھبرا کر انٹھ کھڑا ہوا۔

”مال۔“ سرل نے سحر زدہ آواز میں اس سے کہا، ”مجھے کچھ اور بتاؤ،“ ”اور کیا بتاؤ؟“ اس نے رنج کے ساتھ جواب دیا اور بوت ہاؤس کی سڑیوں پر جا کر کھڑا ہو گیا اور ندی کو دیکھتا رہا ندی گومتی میں تبدیل ہو گئی۔

”مال سنو۔“ چمپا نے کچھ یاد کر کے کہنا شروع کیا۔ ”رات کا سماں ہے۔ کتنے بھونک رہے ہیں۔ سنا نا بازار بھر میں پڑا ہے۔ چڑیاں پھکن تک سوتی ہیں۔ چوکیدار خربوزوں کے کھیت بچار ہے ہیں۔ باغبان گوندنی کے کھنکھلکے کو کھنکھلاتے ہیں۔ اب کوئی دم میں چکیاں چلیں گی۔“

”سرشار؟“

”ہاں۔“ وہ پھر سوچ میں ڈوب گئی۔

”ہم لوگ عموماً ہری شنکر کے کمرے میں جمع ہوا کرتے تھے جو دراصل ایک بر جی تھی۔“ مال نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ ”س کے نیچے دریا بہتا تھا۔ اس کمرے کی دیواروں پر ان گنت پرانے فوٹو گراف تھے اور دلوٹے ہوئے صوفے۔ اس کمرے میں پینہ کر ہم نے لاتعداً کتابوں کے موضوع سوچے۔ دنیا

کے مسائل حل کیے۔ یہ کمرہ اور یہ گروہ ساری دنیا میں موجود ہے۔ زندگی ابھی بہت غیر واضح تھی۔ بہت سے پردے انھتے تھے اور گرتے تھے۔ (کبھی تیز روشنی اندر داخل ہوتی کبھی دھند لکھ کاسایہ سامنے آ جاتا۔ اس ذہنی دھوپ چھاؤں میں وقت نکلتا گیا)۔ کبھی تیز روشنی اندر داخل ہوتی کبھی دھند لکھ کاسایہ سامنے آ جاتا۔ اس ذہنی دھوپ چھاؤں میں وقت نکلتا گیا۔ اب پسند ناپسند کے بجائے بمحض ہمارا رو یہ بتتا جا رہا تھا۔ یہ رو یہ احساس برتری نے پیدا نہیں کیا تھا۔ ہمیں یہ لگتا جیسے ساری انسانیت کے خون سے ہمارے ہاتھ رنگے ہوئے ہیں، ہمیں اس خون کو دھونا ہے اور دیکھو کیا ہوا!“ اس نے ہاتھ آگے پھیلائے۔ ”ایک روز صبح کو ہم اٹھے اور ہم نے دیکھا کہ ہمارے ہاتھ واقعی خون سے رنگے ہوئے ہیں اور ہمارے وہ سارے کردار زین کا ذکر تم نے چمپا باجی سے سنا ہوگا، فوکل کارڈ کے کریکٹرز کی مانند ذہین اور پر لطف گفتگو کرنے والے نوجوان مارگ کا مطالعہ کرنے والی منی پوری تاپنے والی لڑکیاں، ہندوستان کی قدیم کلاسیکل تہذیب کا راگ الائپنے والے پوزیٹر۔ ان سب کو ہم نے دیکھا کہ خون میں رنگے ہوئے ہیں، مگر ہم میں سے بہت سے ایسے تھے جو اس خون کا غارہ دینے کے لیے تیار نہ تھے، وہ انسانیت کی اعلیٰ قدرتوں اور مذہب کی بلندی اور خدا کی بزرگی کا چرچا کرتے ادھر ادھر بھاگ گئے۔ ان کرداروں کے علاوہ اور لوگ بھی تھے۔

اصل انسان۔“ اس نے چمپا کو دیکھا۔

”قدیر اور قمرن؟“ چمپا نے کہا۔

سماں نے خاموشی سے اجازت چاہی کہ ان کا ذکر کرے، وہ اسے بے حد

مقدس ہستیاں معلوم ہوئیں۔

”ہاں۔ قدیم اور قمرن اور رام اوتار اور رام دیا اور ہمارے گاؤں کے کاشتکار اور ہمارے ایکے والے اور پنوٹری اور ہمارے زردوڑ جو چکن کاڑھتے کاڑھتے اندر ہے ہو جاتے تھے اور ہمارے باغوں کے بخڑے اور پالکیوں کے کھار یہ سب ہمارا پس مغلظہ ہے جسے تم کبھی نہ جانو گے۔“ اس نے بات ختم کی۔

چمپا بھی واپس نہ آئی تھی۔ اس نے کہنا شروع کیا: ”وہاں اور ہمارے دریا۔ دریا بھی ایک مستقل کردار تھا اور ان کے نام۔ ذرا ان کے نام سنو: سر جو۔ شاردا۔ در گاؤں۔ مند کینی۔ مدھومتی۔ گومتی۔“

”گندھرو مالائیں جو ہماوت سے اتر کر بنوں میں بستی رت منانے نکل آئی تھیں۔ طغیان صاحب نے کہا۔

مال نے چونک کرائیں دیکھا۔ اب تک وہ ان کے وجود سے بے خبر بیٹھا تھا۔ وہ چند لمحے قبل آ کر چوچی اشی ہوئی ڈونگی پر بیٹھ گئے تھے۔“

”ٹھیک ہے یار۔“ مال نے آزردگی سے کہا۔ میں نے بھی ایک زمانے میں بڑی کوتا لکھی ہے۔ یہ اسٹیج سب پر آتی ہے۔

”تو دریا میرے گھر کے نزدیک تھا۔ انگا میرے گھر کے پاس بہتی تھی۔ گومتی، ہری شنکر کے گھر کے نیچے بہتی تھی۔“ گومتی نے بتایا ہو گا کہ ہم لوگ ذرا سوچو دریاوں کے وجود سے کتنے بے نیاز رہتے ہیں۔

ارے پل دیکھو۔ کشتیا۔ گھاٹ۔ سنگھاڑے۔ کنوں کے پھول اور پھرندی پر برستی

ہوئی بارش۔ یہ سب کتنی اہم چیزیں ہیں۔ مجھے سمندر سے وحشت ہوتی ہے۔ اس سے ڈر لگتا ہے۔ سمندر بیکراں ہے ندی کو اپناراستہ معلوم ہے۔ ”

اب دفعتاً چمپا کی آواز سے مال بور ہونا شروع ہوا۔ لڑکیوں میں یہ کیا مصیبت ہے، اس نے سوچا، کہ ایک تو ہوتی ہی بکی ہیں، اگر ان پر یہ وجہ آجائے کہ کلا کار بھی ہیں تو پڑا ہو گیا۔ چمپا باباجی کلا کار نہیں تھیں لیکن ان کے شاعرانہ مزاج کا کون منکر ہو سستا تھا!

وہ اس ندی کا ذکر کر رہی تھی اور مال بھاگ جانا چاہتا تھا۔ ندی کا کردار؟ مجھے سے زیادہ اور کون یہ بات جان سستا ہے، اس نے لرز کر سوچا۔ مجھے وہ مکان یاد ہیں، وہ ندی اور درخت چمپا باباجی تم خود

”اور باغ میں الہاس کے درخت تھے۔“ وہ کہہ رہی تھی۔ ”اور ایک بیل کا درخت بھی۔ بیل تم نے کھایا ہے کبھی؟“ اس نے او جیت سے پوچھا۔ ”پورب کی خاص چیز ہے۔ مال، گوتم سے پوچھنا، اسے وہ ٹپٹپ گرتے تھے بیل یاد ہیں؟“ اس نے بے اختیار ہو کر پہلی بار گوتم کا نام لیا۔

مال سوچتا رہا۔ میں انہیں کیسے بتاؤں کہ گوتم ان کو تقریباً بھول چکا ہے، مگر بھولنا کیا معنی! ضرور یاد ہوں گی، جیسے اسے ندی یاد ہے اور سنگھاڑے والی کوٹھی اور الہاس کا درخت۔ اب بھی وہ اکثر بڑے جذبات میں ڈوب کر ان چیزوں کا ذکر کرتا۔ کیا مصیبت ہے۔ اس نے جھنجھلا کر چمپا کو دیکھا۔ یہ لڑکیاں مری کیوں جاتی ہیں؟ اصل میں اس نے اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر سوچنا شروع کیا۔ ان کو ہزار ہاہرس سے اس کمپلکس میں بتا کر دیا گیا ہے۔ ایک سنا

ہے وہ ستی تھیں، پھر سیتا، پھر گوپیوں کا فراڈ چلا۔ ان کو دنیا میں کوئی کام نہیں بس کسی بھلے مانس کو پکڑ کر دے اس کی پوجا۔ وہ اس کی پوجا اوری نیک بختو، اللہ رسول سے دل لگاؤ، اگر محبت ہی کرنا ہے۔ رانع بصری سے سبق لو۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی پہنچی ہوئی یہاں گزری ہیں، لیکن یہ ساری سینٹ وینٹ خواتین بھی یہی سوچتی ہوں گی کہ اگر یہ مسیح مل جائیں تو لے کر ان کے موزے رفو کر دیں۔ ”میں گوتم سے ضرور پوچھوں گا۔“ اس نے باواز بلند کہا۔ ”اور مجھے اپنے موزے بھی رفو کروانے ہیں۔“ اس نے اپنے پیروں پر نظر ڈال کر اسی رو میں کہا۔ کل یو تھے فنسیوں کے لیے جرمی جا رہا ہوں۔ راتوں رات لندن پہنچ جاؤں تو طاعت میر اسراساماں سفر تھیک کر دے گی۔

”بہنوں کے ہونے کا یہ بڑا فائدہ ہے۔“ طغیان صاحب نے بات کی۔ ”جی؟ جی۔“ مال نے جواب دیا۔ ”اس لیے چمپا باباجی اب اجازت دیجئے۔ خدا حافظ سرل۔ او جیت۔“

”چلو ہم تمہارے ساتھ ہی چلتے ہیں۔“ سرل نے اٹھتے ہوئے کہا، وہ شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ مال آئشیشن چلا گیا۔ چمپا نے اپنے ہوشل کے کمرے میں آ کر دریچہ کھولا۔ نیچے سنسان سڑک لیپ کی نیلگوں روشنی میں خاموشی سے بہہ رہی تھی۔ سینٹ جان کے گھریوال نے گیارہ بجائے۔ دور جیزس لین میں کوئی شخص ٹرمپ پر اپنا غلگل میں نغمہ چھیڑا کیا۔

گھنٹی بجی تو طاعت نے دروازہ کھولا اور مشرقی بر لین کے ایک جدید وضع فلیٹ میں اپنی ایک سگتر اش دوست کے یہاں تھبھری ہوئی تھی۔ باقی کے سب لوگ ابھی ادھرا وھر سڑکوں پر گاتے بجا تے پھر رہے تھے۔ اس نے بالکل پر سے جھانک کر دیکھا۔ پھولوں کی بیتل کے نیچے نیم تاریک پورٹکو میں دوسائے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے جلدی جلدی دوسرے سے کچھ کہا اور اسے اندر دھکیل دیا۔

نوارہ اسٹوڈیو میں داخ ہوا تو طاعت نے اسے پہچانا یہ وہی نوجوان تھا جو چند روز قبل سینٹ جانز ووڈ میں روشن سے ملنے آیا تھا۔

”میں نے سنا تھا کہ مشہور سگتر اش فراؤ لین کریم بر یہاں رہتی ہیں۔“

”آپ نے بالکل صحیح سنا تھا،“ لیکن ان کے بجائے میں موجود ہوں فرمائیں آپ کی کیا خدمت کی جاسکتی ہے۔ آپ کوسر چاہئے؟ تابا یا پلاسٹر آف پیرس؟“ طاعت نے بڑے پروفسنل انداز میں جھاڑن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”بھی۔ میں سر نہیں چاہتا۔“ اس نے سٹ پٹا کر جواب دیا۔ ”میری ایک دوست ہیں، ان کو چاہئے۔“ پھر دفتار اس نے چونک کرغور سے طاعت کو دیکھا۔ جو اطمینان سے مجسمہ سازی کے لوازمات میں گھری کچھ کھڑ پڑ کر رہی تھی فیஸول کی وجہ سے کامریڈ کریم کا کام خوب چمک گیا تھا۔ بھانت بھانت کے لڑکے اور لڑکیاں ہر قوم اور ہر ملک کے اس کے پاس آ رہے تھے وہ بے حد جذباتی ہو کر نیگرو اور ایشیائی لڑکوں اور لڑکیوں کے سر ہناتی اور ان کو تحفتوں دے دیتی۔ سخت مصروفیت کا زمانہ تھا۔ اسٹوڈیو میں برابر رت جگا رہتا۔ طاعت جسے آرٹ میں بھی دخل تھا، اس

کی استمنٹ بنی ہوئی تھی۔

نووار و جب یہاں آرہا تھا تو دوستوں نے اس سے کہا تھا کہ فراڈ لین کریم
بورڑوا آرٹسٹ نہیں ہے۔ اس سے فلکت کرنے کی کوشش نہ کرنا، وہ پچھر پلاۓ گی
کہ ہوش ٹھکانے آ جائیں گے یا سارے مجسم توڑ کر بھاگ کھڑی ہو گی اور تم کو دام
بھرنے پڑیں گے۔

”اپنی دوست کو بلا لائیئے _____ تا کہ میں ان کا مولڈ بنالوں۔ میں فراڈ لین
کریم کی پارٹنر ہوں۔“ طاعت نے جھک کر بڑے اخلاق سے کہا۔ اس نے
ہنگریں اڑ کیوں کارنگ برگی کڑھت ولا قومی لباس پہن رکھا تھا جو اسے اسی روز
ختفے میں ملا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اجنبی اس کو پہچاننے کی بے انتبا کوشش کر رہا
ہے لیکن اب تک پہچان نہیں پایا۔ اسے اس طرح ایکنگ کرنے میں بہت لطف
آیا۔ ”اس الماری میں چاء کی پتی رکھی ہے۔ اوہ راستوں ہے۔ _____ آپ کافی
ہنائیے میں بھی آتی ہوں۔“ اس نے _____ بوئیمیں انداز کی بے تکلفی کی نقل
کرتے ہوئے کہا اور پلاسٹیسن نکالنے کے لیے اسکرین کی دوسری طرف چلی گئی۔
دروازہ کھلا اور ساجدہ بیگم اندر داٹھ ہوئیں۔

”می؟“ انہوں نے اجنبی سے پوچھا۔

”نہیں، یہاں بھی نہیں ہے، مگر آہستہ بولو، شاید یہ اڑکی اردو صحیح ہو۔“

”کون اڑکی؟“

”وہ اسکلپٹر اس وقت نہیں ہے۔ اس کی استمنٹ ہے۔ ہنگریں سی دکھلائی
ہرتی ہے۔ مگر مجھے تو کچھ گھپا نظر آتا ہے۔_____ اس میں بھی _____“

اسکرین کی دوسری طرف سے طاعت کے اسکرٹ کی جھلک دکھانی دی تو اس نے ذرا گہرا کراو پنجی آواز میں کہا: ”اس بد تیزی کو معاف تجھنے گا ماموزیل کہ ہم اپنی زبان میں باتیں کرنے لگے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ طاعت نے اسکرین کے پیچھے سے جواب دیا۔ ”مجھے اس کی ساوائد بہت اچھی لگتی ہے، جیسے مکھیاں بخوبی ہوں۔“

”مکھیاں؟“

”جی ہاں۔ یہ میں نے تھیہ استعمال کی۔ شہد کی مکھیاں۔ میں بہت عرصے ٹیونس میں رہی ہوں، وہاں عربی سنائی تھی۔“

”ٹیونس میں؟“

”جی ہاں۔ جیسا بورنیجیہ کے ساتھ۔“

”وہاں کیا کر رہی تھیں آپ؟“

” Jasoozی۔ طاعت نے اطمینان سے جواب دیا اور پلاشیں کا گولہ بنانے میں مصروف رہی۔“

ساجدہ بیگم کارنگ سفید پڑ گیا۔ میں نے کہا تھا کہ مشرقی برلن نہ آنا۔ جانے کس مصیبت میں بتا ہوں گے۔ اب دیکھوں کہاں پھنس گئے انہوں نے اب تک ہالی و وعد کی فلموں میں جو کچھ سٹرل یورپ کے بارے میں دیکھا تھا وہ سب پل کی پل میں اتصور میں کونڈ گیا۔ آرٹسٹوں کے بھیس میں خطرناک جاسوس۔ بین الاقوامی سازشیں۔ اغوا اور یہٹ ایکسپریس۔ وکی بام کا ”گرینڈ ہوٹل“، کمیونٹوں اور غیر کمیونٹو ڈیو میں آمد کا مطلب تجویز ہے۔ اس نے بے چینی سے کرسی پر پہلو

بدلہ۔

طاعت اسکرین کے باہر آئی۔

”اے یہ تو طاعت بہن ہیں۔“ ساجدہ بیگم چلا میں۔ ”تو ہے ہے۔ تم نے یہ کیا روپ بھرا ہے۔ اچھا بیوقوف بنایا۔“

”ہو، ساجدہ آپ۔“ طاعت نے شنقتگی سے کہا۔ ”بیٹھئے۔ ابھی آپ فرست کلاس مولڈ بناتی ہوں۔ آپ نے کافی تیاری کر لی؟“ اس نے ساجدہ بیگم کے ساتھی سے دریافت کیا۔

”معاف کیجیے گا میں نے بھی آپ کو بالکل نہیں پہچانا تھا اس لباس میں۔ لندن میں بھی آپ سے ملنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ صرف آپ کا ذکر بہت سنائے ہے۔“

”جی۔ آپ کی یہاں تشریف آوری کیسے ہوئی؟ میں نے دیکھا تھا آج آپ پوش اڑکیوں سے بہت برا درانہ سلوک کر رہے تھے۔“

”وہ تو میں ذرا ان لوگوں کا جھوٹ پچ معلوم کرنے آیا ہوں۔ میں ایک انگریزی اور دو اردو اخباروں کے لیے لندن لیٹر لکھتا ہوں۔ یہاں سے جا کر ان لوگوں کی قلعی کھولوں گا۔“

”تم ان سے پہلے کبھی نہیں ملیں۔“ ساجدہ نے کہا۔ ”بڑے مشہور جرنلٹ میں۔“

”جی اور ساجدہ آپ آپ یہاں کیسے۔“

”میں میں ذرا ان لوگ کا۔“

” جھوٹ پچ معلوم کرنے آئی تھیں!“

”باکل انہوں نے جواب دیا۔“

”مگر ساجدہ آپا۔۔۔ اور آپ“

”خان۔۔۔“

”مسٹر خان۔۔۔ مجھے واقعی بڑا افسوس ہے کہ آپ روشن کا تعاقب کرتے یہاں تک آئے مگر وہ نہ ملی، وہ یہاں کبھی نہیں آئی، اگر آجاتی تو اس کے لیے اچھا ہی تھا۔ اتنی شدت سے الجھی ہوئی نہ رہتی، مگر وہ عین اس لمحے سائز برگ میں موزارت کی موسيقی سن کر اپنی روح کو فائدہ پہنچا رہی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے۔“

”کیا تعاقب بھی۔۔۔ کیا اڑا رہی ہو۔۔۔“ ساجدہ نے خفگی سے کہا۔

”نہیں تو یہ۔۔۔ اچھا ہے ساجدہ آپ یہاں ایک سے ایک تھنے آپ کو ملیں گے۔ پندرہ دن تک وہ خاطر مدارات ہو گی جس کا لٹھانا نہیں۔۔۔ مفت کی تفریح۔۔۔ کیا حرج ہے۔۔۔ آپ لوگ نے ان ممالک کو نہ جانے کیوں ہوا بنار کھا ہے۔۔۔“ وہ سرعت سے ان کی ناک بناتے ہوئے بولی۔

”یہ مشغله آپ نے کب شروع کر دیا۔۔۔“ مسٹر خان نے کہا۔ ”مجسمہ سازی۔۔۔“

”بھی۔۔۔ مشغلوں مشغلوں کی بات ہے۔۔۔ بعضوں کا مشغله مخبری ہوتا ہے۔۔۔“

ساجدہ نے گھڑی دیکھی: ”اب چل دوں۔۔۔ جہاں ہم ٹھہرے ہیں وہاں کھانے پر انتظار ہو رہا ہو گا۔۔۔“

”بہت خوب دوسرا سٹنگ کب دیجیے گا؟؟“

”میں فون کر دوں گی۔۔۔“

”بہت اچھا۔“

وہ بالکل میں سے ان دونوں کا جاتے دیکھتی رہی۔ پھولوں کی نیل پھر جھک آئی جس کے سامنے میں ”مسٹر خان“، ایک لمحے کے لیے گم کھڑا رہا، پھر ساجدہ بیگم کے پیچھے پیچھے بس اشیندہ کی طرف چل پڑا۔

واپسی پر وہ لوگ فرانس کی سرحد عبور کر رہے تھے جب ڈرین میں کسی نے بتایا کہ روشن پکڑ لی گئی۔

”کیا پکڑ دخانے کی اڑاتے ہو؟“ طاعت نے آزردہ ہو کر کہا۔ ”وہ سیاسی کمیٰ نہیں تھی۔ آخر اس کے پکڑے جانے کی کیا تک ہے۔ یہ ایک یار لوگوں نے اس کے لیے افواہیں پھیلا رکھی ہیں خواہ مخواہ اور پکڑے جانے کا مطلب؟ وہ اسمگنگ کرتی تھی؟ بھم بنا تے تھی؟ امریکہ کے اہم راز روں کو اور پاکستان کے اہم راز ہندوستان کو بتاتی تھی؟ آخر کیا کر رہی تھی بھائی؟ اس غریب کو اپنے فلسفے ہی سے فرصت نہیں۔ اس کو یہ تک معلوم نہیں کہ فور تھہ اسٹر نیشنل۔“

”اصل خیالات سے کیا ہوتا ہے۔ اصل خیالات کی تصویر تو نہیں لی جاسکتی۔“

”گوتم نے اس کی بات کافی، وہ مغربی جمنی کے سفارتخانے میں کسی کام سے آیا ہوا تھا اور راستے میں ان کے ساتھ ہو گیا تھا۔“ تم افواہوں کی نفیاں کو نہیں جانتیں اور اسی یونانی پ کی طاقت، اگر میں مستقل تمہارے لیے پروپیگنڈہ کروں کہ تم طاعت رضا نہیں ہو دراصل دلائی لامہ کی جانشین ہو تو واقعی تمہیں دلائی لامہ کی جانشین سمجھا جائے گا۔ ہماری زندگیوں کا جھوٹے مفروضوں اور غلط پروپیگنڈے پر انحصار ہے۔ روشن تو بہت غیر اہم ہستی ہے۔ پوری قوموں، سوچے

ملکوں کے خلاف اسیروں پا کا حکم چلتا ہے۔ یہ آج کی دنیا ہے۔ طاعت آرائیگم جس میں فن کاروں کے علاوہ طالب علموں کی توسیب سے بڑی قیمت مقرر ہے۔“

”اب میں نے دیکھا کہ پروپیگنڈہ کے کہتے ہیں۔ مال ہے بھی۔ روشن غریب، جس کے کوئی سیاسی خیالات کسی قسم کے ایک سرے سے ہیں ہی نہیں، اس کو اتنی اہمیت دی جا رہی ہے کہ دو بھلے آدمی اس کے پیچھے پیچھے بر لین تک آئے گوہ ان کو قب بھی نہ ملی۔“

”مگر اس بہانے ان دونوں نے تفریح تو کر لی۔“

”تنا ہے روشن کے والد بہت بیمار ہیں۔ مجھے بون میں کوئی بتا رہا تھا۔ ممکن ہے ان افواہوں سے اس کی اسکالر شپ پر بھی اثر پڑے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ اپنی کی سیاست کا اس میں کافی دخل ہے۔“ ایک لڑکے نے کہا۔

”وہ کس طرح؟“ طاعت نے پوچھا۔

”تنا ہے کوئی مرکزی وزیر ہیں جو روشن کے والد کے خلاف ہیں۔ یا شاید روشن کے والد مرکزی وزیر کے خلاف تھے۔ ایسا کچھ سلسلہ ہے۔ بہر حال تو وہ سول سرسوں کے آدمی نہیں ہیں۔ ان کو دیسے ہی کسی پچھلے وزیر اعظم نے کوئی بہت بڑا عہدہ دے دیا تھا۔ اب ان وزیر اعظم کے جانے کے بعد روشن کے والد کے خلاف بڑا محاذ قائم ہو رہا ہے۔ ممکن ہے روشن بے چاری کے خلاف جو مضمون خیز کار روائی کی جا رہی ہے اس کا اس محاذ سے کچھ تعلق ہو۔“

”یا اللہ۔“ مال نے گزر بڑا کر کہا۔ ”اس قسم کے حالات ہیں؟“

”ہیں تو سہی۔“ حمید نے جواب دیا، وہ سب کھڑکی سے باہر بھاگتے ہوئے

سبرہ زاروں کو دیکھتے رہے۔

۷۸

شیو پر شاد بحث ناگر رنجو بارہ بنکوی ان لوگوں میں سے تھے جو لندن میں
برسون سے برس سے خود اختیاری جلا وطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ رنجور صاحب
دوسری جنگ عظیم سے پہلے بارہ بنکی سے اوسفر ڈائے تھے۔ تعلیم ختم نہ کر پائے
تھے کہ جنگ چھڑ گئی اور یہ یہیں رہ پڑے۔ ایک عدالیوں یا یقینوں میں اڑکی سے
شادی کر لی۔ سخت موڑی اور کاہل آدمی تھے۔ بی بی بڑی نیک بخت ثابت ہوئی، وہ
اب بورڈنگ ہاؤس چلاتی تھی۔ جس ہندوستانی یا پاکستان کو کہیں ٹھکانہ نہ ملتا وہ
سیدھا یہیں آ جاتا۔ رنجور صاحب بہت ہی شریف آدمی تھے۔ سب کی بہت
خاطرین کرتے۔ اکثر مہمان ان کاہل ادا کیے بغیر ہی بھاگ جاتے مگر رنجور
صاحب ان کی شکایت نہ کرتے۔ اتر پردیش سے اگر کوئی چوہا بھی آنکھا تو اس کے
لیے بچھ بچھ جاتے۔

ہمراز فیض آبادی ان کے مکان کی اوپر کی منزل میں ان کے کرائے دار تھے۔
رنجور بارہ بنکوی ہندو تھے اور ہندوستانی ہمراز فیض آبادی مسلمان تھے اور بڑے
کثر پاکستانی۔ تھے دونوں شاعر۔ ایک دوسرے سے مستقل بحث کرتے۔ رنجور
صاحب کہتے: تم لوگوں نے ہندو شعراء کی کبھی اتنی قدر نہیں کی جس کے وہ مستحق
تھے۔ تم علی گڑھ والوں نے فرقہ پرستی کا زہر پھیلا�ا وغیرہ یا رامائی فرحت لے کر

بیٹھ جاتے اور بیس کے چند گلاسوں کے بعد روہانے ہو کر کہتے تم ملچھ مسلم سے ہو، تم نے بھارت ماتا کے لکڑے کر ڈالے۔ اس پر ہمراز بھائی بھارت ماتا شان میں کچھ گوہرا فشائی کرتے۔ شیو پر شاد عروتے روتے کہتے: یہ شعر سنو۔ کل رات ہوا ہے۔ شعر سن کر ہمراز بھائی کہتے: ہاں یا را اچھا ہے مگر ذرا بوئے کچوری و پینگ می آئید۔ اس پر دوبارہ فساہ شروع ہو جاتا۔ روز رات کو کھانے کے بعد یہ سلسلہ رہتا۔ ایک بات میں رنجور اور ہمراز دونوں اپنے سارے اختلاف چھوڑ کر متفق تھے، وہ تھی پنجابیوں کے لیے ان کی ناپسندیدگی۔ اس موضوع پر دونوں گھنٹوں باتمیں کرتے نہ تھکتے۔ گوہرا ز بھائی بڑے شعلہ بد اماں پاکستانی تھے مگر بہر حال آبائی وطن اتر پر دلیش تھا کہتے: ارے، یہ پنجابی گھڑ سوار، رسالدار اردو کیا جائیں! شیو پر شاد بڑے زور شور سے ہاں میں ہاں ملاتے۔ ان کی پہلی ہندو بیوی سے جو اڑکی ہندوستان میں تھی اس نے کسی پنجابی سے شادی کر لی تھی اور چندی گڑھ میں رہتی تھی۔ جس روز اس کی شادی کی اطلاع آئی شیو پر شاد صاحب نے خاص طور پر آ کر ہمراز بھائی کو اس سانچے کی اطلاع دی۔

”لو میاں ہمارے خاندان کی زبان بھی بگرائی۔ آخر ہم پنجاب گردی سے کہاں تک بچے رہتے۔“ ہمراز بھائی اس صدمو میں ان کے دلی شریک رہے کیونکہ خدا نخواستہ کل کو ان کی بہن کی شادی بھی کسی پنجابی سے ہو سکتی تھی۔ رنجور صاحب کی ان محفلوں میں ان کے بورڈنگ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے اتر پر دلیش والے ہندو مسلمان ہندوستانی اور پاکستانی بیٹھ کر اپنے وطن کی بزرگی بیان کرتے، اس عظیم کلچر پر روشنی ڈالتے اور شعر پڑھتے ایک روز مال اس محفل میں گیا تو اس کو

بڑی حیرت ہوئی۔ ”کس قدر غیر منطقی ہیں آپ۔“ اس نے ہمراز بھائی سے کہا۔
”آپ کا وطن پاکتا ہے۔ آپ کواب یو۔ پی سے مطلب؟“
”اجی وہ تو صحیک یہ۔ مگر۔۔۔“ ہمراز بھائی نے گز بڑا کر کہنا شروع کیا۔

”صحیک کیا ہے؟“ کمال نے ان کی بات کافی۔ ”اسی لیے تو پاکستان میں یو۔ پی والوں کی وفاداری پر شبہ کیا جاتا ہے۔ دل انکا ہوا ہے فیض آباد میں ملازمت کرتے ہیں کوئے میں اور پاپسپورٹ بنو کر اماں بیگم سے ملنے فیض آباد جاتے ہیں تو وہاں خفیہ پولیس پچھے لگ جاتی ہے۔ ادھر پاکستان میں کہا جاتا ہے کہ یہ مہاجر لوگ سارے کے سارے ملک سے فائدہ اٹھانے کے لیے آگئے ہیں ورنہ ان کا اصل وطن تو بھارت ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ بھائی نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے۔ کس قدر دیوانی قوم ہے مسلمانوں کی۔ حد ہے والله!“

”میاں صاحزادے، زیادہ بڑھ بڑھ کر باقی نہ بناؤ۔“ ہمراز بھائی نے جواب دیا تھا۔ ”بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ تم ہندوستانی مسلمان ہو یا درکھو، جب وہاں ملازمت نہیں ملے گی اور بھوکے مرنے لگو گے تو دھکے کھا کر پاکستان ہی کارخ کرو گے۔“

غالباً ہمراز بھائی صحیک کہہ رہے تھے۔ اس نے لرز کران کی صورت دیکھی۔ اس وقت رنجور صاحب پان کی گلوریاں بنانا کر خاصدان میں رکھتے جا رہے تھے۔ پان ایک بڑی مقدس شے تھی جو کراچی سے بذریعہ ہوائی جہاز ہر ہفتے ہمراز بھائی کے لیے اندر آتی تھی اور بطور تبرک رنجور صاحب کو صبح شام اس کے دو بیڑے

کھلانے جاتے تھے۔ پانہنانے کے مقدس فریضے کو بڑے اہتمام سے تکمیل تک پہنچانے کے بعد رنجور بارہ بنکوری مال کی طرف مڑے اور ملوں آنکھوں سے اسے دیکھنے لگے۔

”مصیبت یہ ہے کمال میاں“ انہوں نے اپنے خوبصورت لمحے میں ادا کیے کہا، کہ تم شاعر ہو۔ ہر نجور ان شاعر ہوتا ہے۔ اصول پرست۔ راست باز۔ تصورات پر مر مٹنے والا وہ حقیقت کو نہیں دیکھنا چاہتا۔ مگر بد قدمتی سے دنیا کا نظام شاعر نہیں سیاست دان چلا رہے ہیں جن کو تمہارے وزن سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ تم حقیقت سے کس حد تک صحبوت کرنے پر تیار ہوتے ہو۔ تمہاری اصل بڑائی یا گھٹیاپن اس وقت ظاہر ہو گا کہ تم نے حقیقت سے یعنی بے ایمانی سے جھوٹ سے ریا کاری اور اخلاقی جرم سے کس حد تک صحبوت کیا۔“

طاعت اور مال وغیرہ کی سرگرمیوں کو رنجور صاحب بہت سراحتے تھے۔ اقبال ایونگ میں جا کر انہوں نے اقبال کے فلسفے پر تحریری کی۔ لندن مجلس کو ہمیشہ مختلف قسم کے عطیے اپنی بساط سے بڑھ کر دیتے رہتے حالانکہ رنجور صاحب کی مالی حالت اتنی خستہ تھی کہ اپنے مکان کی مرمت تک نہ کرو سکتے تھے۔ اس غربت کی زیادہ وجہ یہ تھی کہ جیسا کہ پہلے لکھا گیا، ان کے اکثر کرائے دار ان کو راید یا بغیر ہی غائب ہو جاتے اور یہ اپنے مہماںوں سے بے حد واجبی پیسے لے کر انتہائی بڑھیا کھانے انہیں کھلاتے۔ سو یہ کس قدر کریک ہیں رنجور صاحب۔ طاعت نے ایک روز کہا تھا۔ ایسے لوگوں کی دنیا میں جگہ کہاں ہے؟ ان کی بی بی میا (ان کا اصل نام یہی تھا) اور رنجور صاحب نے اس نام کی بنا پر اپنے ایک مضمون میں، جو ۱۹۳۶ء میں زمانہ کا

پور میں چھپا تھا، یہ ثابت کیا تھا کہ لینوین لوگ دراصل ہندو تھے۔ بعد میں جب جدید تحقیقوں سے یہ ظاہر ہونے لگا کہ غالباً آریوں کا اور ریجنل وطن بالٹک کی طرف تھا اور سنکریت اپنی اصل حالت میں انہی علاقوں میں بولی گئی تھی تو رنجور صاحب نے طے کر لیا۔ وہ خود بہت بڑے محقق ہیں۔ انہوں نے اعلان کیا کہ اب وہ تاریخ پر ایک کتاب لکھنے والے ہیں۔ پچھلے پندرہ مرس سے وہ اس کتاب کی تصنیف میں مصروف تھے مگر وہ ابھی پہلے چند ابواب سے آگئے نہ ہو ہی تھی۔ اس تحقیق کے لیے ان کو آمر لینڈ کا سفر درکار تھا جہاں اشو میڈھ عہد عتیق میں منایا جاتا تھا اور بالٹک کے ممالک کا جہاں اندر کی پوجا ہوتی تھی، مگر اس سفر کے لیے جو روپیہ چاہیے وہ رنجور کبھی فراہم نہ کر پاتے ہیں (وہ کتاب ابھی نامکمل تھی) بڑی خاموش طبع اور گھریلو ٹھانوں تھیں اور چند سال قبل بے حد خوبصورت رہی ہوں گی۔ (انجور صاحب خود کافی خوش شکل تھے) ان کا سارا وقت میاں اور بچوں کی خدمت اور کھانا پکانے میں گزرتا۔ دن بھر وہ مشین کی طرح کام کرتیں۔ طاعت وغیرہ کے گروہ کو ان سے بہت ہمدردی تھی۔ رنجور صاحب کو اپنی تاریخ کی کتابوں اور شاعری ہی سے چھشمی نہ ملتی تھی جو وہ ملیا کی طرف توجہ کرتے، وہ تھیٹھے ہندوستانی پتی و رتا عورتوں کی طرح چپ چاپ باور پھیلانے میں گھسی رہتی یا کپڑے دھوتیں۔ زندگی یونہی گزرتی جا رہی تھی کہ شیو پر شاد بحث ناگر رنجور بارہ بنکوی کے بورڈنگ ہاؤس میں ایک نوجوان پارلیسی طالب علم آن کرنکا۔ لڑکیاں جرمی سے لوٹ کر آچکی تھیں اور اب قاضی مذرا الاسلام کے لیے چندہ جمع کرنے کی مہم شروع ہو رہی تھی۔ ان کے علاج کے لیے روپیہ فراہم کرنے کے سلسلے میں ایک وراثی

پروگرام ترتیب دیا جا رہا تھا جس کی تیاری کئی مہینے قبل سے شروع ہو چکی تھی۔ ہمارے اسٹریٹ کے ڈاکٹر کی فیسیں بہت زیادہ تھیں، شاید ان کو وہی آنا بھی لے جایا جائے۔ لڑکوں اور لڑکیوں نے طے کر لیا تھا کہ ان کا علاج پوری طرح سے کراکر ہیں گے۔ ان کے ہمراہ کی بی بی کے علاوہ ایک طے کر لیا تھا کہ ان کا علاج پوری طرح کراکر ہیں گے۔ ان کے ہمراہ ان کی بی بی کے علاوہ ایک بہت بڑی پارٹی تھی۔ ٹولینگ میں ان کو ٹھہرایا گیا تھا جہاں وہ گم سم بیٹھے پھوپھوں کی طرح حیرت زدہ سب کو دیکھتے رہے۔ ان کا دماغ ماؤف تھا۔ ان کی بی بی کے اعضاء مغلوب تھے، وہ زدیک ایک پنگ پر بیٹھی رہتیں۔ ان کا گھر بیگانے طلباء کے لیے زیارت گاہ بنا ہوا تھا۔ ٹیکور کے لیے ہمارے دلوں میں بے پناہ عزت ہے اور مذزل کے لیے ٹرپ پر نکل کر لڑکے اور لڑکیاں مختلف نکڑیوں میں بٹ گئے۔ طاعت اور فیروز نے پہلے سوکس کا منج کارخ کیا جہاں رنجور بارہ بنکوڑی رہتے تھے۔

مکان کے زینے پر ان کو ہمراز بھائی مل گئے۔ ”ہمراز بھائی! لایئے پہیے۔“ طاعت نے دست سوال دراز کیا۔

”یہ طالب علم کیوں مذرالاسلام کے لیے اتنے بے حال ہوئے جا رہے ہیں۔“ ہمراز بھائی نے کہا۔

”یا اللہ____ ہمراز بھائی۔“ طاعت نے کہنا شروع کیا۔ ادھر یہ لوگ ہمراز بھائی سے بحث میں الجھری تھیں عین اسی وقت علامہ رنجور بارہ بنکوڑی کی زندگی میں ایک قیامت پا ہو گئی۔

درپھوں کے شیشے ڈوبتے سورج کی روشنی میں قرمذی نظر آرہے تھے۔ رنجور صاحب فکر شعر میں بتا امکان کے سامنے ٹہل رہے تھے۔ نیچے تھا نے میں تیز روشنی ہو رہی تھی جہاں مایا عموماً اس وقت روزانہ رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف دکھانی دیتی تھیں۔ ٹھیک اس سے رنجور صاحب کو جانے کیا نظر آیا کہ سامنے اندھیرا سا چھا گیا اور وہ تیر کی طرح تھا نے میں پہنچے۔

ہال کے زینے پر کھڑے ہو کر طاعت اور فیروزتہ خانے میں ایک زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی، وہ دونوں دوڑی ہولی نیچے گئیں۔ مایا خون میں لٹ پت فرش پر پڑی تھیں۔ ان کے سر میں سخت چوت آئی تھی اور ان کی بڑی لڑکی قریب کھڑی دھاڑیں مار کر رورہی تھی۔ رنجور صاحب دروازے میں صم بکم کھڑے تھے۔

”کیا ہوا؟“ طاعت نے دل کر پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ انہوں نے سکون سے جواب دیا۔ ”زینے پر سے ان کا پاؤں رپٹ گیا۔ فکر مت رکو۔“ پھر وہ خاموشی سے اوپر چلے گئے۔

دھرے لمحے اوپر کی منزل سے اتنے ہی زوردار دھماکے کی آواز آئی۔

لڑکیاں بوکھلا ہٹ میں دوڑی ہولی اوپر پہنچیں۔ جتنی دیر میں طاعت نے ۹۹۹ کوفون کر کے ایبو لینس منگائی اتنی دیر میں رجور صاحب ہو شنگ ماچس والا کی ٹھکانی بھی اچھی طرح کر کے فراغت پاچکے تھے۔ ہمراز بھائی اور دھرے لوگ ہاں کرتے اپنے اپنے کروں سے فیج بچاؤ کے لیے دوڑے مگر رنجور صاحب نے ہڑ بڑا ہٹ میں ایک ایک جھانپڑاں سب کو بھی رسید کیا اور اسی سلسلے میں ہمراز

بھائی سے باقاعدہ ان کے دو دو ہاتھ ہو گئے۔ لینڈ نگ پر جہاں یہ ہنگامہ ہو رہا تھا، اندھیرا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ہمراز بھائی اور رنجور صاحب دونوں ایک دوسرے کو ہوشنگ ماچس والا سمجھے۔

اب رنجور صاحب سے کہا گیا کہ وہ قریب کے بہ سے اپنی بے چاری بی بی کے لیے تھوڑی سی برائی لے آئیں۔ یہاں برائی کا انتظار ہوتا رہا لیکن معلوم ہوا کہ وہ خود ہی بہ میں شغل کرنے کے لیے بیٹھ گئے۔ طاعت مایا دیوی کو ہسپتال لے گئی۔ فیروز کے بچوں کو پہکارنے میں مصروف ہوئی۔ ہوشنگ ماچس والا نے اسے بہ باندھ کر ٹیکسی منگوائی اور وہاں سے کان دبا کر بھاگا۔

اس ہزر بونگ میں شیم بانو سے ملنے کا وقت نکل گیا۔ مایا بحث ناگر کی مرہم پئی کروانے کے بعد طاعت اور فیروز نائیٹس برجن کے ایک بہت بڑھیا فلیٹ میں پہنچیں جہاں شیم بانو کی والدہ سیٹ تک شادی کیوں نہیں کی؟ کب تک پڑھتی رہو گی؟ اب شادی کرڑا لو اور شیم بانو نے پکوڑے تل کر کھلانے مگر چندے کے نام کا ایک پیرسہ بھی نہ دیا۔

دونوں غصے میں بڑ بڑاتی نیچے اتریں۔ اب کون سے فلم اشار کے پاس جائیں۔ سڑک پر کھڑے ہو کر انہوں نے سوچا۔

یہ فلم والوں کا سلسلہ طاعت کو ہمیشہ بور کرتا تھا کیونکہ جب سے انہیں فلم انڈسٹری کی ترقی ہوئی تھی آئے دن کوئی نہ کوئی بڑا فلم اشار لندن آپنچتا۔ ایشیں فلم سوسائٹی میں اسے بلایا جاتا۔ ان کی پبلیٹی سے ہندوستان کی پبلیٹی ہوتی تھی۔ اس چیلکٹ کے ریکٹ نے دماغ چکرا دیا ہے۔ طاعت کہتی۔

”چلو چل کر مایا دیوی کی خیریت معلوم کر لیں۔“ وہ اٹھے پاؤں سوکس کا جگہ نگیں۔ فیروز پر اس وقت ٹیپر لیشن کا دورہ پڑا ہوا تھا۔

”حد ہے یار۔“ اس نے کہا۔

”ہاں یار حد ہے۔“ طاعت نے جواب دیا۔

ہمراز بھائی کے فلیٹ میں بہت چہل پہل تھی۔ ساری عمارت کے مکین، یعنی رنجور صاحب کے مہمان، ہاں جمع زور شور سے اس غیر متوقع اور عجیب و غریب واقعہ پر تبرہ کر رہے تھے۔ مال بھی موجود تھا، وہ طاعت کو دھونڈتا ہوا ادھر آکا تھا۔

”ہمیڈ کو اڑ میں تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔ تم لوگ کہاں رہ گئی تھیں بھی؟“ اس نے کہا۔

”مسنی بھث ناگر اب کیسی ہیں بھا بھی؟“ طاعت نے ہمراز بھائی کی بی بی سے پوچھا۔

”مگر صاحب _____ رنجور جیسا مرنجا مرنج اور بھگت آدمی جو بھی اوپنچی آواز میں بول کر نہ دے، اور کیا پہلوانی داؤ دکھائے ہیں میرے شیر نے۔ مجھے تو ایسا جھانپڑ دیا ہے کہ اب تک دماغ جھنوارہا ہے واللہ!“ ہمراز بھائی نے خوش ہو کر داد دی۔

”مگر یہ ہوا کیا؟“ اسی پتی ورتا عورت۔۔۔ ایک ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

”اور وہ خود کیسا تھا۔ مر گلا با لکل۔ پیلی چھپکلی ایسا۔ لا حول ولا _____ وہی ماچس والا _____، ان ڈاکٹر صاحب کی نیگم نے کہا۔

”مطہب یہ کہ انسان کے اندر جو طوفان چھپے ہیں ان کا اندازہ کیسے ہو ستا

ہے۔ ”مال نے آہستہ سے کہا۔ ”رنجور صاحب کا طوفان۔ مایا دیوی کا طوفان۔ ہم سب کتنے بڑے جو الامکھی پہاڑ پر زندہ رہتے ہیں۔ حد ہے بھی۔“

اسی وقت دروازہ کھلا اور رنجور صاحب و ملینز میں کھڑے، نظر آئے۔

”آئیے آئیے۔“ ہر ایک نے کہا، مگر سب اپنی اپنی جگہ بہت نادم محسوس کر رہے تھے۔

انہوں نے اندر جھاٹک کر چاروں برف دیکھا۔ ”نہیں۔ میں آپ لوگوں کے تبادلہ خیالات میں مخل نہیں ہونا چاہتا۔ ایسے ہی ادھر آنکا تھا۔ خدا حافظ۔“ دوسرے لمحے وہ غائب ہو گئے۔

شیو پر شاد بحث ناگر کئی دن تک گھرنہ لوئے ان کی بی بی اسی طرح سر پر پٹی باندھے خاموشی سے کپڑے دھونے اور کھانا بنانے میں مصروف ہو گئیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

چند روز بعد شیو پر شاد بحث ناگر رنجور بارہ بنکوی ٹیمز کے کنارے سر دی میں ٹھنڈھرے ہوئے پائے گئے۔

بلیل چودھری بھی پہنچ چکے تھے اور نہ الاسلام کے پروگرام میں تعاون کر رہے تھے۔ ان کا نوربری طرح فیل ہوا تھا، پھر وہ بیمار پڑے۔ ان کو بے حد خراب پر لیس ملا۔ ہر نقاد نے ”پاکستانی“ اور ”ہندوستانی“ رقص کا موازنہ کر کے سوال اٹھایا کہ ان

میں کیا فرق ہے حالانکہ فنون لطینیہ اور جمالیات کے سرکاری ماہرین ان کے متعلق اپنے عجیب و غریب نظریوں سے پر لیں کی تواضع کرتے رہے تھے۔

کئی مہینے ڈرامے اور میلے کی تیاری میں گزر چکے تھے۔ مذرل الاسلام کے لیے اتنا پیسہ اب تک اکتحانہ ہو سکا تھا کہ ان کا باقاعدہ علاج کروایا جاتا۔ ”مذرل ایڈ کمیٹی“، میں سر پھرے طالب علموں نے کھیر اور اصفہانی کو اکتحا کر دیا۔ (کم از کم ان کے نام سر پرستوں کی حیثیت سے پروگرام کی کتاب پر برادر برادر چھپ گئے) کمیٹی کے صدر ہندوستان ٹائمز کی شریعتی ایلاسین تھیں۔ نائب صدر وی۔ کے۔ کرشنامیں۔ ان کے علاوہ اس کمیٹی میں امرت بازار پتھریکا کے سندر کبادی بھی تھے اور ڈان کے شیم احمد بھی۔ (یہ اجتماع ضدین مذرل دادا تمہارا جادو سرچڑھ کر بول رہا ہے۔ مال نے کہا)۔ اس مرتبہ پی ایس الیف اور لندن مجلس نے مل جل کر کام کیا۔ پچھلے سال دو ٹاؤن جماعتوں نے مل کر بڑی دھوم رحام سے ایشیان اسٹوڈنس کانفرنس منعقد کی تھی جس میں عرب اور اسرائیل طلباء کو ایک پلیٹ فارم پر اکتحا کر دیا گیا تھا۔ (عامگیر امن اور بھائی چارہ سب فراڈ ہے۔ ان لوگوں کے بھرے میں مت آنا۔ عامر رضا نے ایک کاک ٹیل پارٹی کے دوران روشن سے کہا تھا)۔

اب ان لوگوں کے ذہنوں میں صرف ایک خیال تھا۔ ہم مذرل دادا کو اس بے کسی کے عالم میں مرنے نہ دیں گے۔

پروگرام میں پہ مارکے سیا اب کی داستان موسیقی اور تمثیل میں پیش کی جا رہی تھی۔ گھنٹوں رقص، گیتوں اور مکالموں کی ریہر سل کی جاتی۔ ایک ایک نگتے پر

بحث ہوتی۔ کاست بے انتہا لمبی چوڑی تھی۔ دھان پھٹکنے والی لڑکیاں۔ بھیلی
گانے والے ملاج۔ سیااب کی زد میں خزان کے پتوں کی طرح بتتے اور ڈوبتے
ہوئے کسان۔ سرکاری لنگرخانے کے سامنے کھڑے ہوئے بھوکے پناہ گزینوں کی
قطاریں۔

”افوہ۔ کس قدر خوفناک.....“ رو میں لکھ بل نے نیم تاریک آفیوریم میں
ایک کرسی پر نیم دراز ہو کر سامنے روشن اسٹیچ پر ریہر سل دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم
لوگ ٹریجندی سے محفوظ ہوتے ہو۔“

”موت سے تو ہماری بڑی دوستی ہے بل کر گیگ۔“ طاعت نے اسکرپٹ کے
کاغذات ایک طرف ڈال کر فرش پر اس کے نزدیک بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”ہماری
پوری نسل تو صریحاً عاشق ہے موت پر۔ تم باہر کے دشمنوں سے لڑتے تھے پر ابھی
چند سال ہمارے گھر کے انگلن میں ایک خوزیرہ جنگ ہوئی تھی اور وہ جنگ بہت
سارے مجاذوں پر اب تک جاری ہے اور روز بروز زور پکڑتی جا رہی ہے۔ یہ
سامنے والی ٹریجندی ہمارے لیے گویا روزمرہ کے معمولی واقعات میں شامل ہے۔
بہت سوں کو تو اس ٹریجندی کا احساس تک نہیں۔“ طاعت نے ترشی سے بات
جاری رکھی۔ ”اور بہت ممکن ہے ابھی جس وقت میں تم سے یہ باتیں کر رہی ہوں،
یہ سیااب کا منظر مشرقی بنگال میں سچ مج لوگوں کو نظر آ رہا ہو۔“

چھن چھن کرتے بل کے ٹراؤپ کے افراد ادھراً دھراً جا رہے تھے۔

”سیااب کے منظر میں سریلزم چلا و تھوڑی سی۔“ اسٹیچ کی پروپس کے انبار
میں سے سر نکال کر زرینہ چلا آئی۔

سریز مچلانی گئی۔ ڈراما پروڈکشن کی جدید ترین تکنیک نہایت زوروں میں ہر طرف استعمال کی جا رہی تھی۔ پچھے گلری میں فریدہ لڑکیوں کو دھان پھٹکنے والے ایک گیت کی شق کر رہی تھیں:

”بیلانائی رے جولدی جولدی بیلانائی“

بالآخر فرست نامٹ، آن پہنچی گرین روم کی گھما گھمی۔ آخری منٹ کی گھبراہٹ کاست کے افراد کی طرف سے فکر۔ جانے کون کہاں پر کوئی ہاؤ مردے۔ ویسٹ انڈ کی پروفیشنل اسٹچ کے اہم افراد کو مددو کیا گیا تھا۔ پر لیں والے سامنے کی قطاروں میں بڑی اشہاک سے بیٹھا اسٹچ کو دیکھ رہے تھے۔ ڈرامہ کرنے والے اس شہر کے پر لیں اور تماشا نیوں کے رو عمل کے عادی تھے۔ نہیں معلوم تھا کہ کل صبح ماچھر گارجین اور ڈیلی اسکچ میں کس طرح نوش نکلیں گے۔

انعروں کے دوران میں بہت سے لوگ گرین روم میں آگئے۔ دھان پھٹکنے والی لڑکیوں کا گروہ بالوں میں پھول اڑ سے سنتھال طرز کے جوڑے بنائے سامنے سے گزرا۔

”یہ سب بنگالی لڑکیاں ہیں؟“ ایک لبرل اخبار کے نمائندے نے کیمرہ سنجھاتے طاعت سے دریافت کیا۔

”یہ۔۔۔ نہیں۔۔۔ وہ سنتھال لڑکی فیروز جبیں ہے۔ اتر پر دیش کی رہنے والی۔ یہ دوسری خوبصورت کسان لڑکی عذر او حید ہیں۔ یہ ادھروں والی پنجابی خاتون ہیں۔“

”ہاؤ نے سی ٹنک۔۔۔“ نمائندے نے بڑے صدق دل سے کہا اور اپنی

نوٹ بک پر جھک گیا۔ ”دیکھو ایک بات مجھے اور پریشان کر ریہے ہے۔“ اس نے پریشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ ”تم ہوتا ان ہی لوگوں میں سے پر آج کل میری برادری سے تعلق رکھتی ہو لہذا مجھے کسی اینگل سے کوئی اسٹوری نہ دینا۔ میں میں تم لوگوں کو اس برح سمجھا و دیکھ کر بے حد پریشان ہوں۔ صحیح سے شام تک میری ساری زندگی تمہارے آپس کے سیاسی جھگڑوں اور تنازعوں اور خوزیریوں کی خبریں چھاپتے گزری جا رہی ہے اور اب یہ کیا سلسہ ہے۔ تم ہمیں بے قوف تو نہیں بنارہی ہو۔ تم ایک سال بسا پہنئے، ایک موسیقی کی آنگن پر، ایک سے گیت گارہے ہو۔ یہ کون سماں یا استثنیت ہے۔ ایس؟“

”راہرٹ صاحب“ طاعت نے منہ لٹکا کر کہا، ”اے تو بس استثنیت ہی سمجھو۔“

”اچھا اب تم پاہر جاؤ۔ دیکھوا گلا ایکٹ شروع ہونے والا ہے۔“

”پتا نہیں اگلا ایکٹ کیسا ہوتا ہے؟“ اس نے غیر یقینی لمحہ کے ساتھ رنجیدہ آواز میں کہا۔

”مجھے تو خود پتا نہیں۔“ طاعت نے گرین روم کے صوفے پر سے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے اگلے ایکٹ کے متعلق ہمیشہ ڈر اگارہتا ہے۔“ دروازے میں پہنچ کر اخبار فولیں پھر ٹھہٹھکا: ”ایک بات اور۔۔۔ سرف ایک آخری سوال۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ طاعت نے جھپٹھلا کر جواب دیا۔ ”۔۔۔ خدا را۔۔۔“ طاعت نے گرین روم کا دروازہ بند کیا اور ونگ میں جا کر اپنے کیوں کے انتظار میں مصروف ہو گئی۔

دھان کے پھٹکنے اور ساون کی بارش کی صداؤں کے ساتھ ساتھ فریدہ کی حسین بنگالی آواز رفتہ رفتہ اوپنجی ہوتی گئی:

بیلانائی رے جو لدی جو لدی

(وقت نہیں ہے جلدی کرو)

اویلانا شونا رکونزا اوپنجل دھولی را

(سنہری کنیا کا آپنجل پکڑ کر دن ڈوب رہا ہے)

جادور کاٹھی ہاتھ لوئی یا آئی اور ایت بو جھی

بیلانائی رے جو لدی جلدی

بیلانائی

دلبی ذوق

۸۰

وقت نہیں ہے۔ جلدی کرو۔ جلدی کرو

وقت نہیں ہے

لوگوں کو دیکھوان کے چہرے کتنے کریہہ ہیں۔ یہ کتنے بد صورت ہیں۔ ان سے بھاگو۔ بھاگو۔ اب میں کس اور جاؤں۔ میرے دشمن میرے دوست۔ میں نے انہیں راستے کے کس موڑ پر چھوڑ دیا۔

جھیل کے پارندی کے پار سمندر کے پار وہاں کیا ہے۔ ہم نے نکلت تو جنوبی ممالک کا لیا تھا پر کیا تمہیں یقین ہے کہ جہاز والوں نے گانیدھ زنے جو بتایا وہی

نجیک ہے، یہ میں ہوں۔ یہ تم ہو۔ باقی سب میرا پروجیکشن ہے۔ یہ مستقل ”میں۔“ سامنے درخ چھت کا جلپل ہے اور اس میں گھنیہاں رنج رہی ہیں یہاں کس کی شادی ہے؟ بہار آگئی ہے۔ پکڑ ٹھیوں پر پھول جھک آئے ہیں۔ ابھی وہ دونوں نہیں پہنچے جن کا بیاہ ہو گا۔

چلتے چلتے میرے پاؤں بھی جل گئے۔ اس نے رنج سے اپنے پیروں کو دیکھا۔ ایک سوترا ہوا چاند بر خش گاڑن کے اوپر ڈول رہا تھا، وہ سرحد عبور کر کے ہستے ہوئے سالز نرگ میں داش ہوئے۔ یونہی خوشی سے ادھرا ڈھر گھو مت ہوئے ایک چھوٹے سے سینما ہاؤس میں پہنچے جہاں ایک بیس سال پرانا فلم چل رہا تھا۔ بیس سال پرانا فلم دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ باہر آ کر وہ ایک اور سارے میں جا بیٹھے، وہ اپنی نالگیں کرسی پر رکھ کر در تھے سے باہر دیکھنے لگی۔ اپرن سے ہاتھ پوچھتا ہوا خوش مزاج دھنڈلی آنکھوں والا بوڑھا ان کے سامنے آیا۔

”یہ شاہاں اودھ کا خاندان ہے۔“ وہ خوب ہنسا۔ ”تم جانتے ہو شاہاں اودھ کون تھے؟“ انہوں نے کانڈ کے نیکپن پر اپنے نام اکٹھے لکھے۔

وقت نہیں ہے _____ وقت نہیں ہے _____

”ہلو بھائی جان _____“ دروازہ کھلا اور زرد تگ موری والی پتلون پہنچے ایک بے حد حسین اڑکی ان کی میز کی سمت بڑھی۔ ”بھائی جان آپ کا تاریخ مجھے آج ملا۔“

”آپ کون ہیں؟“ روشن نے پوچھا۔

”یہ میری کزن ہیں _____ شارخ سلطان پیرس میں ریڈیا لو جی پڑھتی ہیں۔“

”بھائی جان یہ کون تھیں؟“ روشن کے باہر جانے کے بعد نووار دلڑکی نے دریافت کیا۔

”یہ ان کو بھی میری کزن ہی سمجھو،“

”ہائے اللہ آپ کتنے مزاجیہ ہیں پر یہ کافی مغرورسی معلوم ہوتی ہیں ایک دم انٹھ کر باہر کیوں چلی گئیں؟“
”مغرور تو نہیں ہائی بر و ضرورت سے زیادہ ہیں۔ گرشن کا لج اتر نیشن سٹ سے ملاقات وغیرہ جانتی ہوتی یہ ٹاپ؟“

”ہائے اللہ، کس قدر دلچسپ۔“ شارہ خ سلطان نے مسرت سے کہا۔

اس نے ایک گہری تھکنی ہوئی انگڑائی لی۔ یہ سائز بگ ہے اور منی کا مہینہ۔

میں تمہیں ایک روز اپنی کہانی سناؤں گا۔

وقت تکا جا رہا ہے جلدی کرو۔

بھاگو۔ بھاگو۔ بھاگو۔

باہر ایک امریکن مشنری آ کر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ درختوں کے نیچے کر سیاں پڑی تھیں ارگلی کی محراب کے نیچے کوئی اکارڈین بجارتھا۔ سڑک کی دیوار پر بیٹھے بیٹھے اس نے بڑے اخلاق سے مشنری کی طرف ہاتھ بڑھایا: ”ہاؤ ڈو یو ڈو۔“ اس نے کہا۔

”کیا تمہیں اپنی روح بچالی ہے؟“ مشنری نے بے اندازہ اہمیت اور رازداری کے لمحے میں کہا۔ گوبا اگر آپ کو مضبوط جو تے بنانے ہوں تو ہماری فرم میں تشریف لا یعنے۔

”امریکن؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں مجھے پیٹر کہتے ہیں۔“

”بیٹھ جاؤ پیٹر۔ کہوا چھے تو ہو۔“

”جی تھینکس_____ میں یہاں سے چھتیس گڑھ جا رہا ہوں۔ ہم نے وہاں ایک نیا مشن قائم کیا ہے۔“ پیٹر نے آسمانی خوشی سے بے حال ہو کر بتایا۔ ”میں پرنسپن میں پڑھتا تھا۔“

”ہاؤ نڈر فل۔“

”میں پروفیشنل میں بال کا کھلاڑی بننے کی ٹریننگ لے رہا تھا جب میں نے دفتار کال سن لی۔“

”کیا سن لی؟“

”کال۔“

”تمہیں ایک بات بتاؤں پیٹر_____ میں نے بھی کال سن لی ہے۔“ اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

”یہ تو خداوند خدا کی بڑی مہربانی ہے۔ کب سنی؟“ پیٹر نے دلی مسرت سے پوچھا۔

”ابھی ابھی۔ چند لمحے پہلے تقریباً نونج کر پندرہ منٹ پر۔“ اس نے گھری دیکھی۔ ”یا شاید نونج کر بارہ منٹ تھے۔“ اس نے سڑک کی دوسری طرف سراۓ کے جگہا تے در تیچ کی اور نظر انھائی، پھر اس نے ہنس کر مشنری کو دیکھا، وہ بے وقوفوں کی طرح منہ کھولے اسے تکتارہا۔

سوتا ہوا چاند تیرتا در تپے کے عین سامنے آ کر ٹھر گیا اور اس کی روشنی سے خاموش کرہ دفعتا جگہ کا اٹھا۔ برادر کے اسٹوڈیو میں رنگا ناٹھن مر دنگم بجارتے ہے تھے۔ براؤن بالوں، ترجیحی آنکھوں اور پیلی رنگت والے ڈچ اندونیزین اڑکے، جو سریکھا کے ٹروپ میں شامل تھے، ناچنے کے بعد لکڑی کے فرش پر کاہی سے آنکھیں بند کیے بیٹھتے تھے۔ طاعت در تپے میں اس طرح بیٹھتی تھی جیسے کسی نے چوہے کو سیسہ پلا دیا ہو۔

بِاَللّٰهِ اَكْرَمُهُ كَتَنَا عَمَدَهُ كَاتَهُ مِنْ -

بِاَللّٰهِ اَكْرَمُهُ كَالْبَاسِ اَكْرَمُهُ كَتَنَا بَحْتَاهُ -

بِاَللّٰهِ اَكْرَمُهُ

فیروز دوسرے در تپے میں بیٹھتی جانے کا ہے کی نقل کر رہی تھی۔ طاعت نے اٹپیوں کی طرح ایک آنکھ کھول کر اسے دیکھا۔

برج باسیوں میں شیام

برج باسیوں میں شیام بُنْرَی بجاَءَ جا — بجاَءَ جا

طاعت نے یک لخت الائپنا شروع کیا۔

”پھر بے وقت کی رائجی۔“ گیروز نے غصے سے طاعت کو دیکھا۔

”روشن آگئی۔“ ترگیش نے در تپے میں سے جھاکنک کرا طائع دی۔

”ہوا میں بچلوں کی مہک اڑ رہی ہے اور یہ منگی کا مہینہ ہے۔ ہم اس

اندھیرے کمرے میں حسب معمول الوداں کی طرح بیٹھے بول رہے ہیں۔ نوٹ نوہو آؤ بہن روشن، تم بھی آؤ۔ ”طاعت نے اسے صدق دل سے خوش آمدید کہا۔

”تم لوگ۔“ اس نے شک و شے کی نظروں سے لڑکیوں کو دیکھا۔ ”تم نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟ میں سرحد کے پار تھا رہ گئی ہوں۔ سرحد کے ادھر لوگوں کے چہرے کتنے کریبہ ہیں۔ یہ کتنے بد صورت ہیں۔ میں چاروں اور گھومتی ہوں۔ سرحد کے ادھر لوگوں کے چہرے کتنے کریبہ ہیں۔ یہ کتنے بد صورت ہیں۔ میں چاروں اور گھومتی ہوں۔ کہیں جگہ تلاش کر سکوں جہاں بیٹھ کر روؤں۔“

وہ لکڑی کے فرش پر بکھرے ہوئے سازوں کے قریب بیٹھ گئی۔

”تم ابھی کون سا گانا گا رہی تھیں؟“ اس نے پوچھا۔

”یونہی بکواس تھیں لکھنور یہ یوکا ایک پرانا گیت۔“ طاعت نے جواب دیا۔

”مجھے وہ گیت سناؤ۔“

”میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو؟“ طاعت نے فرش پر چاروں طرف ناپتھے ہوئے اس سے سوال کیا۔

”تم لوگ اتنے مغرور کیوں ہو؟“ وہ زور سے چیخی۔

گلی کے نیم تاریک محراب میں سے نکل کر کملادر پیچے کے پاس آگئی۔

”ٹھہر و روشن، میں تم کو ایک گیت سناؤں گی، گندھرو یہ کاسام گیت۔ رنگانا تھن،“ طاعت نے ناپتھے رک کر آواز دی، ”مرد نگم اور زور زور سے کیوں

نہیں بجاتے؟“

”تم روتنی کیوں نہیں؟“ کملانے روشن کے قریب آ کر اسے غور سے دیکھا۔
”کیا ایسا نہیں ہوتا کہ جب لوگ انہیں چھوڑ کر آگے چلے جاتے ہیں تو اُنکیاں
روتنی ہیں۔“ اس نے اداسی سے سوال کیا۔

”دیکھو،“ روشن نے کمالاً کو مخاطب کیا، ”انتہے برسوں تک میں ایک گھر بنانے
میں جنی رہی لیکن ٹھیک نونج کر پندرہ منٹ پر وہ گھر ٹوٹ کر زمین پر آگیا۔“
”کا ہے؟ کیسے؟“ طاعت نے پوچھا۔

”میں نے اسے خود توڑ دیا۔ میں نے بڑے زور سے اسے ایک ٹھوکر لگانی اور
اڑا اڑا دھم، وہ ایک دم نیچے آن گرا۔ اب میں بڑی بے فکر ہوں۔ اب میں آرام
سے سویا کروں گی اور کوئی گھر تعمیر نہ کروں گی۔ اللہ حافظ۔“ وہ دروازے کی
طرف بڑھی۔ اب میں تمہارے بد صورت، اوس اجاڑ مکانوں میں رہا کروں
گی۔“

ڈچ انڈو نیزین اڑکے ایک جمالی لے کر در تپے میں جا کھڑے ہوئے۔

”میں نے اس گھر کے نیلی فون کے تار بھی کاٹ دیے ہیں۔“ چلتے چلتے اس
نے دروازے میں سے سرناکال کر کہا اور زینے کی اور مرگئی۔

طاعت بھی در تپے میں آگئی۔ اس نے دیکھا کہ باہر بے پایاں انڈھیرا ہے اور
انڈھیر مہربان ہے اور انڈھیرا ہمارے ہر دکھ، ہر شکست کو اپنے میں سمیٹ لیتا
ہے کیونکہ آخر میں ہم خود اس بے پایاں انڈھیرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔

گوہمیں کبھی اس طرح نہ مرتنا چاہئے۔

”ہلو____“ اچانک فیروز نے گلی میں آ کر در تپے میں سے اندر رجھا تک۔

”تم کہاں چلی گئی تھیں؟“

”میں دھو بن کے یہاں گئی تھی۔“

”بہت اچھا کیا تھا۔“ طاعت نے بے دلی سے کہا۔

”اب ان کا تمہارے بھیا صاحب کا کیا کیا جائے؟“ اس نے فکر مندی سے پوچھا۔

”ڈارلنگ____ کافی میں تم نے پھر کتنا گھول دیا۔“ استور کے پاس سے کملہ چلائی۔

”تم سے سک نے کہا ہے کہ بکری کی طرح ہر وقت پان چبایا کرو۔“ طاعت نے گرج کر جواب دیا۔ ”سارے میں مار پان کے لوازمات بکھرے ہوئے ہیں۔“

”ڈارلنگ۔“ سر یکھانے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے خبر سنائی۔ ”ساجدہ آپا۔“

”____ نیچے گلیری میں کھڑی پوچھری ہیں کہ اپنا افسانہ کب تک لکھ کر لائیں۔ یہ کون سانیا رکٹ تم نے چلایا ہے____“ کملہ نے غصے سے مطالبه کیا۔

”وراصل____ ورالصل کملہ____ بر لین کے واقعے کے بعد سے میں ساجدہ آپا کی رائے گوپاں بنی ہوئی ہوں۔ ایک روز انہوں نے کہا کہ وہ اپنے مختلف تجربات اور تاثرات پر ایک افسانہ لکھنے چاہی ہیں تو میں نے

میں نے ان سے کہا کہ میں اسے کسی اردو رسالے میں چھپنے کے لیے بھجوادوں گی۔ طاعت نے سہی ہولی آواز میں کہا۔ ”از برائے خدا ان سے کہہ دو کہ مجھ پر اپنڈی سائنس کا حملہ ہوا ہے اور مجھ ہسپتال لے گئے ہیں۔“

”اولہ آدم تم سب۔“ ترکیش نے گلرمی میں سے آواز دی۔

ریسل روم میں ساجدہ بہن ایک سیٹ پر بیٹھی تھیں۔

”السلام علیکم۔“ پیاری بہن ”انہوں نے گرم جوشی سے کہا۔

”وعلیکم السلام پیاری بہن۔“ پیٹا قیس کس حال میں ہے۔ اور شیر لو ہے کے جال میں ہے۔“ طاعت نے نظر لگایا۔

”ہائے بس تم ہر وقت مذاخ کرتی ہو۔“ انہوں نے کہا۔

”اب اپنا افسانہ پڑھ کر بھی سناؤ گی، ساجدہ بہن؟“ طاعت نے لرز کر سوال کیا۔

”آہ۔“ یہ کچھ یادیں ہیں میرے انگلستان کے زمانہ قیام کی۔ ”انہوں نے بیگ میں سے کاغذات نکالتے ہوئے کہا۔ ”تم تو مجھے بھجتی ہونا۔“

”لا ساجدہ بہن۔“ کافی پیو۔“ غیر ورز نے مہماں نوازی شروع کی۔

”ہرگز نہ پیجئے گا۔ اس میں کھا گھلا ہے۔“ کملانے آگاہ کیا۔

”ابھی کھا ہو یا نہ ہو، کیا فرق پڑتا ہے، دنیا کی ہر چیز فیراڑ ہے فیراڑ۔“ غیر ورز نے سخت فلسفیانہ انداز سے کہا۔

طاعت کو غصہ آگیا، وہ آتش دان کے پاس جا کھڑی ہوئی اور ہوا میں ہاتھ ہلا

کراس نے کہنا شروع کیا:

میز ہل جائے گی اور کافی چھلک جائے گی، مجھے معلوم ہے دوست

میز میں پیر لگا۔ میز کو جھٹکا سامنوس ہوا۔

ہل گئی میز تو کافی چھلکی، کافی چھلکی تو مگر گرنہ سکی

میز کا فغل عبث

دلوں میں کوئی نہیں، کچھ بھی نہیں

گھور کر دیکھنے یوں دوست مجھے

بد تمیزی سے بہت دور رہا کرتا ہوں

اتفاقات کے یہ گہرے نکات

میز تو میز ہے اگر دلوں کو ہلا دیتے ہیں

اور سیارے چھلک جاتے ہیں

ایسے ہی جیسے کہ کافی چھلکے

ساجدہ بہت خوش ہوئیں۔ ”اس کا عنوان کیا ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”فیراڈ____ ہی سمجھ لو____ تال جس کی تازہ ترین تصنیف ہے۔“

”اچھا، سر یکھادیوی سے ملاقات ہو سکتی ہے؟“ انہوں نے فون پر مجھے اسی

وقت کا اپاٹکٹ منٹ دیا تھا۔“

سر یکھادیو سرے کمرے میں ڈچ انڈو نیزین رقصوں کو ریہر سل کرا رہی تھی۔

”تم اپنے حواس میں ہو۔“ طاعت نے اس کے پاس جا کر غصے سے کہا۔ ”یہ تم

لوگوں کو ملاقات کا وقت کب سے دیے لگیں؟“

ڈوق

”روشن کوم نے کہاں غائب کر دیا؟“ وہ گرجی۔

”مجھے کیا معلوم۔ میں ہر سے اس کے پیچھے پیچھے تو نہیں پھر سکتی۔“ طاعت نے جواب دیا۔

”ہائے کس قدر لچک۔“ ساجدہ بہن نے دروازے میں پہنچتے ہوئے کہا۔ ”میری ہمیشہ تنا تھی کہ بیک اٹیج زندگی دیکھوں۔“

”کیا ذلیل تنا تھی۔“ طاعت نے غصے سے دانت پیتے ہوئے دل میں کہا۔

”نمستے جی۔“ سریکھانے بے حد سخیگی سے ساجدہ آپا کے قریب آ کر کہا۔

”میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔“ اس نے فوراً انٹرو یو لینے والا انداز اختیار کیا۔

”تمہاری رائے نے سب کا پڑا کر دیا۔“ ساجدہ آپا کے جانے کے بعد کملہ نے طاعت سے کہا۔

”ایں؟“

”ہاں۔ مثلاً اگر تم نے ساجدہ بہن کو رائے نہ دی ہوتی کہ وہ فری ورلڈ کی لیڈری چھوڑ کر افسانہ نگاری پر اتر آئیں تو کیا ہوتا؟“

”تو وہ فری ورلڈ کی سب سے بڑی لیڈر ہوتی۔“ طاعت نے اطمینان سے جواب دیا۔

”لیکن اب وہ انپریشن کی تلاش میں رومینک جنگلوں میں گھومتی ہیں۔“ غیر ورز نے کہا۔

”جنگلوں میں؟“ کملہ نے پوچھا۔

”ہاں جنگل یعنی ووڈلینڈ۔“

”سینٹ جانز ووڈلینڈ؟“ طاعت نے سوال کیا۔

”کہیئے پن پر مت اترو۔“ غیر وزنے کہا۔

”دراصل سینٹ جانز ووڈ کے استوڈیولنس میں تبدیل شدہ اصطبلوں اور ان میں رہنے والے کلاکاروں کی صحبت نے ان کی نفیات پر بہت پریشان کن اثر ڈالا ہے اور دوسری بات یہ۔“ کملانے خفگی سے کہا، ”کہ اگر تم نے روشن کو کوئی سیدھا راستہ دکھایا ہوتا تو وہ کب گھر واپس جا کر کسی ملکانے کے آدمی سے بیاہ کر لیتے۔“

”وہ احوالہ گھر واپس جا کر کسی ملکانے کے آدمی سے بیاہ کر لے گی، وہ فلسفی ضرور ہے مگر یہ نہ بھولنا کہ بورڑا فلسفی ہے۔“ طاعت نے کہا۔ ”ارے جب میاں بزرے باگوں میں آئے مالی بھنے اگوانی۔“ اس نے ڈھول اٹھا کر الپنا شروع کر دیا۔

”اور میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ یہ سارا اسرار ہے کیا آخر؟“ سریکھانے اندر آتے ہوئے سوال کیا۔

”اتفاقات کے یہ گہرے نکات۔“ سریکھانے سیٹی بجائی۔

”میں دھوبن کے یہاں جا رہی ہوں۔“ غیر وزنے در تپے میں سے باہر گلی میں کو دتے ہوئے کہا۔

جاڑے آئے اور برف سے سارے راستے سفید ہو گئے۔ اسٹیٹ گاڑٹ، ترویز، ویزرن۔ ساری جگہوں کو برف نے ڈھانپ کیا۔ کرمس کے پنجو مائیم شروع ہوئے۔ لوگوں نے جنوب کی طرف روانہ ہونا شروع کیا۔ اسٹرن برگ میں چار خانے دار موزے پہنے غریب جرم کیا۔ کرمس کی خریداری کر رہی تھیں اور امریکن سپاہی انہیں اسکریٹ کے ڈبے تھے میں دے رہے تھے۔ فوتدام کی راہبات سین کے کنارے اپنی بھگیاں ہائک رہی تھیں۔ مٹر سپورٹس کا زمانہ آیا۔ برف کے خطرناک حصوں کو جالیاں لگا کر علیحدہ کر دیا گیا۔ وکی بام نے شاید کوئی نیا ناول لکھ لیا تھا اور برف بڑی مہربان تھی۔

پھر برف پکھلی۔ درختوں میں بھی کوپلیں نکلیں۔ ساری کائنات پر شدید، خالص رنگ بکھر گئے۔

خراں آئی۔ جنگلوں میں سرخ آگ لگ گئی۔ تیز سرخ پتوں کے انباروں نے پگڈنڈیوں اور سڑکوں کو اپنے میں چھپا لیا۔ ہوا کی نیلا ہٹ میں زردی شامل ہو گئی۔

چلتے چلتے تھک کر روشن راستے میں ایک جگہ ٹھہر گئی۔ سامنے ایک پرانا چرچ تھا، وہ غیر ارادی طور پر قبروں کے کتبے پڑھنے لگی، پھر وہ اندر گئی۔ چپل خالی پڑا تھا۔ گھسے ہوئے اوک کی بچیں پستہ دینے کا سر دھوض۔ دیواروں پر ان کرنلوں اور کپتا نوں کی تاریخ وفات کی پیشی کی تختیاں گلی تھیں جو اس قبے میں پیدا ہوئے اور سلطنت کی حفاظت کرتے ہوئے جہاں سی اور کانپور اور رزمک میں کھیت رہے۔ اس نے بے دصیائی سے ادھر ادھر گھوٹتے ہوئے چند سکے فندے کے ڈبے میں ڈال

دیے۔

”ہلو۔ میری بچی۔“ بہت بوڑھے پادری نے محبت سے کہا، وہ پچھے درختوں سے نکل کر آیا تھا اور لنگڑا تھا۔

”ہلو۔ گڈا یونگ۔“ اسے بے حد ڈر لگا۔ اس نے مسکرا کر چند اور سکے بکس میں ڈالے اور باہر آگئی۔ کیا فضول بات ہے۔ چرچ بنار کھے ہیں۔ اس نے جھنچھلا کر کہا، پھر اس کا جی چاہا کہ واپس جائے اور ایک اوک کی نیخ پر سر رکھ کر پڑسوتی رہے۔

اس کے ساتھ وہ گھنے جنگلوں اور ہرے جزیروں میں سے گزری تھی۔ طویل مرمریں گیلریوں میں چلی تھی۔ اونچی سفید سیڑھیوں پر چڑھی تھی۔ جن کے اختتام پر رومن ستونوں میں سے تیرتا ہوا چاند یکنخت سامنے آ جاتا تھا اور چاروں اور ساپرس کے درخت تھے۔ اسٹریا۔ یونان۔ اٹلی۔ اب وہ پھر مانوس پرانے انگلستان میں موجود تھی۔

لندن میں وہ سریکھا کے مکان کی بالکنی پر جھکی رہی۔

”وہ سب ایکنگ تھی۔“ اس نے بڑے باوثوق طریقے سے عامر رضا سے کہا۔

” بتا ہے۔“ عامر رضا نے اطمینان سے جواب دیا۔ ان کو ہمیشہ سے ہر بات کا بتا تھا۔ خود ان کو نروان ملنے والا تھا زروان کی مختلف بیفیات ہوتی ہیں۔

” مجھ میں بہت مال کا سٹیج سنس ہے۔“

” معلوم ہے۔“ تم نے بھی کالج میں ایلو کیشن سیکھا ہے اور اس کا لائنیز

میں تم —

”ہاں —“ اس نے خوشی کے لمحے میں بات کائی — ”اور اسی لیے اب میں تم سے یہ کہنے آئی ہوں کہ مجھے صرفت ہے کہ تم نے مجھ پر ثابت کر دیا ہے کہ تم بہت سمجھدار ہو — دراصل غلطی سراسر میری ہی تھی۔ میں صدق دل سے تم سے معافی مانگتی ہوں۔“

”میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔“ اس نے بہت فراخ دلی سے جواب دیا۔
پھر وہ دونوں بالکنی پر جھکتے سیٹی بجاتے رہے۔

۸۳

سوتا ہوا چاند کا، ہی سے چاروں اور تیرا کیا۔ بالکنی کے نیچے سریکھا بیٹھی تھی۔ وہ اور زرینہ نے اسٹیچ ڈریز آئن بنانے میں مصروف تھیں۔
”وہ دیکھو۔ چاندر مر رہا ہے۔“ اس نے اچانک انگلی اٹھا کر روشن کو مخاطب کیا۔
”ہاں۔“ روشن نے پہلی بار دیکھا۔ چاندر مر چکا تھا اور اس کی زرد لاش رات کی ہوا کے حرم و کرم پر ادھرا دھڑول رہی تھی۔

”تم نے دیکھا۔“ سریکھا نے آہستہ آہستہ کہا — ”یہ سب اسٹیچ کی سیزی تھی۔ ڈریز آئن۔ ڈیکور۔ کیوس کے نگین پر دے۔ پر دیں۔“
گلیری میں افٹ آن کر رکا۔ طاعت اور نرگیش اندر آئیں، وہ نرملہ کو دیکھنے مل ہر سٹ گئی تھیں اور واپسی میں انہوں نے دیکھا کہ ہیزل میز کا جنگل وہاں نہیں

تھا۔ تب طاعت کو معلوم ہوا کہ موسموں کے ساتھ ساتھ اس جنگل کی جائے وقوع بدلتی رہتی ہے۔ بیزیل میر کا جنگل کبھی ایک جگہ پر نہیں ظہرتا۔

کمرے میں وہ سب چپ چاپ بیٹھے رہے۔ کملانے روشن کو غور سے دیکھا، گویا اسے پیچانے کی کوشش کرتی ہو، پھر وہ اپنی اور سریکھا کی بھرت نائم کی مابوسات کو والٹنے پڑنے لگی۔

”کملانے____“ طاعت نے دفعتاً کہا۔ ”لوئی مک نیس کی وہ اظہم سناؤ۔“

”کون اظہم؟“

”وہی____ جو خزان نامے میں شامل ہے۔“
کمل آتش دان کے مصنوعی انگاروں کو دیکھتی رہی، پھر اس نے آہستہ آہستہ کہا:

”I loved my, with a platform Ticket“

A handbag, a pair of stockings of paris and

I love her long

I loved her between the lines and against

the clock,

Not until death

But life did us part

I loved her with paacocks eyes

and the wares of carthage.

With blasphemy, camaraderie,

and bravado and lots of other stuff.

I loved her with my office hours, with
flowers and

Sirens,

With my budget, my latchkey

and my daily bread;

And so to London and down the

ever-moving Stairs."

سب خاموش بیٹھے رہے۔

"کمالاً" طاعت چالائی۔ "مجھے ڈرگ رہا ہے۔" وہ قریب آ کر
نہندے فرش پر بیٹھ گئی۔

"تمہیں یاد ہے۔" کمالا نے سوچتے ہوئے کہا۔ "جو لائی یا اگست کی ایک شام،
جب بارش ہو کر تھی تھی، مگل فشاں با اکل سنسان تھی۔ سب لوگ جانے کہاں چلے
گئے تھے۔ میں اور زملا اور تم اکیلے بر ساتی کی سیر ہیوں پر بیٹھے تھے اور شام کی نیلی
روشنی سارے میں پھیل گئی تھی اور اس سے دوسنیا سنیں منتر پڑھتی پھاٹک کے اندر
آگئی تھیں اور مصر تھیں کہ ان کو دکھنا دی جائے اور بچوں کی طرح ہمیں
ایک ایکی یہ خیال آیا تھا کہ یہ چہل میں ہیں، ہم اتنے بڑے گھر میں تنہا ہیں، ابھی یہ
ہمیں شراب دیں گی، ابھی کچھ ہو گا، اس نالے میں کوئی خوفناک انجامی بات ہو
گی۔"

”پھر وہ جاپ کرتی اور راجستھانی میں بڑ بڑاتی واپس چلی گئی تھیں۔ ہم نے خوفزدہ ہو کر انہیں زور سے ڈالنا تھا۔“ طاعت نے آہستہ آہستہ کہا۔ ”اور پھر ہمیں مہوے کے سائے سے بھی ڈر لگا تھا۔ ہم سہمے ہوئے میر جیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے کوشش کر کے آہستہ لکری پڑھی تھی اور تم نے اپنا وہ اکلوتا اشلوک دہرانا چاہا تھا جو تمہیں کبھی یاد نہ ہو سکا۔“

”وہ بڑی سنسان شام تھی۔“ کملانے یاد کیا۔ ”تم نے کبھی سوچا ہے، ساری شام میں بہت سنسان ہوتی ہیں۔ ان میں ایسی بے پایاں اداسی ہوتی ہے۔ شام جب دونوں وقت ملتے ہیں۔ جب ہم جگ مگاتے کروں میں ہستے ہیں۔ اس وقت بھی دفتار بڑے رنج بڑی پیشہ مانی کا احساس ہوتا ہے۔“

”پھر ہم تینوں خاموش سڑک پر سے گزر کر سنگھاڑے والی کوچی چلے گئے تھے اور وہاں لاج کے ساتھ مل کر اپنے اس طرح خوفزدہ ہو جانے پر بہت بنسے تھے۔“ طاعت بولی۔

”وہ سنیا سنیں ہمیں ہر جگہ ہر موڑ پر ملتی ہیں، وہ ہمیں بد دعا میں دیتی مہوے کے سائے میں غائب ہو جاتی ہیں۔ اندھیری راتوں میں میں نے ان سنیا سنوں کو چلا چلا کر روتے سنا ہے۔“ کملانے کہا۔

”درے کمرے میں زور زور سے مردگم بجنما شروع ہو گیا۔ آج رات سریکھا اور کملانہ کا ناج ہے۔ سارا عالم دیکھنے کے لیے آئے گا۔“ طاعت کو خیال آیا۔

روشن اس کے قریب آئی۔ ”میں واپس جا رہی ہوں۔ تم لوگ مجھے کبھی کبھی خط لکھا کرو گے؟“ طاعت کو اپنا لگا جیسے اس کی آواز میں التجھی۔

ہاں۔ ہم تمہیں ہر سال عید اور سال نو کے کارڈ بھیجیں گے۔“ طاعت نے کہا۔ (کیا انجمام بس اتنا ہے۔ کچھ عرصے تک ان سب کے کرسمس کارڈ روشنیں کے پاس جائیں گے مگر وہ بھی بند ہو جائیں گے۔ راہ میں جب مختلف خرابوں کے وسیع ویرانے اور سیاسی حد بندیاں حائل ہوں تو کہاں تک ان خوشنگوار تعلقات کو گھسیٹا جاستا ہے۔ ہاں۔ ہم تمہیں کبھی بھولیں گے نہیں روشن ڈیگر۔ اس نے دہرا دیا۔ ”ہم سب ایک شراپ کے زیراث ہیں۔“

مردنگ کی آواز تیز ہو گئی۔ نادر دام تاندی رے نا۔ سریکھا چھن سے اشیج پر آئی۔ اب حسب معمول میں ناچوں گی۔ اس نے سوچا۔ کملانا چے گی۔ سب ناجیں گے۔ ای رپوچتی سورم۔ شبدم۔ شو جاری رہے۔ ایسی کیا خاص بات ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیوں جاری رہے۔ کڑستک تمام تام۔ کڑستک تینی توتی۔ کل مجھے یلی ویژن پرنا چنا ہے۔ پرسوں ہالینڈ جا کر ملکہ جولیانہ کے لیے رقص کرنا ہے۔ دریا بھے جا رہا ہے۔ ڈلن نامس مر گئے۔ بلبل چودھری مر گئے۔ روشن افسوس کروہ بھی شاید مر گئی۔

اور اب ہال خالی پڑا ہے۔ صرف رادا کی چند لڑکیاں اروڑ کے ادھر ادھر بیٹھے سگریت پی رہے تھے۔ اخباروں کے نمائندے کاغذ پیش ہاتھ میں لیے سریکھا دیوی کے قسمی الفاظ سننے کے لیے کان لگائے کھڑے تھے۔ کارڈ بورڈ کے سینٹ افراتفری کے عالم میں بکھرے ہوئے تھے۔

”رقص میں میری زندگی ہے۔“ سریکھا نے رامیشورم کے مندر کی سیڑھی پر پیدا

نکاتے ہوئے انزو یو والی شائستہ اور تموازن آواز میں کہنا شروع کیا۔

”خداوند سریکھا۔“ طاعت نے بے انتہا بور ہو کر جمائی لی۔

”ہش میں پر لیس کو بیان دے رہی ہوں۔“

خبر کے روپ رسمحور ہو کر اسے دیکھتے رہے۔

طاعت نیم تاریک آڈیو ریم کی ایک نشست پر بینہ کراو نگھٹنے لگی۔ یہ نہایہ سور مار کیٹ گیا تھا۔ یہ نہایہ سور مار کیٹ گیا۔ یہ نہایہ سور گھر پر رہا۔ اس نہایہ سور نے بھنا گوشت کھایا۔ یہ نہایہ سور سارے راستے روتا ہوا گھر واپس آیا۔ وی وی وی وی وی وی وی۔

۸۲

وی وی وی وی شوراب آسمان تک پہنچ گیا ہے۔ چمپا نے دریچہ بند کر دیا اور ہوشل سے باہر نکل آئی۔ سارے میں سے پہر کا سنانہ طاری تھا کال کالج بند ہو جائے گا۔ اب میں کہاں جاؤں گی؟ کیا کروں گی؟ (زمدگی منتظر ہے منہ چھاڑے۔) یہ تحریر بھی غالباً ناکام رہا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دور دور تک پھیلے ہوئے باغوں کو دیکھا۔ کیمبرج کی ہر لیالی پر نیلی لھٹائیں میں چھائی تھیں، وہ بیکس پر سے گزرتی لابریری کی طرف جانے والی پلیا پر آگئی۔ ”شولوم صلیخم۔“ ایک یہودی طالب علم دوسرے یہودی طالب علم کو جو پلیا پر بینہ تھا، سلام کرتا ہوا سانیکل پر گزر گیا۔ ”تم پر خدا کی رحمت ہو۔“

”تم سب پر خدا کی رحمت ہو۔“ چمپا نے دل میں دھرا یا۔

زندگی میں بذات خود اتنی شدت ہے۔ اس کے لیے فلسفے کی فروعات کی کیا ضرورت ہے اور مسرت کی تلاش کے سلسلے میں ہم کس قدر کمینے بن جاتے ہیں۔ یہودی طالب علم، جو پلیا سے درخواست کی۔ ”میں تمہارا اسکیچ بناؤں گا۔“ وہ بینہ گئی تا کہ اس کی دل شکنی نہ ہو۔ ”آج آخری دن ہے۔ کل تم جانے کہاں چلی جاؤ گی۔“ تمہارا اسکیچ میں اپنے پاس رکھوں گا۔“ اس نے تندی سے پنسل چلاتے ہوئے کہا۔ چمپا نے جھاٹک کر دیکھا۔ اسکیچ بڑا خراب تھا، مگر وہ بڑے صبر اور اخلاق سے چککی پیٹھی رہی۔ شاید میری اصل شکل ہے۔ اس نے دل میں کہا۔ ”یہاں کام مصور ہی شاید میری شبیہ اتنا رنے میں دراصل کامیاب رہا ہے۔“

”پسند آئی تم کو تصویر۔“ یہودی اڑکے نے خوشی سے پوچھا۔ ”میں تم کو مسرور دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں تم کو کس طریقے سے خوش کروں؟“ وہ بڑا پر خلوص نظر آیا۔ ”تم مجھے خوش نہیں کر سکتے۔“ چمپا نے دفتار بڑی کرختگی سے کہا۔ (ہم سب کمینے ہیں۔ مسرت کی تلاش میں ہماری چار سو بیس تو دیکھو۔ اس نے دل میں سوچا۔

”وہ کون ہے؟“ اڑکے نے یک لفحت بے حد رنجیدہ ہو کر پوچھا۔ ”وہ کون ہے جو تم کو مسرت بخشنے گا؟“

”یہ بڑا بے در جم اور کمینے پن کا سوال ہے۔“

”معاف کرنا۔“ اس نے اداسی سے کہا۔

”اچھا خدا حافظ شووم علیکم۔“ چمپا نے مسکرا کر کہا۔

”شووم علیکم۔“ لڑکے نے جواب دیا اور اسے ندی کی سمت جاتے ہوئے دیکھتا رہا جدھر مائیکل اور ڈنیس کھڑے تھے۔

”سرل اب تک نہیں ملا؟“ ڈنیس نے سر ایمگی کے عالم میں چلا کر پوچھا۔
”دونہیں۔“

”کہاں غائب ہو گیا سرل؟“ ڈنیس نے کہا۔ ان دونوں نے غصے سے چمپا کو دیکھا۔

”میں سرل کی ذمہ دار نہیں ہوں ڈنیس۔“ چمپا نے آہستہ سے کہا۔

”اوہ چمپا، مجھے معاف کرو دینا۔ کیا میں تم پر برس پڑا تھا؟“ مائیکل نے بجز سے کہا۔
”دونہیں مائیکل۔ ٹھیک ہے۔“

”آج آخری دن ہے چمپا۔“

”ہا۔“

”چلو چل کر آخری مرتبہ کوئی نور میں کھانا کھائیں۔“

”آج آخری۔“ سب یہی دھرار ہے تھے وہ اس جذباتیت سے بچنا چاہتی تھی مگر یہ ناممکن تھا۔ یہ واقعہ تھا آج کیمبرج میں طالب علمی کی زندگی کا آخری دن تھا۔

ریسٹوران میں بیٹھ کر انہوں نے سرل کا قطعی ذکر نہیں کیا۔ انہوں نے تروشن تک کا ذکر نہیں کیا۔ لوگ اتنے مہربان کیوں ہوتے ہیں؟ ایک دھرمے سے اتنی

ہمدردی کیوں کرتے ہیں؟ یہ لوگ میرے بھی بہت سخت بھی خواہ ہیں۔ اب میں پھر کمینے پن پر اتر آئی ہوں۔

چند روز قبل اس نے برسمیل مذکورہ روزماری کی خیریت دریافت کی تھی۔

”اچھی ہے۔“ سرل نے جواب دیا تھا۔ ”وہ غریب تو یہاری کی حالت میں بھی نوکری کرتی ہے تاکہ میں کمپریج میں تعلیم مکمل کر سکوں۔“

”اور _____ دوسرا لڑکیوں سے عشق لڑا سکو۔“ چمپا نے بے دھیانی سے کہا تھا۔ یہ سرل چھانگ لگا کر کھڑکی سے باہر کو دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہوا تھا۔ اس روز سے سرل غائب تھا۔ کانج کے کوارینگل میں، گلیوں میں، ندی کے کنارے، قہوہ خانوں اور کتابوں کی دکانوں میں کہیں سرل کا پتائے تھا۔

دفعتاً وہ باہر بارش میں بھیگتا دکھانی دے گیا۔ ڈنیس لپک کر اس کی طرف دوڑا، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا، پھر مانیکل اس کو بلانے کے لیے گیا، مگر وہ وہیں کھڑا رہا۔ ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ طالب علم بر ساتیاں اوڑھے خراماں خراماں چل رہے تھے۔

”اندر چلو۔ یہ کی پچھنا ہے۔“ چمپا انٹھ کر باہر گئی اور ڈانٹ کر اس سے کہا۔

”نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔“

”بکومت۔“

”میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ کیسے آؤں اندر۔“ اس نے آہستہ سے ڈنیس سے کہا۔

چمپا کے حلق میں کوئی چیز آئی۔ ایک ہفتہ قبل اسی جگہ پر اس نے سرل سے کہا

تحا: تمہاری بی بی اس لیے ملازمت کرتی ہے کہ تم دوسری بڑیوں سے عشق بڑا۔

پھر وہ چمپا کی طرف مزا: ”تم کو غالباً یہ معلوم کر کے دلچسپی ہو گی کہ روزماری نے مجھے اس ہفتے چیک نہیں بھیجا کیونکہ میں نے اسے اطلاع دی تھی کہ میں نے اسے چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”تمہارا _____ تمہارا دماغ یعنی کہ _____ بالکل چل گیا ہے _____“، چمپا نے ہر بڑا کر کہا۔ اسی لمحے اس نے محسوس کیا کہ مانیکل اور ڈنیس اسے انتہائی نفرت کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ نفرت جو اس نے تھی نہ زملا اور شانتا کر گیکی نگاہوں میں دیکھی تھی۔

”ہاں۔“ سرل نے اطمینان سے جواب دیا اور برساتی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ تلاش کرنے لگا۔

ڈنیس اور مانیکل خاموشی سے ریستوران میں واپس چلے گئے۔
بارش چمپا اور سرل پر برستی رہی۔

”چلو یہاں سے چلیں۔ پانی میں بھیگنے کی کون سی تک ہے۔“

”ایسے تو کس بات کی کون تک ہے۔“ سرل نے اسی انداز میں کہا، پھر وہ نہ پڑا۔ ”دیکھو تو کہی۔ سب آخر مجھ پر بھی تمہارے اپنے شدوں کا اثر ہو ہی گیا۔“

”تمہارا دماغ چل گیا ہے سرل۔“ چمپا نے دوبارہ کہا۔

”ہر واقعہ منفرد ہے۔ دہر ۲۳ آیا نہیں جائے گا۔ یہ مت سمجھنا جہا کہ لمحے دہرائے جاسکیں گے۔ تمہاری زندگی۔ میں یہ ساری چیزیں۔ وقت کے الیے پر تم نہیں سکتیں۔“

”چلو____ میں تمہاری طرف چلتی ہوں۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

وہ فٹ پا تھہ پر اس طرح چلنے لگے گویا قبرستان کی طرف جاتے ہوں۔ جب شناساٹر کے اور لڑکیاں راستے میں ملتے تو وہ بڑے الم سے ان کو ہلو ہلو کہتا جاتا۔

”تم کیا واقعی____ میری وجہ سے ____ یعنی کہ ____“ اتنی خوفناک بات اس کی زبان پر نہ آسکی۔ ”یعنی کہ“ اس نے مری ہوئی آواز میں کہنا چاہا، ”کہ تم نے آخر اتنا بڑا فیصلہ کیوں کیا۔“ فیصلہ۔ اور اس کی وجہ۔ دو چیزیں جو اس کی سمجھ میں آج تک نہ آسکی تھیں۔

”جی نہیں____ مجھ کو بقول تمہارے باوے لے کتے نے کاٹا تھا۔“ سرل نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”مجھ پر دراصل کبھی کبھی خلل دماغ کے دورے پڑتے ہیں اسی کے زیر اثر ایسی حرکتیں کر جیٹھتا ہوں۔“

چمپا چورا ہے پر آکر دفلتا اپنے ہوشی کی سمت مڑ گئی۔ ”تم تو اپنے زریں مشوروں سے مجھ مستفید کرنے میرے ہوشی آرہی تھیں!“

”میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی سرل۔ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔“

”یہ تمہارا آخری، قطعی جواب ہے؟“ سرل نے زرد پڑتے ہوئے کہا۔

”آخری، قطعی بالکل۔ تمہیں اس میں شک و شہے کی کوئی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی۔“

”تم گوتم نیلمبر کا تعاقب کہاں تک کرو گی؟“

”میری تو ہیں مت کرو سرل۔“ چمپا کے تن وہدن میں آگ لگ گئی۔

”اچھا۔ اچھا۔“ سرل نے سانس روک کر کہا۔ ”سرک پر چلا و مت چمپا۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ غلطی میری ہی تھی۔ خدا حافظ۔“ بارش کا ایک زوردار ریلا آیا جس سے مکانوں کے پردے لہر اگئے۔ ہوا میں خنک گلابیوں کی مہک تھی۔

شام کو وہ چند کاغذات لینے کے لیے سرل کے کانج گئی۔ رات کی ٹرین سے بہت سے ساتھی اپنے اپنے ملکوں کو لوٹ رہے تھے۔ سینور کا رلوں بر از میل جا رہا تھا۔ اس سے اس کی کتفی تکرار رومن کی تھوک فسلے پر ہوتی تھی۔ لڑکیاں اور لڑکے بارش سے بچنے کے لیے چھانک کے اندر کھڑے تھے۔ چھانک کا بھاری پندر ہو یہ صدی کا چوبی دروازہ اب آخری بار کھل کر بند ہو گا۔

اس کے بعد جب کبھی وہ یہاں آئیں گے تو سب کچھ تبدیل ہو چکا ہو گا۔ بارش اور زور سے ہونے لگی۔ پورٹ میکسیاں لے لے کر آرہے تھے۔ لڑکوں نے بر ساتھیوں کے کالر کان تک اٹھا لیے تھے۔ لڑکیاں چھتریاں کھول رہی تھیں۔ سب خاموش تھے۔ اب یہ بات کتنا کس قدر مضمون کی خیز معلوم ہوتا تھا۔ مثاً ڈورس سے یہ کہنا کہ جب میں اٹھیں آئی تو تم سے ملنے نا رکھو ڈیکونا ضرور آؤں گی۔ یا جینیٹ یہ کہہ سکتی تھی کہ تم جب نیوزی لینڈ آؤ تو میرے ہاں ہی آ کر رکھہ رہا۔ یہ سب کس قدر مسخرے پن کی بات تھی، اگر یہ آخر وقت خدا حافظ کہنے کا سلسلہ نہ ہوا کرے تو انسان کس قدر زبردست کو فتنے سے نجی جائے گا مگر نہیں۔ کھڑے ہیں۔ بے ربط بے تکے جملے ادا کیے جا رہے ہیں۔ نظریں بچا بچا کر ہنسو پئے جا رہے ہیں۔ لا حول ولا قوّۃ۔ میکسیاں آئیں اور سب ایک ایک کر کے اس میں بیٹھے گئے۔ چھانک بند ہو گیا۔ ایک بار اس نے گھوم پھر کرسمن کو اڈرینگل کا چکرا لگایا۔ چیل

میں گئی۔ سنک مرمر کی تختیوں پر ان اڑکوں کے ناموں کو آخرتی بار پھر سے پڑھ دالا جو دوسری جنگ عظیم میں کام آئے۔ ملیوں سے بات کی۔ ایک خانہ میں ڈائرنگ ہال کی طرف لپکا جا رہا تھا۔ اس کو بڑے تپاک سے خدا حافظ کہا گویا وہ خود میدان جنگ پر جا رہی ہے اور دنیا کا انجام ہونے والا ہے، پھر وہ صحن کی دیوار کے دروازے کی طرف جانے لگی جو جیزس لین کی طرف کھلتا تھا۔ راستے میں اسے کیٹ مل گئی۔ ”میں تم کو ڈھونڈ رہی تھی۔“ اس نے ہاتھ بڑھایا۔ ”میں کل کینیڈا جا رہی ہوں۔ اب کب ملیں گے؟“

”پتا نہیں کیٹ“ چمپا نے اس لایعنی سوال سے بچنے کی کوشش کی۔ ”سرل کو دیکھا ہے؟ میں اس کو بھی خدا حافظ کہہ لوں۔ اس نے بڑی بے تعلقی کا انداز پیدا کر کے کیٹ سے پوچھا۔“

”ہاں وہ تو سینٹر کو من روم میں بیٹھا ہے۔“ کیٹ نے جواب دیا۔ ”اس کے مزے ہیں۔ کہیں بھی نہیں جا رہا۔ مزے سے اپنے وطن میں رہے گا،“ اکثر ہیٹ ختم کرے گا اور تم کو معلوم ہے، مجھ کتنی خوفناک جگہ جا کر رہنا ہے۔ نیو گنی اچھا ڈارٹنگ۔ خدا حافظ۔“

چمپا کچھ دور تک اس کے سات چلی اور اس کو پھانک تک پہنچا کر سینٹر کو من روم کی طرف مڑ گئی۔

سارے کالج پر مکمل سنائی طاری تھا جسے صرف بر تی بارش کی آور مخل کر رہی تھی پتوں کی سر سراہٹ سرل ایشلے کو من ور میں در تپے کے پاس، چڑے کے صوفے پر بیٹھا وہ معتمد دیکھ رہا تھا جو کنگز لے مارٹن ہر ہفتے اپنی انہتائی انھلکوں ریڈ سنک

پیک سے حل کرواتے تھیں چمپا کمرے میں آگئی تب بھی وہ معہ حل کرتا رہا پھر جب چمپا ایک کرسی پر بیٹھ گئی تو اس نے سراٹھا کرایک حل کے متعلق اس کی رائے پوچھی، چمپا نے غور کر کے اس کا جواب بتایا۔

”ٹھیک ہے۔ ہو ستا ہے کہ تم غلطی پر نہ ہو۔“ اس نے خالص بر طافی انداز میں کہا۔

وہ چونکی۔ اس نے دھننا دیکھا دیکھا کہ اس کے سامنے صوف پر شہرے بالوں والا ایک بر طافی لارڈ کر لڑ کا تھا: قدامت پسند، مغرور، خاموش طبع، باقہار۔ اس لڑکے کے ساتھ اس نے چند سال اس یونیورسٹی میں بتائے تھے اور ہم جماعت ہونے کے ناطے اب اسے خدا حافظ کہنے آئی تھی۔ یہ لڑکا وہ نہیں تھا جس نے صح بارش میں بھگتے ہوئے دیوانوں کی طرح اس سے شادی کی درخواست کی تھی۔ یہ لڑکا تو لارڈ بارن فیلڈ کا چھوٹا بیٹا سرل ڈیرک ایڈن نہیں۔ کون کسی ٹرین سے جا رہی ہو؟“

”سائز ہے چھوکی ٹرین سے۔“ چمانے گھڑی دیکھ کر جواب دیا۔ ”تم کب لندن آؤ گے؟“

”جب بھی آؤں، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے، تم سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔ میں تم سے عمر بھرنہیں مانا چاہتا۔“

وہ خاموش رہی۔ پانی کی شفاف پھوار در پچھے پر ٹکرایا کی۔ ہوا کا بھینا بھینا پن کرے میں رج گیا۔

یکنہت چمپا نے نہایت بثاشت سے باتیں شروع کر دیں۔ یونیورسٹی

چھوڑنے کے بعد جو پر گرام گروہ کے افراد نے بنائے تھے۔ ان کا ذکر کیا۔ ”میں تو ابھی قانون پڑھوں گی۔“

”مبارک ہو۔ اس کے بعد کیا کرو گی۔“

”علم نجوم تو مجھے آتا نہیں کہ بتا دوں کہ ۶۲ء میں کیا کروں گی اور ۶۵ء میں میرا کیا ارادہ ہے۔“ اس نے خورشیدی کالج برقرار رکھنے کی سعی کرتے ہوئے کپا۔
”یہ بھی صحیک ہے۔“ وہ رسالے پر جھکا رہا۔

”تم البتہ ڈاکٹریٹ یعنے کے بعد یہاں کے استاد بن جاؤ گے۔ تقید پر موٹی موٹی کتابیں لکھے گے۔ اُنہی دو کے بین ٹرست کی پیشی پر بیٹھو گے۔ دنیا عش عش کرے گی۔“

”ہو سنتا ہے۔“

”یا تم ڈاکٹریٹ سے بور ہو کر بنک آف انگلینڈ میں نوکری کراؤ۔“

”یہ بھی ممکن ہے۔“

”اچھا اب چلنا چاہیے۔“ چمپا نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

اگر میں تمہاری جگہ پر ہوں تو مجھے زیادہ تا خیر نہ کرنی چاہیے۔ ٹرین کا وقت قریب ہے۔ ایسی سرل نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ گویا، اب تشریف لے جائیں ہیگم صاحب۔

چمپا نے کری پر سے انتھتے ہوئے کمرے پر آخری مرتبہ ایسی جذباتی حرکتیں کرتے ہوئے وہ خود کو پکڑ لیتی تو بعد میں بہت نام ہوتی تھی۔ دروازے تک آکر اس نے سرل کی طرف مصلخے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ دروازہ بہت نیچا تھا۔ کئی سو

سال سے اس پر عشق پیچاں کی گھنی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ کئی سو سال سے ان گنت طالب علم اسی طرح دروازے سے خدا حافظ کہہ کر نکلے تھے اور باہر کی دنیا میں دھکیل دیے گئے تھے۔

سرل نے جھک کر اس کو جانے کا راستہ دیا اور ہاتھ بڑھا کر کہا۔ ”انتہی عرصے۔

”اس نے ایک ایک لفظ الگ الگ صاف اور گہری آواز میں ادا کیا۔ ”تم کو جان کر اور تم سے واقفیت حاصل کر کے مجھے بعد مررت ہوئی۔ خدا حافظ۔“
وہ عشق پیچاں کی بیل کے نیچے سے جھک کر باہر نکل آئی۔

”تم مجھے پھانک تک نہیں چھوڑ نے آوے گے؟“ اس نے یک نخت اپنی اٹلی اور ابدی تہائی کو محسوس کرتے ہوئے دہشت زدہ ہو کر کہا۔

”نہیں۔“ سرل نے جواب دیا۔ ”مجھے مجھے معتمد حل کرنا ہے اور خدا کرے میری تنوم سے دوبارہ ملاقات کبھی نہ ہو۔“
وہ واپس اندر چلا گیا۔

چمپا کو اڈرینگل کے موڑ پر پہنچ کر رکھی۔ اس نے پٹ کر دیکھا، وہ درست پچ کے اندر رسالے پر جھکا متعے میں مصروف تھا۔ چمپا نے پھانک کھولا اور سنان سڑک پر آگئی۔

سرل نے بالکل صحیح کہا تھا۔ اس روز کے بعد چمپا احمد کی سرل ایشلے سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔

بس مڈ ہرست کی طرف جانے والی سڑک پر سے گزر رہی تھی۔ ہیزل میز کے جنگل شام کا اندر ہیرا اچھا گیا تھا۔ سڑک کے لیے پ اطیف سے دھند لکھے میں ٹھٹھمار ہے تھے۔ چاروں اور اوپرے درخت کھڑے تھے، انسانوں کی قسمتوں کے پاسانوں کی مانند خاموش اور سب کچھ دیکھتے ہوئے۔

پھر کئی گھنٹے کا سفرے کر کے بس مڈ ہرست کی طرف مڑی۔ چڑھائی پر دور سے سینی ٹوریم کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں جیسے اندر ہیرے میں روشنی کا مینار ہوا کسی ان دیکھے اسکا دٹ نے کسی خطرناک پہاڑ پر سکنل کے لیے الاؤ روشن کر دیا ہو۔ دور سے تاریکی میں روشنیاں اس طرح جھلملارہی تھیں جیسے زندگی روشن ہوتی ہے اور بجھتی ہے، روشن ہوتی ہے اور بجھتی ہے۔

گوتم نیلمہر بس سے اتر کر سینی ٹوریم کی طویل سڑک پر چڑھنے لگا۔ اندر ہیرے کے جنگل میں سے گزرتا ہوا جگہ گاتی ہوئی عمارت کی سیڑھیوں پر پہنچا۔ شفاف گیلریاں عبور کرتا نہ ملا کے کمرے میں داش ہوا۔

مزما اس کو دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھی۔ اس کے آنے سے پہلے وہ دیوار کی طرف منہ کیے لیٹ تھی اور جانے کیا سوچ رہی تھی۔

”لبی بی۔“ گوتم کی آواز یکا یک اس کے حلق میں رندھنی۔ باہر کی شور مچاتی، خود غرض، دکھی دنیا سے علیحدہ وہ اتنے سکون سے کاہے کہ انتظار میں مصروف تھی۔ اس کے دیکھتے ہی وہ انٹھ بیٹھی۔ جلدی جلدی انگلیوں سے اس نے بال درست کیے اور دل میں سخت جھنجھلا کر کوئی آئینہ قریب نہیں جس میں وہ جلدی سے اپنا چہرہ دیکھ لیتی۔

”افوہ۔ تم تو بے حد صحت مند نظر آرہی ہو۔ بالکل سرخا سرخ فرخ آبادی۔“ عیادت کرنے والوں کی طرح یہ بٹاش انداز اختیا عر کرتے ہوئے گوتم نے دل میں خود کو گالیاں دیں۔ ”کیوں گپ مارتے ہو۔ ذرا مراثم پر پھر چارٹ دیکھو تو بتا چلے گا بچہ جی کو۔ آج بھی میرا بخار ایک سو ایک تھا۔ اب تو مہینوں سے چلا آ رہا ہے۔“ اس نے گویا بڑے فخر سے کہا۔

گوتم ڈوبتے دل سے اس کے قریب بینہ گیا مگر وہ خود بہت خوش نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب وہ اس سے حسب معمول اندن کے تازہ ترین اسکنڈلز سنانے کی فرماش کرے گی۔ دوستوں کے جم غفار کی فردا فردا خیریت دریافت کرے گی۔ سبات بات میں جروح کرے گی۔

نرملاؤ، جس کامیں نے کبھی نوٹس نہ لیا تھا، اب تو میری روح میں شامل ہے۔ مگر وہ دو اڑکیوں کو بیک وقت کس طرح چاہ سنتا ہے۔ یہ اس کی سمجھ میں نہ آیا چپا اور یہ لڑکی جس میں چپا والی کوئی خطرناک خصوصیات موجود نہ تھیں، سیدھی سادی، خوش خلق، معصوم لڑکی۔

”چپا جو“ وہ من آف دی ورلڈ بن چکی تھی، ہمیشہ سے مردوں کو اپنی خطرناک کشش سے رجھاتی آئی تھی۔ تجربہ کار تھی اور زمانے کی اونچی پنج دیکھے ہوئے مگر اس کے باوجود بے بس تھیہ اور اس کی توجہ کی منتظر نرملائی، جو بستر مرگ پر پڑی تھی، گھر یلو، نا تجربہ کار، اس کی توجہ کی منتظر وہ چپا کو یکسر بھول جائے گا۔ کس قدر کوشش کے بعد پچھلے پانچ برسوں میں اس نے چپا کو اپنے خیالوں سے دلیں نکالا دے دیا تھا۔ ایہک ملک اور دوستوں کے ایک حلقة میں رہنے کے باوجود اس نے

بڑی کامیابی سے چمپا سے ملنے سے احتراز کیا تھا، مگر اب چمپا کی پکار سے مقابلہ کرنا اس کے بد س میں نہیں تھا۔ یہ پکار میڈرڈ اور روم اور وی آنا بجھتے ہوئے آرکیسٹراز میں سنائی دیتی، بارش کی پھوار میں بازاروں اور طعام خانوں کی چہل میں اطاعت کی لہروں میں ٹیویارک کے شور و شغف میں، ہر جگہ یہ پکار اس کا پیچھا کرتی آ رہی تھی۔ آوازوں کے قلم سے وہ عاجز آگیا تھا۔ شاید سنانا اس کے مقدار میں نہ تھا۔ چمپا آواز تھی نر ملانا۔ چمپا نے اس سے طرح طرح کی باتیں کی تھیں: لکھنو کے باڈشاہ باغ کی سڑکوں پر شبلتے ہوئے، کوئی نگر کے کھیتوں کی پلڈٹریوں پر سے گزرتے، گل فشاں اور سنگھاڑے والی کوٹھی اور پروفیسر برجی کے گھر اور کیلاش ہوشی کے ڈرائیک رومز میں بیٹھے ہوئے، پکنوں میں اودھم مچاتے ہوئے۔ اسے وہ سب باتیں یاد تھیں، وہ سب شامیں، دوپہریں، لمحات۔ یہ سب سرفضا میں موجود رہتا ہے۔ نر ملا خاموش تھی۔ گوتی خاموش تھی۔ بر سات کی دوپہر کا سکون، جب بارش ہو کر کھلی ہو۔ کہر آلو درسوں کے کھیتوں کا سنانا۔ نر ملانے اس سے کبھی شخصی باتیں نہ کی تھیں چمپا کے ہر لفظ ہر انداز کے ذریعے دوسرے انسان سے ایک غیر مرلی (mystic) رشتہ قائم ہو جاتا تھا۔

اسے یاد آیا: مدین گزریں جب وہ پہلی بار لکھنو گیا تھا۔ اس نے سنگھاڑے والی کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھ کر اپنی اس وقت کی محبوبہ شانتا نیلمبر کو خط میں لکھا تھا کہ گو مجھے آفیشل طور پر برداھوے کے لیے یہاں بلا یا گیا ہے مگر میری ہونے والی منگیت نرمل رانی کو اپنی اٹھی سیدھی بھتوں ہی سے فرصت نہیں جو وہ میری طرف توجہ کریں۔ ہاں نر مل میں بڑی شان اور تمکنت تھی۔ اس میں خود پر دگی کا انداز کبھی نہ

آیا، وہ علیحدہ رہی تھی۔ غیر شخصی اور خاموش ۔۔۔ دبی کی طرح بلند اور اتم۔ دبی کی طرح سکون بخشے والی۔ اب مجھے تھوڑا سا سکون بخش دے ۔۔۔ اس نے نرمل اپر جھک کر دل میں کہا اور اس کے ماتھ پر ہاتھ رکھا۔

”گوتم!“

”ہاں بی بی!“

”سریکھا کانیا فلیٹ کسا ہے؟“

اس نے تفصیل سے سریکھا کے مکان کا جغرافیہ سمجھایا۔ ”اب اچھی ہو جاؤ تو آکر خود ہی دیکھ لینا۔“

”ہاں بالکل۔“ نرمل نے بڑی گرم جوشی سے جواب دیا۔

”آج کل ایک نئے بزرگ آئے ہوئے ہیں، طغیان بھاگل پوری۔“

”ہائے کتنے مزے کا نام ہے۔ کریک ہیں؟“

”بہت سخت۔“

”چند را بھی ہے؟“

”ہاں ہاں۔“

”تمہارے نئے نئے دوستوں کا ذکر سن کر اس قدر دل چاہتا ہے کہ ان سے ملوں، خصوصاً میش سنگوی سے۔“

”ہاں۔ میش سنگوی بالکل آفت کا پر کالہ ہے۔“ گوت نے مزید بے معنی انداز میں کہا۔

”اب رات زیادہ آگئی ہے گوتم ماشر۔“ نرمل نے حسب عادت مال اور ہری

ننگر کے لجھے میں اس سے کہا۔

”ہاں۔“ وہ کرسی پر سے اٹھا۔

”ارے رے رے ایک بات تو سنو۔“ فعتاز ملانے بٹاششت سے کہا۔

”اتی زیر دست خبر پوچھنا تو بھول ہی گئی۔“

”کیا گوم نے آہستہ سے پوچھا۔“

کل طاعت بتا رہی تھی کہ چمپا بابی اپنا فائنل امتحان دینے کے بعد کیمبرج سے
لندن آگئی ہیں۔ تم کو معلوم ہے؟

”نہیں۔ گوم نے کہا اور اپنے آپ کو دل میں پھر کئی گالیاں دیں۔“

”اچھا۔“ نرمانے سادگی سے جواب دیا۔ ”میرا خیال تھا شاید طاعت نے بتایا
ہو۔ تم ان سے مل اوضروز بے چاری سے۔“ اس نے اپنا سر تکیے پر رکھ دیا۔

مجھے آج کل اتنی فرصت کہاں ہے زمل کہ میں لوگوں سے سو شل ملاقاتیں کرتا
پھر رون۔ ایچ۔ سی (ایم کمشنر) رات کے دس دس بجے تک کام کرواتے ہیں۔ اس
نے نظریں بچاتے ہوئے جلدی سے کہا۔ ”اچھا بی بی، خدا حافظ!“ وہ تیزی سے
دروازے سے باہر نکل گیا، گویا نرمانے کے سامنے سے جلد از جلد بھاگ جانا چاہتا
ہو۔

نرمانے کا چھٹا حصہ بیدارہ وو چکا تھا، سمجھ گئی کہ گوم نے اس سے جھوٹ
بولا ہے۔ اس کو چمپا بابی کی آمد کی اطلاع ہے اور اس کے چہرے کی بدلتی رنگت کو
دیکھ کر نرمانے کو یہ بھی یقین ہو گیا کہ وہ چمپا بابی سے ضرور ملے گا۔

نرمانے آہستہ سے بیڈ سونچ دبا کر روشنی بجھائی اور پھر دیوار کی طرف منہ کر

کے لیٹ گئی۔

۸۶

گوتم نے فرما سے جھوٹ بولاتھا۔ اس روز ملہ ہرست آنے سے پچھ دری قبل، اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ اسے بڑی جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی۔ اس کی کارکوئی دوست لے گیا تھا اور کنور یا آئینشیشن جا کروہاں سے مدرسٹ کے لیے گرین لائن کی بس پکڑنا تھی۔ خواہ مخواہ کی دری ہوئے جا رہی تھی اور اب یہ فون آگیا تھا۔
اس نے رسیور اٹھایا۔

آواز اس کے کافوں میں پہنچی

”گوتم ہلو ارے بھئی گوتم،“
وہ خاموش رہا۔

”گوتم نیلمہر،“ دوسرے سرے پر چمپانے زور سے کہا۔ ”کیا بات ہے؟ میری آواز کن رہے ہو۔“

”کن رہا ہوں۔“

”فون خراب ہے کیا؟“

”نهیں تو۔“

”شرم کرو۔“ چمپا بڑی نارمل آواز میں کہہ رہی تھی۔ ”ڈوب مر جی
حد ہے۔ میں اتنے برسوں سے یہاں ہوں اور تم کو ایک روز بھی توفیق

نہ ہوئی کہ مجھ سے مل لیتے کیا میں کھا جاتی تم کو؟ ”پھر وہ نہیں وہ چپکا رہا۔

اتنا بڑا اڈپومیرٹ اور حاضر جواب بذلہ سنج آدمی اور اس سے مطلق کوئی جواب نہ بن پڑا اور چمپا نے کہا تھا: ”میں کیبھر ج سے آگئی ہوں اور جون کا رڑکے یہاں ٹھہری ہوں۔ آؤ کسی روز ملنے تعلیم کا زمانہ بالآخر ختم ہو چکا۔ اب مجھ فرستہ ہی فرستہ ہے۔“

”ہاں چمپا، میں ضرور آؤں گا۔“ گتم نے ہر بڑاتے ہوئے جواب دیا تھا۔ ”دراصل _____ وہ تم جانتی ہو لندن کی زندگی کس قدر ہنگامہ خیز ہے اور پھر فارن سروس کی مصروفیات، یہ کوئی لکھنو یونیورسٹی کا زمانہ تھواڑا ہی ہے کہ گھنٹوں بیٹھنے کپ کر رہے ہیں۔ اور پھر میرا کام بھی ایسا ہے کہ مستقل دوسرے پر رہتا ہوں۔ آج ہائی کمشنر کے ساتھ یہاں جا رہا ہوں، کل وہاں جا رہا ہوں۔ جب بھی کشمیر کیس یو۔ این۔ میں جاتا ہے تو کر شنا میں کے ساتھ پندرہ چکر نیو یارک کے لگانے پڑتے ہیں _____ ویسے میں تمہاری خیریت دوستوں سے برادر دریافت کرتا رہا۔“

اس نے کامیابی سے بات ختم کی اور بے انہما نروں ہو کر سگریٹ جلایا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ چمپا دوسرے سرے پر اس کی آواز سن کر اس قدر مسروور ہے جیسے اسے ساری دنیا کی دولت مل گئی ہو، جیسے اسے راج سنگھا سن پر بٹھلا دیا گیا ہو۔

مذہپر سٹس والپسی میں رات کے بارہ نج گئے۔ اپنے فلیٹ پر پہنچ کر اس نے ڈرتے ڈرتے فون اٹھایا اور جون کا رڑکا نمبر ڈائل کیا۔

”ہلو کون ہے؟“ ادھر سے نیل کی سوتی سوتی آواز آئی۔

”مس احمد ہیں؟“

”دنیمیں۔“

”کہاں چلی گئیں؟“ اس نے بوکھلا کر پوچھا۔

”آپ کون صاحب ہیں۔“

”نیلمبر۔“

”ہلو ہو ہو مژنیلمبر مس احمد نے شام کوئی بار آپ کو فون کیا تھا مگر آپ شاید باہر چلے گئے تھے اس وقت تو وہ جوں کے ساتھ کہیں گئی ہوئی ہیں۔“

”اوہ۔“

”آپ نے گینگ کے باقی افراد کے یہاں فون کر لیا؟ کوئی ضرورت ہے؟“ گوتم کی آواز کی سر ایمگی محسوس کر کے نیل نے کہا۔ ”فیروز نریکھا، زرینا، کملہ، طاعت۔ ان سب کے یہاں فون کر دیکھیے۔ شاید مل جائیں۔“

”بہت بہت شکر یہ نیل۔ میرے خیال میں اب رات بہت آنکھیہ ہے، کل دیکھا جائے گا۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ گذناہت۔“ اس کو اپنی حماقت کا احساس ہوا، اس نے ریسیور کھو دیا اور سگرہ میٹ جلا کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

اس رات ٹیز کی ایک لانچ پر بہت سی بڑیوں اور بڑخوں نے ایک پارٹی کی تھی۔ جون کے ساتھ مجبہا وہاں گئی اور رات گئے تک وہ لوگ عرش پر ناچتے رہے۔ کشتی میں چمپا کو بہت سے اجنبی چہرے نظر آئے: کالے گورے انگریز فرانسیسی۔ لندن مجلس کے چند لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ ریلینگ پر جھکے وہ لوگ باتمیں کر رہے تھے۔

ارے یہ پروگریسو ہو گئیں! جون کا رژ کے ساتھ گھومتی ہیں، ناہے پہنچ تو بڑی سخت لگیر تھیں انڈیا میں۔ کسی نے چپکے سے اپنے ساتھی کے کان میں کہا۔

”ممکن ہے پاکستان کی جاسوسی کرتی ہوں۔ کیا بھروسہ؟“

”یہ بھی ٹھیک ہیا اور پھر ہندوستانی مسلمان! ان سے زیادہ دو غلام اور خطرناک کون ہوگا؟“ ایک مردھی ڈاکٹر نے کہا۔

”اور ناہے، پہنچ نہ کہا،“ رضا جو مال اور طاعت کا لازم ہے، اس سے شادی کرنا چاہتی تھیں۔ اس نے گھاس نہیں ڈالی، وہ آج کل کیبھر ج والی روشن کے چکر میں ہے کیونکہ روشن کا باپ کسی منشی کا سکریٹری ہے۔“

”روشن کو بھی رضا نے گھاس نہیں ڈالی کیونکہ اس بے چاری کے باپ کا انتقال ہو گیا ہے۔“

”باپ کا انتقال اصل وجہ نہیں، دراصل اس کا جی بھر گیا۔ بور ہو گیا بچارہ۔“

”میں یہ نقطہ نظر خوب سمجھ ستا ہوں۔ بڑخیوں کے ساتھ یہ کیا مصیبت ہے کہ جہاں ذرا سی دلچسپی ان میں لی اور وہ فوراً شادی پر تیار۔ میں رضا کے نقطہ نظر کو خوب سمجھتا ہوں بھائیو۔ کیونکہ کل میں الیمن سے شادی کرنے جا رہا ہوں۔“

فوراً بذریعہ شروع ہو گیا: ”یہ آندرے کی آزادی کی آخری رات ہے، اس رات کو اچھی طرح منا لو جھائیو۔“ مال نے اسٹول پر چڑھ کر رفت اگلیز آواز میں کہا۔ وہ سب بوٹ سے اتر کر شور مچاتے قریب کے ایک پہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

عرش پر صرف لڑکیاں رہ گئیں اور وہ نوجوان جس نے سب سے پہلے یہ مذکورہ چھیڑا تھا، سیرھیاں اترتے ہوئے مال سے بولا:

”عامر رضا بڑا سمجھدار آدمی ہے۔ ہم کو چاہیے اس سے ٹریننگ لیں۔ آخر یہ لڑکیوں سے شادی کرنے سے صاف کیسے فتح جاتا ہے۔“

”مگر وہ کچھ لیتا آخوند میں کر کری کھائے گا۔“

”ابھی بعد کی بات دیکھی جائے گی، فی الحال تو عیش کر رہا ہے۔“

”مال بھائی۔“

”اور یا ری یہ کزن شاہ رخ سلطانہ کون ہیں، تمہاری رشتہ دار ہیں؟“

”آج تک تو میں نے ان کا نام سنائیں تھا، شاید پاکستان میں بھیا صاحب کی کوئی عزیز پیدا ہو گئی ہوں۔“

”جرمن سنتے ہوتے آئے تھے، یہ پاکستان کزن کی قسم آج ہی معلوم ہوئی۔“

”در اصل یہ نوجوان خاتون کسی وزیر کی بھتیجی ہیں۔“

”اوہ آئی سی۔“

”آوازیں ڈوپتیہ چلی گئیں۔ کشتنی آگے بڑھ گئی۔ چھپا اتر کر کنارے پر واپس آگئی اور قلوپڑھ کی سوئی کے نیچے آن کر بیٹھ گئی۔ سامنے دریا بہہ رہا تھا۔“

اے معلوم نہیں تھا کہ چند روز قبل عامر رضا رات بھر نہیں اسی جگہ پر بیٹھے رہے تھے۔ اس رات بھی پورنماشی کا چاند دریا کی لہروں پر بہہ رہا تھا اور عامر رضا کو بے حد ڈر لگا تھا: اپنے آپ سے دنیا کے حس سے مستقبل سے۔ ان کے سامنے کوئی خطرات نہیں تھے، کوئی مسائل _____ صرف ان کے ذاتی غرور کا مسئلہ تھا مگر اس کا تعلق پچالو جی سے تھا اقتضادیات سے نہیں۔ قلوپڑہ کی کوئی کے سامنے میں بیٹھے بیٹھے ان کو ان اڑکوں کا خیال آیا تھا جو تلاش معاش میں سرگردان تھے اور اڑکوں کا جن کو عامر رضا نے چھوڑ دیا۔ روپیہ اصل چیز ہے۔ روپیہ اور عزت اور ایک کوئی اپنی ذاتی۔ ساٹھ ہزار کی مایت کی۔ ہاؤ سنک سوسائٹی ڈرگ روڈ، کراچی میں۔ ایک امریکن کار۔ فریجذیر ریڈ یوگرامی زندگی کی اصل حقیقت، اتم حقیقت صرف یہ چیزیں ہیں۔ زندہ باد زندگی۔ مجھے سے سے کوئی شکایت نہیں۔ صحیح ہوتے سیڑھیوں سے اٹھ کر وہ کار کی طرف چلے گئے۔ دوسرے روز وہ چھٹی لے کر شادی کرنے لکھنوجا رہے تھے۔

۸۸

”میں ایک کتاب لکھنے والا ہوں جس کا نام ہو گا، پورٹریٹ آف دی آرٹس ایزاے ڈون ٹروان“، مال نے منہ لٹکا کر کہا۔

”کیوں، کیا ہوا؟“ طاعت نے ہمدردی سے پوچھا۔

”بس یونہی _____ اب جیس جو اسکس اور ڈلن طامس کے بعد۔“

”کل ڈلن طامس نے بل کے یہاں بڑے مزے کی بتیں کیس۔ ترنگ میں تھے مولانا۔“ شنکر نے مرکر کہا۔

”اجی وہ تو تھے۔ آپ کس ترنگ میں ہیں آج کل؟“ گلشن آہوجہ نے مال سے پوچھا۔ ”یہ کیا پڑھ رہے ہو۔“

”کچھ نہیں۔ یا رخط آیا ہے گھر سے۔ یعنی لکھنوسے۔“
”کیا خبریں ہیں؟“ طاعت نے پوچھا۔

وہ سب سریکھا کے وسیع ڈرائیور میں فرش پر ٹانکیں پھیلائے بیٹھے تھے جس کا بڑا دروازہ باغ میں کھلتا تھا۔ بہار کا روشن دن تھا۔ سریکھا دلیز کے پاس بیٹھی مشین پر لہنگے کی آڑھی گوت سی رہی تھی۔ طاعت اور فیروز باور پچی خانے میں کھانا پکانے میں مصروف تھیں۔ ہری شنکر بھی ان دنوں ہو ہیں موجود تھا جو اشتنشن سے آیا ہوا تھا اور قاہرہ جا رہا تھا۔ ”یہ ہری شنکر اور گوتم کے مزے ہیں۔ بالکل ابن بطوطة بنے ہوئے ہیں۔ آج کل، صح صبح گوتم کا فون آیا تھا پھر ماسکو جا رہا ہے۔“ گلشن نے اظہار خیال کیا۔

”گوتم تو ہیون سانگ بھی یہ۔ مال نے کہا۔“ اکثر چین سے آیا کرتا ہے۔“
باغ میں چند راما تھر نے ایک اور گیت شروع کر دیا۔ ان سب کی پرانی دوست چندر را جو نیو یارک سے دلی جاتے ہوئے زرینہ کے یہاں لندن میں ٹھہر گئی تھی، بہت اچھا گاتی تھی۔ ڈرائیور میں کے دوسرے سرے پر طغیان صاحب سریکھا کے شوہر گلشن آہوجہ کے ساتھ مصروف گفتگو تھے۔

بڑا خوشگوار اور پسکون اتوار کا دن تھا۔ باغوں میں پھولوں کا سیاہب آیا ہوا

تھا۔ صحیح جب چمپا جون کا رٹ کے گھر سے سیکھا کے بیہاں آنے کے لیے بس میں سوار ہوئی تھی تو بس کا بوڑھا کند کڑا اسے دیکھ کر خوش دلی سے مسکرا یا تھا و راس نے اپنی ٹوپی چھوتے ہوئے کہا تھا: ”ماں ڈیر، تم بے حد خوبصورت لگ رہی ہو۔ تمہارے بواۓ فرینڈ تمہیں دیکھ کر بہت مسرور ہو گا۔ خوب خوشی سے اتوار مناؤ۔ دنیا بڑی مہربان تھی اور خوشگوار کون کہتا ہے کہ دنیا غم خانہ ہے اور فلانا ہے اور ڈھرم کانا ہے۔ دنیا تو بے حد آرام دہ حسین جگہ ہے۔

وہ بے حد خوش تھی کل اس نے گوتم س فون پر باتیں کی تھیں۔ اتنے برسوں بعد آج اس کی آواز سنی تھی۔

وہ سریکھا کہ بیہاں پہنچی، بیہاں محفل جمی تھی، وہ بے حد صرفت کے ساتھ سب سے باتیں کرتی رہی۔

”رات کی پارٹی میں بوٹ پر بڑا چنڈ و خانہ رہا۔“ مال نے اس سے کہا۔
”آپ کے بے سک گھر پہنچ گئی تھیں؟“

”ہم جب پہنچے تو ٹرینیں بند ہو چکی تھیں۔ اسٹرینڈ سے گھر تک پیدل آئے۔“
”کیا خبریں ہیں بھائی۔ کس کا خط ہے؟“ طاعت نے باور پھی خانے سے سر نکال کر دوبارہ پوچھا۔

”اپی کا۔“ مال نے جواب دیا۔

”میاں ہری شنکر اے بھائی ہری شنکر ہوت،“ طاعت نے باور پھی خانے میں آواز دی ہری شنکر، جو باغ کے دروازے میں کھڑا تھا، پٹ کر اندر آیا۔ ”لو یہ گرم گرم پوریاں۔ چمپا باجی کدھر ہیں۔ یہ پلیٹ ان کو دے آؤ۔“

وہی گلفشاں کا گھر یلو ما حول یہاں بھی موجود تھا۔ گھر۔ جو اسے کبھی میر نہیں ہو گا۔ چمپا کو ایک در تپے کی نشست میں بیٹھے بیٹھے ایک پھر یہی سی آئی۔

ہری شنگر نے پلیٹ ہاتھ میں لے کر کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ چمپا دوسرا سرے پر در تپے میں بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ سب یاد آتا تھا۔ نگار خانوں کی زندگی۔ فرن کے پتے۔ در تپے میں جھا نکتا ہوا پیرس کا مدمم سورج، یونیورسیٹری آمدے میں رکھی ہوئی جدید وضع کی آرام کر سیاں، دھاری دار سن شیڈ، ایک کابل الوجود ذہنی زندگی جس میں فلسفے تھے اور نیا فرانسیسی ادب، بڑے سائز کے سکھی کے ریکارڈ، سالزبرگ یک مویقی کے تھپوار، کیمبرج کے کواڈرینگل اور جانے کیا کیا۔ اسی قسم کی چیزوں جن کی ایک علیحدہ دنیا نیویارک کے گرینچ و پلیٹ اپریس کے باعث میں ساحل اور یہاں اندن کے چیلسو اور سینٹ جانزوڈ میں آبا دھی۔ اس دنیا کے بائیوں کے یہاں بڑے گھرے جذباتی تجربے تھے اور اور اک اور ماورائی قسم کی گفتگو۔ چمپا با جی تم تو بہت جلد ایک دوسرا سرے پر پہنچ گیکیں۔ پتا نہیں اب تم کھل کر منسق بھی ہو یا نہیں۔ اندر وہ تو ازن تم نے قائم رکھا یا نہیں؛ جس کی تم کو ہمیشہ بڑی تلاش تھی۔ اب سریکھا، طاعت غیر وزان لڑکیوں ہی کو دیکھ لو۔ کیسی سمجھدار ہیں۔ ایک سے ایک۔ لڑکیوں کا معاملہ دراصل بڑا بے ڈھب ہوتا ہے۔ ایک دفعہ میں نیا پار لگ گئی تو لگ گئی ورنہ پڑا ہوا۔ ہم تو صاحب یہ جانتے ہیں۔ — ”چمپا با جی، لوپوریاں کھاؤ“، اس نے با آواز باند کہا۔

چمپا کے قریب جا کر وہ گھنٹوں کے بل بیٹھ گیا، جس طرح سنگھائرے والی کوٹھی کے لان پر وہ اس کی کرسی کے قریب بیٹھا کرتا تھا۔

”ان سب کو کیا ہوگ یا۔ سب چپ ہو گئے ایک دم۔“ طغیان صاحب نے
باٹیں کرتے رک کر گلشن سے سرگوشی میں پوچھا۔

”ان سب پر خیالات سوار ہیں۔“ گلشن نے لاپرواٹی سے جواب دیا۔

”بڑا پر سکون سے ہے۔“ طغیان صاحب نے کہا۔ ”سریکھادیوی کپڑے سینا
بھی جانتی ہیں۔ مجھے گیان نہتھا۔ مال جی پوریاں کھار ہے ہیں۔ چند رادیوی
سچلوواری میں مرغیاں چراتی ہیں۔ طاعت جی چھلکیاں تل رہی ہیں، یہ تو بالکل گرو دیو
یگور کے ناؤں جیسا ما حول ہے۔ پر سکون۔ شاعر انندھر۔“

”اجی دیکھئے تھے یگور کے ناؤں۔“ گلشن نے چڑھ کر کہا۔ ”طاعت تم نے ساری
پوریاں جلا دیں اٹھا کر۔ چا بجھواو۔“

طغیان صاحب پھر مراثبے میں چلے گئے۔

”ہلو۔ ہری شنکر۔“ چمپا نے اخبار پڑھتے پڑھتے سر اٹھا کر کہا۔ ”کیا بات
ہے۔“

اب پوچھتی ہیں کیا بات ہے۔ قسم خدا کی ان کی وحامتی کی حد نہیں۔ ”کچھ
بھی تو نہیں چمپا باجی۔ چا پیٹس گی۔“

”بنادو۔“

اس نے پیالی اٹالی۔ چچپے نیچے گر گیا۔

ہم ایک دھرے کی زندگیوں میں گھسے زندہ ہیں اور مستقل ایک دھرے کو
مارتے جلاتے رہتے ہیں۔ ”چمپا باجی۔“ ہری شنکر نے کہا۔ ”تم ہم سب میں
گریث ہو۔ کیونکہ تم میں محبت کی اتحاد بے بناء امہیت نموجوں ہے۔“ اس نے دھلائی

آہستہ سے کہا۔ ”سنو یو این۔ میں ایک بڑی اچھی جگہ لگلی ہے، اندیا کے کوئے میں۔ اس کے لیے کروں کوشش تمہارے لیے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا میں عمر بھرا اسی طرح ماری ماری پھروں گی؟“

”اس کے علاوہ اور کتنا بھی کیا ہے تمہیں۔“ ہری شنکر نے کہا۔ پھر معاً سے اپنی اس فاش غلطی کا حساس ہوا۔ اس نے کسی چھوٹ موٹی ایسٹ کے بجائے پورا پہاڑ لڑھ کا دیا تھا، مگر یہ تو بڑی بہادر فرش دل آدمی ہیں۔ اس کا کیا برآمانیں گی۔

”میرا مطلب ہے یو اس نے ہڑ بڑا کربات بنائی۔“ کہتم میں اتنی خود اعتادی ہے۔ تم اوروں کی طرح تھوڑا ہی ہو کہ کہیں چو لہا ہندیا لے کر پینچہ جاؤ۔ ”اس نے باور پھی خانے میں گھسی لڑکیوں کی طرح دیکھ کر کہا۔ ابھی میں تو کہتا ہوں، تم تو ایورسٹ تک مزے سے چڑھ جاؤ گی دندوانی ہوئی۔ تم بڑی گریبیت ہو چمپا بابجی،“ اب اس کی آواز میں رفت آگئی اسے چمپا پر یکخت بے حد ترس آ رہا تھا۔

وہ خاموش پیٹھی باغ کو دیکھا کی۔

کمرے کے دوسرا سرے پر اب باقی پھر زور سے شروع ہو چکی تھیں۔ چمپا کو یکخت ایسا لگا جیسے خاتمه اب بالآخر آن پہنچا۔ کمرہ بڑے زور سے ناچنے لگا۔ باغ میں گھومتی چندر را اسے قندیل کی طرح چکر کاٹتی نظر آئی۔ کمرے میں بیٹھے لوگ کئے پتیلوں کی طرح عجیب عجیب آوازیں نکال رہے تھے۔ طفیان صاحب اسے ایک بہت عظیم اجنب نظر آئے جو یونچ سروں میں قائم قائم کر رہی

تھی۔ میں دوائی ہو جاؤں گی۔ اس نے آہستہ سے کہا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

ہری شنکر نے اس کی آنکھوں میں آنسو پہلے بھی نہ دیکھے تھے۔

”چمپا باجی۔“ اس نے کہا۔ ”محبت کو خدا را جذباتیت میں تبدیل نہ کرو۔ تو ازن ‘ضبط’ تناسب کلاسیک گریک آئینڈیلز اصل چیز ہیں۔ یعنی کہ۔“

”کیا معماروں کی سی باتیں کرتے ہو۔“ چمپا کو بے اختیار نہیں آگئی۔ ”میں محبت کر رہی ہوں یا کوئی عمارت کا نقشہ تیار کرنے میں مصروف ہوں۔“

”چمپا باجی۔“ ہری شنکر نے اسی طرح احتجاجا کہا۔ ”تمہارے خیالات تھک ہیں۔ ہمیشہ تھے۔ تمہارے جذبات میں واگز کابو جھہ ہے۔ پہلے بھی تھا اب زیادہ ہو گیا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ تم اپنی روح کی پیورٹی کو تباہ کیے ڈال رہی ہو۔ دس سال گزر گئے مگر تم بالکل نہ بد لیں۔“

جون اور اوجیت پارٹی کی تاریخ لے کر اندر آئے اور مال کی طرف چلے گئے۔

”ہری شنکر۔“ چمپا نے جھک کر کہا۔ ”مجھ پر ترس نہ کھاؤ مجھے شکست کا احساس آج تک نہیں ہوا، میں تو یہ جاننا چاہتی ہوں کہ شکست کیسی ہوتی ہے۔“ ڈائینگ نیبل پر سے طفیان صاحب کی آواز باند ہوئی۔ ”ہم سب سائے ہیں

سائے۔“وہ گلشن سے کہہ رہے تھے۔

”جی ہاں درست ہے۔“ گلشن نے بور ہو کر سگریٹ جلا دیا اور چمپا کی طرف بے دھیانی سے دیکھنے لگا۔

”کیونٹوں نے مارکس کوتباہ کر دیا۔“ طغیان صاحب نے جو ان کا رڑ پر نظر ڈال کر دوسرا موضوع شروع کر دیا۔

موصوف بڑے زبردست سو شلسٹ تھے۔ صوفی ازم ان کی سائیڈ لائن تھی۔ انہوں نے پہنڈی میں بہت سے ناول لکھ ڈالے تھے۔ اب انگریزی میں لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ ان کا پورا نام رائے ہرنس رائے طغیان بھاگپوری تھا۔ بہار کے رہنے والے تھے۔

”میرے حضرت نے مجھ سے کہا،“ انہوں نے کہنا شروع کیا۔

ان کے ایک مسلمان گروہ ہیں جو سری گنگہ میں رہتے ہیں۔ ”ہری شنگر نے چکے سے چمپا کو بتلا دیا۔

”میرے حضرت نے مجھ سے کہا: بچ تو روں جا۔“

”اور ان ملعون مخدوں کو سچی سو شلزم کی مشعل ہدایت دھلا کر راہ راست پر لा۔

”طاعت نے باور پھی خانے میں سے اقبر دیا۔

”انہوں نے تو بھی اپنے حضرت کو بھیا چھا سدھالیا۔“ چند رانے باغ کے دروازے میں آ کر کہا۔

طغیان صاحب نے چونک کرا سے دیکھا۔

”یہ کون مہیلا ہیں؟“ انہوں نے سریکھا سے دریافت کیا۔

”یہ مہیلا بھی بڑے پروگریسو چاروں کی مالک ہیں، لیکن ڈالر مانے کی اولیش سے نیویارک کی آکاش و آنی سے ہندی میں سما چار سنایا کرتی ہیں، ان کا دماغ بھی ہی یہاں پہنچا ہے۔“ مال نے جواب دیا۔

”آپ بہار کے رہنے والے ہیں؟“ چندران نے شکفتگی سے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ طغیان صاحب نے خفا ہو کر کہا۔ ”ہوں تو کہی پھر“

”ارے۔ میرا مطلب تھا۔ تب تو آپ شاید گوم نیلمبر کو جاتے ہوں۔ اس نے پٹنہ یونیورسٹی میں پڑھا ہے۔“

”جانتا ہوں _____ بیوقوف چھو کر اے۔“ طغیان صاحب نے مختصر اکھا۔ ”ہاں تو میں کہہ راہ تھا کہ ہم سب سائے ہیں۔ میں بھی، گوم نیلمبر بھی تمہارا _____ میرے حضرت نے کہا تھا۔“

”مال _____ طاعت پتیلیاں چو لہے سے اتار کر جھاؤن سے ہاتھ پوچھتی باہر آئی۔“ اپی نے کیا لکھا ہے خط میں۔“

”ارے ہاں _____“ مال نے اوjetت سے باتیں کرتے ہوئے مرکر کہا۔ ”پچھنیں۔ بھیا صاحب کی شادی ہو گئی۔“

”ہاں میں _____ وہ کب؟“ کورس ہوا۔ ہر ایک اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔

”اتنی بڑی بات ہو گئی اور تم گپ چپ کالڈو بنے بیٹھے ہو۔“ طاعت نے کمر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”ایسی کون بڑی بات ہو گئی بھئی۔ ہم سب سائے ہیں۔“ مال نے اطمینان سے کہا۔ ”ابھی تم نے سنائے طغیان صاحب کے حضرات کیا کہتے ہیں۔“

”تم بکواس مت کرو۔“ ہری شنگر نے چھلانگ کر کمرے کے وسط میں آتے ہوئے کہا۔ ”تفصیل سے واقعہ بتاؤ۔ کیا لکھا ہے اپی نے۔“

”یار۔ ہوا یہ کہ۔“

”شروع سے شروع کرو۔“ طاعت نے حکم دیا۔

”خوب نمک مرچ لگا کر سناو اور نہ لڑکیوں کو چین نہیں آئے گا۔“ گلشن نے حسب معول اپنے سوتے سوتے انداز میں کہا۔ سب مال کے چاروں اور آن بیٹھے اور کان کھڑے کر کے قصہ سننے لگے۔ مال نے ماہر فن داستان گو کی طرح سگریت مٹھی میں لے کر لمبا کش لگایا۔ چمپا درستچے میں بیٹھی ان سب کو دیکھتی رہی۔

”بھائیو اور بہنو۔ تم کو معلوم ہی ہے۔ کہ بھیا صاحب بے چارے بڑے زبردست سو شل کلامبر۔“

”یہ کیسے لکھنے میں تو نہیں تھے۔“ غیر وزنے اعتراض کیا۔

”تم اپنما لکھنے لیے پھرتی ہو بات بے بات۔ بھیا صاحب اور ان کے وہاں کی ولیوں۔“

”پھر سیاست شروع ہوئی۔“ گلشن نے کہا۔ ”یہ تم تو اپنے بھیا جی کا قصہ سنانے لگے تھے۔“

”سنانے لگے تھے نہیں یا سنانے والے تھے۔ تم پنجابی اور بدآکر غلط اردو بولتے ہو۔“ ہری شنگر نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔

”ارے جا۔ یو۔ پی کے بنئے۔“ گلشن نے جواب دیا۔

”لاو۔ بھئی۔ اپی کا خط دو۔ ہم باہر جا کر خود پڑھ لیں۔“ غیر وزنے نگف آکر

کہا۔ ”تم لوگوں کو لوٹ دیاں ہار پارئی کبھی سنجیدہ ہونا جاتی ہی نہیں ہونہے۔“

”ہاں تو ہوا یہ کہ بھیا صاحب ایک سو شل کلائبر — جب روشن کراچی والپس گئی یہ اس سے بہت پہلے ہی ان کو معلوم ہو چکا تھا کہ بے چاری کے والد کا انقال ہو گیا۔ اب شاہ رخ سلطانہ منظر پر آئیں مگر کراچی میں حکومت تبدیل ہو گئی۔“

” ایں اس کا کیا مطلب جو بات کی ہے تکی۔ ” ہری شنگر نے کہا۔

”اے۔ اس کا مطلب یہ کہ کزان شاہ رخ کے ابا مسٹر نہیں رہے۔“

۲۹۱

”اب لکھنو سے ہماری والدہ یعنی بھیا صاحب کی چھپ کے خط پر خط آنے شروع ہوئے کہیرا چل چلا وہ کا وقت ہے۔ میاں تم گھر بسالو۔ ایک ایک کر کے گلفشاں سے پنجھی اڑ گئے، کم از کم تم یہاں آ کر بہو کا دوالہی لے جاؤ۔ طاعت ذرا چا عہنا نا۔“

”اور بل چھوڑنے والا ہے اسے۔“

”زیادہ تر انخلکچوں لوگ اپنی بیویوں کو چھوڑ دیتے ہیں اگر چہ وہ خود بھی انخلکچوں ہوتی ہیں۔“ مال نے لاپرواٹی سے کہا۔ ”تم لوگ تو یار لندن کی ایک

انہیکو پیدا کا مرتب کر ڈالو۔ فرنس کے لیے آسانی رہے گی۔“

”روشن کی بھی سنا ہے شادی ہو گئی کسی بڑے افسر سے۔“ طاعت نے کہا۔

”مبارک ہو.....“ مال نے جواب دیا۔

”بے چاری چلی گئی واپس اپنے خول میں“ غیر و زیولی۔“ بیکار اس نے یہ سارا جھنجھٹ کیا۔“

”یہ لڑ کیا عشق کیوں اور کیسے کرتی ہیں آج تک میرے پلے نہ پڑا۔“ طاعت نے کہا۔

”ارے یا رخدا کے لیے آہستہ بولو.....“ وہ ٹہل رہی ہیں سامنے باغ میں۔ مال نے کہا۔

”ہماری نگریا میں آئے بسو بنواری۔“ طاعت لفڑوں کی طرح گانا شروع کیا۔ لڑ کیاں اٹھ کر ایک کونے میں چلی گئیں۔

”آج کل ان کا کیا سلسلہ ہے۔“ سریکھا نے چپکے سے پوچھا۔

”میاں۔ میاں۔“ مال نے دور سے چڑا۔

”یاروہ سرل ایشلے تو کل میں نے دیکھا شنیلا مکرجی کے یہاں ڈٹا ہوا تھا۔ کیا وہ بھی سکون دل کی خاطر.....“ طاعت نے پوچھا۔

”واہ عین میں معلوم ہو رہا ہے مسلم اسکول لکھنؤ کی سینئنڈ آہیر میں پڑھنے والی لڑ کیاں گفتگو کر رہی ہیں۔“ مال نے کہا۔ سریکھا اور طاعت اور نزگیش سنی ان سنی کر کے کھس پھس کرتی رہیں۔

”یہ لوگ کتنی ہی انلاطون کیوں نہ بن جائیں گی وہی کشمیری محلہ گرانز

اسکول لکھنؤ۔ ”مال نے دوبارہ کہا۔

”سوال یہ ہے۔“ فیروز نے فرش پر جیختے ہوئے کہا۔ ”کمڈل کلاس اڑکیاں آتی رومان پرست کیوں ہوتی تھیں۔“

”ہوتی تھیں کیا معنی۔ اب بھی ہیں۔ تم تو اس طرح کہہ رہی ہو گویا یہ پرست ریوولیشن پیریٹ ہے اور ماضی پر خالص مورخانہ انداز سے بحث کر رہے ہیں ہم“ طاعت نے کہا۔

”مگر صاحب۔ روشن میں ممکنات تھیں، وہ برلن والا قصہ یاد ہے، وہ تو جب ہم لوگ بخارست جا رہے تھے تو پہنچی ہمارے ساتھ ساتھ آشٹریا کی مرحد تک پہنچ گئی، وہ نکل چلتی ہمارے ساتھ مگر۔“ فیروز بولی۔

”مگر کیا یا۔ ڈرپوک تھی۔ پچانوے نیصدی بورڑواڑکیوں کی طرح۔ بس رومنس دماغ میں نہ صحتا تھا۔ وے رومنس۔ وے بورڑوافلفہ۔ لا ہول والا۔ مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں۔ یعنی عشق بھی کیا تو کس سے۔۔۔ بھیا صاحب جیسے بوگس انسان سے۔“ طاعت نے کہا۔

”اب وہ اس بڑے آدمی، کی بیوی بن کر جنم خانہ کی پارٹیوں میں زندگی گزارے گی، کیا ڈاؤن فال ہوا ہے۔“ سریکھا نے کہا۔

”تمہارا تینیل اس وقت زوروں پر ہے۔“ طاعت نے کہا۔

”میرے تینیل نے ہم سب کو عجیب عجیب حالتوں میں دیکھا ہے۔“ سریکھا نے اداسی سے کہا۔ ”میں نے دیکھا ہے کہ چمپا بیگم ایک تھنکی ہاری پروفسر نی کی طرح ہندوستان کے کسی کالج میں اڑکیوں کوہ شری پڑھا رہی ہیں۔ بہت جلد وہ

وقت بھی آنے والا ہے جب میری شہرت ختم ہو جائے گی۔ رقص کے متعلق کتابوں میں ایک آدھ پیرا گراف میرے سارے وجود کا ماحصل رہ جائے گا۔ شرمنقتنی سر یکھادیوی جود دس سال قبل بہت عظیم رقصہ تھیں۔ طاعت کو لوگ بھول جائیں گے۔ کمال گنمام ہو جائے گی۔ اس وقت ہم میں اور روشن میں کیا فرق رہے گا؟“

”ایسی ڈے کیٹھنٹ باتیں مت کرو۔“ طاعت نے ڈانٹا۔

”میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی۔“ سر یکھانے ذرا شرمذہ ہو کر کہا۔

”میں یہی سوچ رہا تھا۔“ کمرے کے دوسرا سرے پر ہی ہری شنکر نے مال سے کہا۔ ”لڑکیوں کا معاملہ بڑا بے ڈھب ہے۔ ذرا ان کو دیکھو تو۔ کیس مگن ہیں اس سے۔ ایک نے نیا بلا کوزی لیا ہے تو خوشی سے پھولی نہیں ساتی۔ دوسرا ادھر ادھر کی بے ضرر گیمیں ہا نک کر ہی مسرور ہے، مگر دراصل انہیں کتنے عظیم دکھاٹھانے پڑتے ہیں، یہ ایک بچے کی تخلیق کے ذریعے ساری کائنات کی ڈیے داری سنجھاتی ہیں۔ بے چاریاں اپنے آپ کو ایک دوسرا سے انسان کے حوالے کر دیتی ہیں۔ ان کا دل رکھنا کتنی آسان بات ہے۔ کتنی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے خوش ہو جاتی ہیں یہ لوگ۔ ان کو تو دیوی بنا کر رکھنا چاہیے۔ ان کا دل دکھانا سب سے بڑا اگناہ ہے۔“

”طاعت، ہری شنکر کی طرف آئی۔ ہری شنکر پھر مبالغے سے کام لے رہا تھا، یہی مبالغہ طاعت کو ہر طرف نظر آتا تھا۔ گوتم نیلمبر کے کردار میں چمپا میں، اپی میں، یہ لوگ گویا انسانوں کی انوار جذ تصاویر تھیں۔ اسی مارے فوکس سے کبھی کبھی باہر ہو جاتی تھیں۔“

”میاں، کیا بے بنکی ہا نک رہے ہو۔“ اس نے سمجھیدگی سے کہا۔ ”یہ بھرے کسی

اور کو دینا۔ کہاں کی دیوی اور کیسے دیوتا۔ یہ شاعری رکھو چھپڑ پر۔ معاشی آزادی اصل چیز ہے۔“

”یہی بات تو تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔ معاشی آزادی اصل چیز ہوتی تو چھپا بیگم اس سے باغ میں چکرنے کا ٹرکی ہوتی۔“ شنکر نے جواب دیا۔

”اوھ۔ ان کا تو دماغ خراب ہے۔“ طاعت نے کہا۔

”اے لیجھے۔ اتنی قابلِ لڑکی۔ کیمپرچ میں سب پر دھاک بٹھا کر آ رہی ہے، جس سے ملتی ہے وہی فلور ہو جاتا ہے۔ آپ ان کا دماغ خراب بتائے دے رہی ہیں۔“

”کیوں بھی کیونک لوگ عشق نہیں کرتے؟“ طفیان صاحب نے نہایت بھوٹے پن سے گلشن سے سوال کیا۔

”لا حول والقوۃ۔“ طاعت جل کرو اپس چلی گئی۔

”لی لی۔“ ہری شنکر نے اس سے بڑے پیار سے کہا، وہ نرملائی کی قائم مقام تھی۔ ”ابھی تم اور پڑو۔ اب تم لگے ہاتھوپی۔ اسچ۔ ڈی کرہی ڈالو۔ کون مردود کہتا ہے کہ معاشی آزادی ضروری نہیں۔ اپنا دل چھوٹا نہ کرو۔“ وہ یک لخت گھبرا گیا کہ اس نے طاعت کو خفا کر دیا ہے۔

”لی۔ اسچ۔ ڈی کر کے بڑے لذوں جائیں گے۔ تین سو کی ملازمت، صرف تین سو کی۔“ اس نے عین ہری شنکر کی ٹاک کے آگے تین انگلیاں لہرا کیں، وہ بالکل سننے کی موڑ میں نہیں تھی۔ دراصل بھیا صاحب کی شادی کی خبر نے اس کی طبیعت مکدر کر دی تھی۔ اسے اس وقت پہلی بار احساس ہوا تھا کہ شادی کی کتنی

زیر دست مارکیٹ ہے جس میں بڑکیاں، خواہ وہ اعلیٰ تعلیم یا فن ہوں خواہ جاہل جپٹ
برائے فروخت دکان پر رکھی جاتی ہیں۔

”اُرے تو روپیہ ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ نیا ہندوستان ہے۔ ہم سب کو اس
کے لیے کام کرنا ہے کملاؤ کو دیکھو، صولات کو، کسی ٹھانٹھ دار کیروں میں ہیں۔“

چپا نے شہلتے ہوئے ایک مرتبہ کمرے میں جھانکا اور ان سب باتوں میں
مصروف پا کر باغ میں سے گزرتی باہر شرک پر آگئی۔

۸۹

برفباری شدید ہو گئی۔ شنیلا دیبی نے کھڑکیاں بند کر دیں۔
سوامی دیوبیکا نند نے گتنا کا صفحہ الٹ کر مجمع کو دیکھا، یہ وہی کمال اور ہری شنگر
کے انگریز پروفیسر تھے جو تیرہ چودہ سال قبل ایک روز لاما ریز کان لکھنؤ سے
اچانک غائب ہو گئے تھے اور مال اور ہری شنگران کے تعاقب ہیں ہر دوار کی
گھاٹیوں میں مارے مارے پھرے تھے۔ اب یہ زعفرانی کپڑے پہنے، داڑھی
بڑھائے، یورپ اور امریکہ میں پیچھر دیتے پھرتے تھے۔ گوتم نے شنیلا مرجی کے
فیلٹ میں پہنچ کر کھڑکی میں سے جھانکا تو اسے یہ منظر نظر آیا کہ سوامی جی مشرق
پسند انگریز بڑکیوں میں گھرے بیٹھے ہیں، ایک طرف کیرتن ہو رہا ہے۔ شنیلا مکر جی
سب کو کافی پیش کرنے میں مصروف ہیں۔

گوتم اسی صبح کئی ماہ بعد ماسکو سے لوٹا تھا۔ مال نے اس کے توسط سے ہندوستان میں مختلف ملازمتوں کے لیے جو درخواستیں دے رکھی تھیں ان کے جواب میں انڈیا ہاؤس میں گوتم کی میز پر بہت سے لفائے آئے رکھتے تھے۔ وہ ان کھولے بغیر خوشی سے ہڑبڑا کر مال کو سارے میں ڈھونڈتا پھرا۔ سریکھا کے یہاں معلوم ہوا کہ مال اور ہری شنکر اپنے پرانے پروفیسر سے ملنے شنیدا امکر جی کے یہاں گئے ہوئے ہیں مگر وہ لوگ یہاں بھی نہیں تھے۔ گوتم اندر آ کر ایک کونے میں مانیکل کے پاس بیٹھ گیا۔

”ہلو کامریڈ۔ ہوسکو وا سے کب لوٹے۔“ مانیکل نے چکے سے پوچھا۔

”آج صبح۔“

”بھی یہ تمہارے سوامی جی تو بالکل فراڈ معلوم ہوتے ہیں۔“ مانیکل نے کہا۔

”ہوں گے۔ مجھے ان میں وچھپی نہیں ہے۔ تم نے مال کو دیکھا ہے؟“

”نہیں۔“ مانیکل نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ امریکہ ان کو روپیہ دے رہا ہے کہ مذہب کا پرچار کریں اور کانگریس آف کلچرل فریڈم کی طرف سے دورے پر نکلے ہیں۔“

”تم اب تک سرائیل نہیں گئے۔“ گوتم نے دریافت کیا۔

”بس اب جانے ہی والا ہوں۔“

”سب جا رہے ہیں۔“ شنیدا دبی مانیکل کی بات سن کر ان کی طرف آئیں۔

”نومشکار مسٹر نیلو مبر۔“ انہوں نے کہا۔

”نمکار شنیدا دیوی۔“

بہت سے پھول اٹھائے نزگیش کمرے میں داخل ہوئی۔ ”روشنی میں آ کر دیکھا تو یہ سب سرخ نکلے۔ میرا خیال تھا زرد ہوں گے۔“ اس نے سوامی جی کے سامنے پھول رکھ کر کہا۔

”نزگیش.....“ گوتم نے آزردگی سے نیچی آواز میں کہا۔ ”یہ کیا سوانگ رچا رہی ہو؟“

”گوتم..... کلچر کی خاطر..... یہ سب کلچر کی خاطر ہے۔“ اس نے پہنچے ہوئے انداز میں جواب دیا۔
”مال کہاں ہے۔“

”سریکھا کے یہاں دیکھ لیا؟ شاید وہ لوگ مذہب سے نہ لوٹے ہوں۔“
”مذہب سے.....“ گوتم کے ذہن پر ایک موگری سی پڑی۔ ”مگر آج تو تو ارنٹیں ہے۔“

”ہاں، لیکن فرملا کے دوسرے پیچھے ہر دے کا آپریشن ہوا ہے۔ تم کو معلوم نہیں؟ ارے ہاں، تم آج ہی توبابر سے لوٹے ہو۔“

”سب جا رہے ہیں۔ سب اپنے اپنے اسرائیل کی طرف جا رہے ہیں۔“
شنبیلا مکر جی نے آنکھیں نیم واکر کے گوتم سے کہا۔ ”تم لوگوں کی پوری پارٹی ہندوستان والپس جانے والی ہے۔ نزگیش نے آج بتایا مائیکل بھی جا رہا ہے۔ ڈنیس کونیروبلی کی یونیورسٹی میں پروفیسری مل گئی ہے۔“

”شنبیلا دیوی یہ تو دنیا کا قاعدہ ہی ہے۔“ گوتم نے سخت اکتا کر کہا۔ ”لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔“

”یہ تو مجھے معلوم ہے کہ لوگ آتے جاتے رہتے ہیں، بلکہ چلے جاتے ہیں، آتے کبھی نہیں۔“ اب وہ بھی پھر گرو یو گور کا حوالہ دینے والی تھیں۔ گوتم جلدی سے اٹھا۔ ”زرگیں“، اس نے مذکر کہا۔

”مجھے مال کی بڑی سخت تلاش ہے، اس کے نام چند بے حد ضروری خط آئے ہیں۔“

”لبی اسی کینٹھیں میں دیکھ لو۔ یا شاید چوزے کی سرائے میں ہوں وہ سب۔ سوامی جی سے تو ملتے جاؤ۔“

”ارے ہاں۔“ وہ آگے بڑھ کر سوامی جی کے سامنے جھکا اور ان کے پیر چھوئے۔ سوامی۔ دیویکا نند جی سابق ڈاکٹر رچرڈ ہیلمشن۔ نے اسے اشیروادی اور اوکسفرڈ کے لجھے میں اس سے اس کی روح کی خیریت دریافت کی۔

”مجھے تمہارا ہی انتظار تھا کہ تم آ جاؤ تو ایک روز اسٹیون اسپنڈر وغیرہ کو اپنے میہاں بلا کر ایک محفل منعقد کریں۔“ شنیل دیوی نے کہا۔ ”سوامی جی سے میں نے تمہارا بہت ذکر کر رکھا ہے۔“

گوتم دوبارہ جھکا اور سب کو نمسکار کرتا ہوا باہر نکلا۔ وہ اور کوٹ میں منہ چھپا کر تیز تیز قدم رکھتا کارک طرف چل دیا۔ شنیل امکر جی کے فلیٹ میں سے کیرتن کی آوازیں بلند ہوتی رہیں۔

چوزے کی سرائے اس وقت غیر معمولی طور پر سنگان پڑی تھی صرف ایک لڑکی دروازے کی طرف پشت کیے اونچے اسئول پر بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ گوتم ویژس سے پوچھنے کے لیے کاہنر کی طرف بڑھا کہ بی بی سی والے تو ابھی ادھرنیں آئے تھے۔ اسئول والی لڑکی نے مژکرا سے دیکھا، وہ چمپا احمد تھی۔

”ہلو..... تم یہاں موجود ہو۔“ گوتم نے بے ساختہ کیا۔

وہ اپنی جگہ سے اتر کر برادر کے اسئول پر بیٹھ گئی۔ ”تم ہی نے تو کہا تھا کہ دنیا بہت مختصر ہے، ہم کہیں نہ کہیں ضرور ملیں گے دوبارہ۔“

”اب ایسی مختصر بھی نہیں ہے۔“ گوتم نے ذرا براہامان کر کہا۔ ”یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر بات کلفرل سمجھ لیا جائے۔“

”کلفرل تو تم مانتے ہو باتوں کو۔“

”وہ کیسے؟“ گوتم نے پھر مال کی تلاش میں چاروں اور نظریں دوڑا کر پوچھا۔

”میں نے تم سے ایک مرتبہ کہا تھا کہ تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔ بڑی ما بعد الطیعیات بات تھی۔ تم اس کو مجاز کی طرف لے گئے، یہ سب تمہارا قصور ہے۔“ اس نے انگلی اٹھا کر کہا۔

”ما بعد الطیعیات کا ذکر مت کرو۔“ گوتم بے انتہا چڑھ کر بولا۔ ”میں ابھی شنیلا دیوی کے یہاں سوامی دیویکا نند سے مل کر آ رہا ہوں۔ تم نے مال کو تو نہیں دیکھا۔“

”نہیں۔“ چمپا نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا، یہ آدمی پل پل میں کیسے

رنگ بدلتا تھا۔ ابھی تک میں مردوں کو سمجھنے میں پائی۔ ”تم نے مجھے فون کیا تھا اس روز..... جوں کا رڑ کے یہاں۔ یورپ جانے سے پہلے۔“

”ہاں۔ کیا تو تھا۔“ گوتم کو اپنا اس طرح پکڑا جانا بالکل پسند نہ آیا۔ ”کیونکہ تم نے مجھے رنگ کیا تھا کیمبرج سے لوٹ کر.....“

”گوتم، یہ تم کاٹنے کو کیوں دوڑ رہے ہو، بات بے بات۔ تم پہلے تو ایسے نہ تھے، میں تقریباً سات سال بعد تم سے ملی ہوں۔ ذرا تمیز سے پیش آؤ۔“

”چمپا۔“ گوتم نے کہا۔ ”میں اس وقت بے حد پریشان ہوں۔ مال کے کئی ضروری خط ہیں، ممکن ہے اسے دو تین دن کے اندر انٹرویو کے لیے دلی پہنچنا ہو۔ نرملہ کا دوسرا آپریشن ہوا ہے۔ تم چو میں گھنٹے خوابوں میں کھوئی رہتی ہو، باقی کی دنیا ہر سمتے تھارے خوابوں کا ساتھ کس طرح دے سکتی ہے۔“

”ارے۔“ وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ ”چلو مال کو ڈھونڈتے ہیں، مجھے یہ سب معلوم نہ تھا۔“ گوتم نے اسے دیکھا، یہ کسی عجیب لکش عورت تھی۔ وہ سرانے سے باہر نکلے اور سریکھا کے یہاں فون کیا۔ گلشن نے دوسرا سرے سے جواب دیا۔

”مال کا پتا نہیں۔ شاید سرروجر کے یہاں نرملہ کی رپورٹ لینے گیا ہے۔ سریکھا ابھی راڑا سے نہیں لوٹی۔ مال نے کہا تھا کہ وہ سرروجر کے یہاں سے ہمارے گھر ہی آئے گا۔ تم آ جاؤ، میں کانج جا رہا ہوں۔ کنجی ہمسایوں کو دیے جاتا ہوں.....“

”کوئی مدد ہرست گیا؟“ گوتم نے پوچھا۔

”طاعت اور ہری شکر گئے ہیں اگر تم بھی جا رہے ہو تو میرے یہاں سے ایک پارسل لیتے جانا۔ نر ملا کو بھجوانے کے لئے سریکھا نے ڈائیگ نیبل پر رکھ دیا تھا۔ طاعت لے جانا بھول گئی۔“

”اچھا۔ میں ابھی آتا ہوں۔“

گوتم کا رکی طرف لوٹا اور وہ سینٹ جائز ووڈ کی طرف روانہ ہو گئے۔ آشاكے یہاں سے کنجی لے کر وہ سریکھا کے مکان میں داخل ہوئے۔ گلری میں دو بڑے بڑے مجسم رکھتے تھے۔

”اوہو..... ہماری طاعت نے بڑے زوروں سے ٹنکڑا شی شروع کر رکھی ہے۔“

”یہ آشاكے بنائے ہوئے ہیں۔“ چمپا نے فوراً کہا۔
گوتم ٹھٹھکا۔ چمپا، طاعت اور ان سب کو کس قدر ناپسند کرتی تھی۔ اس نے اندازہ لگایا، وہ گارڈن۔ روم میں گئے اور باغ کی طرف بڑا شیشوں والا دروازہ کھولا۔ اب برف پھر مضم کی دھوپ میں روشن تھی۔ ”کتنا آرام دہ گھر ہے سریکھا اور گلشن کا۔“ گوتم نے صوفی پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ باغ کی دیوار کے پرے سے موسیقی باند ہو رہی تھی۔ فضا میں خوش گوار خنکی تھی۔ چمپا نے آتش دان روشن کیا۔ گوتم کمرے کے ساز و سامان پر کامل اور مطمئن انداز سے نظریں دوڑاتا رہا۔ اب چمپا کی موجودگی کی وجہ سے برسوں بعد ایسا معلوم ہوا گویا وہ بہراج میں اپنے گھر پہنچ گیا ہے، یہ بڑا غیر منطقی اور عجیب سا احساس تھا۔

کمرے میں ایک طرف کتابوں کی الماریاں تھیں۔ اقتصادیات، علامہ

اقبال، فیض، کرشن چندر، پھر سریکھا کی کتابیں تھیں۔ موسیقی، بیلے، کربوگرانی۔ سارے میں نہیں آرٹسٹ چیزیں بھی تھیں جو سریکھا اور گلشن نے سارے ہندوستان، عوامی چین اور یورپ میں گھوم کر جمع کی تھیں۔ روس کا یالایکا، چین کے نواور، ہنگری کی گڑیاں، اٹلی اور فرانس کی پینینگز۔

صف معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایک آرٹسٹ اور رقصاء کا کمرہ ہے۔ پیانو پر مار گو فونٹین اور رابرٹ بیلپ میں کی دستخط شدہ تصاویر کھلی تھیں۔ جگہ جگہ بائی اور جنوبی ہند اور سیام کے رقصاؤں کے چھوٹے چھوٹے مجسمے بجے تھے۔ کونے میں سینے کی مشین دھری تھی اور مردگم اور ترکاری کی تو کری، گوتم مسکرا یا، یہ آرٹسٹ کا کمرہ تھا مگر اس میں آرام اور بے تکلفی سے رہا بھی جاتا تھا۔ زندگی کی اسی سادگی اور بے تکلفی کا وہ ہر جگہ متناشی تھا۔

”میں نے یہاں بڑے اچھے لمحے لگانے کے لئے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”یہ بڑے پیارے لوگ ہیں۔ ہیں نا۔“ وہ کہتا رہا۔ ”کروں سے مکینوں کی شخصیت کسی قدر عیاں ہوتی ہے..... ذرا سوچو تو۔“ وہ اٹھ چیڑھا۔ ”جیلی میں کملہ کا اثر اموڈرن فلیٹ دیکھا ہے؟ اس کی آرائش سے معلوم ہوتا ہے کہ مکین شدید انخلکھوں، شدید خوش ذوق اور انہا کی مزاجی حس کی مالک ہے اور ڈائریکٹ۔

اس کے خیالات میں کوئی الجھاؤ نہیں ہے۔ اوسری میں زرینہ کا مکان بھی ایک آرٹسٹ کا مکان ہے لیکن ستراء، خوبصورت اور گھریلو۔ سینٹ جانز ووڈ میں طاعت اور مال کا گھر عین میں گلشاں کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے، وہی ہنگامہ، وہی افراتفری، ہماہمی، مہماںداری۔ حد ہے محروم میں مجلسیں تک تو یہ دونوں کرتے ہیں

یہاں۔

میں نے واشنگٹن میں ہری شنکر کا فلیٹ دیکھا ہے جو بالکل سنگھائرے والی کوٹھی کا ایکٹشنس معلوم ہوتا ہے۔ پھر شنیلا دبی کا کمرہ نشست جہاں ہر چیز شروع سے آخر تک پوز ہی پوز ہے۔“

”تم پوز اور غیر پوز میں فرق کیسے معلوم کر لیتے ہو۔“ چھپا نے اس کی بات کاٹی۔

”نہیں چھپا،“ ہم خود کو اپنے پس منظر سے، کبھی اپنے ظاہر کو اصلاحیت سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ پھر وہ رکا۔ ”مگر کتنی عجیب بات ہے کہ میں نے آج تک تمہارا اصل پس منظر نہیں دیکھا۔ چوزے کی سراکی اسئول پڑیٹھی تم بالکل معلوم نہیں ہوتا تھا کہ بنارس سے آئی ہو۔ عجیب بات ہے تا۔“

”اچھی بات ہے یا بدی؟“

”پتا نہیں، مگر ہمیں اپنے پس منظر سے وفادار رہنا چاہیے جو شاید تم نہیں رہیں۔“

”یہ غلط ہے۔“ چھپا نے سرخ ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں بنارس والے پس جانا چاہتی ہوں مگر مجھے کوئی لے جانے والا نہیں ملتا۔“

وہ خاموش ہو گیا۔

”تم کو معلوم ہے،“ گوتم نے کہا ”پچھلے سال میں نے تم کو امریکہ سے خط لکھا تھا، میں ایک بے حد خوبصورت علاقے میں گیا ہوا تھا، وہاں ایک دیوار کے جنگل میں بیٹھ کر میں نے تم کو خط لکھا۔ ان دنوں میں جانے کیوں بے حد خوش تھا۔ مجھے

یہ وقت فوتا اپنے خوش ہوتے رہنے کی وجہ آج تک سمجھ میں نہ آئی۔ بہر حال میں نے تم کو لکھا تھا خط ایک عدد مگر شاید وہ تم کو ملا ہی نہیں۔“

”مجھے آج تک کوئی خط نہیں ملا۔“

”اب تم پھر رومانٹک ہو سیں!“

برادر کے مکان میں آشنا کے یہاں کسی نے اوپھی آواز میں گانا شروع کر دیا۔

”گوتم کہیں پن پر مت اترو“ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”تمہارے بنارس واپس جانے کے راستے میں کون چیز حائل ہے۔ اور تم روتنی کیوں ہو بھائی۔ زندگی میں آنسوؤں کی کمی تو نہیں کہ تم یونہی روما شروع کر دو بیٹھے بٹھائے۔ ہنسا کرو۔ مثال کے طور پر بھیا صاحب کولو۔ آج میں نے ان کو سلفر جز سے نکلتے دیکھا اپنی بیگم کے ساتھ۔ اس قدر خوش تھے کہ کیا بتاؤ۔“ کھلے جا رہے تھے۔ بڑے تپاک سے انہوں نے میرا تعارف اپنی بی بی سے کروایا۔ میں نے بھی بہت بنشش محسوس کیا۔ دماغی طور پر صحت مندوگ ایسے ہوتے ہیں جیسے بھیا صاحب ہیں۔“

”بکواس مت کرو۔“ چمپا نے کہا اور آتش دان کے کوئی ٹھیک کرنے میں مصروف ہو گئی۔

گانے کی آوازیں اب قریب تر ہو گئیں۔ اوجیت اور ترونا کی آواز سب میں اوپھی تھی۔ چمپا در تپے کے قریب جا کر سنتی رہی، پھر واپس آ گئی۔

”دریچہ بند کر دو۔“ گوتم نے معا کہا۔

”ہاں۔“ چمپا نے جواب دیا۔ ”یہ تورات گنے تک بلڑ مختار ہے گا۔ لندن مجلس والوں کو اس کے علاوہ اور کوئی کام معلوم نہیں ہوتا۔“

”ارے رے.....“ گومت نے چونک کر کہا۔ ”وہاں شایدِ مال بھی پہنچ گیا ہو، یہ لوگ رت جھا کیوں کرنے والے ہیں؟“

”صحیح یہ سب بوداپسٹ چار ہے ہیں اس لئے۔“

”بوداپسٹ؟“

”ہاں، وہیں۔ بالکل وہیں۔ نسلی ڈینیوب کے کنارے۔“

گومت نے کان لگا کر آواز پہچانے کی کوشش کی۔

”وہی سارے پرانے کورس ہیں اور اپنا کے گیت۔“ چمپا نے اکتاہٹ کے ساتھ کہا۔ ”ابھی تمہارا جی ان گانوں سے نہیں بھرا۔“

”ان گانوں سے میرا جی کس طرح بھر ستا ہے چمپا بیگم؟“

”اوہ۔ میں بھول گئی تھی کامریڈ گومت۔“ مگر تمہی نے کہا تھا کہ دریچہ بند کر

”دو۔“

اب وہ ”بُو جھاٹھا لوہیا ہیا۔“ گار ہے تھے۔ گومت نے باہر جا کر باغ کی دیوار پر سے جھانا کا۔

بہت سے لوگوں کو باتھ ہلا کر دیو کیا اور واپس آ گیا۔ ”نہیں مال وہاں نہیں ہے۔“

”گومت ماشر۔“

”ہاں بھائی۔“

”کیا میں بہت ہی بیوقوف ہوں؟“

”نہیں تو، لیکن کچھ ایسی زندگی تقلید بھی نہیں۔“

”بس..... میں یہی پوچھنا چاہتی تھی۔ اچھا ہوا تم نے بتا دیا، اب مجھے
طمینان رہے گا۔“

”گرو گوم کو بداو۔ گرو گوم کہاں ہے۔“ آشاكے گھر میں سے صدائیں بلند
ہوئیں۔

”گرو گوم سریکھا کے یہاں بیٹھا ہے۔“ کسی نے جواب دیا۔

وہ باہر جا کر دوستوں سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔ ”نہیں میں آئیں ستما۔

ایک بے حد ضروری فون کا انتظار کر رہا ہوں۔“

مگر دوسرا ہے وہ دیوار کو دکر گانے والوں کی منڈلی میں جا شامل ہوا۔ چپا
پھرا کیلی رہ گئی۔

اس کی دنیا کی کشش اس کے لئے زیادہ طاقتور ہے، یہ مجھے معلوم ہوتا
چاہیے۔

بہت دیر بعد وہ سریکھا کے ڈرائیور میں داخل ہوا۔ مال کا فون تو نہیں آیا
تھا؟ اس نے سوال کیا۔ چپا آشدان کے سامنے قالیں پر لیٹی پڑھ رہی تھی۔

”نہیں“ اس نے جواب دیا۔ گوم نے اس طرح اسے تنہا چھوڑ کر آشاكے یہاں
چلے جانے کی معدودت نہیں کی، وہیں بینہ کروہ بھی ایک کتاب پڑھنے میں مصروف
ہو گیا۔ ”یار چاءہ بنائی جائے۔“ کچھ دیر بعد اس نے تجویز کیا۔

”تم آشاكے یہاں پی کر نہیں آئے۔“

”ہاں، مگر تم نے جو نہیں پی ہو گی۔ آشام جو اتنی دیر تک آوازیں دیتی رہی۔ تم وہاں آئیں کیوں نہیں۔ اب تم بنا لو چاء اپنے لئے۔“

بہت جلد تم کو میرا خیال آیا۔ چمپا نے کہنا چاہا مگر وہ جھگڑنا نہیں چاہتی تھی، یہ اس قدر رواہیات نسوانیت ہوتی، وہ چپ چاپ اٹھ کر باور پچی خانے میں چلی گئی۔

”آتا بھی ہے چولھا سا گانا۔“ گوتم نے چھپے سے مذاقہ آواز لگائی۔

”بنارس میں ہیری اماں خود کھانا بناتی ہیں۔“ اس نے مختصر اکھا۔

”مگر تم تو کیبھر ج پہنچ ہوا!“

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

”چمپا رانی.....“ گوتم آ کر باور پچی خانے کے دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ ”آخر اس قدر افسر دہ کیوں نظر آ رہی ہو؟“

”اور کیا کروں ماچوں؟“

”یہ تو کوئی جوب نہ ہوا۔ تم تو ایک زمانے میں بڑی سخت بدله سنج تھیں۔“

”وہ دیکھو تو س جلا دیا تم نے.....“

”افسوں طاعت یہاں موجود نہیں جو تم کو پکوان بنا کر کھلاتی۔“

”چمپا، ایسی رواہیات باقی میں مت کرو۔“

”گوتم.....“ چمپا نے کیتیلی اٹھاتے ہوئے رسان سے کہا۔ ”اگر تم چاہتے ہو کہ میں یہاں سے چلی جاؤں گی اور آہن دہ تم سے کبھی ملنے کی کوشش نہ کروں گی۔ غلطی میری ہی تھی کہ میں نے اتنے برسوں تم سے دوبارہ ملنے کی آس لگائے رکھی۔“

”چمپارانی.....“ گوتم باورچی خانے میں آ کر ایک اسٹول پر بیٹھ گیا، اس نے اپنا سر اپنے ہاتھوں پر نکا دیا۔ ”چمپارانی۔“ اس نے بھاری آواز میں کہا۔ ”اصلیت جاننا چاہتی ہو۔ اصلیت یہ ہے کہ میں اپنے آپ سے ڈر رہا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں تم سے کیا بات کروں۔ تم مجھ کو کیا بتانا چاہتی ہو اور میں تمہیں کیا سنانے کا ممتنی ہوں۔ اتنا طویل و قندگز رچکا ہے اور ظاہری طور پر ہمارے پاس باتیں کرنے کے لئے کوئی مشترکہ موضوع نہیں ہے سوائے ان خرافات کے جو ہم پچھلے دو گھنٹے سے دھرارہے ہیں۔“ اس نے سراٹھا کر چمپا کو دیکھا۔ واقعیہ تھا کہ وہ چوٹھے کے پاس کھڑی اور زیادہ خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ اس نے چمپا کو آج تک اتنے گھریلو اور پسکون ماحول میں نہیں دیکھا تھا۔

وہ چاہہ بنا کر ڈر انگ روم میں لے آئی۔

”ادھر آ جاؤ۔“ اس نے ڈر اور شقی سے کہا۔ گوتم اس کی آواز کی درشتی سے ڈر سا گیا، وہ پھر آتشدان کے سامنے آن بیٹھے۔

محض کوئی بات کرنے کی خاطر گوتم نے دارجلنگ کے ایک بیگ کو چھوایا جو کرسی پر رکھا تھا۔ ”کتنا خوبصورت ہے۔“ اس نے کہا۔

”اس میں میں اپنے کاغذات رکھ دوں؟“

”رکھ دو۔“

اس نے لفافے بڑی احتیاط سے بیگ میں ٹھونس دیے۔

اب پھر باتیں ختم ہو گئیں۔

”اس بیگ میں۔“ اس نے گلا صاف کر کے پھر کہنا شروع کیا۔ ”تمہارا

سامان ہے ناچلتے وقت مجھے یہ کاغذات نکال دینا۔ ورنہ سب گڑ بڑ ہو جائے گا۔“

”زیر بحث بیگ“ چھپا نے تلخی سے کہا، ”میرا نہیں سریکھا کا ہے۔ اس میں تم اپنا سامان رکھ سکتے ہو۔ اسے اپنے گھر لے جاسکتے ہو۔ میری اور تمہاری کوئی چیز مشترک نہیں ہے۔ نہ یہ بیگ، نہ کاغذات، نہ یہ مکان، چیزیں حتیٰ کہ یادیں۔ کچھ بھی نہیں۔ جس میں تمہارے ساتھ حصہ لگا سکوں۔ صرف دکھ مشترک ہے، لیکن تم اپنے دکھ بھی اپنے لئے ہی محفوظ رکھنا چاہتے ہو۔“
گوتم خاموش رہا۔

”کیا تم کو معلوم ہے گوتم نیلم کہ گو پچھلے سات سال سے میں نے تم کو نہیں دیکھا مگر مجھے بتا ہے کہ تم ہر سے، سوتے جاگتے، انھتے بیٹھتے اپنے خلاف گواہی دیتے رہے ہو؟“

”ٹھیک ہے میں جس سے بات کرتا ہوں مجھے لگتا ہے میرا مناسب میرا کافیس ہے۔ میرا سارا وجہ و میرا اعتراف ہے۔ میں نے کتنے قتل کیے ہیں۔ تم کو مارا ہے۔ اپنے آپ کو ختم کیا ہے۔ میرا جرم تمہارے جرم سے مختلف ہے۔ تمہارے اندر معصومیت کا جرم چھپا ہوا ہے۔ ایک بات بتاؤ.....“ اس نے رک کر کہا..... ”تصور گناہ تمہارے نزدیک کیا ہے۔“

”کسی کا دل دکھانا۔“ چھپا نے سوچ کر جواب دیا۔

”اور؟“

”ریا کاری۔“

”اور؟“

”اور..... اور کمینہ پن۔“ اس نے دماغ پر اور زیادہ زور ڈال کر جواب دیا۔

”سنڈے اسکول کے سبق۔“

”ایں؟“ چمپا نے اس کی بات اچھی طرح نہیں سمجھی۔

”میں نے دل دکھایا ہے، تمہارے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ ہے؟“

”بہت بڑا۔“

”لیکن تم کو جلد یہ معلوم ہو جائے گا چمپا رانی کہ راستے میں بعض ایسے موڑ آتے ہیں جب کسی دوسرے کا دل دکھانا بالکل ناگزیر اور لازمی ہو جاتا ہے۔“

”قاتل بھی قتل کرتے وقت یہی سوچتا ہے کہ قتل بالکل ناگزیر اور لازمی ہے،

ورنہ وہ قاتل ہی کیوں نہ تا؟“

گوتم پھر خاموش ہو گیا۔

”سر او پچ نیچے ہوتے چاہے ہیں۔“ کچھ دیر بعد انہوں نے باہر کی آوازوں پر کان لگاتے ہوئے کہا۔ ”مگر ہماری کی طرف بڑھتے ہوئے دفتار ک گئے ہیں۔“ اس نے پیانو کے نزدیک جا کر پر دوں پر انگلیاں پھیریں۔

”اس کا ایک سر کمیں سے ٹوٹ گیا ہے۔“ چمپا نے کہا۔

”مجھے معلوم ہے۔ پیانو میں اکثر چوہے اپنا گھر بنایتے ہیں۔ میرے پیانو میں، بہرائچ میں، اکثر آدمی رات کو ایک پیارا موٹا سا چوہا اندر تاروں پر دوڑ دوڑ کر سمنگی بجا کرتا تھا۔“

”تم نے مجھ سے بہرائچ کا ذکر بھی نہیں کیا۔“

”بڑی پیاری جگہ ہے۔ کیونکہ میرا طمن ہے۔“

”ہم سب ایک دھرے کے رحم و کرم پر زندہ ہیں ایک دھرے کے ساتھ وقت میں مقید ہیں یہ بڑی کوفت کی بات ہے۔“ اس نے چند لمحوں بعد الجھ کر کہا۔ حالانکہ یہ وقت بڑا غیر حقیقی تھا جس میں کمرے کی ہرجیز بے حد روشن اور واضح نظر آ رہی تھی۔ باغ کے پھولوں پر سے برف پکھلانا شروع ہو گئی۔

”یہ جوتا دیکھو۔“ معاً گوم نے نالگیں آگے بڑھا کر سنجیدگی سے کہا۔ ”زندگی اس کی طرح فٹ نہیں بیٹھتی۔“ پھر اس نے ایک توں کا نکلا اٹھا کر لمبی کو پھینکا جو دریچے میں آن بیٹھی تھی۔ اس نے توں سونگھ کر چھوڑ دیا۔

”یہ بھی بونیمیں لمبی ہے، توں خیں کھاتی۔ اس کے لئے اوپسز اور شیمپن لاقو۔“

پھر وہ چمپا سے مخاطب ہوا: ”چمپا تم نے اتنے دنوں پیکار میرا منتظر کیا۔ میں بالکل بوگس ہوں۔“ وہ آتش دان کے پاس بیٹھی اسے خود بے حد غیر ضروری نظر آئی۔ غیر ضروری اور سخت یوقوف اب بھلا اس کی کیا تک ہے کہ اتنی گنوں ہونے کے باوجود مجھ جیسے لپاڑی آدمی کی آس لگائے بیٹھی ہیں۔ حد ہے، بے یوقوف لڑکی ہے اور سخت معصوم، بورڑا فلسفی بے چاری۔ اگر اس کے دماغ کو کھر چا جائے اندر سے تو اس میں سے کتنی فالتومٹی ملے گی۔ ہزاروں سال پرانی مٹی۔ ٹیرا کوٹا۔

”طاعت نے اتنے سارے مشہور لوگوں کے سر بنائے ہیں۔“ اس نے با آواز بلند کہا۔ ”پم نے کبھی اس سے اپنا سر بنو کئے نہ دیا، اب بھی وقت ہے بنوالو، تم کہیں جاتو نہیں رہیں۔“ اس نے پرامید لجھے میں پوچھا۔

”فی الحال تو نہیں۔ ہم ایک دروازے سے داخل ہوئے تھے مگر باہر جانے کے سب دروازے بند ہو چکے ہیں۔“

”تھاری اتنی معصومیت بھی غلط ہے۔ بے کار ایک دم۔“ وہ ٹھلتا ہوا مجموع کی طرف چلا گیا اور کسی سر ٹھونک بجا کر دیکھنے لگا۔ ”کیونکہ.....“ اس نے ایک مجسم کی ناک چھوٹے ہوئے کہا۔ ”ہر دفعہ تم پر کڑی جاؤ گی۔ تمہارا خیال ہے تم نے فیصلہ کر لیا اس لئے اب ہر بات آسان ہے حالانکہ یہ اتنا آسان نہیں۔ ابھی تم پر اور مصیبتیں آئیں گی۔“

وہ درستھے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ لمحہ گھومتا چکر کا نتما چتارہ۔ لمحے کا بھنور دور دور تک پھیل گیا۔ ختم ہو گیا، باقی رہا جگہ کاتی ہوئی بر ف پر سے چھلتی روشنی کمرے میں داخل ہوئی۔ پیشتر مکمل ترین بن گیا، وہ ساکت و صامت آتشدان کے پاس بیٹھی رہی۔ کمرے کے تجربے میں بلی بھی شریک تھی۔ ہوا میں بھی جانتی تھیں۔ بہت دور سڑک کی موڑیں، راہ گیر، دکانیں..... سب کو معلوم ہو چکا تھا۔

اب سارا وجہ دیکھ کتاب ہے جسے میں پڑھ چکی ہوں اور انت سے تک کئی بار پڑھوں گی۔ چمپانے اپنے آپ سے کہا۔

”دو دنیا میں ہر سے میرے ساتھ رہتی ہیں۔ ایک دنیا میں یہ سب لوگ ہیں ☆،“ اس نے کمرے کی طرف اشارہ کیا ”وسری دنیا میں صرف میں اور تم تنہا ہیں۔ دونوں کے درمیان ایک پل ہے۔ جس روز یہ ٹوٹ گیا تو کیا ہو گا۔“

”پل تم خود تو ٹوٹ گے۔“

”نہیں۔ لوگوں نے چاروں طرف مشین گئیں لگا رکھی ہیں۔ جھاڑیوں میں

تو پیس چھپی ہیں۔ اور پر باطل گرج رہے ہیں۔ ایک روز مجھے لگتا ہے لوگوں کی دنیا پاتال میں گر کر غائب ہو جائے گی۔ میں باہر ہاتھ پاؤں مارتارہ جاؤں گا۔ یہ سوچ کر دل ڈوب جاتا ہے۔“

”تم اپنی اسپوٹ لائٹ لنے چھت کی کڑیوں میں چھپے بیٹھے ہو، جو شامت کا مارا سٹھج پر آتا ہے تم انتہائی کمینے پن سے اچانک یہ پ کارخ اس کی طرف کر دیتے ہو، وہ روشنی میں عیاں ہو جاتا ہے۔“

”میں خود بھی تو میرا براں روشنی میں ہوں۔“

”نہیں تم پر دوں کے چھپے چھپے رہتے ہو۔ اگر کسی روز ایک سرچ لائٹ تم پر پڑ گئی تو کیا ہوگا۔ اس دن تم اور پر کی منزل سے چھلانگ لگا کر سرپٹ نکل بھاگو گے۔ کھڑکیوں میں لوگ تمہیں نظر آئیں گے۔ اسنوں کے گرد بیٹھے بحشیں کرتے، کھاتے پکاتے، کھاتے تم کسی آوارہ گرد بلے کی طرح چاند کے مقابل میں چھت کے نالوں پر دبے پاؤں چلتے ہوئے آؤ گے۔ تمہارا چہرہ ہمیں کھڑکی کے شیشوں میں سے نظر آئے گا۔ بوجی میں!“

”اور اس سے میں تمہارے ساتھ وہ ہیں موجود ہوں گا: اسنوں کے گرد بحشیں کرتا، کھانا بناتا، کھاتا، اور تم مجھے کھڑکیوں میں سے جھانکتا دیکھو گی..... بوجی مون!!“

وہ خاموش ہو گئے۔

وہ اچک اچک کر دیواروں کی تصویریں دیکھتا پھرا، پھر دریچے کی طرف چلا گیا۔

”اچ بہت برف پڑی۔“ دریچے میں کھڑے کھڑے گوم نے ایک جزل اسٹینٹ دیا۔

ابھی، اس کی بعد بھی باقی ہے۔ اس کے بعد، جو موٹ تک، اب تک پھیلتا چلا جائے گا، موجود رہے گا۔ چمپانے اپنے آپ سے کہا۔

”سر کیھا کا باغ کتنا خوبصورت ہے۔“ گوم نے کمرے کی طرف سے پشت کیے کیے دھراہیاں دیا۔

میری کوئی قسمت نہیں۔ سنا ہے لوگوں کی قسمتیں ہوتی ہیں۔ چمپانے اپنے آپ سے کہا۔

معاودہ چونکا اور پیچھے مڑا۔ اس کا چہرہ دھلے ہوئے کھڑے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ سارا دن گزر گیا۔ سورج ڈھل چکا۔ شام آگئی۔ میں ابھی یہیں ہوں۔ میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔ میں نے اتنا وقت برداشت کیا۔ اتنا انمول۔ انمول وقت۔ وہ بڑا بڑا اور تیر کی طرح گیلری کی اور بڑھا ڈاگنگ ٹبل پر رکھے ہوئے پارسل پر اس کی نظر پڑی۔ اس نے پیچھے پٹ کر چمپا کو نہیں دیکھا۔ پارسل جھپٹ کروہ گولے کی طرح باہر لکھا اور موڑ میں بیٹھ کر دیوانہ وارثہ ہرست کی جانب روانہ ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد چمپانے جھک کر دارجلنگ کے بیگ سے مال کے نام کے وہ لمبے لمبے سرکاری لفاظ نکالے جو گوم یہیں بھول گیا تھا۔ اس نے ان کو کھولا۔

ایک ایک کر کے ہر ٹاپ شدہ خط میں مال کی ملازمتوں کی درخواستوں کو

نامنشور کیا گیا تھا۔

۹۱

”آئے پریم گئے پروانے۔ جوال منی چھوٹی کے دیوانے
جز چلن کے پچھے رے بیٹھی
دیپ شیکھا ہرائے رے۔ دیپ شیکھا ہرائے رے۔
دیپ شیکھا ہرائے رے“

چند را گاتی ہو ہی باغ سے کھانے کے کمرے کے اندر آگئی۔

”طاعت چاء.....“ اس نے میز پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
طاعت نے چاء انڈیلی۔

سر یکھا انہاک سے وید یو ٹیون کرتی رہی۔ زرینہ نے باغ کے رخ دروازے
میں پھیلی ہوئی دھوپ میں ایزیل رکھ کر ایک اور تصویر شروع کر دی۔ پڑون نے باڑ
پر سے سر نکال کر جھوڑی ہی شکر مانگی۔

دنیا کا کام سکون سے جاری رہا۔ بلکہ جب سے زملاء مری تھی دنیا کا کام اور
زیادہ سکون سے جاری تھا۔ سب اپنی اپنی مصروفیات میں اس طرح جیتھے تھے گویا
اس سے پہلے انہیں بتا ہی نہیں تھا کہ ان کے فرائض کیا ہیں۔ اسی شدید مصروفیات
کے مارے وہ ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے تھے۔ طاعت اخبار کی روپورٹیں

لکھتی۔ کملائڈ ٹپیل میں ڈنر کھاتی۔ فیر وہ کتاب میں سنبھال کر بڑی سعادت مندی سے روز یونیورسٹی کا رخ کرتی۔ مال شکست لا یا سر یکھا کے ڈرائیگ روم میں آتش دان کے سامنے اونڈھے لیٹ کر مزید درخواستیں لکھنا۔ ہری شنکر نے ایک نیا مشغلمہ شروع کر دیا تھا۔

وہ چڑیوں کے پر جمع کیا کرتا۔

نر ملا کو مرے آج محض دسوال روز تھا مگر معلوم ہوتا جیسے اسے ان لوگوں سے رخصت ہوئے کئی سو سال گزر چکے ہیں۔ وقت بر کی طرح پھیلتا چلا جا رہا تھا۔ جس روز ایک جھٹکے کے ساتھ ربر کا یہ تناؤ ٹوٹے گا تو کیا ہو گا۔

”اب ہمیں زمل کے دسویں کی فکر کرنا چاہیے نا؟“، شنکر نے چڑیوں کے پروں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے اس طرح مال سے کہا جیسے وہ اکثر اس سے پوچھتا تھا:

”اب ہمیں زمل کے بیاہ کی فکر کرنا چاہیے نا۔“

”ہاں۔ شاید۔“ مال نے آہستہ سے جواب دیا۔

”یہاں کوئی پنڈت جی بھی نہیں ہیں جن سے پوچھ لیتے کہ آج کے روز ہمیں کیا کرنا چاہیے تھا۔“ طاعت نے بھی ہری شنکر ہی کی طرح بڑے عملی انداز میں بات کی۔ پر ابھا زندگی کا کاروبار زمان پہنچا کر چلی گئی تھی مگر اس کی موت کے بعد کاروبار تو ابھی باقی تھے۔

شنیلا دبی پوچھ رہی تھیں کہ اگر تم لوگوں نے دسویں کا کچھ انظام نہ کیا ہو تو فکر نہ کرو۔ سو امی دیویکا نند جی کہہ رہے ہیں کہ ان کے سفر میں.....

”جی..... جی ہاں..... جی بہت اچھا..... شنکر یہ.....“ مال

نے رسور کھدیا۔

موت بھی سوامی دیویکا نند کی طرح فراڑ ہے۔

اب پھر وہ سب اپنی شدید بہادری کا ثبوت دینے کے لیے اپنے اپنے مورچوں پر جا بیٹھے۔ طاعت نے ایک مضمون نام پ کرنا شروع کر دیا۔ سریکھا گیلری میں جا کر ڈانس کی شق میں مصروف ہو گئی۔ ہری شنکر نے پروں کا الہم انداخ لیا۔

وقت کا ناتا بہت سی توپوں کی طرح گرنے لگا۔ گھڑی نے تمیں بجائے۔ مال نے بربان خاموشی ہری شنکر سے کہا۔ ”سررو جر سے ڈی تھوڑی شفکیت لینے جانا ہے۔“ کیونکہ اس لرزہ خیز جملے کو الفاظ میں تو نہیں ادا کیا جاستا تھا۔

”لے آؤ۔“ ہری شنکر نے اسی خاموشی سے جواب دیا۔

”مدد ہرست سے نر ملا کا سامان بھی آتا ہے۔“ طاعت نے اپنے خاموش الفاظ بھی اسی ناتے میں اندھیل دیے۔

”لیکن ہم مدد ہرست کس طرح جاسکتے ہیں؟“ مال نے اسی طرح احتجاج کیا۔

ہر شنکر نے ان الفاظ کو ڈی کو ڈی کیا۔ وہاں، مگر ہم بہت بہادر ہیں۔ ہم ضرور جائیں گے۔ ہم شفکیت بھی لائیں گے اور اس کا سامان بھی۔ چلو انہوں۔ اپنے اپنے زرد بکتر پہنوا۔ افت رائٹ۔ مارچ کرو۔ اپنے پرانے آزمودہ ہتھیار سنپھالو۔ چلو ہم جا کر نر ملا کے زرد بکتر اور ہتھیار والیں لے آئیں جن کی اب اسے ضرورت نہیں۔

اس نیٹو مام کے بعد، جسے کسی نے، خود انہوں نے، نہیں دیکھا، وہ سب باہر لے گئے، موڑ میں بیٹھے اور ایک جانے پہچانے راستے پر روانہ ہو گئے۔ چار سال تک متواتر وہ اس شرک پر سے گزر کر سینی ٹوریم جاتے رہے تھے۔

اب وہ آخری بار مدد ہرسٹ سے لوٹ رہے تھے۔ شام کا انڈھیرا چھاچکا تھا۔ خاموشی سے موڑ سے اتر کر وہ اس روڈ ہاؤس میں گئے جہاں وہ ہمیشہ نارنگیوں کے سامنے میں بیٹھ کر چاء پیتے تھے۔ روڈ ہاؤس کی مالکہ موتی سارہ نے باہر آ کر ان کے سامنے چاہ رکھی، وہ بھی اس نیٹو مام میں شامل ہو گئی۔

سینٹ جانز روڈ میں اپنے فلیٹ پر واپس پہنچ کر مال نے سارا سامان گیٹ روم میں رکھ دیا جس میں ہری شنکر ٹھہر اہوا تھا۔

جب سب لوگ اپنے سورچوں پر واپس لوٹ گئے تو طاعت نے چوری سے نظر بچا کر اپنا مورچہ چھوڑا، اپنا زرہ بکتر اتار کر گیٹ روم میں داخل ہوئی۔

ہری شنکر پروں کا الہم میز پر ڈال کر مال کے ساتھ باہر چلا گیا تھا۔ کمرے میں ہر چیز یہ پکی روشنی میں بڑی واضح نظر آ رہی تھی۔ آبنوس کافرنیچر۔ وکنورین وضع کا اونچا سانید بورڈ جس پر الم غلم بہت سی فالتو چیزیں رکھی تھیں۔ دیوار پر ایک موڈرٹن پیننگ لگی تھی جسے ایک مرتبہ طاعت کسی کباڑی کی دکان سے بہت ستی خرید لائی تھی۔ ایک تانبے کا سوال پرانا مجسمہ جو ایک مرتبہ طاعت نے کیمڈن ٹاؤن میں ایک کباڑی سے مخفی چند شانگ میں خریدا تھا۔ پرانے اخبار اور رسائلے تقریباً شکستہ صوفہ۔

ان سب چیزوں کے درمیان گھرے ہوئے، جب کہ زملا کا سامان اس کے

قدموں میں پڑا تھا، اسے لگا گویا اس کی زندگی، ساری زندگی ایک بہت عظیم الشان کبائری کی دکان ہے۔ یہ سب سامان فالتو ہے۔ ان سب چیزوں کو ذرا بیچ کر تو دیکھو۔ اپنی زندگی کو ذرا اس کبائری مارکیٹ میں رکھو۔ موت اس کی قیمت ہے۔

موت؟

دفعتاً پھر اس کے کافیوں میں ایک توپ دغی۔ موت۔

سامنے سائیڈ بورڈ کے گوشے میں وہ چھوٹا سا مرتبان تھا جس میں ماری نرملہ سریو استوا کی راکھ تھی۔ اس کی کنجی ہری شنکر کے پاس تھی جو گویا اس کا قانونی وارث تھا۔ اس مرتبان کو انگا میں بہانے کے لیے اپنے ساتھ واپس ٹھن لے جائے گا۔ جو اس وقت مال کے ساتھ اسی موت کے سلسلے کے باقی ماندہ آخری انتظامات کرنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ آخری انتظامات۔ ڈسٹریٹر شرپ فلکٹ۔ گیتا کا پاٹھ۔ ہوائی جہاز کا لکٹ۔

ہرش میں بڑی واقعیت تھی، وہ مرتبان بھی اتنا ہی محسوس اور حقیقی تھا جیسے یہ کرسی یا وہ صوفہ۔ یا کھانے کے برتن۔

کون الو کا پٹھا کہتا ہے کہ موت ماورائی ہے۔

موت سے زیادہ پھر سینڈ ویٹ بات کیا ہوگی۔

یعنی ذرا یہ غور کیجئے کہ دوسروں کی موت پر چہ کہو پہکو رو تے ہیں اور پھر خود مر جاتے ہیں۔

ارے میں کہتی ہوں رونے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ایک سخت ایڈیٹ لڑکی تھی۔ اس کا یعنی کہ انتقال ہو گیا۔ کون سی ایسی طرم جنگ تھی۔

اور لکھنؤ میں آپ روڈی والی شریا بابی کے مرنے کی خبر سن کر کتنا روئی تھیں۔ جب مال نے ڈانٹا تھا کہ صرف دو دفعہ ہی تو ملی تھیں شریا بابی سے، اس قدر دہائیں کیوں مار رہی ہو، تو اس نے جواب دیا تھا، میں تو اصولاً رورہی ہوں۔

جب کسی کا دیہانت ہو جائے تو کیا نہ سنا چاہئے؟

یوں بھی سب کو شریا بابی کے انقال کا بہت غم ہوا تھا کیونکہ مرحومہ بارہ بنکی والے اصغر بھائی پر جان دیتی تھیں اور اصغر بھائی نے وعدہ تو ان سے بیاہ کا کیا تھا مگر ایک روز نہیں تال جا کر کسی عیسائی بڑکی سے انہوں نے شادی رچائی تھی اور اس صدمے سے شریا بابی کو سل ہو گئی تھی اور کئی سال تک روڈی کی نیم تاریک کو ٹھزی میں پنگ پڑے رہنے کے بعد انہوں نے اس جہان فانی سے کوچ کیا تھا۔

اور چونکہ وہ نہ قاصہ تھیں نہ انہیں کوں نہ لیکھ کا نہ چتر کرنہ ہی لیڈر لہذا نہ ان کی تصویریں چھپی تھیں نہ ان پر مضر و من لکھے گئے۔ ان کے جہیز کے کپڑے اور ان کی حیدر آبادی چوڑیاں زنانہ اسلامیہ یتیم خانے میں بھجوادی گئی تھیں اور ان کے چالیسویں کے بعد، جس میں لکھنؤ سے رشتہ دار آ کر شریک ہو گئے تھے، گویا اسٹیج پر پڑ رہ گر گیا تھا۔ ہاں ان کے مرنے کے دوسرے روز لکھنؤ کے مسلم اسکول کے آمبیلی ہاں میں ان کی مغفرت کی دعا بھی مانگی گئی تھی جہاں انہوں نے الیف۔ اے تک پڑھا تھا۔

یوں بے چاری شریا بابی کی زندگی کا افسانہ ختم ہوا تھا جو کوئی ایسا لمبا چوڑا افسانہ بھی نہ تھا۔ ایک بڑے، غیر اہم قصے کا بے حد غیر اہم سب پلاٹ تھا۔

پہلی مسلم سوشنل پکچر۔

مگر زمان تو بڑی غیر معمولی اڑ کی تھی۔
وہ بھی اس معمولی طریقے سے ختم ہو گئی۔

اری نر ملا کی پیچی۔ ایڈیٹ۔ ارے بھائی تو بھی اتنی ہی حیرت نکلی۔ کہاں گیا وہ
تیرا سارا فلسفہ اور آئینہ یا لو جی، مگر واقعہ صرف یہ ہے کہ سچ مج سب ٹھانٹھ پڑا رہ
جائے گا جب لا دھلے گا، بخارہ..... وغیرہ..... واقعہ صرف یہ ہے کہ آپ کی
زندگی ہی کیا تھی۔ لمبی چوڑی۔ ساری عمر تو محنت کرتے، پروگرام بناتے گزری۔
رات رات بھر پڑھا جا رہا ہے کہ فرست ڈویژن مل جائے۔ یا اللہ۔ اچھا سیکنڈ
ڈویژن ہی مل جائے۔ ہائے بھگوان کم از کم پاس ہی ہو جائیں۔ سچی، پھر ملک اور
قوم کی فکر میں جان دے دے رہی ہیں۔ لوثی بھڑتی پھر رہی ہیں۔ جہاں کسی نے
کوئی غلط بات کہی اور یہ کاٹ کھانے کو دوڑیں۔ ہر بحث میں یہ کو دنے کو موجود
پھر جب فرست کلاس مل گیا تو کیمبرج جانے کے لیے انہوں نے مہنا متحہ مچا دی۔
ان کے بابا نے بڑی مشکل سے روپیہ جوڑ کر ان کو ولایت بھیجا، وہاں یہ خوشی سے
پچھولی نہ سائیں۔ کئی دن تک تو ان کو یقین نہ آئے کہ یہ واقعی کیمبرج میں موجود
ہیں۔ کہی کہی پھریں کہ یہ خواب ہے، جلد ٹوٹ جائے گا، پھر پروگرام بننے کے
جب یہاں سے پڑھ کر نکلیں گی اچھی سے اچھی ملازمت ملے گی۔ بابا پر جو قرضہ
چڑھا ہوا ہے وہ اتنا ریس گی۔ بھیجن کے لیے بہوڑھوندیں گی۔ پریزاد بالکل، پھر
ذرا پیسے جمع ہو گئے تو میکسیکو کی سیر کریں گی جا کر۔ (یہ جانے میکسیکو جانے کا اتنا
شوک کیوں تھا۔) یہ موہومی امید تھی کہ ایک روز ایک اپنا مکان بھی بنے گا۔ اس
میں ایک چھوٹا مونا سا باغ ہو گا۔ روک گارڈن۔ مکان کا نام رکھیں گی۔ کسی

قسم کا کنج یا کچھ اور خیر کوکل جی سے پوچھ لیں گی، وہ شاعرہ ہیں۔ اتنی تو تھی مستقبل کی چتنا، پھر یہ کہ بیان پل رہی ہیں، کتنے، کبتو، گائیں، بھینسیں پالنے کا بھی شوق ہے اور ساریوں پر تو خيردم نظرتا ہے۔ نیا اور کوٹ بنانے کے لیے وہ مہابھارت مچائے ہوئے ہیں۔ ضد ہے کہ جیسے زمرد کے گھنے لاج کے بننے ہیں ایسے ہی میرے بھی نہیں۔ اپنی سہیلوں کے لیے جان حاضر ہے۔ چند لوگوں سے سخت جلن بھی ہے۔ محبت کی الہیت بھی ہے۔ جو ہر انسان، ہر جاندار میں ہوتی ہے۔

پھر ہوا یہ کہ کیمبرج میں ان کو بخار ٹھہر گیا۔ ان کو ہسپتال پہنچا یا گیا جہاں کئی سال تک پلنگ پر لیٹے رہنے کے بعد ایک روز آپ نے جان شیریں جان آفریں کے پر فرمادی۔

تو کیا اس موت پر اصولاً رونما چاہیے۔ قطعی نہیں۔ یہ تو بڑی سختی کی بات ہے۔ دراصل اس سے زیادہ لطیفے کی بات تو طاعت نے بہت دنوں سے نہیں سنی تھی۔

اس نے کمرے کا چکر لگایا۔ سارے فلیٹ میں گھومی۔ باغ کے سرے پر باورچی خانے میں روشنی ہو رہی تھی۔ چندر اور سریکھا کے سامنے در تپے میں سے نظر آرہے تھے، گھوم پھر کروہ پھر ہری شنکر کے کمرے میں واپس آگئی۔ فرش پر بیٹھ کر اس نے نرملاء کے سامان کو اکٹھا کر کے سنگو انا چاہا۔ بدلي سے اس نے چیزیں لٹیں پلٹیں۔ کتابوں کے بکس میں گیتا پر اس کی نظر پڑی۔ اسے نکال کروہ ڈرائیور میں لے آئی۔

لیپ جلا کر اس سے اصولاً گیتا کا صفحہ کھولا۔ اس احساس کے ساتھ کہ گویا وہ شانستی کے حصول کے لیے اس آسمانی صحیفے کا مطالعہ کر رہی ہے۔ اس نے بے حد دصیان سے پڑھنا شروع کیا:

.....ان کو بہادری سے جھیل

جسم فانی ہیں لیکن ان جسموں کے اندر رہنے والی رو حیں امر ہیں۔ چنانچہ اُڑھا۔
اوپھارت کے فرزند۔ آتمانہ قتل کرتی ہے نہ خود قتل ہوتی ہے۔ تلوار سے زخمی نہیں کر
سکتی۔ آگ اسے جلا نہیں سکتی۔ پانی اسے بھگونہیں سُتا۔ ہوا اسے خشک کرنے
سے قادر ہے۔ جو پیدا ہوا اس کی موت یقینی ہے۔ جو مر اس کی پیدائش اُٹل۔ اس
میں دکھ کی کیا بات ہے؟

دکھ اور سکھ، نفع نقصان، ہار جیت کو ایک سمجھ کر تو جنگ کر۔

تب ارجمن نے کہا: اوکیشو، اگر خرد کی راہ عمل کی راہ سے افضل ہے تو تو مجھے جنگ کرنے کے لیے کیوں کہتا ہے؟ جنگ کا عمل خوفناک ہے۔

بھگوان نے جواب دیا: انسانوں کو کام نہ کر کے کرم سے نجات نہیں مل سکتی۔ نہ کرم سے بے نیاز ہو کر وہ مکمل بن ستا ہے کیونکہ پر اکرتی سے پیدا شدہ گنوں کے زیر اثر انسان متواتر مصروف عمل رہتا ہے۔

اوارجن! تو اور میں کئی بار پیدا ہوئے ہیں۔ گو میں خداوند عالم ہوں لیکن اپنی پراکرتی پر قدرت رکھتے ہوئے اپنی مایا کے ذریعے خود وجود میں آتا ہوں۔ او بھرت، جب دنیا میں نیکی کا زوال ہوتا ہے تو میں خود کو جسم کر لیتا ہوں اور جو میری الہی پیدائش اور میرے عمل کو پہچان لیتا ہے، اے ارجمن، وہ اپنا جسم چھوڑنے کے

بعد دوبارہ پیدا ہونے کے بجائے مجھ سے آن ملتا ہے۔ بڑے بڑے گنوں گھبرا جاتے ہیں کہ کرم کیا ہے اور نہہ کرم کیا، وہ جو نہہ کرم میں کرم اور کرم میں نہہ کرم دیکھتا ہے وہی اصل گنوں ہے۔ اوارجن، عقل کی آگ کرموں کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔

اوچنا دھن، میری پراکرتی مٹی، پانی، ہوا، آکاش، دماغ، ذہن اور انسانیت میں منقسم ہے۔ یہ ادنیٰ دیجے کی پراکرتی لیکن مضبوط بازوؤں والے شہزادے، میری اعلیٰ پراکرتی وجود اور حیات کے احساس اور شعور میں موجود ہے جس کے سارے یہ کائنات قائم ہے میں ہی ابتدائے عالم ہوں اور میں ہی اس کی انتہا! اوس کنقتوں کے بیٹھے، میں پانی کا سودا ہوں۔ سورج اور چاند کی روشنی۔ میں سارے ویدوں میں لکھا ہوا اوم ہوں۔ میں آکاش کی آواز ہوں۔ میں انسانیت کی اجتماعی خود آگئی ہوں۔ میں زمین کی متبرک خوشبو ہوں۔ میں سارے جانداروں کی جان ہوں۔ راہبوں کا زہد ہوں۔ جو جس عقیدے سے میری عبادت کرتا ہے میں اسے بھگتی میں تبدیل کر دیتا ہوں۔ میں عالم الغیب ہوں لیکن مجھے کوئی نہیں جانتا۔

میں عبادت کے مختلف طریقے ہوں۔ میں ہی جڑی بوٹی ہوں اور پوچا کی آگ۔ میں خود ہی پوچا کا عمل بھی ہوں۔ میں کائنات کا باپ ہوں۔ میں ہی ماں۔ راستہ ہوں اور گواہ اور آخری جائے پناہ۔ ابتداء۔ انتہا۔ آرام گاہ۔ گنجینہ اور ازالی بیج۔ اوارجن! میں تپش پیدا کرتا ہوں۔ مینہ بر ساتا ہوں۔ میں ابدیت ہوں۔ میں موت ہوں۔ میں وجود اور عدم وجود ہوں۔ میں وشنو ہوں۔

ویدوں میں میں سام وید ہوں۔ دیوتاؤں میں اندر۔ حواس میں ذہن ہوں

اور خود آگئی۔ رو روں میں شکر ہوں۔ پ انیوں میں مہا سا کر۔ الفاظ میں اوم۔ عبادت میں جاپ۔ نہ بلنے والی چیزوں میں ہمالیہ ہوں۔ رشیوں میں نارو۔ میں فلسفی کپل ہوں۔ گھوڑوں اور شاندار ہاتھیوں اور انسانوں میں الگ الگ میرا بادشاہ کا رتبہ ہے۔ ناگوں میں میں انت ہوں۔ پانی کے باسیوں میں دوون۔ فرمانرواؤں میں یم۔ پیائش میں میں وقت ہوں۔ جنگلی جانوروں میں شیر ببر۔ پرندوں میں گرڑ۔ جنگجو بہادروں میں رام۔ دریاؤں میں گنگا ہوں۔

میں بے پایا وقت ہوں۔ میں تباہ کن موت ہوں۔ میں عورت کی گفتار اور ذہانت، وفاداری اور حرم دلی ہوں۔ میں گالتری منتر ہوں۔ میں جیت ہوں۔ صوفیوں میں میں ویاس ہوں۔ رتوں میں بستت ہوں۔ آناجوں میں جو۔ میں سمسار کا آہ مددھ اور انت ہوں۔ میں رازوں کا ساناٹا ہوں۔ او ارجمن! امیرے اللہی مظاہر نیکراں ہیں۔
او ارجمن۔

او ارجمن کے بچے۔ ایڈیٹ۔

وہ کتاب زور سے بند کر کے پھر اٹھی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ نوبخت والا تھا۔ ابھی ہری شکر اور مال لوٹتے ہوں گے۔ اس نے ابھی ہری شکر کا کمرہ بھی ٹھیک نہیں کیا تھا، وہ دوبارہ گیٹ روم میں داخل ہوئی۔ فرش پر بیٹھ کر اس نے ایک بار پھر نرملہ کی چیزوں کو درست کرنے کی کوشش کی: ساریاں۔ جوتے۔ چوڑیاں۔ میک اپ کے پنارے۔ ہینڈ بیگ جس میں دنیا بھر کی الابلا جمع تھی جو لڑکیوں ہی کے ہینڈ بیگ میں سے متیاب ہو سکتی ہے۔ بس کے ٹکڑے۔ لاغذری

کے بل۔ پرانے خالی لپ اسٹک۔ کانوں کے بندے۔ بخیں۔ پیسے خریداری کی فہرستیں اور جانے کیا کیا۔ ان سب چیزوں پر چار سال قبل کی تاریخیں پڑی تھیں۔ چار سال سے نر ملادنیا سے الگ تھلگ سینی نوریم میں مقید تھی، پھر اس نے نر ملاد کی کتابوں کا بکس پیک کرنا چاہا۔ ایک کتاب میں سے ایک تصویر پر سے نیچے گری۔ طاعت نے جھک کر اسے اٹھایا۔

یہ گوم نیلمبر کی تصویر تھی جو آج سے دس سال قبل برداھوئے کے لیے بہراج سے سنگھاڑے والی کوٹھی بھیجی گئی تھی۔ طاعت نے خالی خالی آنکھوں سے اس تصویر کو دیکھا اور اسے کتاب میں واپس رکھ دیا۔

ہال میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اڑ کے واپس آ چکے تھے۔

سر دیکھانے کی بیز پر سے آواز لگائی۔

طبعلت، ہری شنکر کا کمرہ قرینے سے ٹھیک کر کے مجاذ پر واپس چلی گئی۔

برف باری شدید ہو چکی تھی۔

اس رات، جب ہری شنکر سوچ کا تھا، طاعت نے اس کے کمرے میں دبے پاؤں جا کر کتاب میں سے گوم کی تصویر نکالی۔ اپنے کمرے میں آ کر اس تصویر کو جتوں سے خوب ہی مارا جب جا کر اسے ذرا شانتی کا احساس ہوا۔ تب وہ فرش پر بیٹھ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر روئی۔

چونکہ وہ پچھلے دس روز سے نہیں روئی تھی۔

روتے روتے وہ بیہوش ہو گئی اور گھر میں ڈاکٹر کو بلا نے کے لیے ایک اور ہنگامہ شروع ہو گیا۔

ساری دنیا نے سفید برف کا کفن پہن لیا۔ سڑکوں کے کنارے کھڑے ہوئے درخت ایسے نظر آ رہے تھے جیسے کسی مصور نے کیوس پر پھیلے ہوئے چانداں اٹ پر سیاہ رنگ سے ادھرا دھر آڑی ترچھی لیکر یہی کھینچ دی ہوں جن کے عقب میں مکانوں میں سے چھپتی ہوئی اداں زرد روشنی کے دھبے سے چاروں طرف پھیلے تھے۔ بڑے زور کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ اس عظیم کیوس کے ایک کونے میں ایک خوبصورت دو منزلہ کانج تھا جیسے کانج عام طور پر اوستری میں جا بجا ہیں۔ ایونیو میں داخل ہوتا بائیں ہاتھ پرستا تھا۔ سامنے چھوٹا ساروک گارڈن تھا جو بہار کے زمانے میں پھولوں سے لد جاتا۔ سامنے مناسابر آمدہ تھا جس کی سرخ اینٹوں کی دیوار پر تابنے کی لائیں نصب تھی۔ اندر گیلری تھی جس میں سے زینہ اور پر بیڈ رمز کو جاتا تھا۔ نیچوں شست کا کمرہ تھا اور کھانا کمرہ اور گیلری کے سرے پر پارلر تھا۔ اس کے اندر جا کر باورچی خانہ۔ چیچھے لان تھا جس کے سرے پر شاہ بلوط کا درخت کھڑا تھا۔ گھر والوں کا زیادہ وقت پارلر میں گزرتا تھا جہاں وائر لیس سیٹ اور سیلی ویرین کر رہا تھا، ویس کھانا بناتا، برتن دھوئے جاتے، اسناؤ کے پاس بیٹھ کر چیس ہوتیں۔ جاڑوں کے زمانے میں زرینہ سر پر اسکارف لپیٹے، پتوں پہنے باہر کولری میں سے لکڑیاں نکال کر سوں سوں کرتی اندر لاتی اور ڈرائی گروم کا آتش دان دیک اٹھتا۔ تب دنیا

ایک دم بے حد محفوظ معلوم ہونے لگتی۔ آتش دان پر ایک موڑن مجسمہ رکھا تھا۔ دیوار پر آشنا کا بڑا سا پورٹ ہیٹ تھا۔ جوزرینہ نے مانس کی طرز میں بنایا تھا بڑا سا اپرائی قائمین تھا۔ بڑے بڑے اشینڈرڈ لیمپ۔ در تچے میں سے باہر حد نظر تک برف دکھانی دیتی۔ ریڈ یو پر لدیف پسندیدہ لغتے بجتے۔ دوستوں کے فون آتے اب تک بڑی پر امن، سیدھے سادے پر سکون احساسات سے گھری ہوئی زندگی گزر رہی تھی۔

زرینہ یہاں اپنی ماں اور چھوٹے بھائیوں کے ساتھ رہتی تھی اور یونیورسٹی میں روئی ادب اور فارسی میں بی۔ اے آمزز کر رہی تھی۔ سلیڈز سے آرٹ کا ڈپلوما لے چکی تھی۔ اس کے والدیہ شر تھے۔ اس کی جوان سال، سرخ بالوں والی ماں، جو نساً انگریز تھیں مگر خالص لکھنؤی زبان میں گفتگو کرتی تھیں، انکے محاورے بولنے میں ان کو بڑا ملکہ حاصل تھا۔ بے حد محبت والی بی بی تھیں اور بے حد خوش مزاج اور پرمداق۔ ان کا گھر زرینہ کی دوستوں کے لیے ہمیشہ جانے پناہ کا کام دیتا اور وہ ان سے بڑی بہنوں کی طرح پیش آتیں۔

اس وقت زرینہ پارلر میں میز پر بیٹھی ایک روئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔

اتنے میں گلیری کی گھنٹی بھی۔ زرینہ نے اٹھ کر در تچے میں سے جھانکا۔ برف سے جوتے لٹ پت کیے، اور کوٹ کے کالر سے منہ ڈھانپے سامنے گوتم کھڑا تھا۔ زرینہ اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

وہا تھیں اپنی کیس لیے سیرھیاں چڑھ کر برآمدے میں آ گیا۔

”یہ پانچواں شہر ہے۔ یہاں بھی روشنیاں جل رہی ہیں۔ میرا خیال تھا یہ

جگ مختلف ہوگی۔“

”مگر افسوس کہ تمہارا خیال غلط ثابت ہوا۔ اندر آ جاؤ۔“ زرینہ نے جواب دیا۔

”میرے ساتھ باہر بہت سے لوگ کھڑے ہیں۔“

”ان کو بھی بلا لو اندر۔“

”کیسے بلا لوں۔ اس روشنی میں تم ان کی شکلیں نہیں دیکھ سکو گی۔“

”وہ کون لوگ ہیں۔“

”بہت سے بھوت لاشیں۔ ارواح خبیثہ، وہ سب میری دوست ہیں اور باہر اندر ہرے میں دانت نکو سے کھڑی ہیں۔ ان کا جلوس میرے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔“

”مجھے ان سے ڈر نہیں لگے گا۔“

”تمہیں ان سے ڈر نہیں لگنا چاہیے کیونکہ ہم سب برابر خود ان لاشوں میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں، مگر۔“ اس نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ ”میرا خیال تھا یہ جگہ مختلف ہو گی۔ یہاں اندر ہر اہو گا، لیکن تم نے یہاں بھی دیوالی منار کھی ہے۔ روشنی میں تم کیا دیکھنے کی کوشش کرتی ہو بھائی؟“

وہ اکتا کر اپنے اپنی کیس پر بیٹھ گیا۔ زرینہ نے گیلری کا دروازہ کھولا۔

”گوتم۔ میرا مطلب ہے، کہ تم واپس آ گئے ہو، جہاں بھی گئے تھے۔ یعنی کہ دراصل ہم سب بے حد پریشان تھے تمہاری وجہ سے۔“

”میں تم سب کا ممنون ہوں۔“

”میرا مطلب ہے کہ..... ویکم ہوم..... ہوم جہاں کہیں بھی ہو یعنی۔ ہر سفر
کے بعد کا عارضی پڑاو۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے شان استغنا سے ہاتھ ہلایا۔ ”میں نے تمہارا سو اگت
قبول کیا،“ پھر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ ”یہ مکان تو وہ والا نہیں ہے جس میں
تم رہا کرتی تھیں۔ آرٹسٹ کا مکان۔“
”وہی ہے۔“

”اجھا۔“ اس نے غیر یقینی انداز میں کہا۔ ”تم کہتی ہو تو ٹھیک ہی ہو گا۔ زرینہ
کیا میں خبیث ہو گیا ہوں؟“

”نہیں تو۔“ اس نے گھبرا کر جواب دیا۔ ”محض تم تھکے ہوئے زیادہ لگ رہے
ہو۔“

”متو اتر بھاگتے رہنے سے انسان تھک ہیتا و جاتا ہے۔ میں جانے کتنے
لاکھوں کروڑوں میل چل چکا ہوں اب تک۔“

”تم کہاں تھے؟“

”میں..... یہ کیوں بتاؤں۔“ اس نے بچوں کی طرح جواب دیا۔ ”کئی راتیں
میں نے کھیتوں میں گزاریں۔ بھوے کے ڈھیروں پر سویا۔ ندیوں کی کشمتوں میں
گھسا بیٹھا۔ اسٹیشنوں کے وینگ رومنز میں چھپتا پھرا۔ سارے میں پولیس کی
نظروں سے بچا بچا گھوما کیا۔ تب آج میں نے کہا کہ کیوں نہ ایک شریف بہادر
انسان کی طرح سامنے آ کر اقبال جرم کرلوں۔“

”پولیس؟“

”ہاں۔ کیا تم کو نہیں معلوم؟“

”نہیں تو..... کیا؟“

”میں نے، زریشہ بیگم“ اس نے بڑے ٹھانٹھ سے ٹانگ پرٹا گر کر کر کہنا شروع کیا۔ ”میں نے دُوْقَل کیے ہیں۔ تب سے مارا مارا پھرتا ہوں کہ کہیں سرچھپا نے کوٹھکانہ مل جائے۔ واپس آ کر سارے دوستوں کے درواز کھنکھنائے مگر سب دروازے بند تھے اور اندر تیز روشنیاں جل رہی تھیں، پھر میں ادھر سے گزر رہا تھا تو میں نے سوچا لاؤ تمہیں بھی آزمالوں۔“

”اندر آ جاؤ گوتم یہاں ہوا بہت تیز ہے۔“

”مگر تم پولیس کو خبر تو نہ کر دوگی۔“ اس نے سہم کر پوچھا۔

”قطعی نہیں۔“

”نہیں میں یہیں بیٹھوں گا۔ گھروں کی چھتیں میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔“

زریشہ نے اسکارف سر کے گرد لپیٹ کر جھکڑ کی زد سے بچنا چاہا۔ برف کے گالے چاروں اور بکھر گئے۔

”سنو زریشہ بیگم۔“ اس نے اپسی کیس پر بیٹھے بیٹھے سراٹھا کر اس سے کہا۔

”میں اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے دُوْقَل کیے ہیں اور مال یہ ہے“

وہ ہنسا۔ ”کہ یہیں اس قدر چارسو بیس ہوں کہ میرے دونوں مقتولوں کو اس کا علم تک نہ ہوا کہ میں نے ہی ان کا کام تمام کیا ہے۔“ اب دفتاً اس کی آواز بالکل تاریخی ہو گئی۔ اس روز جب میں سریکھا کے یہاں سے پارسل لے کر بھاگ بھاگ

ہسپتال پہنچا تو نرملانے مجھے پہچان کرنہ دیا کیونکہ وہ مرچکی تھی اور جب میں اسی رات وہاں سے لوٹ کر شہر میں مارا مارا پھر رہا تھا تو مجھے جمیلسی کے ایک بیب میں چمپا احمد نظر آئی اور اس نے بھی مجھے نہیں پہچانا..... کیونکہ وہ بے حد ڈرک تھی..... چنانچہ..... "اس نے بڑے سخن سے کہا..... "میں اس قدر کا ماہر فن کروک ہوں..... دیکھا تم نے۔"

برف کا طوفان بڑھتا جا رہا تھا۔ عین اسی وقت پانی اور بردیلی کیچڑ کے چھینٹے اڑاتی ایک موڑ رائیو پر آ کر رکی اور اس کی تیز روشنی میں برف پر ایک پیلا راستہ سامنے گیا۔

مال اور ہری شنکر موڑ میں سے اترے۔

"زریشہ" انہوں نے ڈرائیو پر سے آواز دی۔ "گوتم تو یہاں نہیں آیا؟"

وہ دونوں برف پر بھاری بھاری قدم رکھتے سیر ھیوں پر آ گئے۔

"سوامی جی کے سفتر میں ابھی ابھی معلوم ہوا کہ گوتم لندن لوٹ آیا ہے اور شاید اوٹرلی کی طرف گیا ہے۔" مال کہہ رہا تھا۔

تحوڑی دیر بعد وہ دونوں گوتم نیلمبر کو موڑ میں ڈال کر اپنے گھر لے گئے۔

دہریے میں سوگ باشی نرملہ کے گھروالے۔ سوامی جی نے سارا انتظام کیا تھا۔ پھول منگوائے تھے۔ مدارسیوں کی ایک کیرتن پارٹی بھی سوکس کانچ سے آگئی تھی، مگر یہ لوگ شانتی کامارگ ڈھونڈنا نہیں چاہتے۔

”اور جانتی ہوا بیوی لوگ کیا کر رہے ہیں وہاں اپنے گھر میں، یا اس اندر میں ڈانسر کے فلیٹ میں جمع ہو کر صحیح سے شام تک تاش کھیلتے ہیں حد ہے۔“ ایک بے حد روحاںی انگریز بڑھیا نے در تپے میں سے منڈیاں کال کربات کی۔ چمپا سیڑھیوں پر سے واپس اتری۔

”تم کسی کی متابی معلوم ہوتی ہو۔“ دوسری ویدانت پرست امریکن بڑھیا نے در تپے میں سے سرنکال کر کہا۔ ”دیکھو وہ یہاں موجود ہے تمہیں ہم سب کو بلا رہا ہے“ انہوں نے انگلی اٹھا کر کرشن کی بڑی تصویر کی طرف اشارہ کیا جو سنٹر کے ہال میں رکھی تھی۔ ”اے دیکھنے کے لیے وہ تیسری آنکھ چاہئے جسے افسوس کہ تم ہندوستانی کھو بیٹھے۔“

چمپا ہڑ بڑا کر دوڑتی نیچے اتر گئی۔ سڑک پر آ کر اس نے اپنے ما تھے پر ہاتھ پھیرا۔ اسے محسوس ہوا کہ جیسے سڑک پر چلنے والے سب انسانوں کے ماحوں پر تیسری آنکھ موجود ہے جو اسے گھور رہی ہے۔

وہ دوڑ کر ایک ۲۷ نمبر کی بس میں سوار ہو گئی۔

سنٹر میں سوامی دیویکا نند نے اپنا یک چھپ لانا شروع کر دیا تھا۔ یوگا پران کا یک چھر سننے کے بعد ان کی سامعین معرفت پسند بڑی میں اپنے گھروں کو لوٹ کر سنک میں پڑے ہوئے صح کے برتن ڈھوئیں گی اور موزے روکریں گی اور گیس کے بل

کی فکر کریں گی۔ اس وقت اڑ کر شنا ان کے کتنے کام آئیں گے۔

وہ بس سے اتر کر طالب علموں کے مرکز کی طرف روانہ ہوئی۔

ہال میں طالب علموں کی ایک بالکل نیئی ٹولی گپوں میں صروف تھی۔

”میں چمپا احمد ہوں۔“ کس نے دروازے میں جا کر کہا۔

”لیں؟“

ایک مدرسی طالب علم نے آگے آ کر پوچھا۔

اس کا دل ڈوب گیا۔ اس کا نام کتنا غیر اہم تھا۔ اسے کوئی نہ جانتا تھا۔ کسی کو اس کی ضرورت نہ تھی۔

”کچھ نہیں..... کچھ نہیں.....“

”جی..... آپ کو کیا چاہیئے؟“ ایک بنگالی لڑکی نے پوچھا۔

”کچھ بھی تو نہیں.....“ اس نے اور زیادہ ہڑ بڑا کر جواب دیا۔ ”ایسے ہی

آپ لوگوں کا سفر دریکھنے چلی آئی تھی۔“

چند لڑکوں نے اسے شک و شے کی نظروں سے گھورا۔

وہ ائے پاؤں پھر شرک پر آگئی۔

اسٹرینڈ پہنچ کر وہ انڈیا ہاؤس میں داخل ہوئی۔ افت میں اوپر کی منزل تک

پہنچی جہاں کئیں میں حسب معمول خوب شور مجھ رہا تھا۔

”میں چمپا احمد ہوں۔“

اس نے کاؤنٹر پر جا کر کہا۔ اسے اپنی اس اجتماعی حرکت پر مطلق تعجب نہ ہوا۔

”لیں ڈینیر۔“ اوہیڑ عمر کی ہندوستانی عورت نے، جو ایڈنگ مشین پر بیٹھی تھی،

انگریز عورتوں کے لمحے کی نقل کرتے ہوئے کہا، ”کھانا تو ختم ہو چکا ہے۔ سنیکس ہیں۔“

نہیں.....ٹھیک ہے۔ وہ سٹ پٹا کر پھر باہر نکلی۔ میزوں پر بیٹھے ہوئے اڑکوں اور لڑکیوں نے سراٹھا کر بھی اسے نہ دیکھا۔ ایک کونے میں سریکھا کامیاب گلشن سر جھکائے کچھ پڑھ رہا تھا، وہ پھر باہر آگئی۔

اب وہ چوزے کی سرائے پہنچی، وہاں سارے مال ملا جو کا وہ تنر پر کھڑا کسی کوفون کر رہا تھا۔ اس سے چند باتیں کرنے کے بعد وہ جلدی سے باہر نکل گیا، وہ شیشے کے دروازے کے پاس کھڑی اسے بھیڑ میں شامل ہوتے دیکھتی رہی، پھر باہر آ کر اس نے بی بی سی کی کینشین میں جھاناکا۔ چچا صدیقی کوئی لطینہ بیان کر رہے تھے۔ اعجاز بٹالوی نے ایک نئی بحث شروع کر دی۔ تھی سید منہ لنگاۓ بیٹھے تھے۔ یا اور عباس کچھ گلگنگارے تھے۔ میں چمپا احمد ہوں۔ اس نے ان سب کو بتانا چاہا مگر پھر واپس لوٹ گئی۔

سامنے ہی اندر گراونڈ تھی۔ سیرھیاں اتر کر اس نے بالکل غیر ارادی طور پر میڈ اویل کاٹکٹ لے لیا۔ چند منٹ بعد میڈ اویل کی چوڑی شرک پر برآمد ہو کر وہ ایک درخت سے ٹک گئی اور چاروں طرف دیکھا۔ سامنے کچھ فاصلے پر سریکھا اور آشکے مکان تھے۔ باڑ کی دوسری طرف چند قدم پر طاعت اور مال کا فلیٹ تھا۔ آشیش کے مقابل کے جدید بلاک میں شانتا اور ولیم کر گیگ رہتے تھے۔

عین اسی وقت گروسر کی دکان سے سبزی کا تھیا اٹھائے سریکھا باہر نکلی۔ ”ارے چمپا۔“ اس نے چلا کر کہا۔ ”وہاں کیسی کھڑی ہو۔ آؤ۔“

آؤ۔“

وہ خاموشی سے سریکھا کے ساتھ ہوئی۔

چند قدم چل کر وہ مکان میں داخل ہوئیں۔

”چانچہ یہی گولکل تھا..... شار میلا..... یہی گولکل تھا.....“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”کیا.....“ سریکھا نے پٹ کر پوچھا۔

”کچھ بھی تو نہیں۔“

”بیو۔ گلشنِ ابھی انڈیا ہاؤس سے نہیں لوٹا۔ تمہیں معلوم ہے اس نے وہاں کام شروع کر دیا ہے۔“

”اچھا۔“

ڈرائیگ روم کے چوڑے دروازے کے باہر ابھی دن کا جالا باقی تھا۔ بہت سی سرخ بیٹیاں آہستہ آہستہ تیرتی ہوئی آ کر نیچے بکھر گئیں۔ پورچ کی سڑیوں پر، ڈرائیور پر۔ چار پانچ بیٹیاں درستچ کے باہر رکھی ہوئی بید کی کرسیوں کے نیچے ہوا میں لرزتی رہیں۔ دھوپ کی شہری لکیر نے گھاس پر حلقہ ساختا گیا۔

کیا پتا انسان دراصل کیا چاہتا ہے؟

”ارے چمپا..... یہاں اس صوف پر بیٹھ جاؤ آرام سے سریکھا نے ترکاریاں سینی میں انڈیلٹتے ہوئے کہا۔

”اس صوف پر بیٹھنے سے کمرہ وہی تو نہیں بنے گا جو اس روز تھا۔“ چمپا نے اپنے آپ سے کہا۔

”اس روز..... کس روز؟ کیسا تھا؟“ سریکھانے باور پچی خانے میں
جاتے ہوئے پوچھا۔

”کیا معلوم.....؟“

غالص موسم اب باہر فضاؤں میں پھیل چکا تھا۔ شدھ سردی۔ شفاف، پاکیزہ
برف۔ سارا وجود بے حد ہلاکا پھلاکا اور صاف محسوس ہو رہا تھا۔ سریکھانے شال
اور ٹھی اور کمرے میں آ کر آتش دان جلایا۔

”کل.....“ اس نے بالشی میں سے کوئی لٹتھے ہوئے بات کی۔ ”بہت
سے لوگ گھرو اپس جا رہے ہیں۔“

”ہاں۔ ہندوستان۔“ سریکھانے را کھکر یہ ناشروع کی۔

”کون..... کون.....“ چھپانے بے تعلقی سے پوچھا۔ اب اسے کسی
سے کیا مطلب، وہ اس غالص موسم کی طرح سارے میں پھیلی تھی۔ اسے مخصوص
شخصیتوں سے کیا غرض۔ اس کا کسی سے کوئی تعلق نہیں۔

سریکھا گھر یلو انداز میں پلوکر میں کھوننے کے بعد پھر ترکاری کاٹنے بیٹھ گئی۔

”سبھی.....“ اس نے جواب دیا۔ مال۔ ہری۔ کملا۔ ہری فلامائی کر رہا
ہے۔ مال پرسوں کیلئے دنیا سے جائے گا۔ گوتم آج صحیح کرنا میں کے ساتھ پھر
نیویارک چل دیا۔

باہر چھتوں کے پرے ایک دم سورج ڈوب گیا۔ بگ بین نے ریڈ یو میں اپنا
بگ بھالیا۔ باہر تاریکی چھا چکی تھی۔ جاڑوں کی رات کی تاریکی جو فعلاً دنیا کو آ
دبو چتی ہے، وہ سریکھا کی مدد کرنے کے لیے باور پچی خانے میں چلی گئی۔

ڈرائیور میں گلشن کے اور اس کے دوست داخل ہو چکے تھے، وہ باورچی خانے کے دروازے سے نکل کر سر دباغ میں سے گزرتی آشام کے گھر پلی گئی۔

سریکھا کی آواز پروہ واپس لوئی۔ اس نے در تپے میں سے اندر رجھا نکا۔ شام کا اٹکرے میں ختم ہو چکا تھا۔ اس کی جگہ رات نے لے لی تھی، وہ دوبارہ اس کمرے میں گئی مگر وہاں کچھ نہیں تھا۔ سائے دوسرے تھے، رنگ، فضا کا سر وقت بھی کھڑی کے راستے باہر چلا گیا۔ اس کا ذرا سائکڑا بھی پیچھے پڑا نہیں ملا۔

سریکھا کے گھر سے باہر نکل کر اسے مال کے مکان کی روشنیاں نظر آئیں۔

مجھے چھوڑ کر مت جاؤ..... مجھے چھوڑ کر مت جاؤ..... مجھے چھوڑ کر مت..... اس نے چلا چلا کر کہنا چاہا مگر خاموشی سے تیز تیز قدم رکھتی اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئی اور جون کار ٹرکی گلی میں پہنچی اور اصطبل کے دروازے میں جا کر روشنی جلانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

مگر وقعاً تاریکی نے سامنے آ کر اسے خوش آمدید کہا، وہ در تپے میں رکھے ہوئے جریں کے پوتوں پر جھک گئی۔ اب تک رات میری خلاف تھی۔ اس نے سوچا۔ اب شاید میری ساتھی بن جائے۔ اونچے مکانوں پر سے گزر کر آتی ہوئی ہوا، گھاس کی سرسر اہٹ، پتوں پر جمی ہو ہی برف۔ زمین پر رات کی موجودیں بہتی چلی جا رہی ہیں اور اب دھارے الگ الگ ہو چکے ہیں۔ اب میں واقعہ مکمل طور پر آزاد ہوں، وہ نہیں۔ نیچے بہت ٹھوس، حقیقی زمین ہے اور اس زمین پر مجھے موت تک چلے جانا ہے۔ قدم مجھے کہاں کہاں لے جائیں گے۔ (اس نے پیروں کو اس طرح دیکھا گویا آج تک وہ اسے پہنچی نظر نہ آئے تھے۔) رات میرے ہاتھ

میں موجود ہے اور اس کے ہاتھ میں بھی۔ رات کی رسی کو میں مضبوطی سے تھامے تھامے دن تک پہنچ جاؤں گی۔ رات تو آج سے میری سکھی ہے۔ کہو سکھی کیس ہو۔ میں تو تم کو مدتوں سے جانتی ہوں۔ بر ساتوں میں، چھا گن کی رت میں پور نعشاشی میں، امتحانوں کی پڑھائی کے زمانے میں، اجنبی دیسیوں میں، ٹرینوں میں سفر کرتے ہوئے میں نے تمہاری ہر کیفیت کو دیکھا ہے۔ میں نے اور تم نے اکٹھے سے بتایا ہے۔ ایک روز تم ہی جیتیو گ۔

اور تم، اس نے دوسرا بات شروع کی، میں تم کو تمہارے خوابوں کی دوسرا تھہ میں چھوڑتی ہوں۔ میں شاید ایک واقعیت تھی اور تم خواب دیکھنے سے کبھی باز نہ آؤ گے۔

رات تاریک تر ہوتی گئی۔ سردی بڑھ گئی۔ جون کا رڑ کے فلیٹ میں مکمل ساناٹا تھا۔ نیل اپنے کمرے میں سورہ تھا۔ جون بھی سوچکی تھی۔ او جیت اپنی میلنگ سے نہیں لوٹا تھا۔ خاموشی کی لہریں بوسیدہ دیواروں سے تکڑایا کیں۔ وقت نے کہا: مجھے پہچانو۔ میں تمہارا پیچھا کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ تمہارا خیال تھا مجھے اپنے جگہ قائم رہیں گے، لیکن تمہارا یہ خیال بھی غلط تھا۔ مجھے دیکھو اور جانو۔ میں جا رہا ہوں پل پل، چھن چھن۔ پر دوں کے پیچھے تہ درتہ اندر ہیروں میں غائب ہوتا جا رہا ہوں۔ میں حد فاضل ہوں۔ اس کے آگے تم نہیں جا سکتیں۔ اب واپس لوٹ چلو۔ سرحد پر تم پہنچ چکی ہو۔ سامنے چھاٹک ہے۔ اب دوسرا دلیں شروع ہوتا ہے۔ اب تم کو دوسرے پروانہ راہداری، نئے کانفڑات کا انتظام کرنا ہو گا۔ نئے سرے سے خانہ پرپی اور دستخط کرنے ہوں گے کیونکہ اب نئی سرحد شروع ہوتی ہے۔ میں نے اب

تک بہت سے حرتوڑے ہیں۔ تمہارا والا آخر تو بہت ہی غیر احمد تھا۔

مجھے پہچانو۔ میں برادر تمہارے ساتھ چلتا رہوں گا۔ تم کم از کم مجھ سے نہیں بھاگ سکتیں۔ لوگ تمہیں چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ میں تم کو کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ دیکھا تم سرحد پر کتنی جلدی پہنچ گئیں۔ تم کو فیصلہ کرنے میں کتنی وقت پیش آ رہی تھی۔ میں سارے معاملے طے کر دیتا ہوں۔ سارے فیصلے، سارے ارادے میری وجہ سے خود بخوبی پورے ہوتے چلے جاتے ہیں۔

ابھی تم پر اور مصیبتیں آئیں گی لیکن میں تم کو ان کا مقابلہ کرنا بھی سکھا دوں گا۔ اب مجھ سے صلح کرو۔ میں اب بھی موجود ہوں۔

ہوا کے ایک تیز جھونکے سے کھڑکی کا پردہ چھپھٹانا نے لگا۔ کمرہ کمرے سے بھر گیا۔ تب اسے معاً محسوس ہوا کہ وہ سردی سے کپکپا رہی ہے۔ اس نے جلدی سے دریچہ بند کیا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”اپی کے بیاہ میں پہنچ کے لیے میں تو بڑی بڑھیا بڑھیا ساریاں بناؤں گی، کارچوپی۔“ ترملہ کہہ رہی تھی۔
میں خاموش رہی۔

”مجھے تو یہ نئے قسم کی بارڈ روائی ساریاں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔“ ماتی نے

ہونٹ لٹکا کر بڑی بوڑھیوں کی طرح کہا۔ ماتحت رائے زادہ سولہ برس کی تھی۔ نرملہ اس سے ایک سال چھوٹی تھی۔ میں نرملہ سے ایک سال چھوٹی۔ ان دونوں نے سخت بزرگی کے عالم میں مابوسات کے متعلق اپنی وسیع معلومات کا مجھ پر رعب ڈالنا شروع کیا۔ میں بڑی عقیدت سے ان کی باتیں سنتی رہی۔

پھر طاعت دھنٹا خاموش ہو گئی۔ ”دیکھو۔“ اس نے مال سے کہا، ”میں نے آج یہ محسوس کیا ہے میرا ماضی صرف میرے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ دوسروں کے لیے، دنیا کے لیے اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ نہ دنیا کو اس سے کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے۔“

”میرا ماضی محض میرا ماضی ہے۔“ مال نے طاعت کی بات دہرائی۔

”اور دنیا کو صرف حال سے دلچسپی ہے۔“ ہری شنکر کی آواز گونجی۔

”لیکن ماضی حال ہے۔ حال ماضی میں شامل ہے اور مستقبل میں بھی۔ وقت کی اس شعبدے بازی نے مجھے بڑا حیران کر رکھا ہے۔“ طاعت نے کہا۔ ”میں وقت کے ہاتھوں عاجز آچکی ہوں۔ تم میں سے کوئی میری مدد کیوں نہیں کرتا۔“

”تمہاری مدد طاعت بیگم شاید آئن اشائیں بھی نہیں کر ستا۔“

”میرے ماضی سے دوسروں کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔“ مال نے پھر ضد سے دہرایا۔

”وقت برابر موجود ہے۔ وقت مسلسل حال ہے۔“ طاعت نے کہا۔

یہ لوگ جولندن کے سینٹ جانزو ووڈ میں بیٹھے ۱۵ دسمبر ۱۹۴۵ء کی سہ پہر کو یہ باتیں کر رہے تھے ان کے سامنے کھڑکیوں کے شیشوں پر عجیب عجیب شکلیں بناتے

رہے۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی۔ موڑیں آ جا رہی تھیں۔ وارڈیس میں سے وی آنا کے کسی کونسرٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وقت کے وسیع اندھیرے اور اوپنی دیواروں اور سڑکوں اور گلیوں اور آوازوں کی بھول بھلیاں میں گھرے تینوں موجود رہے۔

وقت کے اسی اندھیرے میں طاعت ۱۹۲۱ء کی جولائی میں سنگھائرے والی کوئی تھی کے برآمدے میں پہنچی نہ ملا اور ماتی سے با تین کر رہی تھی۔ اس طاعت میں اور اس لڑکی میں کوئی فرق نہ تھا مگر دونوں مختلف ہستیاں تھیں۔ شاکریہ منی نے کہا تھا کہ انسان ہر لحظہ بدلتا رہتا ہے۔ بچپن میں کچھ اور ہوتا ہے جوانی میں کچھ اور۔ تم اس لمحے سے پہلے نہیں تھے۔ صرف تسلسل باقی رہتا ہے۔ دور پہاڑوں میں گلیشیر ٹوٹ ٹوٹ کر بہر رہے تھے۔ ہوا میں وقت جو سیال تھا، وقت جو نجمد تھا۔

”ہم اپنا قصہ وہ اکر اپنا اطمینان کرنا چاہتے ہیں۔“ ہری شنکر نے کہا۔ ”کیونکہ ہم خوفزدہ ہیں۔“

”اور گوتم نیلمہ تک کس قدر خوفزدہ ہکا۔“ مال نے کہا۔

”گوتم نیلمہ کا اس وقت ذکر نہ کرو۔ تم اصل موضوع سے بہت دور رہت جاؤ گے۔ طے یہ کرنا ہے کہ زندگی میں اصل مو ضرع کیا ہے۔“ ہری شنکر نے کہا۔ ”میں چودہ سال قبل بھی موجود تھا اور اگر زندہ رہا تو چودہ سال بعد بھی ہری شنکر ہی سمجھا جاؤں گا اور جب وقت کے سارے تجربے ہم اپنے اوپر کر لیں گے تو یہ جو چھوٹے چھوٹے گنی پک ہم لوگ ہیں ہم بھی ختم ہو جائیں گے۔“

وقت کے پیڑن میں طاعت جہاں پہنچی تھی وہی طاعت اسی پیڑن میں ایک

جگہ اور موجود تھی اور دونوں نقطوں کے درمیان برسوں کا فاصلہ تھا اور اس فاصلے پر انسان صرف آگے کی سمت چل ستا تھا۔ آگے اور آگے پیچھے جانا ناممکن تھا۔ گوہزاروں طبقہ میں ان گنت نکڑوں میں منتشر ان گنت جگہوں پر موجود تھیں جیسے آئینے کے نوٹے ہوئے نکڑوں میں ایک ہی چہرے کی مختلف عکس نظر آتے ہیں۔

مال گویا اٹیچ پر چلتا ہوا وسط کی میز پر آ کر بیٹھ گیا۔ کمھی کی آنکھوں سے اس نے سب کو دیکھا۔ مائیکل۔ بل کر گی۔ زرینہ، وہ سب صحیح گوتم نیلمبر کو ایئر پورٹ پہنچا کرو اپس لوٹے تھے اور مال کے کمرے میں ہر شکر اور مال کے بندھے ہوئے اسہاب پر چڑھے بیٹھے تھے۔

گوتم زرینہ کے یہاں سے آ کر پندرہ دن تک مال کے گھر پر بیمار پڑا رہا تھا۔ تب وہ دن بھرتاش کھیلتے یا بیت بازی کرتے۔ مکی ماوس کے کوک اور فلمی رسائیں تک پڑھے گئے۔ گوتم ابھی پوری طرح صحیت یا بُنه ہوا تھا کہ کشمیر کے کیس کے لیے اسے پھر نیو یارک جانے کا حکم آ گیا۔ لندن میں یہ مال اور ہری شکر کا آخری دن تھا۔ ہری رات کو ایئر انڈیا سے پرواز کرنے والا تھا۔ مال کو کل صبح بوٹڑیں پر سوار ہونا تھا۔ کملابھی جارہی تھی۔ مائیکل بھی جارہا تھا۔

طاعت نے دوبارہ کیلنڈر پر نظر ڈالی۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۵۲ء۔ اسے پھر یہی سی آئی۔ ”مائیکل دروازہ بند کر دو۔“ مائیکل نے اٹھ کر ایسا ہی کیا۔ لوگ طاعت کو کلدار محلوں کی طرح نظر آئے۔ سپاہی جن کے ہاتھ میں بندوقیں تھیں (مائیکل) سر ہلاتے ہوئے سفید چلی داڑھی والے چینی فلسفی (ہری شکر)۔ مہاراجہ چندر گپت

کے دربار کی نرٹگی (سریکھا)۔ دھاڑیں مار مار کر روتے، ماتم کرتے اپنی زندگی کے تعزیے کے ساتھ ساتھ نسلکے پاؤں چلتے گولہ گنج والے کمر خمیدہ نواب کمن صاحب (مال)۔ دیوالی کے گڑیوں گذوں کی طرح وہ سب سامنے بجے تھے۔ مورتیاں جن کو لکھنؤ کے لمبائوں نے بنایا تھا۔ (ان میں سے ایک مورتی گر کر ٹوٹ چکی تھی۔) ابھی بہشتی آئے گا، چھپڑ کا ڈھونڈ ہو گا، تختہ بچھے گا۔ تخت پر راجہ بیٹھے گا۔ لوا چماری کا جادو چلے گا، پھر یہ سب جا کر اپنے طاقوں میں بینچھا جائیں گے۔

”میں بالکل صحیح تھی۔“ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”مگر پھر ایک د چیزوں نے مجھے ڈرانا شروع کر دیا۔“

مال نے گویا اس سے کیوں کر کہا: ”یہ انکشاف ہوا کہ کائنات میں بڑی گردبرد ہے۔“

”اور اس سے پہلے کہ مجھے معلوم ہو میں الفاظ کے سمندر میں سے گزرتی خیالات کے پر خطر راستے پر نکل کھڑی ہوئی تھی۔“

”الفاظ کیا تھے؟ حقیقت کیا تھی؟“ کتابوں نے کہا الفاظ غلط ہیں۔ حقیقت کوئی شے نہیں سمبندھ لا سکتی ہیں۔ پتارم، ماترم، پترم، پورم..... سب ہر شے فال تو ہے۔ کبھی میں نے دیکھا پہ سپتی را کھشوں کو اپنا علم بڑھا رہا ہے۔ کبھی میں خود اپنے آپ کو ایک عظیم را کھشنی نظر آہی یا پریوں کی کہانیوں کی کوئی چیز میں جو اپنے علم کی جھاڑو پر سوار تاریک خلاوں میں ٹاپتی پھر رہی تھی۔

ان تاریک خلاوں میں اور بہت کی جھاڑوں میں سن سے پاس گزر جاتیں جن پر ہزاروں لڑکیاں سوار تھیں: تہینہ، نرملاء، روشن، جون کارڈ، فیروز، چمپا، زرینہ اور

جانے کون کون۔ یہ جھاڑوں میں اب اتنی اوپر اڑ گئی تھیں کہ اب ان کا نیچے اترنا محال تھا۔ دراصل ساری دنیا کے آسمان ان جھاڑوں سے پر تھے۔

ان سب میں چمپا ایک بڑی قابل ذکر،ستی تھی۔ اس سے غلطی یہ ہوئی خواب دیکھنے شروع کر دیے۔

اب اگر آپ ایک جھاڑو پر سوار ہوں اور سو جائیں تو اسی حالہ آپ راستہ بھول جائیں گی اور آپ کی جھاڑو نکلا کر نیچے آ رہے گی۔

اپنی خواب کی حالت میں وہ عہد عتیق کے بھکتوں کی مانندگاتی پھری۔ گر جاؤں میں گئی۔ راہباد کو روشنک سے دیکھا۔ ذاتی زندہ خدا اور اپنی زندگی کے مجازی خدا کے تصور کو بیجا کرنے سے اسے غالباً بڑی مسرت حاصل ہوئی۔ اس مسرت کا تم تجزیہ نہیں کر سکتے۔ یہاں عقیدے اور اللہ کی ذات میں یقین کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ محض تھوڑی سی معرفت کی ضرورت تھی جو صحیح منہ اندھیرے بھیرو گاؤ تو آپ سے آپ حاصل ہو جاتی ہے۔ میں را دھا ہوں۔ میں سیتا ہوں۔ میں مریم مگد لیں ہوں۔ میں زریں تاج طاہرہ ہوں۔ مد تین گزریں اس نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا کہ جب میں چیل میں جاتی ہوں اور بیشپ گھنٹی بجاتا ہے اور یو کراست کے گلاس اٹھائے جاتے ہیں تو میں اس ساری اشاریت کے جال میں خود کو موجود پاتی ہوں۔ گوتم نیلمبر کی طرح اس ہروا فقہ میں رمزیت نظر آ جاتی تھی۔

وہ سب کمرے سے نکل کر نیچے شرک پر آ گئے۔ مال نے ناک اٹھا کر کہرے کو سونگھا۔

”پیزروں کی رمزیت کا مجھے بھی اندازہ ہے۔ میں نے اس کی وجہ سے بہت

دکھاٹھائے ہیں۔“ مائیکل نے ہوا میں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔“ طاعت نے جواب دیا، وہ سب سر جھکائے زمین کو تکتے چلا کیے۔ شام کی کلرنگ روشنی میں وہ امپسٹید ہیلتھ کی طرف بڑھتے رہے۔ مکانوں کے چھوٹے چھوٹے بیک گارڈن، کھڑکیوں میں سے جھانکتے ہوئے لوگ، غل گلیاں ہن کے سرے پر نہم تاریک قہوہ خانے تھے۔ لڑکیاں دفتروں سے لوٹ رہی تھیں۔

” یہ منظر میرے لیے لرزہ خیز ہے۔“ ہری شنگر نے کہا۔

”ہاں۔“ طاعت نے اسی طرح جواب دیا۔

پہاڑی پر پہنچ کرو، مصوروں کی تصویریں دیکھتے پھرے اور مزید بور ہوئے۔

” وہ دیکھو تو ناونگیرہ آرہے ہیں۔“

” آہا۔“

نیچے میلہ لگا تھا۔ جیسی عورتیں ہاتھ دیکھ کر قسمت کا حال بتلارہی تھیں۔ بچے موگنگ پھلی اور آنس کریم کھار ہے تھے۔

” سب سے بڑی حماقت یہ ہے کہ ہم دوسروں کو اپنے خوابوں میں گھٹئے کی کوشش کریں۔“ مائیکل نے کہا۔

” ہاں۔“ طاعت نے دہرا�ا۔ ”میرا ماضی، میرا وقت، میرے خواب صرف میرے ہیں، وہ کسی اور کے نہیں ہو سکتے، گو خیال رکھو.....“ اس نے جلدی سے اضافہ کیا۔ ”میں شخصی سطح پر یہ بات کر رہی ہوں۔ مستقبل ہم سب کا مشترک ہے۔“

مائیکل نے ایک کنگراٹھا کر غصے سے اسے مارا۔ ”خدا کے لیے اس نقطے پر پہنچ کر بھی پارٹی لائیں مت چلا۔ مستقبل مشترک نہیں ہے۔ مستقبل اس پہاڑی کے اوہرہم سب کے لیے الگ الگ منہ چھاؤے کھڑا ہے، ہری کے دس سروالے خدا کی طرح۔“

”او ما نیکل۔“ ظاعت نے بچوں کی طرح کہا، ”یہ واقعہ ہے کہ میں بہت ڈرتی رہی ہوں۔“

”ہاں۔“

میرے ڈرانے کو کیا کم چیزیں تھیں۔ خوبصورت مناظر۔ آرام دہ گھر۔ بیک کھوتی تو اس میں سے طرح طرح کے کاغذات نکلتے۔ بنکوں کے مراحلے۔ شیرز کے کاغذات۔ جواہٹ اسٹاک کمپنیوں کی روپورٹیں جن پر نام ہوتے: سہنا، سر بیہین مکر جی۔ شری تھاپ۔ ان سب نامزد کے پیچھے ایک اور دنیا تھی۔ اونچی مضبوط عمارتیں۔ شفاف غیر شخصی دفاتر۔ روپیہ۔ روپیہ۔ معاشیات کے مسائل۔ اسٹرائیک۔ بھوک۔ بے روزگاری۔ ڈائریکٹروں کے اجلاس۔ ٹریڈ یونین۔ مزدور بستیاں۔ سٹی آف لندن۔ کلائیور و مکلتے۔ بشپ گیٹ۔ چورنگی۔ ٹانٹا گھر۔ اینڈ ریویوں نکلتے۔

”یہیں ڈرتے ڈرتے ان کاغذات پر دخنخت کرتی، جو گویا میرے تحفظ کے ضامن سماج میں میرے اونچے دولت مند درجے کے گواہ تھے۔ یہ سب کیوں ہے؟ مجھے اس کا کیا فائدہ ہے؟ میں نے تو نہیں کہا تھا کہ میں رضا خاندان میں پیدا ہو کر اس کھڑاگ کی وارث قرار دی جاؤں۔ کاغذ کے نکڑے۔ روپیہ۔ روپیہ۔

روپیہ۔ دھنٹا روپے کی اہمیت کا سارا احساس میرے دل سے مکمل طور پر زائل ہو گیا۔ لوگوں نے کہا: پورڈوں کے رئیس ایسے ہی غنی ہوتے ہیں، وغیرہ مجھے یہ سن کر بڑی بھی آتی۔“

وہ سب پتھروں پر بیٹھ گئے۔ نیچے واڈی میں جھیل کے پانی پر ڈوبتے سورج کی کرنیں رقصان رہیں۔ سالویشن آرمی والوں کا ایک دستہ بینڈ بجا تا سامنے سے گزرا۔

مال جھیل کے کنارے تنہا کھڑا تھا اور اس بلندی پر سے بہت چھوٹا سا نظر آ رہا تھا۔

معاً طاعت زور سے قہقہہ مار کر بھی۔

سب نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”میں نے ایک مرتبہ نرملہ سے پوچھا تھا: رانی بی بی! تمہیں ڈر کا ہے کا ہے۔ نرملہ نے جواب دیا تھا کہ میں اپنے خوابیوں کو اس سے بچانا چاہتی ہوں، وہ میرے خواب جاتا ہے۔ کتنی بھی کی بات ہے کہ نرملہ کے خواب اب اس کے پاس ہمیشہ کے لیے محفوظ ہیں۔ گوتم بالا خرال علم رہا۔ ہم اعلیٰ میں پیدا ہو کر اعلیٰ میں زندہ رہتے ہیں اور اسی میں ہرجاتے ہیں۔ یہی اصل سدھانت ہے۔“

مال ان کی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔ مائیکل نے جھک کر گھاس کا پتا توڑا۔ میلے میں بھتی ہوئی موسیقی ختم ہو چکی تھی۔ سردی زیادہ ہو گئی۔ ایک جیٹ طیارہ ان کے سروں پر سے گرجتا ہوا گزر کرتا رکی میں غائب ہو گیا۔ وہ سر اٹھا کر اسے دیکھا کیے۔

”علمی کا جو شہر ہم نے بس رکھا تھا اس کی دیواریں ہم نے فلسفے کی اینٹوں سے
چنی تھیں جہا۔“ طاعت نے بات جاری رکھی۔ ”ایک روز سیندھ لگا کر موت ہمارے
شہر میں داخل ہوئی۔“

”ایک مرتبہ جب فارن برائے ائیر فیஸول کے موقعے پر بے چارہ جان
ڈیری آواز کی سرحد توڑتے خود ہلاک ہو گیا تھا اس کا طیارہ فضا میں پاش پاش ہو کر
تماشائیوں کے اوپر آن گرا تھا..... بیسیوں لوگ مرے تھے۔ اس سے، جب
طیارہ دیکھتے ہوئے آشتن گولے کی صورت میں آواز سے زیادہ تیز رفتار کے
ساتھ میری طرف بڑھ رہا تھا، اس لمحے مجھے پتا تھا کہ یہ موت ہے۔ آن کی آن
میں میں بھی جل کر بجسم ہو جاؤں گی، مگر جانتے ہو۔ زمین پر اوندھے لیٹنے کے
بجائے میں طیارے کے نکلوں کی بوچھاڑ میں چند را اور زرینہ کو پکارتی پھری کہیں
وہ نہ مر گئی ہوں۔ مجھے اس وقت اپنے بجائے ان دونوں کی زندگیوں کی فکر تھی۔
اپنے متعلق تو احساس بھی نہیں تھا۔“

”لہذا از ملانے موت کا سامنا کیا تو مجھے لگا کہ اسے بھی خوف محسوس نہ ہوا ہو
گا گویہ ایک واحد تجربہ ایسا ہے جس میں انسان کسی دوسرے کو شریک نہیں کر ستا
لہذا ہم نے اسے یہ تجربہ کرنے کے لیے تھا چھوڑ دیا۔ بے چاری ہاتھ پاؤں مارتی
دریا کے تاریک کنارے میں بہہ گئی۔“

”ویدانت میں کہیں پر وجود کی چار کیفیتوں کا ذکر ہے۔ جا گتا ہوا انسان،
خواب، بغیر خواب کی نیندا اور موت۔“

”جس روز میں بے ہوش ہوئی تھی۔ مجھے اچھی طرح احساس تھا کہ میں بہت

گھری نیند سورہی ہوں۔ خالی اس گھری نیند میں مجھے خواب نہیں دکھائی دیے۔ میری آتما جا کر اندر ہیرے سے مل گئی اور جب واپس آئی تو مجھے معلوم بھی نہ ہوا کہ میں کہاں گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہی موت ہے اور جب یہ آئی تو آتما وہرے غیر مری لیکن ماڈی جسم کو ساتھ لے کر اپنی راہ نکل کھڑی ہوئی۔ اب بہت سے راستے سامنے تھے۔ ان پر مارا مارا پھرنا تھا مگر واپس نہیں آتا تھا۔ یاد جانے کیا ہوتا تھا۔ مہاراجہ جنک نے کہا تھا: ممکنا! جل رہا ہے مگر میں باقی ہوں۔ غالباً یہ صحیح ہے۔“ طاعت نے کہا۔

”ہم سب جلتے جا رہے ہیں۔“ ہری شکرنے مائیکل سے کہا۔ ”کیا آگ کی پیشیں تم تک نہیں پہنچیں۔“

مائیکل نے بے چینی سے پہلو بدلا۔
نیچے نیم تاریک گھائی میں مال گاتا پھر رہا تھا۔ اس کی آواز ہوا پر تیرتی ان لوگوں کے کانوں تک پہنچی۔ چاند درختوں پر طلوع ہو رہا تھا۔

طاعت پھر اپنے سفر پر چل کھڑی ہوئی: ”اس سے چاند سنگھاڑے والی کوٹھی کے باغ میں کنوئیں پر جھکا آنگن کے اندر کھڑا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”مرنے کے بعد روح شعلے سے رات میں، رات سے بڑھتے چاند میں، بڑھتے چاند سے بڑھتے سال میں، دیوالوں میں، والیوں کی دنیا میں ہوا، سورج اور بلجی سے گزرتی چلی جاتی ہے۔ واپسی میں وہ فضا، دھوئیں، بادل اور بارش اور پودوں میں پہنچی۔ قربانی کا شعلہ ہوا سے دھوئیں میں دھوئیں سے کہر میں، کہر سے بادل میں، بادل سے بارش میں تبدیل ہو کر برس جاتا ہے۔ ساری روئیں فضا میں تحلیل ہو گئیں۔“

”خیالات کا اور روح کا سفر ایک ہے۔“ شنکر نے کہا۔

”موت مجھے ختم کر دے گی۔ موت کو کون ختم کرے گا؟ ہوا میں میرے سانس کو اڑا لے جائیں گی۔ سورج میری آنکھوں کی روشنی پر پردہ ڈال دے گا۔ چاند میرے دماغ کو سادے گا۔ آتمان فضا میں گل جائے گی۔ خون پانی میں گل کر پانی بن گیا۔ طاعت نے چٹان پر کھڑے ہو کر دہرایا۔“

”گھری نیند۔ گہرا خواب۔“ شنکر نے کہا۔ ”عناصر سوچ رہے ہیں۔ حواس سوچ کے ہیں۔ صرف موت باقی ہے۔“

”جسم سوچتا اور محسوس کرتا ہے، وہ ختم ہوا تو سمجھو سب کچھ ختم ہوا۔ جلتی آنی، سرد پانی، تکنک ہوا میں۔ سب اپنے سجاوے سے آپ پیدا ہوئی ہیں۔ گوتم نے چپا سے کہا تھا: اگر تمہارا جسم تمہارے ذہن سے کوئی علیحدہ چیز ہے تو اسے علیحدہ کر دو اور صرف تم میرے پاس آ جاؤ، مگر تم ایسا نہیں کر سکتیں۔“ مادہ پرست گلشن نے کہا۔

”آئے پریم پلے پروانے جوال منی چھوی کے دیوانے جڑ چلن کے پچھے رے پیٹھی دیپ شنکھا لہرائے رے.....

” دیپ شنکھا لہرائے رے

چند رانے گایا۔

”ابھی بہت سوں کو مرنا ہے، میں ان کے پہلے جا رہا ہوں۔ بہت سے مر رہے ہیں، میں ان کے ساتھ جا رہا ہوں۔ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں جو مر گئے ان کے ساتھ کیا ہوا۔ آگے دیکھتا ہوں، جو میرے بعد مریں گے ان کے ساتھ کیا ہو گا؟“ ہری شنکر نے کہا۔

”چیونٹی چڑھی پہاڑ پر کانوں میں ہاتھوں لٹکائے
ایک اچنچا ہم نے دیکھا، نیا نقج ندیا ڈوبی جائے“
گھائی میں سے مال کے گانے کی آواز آئی۔

”میری قیمت کیا ہے۔ میں نے اب تک کیا کیا ہے۔“ سریکھانے کہا۔

”میں جو کچھ کرتا ہوں میرا ہر فعل لگتا ہے ساری کائنات کے چگر سے اس کا براہ
راست تعلق ہے۔ اس اہمیت کو چھپانے کی غرض سے میں ہستا ہوں۔ ویسے میں تم
کو یہ بتلا دوں۔“ مائیکل نے انگلی اٹھا کر کہا ”ہمارا حشر بہت بڑا ہو گا۔“

”کیا کریں۔ کیا کریں۔ کیا کریں۔“ ڈراو نے کورس کی مانندان کی آواز
پہاڑی پر گونجی

”سامنے مستقبلیں کی دیوار ہے اور میں مائیکل کی مانند اس کے سامنے کھڑی
کھڑی چلا چلا کر رورہی ہوں۔ کیا تکلیف اٹھانا جرم کا ثبوت ہے؟“ طاعت نے
کہا۔

”کسی امریکن نیگرو کو بلاو، کسی جرمن یہودی کو پیش کرو، کسی عرب بنناہ گزین کو
ہمارے سامنے حاضر کیا جائے، کسی پاکستانی مہاجر اور ہندو شرناہ تھی کو آواز
دو..... اور ان سب سے پوچھو کہ تمہارا جرم کیا ہے جس کی یہ سزا تم کو ملی؟“
گلشن نے کہا۔

”میں تمہارے سامنے موجود ہوں۔ میری سزا تجویز کرو۔“ مائیکل نے کہا۔

”اسرائیل کے نئے نغمہ نواز! ہم تو محض ڈیبورا کا گیت تم سے سننا چاہتے
تھے۔“ طاعت نے کہا۔ ”مگر تم نے ہاتھ میں بندوق اٹھا لی۔“

”ہم ہزاروں برس تک روتے رہے۔ صحراؤں کی بھوک۔ غصہ۔ بے کسی۔ چیز چیخ کر ہم نے یہوداہ سے فریادیں کیں۔ داؤد کے گیت کاروں کا کرب۔ بے چارگی۔ خواب۔ میں طاعت کا سوال دہراتا ہوں کیا تکلیف اٹھانا جرم کا ثبوت ہے؟ روح کی تنہائی انہوں نے اپنے لمحن میں انڈیل دی۔ گہرائی کی تنہائی۔ اوپنچائی کی تنہائی۔ دکھ، شک، ترغیبات اور گناہ کی تنہائی۔ کسی کشش میں گرفتار ہو کر انسان خود کو کس قدر را کیا لامحسوس کرتا ہے؟“ مائیکل نے کہا۔

”جنگلوں میں ایک ہزار جوگی بیٹھے بھجن کرتے تھے۔ میں نے ان کی آوازیں سنیں۔“ ہری شنکر نے کہا۔

”بابل اور فلسطین کے بزرہ زاروں پر میں گاتا پھر رہا تھا۔“ مائیکل نے کہا۔

”میں نے تمہاری آواز بھی سنی تھی۔“ طاعت نے کہا۔

”یہ سارے تصورات جمع کر کے ایک قربان گاہ کا پروہ کاڑھ دو یا کھڑکیوں کے شیشے رنگ دو۔ تمہارا تجھیل بازنطینی مصوروں کی طرح حد سے زیادہ بھر پور ہے۔“ مادہ پرست گلشن نے کہا۔

”تاریخ کا احساس میرے سر پر تواری طرح معلق ہے۔ میں اپنے آپ سے پیچھا نہیں چھڑا ستا۔“ مائیکل نے کہا۔

”کیا کریں۔ کیا کریں۔ کیا کریں۔“ کورس نے کہا۔

”کتابیں وہی تھیں جواب تک ہزاروں لوگ پڑھ چکے تھے۔ نئی کتابیں چھپتی تھیں۔ مضمون لکھے جاتے تھے۔ نئی کہانیاں بنتی تھیں۔ روز صحیح کو پہاڑوں پر روشنی پھیلیتھی۔ کیساوں میں داؤد کے نغمے دہرانے جاتے تھے۔ میرے رہائی نے کہا:

انسان کو سبب کی رات پانی نہیں پینا چاہتے اگر پئے گا تو اس کا اپنا خون اس کے سر پر ہے، لکھیں انسان پیاسا ہے تو اس کا کیا علاج ہو؟ اس سے کہو، انسان سے کہو داؤں کے ساتھ سات آوازوں کو دہراتے۔ خداوند خدا کی آواز پانیوں کے اوپر ہے۔ خداوند خدا کی لرزہ خیز قہرناک آواز۔ اس آواز سے لبنان کے دیوارٹ کر نکڑے نکڑے ہو جاتے ہیں۔ اس آواز سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں۔ اس آواز سے ویرانے لرزاتختے ہیں۔ جنگل سونے ہو جاتے ہیں اور اس کے ہیکل کے پنجاری کہاناتختے ہیں۔ تقدیمیں ہو..... تقدیمیں ہو..... مگر تم پھر بھی کہتے ہو: میں پیاسا ہوں میں پیاسا ہوں ماہیکل نے کہا۔

”بھوک سے زیادہ انسان پیدا ہوتا ہے۔ عمر بھرا سے بھوک ستاتی ہے۔ محبت کی۔ روئی کی۔ سکون کی۔“ مادہ پرست گلشن نے کہا۔ ”بھوک اور پیاس ہمارے سب سے بڑے بھوت ہیں ☆ میں سب سے پہلے ان بھوتوں سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں وہ دوسری نجات مجھے آپ سے آپ مل جائے گی۔“
مال گاتا ہوا چڑھائی پر آ گیا۔

”لوگوں کو احساس جرم اکتمحا کرتا ہے۔ یہاں احساس معصومیت نے کہیں کانہ رکھا۔ کاش ہم نے ایک آدھ چھوٹا موٹا گناہ کر لیا ہوتا۔ اس احساس معصومیت کی رسیبوں سے ہم سب ایک دوسرے سے جکڑے ہوئے ہیں۔ جس دن ہم میں سے ایک نے اس رسی کو توڑا ہم سب، ہمیشہ کے لیے تتر بتر ہو جائیں گے۔“ ہری شنگر نے کہا۔

طاعت اب ایک دوسری چٹان پر جا پہنچی تھی اور سب کی طرف سے پشت کیے

وادی کو دیکھ رہی تھی۔ ”ایسا بھی نہ ہوگا۔“ اس نے مذکور جواب دیا۔ ”ہمیشہ ہماری کلچر، ہماری بیک گراونڈ، ہمارا بے حد اونچا مول کوڈ آڑے آجائے گا۔“

”نہیں طاعت بیگم۔“ ہری شکر نے کہا۔ ”ہماری کلچر کی رسی تو پہلے ہی نوٹ چکی ہے۔ جس کے ایک سرے پر تم اور دوسرے پر میں ہوا میں معلق لٹک رہے ہیں۔“

”اپنے بھتوں کو بھول جاؤ، اپنے بھتوں کو بھول جاؤ۔“ گشن نے کہا۔

پھر شیشے کا بڑا دروازہ کھلا۔ اس میں سے جو لوگ اندر آ رہے تھے۔ ان میں چمپا بھی تھی۔ ہلو۔

اس نے کہا اور میری طرف آئی۔ یہ کون لوگ ہیں؟ یہ کون جگہ ہے؟ یہ چوزے کی سرائے ہے اور میں جہاز کے ففتر فون کر رہا ہوں۔ میں فی الحال بہت محفوظ ہوں۔ میرے چاروں اور شہر کی سنگی عمارتیں کھڑی ہیں۔ میرے پیروں کے نیچے ٹھووس زمین ہے مگر مجھے بے حد ڈر لگا۔ چمپا باجی میرے سامنے موجود ہیں۔ ان کے بال بھی وہی ہیں۔ سای بھی اسی انداز سے پہنی ہے۔ وقت کا الاؤ جو جل رہا ہے اس میں وہ بڑی نکھری ہوئی نظر آ رہی ہے اور مجھے یہ بھی احساس ہے کہ مجھے اسے دیکھ کر کوئی خوشی نہیں ہوئی کوئی رنج کوئی جھنجھلا ہٹ بلکہ یہ کہ میں جلد از جلد یہاں سے چیختا ہوا بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ میں کیا کر ستا ہوں کہ تم چمپا ہو۔ اگر تم دوبارہ دس پندرہ سال تک بھی مجھے نظر نہ آؤ تو مجھے ہرگز فکر نہ ہوگی۔ پندرہ سال قبل میں تم کو دیبی کہا کرتا تھا۔ اب تم تب سے بھی زیادہ خوبصورت نظر آ رہی ہو۔ زیادہ سمجھدار، سمجھیدہ، بر دبار۔ اللہ جانے تم کیا کیا بن چکی ہو۔“ میں نے سنا تھا کہ آپ آج کل اپنی آواز اردو میں ڈب کر رہی ہیں کسی فلم کے لیے۔ شاید آں کہہ رہا تھا۔

”میں نے اخلاقاً گفتگو شروع کی۔

مجھے لگا جیسے وہ کوئی بڑا اہم بات بتانا چاہتی تھی مگر خاموش ہو گئی۔

آسمان پر بادل گھر آئے تھے اور یہکی چکلی بارش شروع ہو چکی تھی۔ ”چمپا بابی سامنے کون فلم ہو رہا ہے؟“ میں نے پھر اخلاقاً گفتگو کی سعی کی۔ لوگ جو سینماوں میں سے باہر نکل رہے تھے۔ ان کے چہرے اداس تھے۔ بیزاری سارے ما حول پر چھائی تھی۔ روشنیاں غمگین تھیں۔ موسیقی رو رہی تھی۔ سڑک پر موڑوں اور بسوں کے چلنے کی آواز میں پژمردگی تھی۔ وقت گھٹتا جا رہا تھا، وہ شیشے کی بڑی دیوار سے ناک چپا کر کھڑی ہو گئی اور باہر ٹریک کو دیکھنے لگی۔ میں جلدی سے اسے خدا حافظ کہہ کر باہر آ گیا۔

”اب میں نے اس کو بہت پچھے کھڑا چھوڑ دیا ہے۔ میں گھر کی طرف جا رہا ہوں وہ اس بیکراں اواسی، سنائے کے اس پر شور بخور میں اکیلی چپ چاپ شیشے کے درازے کے پاس کھڑی رہ گئی ہے۔ میں کیوں اس قدر تھک گیا ہوں۔ مجھے چپا بیٹھ جانے دو۔“ مال نے قریب ایک پتھر پر بیٹھنے کے بعد کہا۔

”لکڑی جل کوملہ بھی، کوملہ جل بھی را کھ میں برہن ایسی جلی نہ کوملہ بھی نہ را کھ،“ چند رانے گایا۔

”چوروں کی طرح ہم نے بھی اپنے اپنے دیوتا جگائے۔ مگر دیکھو کیا ہوا۔ دیوتا صاف چوت دے گئے۔“ طاعت نے کہا۔

”کاکا سب تن کھائیو، چن چن کھائیو ماس

دولی نینا جن کھائیو، پیا ملن کی آس۔“

”سبرنگ کا کہرہ اب سارے میں پھیل گیا ہے۔ سب اس کہرے میں بہتے چلے جا رہے ہیں۔ میں تاریکی کے کنارے، اجائے اور خوف کے سکم پر پاؤں لٹکائے ہونے کے رنگ والے خدا پر جاپتی کی مانند از سرنوچیزوں کے نام تجویز کر رہی ہوں۔“ طاعت نے کہا۔

”دیکھو۔“ اس نے چٹان پر کھڑے ہو کر افق کی طرف اشارہ کیا۔

”ماںیکل..... ادھر تھا را یرو شلم ہے۔ ہم سب کا یرو شلم ہے۔“

”اور یرو شلم بھی تقسیم شدہ ہے۔“ ہری شنکر نے یاد دلایا۔

”اوپر پیہاڑیوں پر داؤ کے نغمہ نواز کرتے پھر رہے ہیں۔ لحن ختم ہو چکے۔ صلیبوں پر یسوع کے ساتھ ہمیں لٹکایا گیا ہے۔ یسوع کے بجائے ہم سوئی پر چڑھتے ہیں کیونکہ ہم سب سے بڑے چور تھے۔ ہم نے خدا کے خزانوں میں سے مسرت کی چوری کرنا چاہتی تھی۔“ طاعت نے کہا۔

”دبی شیشے کے دروازے کے پیچھے کھڑی رہ گئی ہے۔ اب مجھے کچھ یاد نہیں۔

گزرتے ہوئے برس بگولوں کی طرح میرے چاروں اور منڈلا رہے ہیں۔ شرکوں پر بارش میں رات کی روشنیاں جھلملاتی ہیں۔ سوتے ہوئے مکانوں کی جمیوں پر سے چاند اڑھلتا ہوا سمندر کی اور جا رہا ہے ندی کے کنارے، گل پوش شہرے باغوں میں۔ ایسٹ لینگلیا کے جنگلوں میں تیز ہوا میں چل رہی ہیں۔

سمسان بندرگاہوں میں سیاہ پانیوں پر رات کے پرندے چکر کاٹ رہے ہیں۔

میرے سامنے سے لوگ کے ہجوم گزرتے ہیں۔ جھیل میں ڈونگیاں تیرتی

ہیں۔ میں کنارے پر ہوں۔ مجھے اب اپنے جہاز کو تلاش کرنا ہے۔ ایسا جہاز جس کی روشنیاں بجھ گئی ہوں، جو پیکے سے سمندر کی عمیق تاریکی میں داخل ہو جائے۔ ایسا جہاز جو صرف اس سمت جاتا ہو جہاں کوئی خوش آمدید کہنے والا نہ ہوگا۔ ”مال نے کہا۔

کہرا اب بہت گہرا ہو چکا تھا۔

”جتن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے رونے بدھنا ایسی رین کرو کہ بھور کبھی نہ ہوئے۔“ چند را گاتی ہوئی پیہاڑی کے نیچے اتر گئی۔

”روپ اور نام روپ۔“ ہری شنگر نے کہا۔

”و دیا اور او دیا۔“ طاعت نے کہا۔

”کافٹ اور وید انت۔“ مائیکل نے کہا۔

”اب ہماری سمجھ میں آ گیا ہے۔“ سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

”کیونکہ جذبات اور خیالات کی سب سے اوپھی چوٹی پر ہمیشہ وہی اکیلا کھڑا رہ جاتا ہے۔ تنہا، ازلی اور ابدی جس کا نام گوتم ہے اور مائیکل اور ہری اور سرل، اور مال رضا۔ اس کی تنہائی امٹ ہے۔“

سرد تاریک ہواں میں ان کی آواز ڈوب گئی بزر کھرے نے ان کو اپنے اندر ڈھانپ لیا۔

طاعت دوسرے روز صبح منہ انڈھیرے نیوب میں بیٹھ کر جیلی سی روائی ہوئی۔ اس وقت بہت سخت سردی پڑ رہی تھی اور دھنڈ کی وجہ سے ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دتا تھا۔ اندر رگرا ڈمڈا شیشن ابھی سنسان پڑے تھے۔ وہ جیلی پہنچ کر اس مانوس شرک پر چلنے لگی جس پر کئی سال سے چلتی آئی تھی۔ یہ راستہ بھی ختم ہوا۔ اس نے سوچا کہا کے بلاک پر پہنچ کر حسب عادت فرن کے پتوں کو چھواؤ۔ بوڑھے پورٹر نے، جس کا ایک ہاتھ کٹا ہوا تھا، اسے دیکھ کر سر ہلا کیا اور مسکرا کیا۔ برسوں سے مسٹر جنکنز اور طاعت میں نے یہ مکالمہ ہوتا آیا تھا: کیسا اچھا موسم ہے یا کیسا برا موسم ہے یا اچھی ہوا چل رہی ہے یا بہار آنے والی ہے۔ مسٹر جنکنز زندگی کے اس ڈرامے کا خاموش کورس تھا۔ مسٹر جنکنز، جس کا دایا ہاتھ بر ماکے مخازن پر کٹ گیا تھا، لفت کے پاس کھڑا رہ گیا۔ طاعت اور پہنچی۔ گیلری کے دیہ سرخ قابینوں پر سے گزر کر اس نے کمال کے فلیٹ کے دروازے پر دستک دی۔ آج گویا جو کچھ ہو رہا تھا ایک اداس سے رمزی حیثیت رکھتا تھا۔ کمال نے دروازہ کھولا۔ اس کا سامان فرش پر بکھرا پڑا تھا۔ خاموشی سے، ایک لفظ کہے بغیر دنوں پینگ میں جد گئیں۔ اتنے برسوں میں کتنی گرہستی جمع ہو گئی تھی۔ برتن، کتابیں، مبوسات۔ یہ بھی تم لے لو، یہ بھی تم لے لو۔ کلامیں کافی انداز سے کہتی چلی گئی۔ کتابوں کو بڑے ٹرک میں ٹھونسا گیا۔ جوتے نکال باہر پھینکے گئے۔ تصویریں دیواروں پر سے اتریں۔ سامان کے ڈھیر پر بیٹھ کر ایک اپنی کیس بند کرتے کرتے کمال نے یکنہت ہوا میں ہاتھ لہرا کر Ash

Wednesday پڑھنا شروع کر دی اور پھر اسی طرح چکنی ہو کر سلیپر اور ہاوس کوٹ سمینے میں مصروف ہو گئی۔ باہر بھی وہندہ کا موجود تھا۔ ایک آدھروشنی کسی فلیٹ میں جھلما جاتی تھی۔ ”یہ گوم صاحب بھول گئے یہاں پر۔“ طاعت نے ایک کتاب انٹھا کر اسے اٹھا پلنا اور صندوق میں اوپر سے گرا دیا۔ جس طرح تالاب میں پتھر گراتے ہیں۔ اب وہ تھک گئی۔ چائے بنانی گئی۔ سوریا ہوا۔ آدھ گھنٹے بعد کمال آئینہ کے لیے روانہ ہو گئی۔

اب طاعت نے مال کا سامان پیک کرنے کی غرض سے واپس گھر کی طرف رخ کیا۔ صبح دس بجے مال کی بوٹ ٹرین چھٹ رہی تھی۔

ادبی ذوق

۹۶

جہاز کے برآمدے میں آرکیسٹرا کا رخصتی نغمہ بلند ہوا۔ مال کا فتحاً دل بھر آیا، وہ ریلنگ پر جھکا نیچے دیکھتا رہا۔ لندن میں اسے بوٹ ٹرین پر پہنچانے کے لیے بیسیوں لوگ آئے تھے۔ آنسو پوچھے گئے تھے۔ رومال ہلائے گئے تھے۔ اوجیت اور تزوہ نے تو چول چول بھی شروع کر دیا تھا۔ قدم قدم بڑھائے جا، خوشی کے گیت گائے جا..... گویا وہ سپاہی تھا اور ایک ایسی جنگ میں کوئے نے جارہا تھا جس کا مقصد کسی کو معلوم نہ تھا۔

مگر پورٹ سمعتھر میں وہ اکیلا تھا۔ اجنبی بندرگاہ، اجنبی مسافر، دنیا کی

اجنبیت ابھی سے اس کے لیے شروع ہو گئی۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے
امنڈتے ہوئے آنسوؤں کو ضبط کیا۔ برابر میں دو بوڑھے کھڑے تھے۔ ان میں
سے ایک نے شفقت سے اس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ مال نے جذبہ تشكیر میں
ڈوب کر اسے دیکھا۔ بوڑھا سونی سونی آنکھوں سے بندرگاہ کا نظارہ کر رہا تھا۔
جہاز نے لنگراٹھایا تو وہ اپنے کیمبن میں آگیا اور سارا دن اس نے اپنے کیمبن میں
گزار دیا۔ اپنے ہم سفر سے بھی بات نہ کی جو کوئی اطابوی معمارتھا۔

دوسرا روز اس نے سارے جہاز کا جائزہ لیا۔ ہندوستانی اور پاکستانی فاران
سرود کے چند اعلیٰ حکام اور ان کے خاندان فوجی افسر طالب علم جو سرکاری وظیفوں
پر سفر کر رہے تھے۔ چند پاکستانی، ہندوستانی اور بڑکا کی لڑکیاں جو ڈاکٹری اور
ایجوکیشن کی ڈگریاں لے کر لوٹ رہی تھیں۔ انگریز اور امریکن جو دولت مشترکہ اور
امریک امداد کے پروگراموں کے تحت برصغیر کو ترقی دینے کی غرض سے جا رہے
تھے۔ ٹورست کلاس کا مجمع زیادہ دلچسپ تھا۔ طلباء جو اپنے خرچے پر پڑھنے آئے
تھے۔ ان پڑھ سکھ اور کاروباری، مشنری، کیتھولک راہبیات، ایک فرانسیسی بھائشو۔
برلن کی مسجد کے قیادیانی مبلغ اور ان کا خاندان۔ پنڈت جی، جن کو مال لندن میں
بھی جانتا تھا جو چھٹی پر گھر جا رہے تھے، اور مغل سکول میں پڑھاتے تھے۔ شدھ
ہندی بولتے تھے۔ بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ گھنٹھریاں لے لبے لبے بال،
لڑکیوں کی الیک خوبصورت شکل، دبلے پتلے نازک سے، مہاتما گاندی کے چیلے،
بے حد نہ سکھ اور خوش اخلاق۔ چلے کے جاؤں میں بھی لندن میں دھوتی اور چپل
پہنتے۔ برج کے علاقے کے لوگ گیتوں پر ریسرچ کر رہے تھے۔ ”ری اماں

مورے بھیا کو سمجھو ری کہ ساون آیا، ”خوب لہک لہک کر گاتے۔ انہوں نے چھوٹتے ہی مال سے فرد افر داسارے دوستوں کی خیریت پوچھی اور ماری نر ملا کے دیہانت پر انہمار تعزیت کیا۔ مائیکل بھی، جو جبرا اس تک جا رہا تھا، نورست کلاس میں تھا۔

شروع شروع میں فرست کلاس کی لڑکیوں نے مال کے بے حد دلچسپی سے دیکھا مگر جب اس نے کوئی پیش قدمی نہ کی تو وہ اکتا کر دوسرے لوگوں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

ایک روز مال برآمدے میں آرام کری پر بیٹھا ریلنگ میں پیر انکائے والقٹا سمندر کی لہریں گن رہا تھا کہ چیچھے سے کسی کی آواز آئی:

”میں یہاں بیٹھا ستما ہوں؟“

”ضرور اس نے سراٹھا کر دیکھا، وہی بوڑھا کھڑا مسکرا رہا تھا جس نے پہلے روز مال کو خاموشی سے دلا سا دیا تھا، وہ اس اجنبی بوڑھے کی اس چھوٹی سی صہر بانی کا بے حد ممنون تھا، وہ جلدی سے اٹھ جیٹھا اور اس کے لیے وسری آرام کری کھینچ لی۔“

”فریڈ، پال، تم لوگ بھی ادھر آ جاؤ۔“

”مٹھرو، ہم نیز لے آئیں۔“

چند لمحوں بعد دو اور یورپین آ کر قریب بیٹھ گئے۔

”میرا نام ڈاکٹر ہینس کریمر ہے۔ میں آسٹریا ہوں۔ میں اور میرے دونوں دوست، جوتا رنج کے پروفیسر ہیں، انڈیا جا رہے ہیں۔ تم انڈیا ہو؟“

”ہاں“

”اسی لیے میں نے پہلے سے پوچھ کر اطمینان کر لیا کیونکہ کل میں نے اس سامنے والی اڑکی کو انڈیں کہہ دیا تو وہ بھرگئی، وہ پاکستانی ہے۔“ تینوں کھوکھلی ہی نہیں ہنسے۔

کمال خاموش رہا۔

”تم انڈیا میں رہتے ہو۔“

”جی۔“

”میں بودھ جینشی کے لیے جا رہا ہوں۔“ ڈاکٹر کریم نے کہا۔

”اوہ؟ اوہ! بدھ جینشی!!“

”بودھ اترنخ کا سب سے بڑا آدمی تھا۔“ پال نے اظہار خیال کیا۔ ”تم ہندو ہونا؟“

”جی نہیں۔“

”اوہ، معاف کرنا، مجھ سے پھر غلطی ہوئی۔ تو کیا تم محمد ن ہو؟“

”جی۔“

”تو پھر انڈیا میں کیسے رہتے ہو؟“

”یہی اب تک خود میری سمجھ میں نہیں آیا۔“ کمال نے جواب دیا۔

”ہائی ڈوک..... ایک امریکن نے بٹاشت سے قریب آتے ہوئے کہا۔“

”ہائی! اس نے بے تکلفی سے مال کو مخاطب کیا۔

”ہائی!!“ کمال کہتے ہیں۔

”میرا نام نامس جیر لڈائیکنر ہے۔ مگر مجھے نام پکارو اور تم؟“
”مجھے مال کہتے ہیں۔“

میں تم کو کم کہوں گا..... کپلنگ کام!!?

”لو بیز پی او لڈ نام۔“ مال نے آکتا ہٹ کے ساتھ کہا۔

”باقی جرئت لوگ کہاں ہیں؟“ فریڈ نے پوچھا۔

وہ لوگ بھی آگئے۔ ان میں سے ایک فرانسیسی تھا، مارلیس، جو ہند چینی جارہا تھا۔ وہ دوسرے ایک مشہور برطانوی شاعر تھا جو بی بی کے نمائندے کے حیثیت سے بده کی پچیس صد سالہ بریسی میں شرکت کے لیے عازم ہند تھا۔ چند دولت مند امریکن سیاح خواتین تھیں جو امریکہ سے اسی یا تراپر نکلی تھیں۔ ایک فرانسیسی بھکشو نارنجی چادر میں مابوس سب سے الگ تھلگ ایک کونے میں بیٹھا رہتا، وہ بھی گیا اور بنارس جا رہا تھا، وہ ثورست مسافر تھا۔

”میں دیکھتا ہوں کہ تم دوڑ دوڑ کریچے بہت جاتے ہو۔“ کھانے کے وقت نام نے مسکرا کر دوستانہ لبجے میں مال سے کہا۔ ”کیا وہاں تمہاری گرل فرینڈ سفر کر رہی ہے؟“

”نہیں میرا پر انا دوست ہے، مائیکل گولڈ اسٹائن کیمبرج میں میرا ہم جماعت تھا۔ اس سے آپ ضرور ملنے گا۔“

”مائیکل گولڈ اسٹائن میں، یہودی ہے؟“ پال نے پوچھا۔

”ہاں۔“

”اوہ۔“

خاموشی چھائی۔

”اور سونے پر سہا گہرے یہ۔“ مال نے گلا صاف کر کے کہا، ”کہ اسرائیل جارہا ہے۔“

شام کو مال نے مائیکل کو ان سب لوگوں سے ملوایا۔ پنڈت جی بھی اس حلقے میں شامل ہو گئے۔ اب ان سب کی المک بینٹھک ساتھ رہتی۔ ایک بیگم صاحبہ نے، جو نیوپارک سے آرہی تھیں، کئی مرتبہ مال کو اپنی محفلوں میں بلایا۔ ان کی لڑکی بھی ہمارا تھی اور یونیورسٹی آف سنٹائزی سے سو شل سائنس میں ایم۔ اے کر کے آرہی تھی اور حیرت انگیز طور پر کم عقل تھی۔ بیگم صاحبہ کے گروہ میں اعلیٰ افسران اور دوسرے بڑے لوگ شریک رہتے۔ دو مسلمان لڑکیاں اور تھیں جو ہمیشہ ننگ کرتی رہتیں۔ ایک مرہٹی لڑکی گاتی بہت عمدہ تھی۔ یورپین اور امریکن لڑکیاں ہر وقت آفتابی غسل میں مصروف رہتیں مال کی شکل و صورت اور اس کی کم آمیزی سب کو بہت بھاگئی تھی۔ کون کہہ ستا تھا کہ یہ ہی ہر وقت بلڑ مچانے والا لڑکا ہے جو ایسا فقیر منش بنا ہوا ہے۔

دن بھر اور رات گئے تک وہ سب ادھر ادھر کر رہیوں پر بیٹھے کتابوں پر تبصرہ کرتے۔ فلسفہ تاریخ کھنگالا جاتا۔ پنڈت جی کیرتن کرتے۔ لیاں بھا سکر گاتی۔ رات کو قصص ہوتا۔ سینما دیکھا جاتا۔ ہر طرف زور شور میں فلٹیشن چل رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے قصے تیار ہو گئے۔ شادی شدہ بیگمات مسلمان لڑکیوں کی ایک ایک بات نظر میں رکھتیں۔ جہاز پر ایک شادی بھی تقریباً طے ہو گئی۔ ایک پٹھان انجینئر صاحب تھے ایک کراچی کی ماہر تعلیم صاحبزادی تھیں۔ دونوں گھنٹوں ڈیک پر

کھڑے ہو کر سمندر کے منظر کا مطالعہ کریں تو احوالہ بہن رشیدہ سلطانہ کے کافوں میں شادی کی گھنٹیاں بجئے لگیں گی۔ ایک شادی شدہ بزرگ، جو تہاں سفر کر رہے تھے، بہن ایڈ وینارت وردھن پر بہت مہربان ہو گئے جو کو لمبی جاری تھیں۔ اس کا بڑا قصر رہا۔ مال یہ سب دیکھا کرتا۔ جہاز کی اس چھوٹی سی مدد و دنیا میں انسانوں کی ساری اچھائیاں، ساری کمزوریاں ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہتی تھیں۔ کاش میں بھی ان عام نارمل انسانوں میں شامل ہوتا۔ وہ بعض مرتبہ جھنجرا کرو چتا اور پھر ڈاکٹر کریم کے پاس جا بیٹھتا۔ اپنے ساتھی پچھڑ گئے تھے مگر یہ لوگ کتنے اچھے تھے۔ سفر بہت تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔

کل صبح جہاز جبراں پہنچنے والا تھا۔ مال مختلف گروہوں میں بیٹھ کر لوگوں کی باتیں سن کر، تاش کھیل کر، سومنگ کر کے، لانبری یہ میں رسالے پڑھ کر اب بڑی طرح اکتا چکا تھا۔ ایک انگریز لڑکی سے فلموں پر تباولہ خیالات کرنے کے بعد وہ پھر سارے جہاز کا چکر لگاتا پھر اور آخر سب سے اوپر کے ڈیک پر جا کر کھڑا ہو گیا۔

عقب سے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا، دور کشمیوں کے پاس ڈاکٹر ہمیں کریم اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ مائیکل رینگ کے سہارے کھڑا ان کو مخاطب کر رہا تھا۔ ایک امریکن پروفیسر لڑکی فرش پر دری بچھائے کہنیوں کے بل لیئی تھی۔ کسی نے گٹار بجانا شروع کر دیا تھا۔
”آنکھوں۔“ مائیکل کی آواز آئی۔

”کیا آنکھوں۔“ ٹام نے کہا۔

”جو میں کہتا ہوں اس کی غلط رپورٹ کرو کیونکہ خداوند خدا کی وعدہ کی ہوئی روئی تم اسی طرح ماتحت ہو۔“ مائیکل گرجا۔

”اوہ۔“ مال نے سوچا، مائیکل اور ٹام میں پھر جھڑا شروع ہوا۔

”مصیبہت یہ ہے مائیک“ ٹام نے کہا ”کہ تم جذباتی ہو۔ آخر ہونا اصل نسل ایشیائی!“

”میں جذبات کو باعث شرم یا گالی نہیں سمجھتا۔“ مائیکل نے منہ لٹکا کر جواب دیا۔

”آہا۔“ پنڈت جی نے زفیس چھٹکا کر کہا۔ ”آئینے شری رجاحی۔ اپنا مائیکل ایک اور بھاشن دے رہا ہے۔“

”آما، پنڈت جی! اس کی کٹوٹا کاوش ناشک میرے پاس بھی نہیں۔“
مال نے اس کر جواب دیا۔

برطانوی شاعر غور سے دونوں کو دیکھتا ہا۔

”مصیبہت یہ ہے،“ ٹام نے مال سے کہا، ”جو غیر ملکی تمہارے ملک کے بارے میں کچھ لکھتا ہے تم اسے ایسی ایم۔ فارسٹ کے پیانے سے ناپتے ہو جو بے چارہ خود آئندہ ملک تھا۔ بونوں کی دنیا میں رہنے والا دیو۔“

”فارسٹ نے اپنا ناول ۱۹۲۲ء میں لکھا تھا۔ اس وقت اس نے ڈاکٹر عزیز کو ہندوستان کے نمائندہ کردار کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔“ برطانوی شاعر نے کہا۔

”آج اگر فارسٹ دوسرا ”میسح نو انڈیا“ لکھتے تو اسے اپنا یہ کردار بدلا پڑے گا۔ اب ڈاکٹر عزیز ہندوستان کا نمائندہ نہیں رہا۔ اب ہر مسلمان لا محالہ پاکستانی ہے۔

اب ہندوستان کا صحیح نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔“

”ہاں۔“ مال نے جواب دیا۔

”مال تم نے بہت دکھا اٹھائے ہیں؟“ شاعر نے پوچھا۔

”ہاں۔ مگر مظلوم کے روپے میں نظر نہیں آنا چاہتا۔ ہندوستان کی ازی اور ابدی، دکھنے والی روح۔! تھل، یہ گر لیں، یہ دکھا اٹھانے اور برداشت کرنے کی عادت، تم موسیو پال بلال کی طرح دھوتی پہن کر چوکے میں بینجھ جاؤ تب بھی نہیں سمجھ سکتے۔“

”سینٹ آ گسٹن تو بیارس میں پیدا نہیں ہوئے تھے۔“ مارلیس نے پوچھا۔

”کیتوں لک نظر یہ حیات ایک مخصوص Cult تھا۔ ساری زندگی کو اس نے اپنے اندر نہیں سمیا اور نہ تم آج کیتوں لک ہونے کے باوجود انڈو چاٹاٹڑنے کے لیے نہ جا رہے ہوتے۔“ مال نے چڑ کر جواب دیا۔

”آبزرو اور combatant میں کیا فرق ہے؟“ مارلیس نے پوچھا۔

”تم اپنے آپ سے پوچھو۔ وہرے جنگ کریں تم او بزر و کرتے رہو، اس سے کیا احساس جرم کم ہو جاتا ہے؟“ مال نے کہا۔

”تم تو مجھے کو نیکر ز کی طرح پروفیشنل امن پرست معلوم ہوتے ہو۔“ نام نے

کہا۔

”بھور بھئے گین کے پا چھے مدھو بن موہی پٹھایو۔“ ڈیک کے سرے پر لیا بھاسکر نے گانا شروع کیا۔ مال نام کی بات کو نظر انداز کر کے گانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پنڈت جی نے تال دینا شروع کی۔ چند لمحوں بعد وہ دونوں لیا بھاسکر کی

طرف چلے گئے۔

ہر کلچر کی ایک خفیہ زبان ہے جسے صرف وہی کلچر سمجھ سکتی ہے۔ برتاؤی شاعر نے کہا۔

”مزید! سپنگارا!“ نام نے کہا۔ ”پنڈت اور کم کی کلچر ایک کہاں ہے؟“

”تم تو خیر مانیکل کی بھی خفیہ زبان سمجھنے سے قاصر ہو۔“ برتاؤی شاعر نے مسکرا کر کہا۔ ”اسرا رتھماری سمجھنے سے بالاتر ہیں نامس جے ایکنز !!“

مانیکل ڈرانی مارٹینی کے اثر میں بتتا ایک کونے میں چپا بیٹھا تھا۔ اپنا نام سن کروہ چونکا۔ میکانگی انداز سے اس نے پٹ کرو ہیں سے بات شروع کر دی جہاں سے اس کا سلسہ تقریر منقطع ہوا تھا۔

”دکھو مانیکل پھر گر جا،“ دنیا کی اقوام کی تاریخ فتوحات اور سلطنتوں کے قیام اور ملکوں کی آباد کاری سے عبارت ہے۔ میرے ہاں تاریخ کا سلسہ شدید ترین مظالم اور تکلیفوں کی داستان کی طویل کڑی ہے۔ تیرھویں صدی میں مجھے انگلستان سے نکلا گیا۔ چودھویں میں فرانس سے پندرھویں میں اپین کا قہر شروع ہوا۔ سارا زمانہ میں نے یورپ کے شہروں میں اچھوتوں کی طرح زندہ رہ کر گزارا مگر میں خانہ بدوش، دنیا کی لعنت کاشکار، مشرق اور مغرب دونوں جگہ میں نے آنسوؤں کے چراغ جلا کر علم کی روشنی پھیلائی۔ میں نے بوعلی سینا اور ابن خلدون اور امام غزالی اور الفارابی اور خوارزمی کے نظریوں کو یورپ میں راجح کیا۔ میں نے

”دھڑرو تم بھولتے ہو کہ نام نے بخشنا شروع کیا۔“

لیا ابھا سکرگاتی رہی مال نچلے ڈیک پر اتر آیا جہاں برآمدے میں موسیقی بج رہی تھی۔ بیگماں خوبصورت ساریاں اور شلواریں پہنے ایک حلقے میں بیٹھی تھیں ایک میز پر برج ہو رہا تھا۔

دوسرا طرف سینما دکھلایا جا رہا تھا۔ مال ایک کھبے سے لگ کر اندر ہیرے میں کھڑا ہو گیا۔ سامنے اسکرین کے پیچے عمیق بیکار اندر ہیرا تھا۔ اسکرین پر ایک غنڈہ صفت لفروں کی شکل والا مشترقی بریلن کا کمیونسٹ جاسوس امریکن ہیر ون کو اڑا لے جانے کی فکر میں دبے پاؤں ایک گلی میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں پستول تھے، پھر ہیر ون موزہ اتار کر چھپت پر چڑھ گئی۔ دوسرا طرف سے ہیر ون، جو شاید رابرٹ ٹیلر تھا، کو دکر سامنے آیا اور کمیونسٹ ویلن کو چاروں شانے چت گرا کر ہیر ون کو بچانے کے لیے لپکا۔

”آئیے، آئے، بیٹھئے مال صاحب۔“ مس خان نے کری سکھنچتے ہوئے کہا۔ ”جی نہیں، اب میں چل دوں۔ میں یہ فلم پہنے دیکھ چکا ہوں دراصل۔“ لڑکیوں کو کھس پس کرتا چھوڑ کر وہ ڈرائیگر روم میں داخل ہوا جہاں کراچی اور کلکتہ کے چند ملک التجار پیس پگال کا تذکرہ کر رہے تھے اور قیمتوں لگارہے تھے۔ ان کی بیویاں اس وقت باہر سینما دیکھنے میں مختصیں۔ ان کے قریب سے گزرتا ہوا وہ ایک در تپے میں جا کھڑا ہوا۔

کیوں جی، اب کے سے مری ڈریز خرید کر خشکی کے راستے واپس آیا جائے کراچی۔ کیا خیال ہے؟ وہ فور ڈکنسل تو میں نے اپنے بھائی کو دے دی۔ در تپے کے نیچے برآمدے میں باقی ہو رہی تھیں۔ ”اچھا جی میں اپر میل میں یو۔ این۔

سیشن کے لیے نیویارک جا رہی ہوں۔ مجھے اپنی بھائی کا پتا ضرور دے دیجئے گا۔
شیوتواب میں ۵۶ کاموڈل ہی لاوں گی۔“

”کیا کیا جائے، پاؤ نہ میں ملتے۔“

”میری بڑی بٹکی نے لاہور سے ایم۔ اے کر لیا ہے کہیں اس کی شادی
کرائیں۔“

”کیا الٹکا چاہیے۔“

”کم از کم سی ایس پی تو ہو۔“

”کہیں کام کر رہی ہے پنجی۔“

”جی ہاں۔ کنڈر گارٹن اسکول میں پڑھاتی ہے۔ ویسے اس کو تو امریکہ کا اسکالر
شب بھی مل گیا ہے مگر میں چاہتی ہوں کہ شادی.....“

”ہاں جی۔ یہ تو بالکل ٹھیک ہے۔ یہ بیگ روم سے لیا؟“

”جی..... آپ..... اب کے امریکہ سے بہت جغا دری فری بندیر
لے آئیں۔“

”جی کیا بتاؤں..... ضروریات زندگی بڑھتی ہی چلی جا رہی ہیں۔“

”یہ تو بالکل ٹھیک ہے۔“

مال در تپے سے ہٹ آیا۔ سیڑھیاں اتر کر ٹورست کلاس کا چکر لگانے میں
مصروف ہو گیا۔ ڈیک پر سردار صاحبان دری بچھائے ہیر گانے میں محو تھے۔
دوسری طرف رقص ہو رہا تھا۔ ڈرائیور میں تاش کھیلے جا رہے تھے۔ مال
ماںیکل کے کیبین کے سامنے سے گزر اور اسے یکخت خیال آیا کہ کل صبح ماںیکل

جبراہر پر اتر جائے گا اور اس کے عین بعد ممکن ہے کہ ساری عمر، مرتے دم تک اس سے دوبارہ ملاقات نہ ہو۔ کیسی عجیب بات تھی۔ سردار صاحبان کے گانے کی آواز مدمم پڑ گئی۔ وہ ماںیکل کے کیبن کے باہر رینگ پر جھکا کھڑا رہا۔ سامنے پورنماشی کا چاند افق پر طلوع ہوا تھا۔ سمندر بے حد پر سکون تھے۔ جہاز ہروں کو چیرتا ہوا وقار سے آگے بڑھ رہا تھا۔ ڈیک کے اس حصے میں مکمل تہائی تھی۔ صرف فرانسیسی بھکشوں ایک سرے پر مال کی طرف سے پشت کیے بیٹھا تھا۔

مال کا دل دھڑکتا رہا۔ سنایا اتنے زور سے گر جاسائے محسوس ہوا کہ اس کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔ اسے ٹام اور بر طانوی شاعر کی باتیں یاد آئیں۔ اس کا جی بیٹھنے سالگا، وہ رینگ کو مضبوطی سے پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

”میں اسیٹ لیں ہوں، میں اسیٹ لیں ہوں۔“ اس نے پہلی مرتبہ اپنے آپ سے کہا۔ سمندر کی لہروں کے سفید جھاگ چاندنی میں چمکتے رہے۔ دور دور دنیا کے چاروں کھونٹ چاندنی کی اس وسیع نیلگوں چادر پر مسافروں سے بھرے ہوئے جہاز چل رہے تھے۔ کاشمی ٹیوشن اور کوئین ازبکھ۔ امراء کے یاٹ۔ تجارتی اور جنگی بیڑے۔ ان کشمتوں سے موسيقی کے سر بلند ہو رہے تھے۔ دور راز کے ملکوں کے انسان ان کشمتوں میں سوار ہتے۔ یورپ اور انگلستان کے عالم۔ اٹلی کے راہب۔ امریکن سیاح میکسیکو کے نقاش۔ ہندوستان کے رقص۔ دنیا میں فی الحال امن قائم تھا۔ دلی میں پنڈت نہر و حکومت کرتے تھے۔ زندگی میں بظاہر بڑی گہما گہمی تھی۔

”خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں دل کا چین نصیب ہے بھائی۔ مجھے شانتی

چاہیے۔“مال نے آہستہ سے کہا۔

فرانسیسی بھکشو نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر کامل سکون تھا اور لازوال مسرت ایسی ہی پورنماشی کی رات، ڈھانٹی ہزار سال ادھر، اس سمندر کے اس پارائیک ملک میں شاکیہ منی پیدا ہوئے تھے۔ چودھویں کا چاند سمندر کی لہروں پر ادھر ادھر تیرا کیا۔ اس کی تیز اور محنتی کرنیں مال کے اور بھکشو کے چہروں پر پڑ رہی تھیں۔

”مجھے میرے خیال سے نجات دلو۔“ مال نے کہا۔

بھکشو اپنی پراسرار نیلی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ ”خیال۔ خیال خود کو نہیں جان ستا۔ خیال اپنے آپ سے باہر نہیں جا ستا۔ کائنات سے باہر کوئی خدا نہیں ہے۔ اور خدا سے باہر کوئی کائنات نہیں۔ حق و باطل میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن ان سب سے بالاتر ذات مطلق ہے جو سنانا ہے۔“ اس نے فرانسیسی میں کہا۔

”مجھے اس سنائے سے بڑا ذرللگتا ہے۔“ مال نے کہا۔

”شونیا..... سنانا..... شونیتا..... سونا جو ذات مطلق ہے، جو صفر کا تصور ہے۔“

”مجھے اس تصور سے بھی وحشت ہوتی ہے۔“ اس سنائے میں میں اکیلا کدھر جاؤں گا۔ تم بھی میرا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اس نے مہایاں مذہب کے اس فرانسیسی بھکشو کو شک و شہبے کی نظروں سے دیکھا جو سوربون یونیورسٹی کا ڈاکٹر آف فلاسفی تھا۔

”میں اشیعت لیں ہوں اور یہ تمہاری سکھو تی نہیں ہے۔“ اس نے دل میں کہا

اور بھاری بھاری قدم رکھتا اپنے ڈیک پرواپس آگیا۔ رات گزر گئی۔
جہاز اپنا سفر طے کرتا رہا۔ منزل میں گویا قریب تر آتی گئیں۔

۹۷

ہندوستان کا ساحل! بسمی!! گھر!!! گھر??

مال لکھنؤ پہنچا۔ گلفشاں کے چھانک میں داخل ہوا۔ اسے دنیا بدالی ہو ہی نظر آئی۔ باغ کے درخت جل چکے تھے۔ پودے سوکھ گئے تھے۔ گھاس کی جگہ جھاڑ جھنکاڑا گاہوا تھا۔ موڑ خانہ اور اصطبل گودام بننے ہوئے تھے۔ (جنئے عزیز پاکستان بھرت کر کے جاتے ہیں اپنا اپنا سامان لا کر یہاں ڈمپ کر دیتے ہیں، خالد بیگم نے کہا) شاگرد پیشہ سنسان پڑا تھا۔ اس کی آنکھوں نے انگادین کو ڈھونڈا۔ قادر اور قرن کی تلاش کی۔ حسینی کی بی بی اور رام اوتار اور جھٹکی کو آوازیں دی۔

آخر وہ اپنے کمرے میں جا کر پنگ پر گیا اور چپکے چپکے رو نے لگا۔ دنیا وہی تھی۔ گلفشاں، لکھنؤ، عزیز رشتہ دار۔ سب کچھ وہی تھا۔ کیا صرف وہ خود بدل گیا تھا؟ کیا وہ اپنے باپ کی تجھ کی دتی دیکھ کر جذباتی طور پر مضطرب تھا؟ وہ جس کی ساری عمر زمینداروں کے خلاف نعرے لگاتے گزری تھی۔ زمینداری کے خاتمے کی صوبیہ سے اب اتنا بڑا زوال آیا تھا کہ گلفشاں والوں کے یہاں دو وقت کی روئی بھی مشکل سے چلتی تھی۔ (بہت انقااب انقااب کرتے تھے۔ لوپوڑھے باپ کو

ایکے پر جیخا دیکھ کر اب تو خوش ہولو، نواب صاحب بہادر نے کہا) بڑی بڑی ریاستیں تباہ ہو گئیں تم ہم کسی گنتی میں ہیں، شام کو اپنی نے اس سے کہا جو اس سے ملنے کی خاطر جھانسی سے آئی ہوئی تھیں۔ نانپارہ کی کراکری بک رہی ہے۔ راجہ سورج سنگھ کے پاس ایک دھیلہ نہیں رہا۔ امی نے اپنے آدھے زیور تھیں ڈالے۔

”اب کیا ارادہ ہے؟“ مال نے اپنے بابا سے پوچھا۔ ”کربلا ہجرت کیجئے گا پاکستان؟“

”یہیں رہوں گا۔“ انہوں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”کوئی ہم بھگوڑے ہیں۔“

مال ہکا بکارہ گیا۔ ”مگر بابا آپ تو بڑی دھوم دھام سے مسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے۔“

”مال ہاں تو پھر؟“ پاکستان بن گیا، ٹھیک ہوا۔ اب اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ ہم بھی بھاگ جائیں جہاں سے۔

”آپ پاکستان کو اپنا جائز وطن سمجھنے کے باوجود ہجرت نہیں کرنا چاہتے۔ کیونکہ سوچتے ہیں کہ اس بڑھاپے میں کہاں دربدار مارے پھریں گے یا اس لے کہ ہندوستان کو اپنا وطن سمجھتے ہیں اور اس سے محبت کی بنا پر اسے نہیں چھوڑ سکتے۔“

مال آج قطعی طور پر معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کے باپ اور اس کے باپ کی نسل کے لوگوں کی نفیات آخر کیا تھی۔ ان کے آئندہ میز، ان کی منطق، ان کی بہادری یا بزدی۔

”اب تم سے جرح کون کرے۔ تمہاری کھوپڑی ہمیشہ کی اٹھی ہے۔“ نواب

صاحب نے جواب دیا اور گھڑی دیکھی۔ ان کو آج عدالت سے جا کر معاوضہ کی قسط کے دوسرو پے لانے تھے جن سے مہینے کا خرچ چلتا تھا۔

”اب میں عامر بھیا کی دہن کے درپر تو جا کر پڑنے سے رہی کراچی میں۔ یہاں کم از کم اپنا گھر تو نہیں چھنا ہے۔ اگر چلے گئے تو یہ بھی گیا اور معاوضہ بھی ختم، وہاں کون کلیم و لیم کرتا پھرے گا۔ ویسے میرا دل نہیں لگتا ب یہاں۔“ امی بیگم نے کہا۔

”مگر یہ آپ کا گھر ہے، آپ کا شہر، آپ کا وطن، جنم جنم کا دلیں۔“

”مسلمان کا کوئی وطن نہیں ہے۔ سارا جہاں وطن ہے۔“ چھوٹے پھوپھانے کہا جو حال ہی میں بھرت کر کے کراچی گئے تھے اور ان دونوں سامان کا تیا پانچہ کرنے آئے ہوئے تھے۔

مال نے مزی تبادلہ خیالات اس موضوع پر لا حاصل سمجھا اور اٹھ کر باہر آ گیا۔

چند روز بعد اس نے کرکس کر ملازمت کی تلاش شروع کی۔ اس کے پاس ان گنت ڈگریاں تھیں۔ ٹرنتی کالج، کیمبرج۔ امپریل کالج آف سائنس، لندن اور کئی سال اس نے انگلستان کی ایک مشہور لیبارٹری میں نوکری کی تھی۔ برطانیہ کی ملازمت چھوڑ کر وہ وطن کی خدمت کے جذبے سے واپس آیا تھا۔ یونیورسٹی میں جس جگہ کے لیے وہ کوشش تھا وہ ایک معمولی ایم۔ ایس سی کو دے دی گئی چونکہ وہ ہندو تھا۔

چھ مہینے گزر گئے، وہ دلی کے چکر لگا لگا کر دیوانہ ہو گیا۔

”میاں کسی سے سفارش کروالو۔“ نواب صاحب نے کہا۔

”سفارش تو میں قیامت تک نہیں کرواؤ گا۔ کیا مجھے اپنی الہیت پر بھروسہ نہیں جو سفارشیں کرواتا پھرولو۔“

”یہی تو تمہارے دماغ میں خناص ہے۔“

اب وہ سارا سارا دون گلفشاں میں چپ چاپ پڑا رہتا یا طاعت کو خط لکھتا: انڈیا ہرگز مت آتا۔ جہاں تک ہو سکو ہیں رہے جاؤ۔ یہاں آؤ گی تو وہی حشر ہو گیا جو میرا ہو رہا ہے۔

تم کو کیا ہو گیا ہے۔ طاعت جواب دیتی۔ ”تنے ڈی مور لامزڈ کیوں ہو گئے۔ جدو جہد کی ہمت ہار بیٹھے۔ یہی تو وقت ہے آزمائش کا۔ ڈٹے رہو، مزدوری کرو، مل چلاو۔ آخر انقاپ کا سامان کرنا اسی کو تو کہتے ہیں۔ مگر کیا تم عیش کے خواب دیکھ رہے ہو؟“

کیا لڑکیوں میں ہمت زیادہ ہوتی ہے؟ وہ سوچتا یا وہ آئینہ میلٹ پر لے درجے کی ہوتی ہیں۔ بہر حال طاعت کے خطوط سے اس کو بڑا اہمال جاتا۔

گوتم نے اسے متواتر نیویارک سے خط لکھے۔ اس نے کسی کا جواب نہ دیا، وہ لکھتا کیا آخر؟ ہری شنکر امریکہ سے لوٹ چکا تھا۔ اور بنگلور میں تعینات تھا۔ مال نے اسے بھی کوئی خط نہ لکھا۔

بھیا صاحب نے کراچی سے ڈاک بٹھا دی: فوراً یہاں آ جاؤ۔ ایک سے ایک بڑھیا عہدے یہاں موجود ہیں۔ بس تمہارے آنے کی کسر ہے۔ ضد چھوڑ دو۔ وہ دوبارہ تبدیل ہو کر بر از میل کے سفارت خانے جانے والے تھے اور بر ابر لکھا

کرتے: آ جاؤ..... آ جاؤ..... آ جاؤ.....

نوبت یہ آئی کہ اب مال نے ان کے خط کھولنے بھی چھوڑ دیے۔ چند روز بعد اسے بارہ بُنکی کے کانج میں پکھر رشپ مل گئی مگر چونکہ بھیا صاحب پاکستانی تھے اور ”گلفشاں“ اور موروٹی جائیداد میں ان کا بھی حصہ تھا لہذا کشوڈین کا قبضہ شروع ہو گیا۔ نواب صاحب نے عدالت میں کشوڈین کے فیصلے کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ اب دن بھر مال اس چکر میں مارا مارا پھرتا۔ اس کے لمحے میں اب تینی آگئی تھیں۔ وہ بہت کم ہستا تھا۔ اودھم مچانا وہ کب کا بھول چکا تھا۔

”بورڑوا انقاومی تھے حضرت۔ جب اصلاحیت کا سامنا کرنا پڑا تو پہلا جیس بول گئے۔“ کافی ہاؤس میں کام ریڈز نے کہا۔

حینی اور ان کی بی بھیا صاحب کی دہن کے ساتھ کراچی جا چکے تھے۔ قدری اور قمرن مدینی گزریں، موڑ رکنے کے بعد، هر زاپور والپیں چل گئے۔

ایک روز وہ حسب معمول دلی میں لاج کے یہاں جمنار وڈر پٹھبر اتھا اور ایک درخواست لکھ کر میڈن زہوٹل کے ڈاک خانے میں پوسٹ کرنے کے لیے چار باتھا کرداست میں اسے ٹامس انکنز مل گیا جو جہاڑ پر اس کا ہم سفرہ چکا تھا۔

”ہلو تم، یہاں کہاں۔“ مال نے پوچھا۔

”میں سارے ملک کا چکر لگاتا پھر رہا ہوں۔ جنوب، بنگال اور آسام اور اڑیسہ۔ اب راجستان کا قصد ہے۔“

”تم نے دلی کی سیر کر لی؟“

”ابھی نہیں۔“

”تم نے ہمارا راشٹر پتی بھون دیکھا۔“ مال نے فخر سے کہا۔ ”اور براؤ کاسٹنگ ہاؤس اور نئی دلی کی عمارات جو نئے ہندوستان کی سمبل ہیں اور پوتا انسٹیٹیوٹ اور راج گھاٹ اور اور وہ دفتاراً پرانا مال بن گیا۔ فکر معاش سے آزاد۔ ہندوستان کا جوشیا فرزند۔ وہ دلی کی ایک ایک چیز نام کو دکھاتا پھر۔ شام کو اس نے سپردہاں میں کونسرٹ نانے کا پروگرام بنایا۔

”آج کل تم کیا کر رہے ہو؟“ اپس میں بینہ کر قہوہ پیتے ہوئے نام نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ نوکری ڈھونڈھ رہا ہوں۔“ اس نے بے فکری سے جواب دیا۔

”بے روزگاری بڑا زبردست پراملم ہے۔“ نام نے کہا۔

”سب کے لیے ہے۔ اس میں میری کیا تخصیص ہے۔ جب خوشحالی آئے گی تو سارے ملک کے لئے آئے گی۔ یہ جوڑا ہی دیکھتی پھرے گی کہ یہ ہندو کا دوار ہے یہ مسلمان کا۔ ہم سب اکٹھے ڈو گے اکٹھے ابھریں گے۔“

”لیکن تم نواب زادے ہو۔ تم مزدوری نہیں کرو گے۔“ گلشن نے کہا جسے انہوں نے براؤ کاسٹنگ ہاؤس سے ساتھ لے لیا تھا۔ تم اپنے آپ کو ڈی کلاس نہیں کر سکتے۔

”بالکل غلط ہے۔“

”اچھا تو آؤ میرے ساتھ چلا ڈریکٹر۔“

”اگر میں نے ڈریکٹر چلانے کی ٹریننگ لی ہوتی تو ضرور چلاتا مگر افسوس کہ میں آٹھ سال نیو گلرفز کس میں بر باد کر کے آیا ہوں۔“

”شایہ پاکستان میں بڑا قحط الرجال ہے، وہاں جاؤ۔ یہاں کیوں جھک مار رہے ہو۔“ گلن نے رائے دی۔

”تم بھی یہی کہتے ہو؟“
”باقل،“

رات کی ٹرین سے وہ لکھوں لوٹ رہا تھا۔ آئیشن پر اسے ہمراز بھائی ملے، وہ بھی لندن سے کراچی آچکے تھے اور اب اپنی والدہ سے ملنے فیض آباد جا رہے تھے۔

کہومال میاں کیا حال ہے؟ انہوں نے پوچھا۔
بہت اچھا حال ہے ہمراز بھائی۔

اچھا تو نہیں دکھتا مجھے۔ کیا قصہ ہے۔ ایں؟

”کچھ بھی تو نہیں ہمراز بھائی۔“ اس نے جلدی سے ان کو آواب کیا اور آگے بڑھ گیا۔

آخر وہ دن بھی آن پہنچا جب مال نے وہی جا کرو زنا کی درخواست دی۔ اس فیصلے پر پہنچنے سے پہلے اس نے کئی راتیں جاگ کر گزاری تھیں، وہ دنیا کی نظروں سے بچتا پھرا تھا۔ بھائیں بھائیں کرتی گلفشاں میں صرف سائے ڈولتے نظر آتے۔ دروازے بند ہوتے۔ ہوا سے خالی کمروں کے پردے پھیپھلاتے۔ اندر کی خواب گاہ سے بوڑھے نواب صاحب کے کھانے کی آواز آتی۔ امی بیگم پچھلے دروازے میں تخت پر بیٹھو ٹلیفے پر ٹلیفے کئے جاتیں۔ ہزاروں مٹیں انہوں نے مان ڈالیں۔ جناب عباس کی درگاہ پر نذرانے چڑھائے۔ سبھیں آباد کے امام

بالت میں جا کر جمعرات کی جمعرات جناب علی اکبر کے نام کی مجلسیں کروائیں کہ یا مولا کمن بھیا کام پر لگ جائیں، یا مولا کمن بھیا کی مدد کر۔ (بارہ بیکنی کی یتکھر شپ ختم ہو چکی تھی)۔ وہ متواتر اپنے آپ سے مکالمہ کہتی ہے۔ گھاس کھودو، بل چلاو۔ لعنت ہوتم پر۔ موقع پرست، بے ایمان، ڈھمل یقین کہیں کے۔ اب جامعہ ملیہ اور علی گڑھ یونیورسٹی دو جگہ کا آسرارہ گیا تھا مگر فی الحال وہاں بھی اس کے لائق کوئی جگہ خالی نہ تھی۔ اس نے بہر حال طے کر رکھا تھا کہ بھوکا مر جائے گا مگر ترک وطن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تب ایک روز عدالت نے فیصلہ نہادیا۔ گلفشاں مال کے بڑے ابا یعنی بڑے نواب صاحب مرحوم کے نام سے رجسٹرڈ تھی۔ عامر رضا ان کا اکلوتا وارث پاکستانی تھا۔ گلفشاں متروکہ جائیداد قرار دے دی گئی۔ دوسرے روز صبح جب مال کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو لکھنؤ میں پایا۔ تیرے دن پولیس کے افسر کو تھی میں تالے ڈالنے کے لیے آگئے۔ چوتھے روز مال رضانے ویز اہنوازا اور اپنے بوڑھے والدین کو لے کر ٹرین میں بیٹھا۔ پانچویں دن ٹرین ولی پہنچی۔ چھٹے دن ٹرین نے بارڈر کراس کیا۔ ساتویں روز مال رضا کراچی میں تھا۔

ساتویں روز یوم سبت تھا اور انسان اپنا خون پی رہا تھا

”کراچی۔ مملکت خدا و پاکستان، دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت اور دنیا کے پانچویں بڑے ملک کا دارالحکومت۔ جہاں کے سلخ اور پناہ گزینوں کے جھونپڑے عجائبات عالم میں شمار کیے جاتے ہیں۔ خصوصاً وہ غلیظ ترین بھیانک ”چلگیاں“، جو قائد اعظم کے آس پاس پھیلی ہیں۔ اس شہر میں سفید فام غیر مکلبوں بالخصوص امریکیوں کی بہت بڑی نوآبادی ہے۔ ہاؤسنگ سوسائٹی میں بے انتہا خوبصورت کوٹھیاں بنی ہیں جن کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان متوسط طبقے نے اپنی ساری تاریخ میں آج تک اس قدر زبردست خوشحالی حاصل نہیں کی تھی۔ یہاں نئے دولت مند متوسط طبقے کی حکومت ہے۔ ان کا نیا سماج۔ ان کے نئے اصول۔ کراچی بے حد موڈرن شہر ہے یہاں روز رات کو اعلیٰ درجے کے ہو ٹلوں اور کلبوں میں ایک جگہ گاتی کائنات آباد ہوتی ہے۔ ماہرین عمرانیات کے لیے یہ مسئلہ انتہائی دلچسپی کا باعث ہونا چاہیے کہ پچھلے نو سال میں کس طرح ایک نئے معاشرے نے اس ملک میں جنم لیا ہے۔ اس معاشرے کی بنیاد رو پیغام ہے اور روپیہ بناؤ اور دولت حاصل کرو۔ آج بہتی انگا میں ڈکمیاں لگا لو، کل جانے انگا خشک ہو جائے یا اپنا رخ بدلتے۔ تیرا عنصر شدید ترین فرثیریشن کا احساس ہے۔ بلیک مار کیتے کو فرثیریشن ہے کہ مزید بلیک مار کیتے کیوں نہیں کر ستا۔ باہمیں بازو کا انخلکچوں روتا ہے کہ اب انقلاب کی کوئی امید نہیں۔ جماعت اسلامی والا چلا رہا ہے کہ مسلمان عورتیں بے پرداز گھوم رہی ہیں اور بال روم میں ناچتی ہیں۔ متوسط طبقے والے کی جان کو ہزاروں فکریں کھا رہی ہیں۔ سفارشوں کے بغیر نہ ملازمت ملتی ہے نہ بچوں کا اسکول اور کالج میں داخلہ ہو ستا ہے نہ عہدوں میں ترقی ہوتی

ہے۔ اور پر سے بنگالی اور پنجابی مہاجر اور مقامی آبادی کی کشکش اعصاب پر سوار ہے۔ یہ کشکش اتنی ہی شدید ہے جتنی غیر منقسم ہندوستان میں ہندو مسلمان کی تھی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں آخرا میدا ب فوجی انقلاب میں باقی ہے۔

ایک جماعت مہاجرین کی کہلاتی ہے۔ یہ پاکستان کی عجیب ترین مخلوق ہے اور ہندوستان سے آئی ہے اور ملک کے ہر شہر، قصبے اور قریے میں پائی جاتی ہے۔ کراچی میں اس کا ہیڈ کو ارٹر ہے۔ اس جماعت کا خاص ریکٹ کلپر ہے۔

تقسیم کے بعد معلوم ہوا کہ اب ہندو کہتا ہے کہ جب تمہارے کلپر اور تمہارے نظریے تبلیح ہے میں تو جاؤ پاکستان۔ اب ہمارے سر پر کیزیں سوار ہو؟ چنانچہ یہ قوم ”مہاجر“ بن کر پاکستان آئی۔ یہاں انکشاف ہوا کہ ہندو سے تو چھٹکارا ملا مگر ایک مصیبت کا سامنا درپیش تھا۔ لاہور میں پنجابی تھا، ڈھاکے میں بنگالی۔ دونوں جگہ مہاجرین کو بڑا فریشن ہوا۔ لہذا ہر مہاجر نے اور بڑا کر کراچی کا رخ کیا۔ اب کراچی گویا مہاجرین کا گڑھ ہے۔ بڑی تعجب خیز چیز یہ ہے کہ اتر پردیش کی اس آبادی نے کس خوش اسلوبی سے اپنے آپ کو رنس پلانٹ کر لیا۔ اب یہاں جگہ جگہ ان کی ”کولونیاں“ قائم ہیں۔ یہاں آگرے والے رہتے ہیں۔ اور رہبپوریوں کا جتنا ہے، وہ حیدر آباد کن کے جانبازوں کا محلہ ہے۔ اس طرف گڑھ والے، لکھنؤ والے، دلی والے رہتے ہیں۔ بڑے بڑے چھوٹے چھوٹے مکان قرضہ لے کر بنائے گئے ہیں۔ زیادہ تر ناظم آباد کا علاقہ ہے۔ لارنس روڈ، الی بخش کالونی، جہانگیر روڈ، مارٹن روڈ کے سر کاری کو ارٹروں میں ایک پوری دنیا آباد ہے۔ یہ خالص، ٹھوس، مسلمان متوسط اور نچلے متوسط طبقے کی دنیا ہے اور مہاجرین

کی سماجی زندگی کی گویا ریڑھ کی ہڈی۔ ان کی اڑکیاں بر قعے پہن کر بسوں میں بینچہ کرا سکول اور کالج اور یونیورسٹی جاتی ہیں، بندروڑ پر خریداری کرتی ہیں، ریڈیو پر عورتوں کے پروگرام میں حصہ لیتی ہیں، ویمنز نیشنل گارڈ میں پریڈ کرتی ہیں۔ یہ طبقہ اب کراچی میں اس طرح رہتا ہے گویا صدیوں سے یہیں رہتا آیا ہے۔ یہ لوگ جنگ اور انجمام اور ڈان پڑھتے ہیں کشمیر حاصل کرنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ سال میں ای مرتبہ ویرزا بغا کر خاندان کے بچے کے افراد سے ملنے ہندوستان جاتے رہتے ہیں جس کو اب تک یہ ”گھر“ کہتے ہیں۔ یعنی گھر دراصل سندھیہ یا مراد آباد ہے، ملک پاکستان ہے۔

انسانیت کا وہ حصہ، جو برصغیر ہندوپاکستان کی مسلمان قوم کہاتا ہے، اس کی نفیاں سمجھنا کوئی آسمان بات نہیں!

وہ مراد طبقہ اعلیٰ طبقہ کہاتا ہے پچھلے نو سال میں بے حد مستکم ہو چکا ہے۔ اور محتاج تعارف نہیں۔ اس طبقے کی زندگی اس قدر الاف الیلوی ہے کہ اب ”قصہ سوتے جائے کا“، اس کے مقابلے میں بالکل یقین سمجھو۔ یعنی کل جو صاحب بالکل گنام اور ہاشم اقسام کے آدمی تھے آج وہ مرکزی وزیر ہیں یا کروڑ پتی یا بہت مشہور لیڈر۔ پورے ملک کی قسمت کافی صہان کے ہاتھوں میں ہے۔ نہایت ادق ہیں الاقوامی سیاسی مسائل پر اس فرائٹ سے اخباروں میں بیان دیتے ہیں کہ طبیعت صاف ہو جاتی ہے۔ انتہائی معمولی قابلیت کے حضرات اقوام متحده اور دوسرے بڑے بڑے عالمگیر اداروں میں ملک کی نمائندگی فرماتے ہیں اور ہاؤلز کرتے ہیں مگر کوئی برائی نہیں مانتا۔

ان گنت خواتین و حضرات اندھوں میں کا نے راجہ بننے بیٹھے ہیں۔

اور خواتین! پاکستان کی بیگمات بھی دنیا کی عجائب سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی ساریاں، ان کے زیورات، ان کے ڈنر اور پارٹیاں، بیرونی ممالک میں ان کے سفر۔ ان کی زندگی کا عکاس اور گویا ان کا افیشل آرگن ماہنامہ مرر ہے جس میں ان کی دعوتوں کی تصویریں چھپتی ہیں۔ تب اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان دراصل کس قدر ترقی یافتہ اور دولت مند ملک ہے جس کی آدمی آبادی صرف ڈنر اور ایمٹ ہوم کھاتی ہے اور سماں پاچی ہے۔

ہندوستان پوری کوشش کر کے یہ ثابت کرنے میں مصروف ہے کہ تقسیم غلط تھی اور ملک دراصل ایک ہے اور اس کی تہذیب ناقابل تقسیم۔ پاکستان یہ ثابت کرتا ہے تقسیم بالکل جائز اور صحیح تھی اور یہاں کی کلچر بے حد مختلف ہے اور اسی علیحدہ قومیت کی بنیاد پر یہ ملک حاصل کیا گیا ہے۔

اونہر ہندوستان کہاتا ہے کہ سارے مشرق کی تہذیب کا ضلع اس کا کلچر ہے۔ اونہر گپتا پیریڈ پر روشنی ڈالی جاتی ہے اونہر خلافت راشدہ اور عباسیوں اور مغلوں کے زمانے کے راگ الائپے جاتے ہیں۔ ان دونوں ممالک کا پروپیگنڈہ غرضیکہ بڑے زوروں میں چالو ہے۔ اور اس چاند ماری کا نشانہ مغربی ممالک۔

ایک اور عجیب و غریب چیز یہ ہے کہ ملک کے حالات سے لوگ حد سے زیادہ نالاں ہیں۔ اقتصادی مشکلات، گرانی، رشوں ستانی، اقرباء پوری، بے ایمانی، چارسوں بیسی، سیاسی غنڈہ گردی وغیرہ وغیرہ کا ذکر روانہ بلا ناغہ اخباروں کے اڈیوریل میں ہوتا ہے۔ لوگوں کے پاس بھی سوائے اس کے اور کوئی موضوع نہیں

مگر اس کے باوجود کوئی ان حالات کامد ادا کرنے کے لیے کچھ نہیں کرتا۔ لوگوں کو معلوم ہے کہ نسلین اور دواؤں کی بلک مارکیٹ ہوتی ہے، ان کو بتا ہے کہ ناممکن سے ناممکن کام ذاتی رسوخ یا سفارش کے ذریعے چکنی بجاتے میں پورا کر لیا جاتا ہے، وہ جانتے ہیں کہ شروع سے آخونک اوپر سے نیچے تک بے ایمانی کا دور دوڑہ ہے مگر اس کے لئے کوئی کچھ بھی تو نہیں کرتا۔ عوام جانتے ہیں کہ ان کے لیڈر کتنے پانی میں ہیں۔ لیکن لیڈر کو بھی چند ایسے گرداء ہیں جن کے ذریعے عوام کو قابو میں رکھا جاستا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ تاریخ میں اتنے پیارے پر مسلمانوں نے اتنے گرے ہوئے کردار کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ بار بار میں نے اپنے نئے دوستوں سے (جن کا تعارف میں تم سے آگے چل کر کروں گا) پوچھا کہ جب مسلمان کو آزادی اور اقتدار ملا تو اس نے من حیث القوم اتنے گھٹیاپن کا مظاہرہ کیوں کیا۔ مجھے بتایا گیا کہ شروع کے دو تین سالوں میں جس قدر جوش و خروش یہاں طاری تھا اب اس سے چوگنی مایوسی کی عملداری ہے۔ اب تو لوگ کہتے ہیں کہ یا رہمیں بیرونی ممالک میں خود کو پاکستانی کہتے شرم آتی ہے۔ یہی احساس کمتری زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتا ہے۔

کراچی میں شام کو لوگوں کو کوئی کام نہیں سوائے پارٹیوں میں جانے یا سینما دیکھنے کے۔ نہ یہاں تھیز ہیں نہ کانسرٹ نہ سینما نہ دوسری تہذیبی سرگرمیاں۔ تھوڑی بہت دچپی غیر ملکی سفارت خانوں کے دم قدم سے قائم ہے۔ کسی روز برٹش کنسل نے ایلیٹ پر ایک یکچھ کر دیا یا تصویریوں کی نمائش منعقد کر لی گئی، کسی

روز امریکن اطاعت کے فنٹر میں کوئی پروگرام ہو گیا، بھی ایران یا انڈونیزیا فرانس والوں نے کوئی تقریب کر لی، بھی جمیں سفارت خانے میں فلم شو منعقد کر لیا۔

ویسے بس پارٹیوں کا بڑا ذریعہ ہے جن میں یہ خم پر خمنڈھائے جاتے ہیں۔ پارٹیوں کے ذریعے لوگ اپنا اپنا مستقبل بناتے ہیں۔ موڑوں کا لین دین ہوتا ہے۔ اعلیٰ عہدے حاصل کرنے کی نیچی لڑائی جاتی ہے۔ مکانوں اور زمینوں کے الٹھنٹ کا کار و بار ہوتا ہے۔

یہاں جمیع طور پر جنگل کا قانون نافذ ہے۔

اعلیٰ طبقہ، جو بڑے بڑے تاجریوں، اعلیٰ حکام پر مشتمل ہے، اس کی علیحدہ برادری ہے۔ تو اور یہ لوگ سندھ کے کنارے گزارتے ہیں۔ چھٹیاں لے کر یورپ اور امریکہ جاتے ہیں۔ ان کی اولاد بھی مغربی ممالک میں پڑھ رہی ہے۔ انہوں نے لاکھوں روپیہ سو ستر لینڈ کے بنکوں میں جمع کر لیا ہے۔ بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ لوگ، جو بات بات پر دوسروں کو غدار اور وطن فروش کے نام سے نوازتے ہیں اور حب وطن کا سارا تھیکہ انہوں نے خود لے رکھا ہے، یہی سب لوگ خود انگلستان یا کینیڈا میں سکونت اختیار کرنے کے پروگرام بنارہے ہیں۔

پاکستانی انھلکچوائز کو دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے۔ ان ذہین لوگوں کا وقت کس بھی انک خلاء میں بر باد ہو رہا ہے۔ ان کے سامنے کوئی پروگرام نہیں ہے، کوئی راستہ، کوئی مقاصد، یہ سب بھی جنگل کے قانون میں گرفتار ہیں۔ محض تلغی اور بیزاری اور ما یوں کا فلسفہ ہے، میں ان کا مقابلہ اپنے ساتھیوں سے کرتا ہوں جوان ہی کی نسل کے

نوجوان ہیں اور پچھلے نو سال میں بالکل مختلف راہوں پر چلتے ہوئے ارتقاء کی منزلوں میں کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں۔ اکثر میرے نئے دوست مجھ سے پوچھتے ہیں اندیسا میں ہر مہینے اہم، ٹھوس موضوعات پر کتنی ان گنت کتابیں پچھتی ہیں، مختلف شعبوں میں کس قدر زبردست ریسرچ اختیار کی جا رہی ہے، کیسے کیسے رسائیں نکل رہے ہیں، کیا کچھ سوچا اور لکھا جا رہا ہے، حکومت فتوں لطینہ اور ادب اور علم کی کتنی سر پر ترقی کر رہی ہے۔ ان میں سے ایک اکثر مجھ سے کہتا ہے: ”یا راقم خدا کی، باہر کے اخبار پڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔ بڑا فرشریشن ہوتا ہے۔“

فرشریشن..... یہ لفظ یہاں کی ساری ذہنی زندگی کا سمبول ہے۔

دوسرا الفاظ ریکٹ ہے۔ سیاست، ادب، کلچر، مذہب۔ ہر چیز کا نہایت اعلیٰ پیارے پر ریکٹ چلا دیا جا رہا ہے۔ میرے ذہن پرست دوست جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو بڑے بے نیاز انداز میں سوال کرتے ہیں: ”کہو بھائی آج کل کون ساریکٹ چلا رہے ہو۔“

جب میں ان لوگوں کو اپنی عمر کا بہترین حصہ اس خلاء میں ضائع کرتے دیکھتا ہوں تو مجھے کس قدر صدمہ ہوتا ہے۔ صحیح ہوتی ہے، یہ لوگ اپنے اپنے کام پر نکلتے ہیں، دوپہر کو ایک نیم تاریک اور غیر دلچسپ کافی ہاؤس میں جمع ہو کر کھانا کھاتے ہیں اور شام کو جا کر کوہی انگریزی فلم دیکھ لیتے ہیں۔ منگل کے منگل کسی ایک کے یہاں جمع ہو کر پھر وہی با تم شروع کر دیتے ہیں۔ ان سب کو اپنے اپنے ضمیر کا بڑا احساس ہے مگر زندہ بہر حال رہنا ہے، روزی بہر حال مانا ہے، اگر بھوکوں ہی مرتا ہوتا تو ہندوستان سے ادھر کیوں آتے (ان میں سے اکثر حضرات ”مہاجر“

ہیں)۔ جرئت ایمانداری سے روپرٹنگ نہیں کر سکتے کیونکہ اپنے اپنے اخباروں سے نکال باہر کیے جائیں گے۔ ادیبوں کے پاس لکھنے کے لئے کچھ باقی نہیں رہا (گوبے شمارہ سالے نکل رہے ہیں)۔ ترقی پسندی آؤٹ آف فیشن ہو چکی حتیٰ کہ ادب میں حمود کانفرہ بھی پرانا ہو گیا۔

اسلام..... اس لفظ کی جو گت بنی ہے (کرکٹ میچ میں پاکستانی ٹیم ہارنے لگتے بھروسہ اسلام خطرے میں ہے)۔ دنیا کے ہر منسلکی تناں آخر میں آ کر اسی لفظ پر ٹوٹی ہے۔ دوسرے مسلمان ملک اس بات پر خوب چڑھتے ہیں۔ ساری دنیا کی طرف سے اسلام کا تھیکہ اس وقت ان لوگوں نے لے رکھا ہے۔ ہر چیز پر بگ نظری کا غاف چڑھا ہوا ہے۔ موسیقی، آرٹ، تہذیب، علم و ادب..... سب کو ”ملا“ کے نقطہ نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ اسلام، جو ایک چڑھتے ہوئے دریا کی طرح ان گنت معاون ندیٰ والوں کو اپنے دھارے میں سمیٹ کر ایک عظیم الشان آبشار کی صورت میں روان ہوا تھا، اب وہ سمت کر ایک میا لے تالے میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ تالہ ایک وسیع بھیڑ میں کہہ رہا ہے جس میں چاروں طرف سے بند بامند ہے جا رہے ہیں۔

لطینہ یہ ہے کہ اسلام کا نعرہ لگانے والوں کا فلسفہ مذہب سے قطعی کوئی سروکار نہیں ہے۔ ان کو صرف اتنا معلوم ہے کہ مسلمانوں نے آٹھو سال عیسائی اپنی پر حکومت کی، ایک ہزار سال ہندو بھارت پر۔ عجھ انہوں نے صدیوں تک مشرقی یورپ کو تابع رکھا۔ امپیریلزم کے علاوہ اسلام کی جو عظیم انسان پرستی کی روایات ہیں ان کا تذکرہ نہیں کیا جاتا۔ عرب حکماء، ایرانی شعراء اور ہندوستانی صوفیائے

کرام کی وسیع الفہمی کا چرچا کرنے کی ضرورت نہیں تھی جاتی۔ علیٰ اور حسین کے فلسفے سے کوئی غرض نہیں۔ اسلام کو ایک نہایت جارحانہ زندگی اور طرز زندگی بنانے کا پیش کیا جا رہا ہے۔

علاوہ ازیں اپنے ملکی اور اشداہمیت کے مسائل نظر انداز کر کے کلچر کو غیر ملکیوں کے سامنے پیش کرنے کا رجحان بھی زروں پر ہے۔ یعنی یہ کہ شاید ہماری یہ کتاب انگلستان یا امریکہ سے چھپ جائے، کوئی امریکن فلم کمپنی ہمیں اپنے مووی میں لے، ہم کسی بین الاقوامی کانفرنس میں بھیج دیے جائیں۔

انگریزی جرائم کی حالت ناگفته ہے۔ مسلمانوں کے پاس پہلے ہی کون سے اخبار تھے اور کون سی ان کو صحافت کی ٹریننگ مان تھی اور ۲۷ء کے بعد سے اب تک جو کھیپ یونیورسٹیوں سے باہر نکلی اس میں اچھے لکھنے والے نمودار ہونے چاہیں تھے۔ ان گنت خواتین و حضرات یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں سے ڈگریاں لے کر لوٹے ہیں۔ ہمارے زمانے میں کوئی اکادمیک خوش نصیب ہی اعلیٰ تعلیم کے لیے سندھ پار جاتا تھا۔ جانے آج کل لوگوں کو ڈگریاں اور ڈاکٹریٹ کیسے مل جاتے ہیں اور یہ لوگ پڑھ لکھ کر کہاں لا دیتے ہیں، یہ اسرار آج تک میری سمجھ میں نہ آیا۔

مگر خوشی کی بات یہ ہے کہ پاکستانی اڑکیاں بڑی تعداد میں تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ (کم از کم شہروں میں کیونکہ متوسط طبقہ موڈرن ہو چکا ہے)۔ ان گنت اڑکیاں ڈاکٹر، نرنس اور پیچرہ بن رہی ہیں ملاز میں کر رہی ہیں۔ گلیوں کی ملاز ثابت کواب معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ مجموعی طور پر پاکستانی خواتین نے فی الواقعہ بہت

ترتی کی ہے اور یہ ایک بہت ہی اچھا شکون ہے۔

رات گزرتی جا رہی ہے۔ جو کچھ میرے ذہن میں آتا جا رہا ہے لکھتا جا رہا ہوں۔ اسی وجہ سے شاید تم کو خط بے ربط معلوم ہو گا مگر اتنی بہت سے باقی تم سے کرنا ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ تم میری آنکھوں سے میرے نئے ملک کو دیکھ لو۔ میری ہمت بڑھاتا کہ میں اس ملک کے لیے اپنے بھربرا بھلا کچھ کر سکوں۔

مغربی پاکستان کی سوسائٹی کا ڈھانچا اب تک فوجوں رہا ہے لہذا یہاں سیاسی شعور کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عوام مذل ایسٹ کے باڈشاہوں کے جلوس دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ جہاں گیر پارک میں جمع ہو کروزیر اعظم کی تقریب سننے کے بعد زندہ باد اور مختلف پارٹی کے لیڈروں کی تقریروں کے بعد مردہ باد کے نعرے لگاتے ہیں تو لئے خوش گھر لوٹتے ہیں۔ عام طور پر سرکاری اور غیر سرکاری جلسے جلوسوں کے لیے کرائے کے آدمی بلوائے جاتے ہیں، نعروہ بازی کے بعد ان کو پیسے دے کر رخصت کیا جاتا ہے۔ سیاسی لیڈر شپ بڑے بڑے کاروباریوں وار سیٹھوں کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر۔

عوام کی نفیاں اور رسیٹر یا کی عجیب و غریب مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ چند سال قبل پنڈت جی یہاں آئے تو عوام کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے پولیس کو رُن توڑ دیے اور زندہ باد کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھایا۔ پنڈت جی خود ایک نمبر کے جذباتی آدمی، ان پر خوب رفت طاری ہوئی۔ خوش آمدید کے پھانک بنائے گئے۔ تقریباً ہوئیں، یہی عوام وقتاً فوقاً مختلفین کی ارتقی کے جلوس نکالتے ہیں اور ان کے پتلے شرکوں پر جلاتے ہیں۔

اس کے علاوہ کرکٹ میچ بھی اس ہسپیریا کا ایک تاریخی واقعہ ہے۔ اندریا پاکستان کا میچ ہوا تو چند روز کے لئے گمان ہوتا تھا پنجاب تقسیم نہیں ہوا اور اسی ہو را اور امر تحریک سبقت ایک ہی صوبے کے دو شہر ہیں۔ ہزاروں سکھ اور ہندو جو قدر جو قدر سائیکلوں پر بیٹھ کر لا ہو را آئے۔ لاہور کے حلوانیوں نے ان کو مفت ملھائی کھلائی۔ تالنگے والوں نے ان سے کرایہ نہیں لیا۔ قیامت کی چہل پہل رہی۔ آئینہ نیکست قسم کے کالم نگاروں نے اخباروں میں عظمت انسان کے گن گائے، بڑے لخراش و اقuatat بھی ہوئے۔ ایک بوڑھا اندھا سکھ مشرقی پنجاب سے آیا اور اپنے سابق شہر کے گلی کوچوں کے درودیوار چھوٹا پھرا۔ اس نے کہا مجھے میرے پرانے مکان لے چلو جو کہیں شاہ عالمی میں تھا۔ لوگوں نے اسے وہاں تک پہنچایا اور وہ اپنے گھر کی دیواروں سے لپٹ لپٹ کر رویا۔

میں اس نفیات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر میرا دماغ کام نہیں کرتا۔ اسٹریو ٹاپ کے متعلق ہم نے سو شیو لو جی میں بہت کچھ پڑھا ہے مگر جب اصلیت میں اس سے دوچار ہوتے ہیں تو عقل جیران رہ جاتی ہے۔

مہاجرین کا ایک اور مسئلہ ہے، یہاں ہنوز روزاول ہے۔ ۷۲ء کے ہندوستان میں جو حالت شرنا تھیوں کی تھی وہ آج اٹھ سال گزرنے کے بعد مہاجرین کی ہے اور روز بروز ہونا کہتر ہوتی جا رہی ہے۔

چونکہ میں ٹینکنیکل طور پر خود ”مہاجر“ ہوں لہذا اس پر ابھم میں نے بہت غور کیا۔ دیکھو پیدا، بات ساری یہ ہے کہ ہندوستان میں متوسط طبقے کے مسلمان کے قدم اکھڑ چکے ہیں، وہی اسٹریو ٹاپ کا حوالہ یہاں پھر دینا پڑے گا۔ سکیورٹی کی

تلش میں یہاں کے ناگفتہ بہ حالات جانتے ہوئے بھی ہندی مسلمان یہاں آ جانا چاہتا ہے۔

جب مسلمان اڑکے یونیورسٹیوں سے نکلتے ہیں تو ہندکی وفا میں افواج میں اس لیے نہیں جاتے کہ ان کی وفاداریاں مشکوک ہیں۔ سارے خاندان بٹ پچے ہیں۔ ایک بھائی پاکستان آرمی میں ہے دوسرا نیوی میں، تیسرا آزاد کشمیر ریڈ یو میں نوکر ہے، اس کا چوتھا بھائی، جو بھی پڑنے میں بی ایس سی کر رہا ہے، انہیں ایئرفورس میں درخواست بھینے کے متعلق سوچ بھی نہیں سنتا ہذ اور یہاں پہنچ کر جٹ پالک بکن جاتا ہے، پٹنے میں شاید کلر بھی نہ بن سکتا۔ دوسرا غصہ یہ ہے کہ اسے یہ خیال رہتا ہے کہ اگر وہ ملازمتوں کے کمپی ٹیشن میں بیٹھا بھی تو ہندو سے، جوزیا دھستنی ہوتا ہے، نہیں جیت سکے گا، اگر جیت بھی گیا تو تعصب کی وجہ سے اسے سلیکٹ نہیں کیا جائے گا، ہندوستان وطن نہیں ایک قسم کا عارضی پڑا تو کاکیمپ ہے۔

علی گڑھ میں کہاوت ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی سٹرکٹنی دلی کے بجائے سیدھی کراچی جاتی ہے۔ برطانوی دور حکومت میں مسلمانوں کی دوسری اقلیتوں کی مانند ملازمتوں میں نشتمیں مخصوص تھیں، نامزدگی کا دستور تھا اور ہندوستان میں ملازمتوں کے سلسلے میں مسلمانوں سے جو تعصب بردا جا رہا ہے اس کا اندازہ مجھ سے بہتر کس کو ہو گا۔

مسلمان کے اشمور میں ہجرت کافسوں بسا ہوا ہے۔ پچھلی صدی میں ایشیاء میں سیاسی بیداری کے پھیلتے ہی یہ قوم متضاد مختلف وفاداریوں کی کش کمش کا شکار ہو گئی۔ رہا ہند میں لیکن ”میرے مولا بلائے مدینے مجھے“، اس کا محبوب نغمہ تھا۔ پان

اسلام موزم کی تحریک نے اس تصور کو اور دل آ ویز بنا لیا اور مسلمان کے یہاں نیشنلزم اور وطن پرستی کا تصور ہی بدل گیا۔ اب ہندوستانیت اور اسلام ہم معنی نہیں تھے کیونکہ اول الذکر میں ہندو اسلام بھی شامل تھی اور اس میں انگریزوں نے فرقہ پرست عناصر کے ذریعے الگ ہندویت کی تحریک چلا رکھی تھی۔ ایرانیت اور اسلام، عربیت اور اسلام میں کوئی تصادم نہیں تھا جس طرح ہر فرانسیسی لا احوالہ عیسائی بھی ہے مگر ہندی مسلمان کو اس ملک میں اکثریت کی ایک بڑی تکمیل تہذیب اور مضبوط معاشرے سے مقابلہ کرنا تھا لہذا وہ اس ماحول میں شامل ہو کر اس سے مدافعت کرتا رہا، مگر یہ مدافعت کب پیدا ہوئی؟ سارے غیر ملکی مہرین کا، جو مغلوں کے زوال کے وقت ہندوستان میں آ ہے اور جن کو اس وقت جدا کرو اور حکومت کرو کی پالیسی کا علم نہ تھا جو انیسویں صدی میں تیار کی گئی، یہ کہنا کہ اس طوائف الملوکی کے باوجود ملک میں ہندو مسلم سوال کا وجود نہیں تھا۔ ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ سوال کس طرح پیدا ہوا۔ انیسویں صدی میں جب ملک کی اقتصادی تباہی کی وجہ سے یہ کھنچا و شدید تر ہو گیا، ہندو اکثریت کے ہاتھوں پٹ جانے کے خوف کی نفیات کا تذکرہ پنڈت نہرو اور سردار پانکر دونوں نے کیا ہے، یہ سوال تاریخ کا بہت بڑا ”اگر“ ہے کہ اس خوف کا تدریک کیا جاستا، جو کہ انگریس کر سکتی تھی، تو آج حالات کیا ہوتے۔

خیر۔ تو ہندی مسلمانوں کا صہیون، حجاز تھا۔ یورپیں یہودیوں اور ہندی مسلمانوں کے علاوہ دنیا کی کسی اور قوم نے وفاداریوں کے اس تصادم کا سامنا نہیں کیا۔ دونوں نے اپنے علیحدہ ملک بنائے ہیں اور دونوں اب ان مزید

مسئل سے دو چار ہو رہے ہیں۔

پاکستان میں جو نفس انسانی کا عالم اور حب وطن کی نظر آتی ہے اس کی بھی وجہ ہے کہ مسلمان کو اس سر زمین سے کوئی بے اختیار جذباتی اور روحانی شگاونگیں، وہ موقع اور سیکیورٹی کی تلاش میں یہاں آئے ہیں جس طرح یورپین اقوام امریکہ پہنچی تھیں۔ نیو یارک میں رہنے والا پوش بوڈھاوار سا کو یاد کر کے آئیں بھرتا ہے مگر پولینڈ کے اس وضنڈ لے تصور سے اس کی اولاد کو کوئی غرض نہیں جو نئے ملک میں امریکن کی حیثیت سے پروان چڑھتی ہے۔ اسی طرح یہاں پر جو لوگ گوتی کے خر بوزوں اور پریاگ کے میلے اور ساون کی گھناؤں کو یاد کر کے روتے ہیں ان کی اولاد، جو یہاں بڑی ہو رہی ہے، اس کے لیے یہ سارے تصورات بے معنی اور مضائقہ خیز ہیں، یہ نسل خالص پر اکتنا فی ہو گی اور اس طرح ان متفاہ و فادار یوں کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔

زبان کا مسئلہ ہماری کتنی بڑی بد قسمتی رہی ہے۔ ہندوستان سے مُدل کلاس مسلمان کے قدم اکھڑنے کی دوسری وجہ سنسکرت آمیز ہندی زبان کا تسلط ہے۔ اپنی زبان کی تباہی کسی قوم کے لیے سب سے بڑی ٹریجندی ہے۔ انسان اپنی دولت لئتے دیکھ سنتا ہے مگر اپنی زبان اور تہذیب کی بخش کنی برداشت نہیں کر ستا۔ علاوہ ازیں ہندی مسلمان کو غیر شعوری اور شعوری طور پر اپنی مخصوص تہذیب کی برتری کا ناز بھی رہا ہے چنانچہ یہ اس کی دوسری بڑی زبردست نفیاتی شکست ہے۔ مسلمان بچے اسکولوں میں ہندی پڑھ رہے ہیں (جبکہ ان کے باپوں کی نسل کے ہندوانہ اسکولوں میں اردو پڑھتے تھے) یہ بچے اگر ہندوستان میں رہ گئے تو

اس نئے تمدنی سانچے میں کھپ جائیں گے، اور اسکی میں ان کی عافیت ہے، اگر وہ اسے بھی resist کرنا چاہتے ہیں تو اسی حالہ ان کو ادھر آنا پڑے گا۔

زبان کا مسئلہ زیادہ تر شہروں کے مسلمانوں کے لیے ہے کیونکہ پورب کے مسلمان کسانوں کی زبان وہی ہے جس میں ملک محمد جائیسی نے پدمawat، بیبرداں نے اپنے دو ہے اور تسلی داس نے رمان لکھی تھی۔

دیہاتوں میں مسلمانوں کو ایک مختلف مذہبی فرقے کی بجائے ممحن ایک اور جات سمجھا جاتا رہا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اتر پردیش کا وہ مسلمان، جو مسلمانوں کی ٹڈل کلاس سیاست اور تہذیب کا نمبردار تھا، نہ ادھر کا رہا نہ ادھر کا، اس کی حالت قابلِ رحم ہے۔

اب میں پھر یہاں کے حالات کی طرف واپس آتا ہوں۔

کل میں بھی صاحب کے دفتر میں بیٹھا ان کا انتظار کر رہا تھا۔ وقت گزارنے کے لیے میں نے پبلیٹی کے لئے پیر کی ورق گردانی شروع کی اور بہت سی کتابیں گھر اٹھتا لایا۔ رات کو میں نے بھلے برسوں کے وزراءً اعظم کی اہم ترین تقاریر نکال کر پڑھیں۔ طاعت! وعدوں کا ایک سمندر ہے کہ خانجیں مار رہا ہے۔ اسکیم کا ایک ریلیہ ہے جو آٹھ سال سے اب تک بہتا چلا آ رہا ہے۔

مسلمان سیاست ہمیشہ سے ٹڈل کلاس، شہروں کی سیاست رہی ہے لہذا دیہاتوں کی طرف کوئی بھولے سے بھی توجہ نہیں دیتا۔ مسلمانوں کے پروگرام میں تقسیم سے پہلے زرعی اصلاحات وغیرہ کا دور دور کہیں ذکر نہ تھا، وہی روایت اب بھی باقی ہے۔ زمینداری کے خاتمے کافی الحال سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اسی

طبقے کی حکومت ہے۔

آج جمعہ کی رات ہے اور میں ایک انگلکچوں محفل سے لوٹ کر آ رہا ہوں۔ وہاں گھاس پر، قالینوں پر، صوفوں پر بیٹھے گروپ بناؤ ہے مغربی ادب اور عالمگیر سیاست کی موشنگا فیاں کرتے ہوئے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو دیکھ کر میں سوچا کیا کہ کاش تم ان سب کی باتیں سنتیں۔ (اس محفل میں دیسی لڑکیاں صرف دو تین ہی ہوتی ہیں، میں نے یہاں کی مسلمان لڑکیوں میں ان کی اعلیٰ تعلیم کے باوجود بنیادی سنجیدہ مسائل کے متعلق سوچنے کی طرف سے حیرت انگیز بے اغتنامی دیکھی)۔

اس محفل کے غیر ملکی اراکین بھی بہت دلچسپ ہیں۔ الفریڈ ایک انگریز لڑکا ہے جو لندن اسٹچ پر رہ چکا ہے۔ جولین ایک اور انگریز لڑکا ہے، رومن کیتوولک انگلکچوں، اس کا ساتھی رونلڈ ہے، یہ بھی اوکسفرڈ سے آیا ہے۔

اس محفل میں دنیا جہاں کے مسائل پر زور شور سے بحثیں ہوتی ہیں۔ دراصل یہ ایک قسم کا ہائیڈ پارک کو نہ ہے جہاں لوگ باغ آ کر اپنے اپنے دلوں کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔

آج شام وہاں ایک طرف کیتوولک عقیدے پر بحث ہو رہی تھیں اور دوسری طرف مغرب کے رجعت پسند ادیبوں پر تبرا بھیجا جا رہا تھا۔ ایک فرانسیسی پر الجیریا کے سلسلے میں لعنت ملامت ہو رہی تھی۔ امریکن امداد کے بارے میں میری رچرڈز کی لوگ جان کھار ہے تھے۔ میں دوسری طرف مڑا۔ قالین کے ایک سرے پر اجلا کا گروپ فرانسیسی انگلکچوں سے الجھ رہا تھا۔ کانگریس آف کلچرل فریڈم کا تذکرہ

تھا۔

”فرانس کی موجودہ دگرگوں حالت سے مغربی دانشوروں کی حالت غیر ہے۔ فرانس، جو یورپ کی لکھر اور ذہن کا سمبل تھا، اس کے موجودہ روئے نے مغربی انگلکچوانز کو ہٹر بڑا دیا ہے۔ مغرب کا باتفاق زوال ہو گیا ہے۔ اب اس کے پاس اپنے جواز میں کوئی دلیل نہیں۔“ تنویر گرج رہا تھا۔ ”اب اگر کل کو سارتر دوبارہ تائب ہو جائے تو میں متعجب نہ ہوں گا۔ مغربی تہذیب کے علمبرداروں کے پاؤں تملے سے زمین نکل گئی ہے۔“

”برطانوی دانشوروں کی کیا مضمون خیز حالت ہے۔ امریکہ سے روپیہ کھاتے ہیں۔“

یونیون دوسری طرف گوہرا فشائی کرنے میں مصروف تھا۔ میں ٹھلتا ہوا جا کر امریکنوں کے پاس بیٹھ گیا۔ ”میری ذرا امریکن ایڈ دینا۔“ رونلڈ نے سگریٹ پینے کے لیے میری رچرڈز کی طرف ہاتھ بڑھایا، وہ تھکہ لگا کر ہنسی، بری خوش اخلاق اڑکی ہے۔

دوسرے گروپ میں چن جن الاقوامی شہرت کے مورخ بیٹھے تھے جو چند روز کے لیے کے کراچی میں تھبہرے ہوئے تھے۔

”اگر امریکہ خانہ جنگی کے بعد وہ حصوں میں تقسیم ہو گیا تو ہم لوگوں کا آج تک جانے کیا حشر ہوا ہوتا۔“ امریکن مورخ نے کہا۔ ”تم اپنی تھیوری مت دہرانا کہ تقسیم کی وجہ اقتصادی تھی۔“ اس نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ملا کیا۔ ”اس کے علاوہ کیا تھا، میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں تو یہ جاننا چاہتی ہوں کہ مشرق کے ڈاؤن فال کی اصل وجہ کیا ہے؟“ فرنی نے کہا۔

”میں نے ٹونہنی سے بھی یہ پوچھا، وہ حیران ہیں ہندوستان کا اٹھارہویں صدی میں کیوں زوال ہوا۔“

”ہندوستان کی نہری آپاشی کا انظام ناقص تھا۔“ جیکب موریس نے کہا۔ ”یہ مسئلہ خالص زرعی ہے۔“ اب رونلڈ اور یونیں اور میری رچرڈ ڈزاک اور بحث کر رہے تھے۔

”مشرق کے ڈاؤن فال کی وجہ اسلام ہے۔“ ”ایں؟“

لینفرمیشن کے بعد عیسائی یورپ نے انقاود کی اپرٹ پیدا کی، وہ اسلام میں آج تک موجود نہیں۔ تم اعلانیہ اپنے مذہب پر اعتراض کر سکتی ہو؟ تمہارا جینا دو بھر کر دیا جائے گا۔

”واہ، اسلام میں بھی بدعتی اور باغی پیدا ہوتے رہے ہیں۔“ فرنی نے کہا۔ ”ہاں، مگر اپنے رسول یا خدا کے تصور یا قرآن کسی چیز پر بھی تنقید کر سکتی ہو؟ عیسائیوں کے یہاں ان گنت چرچ ہیں اور مخدوں کی فوج کی فوج موجود ہے۔ عیسائی بڑے اطمیان سے ثلثیت اور وہ تن میری کے تصور کا مذاق اڑاتے ہیں کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ مسلمان سائنسیک طریقے سے سوچنے کا اہل نہیں۔“

”جبھی ٹونہنی نے کہا ہے کہ انڈک سوسائٹی اسلامک سوسائٹی کے مقابلے میں زیادہ روادار ہے۔“

”بدھازم اور.....“

ڈیڑھ بجے کے قریب ہم لوگ وہاں سے اٹھے۔ ایک پورٹ جا کر قہوہ پیا۔
جب میں واپس گھر پہنچا اس وقت میں تھک کر چور چور ہو چکا تھا۔

سامنے نام کی کوئی بھی ہے۔ اس میں روشنیاں بجھ گئی ہیں۔ نام بھی کسی پارٹی سے
لوٹ کر سونے جا چکا ہے، یہ لڑکا میرے ہمراہ جہاز پر بھی آیا تھا۔ پیشے کے لحاظ
سے اخبار نہیں ہے، کچھ عرصے ہندوستان میں گھومتا پھرا۔ اب محکمہ فشریز یعنی
محضیوں کا ایڈواائزر ہو کر یہاں آ گیا ہے۔ فشریز کے علاوہ براد کاسٹنگ کو بھی
ایڈواائزر کرتا ہے۔

ایڈواائزر کی ہر طرف ریل پیل ہے۔ ہر محکمے میں ان گنت ایڈواائزرنوں کا
ہیں جو جانے کیا جاوے سکھاتے ہیں مگر اب تک کوئی ترقی کہیں نظر نہیں آئی۔
چہار سو اسکنڈلز کا بازار گرم ہے۔ رشوٹ کے اسکنڈل، دھاندہ لی اور سیاسی غنڈہ
گردی کے اسکنڈل۔

آج سب سے بڑا واقعہ، طاعت میری چیلتی بہن، یہ ہے کہ میں لکھنؤ کا
انقلابی، کانگریس کا سرگرم کارکن، متحده ہندوستان کی عظمت کا جوشیا انتیب، آج صح
میں بارہ سورہ پے ماہوار کے ایک عہدے پر لے لیا گیا۔ ایک پوری لیبارٹری مجھے
ست اپ کرنا ہے۔ اس کے لیے ساز و سامان خریدنے میں شاید جلد امریکہ بھیج دیا
جائے۔ فی الحال اسی کام کے سلسلے میں اگلے ہفتے مشرقی پاکستان جا رہا ہوں۔ اگلا
خط تم کوڑھا کے سے لکھوں گا۔

اب صحیح ہو رہی ہے۔ ساری رات میں نے تم کو خط لکھنے میں گزار دی، حد

ہے۔ میں نے جانے کتنے صفحے سیاہ کر دیے ہوں گے۔ ابھی میں نے درپھوں کے پر دے ہٹائے اور باہر جھانکا۔ کراچی جگ اٹھا ہے۔ کراچی اپنے کام پر جارہا ہے۔ سینکڑوں ہزاروں انسان سائیکلوں، چکڑا لیسی بسوں، سائیکل رکشاوں پر سوار کارخانوں اور فتروں کی طرف رواں ہیں، یہ وہی لوگ ہیں بیبا جن کو عرف عام میں جتنا کہا جاتا ہے۔ طاعت! ان لوگوں نے تو کوہی قصور نہیں کیا، کوئی جرم۔ ان کو تعلیم نہیں دی گئی۔ ان کو بھوکار کھا گیا۔ ان کو جس لاٹھی سے ہاںک دو ہنک جائیں گے، یہ سب امن سے زندہ رہنے، پیٹ بھر رہی کھانے، آرام سے سونے کے مستحق ہیں۔ طاعت جس وقت صحیح سوریے ہزاروں انسانوں کا ریا پی آئی ڈی سی کے نئے ڈاکیا رڈز کی طرف بڑھتا ہے اس وقت، قسم خدا کی، وہ نظارہ دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ مجھے پاکستان کے مستقبل سے امید یہی سی بندھ جاتی ہیں، یہ بڑے معصوم بے ضرر انسان ہیں، یہ لوگ جواس جید، بے ہود، بدشکل یوم ناؤں کی پ ندرہ لاکھ آبادی ہیں، یہ مکرانی اونٹ گاڑی والے، رنگ برلنگے لہنگے پہنے راجستھانی اور کاٹھیا واڑی مزدور نہیں، سعوداً باد کولوں میں رہنے والے بنارس کے جولا ہے (جن کے پر کھبیر کے ساتھ بیچ گناہ گھاث پر دو تارہ بجاتے پھرتے ہوں گے، لا لوکھیت اور لیاری کی لرزہ خیز مہاجر بستیوں کے باسی، مغربی یو۔ پی۔ کے کاری گر، دلی کے بساٹی، بمعنی کے نیکی ڈرائیور اور چاءخانے والے، فٹ پا تھو پر دکانیں رکھنے والے چھوٹے کاروباری، انجام کولوں اور آگرہ تاج کولوں کے باشندے جو ہاکس بے کے راستے پر ہندوؤں کے سابقہ شمشان گھاث کی دلدل میں جھونپڑے ڈالے پڑے ہیں اور اپنی اپنی جھگیوں پر چاؤ سے چاند تارے

کا جھنڈا الہراتے ہیں۔ ہر سال بارش آتی ہے تو ان کی جھونپڑیاں بہہ جاتی ہیں۔ اپا کی بیگمات آ کر امریکن دودھ کے ڈبے اور کمبل ان کو تقسیم کرتی ہیں اور ان کی جھونپڑیاں اگلی برسات تک کے لئے پھر آباد ہو جاتی ہیں۔ رات میری رچڑ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ بحیثیت سو شیو لو جست میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ اس قدر ناقابلِ یقین تکالیف کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے باوجود کراچی کی یہ مخلوق اس قدر امن پسند کس طرح ہے، یہ انقاپ کیوں نہیں پا کرتی۔ تشدید پر کیوں نہیں اتر آتی مال ہے کہ اس کا جواب میری رچڑ کو بھی معلوم نہیں۔ مجھے بڑی نامیدی ہوئی۔

نہیں طاعت! یہ بڑے پیارے لوگ ہیں۔ ان سے اس لیے تنفر نہ ہو کہ انہوں نے ہله کر کے تمہاری دنیا تقسیم کروادی، یہ بڑے معصوم انسان ہیں۔ ان کو ان مباحثوں، تاریخ کی ان موشاگیوں اور تجزیوں سے کوئی غرض نہیں جو کل رات میں نے اس محفل میں سنیں۔ جو کچھ روشنلڈ کہہ رہا تھا، جو کچھ تنویر کہہ رہا تھا، میری رچڑ کہہ رہی تھی۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ سندھ انڈسٹریل اسٹیٹ میں کارخانے کھل گئے ہیں اور ان کی مشینیں یہ انسان چلا رہے ہیں اور جس ملک میں وہ رہ رہے ہیں اس کا نام پاکستان ہے۔ اب ماضی پر رونے اور ماضی کی نسلطیوں پر پچھتا نا مصالکہ خیز ہے کیونکہ مستقبل ابھی باقی ہے، یہ سوچنا حماقت ہے کہ دونوں ملک پھر متعدد ہو جائیں۔ دنیا کا نقشہ ہر جنگ عظیم کے بعد بدلتا ہے۔ ۲۵ء کے بعد بھی بدل گیا۔ جب میں ماضی کے متعلق سوچتا ہوں میرا دل کتنا ہے مگر دل کہاں تک کئے گا۔ زندگی آدھی گزر گئی، تھوڑی سی باقی ہے۔ اب بھی موقع ہے کہ ہم اس

بچے کچے وقت کو سوارت کر لیں۔

اس ملک نے مجھے اپنی حفاظت میں لیا ہے۔ مجھے پناہ دی ہے۔ اس کا بنا نایا بگاؤتا اب میرے ہاتھ میں ہے۔ میں نے جو عمر بھر تحریک کے بجائے تعمیر کے خواب دیکھے ہیں کیا تمہارا خیال ہے یہاں کے ذہن پرستوں کے خلاء میں داخل ہو کر میں آپنے آپ کو کھو دوں گا؟ نہیں طاعت میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔
میں تعمیر کروں گا۔

پی۔ ایس:

تعمیر پر یاد آیا کہ بھیا صاحب کی کوئی، جس میں میں مقیم ہوں، بے حد شاندار ہے۔ ایک اطالوی آرکیٹیکٹ نے بنائی ہے خالص جدید ترین کیلی فور نین وضع کی۔

بھیا صاحب کی دلیں خاصی بد ذات ہیں۔ میں سوچ سوچ کر محفوظ ہو رہا ہوں کہ تم ان کو کس قدر ناپسند کرو گی، وہ اپوا کی بڑی سرگرم کارکن ہیں اور کراچی کی مشہور میزبان خواتین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ دلیں بھا بھی میری آباد کاری کے بے حد کوشش ہیں۔ ابھی انہوں نے میرے لیے ایک ہزار گز زمین خرید والی اور اپنے ایک با اثر پچھا کے ذریعے مکان کی تعمیر کی غرض سے پچاس ہزار روپیہ قرضہ دلوا دیا۔ کل جب ان کا اطالوی آرکیٹیکٹ مکان کا نقشہ لے کر میرے پاس آیا تو میرا دل چاہا دھاڑیں مار مار کر رہوں۔ (دلیں بھا بھی کی چھوٹی بہن نبی تال کا نونٹ میں پڑھ رہی ہے۔) عنقریب بھیا صاحب اور دلیں بھا بھی برازیل جانے والے ہیں۔ کوئی غیر ملکیوں کو پندرہ سو روپے ماہوار کرائے پر اٹھادی جائے گی۔ بابا اور

امی اس کا مجھ میں رہیں گے جو بھیا صاحب نے احاطے میں بنوائی ہے۔ بابا سارا دن اخبار پڑھنے میں گزارتے ہیں۔ امی کسی سے ملتی جلتی نہیں حالانکہ کراچی میں لکھنؤ کے بہت سے خاندان برائج رہے ہیں۔ بابا اور امی کی حالت دیکھ کر میرا کلیجہ غم سے پہنتا ہے۔

اب میں پھر جذباتی ہو رہا ہوں۔ لہذا خدا حافظ

تمہارا
کمن

مزید پی۔ ایس:

پچھلے ہفتے گورنمنٹ ہاؤس کے ایک ڈنر میں روشن آراء سے ملاقات ہوئی تھی۔ خاصی موئی ہو گئی ہے۔ اس کے شوہر کو میں نے نہیں دیکھا، وہ کسی مشن پر امریکہ گیا ہوا ہے۔ روشن نے تم لوگوں میں سے کسی کی بھی خیریت نہیں پوچھی۔ مجھ سے دو چار رسمی باتیں کرنے کے بعد دوسرا گروہ میں شامل ہو گئی۔

۹۹

ازمنہ وسطی کا ہندوستان گھاس پھونس جس کی دیواروں سے اگ رہا ہے۔ پرانی دلی کی عمارتیں، ابھیر، خاندیش، بنگال اور مالوہ کی مسجدیں۔ گوڑ کا داخل دروازہ، تانقی پاڑا، فیروز بینار، گن منت مسجد، احمد آباد اور کجرات، چندریہ اور

جو دھوپور کی مساجد، رانی سپاری کی مسجد، چمپانیز، دھروار، مانڈز کا ہندو لامگل، باز بہادر کا محل، کالپی کا چوراسی گنبد، جونپور کی اتالادیوی کی مسجد، دولت آباد کے قلعے، ہنسنی بادشاہوں کی عمارتیں، ہری نگر کی گوڑائی کی چوبی مساجد، چندیری کا بادل محل، بیدار اور گلگیر گہ، دکھن، دکھن۔

آخر پردیش میں للت پور تھا اور کالپی اور شکوہ آباد اور بدایوں اور جونپور۔
مغلوں سے پہلے کا ہندوستان۔

اڑیسہ، مدراس، کرناٹک آندھرا پردیش، حیدر آباد کا دلفریب، پرشکوہ، شامدار شہر، اجنبیا، ایلوورا، نیگلری کے پیہاڑ، بنگلور، کیرالا، ٹراونکور، سرل گھوم پھر کر دوبارہ از منہ وسطی کی عمارتوں میں پہنچ جاتا۔ ان گنت نام، ان گنت زمانے، وقت کے پیشہ، وہ، جو یورپ کے قدیم کی تھدرلوں کی محربوں کے نیچے گھومتا تھا اب خانہ بدوسوں کی طرح سارے ملک میں چکر لگاتا پھرا۔ ان عمارتوں کے پتھروں پر وہ ہاتھ رکھتا۔ کنوں کے چھوٹے، ہاتھی، گندھرو، حوض۔ سیڑھیاں، مینار، طاق، کسی تاریک اجارہ محراب کے نیچے سے کوئی دیہانتی لڑکی بکریاں چراتی نکل جاتی۔ کوئی لڑکا پتپیل کی شاخ پر سے باولی میں کو د جاتا۔ کوئی فقیر راستہ ٹھوٹ محل کے ایک شکستہ کونے میں بیٹھ کر چشم سلاگانے میں مصروف ہو جاتا۔ اوپر ٹوٹے ہوئے گندبوں اور سیچ صحنوں پر جھکا ہوا نیلا آسمان سمنا تارہتا۔ بادل کی مغربی گھاث سے جھوم کر اٹھتے اور دھروار اور چتوڑ پر چھا جاتے۔ خلیج بنگال سے لھٹا کیں بڑھتیں اور راج شاہی اور گوڑ پر پھیل جاتیں از منہ وسطی کا اداس، خاموش، اجارہ ہندوستان بارش میں نہاتا، گھاس کے پودے ہوا میں لہراتے۔

یہ پھر ماضی اور حال دنوں میں شامل تھے اور اس کے ذہن پر اس طرح بہتے تھے کہ اسے لگتا تھا کہ اب اس کا دماغ قطعاً معاوِف ہو جائے گی، وہ بھاگ کر حال میں بنناہ لیتا۔

سارے ہندوستان میں مارے مارے پھرنے کے بعد (وہ کس کا متناشی تھا؟ اس نے کئی مرتبہ جھپٹلا کر خود سے سوال کیا)، وہ پھر کلکتہ پہنچتا، پھر ہوائی جہاز میں بینچ کر مشرقی پاکستان کی سر زمین پر اترتا۔ ڈھاکہ کے کلب کی بار میں متواتر بیسر پیتے رہنے کے بعد پھر سلہٹ جانے والی ٹرین میں بینچ کر منزل مقصود کی طرف روانہ ہو جاتا۔

مزہ مقصود بالا خریج تھی۔

ایک چھوٹے سے آئیشن پر دھکے سے ٹرین رکی۔ طرح طرح کی آوازیں نیند میں ترتی ہوئی اس تک پہنچیں۔ ڈیم (اندرے) بولالڈ ڈیم سا (چاء) گرم گرم سا گرم سا گرم۔ ڈیم بولالڈ۔ اس نے کھڑکی کا پٹ چڑھا کر پھر باہر دیکھا۔ اس منظر میں کس قدر بے بنناہ ادا کی تھی۔ اندھیرا چھارہاتھا، باہر فضا میں پھولوں کی خوبیوں پھیلی ہوئی تھی جو وسیع ہرے تر و تازہ کھیتوں پر سے بہتی ہوئی آئی تھی ایک بوڑھا پھوس ہندو بے شمار گھٹڑیاں اور اسہاب اٹھائے جھکا جھکا، تیز تیز قدم اٹھائے جا رہا تھا، وہ دری تک بوڑھے کی دیکھا کیا حتیٰ کہ وہ آئیشن کے مجمع میں نظر وہ سے او جھل ہو گیا افواہ، یہاں کسی قدر آبادی تھی۔ عورتیں جن کے ماتھوں پر بڑی بڑی سرخ بندیاں اور مانگ میں گہرا سرخ سیندھور رچا تھا۔ رنگ برلنگی سوتی ساریاں پہنے، پچیاں، دھوتیوں کے کنارے سنجھائے

ہندو۔ چار خانہ تہذیب باندھے مسلمان جن کی زیادہ تر دائریں تھیں فاقہ کش کا لے کا لے لڑکے۔ حکام، انگلوا اندیں گارڈ، پالکی برادر (یہاں اب تک پالکیاں چل رہی تھیں)۔ پھر ٹین چلی، بنگالی آوازیں اندھیرے میں معدوم ہو گئیں۔ ٹین دوبارہ تالابوں کے کنارے دوڑنے لگی جن میں کنوں کے پھول کھلے تھے۔ کسی پھولوں کی بیل سے ڈھکے جھونپڑے کے دروازے پر کوئی عورت اوڈی ساری پہنے کھڑی نظر آ جاتی۔ چند عورتیں گھونگھٹ نکالے بانسوں کے جھنڈے کے نیچے نیچے چل رہی تھیں۔ ان کے نام کیا ہوں گے؟ آمنہ، سیمنہ، ریبا، رادھا۔ ان کی زندگیوں کی کہانیاں کیا ہوں گی بھا! ان کا نظریہ کائنات، ان کا فلسفہ! زندہ رہنے سے مر جانے تک کی داستان: تکالیف، افلام، قحط، قحط، قحط۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اللہ کو پڑ دے۔ پانی دے بھات دے دے..... اللہ بھات دے..... اس کے کانوں میں اس کو رس کے الفاظ گوئے جو اس نے کئی بار ڈھا کہ کی محفلوں میں طالب علموں سے سنا تھا۔ اللہ بھات دے..... اللہ بھات دے، یہ یہاں کا قومی تراث ہونا چاہیے، اس نے سوچا اور بنگال کے متعلق اس نے ہمیشہ سے کتنے رومنی تصورات باندھ رکھے تھے۔ شنیلا دیبی نے اسے یگور پر کیا کیا یک پھر پلانے تھے اور ساری کتابیں جو اس نے پڑھی تھیں: ڈی۔ سی۔ سیں اور جسم الدین اور لیما رائے۔ لوگ گیت جمع کرنے والوں کی نولیاں، ادبی کانفرنسیں، نکلتے کے تھیڑ اور تہذیبی سرگرمیوں اور یونیورسٹی لائبریری اور اٹھارہویں اور انیسویں صدی کا پس مظرا اور کمپنی کے زمانے کی بی

ہوئی کوٹھیاں، کلائیور و ڈجواب سجاش چندر بوس روڈ تھی اور علی پور اور دھرم تلہ، مگر وہ سرحد عبور کر چکا تھا۔ کلمتہ اور اس کی طلسماٰتی فضا میں دوسری طرف رہ گئیں۔

ٹرین ایک اور آئیشن پر رکی۔ اللہ بھات دے۔ بھات دے۔۔۔۔۔ بھات دے۔

چند پور بنیں گھڑیاں اور بچے انھائے دھکا پیل میں ادھکتی پر حکمتی تھرڈ کلاں کے ڈبیوں کے طرف بڑھ گئیں۔ اس کے کپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور ڈائنسنگ کار کے بیرونے کا سفید براق صافہ اندر داخل ہوا۔

”ڈنر صاحب؟“

”ہاں۔“

اس نے کمبل ٹانگوں پر ڈال لیا اور دوبارہ آرام سے لیٹ گیا۔

سلہٹ میں چاء کے باغات میں سینکڑوں پوربی مزدور کام کرتے تھے۔ رام والی، رام اوٹار، پچھمن اور سیتا۔ تلوچن اور چنپیلیا۔ پوربیوں کے یہاں یہ دو نام مقبول تھے: رام اور سیتا۔ ہند کا عہد عقیق زریں زمانہ، پائلی پتر، اندر پرستھ، ایودھیا، لکش و قی، ڈگ وجہ رام چندر اور متھل کی جنک ساری سیتا۔ ارے واہ رے تارت خ دانو۔

”ڈنر صاحب..... کافی لاوں.....“ بیرے نے ٹرے لا کر سامنے

رکھ دی اور سر گوشی کے لجھے میں اس طرح سے مخاطب کیا گویا وہ دیوتا تھا۔

وہ پھر ہال میں واپس آ گیا۔ اسے یاد آیا کہ اسے ابھی سری منگل پہنچتا ہے اور رنگامائی اور بندربن۔ اسے مزید روپیہ مانا ہے۔

دوسرے روز ٹرین سلہٹ پہنچی۔ آئیشن پر اس کا فیجر پیٹر جیکسن حسب معمول

کار لیے اس کے استقبال کو موجود تھا، وہ شہر سے نکل کر سری منگل کی سمت روانہ ہوئے۔

سر ماندی کے کنارے پہنچ کر اس نے کارروائی۔ اب شام کی تاریکی چھار ہی تھی۔ لاٹین لیے بوڑھے اور عورتیں کشتیوں پر سوار ہو رہے تھے۔ یا اتر رہے تھے۔ بوٹ گھر گھر کرتی دوسرے کنارے سے لوٹ آئی تھی۔ ساحل پر ٹکٹے لاریوں میں لوگ مرغیوں کی طرح ٹھنڈے بیٹھے تھے۔ ایک اندھا فقیر قرآن کی آیتیں پڑھ کر بھیک مانگ رہا تھا، اندھیرے میں اس کی آواز بڑی ہولناک لگی۔ دو اندھے ایک نوکے میں جا بیٹھے تھے، ایک اندھی عورت درخت کے نیچے بیٹھی تھی۔

یہاں کتنے اندھے تھے۔ کتنے بے شمار اندھے۔ بوٹ سے تنخیت جوڑ کر اس کی کارکشتی پر چڑھائی گئی۔ کشتی مسافروں سے لد گئی۔

”بڑا گنداب جمع ہے، چلو ہم لوگ نوکے میں چلے چلیں۔“ پیڑ نے کہا اس نے مزاحمت نہیں کی، وہ تو خود کشی کی طرح سطح پر بہہ جا رہا تھا۔ وہ دونوں کو دکر ایک نوکے میں سوار ہو گئے۔ نوکا بوٹ کے پیچھے چلنے لگا۔ ساحل دور رہ گیا جس پر مٹی کے تیل کے چراغ ٹمثمار ہے تھے اور جس کے عقب میں جھونپڑوں پر پان کی بیلیں چڑھی تھیں۔ ایک چاء خانے کے آگے لوگ لاٹین کے سامنے جھکے اخبار پڑھ رہے تھے۔ دریا پر کشتیاں چل رہی تھیں۔ افق پر ساری کے درخت ہوا میں جھو متے تھے۔ کس قدر سکون تھا، امٹ سکون۔

دفعت ازور کی ہوا جلی نوکا چکو لے کھانے لگا۔

بہت بوڑھا ماجھی اپنا زور لگا کرنوکا کھیتا رہا اور پھر گانے میں مصروف ہو گیا۔

اور اس نے دیکھا کہ اس کے بوڑھے ملاج کا نوکا الہروں پر ڈولتا جا رہا ہے۔

آگے جدھر گھپ اندر ہیرا ہے اور فضاوں طوفان لزرا ہے ہیں اور تاریک دھاراؤں میں مہریب ناکے منہ پھاڑے بیٹھے ہیں اور ہوا میں بہت تیز ہیں مگر اس فاقہ زدہ ملاج کی کشتنی بڑے مزے میں عناصر کا مقابلہ کر رہی ہے کیونکہ عناصر کی بے رحمی اور موت سے اس کی پرانی دوستی ہے۔

آخر جب ہوا کا زور زیادہ بڑھا اور کشتی بار بار ڈولنے لگی تو سرل نے لاشین اٹھا کر گھبرائیت کے ساتھ چاروں طرف نظر ڈالی۔ ”پیٹر ہم طوفان میں تو نہیں پھنس گئے؟“ اس نے پریشانی سے سوال کیا۔

”نہیں یہ تو معمولی سی ہوا ہے۔ پریشان مت ہو۔“ پیٹر نے جواب دیا۔ ”مگر ذرا اس کا لے سوڑ سے کہو کہ اپنا بھوٹا گانا الائپنے کے بجائے پتوار کی طرف زیادہ توجہ کرے ورنہ اس طرح ہم گھاث پر صبح تک نہ پہنچ پائیں گے۔“

”بے چارہ بوڑھا۔“ سرل نے چٹائی کی چھت پر جھک کر دوسرا اور جھانکتے ہوئے کہا۔ ماجھی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور صبر کے ساتھ پتوار چلانے میں مصروف رہا۔

”یہ بڑے ذیل ا لوگ ہیں۔ چستی ان میں نام کو نہیں۔“ پیٹر نے کہا۔

سرل نے چھت پر جھکے جھکے آواز دی: ”اوآدمی..... کیا نام ہے تمہارا؟“

”ابوالمنصور..... صاحب۔“

”ابوالمنشور.....“ سرل نے دہرایا۔

”جب صاحب.....“ وہ پھر پتوار پر جھک گیا۔ فوکا اب سرعت سے دوسرے کنائے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کنارے پر دونوں طرف انناس اور کیلے کے جھنڈ تھے اور گاؤں میں روشنیاں جل رہی تھیں۔ سرل نے فوکے کے اندر جھانٹا جہاں ابوالمنشور کا مٹی کا دیبا اور چٹائی اور جانماز اور دو کانی کے برتن رکھے تھے۔ دیوار پر تاریل آؤیزاں تھا، یہ اس بوڑھے پھونس سفید داڑھی والے کی ساری کائنات تھی جو دریا کے طوفانی پائیوں پر ڈلتی تھی۔ فتحا سرل کو بڑا عجیب سا لگا۔ اس نے آنکھیں ملیں اور خود کو یقین دلانا چاہا کہ یہ سب صحیح ہے، یہ صحیح ہے کہ قسمت کے ایک انوکھے داؤ نے اسے کیمرج کی گلیوں سے نکال کر یہاں اس فوکے میں لا بٹھایا ہے۔ اس عجیب و غریب، حسین ملک میں جسے مشرقی بنگال کہتے ہیں، جسے مشرقی پاکستان کہتے ہیں۔

لاشین اٹھا کر اس نے دوبارہ چاروں اور نظر ڈالی۔ روشنی سے لہروں پر راستہ سا بن گیا۔ برابر سے ایک شمپان گزر گیا۔ چاند بید کے درختوں کے پیچھے سے آہستہ آہستہ انتہائی کاہی کے ساتھ طلوع ہو رہا تھا۔

یہاں بیٹا باپ کی، بی بی شوہر کی عزت نہیں کرتی۔

لوگ سجاوں میں جمع نہیں ہوتے۔

خوبصورت باغ اور عبادت خانے تغیر نہیں کیے جاتے۔

یہاں امیروں کی دولت محفوظ ہے لیکن چروں ہے اور کسان دروازوں کی چھنٹی چڑھا کر سوتے ہیں۔

بغیر پانی کی مدی۔ بغیر گھاس کا جنگل۔ بغیر چروں کا گل۔

پڑھتے پڑھتے مال نے رامائش بند کر دی۔

”یہ کھاں کا ذکر ہے۔“ سرل نے پوچھا۔

”کہیں کا بھی نہیں۔ میں تو رامائش دیکھ رہا تھا۔ یہاں الماری میں پڑی مل گئی۔

مدتوں پرانی۔ اس پر ۱۹۶۷ء کی تاریخ پڑی ہے۔“ وہ اداسی سے کتاب کے سروق پر لکھے ہوئے نام کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگا جس کی سیاہی و حندی ہو چکی تھی۔

”تم تو اس عقیدت سے پڑھ رہے ہو گویا تلسی داس جی کیونٹ تھے۔“ سرل نے کہا۔

”ہاں۔ بھگت ویاس بھی پارٹی ممبر تھے۔“ مال نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”نہوں نے لکھا ہے مہا بھارت میں کہ اگر بادشاہ ظالم ہو تو اس کے خلاف بغاوت کرو۔ ایسا بادشاہ بادشاہ نہیں۔ اسے پاگل کتے کی موت مارنا چاہئے۔“

”واہ پنڈت جی۔“ سرل نے نہس کر کہا۔ ”کیا بات ہے، مگر یہ بتاؤں کہ اب تم یہ رامائش بھارت بھول جاؤ ورنہ آفت میں پھنسو گے۔“

”ہاں۔ یہ میں نے بڑی بے وقت کی راگنی چھیڑ دی۔“ مال نے کہا۔

دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ گزرے ہوئے برس بیز کے گاسوں میں بلبلوں کی طرح تیرا کیے۔ آدھ گھنٹہ اور گزر گیا۔ سرل چپ چاپ بینھا نیلی پیماڑیوں کو دیکھتا رہا تھا کہ اس پار برداشتہ۔

”کیوں بھائی، کیا سوچتے ہو؟“ مال نے اسی الم سے پوچھا۔

”کچھ نہیں..... سوچ رہا تھا کہ برمًا اگر یہاں سے پاؤں پاؤں جالیا جائے تو کتنی دور ہو گا۔“

”بس یہی سوچ رہے تھے؟“

ایک آوارہ فاقہ زدہ کتابی نیچے سے کوکر برآمدے میں آگیا۔

”دیکھو یہ بھی برمًا سے آ رہا ہے۔“

”یا برمًا جانا چاہتا ہے۔“ مال نے کہنے پن سے کہا۔

کتابدم ہلاتا رہا۔

”ہلو ہلو لومکٹ کھاؤ۔“ سرل نے کتے کی خاطر کی۔

”یا ری، یہ تو ریڈ چانٹا سے بھاگ کر آیا ہے۔“ مال نے اسے غور سے دیکھ کر بڑی متانت سے کہا۔ ”میٹی کیونٹ کتا ہے۔ آزادی کی جلاش میں یہاں پہنچا ہے۔“

سرل نے منہ لٹکا کر مال کو دیکھا۔ ”تم اب بھی کانج کے زمانے کی سی باتیں کرتے ہو۔“

”اب بھی کی تعریف نہیں کی جاسکتی۔“

میز پر چاء کا سامان رکھا تھا۔ مال نے ایک سینڈوچ کتے کے سامنے پھینکا اور

بولا: ”نہیں سرل…… میں اب مشرف بہ اسلام ہو چکا ہوں۔ دیکھو میرا پاسپورٹ۔“ اس نے جیب سے سبزرنگ کانیا نویلا پاسپورٹ نکالا۔

”ریلے برادرز میں تو میں تم کو اس سے اچھی نوکری دلوادتا۔“ سرل نے کہا۔ ”کیا کرتا فلی مل کی پلانگ کرنے ائے ہوتم؟ یہاں اکثر لوگ اس سلسلے میں آتے ہیں۔“

”میں جھک مارنے آیا ہوں۔ تم سے مطلب؟ تم بگالی مزدوروں کا خون چوستے کے لیے نہیں آن موجود ہوئے۔ سوپ بولے تو بولے چھلنی بھی بولی جس میں باون چھید۔ میں تو ہوں ہی زمانے بھر کا نمبر ایک کا بھگوڑا رجعت پسند۔“ اب اس پر پھر اپنے ضمیر کا دورہ پڑنے والا ہے۔ سرل نے بڑے دکھ سے دوسری طرف منہ کر لیا۔

سرل ہاؤرڈ اشٹلے مذیوں، پیماڑیوں اور گھنے جنگلوں میں سے گزرتا کل صبح ہی یہاں پہنچا تھا، وہ سری منگل سے کاروبار کے سلسلے میں چانگام آیا تھا جہاں سے اس کی چاء ایکسپورٹ کی جاتی تھی۔

چانگام میں پھر دل کی وحشت نے زور باندھا اور پیٹر پر کام کی دیکھ بھال چھوڑ کر اس نے پیماڑیوں کا رخ کیا، وہ دو ہزاری اور بندربن اور چند رگوں کے جنگلوں میں مارا مارا پھراوار رانگا مائی کے ڈاک خانے سے اپنے بھائی کو اس نے فرمانبرداری سے اپنی خیریت کا خط بھی بھیجا جس میں آسام اور سلہٹ اور چانگام کے علاقوں کی خوبصورتی پر اس نے روشنی ڈالی اور لکھا کہ امید ہے کہ اگلی کرسمس وہ اس کے ساتھ سلہٹ میں منائیں گے۔

یہ خبر سن کر سرل نے روز میری کو طلاق دے دی (اس کی وجہ کسی کو معلوم نہ تھی)۔ اس کے بڑے بھائی لارڈ بارن فیلڈ کے دل پر سے ایک بو جھسا اتر گیا تھا۔ ان کو محسوں ہوا تھا کہ یہ ہمیا سے نکل کر ان کا چھوٹا بھائی بلا آخرا ب اپنی دنیا کو واپس لوٹ آئے گا۔ لارڈ موصوف نے گلکتے سے اپنا کار و بار سمیٹ کر اب بڑے چیلے پر مشرقی پاکستان میں روپیہ لگایا تھا جہاں ان کے چاء کے باغات بھی تھے۔ سرل، جواب کیمبرج سے نکلنے کے بعد روزگار کی تلاش میں لندن میں مارا مارا پھر رہا تھا، اسے ایک روز انہوں نے اپنے کلب میں بلا یا اور بغیر تمہید اس سے کہا:

”میں تم کو پاکستان بھیج رہا ہوں۔“

”بہت اچھا۔“ سرل نے اسی انداز میں جواب دیا۔ اب زندگی میں مزید جھੜ کرنے کی گنجائش کہاں تھی!

پچھلے چھ میں سے وہ پاکستان میں تھا۔ اسے لندن چھوڑنے کا زیادہ رنج نہیں ہوا۔ گوتم نیلمبر، ہری شنکر، مال، ماسیکل، سریکھا، سب لوگ پہلے ہی انگلستان کو خیر با دکھے چکے تھے۔ روانہ ہونے سے پہلے اس نے شنیلا دہی کوفون کیا اور طاعت کو بھی مگر طاعت گھر پر موجود تھی۔

اب وہ سری منگل میں ایک بے حد خوبصورت بنگلے میں رہتا تھا۔ کام سے فرصت ملتے ہی ہندوستان کا چکر اگا آتا تھا۔ دارجلنگ، شیانگ، گلکتہ، بمبئی، حیدر آباد دکن، عمارتیں، گھنڈر، مکانات اسے طرح طرح کی کہانیاں سناتے۔

کل شام جب وہ ایک پگوڈا کے باغ میں گھنٹہ بھر چپ چاپ بیٹھے رہنے کے بعد سر کٹ ہاؤس واپس پہنچا تو ایک نوجوان کی پشت پر اس کی نظر پڑی جو پچھلے

برآمدے کی ریلنگ پر جھکا نیچے کرنا غلی مدنی کو دیکھ رہا تھا۔

اس کے قدموں کے آہٹ پر اس نوجوان نے پٹ کر سرل کو دیکھا۔

یہ نوجانِ مال رضا تھا۔

مال نے اسے اپنی داستان سنائی اور اسے مطلع کیا کہ وہ ایک لیبارٹری قائم کرنے کراچی سے ادھر آیا ہے اور سارے صوبے کا دورہ کرتا پھر رہا ہے۔

اب وہ صحیح سے برآمدے میں بیٹھے تھے اور زندگی کا غم ان کے نکڑے نکڑے کیے ڈال رہا تھا۔

شام کا اندر ہیرا چھا گیا تھا۔ ملاز میں نے سرکٹ ہاؤس میں یہ پروشن کر دیئے۔

چند روز قبل کھیدا ختم ہوا تھا۔ برادر کے کروں میں ہاتھیوں کا ٹھیکے دار ایک انگلو انڈین مع اپنے انگلو انڈین عملے کے ٹھہر اہوا تھا جو شراب پینے کے بعد بے حد فاسدیاں باقی کرتا۔

رات کو نوجوان خوش مزاج افسروں کی ایک ٹولی شور مچاتی ہوئی آئی۔ ان میں سے دو ایک لڑکے علی گڑھ کے تھے۔ مال کی ان سے علیک سایک ہوئی۔ کھانے کی میز پر وہ بنگال کے مسئلے کا تذکرہ کرنے لگے۔

”بہت سے لوگ تو بس نام کے مسلمان ہیں۔“ ان میں سے ایک نے کہا۔

”اچھا! میرا تو خیال تھا کہ اسلام کا یہاں بڑا ذریعہ ہے جتنا سارے بر صغیر میں نہیں ہے۔ مثلاً اتنے نمازی اور اتنے سخت پرده میں نے اور کہیں نہیں دیکھا۔“

مال نے کہا۔

”..... سارا روپیہ یہاں لکھتے کی کیونٹ پارٹی سے آتا ہے۔“ انہوں نے کہا۔

”بنگال کا مسئلہ ہے نازک“

”مال چپ چاپ بیٹھا ان سب کو دیتھا ہا۔“

کھانا کھانے کے بعد وہ سب اپنے اپنے کروں کی طرف چلے گئے۔ سرل اور مال پھر پھلے برآمدے میں آبیٹھے جس پر نارنجی پھولوں کی بیل پھیلی ہوئی تھی۔ سارے میں خاموشی چھا گئی۔ ندی جہاں مرتی تھی وہاں پیہاڑی پر پاورہاؤس تھا۔ رات کے نائلے میں اس کی گھر گھرا ہٹ بڑی صاف سنائی دیتی تھی۔ اس کے قریب بانس کا سینما ہاؤس تھا جس میں سے ”نیجو باؤر“ کے گاؤں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ لتا کی آواز ندی کی سطح پر تیرتی ہوئی سرکش ہاؤس تک آ رہی تھی۔ مال جنگل پر سر رکھے اس آواز کو سنتھا ہا۔ لتا کی آواز ایک ایسا مضبوط پل ہے جس نے دو دشمن ملکوں کو ایک دوسرے سے ملا رکھا ہے، اس نے سوچا۔

”تم نے لتا کو سننا ہے؟“ اس نے بآواز بلند سرل کو منا طب کیا۔

”وہ کون ہے؟“ سرل نے چونک کر کہا۔

”مال بوریت کے دریا میں غوط زن رہا۔“

خانہ ماں کافی کی کشتی لے کر نمودار ہوا۔

”مال کی اس خانہ ماں سے بہت دوستی ہو گئی تھی۔ کئی بار ان دونوں کا مختلف مسائل پر تبادلہ خیالات ہو چکا تھا۔“

”کہنے خانہ ماں جی، کیا حال چال ہے؟“ مال نے کہا۔

”مہربانی ہے حضور۔ آپ لوگوں کے آنے سے رونق لگی رہتی ہے ورنہ اس جنگل بیابان میں کیا رکھا ہے۔“

”تم بڑی صاف اردو بولتے ہو۔ ڈھلکیا ہو کیا؟“

”بھی نہیں سر کار، ہم تو کھلتی ہیں۔“

”اچھا۔ ہم بھی تھوڑے سے کھلتی ہے تھے ایک زمانے میں۔“

”بھی حضور۔“

مال نے ایک اور جمائی لی۔ خانہ ماں جھک کر کافی بنانے لگا۔ سرل حسب معمول آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔

گورنر جنرل اور ان کی پارٹی کھیدا کے بعد بند رہن سے لوٹ کر کراچی واپس جا چکی تھی۔ ان کی آمد کے لیے باشنا کا سرکٹ ہاؤس خاص طور پر آرائش کروایا گیا تھا۔ گورنر جنرل کی شان و شوکت دیکھ کر خانہ ماں کو سفر فریڈرک کازمانہ یاد آ گیا جو بنگال کے گورنر تھے اور جب شکار کے لیے آتے تھے تو اسی طرح جنگل میں منگل لگ جاتا تھا اور خوب بخیش ملتی تھی۔

”پچھلے دنوں تو یہاں بڑی چہل پہل رہی ہوگی۔“ مال نے کہا۔

”بھی حضور۔ آپ کو اس زمانے میں آنا چاہیے۔ دور دور سے صاحب لوگ آیا تھا۔ اب خوشی کی بات یہ ہے کہ بڑے لاث صاحب انگریز کے بجائے مسلمان ہیں مگر شان میں انگریزوں سے کم نہیں۔ اسی پر تو غیر لوگ جلتے ہیں۔ اسلام کی شان دیکھ کر حاسدوں کے آگ لگتی ہے۔“

”کون جلتے ہیں؟“ مال نے پوچھا۔

”اُرے صاحب“ اس نے چاروں طرف دیکھ کر سرگوشی میں کہا۔ ”یہاں بڑا بڑا مفسد پڑا ہوا ہے۔“

”یہاں کہاں؟“ مال کو اس کے راز درانہ لجھ سے ایسا لگا جیسے ان گھنے جنگلوں میں بڑے جیڈ کمپونٹوں کی کمین گاہیں ہیں۔ ابھی ان کے گوریلا دستے اندھیرے سے نکل کر سرکش ہاؤس پر دھاوا بول دیں گے اور وہ بے چارا اپنا فرض منصبی انجام دتا ہوا شہید ہو جائے گا۔

سرل کپڑے تبدیل کرنے کے لیے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ خانہ ماں نے کافی کے برتن اٹھایے، پھر خاموشی چھا گئی، کچھ دیر بعد ایک امریکن ڈرائیک روم میں سے نکل کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہے تکلفتی سے آن کے مال کے پاس بیٹھ گیا۔

”ہاؤ ڈی.....“ اس نے مسلکا کر کہا۔

”اُر..... ہاؤ ڈو یو ڈو.....“ مال نے ہاتھ ملا کیا۔

”میں جان ناٹی ٹس سبل جو نیز ہوں۔ مجھے جو نی کہو۔“

”ہو جو نی۔ یہاں کیسے آنا ہوا؟“ پھر دھتنا مال کو خیال آیا کہ یہ کیسا غیر ضروری سوال تھا۔

”میں چکر قبائل کے متعلق ایک ڈو کو منہری فلم بنارہا ہوں۔“

”او..... ہاؤ اکسائینگ!“ مال اور ناٹلیں پھیلا کر آرام کری پر لیت رہا۔ ”سگر ہیٹ؟“
”تھینکس۔“

دوسراے لمحے جوئی بھی فضا کے اس سحر میں کھو گیا، وہ جنگے پر بازو رکھ کر ندی کو دیکھتا رہا۔ جوئی کی بیش شرٹ پر جوا خبار چھپے تھے مال آنکھیں کھول کر برآمدے کے مددم اجائے میں ان کے الفاظ پڑھنے کی کوشش کرتا رہا، پھر اس سے بھی اکتا گیا۔ دریا پر مکمل سکونت کے ساتھ کشتیاں گزر رہی تھیں۔ کبھی کسی ملاح کے گانے کی آواز بلند ہوتی تھی۔ ان کشتیوں میں چراغ جل رہے تھے۔ اب گھپ اندر ہمرا سامنے وادی پر چھا گیا تھا۔

پھر جوئی نے بڑے دوستانہ اور بھولے انداز میں مال سے باقی شروع کر دیں۔ مال ہوں ہاں کرتا رہا۔ سرل نے ڈرینگ گاؤن پہن کر اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے جھانکا اور مال کو امریکن کے ساتھ سر کھپاتا دیکھ کر چکے سے غسل خانے کے راستے باہر نکل کر پہلو کے برآمدے کی بیٹھیوں پر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے بھی دریا بل کھاتا ہوا بہہ رہا تھا اور کشتیوں کی روشنیاں لرز رہی تھیں۔ ان صیارا چکر کا تما سارے میں چھایا چا رہا تھا۔ برآمدے میں جوئی اپنی کیساں آواز میں مال کو بتا رہا تھا کہ وہ کچھ عرصہ قبل ہی مشرقی پاکستان آیا ہے لیکن اندر ڈیولپڈ ممالک کا اسے خاصہ تجربہ ہے کیونکہ اس سے پہلے وہ ویسٹ نام میں رہ چکا ہے۔ اس کی بیوی نیویارک میں پرلیس فوٹو گرافر ہے۔ ان کے دونوں بیویوں کی تصویر نکال کر دکھائی اور دریہ تک اپنے چھوٹے بیچے کا تذکرہ کرتا رہا۔ جو دو سال کا تھا، پھر اس نے ایشیا میں کیوززم کے خطرے پر روشنی ڈالی اور مال کو بتایا کہ مسلم ممالک اپنی مذہبی اور روحانی طاقت کے ذریعے کیوززم کے خلاف جہاد میں امریکہ کی بڑی مدد کر سکتے ہیں۔

”اب تو کافی پی لو۔“ مال نے جہانی لے کر کہا۔

”نہیں۔ اب میں کھانا کھاؤں گا۔“ اس نے مشرقی پاکستان کے سیاسی حالات پر گفتگو شروع کی۔ مال کو بڑا تعجب ہوا کہ مشرقی پاکستان کے متعلق ساری تفصیلات، اعد و شمار، ہر چیز اسے فوک زبان تھی اور اسے یہاں آئے صرف ایک ماہ ہوا تھا۔

اتنے میں دو اور امریکن نگین بیش شرٹ پہننے ڈرائیور روم عبور کرتے ہوئے برآمد میں آگئے۔ ایک دفعہ پھر تعارف کا سلسلہ شروع ہوا اور بہت اخلاق کی باتیں کی گئیں۔ یہ دونوں یو۔ ایس۔ آئی۔ ایس ڈھاکے کے افراد تے اور اسی جوئی کے ہمراہ رانگامائی آئے تھے۔ لوکیشن ڈھونڈنے کے لیے وہ سارا دن چکمے گاؤں میں گھوٹتے پھرے تھے۔ ان کے پاؤں گرد آسود تھے اور بہت تنگے ہوئے تھے۔ پچوں کے ایسے جوش و خروش سے وہ مال کو اپنے ایڈ و نچر زستاتے رہے۔

”تم کو معلوم ہے۔ ریڈ چائنا یہاں سے کس قدر قریب ہے۔۔۔۔۔ ان پہاڑیوں سے ذرا ہی آگے بڑھ کر۔۔۔۔۔“ جوئی نے ایک اور انکشاف کیا۔

سرکٹ ہاؤس کے خدمت گارنے آن کر اطلاع دی کہ غسل کے لیے پانی لگا دیا گیا ہے، وہ سب اسی طرح باتیں کرتے اٹھ کر اندر چلے گئے۔

سرل نے منڈیا نکال کر پھر کھڑکی میں سے جہانگا۔

”گئے تمہارے یار دوست۔“

”آ جاؤ۔ اب میدان صاف ہے۔“ مال نے جواب دیا۔

سرل باہر آ کر اپنی آرام کرسی پر لیٹ گیا، وہ دونوں پھر اپنے اپنے مراتبے

میں ڈوب گئے۔ مال اور سرل پانچ چھوٹن وہاں رہے۔

سرکٹ ہاؤس کے نیچے کرنا فلی روائی تھی جس پر لکڑی کے بڑے بڑے گٹھے بہا کر چند رگوں کی طرف لے جائے جا رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر انگلو اندین ڈپٹی کمشز کا بندگہ تھا۔ اس کی آرٹسٹ لڑکی جیسی سیفید ساری پہنے پیاڑیوں پر بیٹھی خاموشی سے تصویریں بناتی نظر آتی۔ بل کھاتے راستوں پر منگول شکلوں والے پیاڑی بوجھ پیٹھ پر لادے گزر کرتے۔ سرکاری جیپ گاڑیاں زن سے نکل جاتیں۔ صبح شام مندوں میں گھنٹے بختے۔ ہاٹ میں واڈی سے آئی ہوئی چیزیں بکتیں۔ رنگ برلنگے سوتی کپڑے، موںگے اور فیروزے کے ہار، چاندی کے زیور۔ لمبے لمبے پانپ پیتی ہوئی نہس مکھ پیاڑی عورتیں دکانیں لیے بیٹھی رہتیں۔ ہندو، مسلمان، بدھ۔ سب سکون اور قناعت سے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ انسان کے کھیتوں میں کٹائی کر رہے تھے۔ چاول اگا رہے تھے۔ عمیق خطرناک جنگلوں سے بانس کاٹ کر نیچے لارہے تھے۔ اکثر کسی انتہائی ویران اور غیر آباد جنگل کی اوپنجی پلڈنڈی پر مال کو ایک بوڑھا تہجد باندھے، سر پر بانسوں کا بھاری گھٹا اٹھائے اپناراستہ طے کرتا دکھلائی دے جاتا۔ اس گٹھے کو بیچ کروہ چند آنے مائے گا۔ صدیوں سے وہ یہی کرتا آ رہا تھا۔ آج بھی اس کی حالت میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا تھا۔ جنگلوں میں چکسہ اور ماگھ اور موںگ قبلے اپنے بانس کے جھونپڑوں میں زندہ تھے۔ میسیوں میل کا فاصلہ طے کر کے ہاٹ کے لیے رانگا مائی آتے تھے۔ یہاں شرکیں نہیں تھیں۔ یا ریل گاڑیاں یا ہوائی جہاز کی سروں۔ یہ حسین ترین، پر امن علاقہ، وحشیوں کا ملک، کہلاتا تھا۔ یہ جگہ اپنحضر و پولوجست

کے لیے جنت ہے، جو نی کہتا اور ان کو اپنے ساتھ لو کیش پر گھسید کر لے جاتا۔ یا دونوں خود ہی جیپ پر بیٹھ کر سا گوان کے جھرمٹوں میں گھس جاتے اور پرندوں کی چپکار سنتے پھرتے۔ پہاڑی اڑکیاں سیاہ دھاری دار سیر و نگ باندھے، گلریاں اٹھائے ان جنگلوں میں سے گزر جاتیں۔ کسی بھکشوں کے نارنجی لباس کی بھلک دکھائی دے جاتی۔ کرنا فلی کے دھارے پر انہوں نے دور دور تک کشتی رانی کی۔ بندر بن جا کر موگھر رجہ سے ملے اور اس کا محل دیکھا اور وہ گھنے جنگل جن میں ہاتھی رہتے ہیں۔

”آسام میں اس سال جو سیاہ آیا تو بے شمار ہاتھی ہجرت کر کے یہاں آ گئے۔ ویسے بھی ان جنگلوں کی سرحد کا صحیح تعین کرنا بڑا مشکل ہے۔“ ایک افسر نے مال کو بتایا۔

”تو گویا ان پاکستانی ہاتھیوں میں، جن کا کھیدا ہوا، مہاجر ہاتھی بھی شامل تھے؟“ مال نے سمجھی گی سے دریافت کیا۔

انہوں نے بندر بن کے سارے علاقوں کی سیر کی۔ انسانوں کو دیکھا۔ مال ان کی زبان نہ سمجھتا تھا، وہ مال کی زبان سے ناواقف تھے۔ یہ بھولے، معصوم لوگ جواب تک تقریباً پھر کے زمانے میں رہ رہے تھے۔

ان جنگلوں میں خوبصورت جانور بھاگے پھر رہے تھے۔ چیتے اور گلدار اور بارہ سنگھے۔

یہ کیسی صاف سترہی، پا کیزہ دنیا تھی۔

ایک روز شام کو وہ رانگماٹی سے کرنا فلی کے اس پار راج بائزی گئے جہاں چکہ

راجہ رہاتا تھا۔ یہاں گویا ہندوستانی ریاستوں کے دم واپسیں کا بڑا موثر منظرِ مال کو دکھلائی دیا۔ باغ میں ایک چھوٹی موٹی توپ رکھی تھی۔ ایک مندر تھا۔ آم کے درختوں پر شام کی اداسی میں کوئی چلا رہی تھیں۔ سامنے معمولی سے محل میں مدھم بلب روشن تھے کیونکہ رانگامائی کا پاورہاؤس بے حد کمزور تھا۔

ہال میں راجہ کے پرکھوں کی قدم آدم رغنی تصاویر آ ویزاں تھیں۔ ”ان پرکھوں میں بنگال اور آسام کے مغل گورز بھی شامل تھے۔“ سرل نے فوراً اس علاقے کی ہستی کی اس کرم خورده کتاب کا حوالہ دیا جو سرکش ہاؤس کے ڈرائیور روم میں رکھی تھی۔

انگلستان کے پڑھے ہوئے نوجوان راجہ اور اس کی ماں نے سرل اور مال کا استقبال کیا۔

ڈرائیور روم میں پیانو کے اوپر سادھنا بوس کی تصویر پر رکھی تھی۔ کیشپ چندر سین کی تصویر آتش دان پر موجود تھی۔ راج Mata کیشپ چندر سین کی توںی اور سادھنا بوس کی بڑی بہن تھیں۔ ”کیشپ چندر سین نے جب اپنی کمسن لڑکی کی شادی مہاراجہ کوچ بھار سے کر دی تو برہمو سماج میں بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔“ مال نے سرل کے گوش گزار کیا۔

”ہاں۔ میں نے ستی دیوی، مہارانی کوچ بھار کی خود نوشت سوانح حیات پڑھی ہے۔ شنیلا دہبی نے پڑھنے کو دی تھی جب وہ برہمو سماج پر یک پھر دیتی تھیں۔“ سرل نے آہستہ سے جواب دیا۔

”آپ پاکستان سے آئے ہیں؟“ راج Mata نے پوچھا۔

مال ایک بھٹے کے لیے ہڑبڑا گیا۔ یہ بھی تو پاکستان ہے، پھر دورے بھٹے اس نے صورت حال پر غور کیا۔ کیا یہ پاکستان نہیں ہے؟ کسی ملک کا تصور دراصل کیا ہے؟ یہ راج باڑی اب کس ملک میں شامل ہے؟ کیشپ چند رسیں اب کدھر کھپتے ہیں؟

رانی صاحبہ کمرے میں داخل ہوئیں جو ایک خوبصورت سی سترہ سالہ لڑکی تھی جس نے ساری عمر دارجلنگ کے کانونٹ اسکول میں گزاری تھی، وہ دونوں فوراً تعظیم کے لیے کھڑے ہوئے۔ مال کے خیالات کا سلسہ منقطع ہو گیا۔

اب راجہ، جو کافی خوش شکل تھا، اوس فرڈ کے لجھے میں سرل سے کہہ رہا تھا: ”حکومت کرنا فلی میں بند بامدھ کر سارے صوبے کے کارخانوں کے لیے ہائیڈرو الیکٹرک کا ذخیرہ بنانے والی ہے۔ میرے قبیلے کے لوگوں کا علاقہ بھی زیر آب ہو گا۔ ان کو حکومت معاوضے دے کر کبیس اور بساوے گی۔ یہ میرا مکان مع رانگا مانی کے غرقبہ ہو جائے گا۔“

”تغیر کے بغیر ترقی ممکن نہیں۔“ مال نے آہستہ سے جواب دیا۔

”ہاں۔“ راجہ نے کہا۔

راج ماٹا کلکتے کی باتیں کرنے لگیں۔ مال کا ذہن پھر دور دور بھٹک گیا۔ بنگال کے راجوؤں کا ماحول، برداں، کوچ بھار، میمن سنگھ۔ یہ اس الف لیلوی سلسے کی ایک چھوٹی سی گنام کڑی تھی جواب ہائیڈرو الیکٹرک کے پانی کے ذخیرے میں غرق ہونے والی تھی۔

مال اور سرل نے کچھ دیر بعد اجازت چاہی۔ راجہ اور راج ماٹا دروازے تک

پہنچانے آئے.....

”پھر کبھی ضرور تشریف لائے گا۔“ راج ماتا نے مال سے کہا۔

”ضرور۔ خدا حافظ۔“

وہ باہر آ گئے۔ راج بائزی کی روشنیاں ٹھیکایا کیں۔ کرناٹی پر کشتوں کا تشریف
اب کم ہو چلا تھا۔ رات بھیکتی جاری تھی۔

دوسری صبح وہ رانگا مانی کو خیر باد کہہ کر نیچے میدانوں میں اتر آئے۔
چٹا گانگ سے وہ ٹرین میں بیٹھ کر سیتا کندڑوانہ ہوئے۔

راستے میں نوجوان تک چیکر کیا رہمنت میں داخل ہوا اور تک دیکھنے کے بعد
دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

تشریف رکھئے۔ مگر یہٹ لیجئے گا؟ مال نے کہا۔
اس نے ذرا بھونچ کا ہو کر مال کو دیکھا اور پھر بھیت ہوئے سیٹ کے کنارے پر
نک گیا۔

”آپ یہیں کے رہنے والے ہیں؟“ مال نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ سپاری کے اس جھنڈ کے ادھر میرا گاؤں ہے۔“ تک چیکر نے
جواب دیا۔

مال کو اور بہت سی باتیں معلوم ہوئیں: اس کوئی بی ہو چکی ہے۔ اس کی تختواہ
بہت کم ہے اور گھر کا خرچ بہت زیادہ ہے۔ پانچ بہنوں کی شادی کرنا ہے، وہ
موجودہ وزارت سے مطمئن نہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اس کی سیاسی معلومات حیرت انگیز
تھیں، وہ یونیورسٹی کے کسی جوشیلے طالب علم کی طرح مدلل گفتگو کر رہا تھا حالانکہ وہ

محض ایک موقق بلکچیکر تھا جس کی زندگی چھوٹی لائیں کی ہڑین پر سفر کرتے گزرتی تھی۔

”پاکستان بننے سے پہلے فرست اور سینئنڈ کلاس کے ڈبیوں میں کوئی مسلمان نظر نہ آتا تھا۔ بنگالی مسلمان سماجی اور اقتصادی طور پر اس حد تک پس ماندہ تھے۔ آج آپ لوگوں کو فرست کلاس میں سفر کرتے دیکھ کر میرا دل خوشی سے بھر جاتا ہے۔“ اس نے مال سے کہا۔

ائیشیشن قریب آ رہا تھا۔ گاڑی کی رفتار مدد حمہ ہونا شروع ہوئی۔

”آپ کو بتا ہے“ بلکچیکر نے کھڑے ہوتے ہوئے معاً کمال کو مخاطب کیا، ”۲۷ سے آج تک اس لائیں پر چینگ کرتے مجھے اتنے برس بیت گئے۔ آپ پہلے بڑے افسر ہیں جنہوں نے مجھ سے اخلاق سے بات کی اور مجھے ایک باعزت انسان سمجھا۔ میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔“

دوسرا لمحہ وہ سرعت سے ڈبے کے باہر نکل گیا۔

مال اور سرل ایشیشن پر اترے۔ شام ہو رہی تھی۔ ہوا میں پھولوں کی خوبصورتی تھی۔

”ہم سیتا کے مندر جانا چاہتے ہیں۔“ مال نے ایک آدمی سے پوچھا۔

”اب اس وقت نہ جائیں۔ پھاڑی کی چوٹی بہت اوپنجی اور پر خطر ہے۔ لوٹتے لوٹتے رات ہو جائے گی۔“ ایشیشن ماشر نے آگے بڑھ کر کہا۔

”ہم ضرور جائیں گے۔“ سرل نے ضد کی۔

ایشیشن ماشر نے ذرا محفوظ ہو کر اسے غور سے دیکھا۔ دس پندرہ لوگ جمیکتے

ہوئے ان کے آس پاس جمع ہو گئے۔ یہ ایک بڑا سا خاندان تھا۔ آئشیشن کا عملہ۔ پولیس کا نشیبل۔ چاء کے اشال والا۔ گاؤں کے باشندے۔ مندروں کے سادھو۔ ان کی اس مکمل پر سکون دنیا میں یہ دوانوں کے جنمی کہاں سے آن ٹپکے۔

فوراً بھتی میں خبر پھیل گئی: دو یا تری آئے ہیں اور ان میں سے ایک انگریز ہے۔ (انگریز بھی یا تری ہی ہو گا اور نہ اس کا دماغ خراب ہوا تھا کہ جان جو کھم میں ڈال کر اتنی دور سیتا جی کی مقدس آگ کے درشن کرنے آتا؟) ایک پاکی لارک پلیٹ فارم پر رکھی گئی۔ اس کے پردے ہٹا کر ساری کے گھونگھٹ میں سے ایک لڑکی نے بھی ان دونوں اجنبیوں کو حیرت سے دیکھا۔

سرل پاکی کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔

”یہ ہمارے ہڑے مولوی صاحب کی بیٹا ہے۔ اپنے سرال والپیں جا رہی ہے۔“ کاشیبل لنگوالے نے بتایا۔

کاشیبل آگے بڑھا۔ ”آئینے آپ کو گاؤں تک پہناؤں۔“ اس نے کہا۔ گاؤں کے راستے میں اس نے بھی سیاسی گفتگو شروع کر دی۔ گرانی۔ مسلم لیگ کی سیاست۔ مصنوعی قحط۔ عوامی لیگ۔ اے۔ کے۔ فضل الحق۔ مال کا سرچکرا گیا۔ اس صوبے کا بچہ بچہ کتنے زبردست سیاسی شعور کا مالک تھا۔ گاؤں کے چھوٹے سے بازار میں ایک لڑکا مال کے پیچھے چلنے لگا، وہ کاشیبل سے چٹا گانگ کی علاقائی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔

”پر فلا کہتا ہے کہ آپ کو کنڈ تک لے جائے گا۔“ کاشیبل نے کہا۔

”ہلو پر فلا۔“ سرل نے اس سے مصافحہ کیا۔

”تمہارا پورا نام کیا ہے؟“

مال نے اس سے کلکتے کی بنگالی میں پوچھا۔

”پرفلاؤ مار بسو اس۔“

”اسکول میں پڑھتے ہو؟“

”جی نہیں۔ کھیتی کرتا ہوں۔“

”یہاں آرام سے رہتے ہو؟“

”آرام سے کیوں نہیں رہوں گا؟“ پرفلاؤ نے حیرت سے پوچھا۔

مال خاموش ہو گیا۔

بازار کی کچی شرک پر تازہ تازہ چھپڑ کا وہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی دکانوں پر لوگ جمع تھے۔ سب کی نظریں ان دونوں کی طرف تھیں۔ سفید دیوکی طرح سرل آگے آگے اس تنہے سے بازار میں داخل ہوا۔ مال ایک چاءخانے کے سامنے رک گیا۔ صاف سترے بانس کی ٹیوں سے بننے ہوئے چاءخانے میں بلزنیں تھا اور نہ غندہ پن کا ماحول اس پر طاری تھا۔ چند آدمی چادریں لپیٹنے پھوپھو پر بیٹھے بنگالی اخبار پڑھ رہے تھے۔ کونے میں گراموفون بیج رہا تھا۔ دیواروں پر بنگالی فلموں کے اشتہار لگے تھے۔ یہ بالکل ایک دوسری دنیا تھی۔ ”ہمارے لیے خوب گرم چاء بنانا۔ ہم ابھی پیہاڑی پر سے واپس آتے ہیں۔“ مال نے چاءخانے کے مالک سے کہا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں سے کیلے اور پھل لے کر خاطر کے لیے آن موجود ہوئے۔

”آپ یا تری ہیں۔ بڑی دور سے آئے ہیں۔ آپ کی خدمت ہمارا فرض

ہے۔“ ایک داڑھی والے مسلمان نے کہا۔

مال حیرت سے یہ سب متاثر ہا۔ کیا ان ہی انسانوں نے نواکھالی اور بھار میں ایک دوسرے کو ذبح کیا تھا؟ اس کا سر پھر چکرا گیا۔

پرانلا کی معیت میں انہوں نے پیہاڑی کی اور بڑھنا شروع کیا۔ راستے میں خوبصورت جھونپڑے تھے اور سر بزرنگ۔ جگہ جگہ سرسوتی پوجا کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ گھاس پر اور مکانوں کے سامنے سرسوتی کی بے حد خوبصورت اور سب مورتیاں رکھی تھیں۔ تن کو لمباؤں نے خشک ہونے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ مال ایک مورتی کے قریب زمین پر بیٹھ گیا۔ ”علم کی دیوی۔“ بخچ پر سوار ہو کر ستار بجانے والی برمہما کی بی بی۔ مادر کائنات۔“ اس نے کہا۔ ”ہم انسانوں نے تیرا کیا حشر کیا۔“

سرل بھی گھاس پر دوزانو بیٹھ گیا۔ ”تمہارے گاؤں کے مارکس قدر زبردست ماہر فن ہیں۔“ اس نے مورتی کو بغور دیکھ کر کہا۔

”ہا۔“ مال نے فخر یہ جواب دیا۔

پھر وہ بانسوں کے جھنڈ میں سے نکل کر پیہاڑی کی طرف بڑھنے لگے۔ سامنے سرخ پتھر کا تالاب تھا جس کے چاروں اور سرخ مندر تھے اور سنگ سرخ کی چوڑی سیڑھیوں پر بر گدکی شاخیں جھکی تھیں۔ چاروں اور ہو کا عالم طاری تھا۔

تالاب کا چکر کاٹ کر وہ ایک اور کنج میں داخل ہوئے۔ یہاں اڑکیاں ننھی ننھی جھیلوں کے کنارے بیٹھی تھیں۔ جھونپڑوں اور مکانوں پر تر گی کے زرد چھولوں میں بیلیں پھیلی تھیں۔ درختوں سے معطر پھول گر رہے تھے۔

”یار یہ تو بالکل کسی ترقی پسند بنگالی فلم کا سیٹ معلوم دے رہا ہے۔“ مال نے

کہا۔

”بنگل کے گاؤں سے زیادہ حسین مناظر اور کہاں ہوں گے۔ بنگالی استادوں کے ناول انہی خطوں کے عکاس تھے۔“ سرل نے جواب دیا۔

وہ پیاری کی سیر ہیوں پر پہنچ گئے۔ اب ان کے دونوں طرف بے حد گھنے ٹرو پیکل جنگل تھے اور عمیق غار اور کھڑ۔ جگہ جگہ سینکڑوں برس پرانے مٹھ درختوں میں چھپے کھڑے تھے۔ بھورے رنگ کے لرزہ حیز ڈراہ نے معبد جن کی مقفل کوٹھریوں میں مہنت دن تھے۔ مکمل خاموشی طاری تھی۔ عقیدہ تمندوں کے روپے سے بنائی ہوئی ہزارہا شکستہ سیر ہیاں پیچ در پیچ خطرناک موڑوں سے گزرتی چوٹی تک چلی گئی تھیں جہاں گندھک کے ذخیرے میں ہزاروں برس سے آگ روشن تھی۔

”سیتا مہارائی کو راون نے لکھا سے لا کر بیہاں چھوڑ دیا تھا۔“ پر فلانے ہڑے تینیں اور عقیدت کے ساتھ میسر آف فیکٹ انداز میں اس طرح مطلع کیا گویا یہ کل کا واقعہ ہے۔

چند سادھو نشیب میں مندروں کے ایک جھنڈ کی طرف جاتے دکھائی دیے۔ سرل اور پہنچ کر ایک درخت سے لٹک گیا۔

اندھیرا گہرا ہو گیا۔ شکستہ سیر ہیوں کے نیچے جھرنا گر رہا تھا۔ شام کے گھرے سائلے میں پرندوں کی سیٹیاں، پتوں کی سرسر اہٹ، پامی کی آواز اور شعلوں کی سمناہٹ پچاریوں کے منتزوں کی مدھم صدائوں میں گھل مل کر بلند ہوتی گئی۔ بہت دور، نشیب کے گاؤں میں روشنیاں اندر ہی ٹھٹھماری تھیں۔ پر فلانہ اطمینان

سے اچک کر درخت کی شاخ سے لٹک گیا۔ ”صاحب! ذرا دصیان رکھیے گا یہاں
اڑدھے اور بچھو بہت ہیں۔“

”اچھا۔“ سرل نے کہا، مگر ان دونوں نے بالکل دصیان نہ رکھا اور مزید
سیئر دصیان طے کر کے ایک اور مٹھتک پہنچ گئے۔

اب سورج ڈوب چکا تھا۔ اس کی کرنیں، جواب تک پہاڑی کے جنگل پر
طرح طرح کے رنگ بمکھیرہ تھیں، تاریکی میں گم ہو گئیں۔ اب واپس چلو، ہمیں
دیں بجے کی ٹرین پکڑنا ہے۔ مال نے یاد دلایا۔

انہوں نے پہاڑی سے اترنا شروع کیا۔ آخری سیڑھی تک پہنچتے پہنچتے ان کو
ایک گھنٹہ لگ گیا کیونکہ تاریکی بہت گہری تھی اور ان کے پاس ٹارچ تک نہیں تھی۔

گاؤں کے چاء خانے میں ان کا انتظار ہو رہا تھا، وہ اندر جا کر ایک صاف
ستھرے نیچ پر بیٹھ گئے۔ ان کے سامنے چاء اور رو رو پیسے والے سکت رکھے گئے۔
میز بان لوگ ذرا شرمائے شرمائے، سہے سہے، مہماںوں سے بہت کر ایک طرف
کھڑے ہو گئے۔

”سرل۔“

”ہاں۔“

”دنیا میں اس چاء خانے سے زیادہ خوبصورت جگہ تم نے کوئی اور دیکھی
ہے؟“

”نہیں۔“ سرل نے آہستہ سے جواب دیا۔

پھر وہ باہر نکلے۔ بہت سے لوگ ان کو اشیش تک پہنچانے آئے۔ پنلا پرانے

دوستوں کی طرح چپ چاپ ان کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ گاؤں کے بچوں نے ان سے بخشش کی خواہش ظاہر نہیں کی۔ پرانا نے بھی انعام لینے سے انکار کر دیا۔ ایسا لگا جیسے روپے کی پیش کش کر کے مال نے اس کی دل شکنی کی ہے۔

”میں بھکاریوں کی دنیا کا رہنے والا ہوں۔ اگر کوئی بھیک مسترد کر دے تو مجھے متعجب نہ ہونا چاہتے؟“ مال نے کہا۔
”ہاں۔“ سرل نے جواب دیا۔

راستے میں ایک جھونپڑی کے برآمدے میں چراغ جل رہا تھا۔ مال ٹھہر گیا۔ دیکھوں یہاں کیا ہو رہا ہے۔ انہوں نے اندر رجھانکا۔ ایک بوڑھا بچوں ہندو سفید براق وہوتی اور چادر لپیٹنے مٹی کے دیے کی روشنی میں چند بچوں کو بنگالی قاعده پڑھا رہا تھا۔ بچے زمین پر بیٹھے تھے۔ گرد کے لیے انہوں نے ایک بوسیدہ چھٹائی بچھا رکھی تھی۔ اجنبیوں کو دیکھ کر بوڑھا گھبر اکر باہر نکل آیا اور ہاتھر جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔
”تم یہ منظر کبھی بھول سکو گئے۔“ سرل نے کہا۔

”نهیں۔“ مال نے جواب دیا۔
وہ آشیش پہنچے۔ ترین آئی، وہ چٹا گانگ واپس پہنچ گئے۔ جہاں جگما تے کلب میں پیٹر جیکسن بار روم میں ان کا منتظر تھا۔

”آپ سیتا کنڈ ہو کر آ رہے ہیں۔“ اس کارنگ فق ہو گیا۔ ”غصب خدا کا۔ معلوم ہے وہ پیماڑی، اژادوں، چیتوں اور خطرناک ترین بچھوؤں کا مسکن ہے، وہاں تو دن کے وقت بھی سمجھداری آدمی بندوق لیے بغیر نہیں جاتے۔“
”مگر وہاں جوان تنے انسان بنتے ہیں وہ؟“ مال نے اعتراض کہا۔

”ابھی وہ آئے دن سانپ بچھو کے کالے سے مرتے رہتے ہیں اور پھر ان کا کیا ہے، وہ تو ہیں ہی جنگلی، حشی، بن مانس لوگ۔“

دوسرا دن انہوں نے سلبہت کا رخ کیا، وہاں سے سرلِ مال کو راج شاہی لے جا کر پیاڑ پور کے گپتا عہد کی سُغْنَتِ اشی کے شاہ کار دکھانا چاہتا تھا۔ سارے ملک میں چپے چپے پر جو پرانے مندر، مٹھے، مسجدیں اور درگاہیں بنی تھیں سرل کسی ماہر آرکیا لو جسٹ کی طرح ان کے متعلق مال کو بتاتا رہا۔

”تم کو آرکیا لو جی میں کب سے دخل ہو گیا۔“ ایک روز باریں بال جاتے ہوئے مال نے اداکی کے ساتھ اس سے پوچھا۔

”میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔“ سرل نے اسٹینر کی ریلنگ پر جھک کر سمندر کے ایسے وسیع دریا کی پر شور لہروں کو دیکھتے ہوئے جواب دیا، ”کہ میرے پاس ماضی ہی ایسی چیز ہے جو محفوظ ہے، جسے دوسرا دن کوئی گز نہ نہیں پہنچا سکتے، جو وقت کی دسترس سے باہر ہے، میں خود اب ماضی ہوں تمہاری طرح اور ہندو پاکستان کے یہ پرانے گھنڈر ہی میرے دوست ہیں، میں ان کی زبان سمجھتا ہوں۔ اس دیوانے پر صغير میں صرف وہ ہی میرے ہم نوا ہیں۔ مورخین کے مقضا و نظریوں کو مسترد کر کے یہ اپنی رام کہانی مجھے الگ سے سنار ہے ہیں۔ میں ان کا واحد، تن تھا آڑ نہیں ہوں۔ یہ پتھر میرے دوست رہیں گے۔ مال، خدارا یہ نہ کہنا کہ میں ایک اور مغربی یورپین برطانوی ڈی جزیرت ڈیکیڈنٹ انگلکچول بن گیا ہوں۔ مجھے اب ان لیبلوں کی پرواہ نہیں رہی۔ میں اب سمجھ سنتا ہوں کہ لوگ روم اور بازنطیم میں پناہ کیوں ڈھونڈ رہے ہیں۔ میں نے کائنات سے جو یہ نیا رشتہ قائم کیا ہے اپنی تلخی

جدبات کے ذریعے اسے توڑنے کی کوشش نہ کرنا۔“

سلہٹ میں وہ خوبصورت بل کھاتے پہاڑی راستوں پر سے گزرتے ایک روز سرحد تک گئے۔ سامنے لکڑی کا بڑے شہتیر کا چاٹک تھا جس کے ادھر پا کستانی سپاہی مستعد کھڑا تھا۔ شہتیر کے دوسرا طرف چند آسامی کا ہی سے کھڑے پان چبا رہے تھے۔ چند قدم پر آسام کی سربراہ پہاڑیاں تھیں جن پر خوبصورت مکان بنے تھے۔ مال لکڑی کے شہتیر پر کہنیاں شیکھ دیر تک خاموش کھڑا رہا۔

سلہٹ سے اگلے روز انہوں نے سری منگل کا رخ کیا، یہ بہت لمبا سفر تھا مدیاں اور گھنے جنگل اور مولی بازار کا خوبصورت علاقہ عبور کر کے وہ سرل کے مستقر پر پہنچے۔ ایک نیچے سے ٹیلے پر سرل کا بنگلہ تھا جس کی روشنیاں دور سے نظر آ رہی تھیں۔ اب رات ہو چکی تھی۔

یک لخت مال نے محسوس کیا کہ اس کا جانا پچھانا سرل کسی پر اسرار طریقے سے مل کی پل میں بڑے صاحب میں تبدیل ہو گیا ہے۔ کارروک کروہ سرائھائے سامنے کی اور دیکھتا بر ساتی کی سیر صیاں چڑھا۔ اس کے ملاز میں کی پلٹن استقبال کے لیے لپک کر آ گئے بڑھی۔ برآمدے کے نیچے کھڑے ہوئے چند مزدوروں نے جھک جھک کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ اس نے آواز دی: ”عبد الرحمن، غسل کا پانی لگاؤ۔“ پھر وہ مال کو ساتھ لیے گیٹ روم کی طرف بڑھا۔

”یہ تمہارا کمرہ ہے۔“ اس نے کہا

بنگلہ شیر کی کھالوں اور جیتے اور بارہ سنگھے کے سروں اور بیش قیمت سا گوان کے فرنچیپ سے مزین تھا۔ مال کو محسوس ہوا ۱۹۲۸ء کے ہندوستان میں داخل ہو

گیا ہے اسے گل فشاں شدت سے یاد آئی اور اس کا دوسرا مکان خیابان جودہ رہ دوں میں تھا۔ عبدالرحمن کو دیکھ کر اسے امیر خان کا خیال آیا۔ سرل نے ڈرائیور کو پکارا تو مال نے محسوس کیا۔ شاید میاں قدر یہ لپکے ہوئے آئیں گے۔

جلاوطنی..... جلاوطنی..... خداوند! تو نے مجھے کیوں جلاوطن ہونے دیا۔ مال نے آرام کری پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

ڈرائیور میں بیرے نے کھانا لگانا شروع کیا۔ سارے ملاز میں اپنی اپنی جگہوں پر کام میں سرعت سے مصروف ہو گئے۔

بنگالی مشی جی مزدوروں کا حساب کتاب لے کر برآمدے میں ٹھیل رہے تھے۔ ٹریئی یونین کا ایک فرد بہت دیر سے سرل کے انتظار میں بر ساتی کی سیڑھیوں پر بیٹھا تھا۔ ملاز میں کا دستہ سرل کے غسل خانے سے برآمد ہونے کا منتظر تھا: بیرہ، خانسماں، خدمتگار، بوائے، اس کا یوریشین ٹلرک رالف جوزف برآمدے میں کاغذات لیے کھڑا تھا۔ سرل صاحب کئی دن بعد لوٹے تھے اور بہت سے ضروری کاغذات پران کے دخنخڑ درکار تھے۔ کئی چپر اسی ادھر ادھر موجود تھے۔ ایک تن تھا سرل اور اس کے ذاتی عملے میں ان گنت آدمی شامل تھے: مالی اور گر اس کٹ اور سائیس اور بہشتی، چوکیدار۔ دریا پر اس کی اپنی موڑ لانچ تھی۔ اس سلطنت کا، جو سری منگل میں دور دوستک پھیلی تھی، سرل اپنے بڑے بھائی لاڑ بارن فیلڈ کی شرکت کے ساتھ مالک تھا، وہ چاہتا تو ان سب کو اتنا لکھا کر پٹوا سنتا تھا، وہی سرل جو کچھ عرصہ قبل کیمبرج میں بو دیئر اور ایلیٹ کی کتابیں لیے گھوما کرتا اور کوہ نور میں مائیکل کے ساتھ جا کر آ لو کھاتا تھا۔

صحیح سات بجے چوکیدار نے بیگنے کے ہال کا دروازہ کھولا۔ وہوپ تھاملیوں میں سے چھن چھن کر اندر آئے لگی تو سرل اپنی مسہری سے اٹھا۔ مال اپنے کمرے سے نکل آیا تھا اور ڈرینگ گاؤن پہنے برآمدے میں کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ ”یاد صحیح وطن دے رہی تھی ہوا..... داغ دل پھول بن کر کھلنے لگے۔

میری پکلوں پر بدر مال آگیا۔“ اس نے زیر لب کہا اور لمبا سانس بھر کر ڈر انگ روم میں داخل ہوا جس کی دیواریں مکمل ڈے، اقل بوس، ابافی سین، رضا اور حسین کی پینٹنگز سے مزین تھیں۔ کنوں میں تابنے کے مجسم رکھتے تھے۔ الماریوں میں کتابیں چھپتی تھیں۔ بریکفارست کے بعد وہ سرل کے ساتھ باہر نکلا۔ سرل نے سوالا ہیئت پہنچی، وہ دونوں کار میں سوار ہوئے۔ پیٹر جیکسن اور رالف جوزف کی قیادت میں مشیوں اور کارکنوں کا جلوس جیپ گائیوں میں پیچھے پیچھے چلا۔ سرل نے مال کو اپنی فیکٹری دکھائی جہاں چاء کی پیتاں تیار کی جا رہی تھیں۔

دوپھر کو لنج کے لیے وہ کلب گئے اور چند ساتھی پلائزرز سے تاراں گنج کی شیئر مارکیٹ کے اس روز کے نرخ پر سرل نے تبادلہ خیالات کیا۔ اسٹیشنیس میں اور امرت بازار پتھریا اور ڈھاکے کے مارنگ نیوز پر نظر ڈالی۔ ابھی کھانے سے قبل بیز کا دور چل رہا تھا کہ دفعتاً مال غائب ہو گیا۔

”مسٹر رضا کہاں گئے؟“ برآمدے میں آ کر سرل نے پیٹر سے پوچھا۔

”پتا نہیں۔ ابھی میں نے ان کو نور الاسلام چودھری کے ہمراہ باغوں کی طرف جاتے دیکھا ہے۔“

”نور الاسلام چودھری؟“ سرل خاموش ہو گیا۔

چودھری مزدوروں کا نمائندہ تھا اور رات سرل سے ملنے آیا تھا مگر سرل نے اس سے ملنے سے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ صحیح دفتر میں آئے۔

سرل کا رہیں بیٹھ کر مال کو ڈھونڈھنے کے لیے آکا۔ اپنی اسٹائیٹ میں بیٹھ کر وہ خاموش سایہ دار سڑکوں پر چکر لگاتا پھر اگر مال کا کہیں بتا نہیں تھا۔ آخر اکتھا کر اس نے ایک جگہ کاروک لی اور بے دھیانی سے جھاڑیوں کی طرف چلا شروع کیا۔ موسم بے حد سہانا تھا۔ پرندے درختوں میں چچھا رہے تھے۔ شاخوں میں سے چھختی ہوئی دھوپ نے چاء کی جھاڑیوں پر طرح طرح کے پیڑن بنا دینے تھے۔ چوڑیوں کی جھنکار پر اس نے معاشر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ ایک پورہ لڑکی بڑے ماہراںہ انداز میں پتیاں توڑ رہی تھی۔ بڑے صاحب کو دیکھ کر اس نے جلدی سے گونگھٹ کاڑھ لیا۔ سرل مسکرایا۔ اس نے خیالات کے دھارے میں بہتے بہتے ایک لختے کے لیے ساحل پر آ کر سوال کیا:

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”ہمارا نام؟ چمپا۔“

”چمپا۔“ اس نے طرح دہرایا گویا یہ نام آج پہلی مرتبہ سنا ہے۔ ”چمپا..... اچھا نام ہے۔“ یہ کہہ کروہ لمبے ڈھیلے ڈھالے قدم رکھتا پھر کار کی طرف لوٹ آیا۔

لڑکی ذرا تعجب سے اسے درختوں کی دھوپ چھاؤں میں او جھل ہوتا دیکھتی رہی۔ وہ اور اس کی چھپلی نسلیں ہر طرح کے انگریزوں کو دیکھتی آئی تھیں۔ سنکی، بد دماغ، بیہودہ، بے حد دار و پینے والے۔

یہ الابڑا صاحب سنگی تھا۔

کلب واپس آ کر وہ دھرام سے ایک آ رام کری پر گر گیا۔ سامنے دیوار پر ملکہ انز بھکی تصویر آ ویزا تھی۔ ایک تصویر میں شیر کے شکار کا سین تھا۔ ایک میم سفید نوپ پہنے احمقوں کی طرح بندوق سنجالے ہو دے پڑھی تھی۔ برابر میں مہاراجہ کوچ بہار رونق افروز تھے۔ میم کی شکل میں اسے اپنی دادی لیڈی بارن فیلڈ کی جھلک نظر آئی جو پچاس برس قبل اکثر ہندوستان آ کر مہاراجاؤں کے ساتھ ناگر شوٹ سے شغل کیا کرتی تھیں۔ گذ مارنگ! اگر نہیں۔ آج کی صحیح تم کیسی ہو؟ اس نے دل میں کہا اور پھر سوچنے میں مصروف ہو گیا کہ مال اس وقت کہاں ہوگا۔

شام کو سرل سے مال کے اعزاز میں ایک مخصوص سے ڈنر کا انتظام کیا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔

”آپ کہاں تشریف لے گئے تھے؟“

”کہیں نہیں۔ ادھرا دھرم گھوم رہا تھا۔“

”مزدوروں کی بستی گئے تھے؟“

”ہاں۔“

”میرا یہی خیال تھا۔“

”تم نا راض ہو؟“

”نہیں تو۔ تم بھی اس نظام میں اتنی ہی حد تک شامل ہو جتنا میں۔ نا راضگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”یہاں مزدوروں کو صرف ایک روپیہ چار آنے مزدوری ملتی ہے؟“

”ہاں“

”کوئی ٹریڈ یونین نہیں ہے؟“

”نہیں“

”کوئی کیونسٹ عناصر؟“

”پتا نہیں“

”بکواس مت کرو، تم کو سب پتا ہے۔“

”مال کائنات کی ذمے داری کا بوجھ میں نے بھی دنوں اٹھائے رکھا۔ آخر اسے اتار پھینکا تم بھی اس بوجھ سے سبکدوش ہو چکے ہو۔ پھر اس بہت ڈھرم کا کیا فائدہ۔ اس طرح کیا تم اپنے ضمیر کو تسلیں دینا چاہتے ہو کہ تم مجرم نہیں ہو؟ تم بہت بڑے مجرم ہو مالِ رضا، مجھ سے کہیں بڑے مجرم۔“

مال خاموش رہا۔ سرل نے اٹھ کر اس کے لیے وہ سکلی اور گلاں نکالا۔

”پھر میں تمہارے جیسے ایک نہایت چغدان انسان سے ملا، وہ بھی تمہارے ساتھی پلاصر ہیں شری نہار نجف داس گپتا۔“ مال نے کہا۔

”داس گپتا۔ اس سے تم کہاں ملے۔ واپس کلب گئے تھے؟“

”نہیں میں پیدل ایک پگڈنڈی پر سے آ رہا تھا۔ میرا سوت بوٹ دیکھ کر انہوں نے افت دینے کے لئے کارروک لی، وہ ہی مجھے تمہارے مکان تک چھوڑ گئے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ تمہاری رح کے رئیس ابن رئیس ہیں۔“

سرل نے وہ سکلی دو گلاسوں میں اٹھایا۔ مال کہتا رہا، ”میں نے ان سے پوچھا آپ ترک وطن کا ارادہ نہیں رکھتے۔ قہقهہ لگا کر ہنسے فرمایا، آپ بھی حد کرتے

ہیں۔ انڈیا گورنمنٹ ہر چیز کو قومی ملکیت بنانے پر تلی ہوتی ہے۔ سرمایہ داروں پر
دھڑا دھڑ بھاری بھاری انکم نیکس لگائے جا رہے ہیں وہ الگ۔ میرا دماغ خراب ہوا
ہے جو ترک وطن کروں گا؟ یہ صاف گولی قابل تعریف تھی۔“

سرل خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا: ”میں تم کو پھر یہی رائے دوں گا،
دنیا بھر کی ہر چیز میں تاک ڈبو نے کی جو تمہاری عادت ہے اسے خدارا اب چھوڑ
دو۔ ورنہ آفت میں پھنسو گے۔“

مال وہ سکی کے بلبلوں کو دیکھتا رہا۔

دوسرا روز صبح وہ راج شاہی روانہ ہو گئے۔ کئی دن تک اس خوبصورت ضلعے
کی وسعتوں میں خاک چھانتے پھرے۔ دورافتادہ سنتھال گاؤں میں پہنچے جہاں
راستے اتنے خراب تھے کہ کئی باران کی جیپ التھے التھے پھی۔ سنتھالوں نے مال کو
اور زیادہ مغموم کر دیا۔

”ان بیچاروں کے لیے تو میں ذہن میں بڑا رومینیک تصور لیے بیٹھا تھا۔ لوگ
ناچ اور زین العابدین کی مشہور و معروف آلبی رنگوں کی تصویر اور جانے کیا کیا۔“

”اور اصلیت میں بوجہ اپنے انلاس یہ درختوں کی جڑیں کھاتے ہیں اور جنگلی
جانوروں کی طرح زندہ ہیں۔ ہے نا؟“ سرل نے جیپ چلاتے چلاتے مرکر کہا۔
”میرا بھی شروع میں قدم قدم پر یونہی دل ٹوٹا تھا۔“

”جو نی یہاں نہیں آیا اپنی موسوی بنانے کے لیے۔“ مال نے کہا۔

”یہاں بھی آجائے گا۔“ سرل نے اطمینان سے جواب دیا۔

سنتھالوں سے بھی ان دونوں کا بڑا دوستانہ ہو گیا۔ جس روز وہ لوگ واپس

لوٹ رہے تھے ایک گاؤں میں سارے سختاں ان کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ ایک سیاہ فام بے حد دلکش لڑکی نے آگے بڑھ کر گیندے کے ہار ان کے گلے میں ڈالے اور ہاتھ جوڑ کر ان کے آگے جھکی۔ ان کا لکھیا، جس کی ٹانگ کئی ہوئی تھی، جس سے اس نے لاخی باندھ رکھی تھی، ان کے اعزاز میں اپنی اکلوتی تار تار قبض پہن کر ان کو رخصت کرنے بستی کے موڑ تک آیا۔ ایک نوجوان نے تالاب میں سے سرخ کنوں نکال کر سرل کو پیش کیا۔

رات کو وہ راج شاہی کے سرکٹ ہاؤس واپس پہنچ تو ڈرائیور میں چند امریکنوں کی آوازیں آئیں۔

جونی سختاں کے متعلق ایسٹ مین کلر میں ڈاکو منفری بنانے کے لیے پہنچ چکا تھا۔

سرکٹ ہاؤس کے پہلو میں گنگا بہتی تھی۔ دوسرے کنارے پر مرشد آباد تھا۔ مرشد آباد؟ سراج الدولہ؟ کریل کلاسیو؟ کیا بے کار کی بائیں ہیں، وہ سنو۔ زن سے گولی چلی۔ کوئی اور اسمگر مارا گیا، وہ دونوں گھپ اندھیری رات میں گنگا کے کنارے کنارے خاموش شرک پر ٹھلا کرتے اور آگے بڑھ کر ضلع کے اعلیٰ حکام کی کوٹھیاں تھیں اس کے بعد بازار چھوٹے چھوٹے چورا ہے۔ گلیاں۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے اداں مکانات۔

”مکان کیسی کیسی کہانیاں سناتے ہیں۔“ سرل نے پھر دہرا یا۔

سایہ دار کنجوں میں بڑے بڑے ہندو زمینداروں کی حویلیاں اور کوٹھیاں چھپی ہوئی تھیں جن میں سے پیشتر سنستان پڑی تھیں۔

”شایہ زمینداری ختم کر دی گئی ہے۔“ مال نے کہا۔

سرل نے اسے پھر دیکھا۔ ”اب تم نے پھر ناک ڈھونا شروع کی۔“ اس نے ڈانٹا۔

وہ آشیش و اپس جا رہے تھے۔

ڈھاکے واپسی میں پھر ٹین دریا کے کھاث پر رکی۔ مسافر اتر کراشیمیر پر سوار ہوئے۔ ٹین کا تجارتی مال اتنا کراشیمیر پر چڑھایا گیا۔ یہاں کریں نہیں تھے۔ سینکڑوں قلیوں نے آواں میں لگا لگا کر سامان ڈھونا شروع کیا۔ اس طرح کی صداؤں کو مال نے IPTA والوں کے ساتھ خود کو رس میں گایا تھا اور ترقی پسند فلموں میں اس طرح کے گیت سننے تھے مگر اب اسے معلوم ہو چکا تھا کہ سارا مشرقی بنگال ایک نہایت شدید حقیقت پرست، ترقی پسند فلم کے مناظر کا بہت بڑا Sequence ہے۔

جہاز پر داری ہیوں والے چند بیوڑھے اور بر قعہ پوش عورتیں آ کر تھر ڈکلاس کے فرش پر بیٹھ گئیں، یہ بھی بڑا ترقی پسند فلموں والا منظر تھا۔ بے شمار بیوڑھے ہندو اور مسلمان، شالیں اوڑھے، ان کی لڑکیاں اور بہوئیں گود میں بچے اٹھائے گینگ وے پر سے گزرتی سینکڑ کلاس میں خنس رہی تھیں۔

اب فرست کلاس میں لوگ آ آ کر بیٹھنا شروع ہوئے۔ کیبین میں گئے، ڈیک پر بکھر گئے، دور میں اور کیمرے نکالے گئے، اخبار کھولے گئے۔ دوسارہ بیگماں نے ملنگ شروع کر دی۔ چند امریکن، جو کسی دور افراطہ ضلعے میں یو۔ ایس۔ آئی۔ ایس کی شاخ کھولنے جا رہے تھے، ایک نوجوان طالب علم سے

مصروف گفتگو ہو گئے، جو تعطیلات کے بعد ڈھاکے واپس جا رہا تھا۔ ایک طرف دو بنگالی مولانا عوامی لیگ کی سیاست پر تبادلہ خیالات کر رہے تھے۔ ڈھاکے کا ایک اردو اخبار نویس۔ یو۔ ایس۔ آئی۔ ایس والوں کی دعوت پر بحثیت ان کے مہمان ان کا ہم سفر تھا۔ ایک اعلیٰ افسر کی بنی میں بیٹھے تھے۔

مال جہاز کے اس منظر کو دیکھتا رہا۔

یہ کیسا جھمیلا تھا؟ یہ کیسی دنیا تھی جو وجود میں آگئی تھی؟ یہ گتھی کس نجح پر سمجھے گی؟ اور اس سارے گھپلے میں کتنی لاکھوں جانیں تلف ہوئیں، کتنے گھر لٹے، کتنے لاکھوں انسان خانماں برباد اور جلاوطن ہوئے اور کتنے کروڑوں انسان جو پہنچے بھجو کے مرتے تھے اب بھجی بھجو کے مرتے ہیں۔

مال رینگ پر جھک کر افق کو دیکھتا رہا جہاں تک صرف پانی ہی پانی تھا عظیم دریا، عظیم ملک، عظیم انسان۔ کیا یہ سارے انسان عظیم نہیں جو سلاخوں کے اوہ مرغیوں کی طرح ٹھنڈے بیٹھے تھے؟

اردو اخبار نویس ٹھیلتے ہوئے مال کے پاس آئے اور اپنا تعارف کرایا۔

”آپ بھی مغربی پاکستان سے تشریف لائے ہیں؟“ انہوں نے پان کی ڈبیا نکلتے ہوئے دریافت کیا۔

”جی،“ مال نے مختصر جواب دیا۔

”کراچی؟“

”جی،“

انہوں نے دوبارہ مال سے ہاتھ ملایا۔ ”صاحب ہم تو یہاں یوں سمجھتے کہ

کا لے پانی میں پڑے ہیں۔ اپنے ہم جنسوں کے لیے بسا اوقات آنکھیں ترس جاتی ہیں (یہ مغربی یو۔ پی کے رہنے والے تھے) پچ عرض کرتا ہوں قبلہ، اس خطے کو تو علیحدہ کر دینا ہی مناسب ہے۔ بالکل نہیں میں دم کر رکھا ہے ہمارا ان لوگوں نے۔“

ایک نوجوان سرل سے با تم کرتا قریب سے گزرا۔ اخبارنویس ایک ذرا کی ذرار کے۔ جب وہ آگے چلا گیا تو بولے: دیکھا آپ نے انگریزی کیا لا جواب بولتے ہیں۔ بات کرنے کی تیزی نہیں۔ میں آگئے جوٹ کوٹا میں۔

”جوٹ کوٹا۔“ مال نے حیرت سے دہرایا۔ اس نے یہ اصطلاح آج ہی سنی تھی۔

”جی ہاں صاحب۔ آپ کا قیام ڈھا کے میں ہے؟ شاہ باغ؟ اچھا کہیں اور ٹھہرے ہیں۔“

اب اعلیٰ افسر بھی کہیں سے باہر نکل آئے۔ انہوں نے مال کو سگریٹ پیش کیا۔ دریا کا پانی سورج کی کرنوں میں سونے کے رنگ کا ہو گیا تھا۔ برابر سے ایک جوٹ کی بار برداری کرنے والی سیاہ رنگ کی مہریب کا رگ بوٹ بڑی تملکت سے تیرتی ہوئی نکل گئی مال مسحور ہو کر اسے دیکھتا رہا۔

”کس قدر حسین منظر ہے۔“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔

”جی ہاں،“ اعلیٰ افسر نے کہا۔ ”ان مناظر کی پہلوئی کرنے کے علاوہ آپ کی مرکزی حکومت کو اور کوئی کام بھائی نہیں دیتا۔ مگر بس دور ہی سے یہ نظارے سہانے معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں رہنا پڑے آپ کو تو اصل حقیقت کھلے۔ ہم کو

ویکھیے تین سال سے اس وحشی علاقے میں گویا قید تہائی کی سزا بھگت رہے ہیں۔“
”قید تہائی؟“

”جی ہاں اور کیا۔ بالکل بیک ورڈ ملک ہے یہ ذرا یہاں کے باشندوں سے آپ کو سابقہ پڑے تو آئے دال کا بھاؤ معلوم ہو گا۔ ایک سے ایک کاہل، سازشی، متغصب اور بے ایمان۔ ان پر حکومت کرنا اور ان کو قابو میں رکھنا بڑا دل گردے کا کام ہے۔“

مال کو یاد آیا: اٹھارہویں انیسویں صدی کے انگریزی سفر ناموں میں اہل بنگالہ اور عموماً سارے نیوز کے لیے یہی الفاظ پڑھے تھے۔ اسے لگا گویا وہ اٹھارہویں صدی کے کسی انگریز بلکن انگریز کی معیت میں سفر کر رہا ہے۔

”یقین فرمائیے،“ اعلیٰ افسر نے بات جاری رکھی، ”جس روز یہ خطہ پاکستان سے علیحدہ ہو گا میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کروں گا اور خوشی کے مارے سات روز تک ڈرک رہوں گا۔ ان کی ہر شے ہم سے مختلف ہے۔ غیر اسلامی زبان بولتے ہیں۔ وزیر اعظم کو پر دھان منتری اور امن کوشانی کہتے ہیں۔ سنگرہت سے اپنا ناطہ جوڑ رکھا ہے۔“

بیرے نے چاہا کر میز پر رکھی۔ ”جہاں جگن نا تھوڑا گھاث کو بے پنچے۔“

مال نے اس سے پوچھا: ”امر اونی کھن دھورے جہا جے روئے چھی۔“
خبر انویں اور اعلیٰ افسر دونوں نے اسے چونک کر دیکھا۔

”معاف سمجھیے گا، آپ کے لب والجھ سے میں سمجھا تھا کہ آپ بھی لکھنوں کی طرف ہیں۔“ خبر انویں نے کہا۔

”کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ مال نے مسکرا کر جواب دیا۔

”جناب کا اسم شریف تو اب تک پوچھا ہی نہیں۔“

”سیدِ مالِ رضا۔“

”آپ نیا برج کے نواب علی رضا بہادر کے خاندان سے تو تعلق نہیں رکھتے؟“

”جی ہاں۔ انہی کے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔“

”اوہ..... ہو..... ہو..... بڑی خوشی قسمتی ہے میری کہ جناب سے ملاقات ہو گئی۔“ اخبارنویس نے تیری بار مال سے مصافحہ کیا۔ ”کیا لوگ تھے۔ صاحب کیا خاندان تھا۔ لکھنؤ کی کلچر کی آخری یادگار تھے یہ حضرات کلکتے میں۔ وہ زمانے ہی خواب خیال ہو گئے۔ سنائے نواب عباس رضا بہادر کا بھی انتقال ہو گیا۔“

”جی ہاں۔“

اعلیٰ افسر کی بیگم اور سالی گوگنڈا گئے آرام کر رہیوں پر دھوپ کے رخ بیٹھی تھی سالی فلم فینر کے مطالعے میں مشغول تھی۔ سرل مقابل کی رینگ پر جھکا کھڑا تھا۔ اس کے سنبھرے بال سورج کی کرنوں میں سونے کی طرح جگہگار ہے تھے اور وہ غیر معمولی طور پر حسین نظر آ رہا تھا۔

زینے کے دوسری جانب سینئنڈ کلاس کا عروضہ تھا۔ ایک سیاہ فام انگلکواں دین اڑکی جالی سے بیک گئے تھیں ٹرو اسٹوری میگزین کے مطالعے میں معروف تھی۔ اس کے قریب فرش پر اس کا بڑا سا دارجلنگ کا بننا ہوا بیگ رکھا تھا جس میں اس کی

ٹنڈ، میک اپ کا سامان اور ایک نافی کا ڈبہ رکھا تھا۔ اسی بیگ میں چند ہالی ووڈ کے فلمی رسائلے اور بر طانیہ کا زمانہ رسالہ و مسن اور ایک رومنی ناول محسنا ہوا تھا۔ ناول کی چمکدار کاغذی سرورق پر ایک شہرے بالوں والا ہیر و نائیلوں کے نام گاؤں میں مابوس، ہیر و نکو گلاب کا پھول پیش کر رہا تھا۔ لڑکی نے کچھ دیر بعد شہرا رومنی ناول نکالا۔ سرورق کے ہیر و کے دیکھتے دیکھتے ان کی نظر ہینڈ اسم انگریز تک پہنچی جو جالی کے ادھر رینگ کے سہارے کھڑا بالکل مارلن برانڈ و معلوم دے رہا تھا۔ لڑکی نے ایک لمبا سنس لیا اور پھر ناول پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔

اس سالنی سلوٹی لڑکی کا پورا نام مس مارگریٹ ازاں کر شینا میفر ڈیل تھا۔ یوں اس کے بوائے فرینڈ اور دفتر کے ساتھی اسے میگی کہتے تھے۔ گواں کے اتنے لمبے چوڑے نام کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ خاندانی روایت کے مطابق اس کی پرداوی مارگریٹ ازاں، سرسرل ایشلے کی اور ایک نیٹو عورت کی اولاد تھی۔ سرسرل ایشلے پہچلی صدی کے بنگال کے بہت نامور آدمی تھے قحط کے زمانے میں اس کی ماں ڈھاکے سے ملکتہ آ کر فواب ایشلے کے حرم میں داخل ہوئی۔ مارگریٹ ازاں نے بڑے ہو کر کانپور چھاؤنی کے سار جنٹ جارج میفر ڈیل سے شادی کر لی تھی جو اصل نسل گورا تھا اور وجہ کثرت شراب نوشی جوانی ہی میں خدا کو پیارا ہوا۔ چنانچہ مارگریٹ ازاں اپنے بچوں کو لے کر پھر ملکتہ والپس آگئی اور اس کا خاندان ملکتے کے نچلے طبقے کی انگلیو اندیں سوسائٹی میں رل مل گیا۔

میگی میفر ڈیل کے ماں باپ دونوں مر چکے تھے، وہ گریٹ ایشلن ہوئی میں نیلی فون آپریٹر تھی اور چھٹی لے کر اپنی بیمار حالہ کو دیکھنے آئی ہوئی تھی جو کسی میں

رہتی تھی اب وہ بکسی سے کلکتے واپس جا رہی تھی۔

وہ ناول کے کامیکس تک پہنچی ہی تھی کہ جس میں ہیر و اپین جا کر ہیر و ن کو ایک بد معاش کاؤنٹ کے چنگل سے چھڑانے والا ہے کہ اسیمیر کی سیٹی نے اسے چونکا دیا۔ اس نے سراخنا کر دیکھا۔ گھاٹ قریب آ رہا تھا۔ مسافر اپنا اپنا سامان سمیٹ رہے تھے۔ فرست کلاس کے عرش پر کھڑا ہوا ہیر و بھی ہجوم میں غائب ہو چکا تھا۔ اس کا دل ڈوب سا گیا، اس نے جھک کر اپنی سینٹل کے تسلی باندھے۔ اپنے نگین پھولدار سکرت کی سلوٹیں ٹھیک کیں آئینے میں اپنے بالوں کے کرل سنوارے اور بیگ اور رسالے سنبھال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

سرل اور مال جہاز سے اتر کر کنارے پہنچے۔ مسافروں اور قلیوں کا جم غفیر ٹرین کی طرف بڑھا جو گھاٹ سے کافی فاصلے پر کھڑی تھی۔ گھاٹ پر ہندو عورتیں اشنان میں مشغول تھیں۔ چاروں طرف اہل ہنود کی رویں پیل تھیں۔ متوسط طبقے کے خوشحال ہندو مرد اور عورتیں۔ غریب طبقے کے بد حال ہندو مرد اور عورتیں۔ مال اپنی کیس اٹھائے سرل کے ساتھ ساتھ پڑی پر چلتا رہا۔ ”ان اضاءع میں ہندوؤں کی آبادی زیادہ ہے۔“ سرل نے کہا۔

”یہاں کس قدر سکون ہے۔“ مال نے دوبارہ کہا۔ ”در اصل میری سائیکولو جی اتنی خراب ہو گئی ہے۔ میرے ذہن اور اعصاب پر ہندو مسلم پر الہم اس تکلیف دہشت سے مسلط ہے۔ جب میں ان دونوں فرقوں کو کہیں پر سکون انداز اکٹھے زندگی گزارتے دیکھتا ہوں تو یقین نہیں آتا۔ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہاں فساد کیوں نہیں ہو رہا۔“

چڑھائی پر کالی انگلوانڈین لڑکی سر جھکائے اس کے آگے آگے جا رہی تھی۔
ٹرین کے نزدیک پہنچ کر اس نے اپنا اپنی کیس زمین پر رکھا اور رومال سے چہرہ
پوچھنے لگی۔ قریب سے گزرتے ہوئے سرل نے اپنی سی نگاہ اس پر ڈالی اور اپنے
کپارٹمنٹ کی طرف بڑھ گیا۔

ڈھاکے پہنچ کر مال اور سرل اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ روز شام
کو وہ کلب میں ملتے اور اکٹھے اپنی جائے قیام واپس لوٹتے۔ کام ختم کرنے کے
بعد سرل ڈھاکے کی ٹھیکانے اور کونے کھدرے سونگھتا پھرتا۔ ٹنگ و تاریک گلیوں میں
سے گزرتی ہوئی جھلملیوں والی بندگوڑا گاڑیوں کو دیکھ کر فوراً بیگور اور سیتا دیوی کے
ناولوں کا حوالہ دیتا۔ بیچ درجیق قدیم محلوں میں سے نکلتے ہوئے ارمی نولہ کے چار سو
سال پرانے قبرستان میں جا کر اس نے سارا دن ارمی تاجروں کی قبروں کے کتبے
پڑھنے میں گزارا۔

اسٹیٹ بنسک کی عمارت کے جغا دری پل پائے دکھا کر اس سے مال کوتایا کہ
یہ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کا اولین گورنمنٹ ہاؤس تھا۔

ایک روزہ ویز گھاث گئے جہاں دریا کے کنارے ایک شکستہ، ہنڈرالیسی دو مزہ
کوٹھی میں بلبل اکیدہ بھی قائم کی گئی تھی۔ ہال کے دروازے کے اوپر بلبل کی تصویر
آؤ ریزا تھی جس پر پھولوں کا ہار پڑا تھا، ہال میں اندر ہیرا تھا۔ اندر اور اوپر کی منزل
میں بڑے بڑے ڈھنڈار لق و دق شکستہ کمرے پڑے بھائیں بھائیں کر رہے
تھے۔ زینے کی لکڑی پر برما کا انتہائی خوبصورت نقش وزگار کا کام بناتھا، وہ سارے
کمروں میں گھوٹتے پھرے۔ نیچے ایک کمرے سے گھنٹھروں کی آواز آئی، وہ

دونوں اندر گئے جہاں ایک اور خستہ حال کمرے میں، جس کی دیواروں سے پلاسٹر گر رہا تھا اور جس کا اینٹوں کا فرش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا، ایک چھوٹی سی دری بچھی تھی اور چند موسیقار ناج کی گت بجارتے تھے۔ چار پانچ لڑکیاں بنگالی مسلمان والکن بجارتہا۔ دبے پلے شری سو شل مار میٹر ॥ اچک اچک کر لڑکیوں کو ناج سکھانے میں مصروف تھے۔ مال دروازے کی چوکھت میں محور کھڑا یہ منظر دیکھا کیا۔ اس شکستہ کمرے میں، اس ویران جگہ پر، یہ چند لوگ، جوان بوڑھے، باہر کی دنیا کے سارے دکھا اور کمینے پن اور ظلم و ستم اور مجبوریوں اور پریشانیوں کو فراموش کر کے تھوڑے سے لمحات کے لیے تال اور سر میں کھوئے ہوئے تھے۔ ان میں کسی نے نوادردوں پر توجہ نہیں دی اور ناچنے اور ساز بجانے میں مصروف رہے۔ مال دبے پاؤں وہاں سے لوٹا اور سطھی ہال عبور کر کے پچھلے پورٹکوکی طرف گیا۔ دو لڑکیاں ماتھے پر کم کم کے بڑے بڑے ٹیکے لگائے دریا کے رخ، شکستہ سیڑھیوں پر خاموش کھڑی تھیں۔ سامنے ایک گائے گھاس چرہ تھی۔ احاطے کی دیوار کے نیچے کشتیاں بندھی تھیں۔ اور پر کی منزہ میں برآمدے کے جنگلے پر دھوتیاں دھوپ میں سکھانے کے لیے پھیلی تھیں اور پیتل کی گذویاں چمپ جمارہی تھیں۔ یہاں کتنی بے پناہ، اتھاہ ادا کی تھی۔ ان سب لوگوں کے چہروں پر کیساالم بر سر رہا تھا یا ممکن ہے وہ سب بے حد بثاش ہوں۔ مال ہی کو ہر شے میں غم نظر آتا تھا، وہ سرل کو آواز دیتا ہوا باہر نکل آیا، وہ نواب پور روڈ کی رکشاوں، چھکڑا ایسی بسوں، فقیروں کی ٹولیوں اور یونیورسٹی کے طلباء کے ایک احتجاجی جلوس میں گزرتے رہنا کی طرف واپس لوئے۔

رلیس کی سٹرک پر ڈھا کر کلب جگہ کارہاتھا۔ آج وہاں گیست ناٹ تھی۔
اعلیٰ طبقے کی موڑیں باہر کھڑی تھیں اور بال روم میں بیگماں رقصان تھیں جو کلکتے
سے ساریاں خرید کر لاتی تھیں اور زان میں سے اکثر کے پچے دارجلنگ اور شیا انگ
کے انگریزی اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ لاڈنچ میں بڑے بڑے تاجر
اور مل اوز بیٹھے تھے۔

ذرا آگے بڑھ کر نیا شاہ باغ ہوٹل تھا جس میں امریکنوں کی فراوانی تھی۔
دوسرا رودہ سرل کے ہمراہ لاٹچ کے ذریعے بوڑھی انگا پر سر کاری کام سے
ایک اور ضلعے کی سمت جا رہا تھا۔ سرل کری پر بیٹھا اخبار پر ڈھنڈتا رہا پھر معاں نے
مزکر مال کو مجاہد کیا:

”وہ سامنے درختوں کے جھنڈ دیکھتے ہو؟“
”ہاں۔“

”یہ بکرم پور ہے۔ یہاں سرو جنی نائید و اور بی کی رائے وغیرہ کے بے حد
خوبصورت گارڈن ہاؤس ہیں اور بے حد خوبصورت مناظر ہیں۔ یہ گاؤں اب
سنسان پڑے ہیں۔ ان کے باسی مغربی بنگال بھرت کر گئے۔ چلتے ہو دیکھنے؟“
”میں قبرستانوں کی زیارت کرتے کرتے عاجز آ گیا ہوں۔ کیا تم مجھے جینے
نہیں دو گے۔“

”نہیں۔“ سرل نے جواب دیا۔

”مہاراجہ و کرم سین کی ماں نہ، جولاش کو کندھے پر اٹھائے مر گھٹ سے آتا تھا
اور لاش کا اغفریت راستے میں وقت کاٹنے کے لیے روزان کو ایک قصہ سناتا تھا، تم

مجھے قصے نہاتے ہو میں نہیں سنوں گا تمہارے قصے۔ ”مال نے ضد سے کہا۔

”وہ دو منزلہ گارڈن ہاؤس نظر آیا تھیں؟“ سرل نے اسی طرح ساحل کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس میں رابندا تھے یگور رہا کرتے تھے۔“

”چلو میں تم کو آج کا منظر دکھاؤں۔“ لانچ پانی پر چکر کاٹ کرنا رائے گنج کی سمت مزگئی اور مال نے رینگ پر جھک کر سرل کو مجاہد کیا:

”ہم آدم جی جوٹ مل جا رہے ہیں۔“ اس نے فاتحانہ انداز میں سرل سے کہا۔

”اور وہاں پہنچ کر تم مینجر کے ساتھ لنج کھانے کے بجائے مزدوروں کی اجرت کے متعلق اعداد و شمار جمع کرنا شروع کر دینا، مفسد کپیں کے!!“ سرل نے جواب دیا۔

مال مسکرا تا رہا۔ وہ ملوپہنچ گئے عظیم اشان کارخانے جن میں بھاری عورتیں اور بنگالی مزدور کام کر رہے تھے بھاری مشینیں شور چاڑھی تھیں۔ مال بہوت بنا مشینوں کو دیکھا کیا۔

پھر وہ لانچ میں سوار ہو کر واپس مڑے۔

ساحلوں پر بیل گاڑیاں پٹ سن کے گٹھے لادے آ رہی تھیں کسان ٹکنوں والی ٹوپیاں اوڑھے گھٹنوں گھٹنوں پانی میں کھڑے کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ دریا کی سطح پر چاروں طرف چھوٹے بڑے اسمیر اور لانچ روائی تھے جن کے انگریزی نام تھے: بیبری، اینڈرسن، اینی لاری، لیدی فلورا، روز ماونٹ۔ انگریزوں کے عہد کی یادگاریں۔ دریائی جہاز رانی آج بھی ایک بر طانوی کمپنی کے ہاتھ میں تھیں۔

لائق دریا کے چوڑے دھارے پر چلتی رہی۔ آسمان کے اوپرے بادلوں میں سے سورج سرخ تک کی طرح چمک رہا تھا لہریں سورج کی کرنوں میں سونے کی ایسی جھلما نے لگیں۔ ہزاروں کشتیاں سطح پر حد نظر تک تیر رہی تھیں ایک بوڑھی عورت تیزی سے اپنا نوکا کھیتی ہوئی لائق کے قریب سے نکل گئی۔ دریا پر ایک عظیم الشان، طاقت و روزیا آباد تھی۔

مغرب کا وقت ہوا۔ کشتیوں میں چراغ جلے۔ پانی پر دیوالی منائی گئی۔ نجھیوں نے اپنی اپنی کشتیوں میں نماز پڑھنا شروع کر دی۔ ہوا اٹھی اور روشنی کی مختلف سمت میں جاتے ہوئے کشتیوں کے باوبان سفید بگلوں کے پروں کی طرح پھیپھانا نے لگے۔

یہ سارا منظر ایک عظیم سمفینی تھا۔ بڑا گنجیر راگ تھا۔ سارا بنگال راگ میں ڈوبتا تھا۔ دکھ کاراگ، ہوت کاراگ، زندگی کاراگ۔

رات کو رمنا کی سڑکوں پر مدھم روشنیاں ٹمٹھا رہی تھیں۔ دو راک مندر سے ایک ویشنو بھجن کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ سرل اور مال برآمدے میں بیٹھے تھے۔ ساون کی گھٹائیں امنڈ کرائھی تھیں۔

سرل نے دوبارہ کتاب کھولی: ”تالاب کے چاروں اور چمپا کے پھول کھلے ہیں۔ آسمان پر کالے بادل گرتے ہیں۔ میرے جی میں جذبات کا دھارا موجیں مارتا ہے جیسے اگست کے مہینے میں ندی میں بہیا آ جاتی ہے۔ ندی تو تو نہیں جانتی کہ کدھر کو جا رہی ہے، پھر اتنی تیزی سے کیوں بہتی ہے؟ او گھڑے! پانی میں بوند کی طرح ڈر زب جا۔ میں بھی تیری طرح اتحاہ مندر میں ڈوب چکی ہوں۔“

سرل قرون وسطی کے بنگال اور گیتوں کے صفحات پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ باہر اندر ہیرا تھا۔ ایسا اندر ہیرا جو صرف بنگال کی بھیگی فضاؤں میں رات کے وقت گھنے باغوں پر چھاتا ہے۔ یہ پک کی مضمحل سی زرد روشنی برآمدے میں بھیلی ہوئی تھی۔ دفعتاً بھلی کی چمک کے ساتھ زور کی لھٹاٹھی اور ہوا چلنی شروع ہو گئی۔

”میں کل صبح انڈیا کے راستے کراچی کے لیے روانہ ہو رہا ہوں۔“ مال کہہ رہا تھا۔ سرل چونکا۔

”معلوم ہے۔“

”تم سے تو اکثر ملاقات ہوتی رہے گی۔“

”ہاں۔“

ہوا کا جھکڑتیز ہو گیا۔ برآمدے کے نیچے اسوک کی شاخیں ہر سر ان لگیں۔ ”اسوک کا درخت!“ سرل نے گوجا سے مخاطب کیا۔ ”جسے کوئی حسین لڑکی چھوٹے تو اس میں فوراً چھوٹے کھل جاتے ہیں!“

مال نے بارش کی پھوار سے بچنے کے لیے کرسی اندر کو گھیت لی۔

”کوا کالا ہے۔“ سرل نے پڑھا۔ ”کوئی اس سے زیادہ کالی ہے اور تنجا کھالی ندی کا پانی اس سے بھی زیادہ کالا ہے۔ پر اس کے بال سیاہ ترین تھے۔“

بارش کی بوندوں نے باہر تالاب میں جل ترنگ بجانا شروع کر دی۔ بھلی چمکی تو باغ کا ایک ایک پتا ایک پل کے لیے اس میں جگمگا اٹھا۔

”چمپک کے درختوں کے پار، بوڑھی گنگا کی موجودیں بیکار شور کر رہی ہیں۔“ سرل نے کہا۔ ”ان سے کہہ دو کہ میں نے تمہاری آواز کی طرف سے کان بند کر

لیے ہیں میں اپنی کشتنی کنارے سے باندھ چکا ہوں۔“

”اچھا میں کہہ دوں گا۔“ مال نے آہتہ سے جواب دیا۔

وہ مری صحیح مال نے سرل اسٹبلے کو ڈھاکے میں چھوڑا اور فلائی گل کلب کا طیارہ لے کر گلکتے پہنچا۔ اس نے سوچا اپنے مرحوم ماموں نواب عباس رضا بہادر کے گھر والوں سے ملنے دت ہاؤس جائے مگر پھر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور ٹرین میں بیٹھ کر لکھنؤ روانہ ہو گیا۔

وہ ہوڑہ اسٹیشن پر ایک پولیس افسر کو واپسی اور آتے دیکھ کر ہڑبڑا گیا اور اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ویزا اور پاسپورٹ کے کاغذات کو چھووا اور مضمون ہوا کہ وہ غیر قانونی طور پر انڈیا میں داخل نہیں ہو رہا ہے۔ ٹرین چلا گی۔ برداں، آنسوں، پینے، مغل سراۓ اللہ آباد، لکھنؤ، ٹرین ایک اجنبی سرزی میں میں چل رہی تھی۔ سال پہر قبل یہ اس کا اپنا ملک تھا، اب اس میں وہ ایک غیر ملکی کی حیثیت سے سفر کر رہا تھا۔ اسے لگا لوگ اسے مشتبہ نظریوں سے دیکھ رہے ہیں۔ سب کی آنکھیں اسی کی طرف ہیں۔ تم پاکستانی ہو۔ تھانے چلو۔ تم پاکستانی ہو۔ مسلمان۔ جاسوس۔ مسلمان جاسوس۔ ٹرین کے پہیوں میں سے یہی آواز نکل رہی تھی۔ خدار۔ جاسوس۔ خدار جاسوس۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھ کھوئی۔ ٹرین حسب معمول بڑی شان و شوکت کے ساتھ چارباغ جنگشن میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

چارباغ۔ لکھنؤ۔ لکھنؤ۔

دو دن وہ عزیزوں کے پاس ٹھبرا۔ اب اسے خیابان کے گلیم کی خانہ پری کے

سلسلے میں ضروری کاغذات لینے دہرہ دون جانا تھا۔ تیرے دن وہ لکھو سے چلا۔ (یہاں اب کیا رکھا تھا، وہ کس کے لیے یہاں ٹھہرتا، وہ بدل چکا تھا لہذا لکھو بھی بدل گیا تھا) جب ٹین مراد آباد کے قریب پہنچی تو اسے معاياد آیا کہ لکھو میں سیتا ڈکشت نے اسے بتایا تھا کہ چمپا والیت سے لوٹ آئی ہیں اور اپنے چچا کے پاس مراد آباد میں مقیم ہیں۔ اس اطلاع پر مال نے ویزا پر مراد آباد کا اضافہ کروالیا تھا۔ ٹین پلیٹ فارم پر پہنچی تو وہ اپنا سامان اٹھا کر گاڑی سے اتر آیا۔ اسٹشن سے باہر آ کر اس نے ایک تانگہ لیا اور سیتا ڈکشت کا بتایا ہوا پتا دیکھنے کے لیے جیب سے نوٹ بک نکالی۔ پھر اس نے تانگے والے سے کہا: ”کھنگھر چلو۔“

تانگہ روشن بازاروں اور کالجوں اور ہستاں کی بلند عمارتوں کے سامنے سے گزرتا ایک سمت کو چلا۔ سڑک پر خلیے چل رہے تھے اور پردے دار ریزوے اور ڈولیاں اور یکے لڑکے بالے۔ بر قعہ پوش عورتیں سلپر گھسیٹیں گلیوں میں گھس رہی تھیں۔ تانگہ اب ایک محلے میں داخل ہوا جو شاید مال کی منزل مقصود تھی۔ دروازوں کے آگے نوٹے پھولے چبورتے تھے اور مسجد کی منذری پر ایک چیل بیٹھی او گھٹتی تھی، یہ چمپا باباجی کا محلہ تھا؟

وہ تانگے سے اتر اسامنے بڑا سا پرانے وقتوں کا چھانک تھا جس کے دروازے میں ایک چھوٹی کھڑکی کھلتی تھی۔ اندر سلیمن تھی اور بھووسے کا ڈھیر۔ دو تین کھشیاں پڑتی تھیں۔ اندر ایک اور بے حد تانگ و تاریک زینہ تھا جو شاید اٹھا رہو ہیں صدی میں بنا ہو گا چھانک میں وہ چاروں طرف آوازیں دیتا پھرا، جب کسی نے اس کو جواب نہ دیا تو وہ ہمت کر کے خود ہی اس زینے پر چڑھ گیا۔ دوسری منزل پر چھوٹا

سا آنگن تھا جس میں چینی کے گلے رکھے تھے۔ سامنے برآمدہ تھا اور ایک بڑا کمرہ جو شاید اس گھر کی بیٹھک کا کام دیتا ہوگا۔ اس میں صرف ایک کری پڑی تھی اور ایک مسہری۔ ایک الماری میں خدائی فوجدار اور او وہ شیخ کی جلد یہ رکھی تھیں۔ دروازوں میں ان گنت اودے، نارنجی، بزر اور سرخ شیشے لگے تھے۔ باہر کے رخ چھجا تھا جو چھانک کے عین اوپر شہنشیں کی طرح نظر آتا۔ چھجے میں کھڑے ہو کر اس نے پچھم کی اور نظر ڈالی۔ گلی بے حد صاف تھی، اس نے غور سے دیکھا۔ نیچے مسجد میں پیش امام نماز پڑھ رہے تھی۔ ان کی جاء نماز کے سامنے بحدہ گاہ کے قریب تا م چینی کی رکابی میں پکھر کھا تھا اور محلے کے تین چار لڑکے بالے ”بٹ لیکھی، بٹ لیکھی“ کہہ کر ان کو چڑھا رہے تھے۔ امام صاحب سلام پر ہیر کر جلدی سے اٹھے۔ لڑکوں کو ڈھیلے سے مار بھگانے کے بعد پھر جاء نماز پر واپس چلے گئے، ناقابل بیان سنائیں سارے میں طاری تھا۔ اسی مکان کے دائیں ہاتھ ایک سر بزر ڈھلان پر قبرستان تھا۔ اسے ایک جھر جھری سی آئی۔ زندہ رو جیں، مری ہوئی رو جیں، یہاں کتنی نحوس تھی۔ مردوں کا شہر۔ چمپا بابی تم یہاں کہاں ہو؟ قبرستان کے سرے پر چھپر تھا اور نیم کا درخت جس کے نیچے بکری بندھی تھی۔ چھپر کے اوپر کھڑی میں سے کوئی لڑکی جھانک رہی تھی۔ مال کو اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے جھٹ کھڑی کی بند کر دی۔ وہ زینے سے نیچے اتر کر دھرے چھانک کے سامنے آیا۔ اس کی بھی وہی وضع تھی۔ رنگ برلنگے شیشوں والا شہنشیں۔ نیچے دربان کے کھڑے ہونے کے لیے طاپے، شکستہ چبوڑہ۔ اس نے چھانک کی کنڈی کھٹکھٹائی۔

”کون ہے؟“ اندر سے آواز آئی۔

مایوسی اور ڈپریشن کی وجہ سے مال کے حلق سے آواز بھی نہ لگی۔

”کون ہے؟“ دھاری دار گبرون کا سیاہ تگ پائچامہ پہنے ایک بڑھیا نے اندر سے جھانکا۔

”میں ہوں۔“

”گے کیا بات ہوئی۔ اے نام تو بتاؤ بخوبی۔“

”میں ہوں مال رضا۔ پاکستان سے آیا ہوں۔“

بڑھیا نے کچھ دیر بعد واپس آ کر کھڑی کھوئی۔

”آؤ۔ آ جاؤ میاں۔“ اس نے کہا

وہ اندر آ گیا۔ انگلائی میں اینٹوں کا فرش تھا۔ دیوار کے ساتھ کیا ری میں کسی زمانے میں پودے رہے ہوں گے، اب وہ ویران پڑی تھی۔ باور پچی خانے کے سامنے مرغیوں کا ڈر بہ تھا۔ مرغیوں کے پر ادھر ادھر اثر رہے تھے۔ سامنے بڑا دالان تھا۔ دالان میں تخت، اس پر چمپا یتھی تھی۔

”ارے ہلو۔ مال، بھئی حد ہو گئی!“

”چمپا باجی!“

”تم! گذگاڑ!!“ وہ آہستہ سے اٹھی اور مخذلت طلب انداز میں جلدی جلدی تخت پوش ٹھیک کرنے لگی۔

”میں سامنے والے مکان میں گھس گیا تھا۔“ مال نے کہنا شروع کیا۔

”میرے گھروالے سب پچا میاں کے یہاں گئے ہوئے ہیں، وہیں چلو، وہاں اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“

اس نے الگنی پر سے دلائی اتاری اور اسے بڑے سلیقے سے اوڑھاتا کہ سر سے پاؤں تک دلائی اسے ڈھانپ لے اور گھونگھٹ سانگاں کر مال کے ساتھ گلی میں آ گئی۔ ”ہمارے یہاں بر قفعے کا رواج نہیں ہے اب تک چادریں اور دلائیاں ہی اوڑھی جاتی ہیں۔“ اس نے گویا تشریح کی، وہ قدیم مسجد کے پاس پہنچ کر دوسرا گلی میں مرگئی جو قبرستان کی ڈھلان کے برابر سے گزرتی تھی، یہ بھی بے حد صاف ستری تھی۔ دیواروں میں گھاس اور چمپل کے درخت اگ آئے تھے۔

”یہ؟“ مال نے قبرستان کی طرف اشارہ کیا۔

”ہم ہی لوگ ہیں۔“ چمپا نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے جواب دیا۔ ”یہیں جیتے ہیں اور یہیں مریں گے۔“ اس نے کچھ تو قف کے بعد اضافہ کیا۔ چند قدم چل کر ”دیوان خانہ“ آ گیا۔ ”چچا میاں کا مکان؟“ ”ہاں۔“ وہ ڈیورٹھی میں داخل ہوئے۔ آنکن میں بہت سے تخت بچھے تھے۔ ویرانی کی شدت سے جگہ سنواری تھی۔

”یہاں تو کوئی بھی نہیں رہتا؟“ مال نے ذرا دشمنت زدہ ہو کر پوچھا۔ ”نہیں“ چمپا نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”یہ امام باڑہ ہے، یہ جو تخت پڑے ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے اس میں ہمارے یہاں کی مشہور تختوں کی مجلس ہوا کرتی تھی۔“

اب انہوں نے پھر ماضی کی گردان شروع کر دی، مال نے بوکھلا کر سو جا۔

”اصل مکان اندر ہے۔“ چمپا نے بات جاری رکھی۔ ”چلے آؤ۔ تم سے پرداہ کوئی نہیں کرے گا۔“

وہ ڈیورٹھی میں سے گزڑتا اندر چلا گیا۔ صحن میں کرسیاں اور چارپائیاں بچھی تھیں، ایک چارپائی پر کڑھا ہوا پنگ پوش پڑا تھا۔ باورچی خانے میں بگھار کی تیز مہک آ رہی تھی، دو تین غیر واضح، غیر اہم سے لوگ ادھر ادھر بیٹھتے تھے۔ بادل گھرے ہوئے تھے مگر ہوا بند ہونے کی وجہ سے شدید جس ہو گیا تھا، بر ساتی کیڑے چراغوں کے چکر کاٹ رہے تھے۔

”چالا۔۔۔ یہ مال ہیں۔۔۔“ نیم تار کی میں چمپا کی آواز آئی۔
”آؤ۔۔۔ آؤ۔۔۔ بیجھومیاں۔۔۔ بڑی عزت افزائی کی تم نے ہماری۔“ چالا
نے، جو پنگ پر لیٹے ہوئے تھے، اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

لائیں اٹھا کر ایک لڑکی باورچی خانے کی اور پکی۔ ایک اور لڑکی والائی میں میز پر بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ یا اللہ! مدل کلاس اس قدر ڈیپریسنسنگ ہوتا ہے؟ مال نے لرز کر سوچا۔ آنگلن میں آنے والوں کی آہٹ سن کر والائی والی لڑکی نے نظریں اٹھا کر مال کو دیکھا۔ مال نے جلدی سے دوسرا طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ اس نے مسلمان مدل کلاس لڑکیوں کے فرسریشن اور رومان پرستی کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا اور وہ ہرگز نہ چاہتا تھا کہ یہ لڑکی یا وہ لڑکی جو باورچی خانے میں اس کے لیے چاہنے والی تھی اس کے ساتھ وقیقی رومان شروع کر دیں اور بعد میں اسے لمبے کھرے لکھا کر دیں۔ محبت نامے۔

اس کی کوفت میں اضافہ ہوتا گیا۔

”یہ میری کمزز ہیں دونوں۔“ چمپا اسی آواز میں پائیتھی پیٹھی اسے بتا رہی تھی۔
”وہ والی زیب النساء ہیں انہوں نے دلی سے لانبریوی سانس میں ایم۔ اے کیا
ہے۔ چھوٹی والی مریم زمانی ہیں، یہ اگر یکلچر میں ایم۔ ایس۔ سی کر رہی ہیں۔ جب
میں انہر کے بعد لکھنو پڑھنے گئی تھی یہ دونوں کی دونوں بالکل ذرا ذرا سی تھیں۔ کس
قدرتیزی سے گزرتا ہے، تم کو چپ کیوں لگ گئی؟“
”کچھ بھی تو نہیں چمپا بابی۔“

پھر چچا میاں اس سے آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔ وہی پرانے قصے۔
پاکستان، ہندوستان ہماری تو میاں بدھیا بیٹھی۔ انہوں نے کہا۔
”یہاں اتنا سنا کیوں ہے؟“ مال نے گھبرا کر پوچھا۔ پھر اسے اپنی بیوقوفی
کا احساس ہوا۔

ڈوپ

”ساری آبادی کہاں چلی گئی؟“
”وہیں جہاں تم چلے گئے۔“ چچا میاں نے جواب دیا۔ ”کھوکھرا پار کے
راستے سے سب نکل لیے، روہیل گھنڈ خالی ہو گیا۔ بس ہم چند بڑھے ٹھٹھے باتی
رہ گئے ہیں۔ دو تین سال کی بات اور ہے، جب ہم مر جائیں گے تو یہاں ہمارے بعد
گدھے لوٹیں گے۔“

مال اٹھ کر ٹبلنے لگا۔ مریم زمانی نہایت بے تعلقی سے چاءہنا کر لارہی تھی۔
اس کا رومان شروع کرنے کا ارادہ معلوم نہیں ہوتا۔ مال نے ذرا اطمینان اور ذرا
مایوسی سے سوچا۔

”پاکستان کے کیا حال ہیں؟“ چالبا پوچھتے رہے۔ ”نا ہے یہاں سے دیکھنے

جولا ہے جا کر وہاں لکھ پتی ہو گئے، اپنے کوسیدا ہوئیں ہیں اور کوٹھیوں میں رہیں ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے میاں؟ میرے بھائی نے لکھا ہے کہ وہاں ہر جگہ پنجابیوں نے یو۔ پی۔ والوں کا ناطقہ بند کر رکھا ہے اندھیر گردی بھی ہے۔ میاں ہم تو تباہ ہو گئے تباہ اور وہاں بھی کون سے لذوٹ جائیں گے۔ میرے بھائی کا خط کالی ہی آیا ہے جملہ سے، اس نے شعر لکھا ہے، وہ کیا شعر ہے زیبائی؟“

غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا
ہجی.....ہجی۔ انہوں نے کرسی پر پہلو بدلا۔ ”مر جھمکت بھی تو لا دھنیے کے
لیے۔ مال میاں اسی ڈیورٹھی پر چار چار ملازم موجود تھے، اب یہاں سارے میں
اویول رہا ہے۔“

مال چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اس نے مسلمان قوم کے متعلق پھر اپنی محبوب
تحیوری دل میں دھرانا شروع کر دی۔ یہی بڑے میاں ۲۶ء میں سنی مسلم لیگ
صدر رہے ہوں گے۔ سن اڑتا لیس تک سوچتے ہوں گئے کہ لشکر اسلام سری نگر فتح
کرنے کے بعد لال قلعہ، دلی پر فتح کر پر چشم لہراتا یہاں کے مسلمانوں کو لبریث
کرنے کے لیے بس اب آیا ہی چاہتا ہے، مال کا دم گھبرا نے لگا۔

”یہاں بھلی کی روشنی اب تک نہیں آئی۔“ چمپا غیر شخصی آواز میں بتلارہی تھی۔
 محلے میں تو کب کی آچکی ہے جہاں پھوام کی کوٹھی تھی، وہ چلی گئیں حیدر آباد
سندھ مع اپنے گھروالوں کے لہذا کوٹھی کشوڈین نے لے لی۔ اس میں سکھوں نے
اسکوں کھول کر بھلی منگالی ہے ہمارے مکانوں میں نہیں آسکی۔ چمپا کی آواز نیم
تاریکی میں ڈرون کرتی رہی۔

”بجلی کے لیے میاں پیسے چاہئیں۔“ چاہانے کی سینی زور سے اسٹول پر رکھتے ہوئے کہا۔ سینی کا توازن قائم نہ رہ سکا، جگ لوٹنے سے سارا دودھ انگناٹی کے فرش پر بہہ گیا۔ چمپا اسے افسوس سے دیکھتی رہیں۔ ”اب اتنی رات گئے دودھ کہاں سے آئے گا۔“ انہوں نے کہا۔

”اس پر افسوس نہ کرو چمپا باجی۔“ مال نے گہری آواز میں آہستہ سے کہا۔
چمپا نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور مسکرا دی۔

مال نے چمپا کو آج ان کی زس دگی کی ایک اور سیر ھی پر ایک پس منظر میں دیکھا جوان کا حقیقی پس منظر تھا۔ اس نے لمجھ بھر کے لیے آنکھ بند کر لی۔ لکھنؤ، پیرس، کیمبریج، لندن، روم اور میڈرڈ والی چمپا، مراد آباد کے محلے کٹھگھر کے اس نیم تاریک مکان والی چمپا، مدل کلاس چمپا، بہادر چمپا عرف نئے ہندوستان کی عاقلا وردا اور حسینہ۔ واہ بجیا۔ تمہارا جوب نہیں۔ مانتا ہوں۔

مال مراد آباد میں دو دن رکا۔ رات کو اسے اسی اودے اور نارنجی شیشوں والے کوٹھے کے کمرے پر پہنچایا گیا۔ جہاں وہ سب سے پہلے جا پہنچا تھا۔ آڈھی رات تک وہ چھجے میں کھڑا سامنے کا منظر دیکھتا رہا جہاں چاند نے اپنی میالی روشنی مکانوں کی چھتوں، مسجدوں کے میناروں اور نیم کے درختوں پر پھیلا رکھی تھی۔

دوپہر میں قیلو لے کے لیے اس کا کھشولہ زینے کی آخری سیر ھی پر بچھا دیا گیا جہاں رام گنگا کی طرف سے ٹھنڈی ہوا آتی تھی۔

”تنا ہے تمہارے یہاں ہندوستان کی ساریوں کی بڑی مانگ ہے۔“ چمپا باجی نے آ کر دلیز پر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے بشاشت سے بات شروع کی۔

”تمہاری ہم وطن اعلیٰ سوسائٹی کی خواتین یہاں آتے ہی کپڑے کی دکانوں پر یلغار کرتی ہیں۔ سناء ہے تمہارے یہاں کی اعلیٰ سوسائٹی۔“

”کیا اعلیٰ سوسائٹی کی گردان کر رہی ہو۔“ مال نے جھنجھلا کر اس کی بات کائلی۔ ”یہ نہ بھولو چمپا بابی کہ خود تم کو طبقاتی شعور حاصل کرنے میں پورے پندرہ سال لگے۔“

چمپا زور سے نہیں۔ ”طبقاتی شعور کی بات کرنا ہے تو میری کنزہ سے گفتگو کرو۔ زیبا اور مریم، بڑی بھاری اسموڈنٹ ورکر زیبیں دونوں۔ دلی کے سالانہ انحر یونیورسٹی یو تھ فیسٹول میں ہمیشہ یہ لوگ جانے کیا کیا کرامات کرتی ہیں۔ جھانکیاں عوامی ناج، موسیقی کے مقابلے۔ زیبائے پچھلے سال کے فیسٹول میں سگتر اشی میں پہاڑ انعام حاصل کیا۔“

مال کی سمجھ میں آگیا۔ اس کا خدشہ بے کار تھا، یہ مڈل کلاس لڑکیاں اپنے فرشنریشن اور اپنی رومانیت پر فتح حاصل کر چکی تھیں۔ آج سے پندرہ سال پہلے اگر وہ چمپا کی جگہ ہوتیں تو شاید اسی کی طرح رومان پرست ہوتیں، یعنی لڑکیاں تھیں۔ چمپا عبوری دور کی تھی اس لیے لا محالہ اس نے تجربے کیے اور ٹھوکریں کھائیں۔ زیبا اور مریم، ہمت والی لڑکیاں۔ ان کے دماغوں میں کوئی الجھن نہیں۔

پھر اسے خیال آیا کہ اس کے دلیں میں ایسی لڑکیاں نہیں، وہاں ابھی عبوری دور بھی پوری طرح شروع نہیں ہوا۔

”کاش میں ۳۲ء میں ان دونوں کی ایسی بن گئی ہوتی۔“ چمپا نے گویا مال کے دل کی بات پڑھلی۔ ”اب ہم لوگوں کے اختیار میں تو واقعات نہیں ہوتے۔“

مال نے جواب دیا۔ اس نے محسوس کیا وہ کس قدر بوڑھا ہو چکا ہے۔ چمپا، جو اس کے سامنے چوکھت پر بیٹھی ہے، کتنی بوڑھی عورت ہے۔ ہم دونوں نے میں کی دنیاوں کی کتنی بمبی سیاحت کی۔ اس نے حیرت سے سوچا۔

وہ اس وقت ایک اجنبی شہر میں ایک نیم تاریک زینے پر بیٹھا تھا۔ دریا پر سے آتی ہوئی برساتی ہوا اس کے بال پر بیشان کر رہی تھی۔ وطن کی برسات، مگر یہ وطن نہیں تھا۔ اس کے ویزے کی معیاد ختم ہونے والی تھی، کل سوریے وہ یہاں سے اپنے ملک روانہ ہو جائے گا۔ مراد آباد، کٹھ گھر، یہ زینہ، چمپا احمد، زیبا، مریم، چا ابما۔ سب نہیں رہ جائیں گے۔ کیا اس حقیقت پر اسے آنسو بہانا چاہیے؟ لیکن اب اسے محسوس ہوا کہ وہ بوڑھا ہو چکا ہے۔ اس میں ضبط آگیا ہے۔ ضبط، توازن اور سکون، گریک آئینہ بیٹھ۔۔۔۔۔ اسے ہری شنکر کے الفاظ یاد آئے۔

چمپا نے پھر اس کے دل کی بات پڑھ لی اور اس نے پرانی عادت کے مطابق دہرا لیا: ”کہاں ہے تمہارا ہمزا وہری شنکر؟“

”چمپا باجی“، اس نے ذرا غصے سے کہا: ”ہری شنکر اب میرا ہمزا نہیں رہا، مجھے کیا معلوم وہ اس وقت کہاں ہے۔“

”کیوں اسے خط نہیں لکھتے؟“

”چمپا باجی“، اس نے پہلو بدل کر کہا، ”تم کو یہ اب تک معلوم نہیں ہوا کہ میں دوستوں کو خط نہیں لکھا کرتا۔ میں ہری شنکر سریواستو کو کیا لکھوں اور کیوں لکھوں؟“

”اب تک جذباتی ہو!“

”نہیں۔“ اس نے بل کھایا۔ چمپا نے اسے پھر چوری کرتے کپڑا لیا تھا۔
”ہٹائیئے چمپا باجی۔“ اس نے جھنجڑا کر جواب دیا۔ ”میں اس سارے انڈو پاکستان
میلوڈراما سے، جو چاروں طرف کھیلا جا رہا ہے، قسم خدا کی عاجز آ چکا ہوں۔ ہری
شکر آج کل شاید بنگور میں ہے، اب میں کیا جا کرو تے ہوئے اس سے لپٹ
جاوں؟ لا حول ولا قوۃ۔“

”تم اب تک مضبوط نہیں ہوئے۔“ چمپا نے آہستہ سے کہا ”تم ہری شکر سے
ماننا نہیں چاہتے کیونکہ تم کوڈر ہے کہ واقعی جا کرو تے ہوئے اس سے لپٹ جاؤ
گے۔ اچھا پھر مجھ سے ملنے کیوں آئے؟ یہ بھی بڑی سخت میلوڈری ملک بات تھی۔“

”آخر انسان ملتا ملاتا ہی رہتا ہے پرانے دوستوں سے۔“ مال سے کوئی اور
معقول جواب نہ بن پڑا۔ ”اور پھر مراد آبادر استے میں ہی پڑتا تھا۔“ اس نے منہ
لٹکا کر کہا۔

بارش کی بوندیں ٹپ ٹپ ٹین کے چھجے پر برستے لگیں۔ گلی کی مٹی کی سوندھی
خوبصورت کر مال تک پہنچی۔ ایک عورت تگ پانچاہمہ پہنے، آم کی کھانچی سر پر
اخنائے، آواز لگاتی نیچے سے گزری۔ چمپا دہیز پر پیٹھی موکھے سے باہر دیکھتی رہی۔
بہت دیر سے مال ایک سوال دل میں لیے بیٹھا تھا مگر پوچھنے کی ہمت نہ پاتا
تھا۔ آخر اس نے دلبی زبان سے دمری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ہی لیا:

”چمپا باجی اب تم کیا کرنے والی ہو؟“

یہ بڑا بے رحم سوال تھا۔ ہم کسی سے اس کے مستقبل کے بارے میں کس طرح
پوچھ سکتے ہیں!

”میں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں بالآخر بنا رس واپس جا رہی ہوں۔ تم کو یاد ہے میں نے کیم کے کنارے بوٹ ہاؤس میں تم سے کہا تھا: میں واپس جانا چاہتی ہوں، کوئی ساتھ لے جانے والا نہیں ملتا۔ اب میں نے دیکھا کہ کسی دوسرے کا سہارا ڈھونڈھنا کس قدر زبردست حماقت تھی۔ میں خود ہی بنا رس لوٹی ہوں، جانتے ہو میرے آبائی شہر کا نام کیا ہے؟“

”ہاں۔ مسرت کا شہر، وہ بھی ایک نہ ایک دن والقعاً مسرت کا شہر بنے گا۔ سارے شہروں کی طرح اس ملک کو دکھ کا گڑھ یا مسرت کا گھر بنانا میرے اپنے ہاتھ میں ہے مجھے دوسروں سے کیا مطلب؟“ اس نے اپنے ہاتھ کھول کر غور سے انہیں دیکھا۔ ”رقاصہ کے ہاتھ، آرٹسٹ یا لیکھک کے ہاتھ؟ نہیں..... یہ صرف ایک عام، او سط درجے کی ذہین لڑکی کے ہاتھ ہیں جواب کام کرنا چاہتی ہے۔“

وہ خاموش ہو گئی، کچھ دیر بعد مسجد سے ظہر کی اذان کی صدا باتند ہوئی۔ اس نے غیر ارادی طور پر دو پیٹے سے سر ڈھانپ لیا۔

”مال!“ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ”مسلمانوں کو یہاں سے نہیں جانا چاہیے۔ تم کیوں نہیں دیکھتے کہ یہ تمہارا وطن ہے۔“ اس نے بُنی سے انگلیاں مروڑیں۔ ”اور تم کیوں چلے گئے؟ کیا میں تمہارے یہاں آ جاؤں تو مجھے ایک سے ایک عمدہ عمدہ نہ مل جائے گا! دیکھو میں پیرس اور کیمبرج اور لندن سے کتنی ڈگریاں لائی ہوں۔“

ہر سنگھار میں رنگے دو ٹیئے اور پتھری سائزیاں پہنے چمیا کے رشتے دار لڑکیاں

نیچے دالان میں پکوان چڑھا رہی تھیں۔ ”بھئی کچھ یہاں بھی بھجواؤ۔“ چمپا نے کھڑکی میں سر نکال کر آواز دی۔

”اچھا بجیا۔ ابھی تھے۔“ پھر انہوں نے ایک گیت شروع کر دیا۔ جھولائیں نے ڈالوری امریاں۔

مال نے کھولے پر لیئے لیئے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ بچپن سے یہ گنت سنتا چلا آ رہا تھا۔ آتے ہی اس کے خامدان کی لڑکیاں بھی کڑھائی چڑھا کر یہ گیت الان پا شروع کر دیتی تھیں۔

زینے پر پانچھے کی جھونک دکھلائی دی۔ زیبا پھلکیوں کی پلیٹ لے کر اوپر آ رہی تھی۔ سمجھ سمجھ وہ اندر آئی اور پلیٹ فرش پر رکھ کر گنگنا تی ہوئی پھر نیچے اتر گئی۔

چمپا چوکھت پنپھی رہی۔ ”تم سوچ رہے ہو۔“ اس نے آہستہ سے کہا، ”کہ اب میرے دوار کون آئے گا۔ لیکن مال میں سمجھتی ہوں، جہاں تک ذاتی کامیابی کا سوال ہے، میں تم سے کہیں زیادہ خوش قسمت ہوں۔ میں نے سراغ پالیا ہے۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو چمپا باجی۔“

نیچے حوض میں برکھا کی پھوہار کا جھلانچ رہا تھا۔ بارش کی وجہ سے سارے میں ہریاں اور تروتازگی چھا گئی تھی۔ گلیوں میں منہمی منہمی ندیاں بہہ رہی تھیں، چھوٹوں اور پرپنالوں سے پانی کے آبشار اگر رہے تھے، نیچے آنگن میں پانی کی چھوٹی سی شفاف جھیل بن گئی تھی، اور پرچیٹی کے گملوں میں لگے ہوئے پودے پانی میں لہلہہار رہے تھے۔ ”یہ میرا جل محل ہے۔“ چمپا نے آہستہ سے کہا۔ ”یہاں میرے آنسوؤں کا پانی بہتا ہے۔“

دالان میں لڑکیوں کے دو پٹے لہرائے، ہلکی کاسنی، زرد اور بزرگ کی چزی اوڑھے ایک لڑکی نے، جو شاید مریم تھی، میرا کا گیت شروع کر دیا۔

”میں ایک عام اوسط درجے کی لڑکی ہوں۔“ چمپا کہتی رہی۔ ”اگر میں خدا کا خاص انجام بندہ ہوتی۔ میرا، مکتابی، سینٹ صوفیہ۔ تو میرے جسم پر زخموں کے نشان نظر آتے، میرا البادہ میرے مقدس خون سے سرخ ہوتا، میرے ہاتھوں میں میخیں گڑی ہوتیں، میرے سر کے گرد نور کا بالہ ہوتا، مجھے وہ شکر کے پیالے اور سانپ کے پیارے بھجوائے گئے ہوتے، لیکن میں محض چمپا احمد ہوں۔ میرے زخم کسی کو نظر نہیں آ سکتے کیونکہ میرے تماشائی بھی میری طرح زخمی ہیں، وہ کمزور اور فانی انسان ہیں۔ چشم میں نہیں رکھتے۔ لوگ ممکن ہے مجھ پر ہستے بھی ہوں جبکہ سینٹ صوفیہ کی پرستش کی جاتی ہے۔“

ہوا کے زور سے بہت سی جانشیں ٹپ کرتی یئر ہیوں پر آن گریں۔ چمپا نے اپنے بالوں میں سے ایک زرد پتا نکالا۔

”مال،“ اس نے سوچتے ہوئے کہا، ”تمہیں وہ لنکا کی آرٹسٹ لڑکی یاد ہے؟“ برسوں تک وہ کیوس پر کیوس رنگتی چلی گئی۔ دنیا کے نگارخانوں کی اس نے خاک چھانی، لندن اور پیرس میں اس کی نمائشیں ہوئیں جن میں بیویاں نئی نئی ساریاں اور فراک پہن کر آتیں، معزز مہمان تقریبیں کرتے، تصویریں لی جاتیں، پر لیں کے نمائندے اس کا انٹرو یوکرتے، وہ ایک کونے میں کھڑی مسکرا کر سب سے باتمیں کرتی، آخر میں سب چلے جاتے، اس کا بال خالی ہو جاتا، اپنی چنگر کی معیت میں وہ تنہارہ جاتی اور چپ چاپ باہر نکل کر بس میں پہنچتی اور گھر کی راہ لیتی۔ تین

مرتبہ میں نے یہی منظر دیکھا۔“

”میں نے طرح طرح کے جینس قسم کے لوگوں کے ساتھ وقت بتایا۔ ان میں سے ہر ایک کبھی اپنی جگہ خوش ہوتا کبھی رنجیدہ۔ تم خوش کیوں ہو؟ میں ہر ایک سے پوچھتی۔ اتنے ذہین ہوتے ہوئے بھی بٹاش ہو، حد ہے۔ میں برآمان کر کہتی، مگر آخر میں میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں اپنے غم کو جنہوں نے دنیا کے غم میں سودا تھا۔ کس قدر آسان بات تھی۔ پیار کے نیچے پہنچ تو معلوم ہوا ہم خود اور ہمارا ذاتی الام کس قدر حیرت ہے۔“

”آٹھ سال بعد تمہاری طرح میں اپنے وطن واپس لوئی اور میں نے یہاں کے حالات دیکھے۔ ایسی باتیں دیکھیں جن سے میرا سر نداشت سے جھک گیا اور میرا دل دکھی ہو گیا۔ میرے سامنے مسائل کا بہت اوپھا پیار کھڑا تھا۔ تب جانتے ہو کیا ہوا؟ چیونٹی نے کیا کیا۔ اس نے کانوں میں ہاتھی لٹکا کر پیار پر چڑھنا شروع کر دیا۔“

”اب بھی معلوم کرنا چاہتے ہو کہ میں کیا کرنے والی ہوں؟“

دوسرا روز شام کو وہ وہاں سے چلا۔ اس کے لیے تانگہ منگوایا گیا۔ چمپا اور مریم اور زیبا اسے ڈیورٹیک تک چھوڑنے آئیں۔ ”ہم اب تک اس محلے میں زیر دست پر دہ کرتے ہیں ورنہ چاہا کو خواہ مخواہ صدمہ ہو گا اس لیے ہم بوجہ پر دے کے تم کو اسٹینشن تک چھوڑ نے نہیں جاسکتے۔“ چمپا نے نہس کر کہا۔

مال تانگے پر بیٹھا۔ تانگہ گلی سے نکل کر اسٹینشن کی طرف چل دیا اور مال نے دیکھا: چمپا باباجی ایک بار پھر دور کھڑی رہ گئیں، ٹوٹے ہوئے مکان کی دلیز پر۔ اسی

طرح اس نے ان کو اوس فرڈ اسٹریٹ پر چوزے کی سرائے کے شیشوں والے دروازے کے پیچھے تھا کھڑا چھوڑ دیا تھا۔ اسی طرح وہ ایک مرتبہ گل فشاں کے پھانک کے سامنے اندھیری سڑک پر کھڑی رہ گئی تھیں جب بھیا صاحب ان کو چھوڑ کر پاکستان چلے گئے تھے۔

لیکن اس وقت وہ اکیلی نہیں تھیں، اب وہ ہجوم کا حصہ تھیں۔ انہوں نے بالآخر غیر مشروط طور پر ہجوم کی دہراتھ قبول کر لی تھی۔ چند سال پہلے مال سوچا کرتا تھا: وہ آگے جا رہا ہے۔ چمپا پیچھے رہ گئی ہیں، وہ دور نکل جائے گا۔۔۔۔۔ نئی دنیا ہیں، نئے خواب، عزم، آئندہ میز۔

مگر آج، اس سے، اس نے دیکھا کہ وہ آگے نہیں جا رہا، وہ مع اپنی دنیا کے مسلسل، مستقل مراجعت میں ہے اور تھا ہے۔ چمپا، جواب تھا نہیں، جلوس میں شامل ہیں، آگے برد رہی ہیں۔ ان کے ساتھ ان کے محلے کی گلیاں، مسجد کے مینار، زیبا اور مریم، سڑک پر گولیاں کھیلتے ہوئے لڑکے، تھیلے والے، برقعہ پوش عورتیں، سب ہیں۔ چمپا بابا جی ان سب کی ساتھ بن گئی ہیں۔ یہ لوگ آگے بڑھنے کے لئے تیار ہیں۔ آج نہیں، کل سہی۔ ایک نہ ایک روز بہت جلد یہ لوگ ترقی یافتہ ہو چکے ہوں گے۔ اس نکتے پر پہنچ کر سرل کے فلسفے کے سارے غیر مرلمی تاریخ جھنم کرنٹوٹ گئے۔

تاگنہ اب قاضی کے بازار سے گزر رہا تھا، دکانیں بڑھائی جا رہی تھیں۔ چاء خانوں میں ریڈ یونیون رہے تھے، بینما گھروں کے آگے ہجوم تھا، مغرب کے آسمان پر ایک آدھ کنکو اڑتا ہوا دھلانی دے جاتا تھا۔

کیا کروں پارٹنر..... ٹرین میں بیٹھتے ہوئے اس نے دل میں کہا، میرا بڑا
افسوںاک خاتمہ ہوا ہے۔

ٹرین شوالک کی پیماڑیوں سے گزرتی ہمالیہ کے ہرے بھرے دامن میں
پہنچی۔ ہر دوار، رشی کیش، ہر کی پوڑی، دیودار کے جنگل، بانسوں کے جھنڈ،
جھرنے، پیماڑی ندیاں، مندر، سادھو، چٹانیں، پھولوں سے لدے ہوئے
درخت، دہراتہ دون کے آشیش پر اتر کروہ ڈسٹرکٹ محکمہ عدالت میں گیا۔
کلیم اور منقولہ اور غیر منقولہ کے کانفادات اور مکان کے قبائلے نکالے گئے۔ سرکاری
قسم کی گفتگو ہوئی۔ پھر اس نے ڈالن والا کی خوبصورت سڑکوں پر گھومنا شروع کیا۔
اس نے آخری بار مکانوں کے ناموں کی تختیاں پڑھیں۔

سامنے رپنا بہرہ رہی تھی۔

”یار ہری شنکر۔“ مال نے کہا۔

”ہاں یار۔“

”یار یہ پروفیسر ٹھیک تو کہتا تھا۔ ہم لوگ کس جنگال میں گرفتار ہیں خدا کی
قسم۔“

اس روز انہوں نے تیاگ کے مسئلے پر کافی غور و خوض کیا اور سخت فلسفیانہ موڑ
ان پر طاری رہی۔ آؤ کوئیوں کے نام پڑھیں۔ ناموں کے انتخاب سے مکینوں کی
سانکلپولوچی آشکار ہوتی ہے۔ چلتے چلتے رک کر ایک چھائک کے قریب جاتے
ہوئے ہری شنکر نے کہا۔

”ہم کبھی مکان بنانا کرنیں رہیں گے کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ۔“ مال نے

کہا۔

”ٹھیک کہتے ہو۔ دیکھو بورڑوازی کس قدر افسونا ک طور پر جذبات زدہ ہے۔ ذرا یہ نام پڑھنا۔“

”خوابستان۔ لاحول والاقوۃ۔“

”مگر تم خود گل فشاں میں رہتے ہو۔“

”جانتا ہوں۔“

”یار کمال۔“

”ہاں یار۔“

”ڈر اسوچ چلوگوں نے مکان بنار کھے ہیں، یہاں سے وہاں تک، ایک سے ایک خوبصورت ساری دنیا میں مکان بننے ہوئے ہیں۔“

”ہاں یار بڑی عجیب بات ہے۔“

وہ دونوں ایک چالنک کی پلیا پر بیٹھ گئے اور پھر اس مسئلے پر غور و خوص کرنے لگے۔ دراصل ان کو پروفیسر کے دنیا تج دینے نے بے حد مضطرب کر دیا تھا۔ ”ایک صحیح الدماغ انسان، سائنس و ان اور لے کر چل دیا جنگل کو، حد ہے۔“

”اس کا مطلب کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ معنی کے معنی.....“

اندھیرا پڑے تک وہ ڈالن والا کی خاموش معطر سڑکوں پر مکانوں کے نام پڑھتے پھرے ”فسترن“، ”دولت“، ”شیم روک“، ”راج محل“،

ان مکانوں کے باغوں میں لگے ہوئے پھاڑی پھلوں کی مہلک سارے میں اڑ رہی تھی اور دنیا بڑی حسین جگہ تھی۔

وہ دونوں منہ لٹکا کر پھر ایک چالنک کی پلیا پر بیٹھے گئے اور نہر کے پانی کو دیکھتے رہے جو شرک کے کنارے کنارے بہہ رہی تھی۔ پانی میں ایک ٹوٹا چھوٹا جوتا دھارے کے زور سے اچھلتا کو دتا چلا جا رہا تھا۔ ایک لمبی سی کار آ کراس کے قریب رکی، وہ چونک پڑا۔ آنکھیں مل کراس نے چاروں اور دیکھا ہری شکر غائب ہو چکا تھا۔ یہ ۲۴ نومبر کے دہرات دون ۵۶ میں موجود تھا۔ اس نے دوبارہ آنکھیں ملیں، وہ تو اپنے ہی مکان کے چالنک پر بیٹھا تھا۔ کار میں سے ایک خوش پوش سردار جی اتر کراس کی طرف بڑھے۔

”آپ کس سے ملاجا چاہتے ہیں جی؟“

”میں میں وہ گز بڑا گیا، اس کا دل دھڑ کنے لگا۔ سردار جی شاید اسے ٹھگ سمجھ رہے تھے جو ان کے ڈرائیور روم سے ریڈ یوچانے کے ارادے سے آیا تھا۔ اس نے دوبارہ چالنک میں لگی ہوئی سنک مرمر کی تختی پر ٹھیک نواب تھی رضا بہادر آف کلیان پور۔

یہ اس کا مکان تھا، وہ پلیا پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا حلق سوکھ گیا۔ اس نے ٹھوٹ کے طور پر قبائل کے کاغذات نکال کر سردار جی کو پیش کیے اور کھیسانی نہیں ہنسا۔

”اوہ آپ موواسیل پر اپرٹی کے سلسلے میں آ ہے ہو۔ تشریف لاو جی تھی۔“

وہ سردار جی کے ساتھ باغ کی شرک پر داخل ہوا۔

”آپ کا اسٹور روم حفاظت سے بند ہے جی۔ کنجی لائے ہو آپ؟“

”جی ہاں۔“

ڈرائیور میں لے جا کر سردار جی نے اسے چاہ پلانی اور کھانا کھلانے پر مصروف ہے۔

سردار جی راولپنڈی کے رہنے والے تھے اور یہاں بہت بڑے ملکیتدار تھے۔ درستک وہ اپنے وطن کی یاد میں روایا کیا کیے۔ مال گھبرا کر انہوں کھڑا ہوا۔

”باکس روم کھولنے میں کل صبح آ سئتا ہوں؟“

”ضرور جی اپنا ہی گھر سمجھو۔“ سردار جی نے کہا اور اپنی کار میں بٹھاں کر اس کی قیام گاہ تک پہنچایا۔ صبح کو وہ پھر ”خیابان“ پہنچا۔ اب دھوپ نکل آئی تھی۔ باغ میں دو نوجوان اٹکیاں نگلے پیر بید منش کھیل رہی تھیں۔ سردار نبھی تو کروں پر چینت چلاتی پھر رہی تھیں اور بھینیوں کی سانی کروارہی تھیں۔ اندر ریڑہ یونچ رہا تھا، بڑا پر سکون منتظر تھا، وہ پہلو کے راستے سے گزرتا استور روم پہنچا اور تالہ کھولنے سے پہلے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

وہاں ان سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا وہ بیسویں صدی کے ہندوستان کی ”گم شدہ نسل“ کا ایک فرد تھا۔ اس نے محسوس کیا اس کے خاندان والوں کی دنیا، خزان زدہ جنگلوں، گلاب کے پھولوں، پیاری کالجوں اور تیسرے پھر کی چاء میں چاندی کی جھلمالاتی ہوئی چاء دانی کی دنیا تھی۔ سامنے دیوداروں کے درمیان سے جو پلڈنڈی گزرتی تھی اس کے خاندان کی خواتین رنگیں چھتریاں سنجلائے اس پر چلتی ہوئی کسی پرانی تر کی یا یورپین افسانے کی خوابناک فضاؤں میں تیرتی معلوم ہوا کرتی تھیں۔

”خیابان“ میں چھوڑے بڑے کمرے تھے جن کے چاروں اور مزید کمرے اور برآمدے اور گلریاں۔ جائزوں میں جب بھی وہ یہاں آتے وسط کے کمرے میں فرش پر گدے بچھا دیے جاتے۔ پہاڑی خانہ ماں فقیر اچاء کی کشتنی لا کر آشداں کے سامنے رکھ دتا۔ آنگن میں چمپا کا ایک درخت کھڑا تھا۔ اس کے تین طرف برآمدے تھے جن میں سے ایک کے سرے پر یہ اسموروم تھا۔ آنگن میں اس طرح کا گھر یہ ماحول رہتا جس کا ذکر سرت چندر کے نالوں میں عموماً پایا جاتا ہے۔ جائزوں کی راتوں میں نماں اور طاعت کے سامنے کتابوں کا ڈھیر لگا ہوتا۔ رنگ بھرنے کی کتابیں، پریوں کی کہانیاں، گزیاں اور یمنوسیٹ، جب بھی یہ گودام کھلتا تو سب بچوں کی طرح شدید تجویز اور اشتیاق سے وہ بھی اماں بیگم کے پیچھے پیچھے اس میں جا گھستا۔ کیسی کیسی پر اسرار چیزیں اس میں بند رہتی تھیں۔ صندوق، لوکریاں، برد، جھاڑ فانوس، بڑے بڑے لیہپ، پرانے رسائل، خطوط سے بھرے ہوئے ایچی کیس، نوازوں کے بندل، دریاں۔

سردیوں میں کرسیاں بھری پر ڈالے بابا بیٹھے حصہ گڑا گڑا کرتے۔ لیچیوں کے درختوں پر سے کمرہ رفتہ رفتہ چھٹتا۔ شاگرد پیشے میں ترلوچن مالی نے کمرے کی دیوار پر ایک بڑی سی رنگیں تصویریں سے چپکار کھلی تھیں جس میں دکھلایا گیا تھا کہ جو منش دنیا میں برے کام کرتے ہیں زک میں ان کا کیا حشر ہوتا ہے۔ (مثلاً ایک تصویر تھی کہ ایک آدمی زک میں ایک گاڑی میں جاتا تھا اور لمبی لمبی زبانیں نکالے بندرنما فرشتے گرز مار کر اس کو ہانک رہے تھے) اور روزی جمداداری جس کی لڑکی انگریزوں کے یہاں آیا گیری کرتی تھی، جب چاء دافی کوڑے کی باٹی میں

امدیلی جاتی تو وہ چاء کی پیتاں اس میں سے نکال کر گھاس پر سکھاتی اور ان کی چاء بنا کر پیتی۔

لکھو سے سارا عملہ ساتھ آیا۔ قدر یہ جو ہرے رنگ کی لوئی اوڑھے ٹھانٹھ سے بے ٹانگ کی کری پر اپنے کمرے کے آگے بیٹھے رہتے۔ باورچی خانے کے سامنے کٹھل کا درخت تھا۔ حینی کی بی بی روز کھڑی ہو کر اس کے پھل گنتیں۔

فرنچ پر سرخ رنگ کا کپڑا منڈھا تھا۔ موچ کے فرش، سرخ اور عنابی قالین۔ سامنے برآمدے میں دیوار پر ایک رنگیں تصویر فریم میں لگی تھیں جس میں شکاری کتے ایک بارہ سنگھے کا تعاقب کر رہے تھے۔ ڈرائیگ روم کا آتشدان بانات کی کار چوبی جھالر سے آ راستہ تھا۔ اس پر چاندی کے فریموں میں اہل خاندان کی تصویریں دھری تھیں۔ کونوں میں پیٹل کے بول اشینڈ زپر کھے تھے جن میں پام کے گملے رکھے جاتے۔ ڈرائیگ روم کی چالجی میں روز تازہ پتے بھرے جاتے جن کی بڑی اچھی سی مہک آتی۔ ڈرز کے موقع پر میز خالص انگریزی اشائیل سے سجائی جاتی۔ چھری کانٹے، فنگر بول جن میں گلاب کی پیتاں تیرتیں۔ بیرہ ہمیشہ ضابطہ چپکن پہنتا اور صافے پر چاندی کا بلالگاتا اور کمر میں پٹا باندھتا۔

گرمیوں کی دوپہروں میں جب سارا گھر سو جاتا تو مال چپکے سے باہر نکل کر چیوں کے خلک جھنڈ میں جا جیھتا۔ ایک عظیم آفاتی کا ہی سارے میں چھائی ہوتی۔ بڑے پر سکون خیالات دماغ میں آتے۔ دور دیواروں میں ایک پرندہ متواتر بے تکان چلائے جاتا: میں سوتا تھا..... میں سوتا تھا..... کہا جاتا ہے کہ یہ پرندہ شوالک کی وادیوں کے علاوہ اور کہیں نہیں پایا جاتا اور اسے کبھی کسی نے دیکھا

بھی نہیں۔ پہاڑی نوکر کہا کرتے تھے کہ جب پر جا پتی دنیا بنار ہے تھے اور سارے جانداروں کو ان کی قسمتیں اور اوصاف بائیٹے جا رہے تھے (مور کو پر ملے، کوئل کو آواز، وغیرہ) اس وقت یہ نہیں پڑا سورہاتھا۔ لہذا یہ اس کا جنم جنم کارونا ہے۔ اس کی آواز پر کان لگا کر سنو تو صاف سنائی دیتا تھا: میں سوتا تھا۔

سردانی بھی نہ گئے پیر شر پڑ کرتی ایک کمرے سے دوسرے میں جا رہی تھیں۔ انہوں نے زور سے پندری کا دروازہ بند کیا۔

کمال چونک کر ۳۵ء کے دہرہ دون سے بھی واپس آگیا۔

پیر ھیوں پر سے اٹھ کر اس نے جیب سے کنجی نکالی اور گودام کا دروازہ کھولا۔ اندر جا کر وہ الماریوں کو بے وصیانی سے کھولتا بند کرتا رہا۔ صندوقوں میں جھانا، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ ملکیت کا کیا مصرف ہے۔ اس نے انبار پر نظر ڈالی جسے انسان اپنی ذاتی ملکیت کہہ کر خوش ہوتا ہے اور اس طرح کے سامان کے پشتارے ابھی گلفشاں اور کلیان پور کی حوالی کے کمروں میں مقفل تھے۔ کمرے کے وسط میں تھوڑی سی خالی جگہ کا جو جزیرہ سا، بن گیا تھا اس میں کھڑے ہو کر وہ سوچتا رہا: اس ملکیت کے لیے دنیا مری جاتی ہے! ان سب کے بدالے میں ایک مرگ چھالا، ایک مرگ چھالا!

اب جا کر اس کی سمجھ میں آیا کہ لوگ دنیا تج کر جنگلوں میں کیوں جا بیٹھتے تھے۔ پھر اس نے اکڑوں بینچ کر کاغذات کی صندوقیاں کھولیں۔ چاروں طرف رسالوں اور کتابوں اور پرانی تصاویر کے انبار لگے تھے۔ اس نے ”خط و کتابت“ کا ایک ٹوٹا پھونٹا اپنی کیس اٹھایا۔ لفافے جن پر عجیب و غریب مہریں تھیں۔ پنہ

۱۹۳۳ء۔ بلاسپور ۱۹۲۸ء۔ جھالاوار ۱۹۳۷ء۔ جانے ان خطوں میں کیا تھا اور کن لوگوں نے یہ خط لکھے تھے اور اب وہ کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے۔ مشاً راس بہاری لال کا خط جو ۱۹۳۲ء میں پیلی بھیت سے آیا تھا اور بیکٹ میں لکھا تھا، یہ صاحب کون تھے اور کیوں تھے؟ اور وشا نندن پاٹے، رانی بھیت اور محمد احمد عباسی منصف ضلع گونڈہ، فرہ فرش پر آلتی پالتی مار کر پیٹھ گیا۔ اس نے ”خط و کتابت“ کے صندوق پیچے واپس ایک الماری میں ٹھوں دیے۔ قالینوں کے انبار کے نیچے فالکیں دبی تھیں۔ مقدمات، زمینیں، مکانات، نان و نفقہ، خالی چنی بیگم کا جھشم چھٹا جب میر مرغی سے ہوا تھا اس کے سارے کاغذات اور ایک تاریخ اودھ با تصویر جس کا کاغذ اتنا پیلا ہو چکا تھا کہ ہاتھ لگانے سے لکڑے لکڑے ہوا جا رہا تھا۔ جس کے اوپرین صفحے پر ہزاری نس دی آنڑیبل سرمهاراجہ ڈیگھے سنگھ بہادر کے سی۔ ایس۔ آئی بلرام پورو تلسی پور، صوبہ اودھ کی نہایت مسخرے پن کی قلمی تصویر چھپی تھی اور ان کے قلم سے لکھا ہوا نہایت متفع و مسح عبارت کا دیباچہ تھا：“القصہ ایسی بے الشفافی کی باتوں سے مضطرب ہو کر ایک دن عالی جاہ بسبب تحریک مصاحبہ سفارہت شعار بغور تائل و فکر و مال اندیشی لباس گیر و فقراء کا پہن کر بعد یہ پر بیٹھے رفقاء خاص بھی اسی صورت سے بنے اگشت نمائے خاص و عام ہوئے۔ جناب عالی نے اپنی رفع بدنا می سمجھ کر علی ابراہیم خان کو نواب عالیہ کی طرف سے کہا بھیجا کہ میں نے بادشاہ کے حکم سے

مال نے دوسرا صفحہ پڑھا:

”پس صاحبہن عالی شان نے سمجھا تینیر بلا دہندوستان تو اسی دن ہو چکا تھا۔

شرق سے غرب تک حقیقت کھل چکی تھی لہذا اس زینہ وزارت پر مستقل رہنا چاہیے
پھر مدارج سلطنت پر جانا آسان ہو جاوے گا اور یہاں کیک کسی کے گھر میں چلنے نجات
چاہیے اگر چاں میں ایک مدت گزر جائے۔ اب یہ سب حقیقت حال اس زمانے
کی کھل گئی۔ اتفاق قوم سب کا جاتا رہا۔ گویا سب چراغ ہندوستان بھوگے۔“

”انتقال مرزا وزیر علی خان بابت ماہ جون ۱۸۱۶ء گلکتہ کے کاسی باغ
میں، جہاں ٹیپو سلطان کا بیٹا بھی دفن ہے، مدفون ہوئے۔ چند غرباۓ شہروزیر ہند
سمجھ کر ساتھ تھے۔ کچھ شہر کی کسیاں ان کی سخاوت و نیکی یاد کر کے اپنے اپنے
دروازوں پر کھڑی روئی تھیں۔ صاحب نے حکم دیا گورے قات کے باہر کھڑے
رہیں۔ تابوت پر گوروں کا پھرہ تھا۔ اوس عہد میں صاحب رینڈیٹنٹ لکھنؤ جان
لمسدن صاحب۔ ہنارس میں جان چیری صاحب مقتول نائب تنصل حسین خان
تھے۔“

”مرزا مظفر بخت شاہزادے بیٹے مرزا سلیمان شکوہ ایک دفعہ اپنی اولواعزی و
طمع دنیا سمجھ کر لکھنؤ سے باہر نکلے۔ لکھنؤ کے جو لوگ پریشان حال و معطل تھے ساتھ
ہوئے، جب ناکام لکھنؤ پھرے سیلی بیگم محملہ بی بی ہائے جریل مارٹن سے نکاح کیا
اونیں کی پیش میں بسر اوقات رہی۔ بعد گوری بی بی کے مرنے کے انہیں کے
مکان میں رہتے تھے۔“

”جانا کریل ڈیوا صاحب و فریل صاحب و مولوی محمد اسماعیل کا لندن کو
سفارت معہ دیا یائے شاہ جم جاہ جارج چہارم“

کتاب اس نے توکری میں واپس پھینک دی۔ اس کے ہاتھ جو گردگی تھی

چند لمحوں تک وہ اسے افسر دیگی سے دیکھا کیا۔ بہت دیر تک اس نے اپنے ہاتھوں میں پوچھے۔

یہ سامان کہیں نہیں جائے گا۔ ان سب چیزوں کو ضبط ہو لینے والے اس نے دل میں کہا گودام سے نکلتے ہوئے اس نے ایک بیس سال پرانا گروپ فون فرش پر سے اٹھایا۔ اس میں بڑے ابا مر حوم ہار پھول پہنے درمیان میں بیٹھے تھے، یہ کسی ضلع کا الوداعی گروپ تھا جس میں بہت سے ڈپی ٹکنیکر ان اور وکلا، قطار میں بیٹھے تھے۔ پیچھے بڑے بڑے دروازوں والا برا آمد تھا۔ سینئر صاحب، رضوی صاحب، ٹھاکر رام نزاں صاحب، مسعود الحسن صاحب، یہ کیسے عجیب لوگ تھے۔ سید ہے سادے شریف۔ بھولے بھالے جعل سازی غالباً ان میں سے کسی کو نہ آتی ہوگی۔ ریکٹ چلانا ان کا مشغله نہ رہا ہو گا۔ فراڈ اور چارسوں میں سے یہ حضرات ناواقف تھے۔ کس قدر بے قوف لوگ تھے۔ ان کے مخصوص طرح کے مذاق ہوتے تھے۔ مخصوص مشغله۔ مشاعرے۔ مقدمے بازیاں۔ شکار پکے گانے کی محفلیں۔ کیسی پر امن زندگیاں یہ لوگ گزار گئے۔ اسے ان لوگوں کے مذاق یاد آئے۔ رضوی صاحب کی چپ گلاب جامن تھی۔ ان کے سامنے گلاب جامن کا دو دھرا ہے اور وہ ہائے توہہ کر رہے ہیں۔ ٹھاکر صاحب کی تو ند پر پھبٹیاں کسی جا رہی ہیں۔ میرٹھ کی نوچندی جانے کے پروگرام بن رہے ہیں، چھٹریوں کے سلے کا تذکرہ ہے، سالے بہنوں کی چوٹیں چل رہی ہیں، کیسا پر سکون ان کا معاشرہ تھا۔ مال اس تصویر کو دیکھتا رہا۔ ہم نے کس طرح ان کی نسل سے خود کو بہتر ثابت کیا؟ بے چارے بوڑھو۔ میں تمہارے آگے شرمند ہوں۔ میں تم کو اپنا منہ نہیں دکھانا چاہتا۔ میں اپنا

منہ چھپا کر دور بھاگ رہا ہوں۔ خدا حافظ۔ اس نے گروپ کو آہستہ سے پھر گودام کے فرش پر گرا دیا اور تالہ لگا کر باہر آ گیا۔

دیواروں میں پرندہ بدستور چلائے جا رہا تھا: میں سوتا تھا..... میں سوتا تھا۔

ارے سوتا بھی تھا تو کیا حرج تھا؟ مال نے جھنجڑا کر دل میں کہا۔ جگ رہا ہوتا تب بھی پر جا پتی تھے کون بڑا سکھ عطا کر دیتے مگر پچھتا وے کے احساس اور تو پہنچا سے بھی تو اپنی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ ارے میں پوچھتا ہوں آپ ہیں کون چیز، مال رضا اور سرل بیشلے اور گوم تم نیلمبر؟ جو طرح طرح کی ٹڑڑا کر کھی ہے۔

دلی کے اسٹینشن پر جیجا جی اس کے منتظر تھے۔ ان کے ہمراہ وہ جمنار وڈا آیا۔ لاج ہر آمدے میں کھڑی اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ وہ اس سے پہنچ کر رونے لگی: ”مت جاؤ کمن۔ نزل سور گہاشی ہو گئی۔ شکر سدا باہر رہتا ہے۔ تم پاکستان چلے گئے۔“ روتے روتے لاج و تی کی پیچکی بندھ گئی۔

وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ”کاہے رو تی ہو؟“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”رو وہ متی۔“

اس کی ٹرین شام کو امر تسر جاتی تھی مگر وہ جلد از جلد لاج و تی کے گھر سے بھاگنا چاہتا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ جیجا جی کے ساتھ نئی دلی جانے کے لیے تیار ہوا۔ ”ارے گوم کو تو فون کرو، وہ چندی گڑھ گیا ہوا تھا، شاید لوٹ آیا ہو۔“ جیجا جی نے کہا۔

مال نے بے دلی سے نیلیفون ڈائریکٹری اٹھائی اور اوراق پلٹنے لگا۔ بہت

سے جانے پہچانے نام صفحات پر اسے تھرا آہے۔ مس صولت حسن، فلمر ڈویز،
مس کمل اسپال، نشری آف ایکٹریل افیرز۔

اس نے صفحے پئنے تروا، ہریش چند، نرائن ایم جے، نیلمبر، گوم۔۔۔ اس نے
نمبر ڈائل کیا۔

”ہلو۔۔۔ ارے تم یہیں موجود ہو۔ الو کے۔۔۔ پڑھے“ اس نے بے حد کوشش کر
کے نارمل بشاش آواز میں بات شروع کی۔ ”ابے یار۔۔۔ ہاں ہاں۔ آج ہی
صحیح دہرہ دون سے۔۔۔ ہیں؟ ہاں ڈھا کر سے آ رہا ہوں بذریعہ ریل گاڑی۔
لکھنؤ میں؟ ہاں۔ اپی نے تم کو دعا کہلوائی ہے۔ ہاں۔۔۔ ہاں مزے میں ہیں۔
سب مزے میں ہیں الامیرے۔ کیا کہا میں نے؟ کچھ نہیں میں کہہ رہا تھا میں بھی
بہت لھاٹھ کر رہا ہوں آج کل۔ نام بنام سب کی خیریت بتاؤں؟ پوچھو۔۔۔ قدری
او قمرن؟ بھی وہ۔ تم کو خوب یاد رہے۔ تم کو کون چیز یاد نہیں ہے؟ سب یاد رہے؟
تمہارا حافظہ بہت تیز ہے ماشاء اللہ قدری تو زمانہ ہو امر زاپور واپس چلے گئے۔ موڑ
کب کی بک گئی۔ کیوں بک گئی؟ اجی یہاں زندگیاں ہی بک گئیں۔ تم ایک موڑ
لیے پھرتے ہو۔ تم نہیں بکے؟ ہاں ہاں میں کب کہتا ہوں میں تو اپنی بات کر رہا
تھا۔ قیمت اچھی مل رہی تھی۔ یونہی کا وقت تھا۔“

”اور پوچھو۔ کس کس کی خیریت دریافت کرنا ہے۔ چھٹلی۔۔۔ رم دیا؟ غضب خدا
کا، تم کو چھٹلی اب تک یاد رہے؟ اس غریب کا انتقال ہو گیا۔ ہاں بڑا افسوس ہوا۔
کیسے؟ برسات میں گلفشاں مرحومہ کے باغ کی گھاس کھود رہی تھی، سانپ نے
کاٹ لیا۔ ہاں کئی سال ہو گئے اسے مرے۔ گنگا دین تو آج کل کہیں مدھیہ

پرولیش میں ٹریلر چلا رہا ہے۔ اس نے اپی بتارہی تھیں ایف۔ اے۔ پاس کر لیا ہے ہاں۔ اے اصل ترقی کہتے ہیں۔ میں انگادین کے کیریہ کا احوال سن کر بہت خوش ہوا اور باتیں کروں؟ نہیں میں تم سے مل نہیں ستا۔ مجھے فرصت نہیں۔ ہیں؟ تمہاری کانفرنس تین بجے ختم ہو گی، اس کے بعد تم میرا انتظار کرو گے، اپس میں؟ کیا کرو گے انتظار کر کے نہیں۔ میں کشوڈین سے ملنے جا رہا ہوں پی بلاک۔ اس کے بعد۔ اچھا دیکھو پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ مگر میرا زیادہ انتظار نہ کرتا۔ اچھا سولونک۔“

مال نے تیلیفون بند کر دیا۔ لاج و ق دروازے میں کھڑی تھی۔ ”اچھا ب میں چلا۔“

دلبی ذوق

”تمہارے ناشتے کے لیے کیا کیا بنا دوں۔“

”وہی سب جو ہمیشہ بناتی ہو۔“ وہ ذرا جھنجھلا کر بولا۔ تم یہ اپنا بہنوں کی محبت والا جال پھیلاتی رہو۔ میرا دل اس سے تھوڑا ہی پسیج سکے گا۔ نہ میرے قدم ڈگ گا کیں گے، میں مضبوط ہوں، میں بوڑھا ہوں۔ مجھے میں ضبط اور توازن اور سکون ہے۔ اس نے دل میں کہا۔

وہ جمناروڑ سے نکلا۔ علی پور روڑ، کشمیری گیٹ۔ سینما کے بڑے بڑے اشتہار، لال قلعے کامیدان، دکانیں، نئے نئے بازار، کناث پلیس پہنچ کرو۔ دکانوں میں رکھی ہوتی نئے ہندوستانی مصوروں کی پینٹنگز دیکھتا پھرا۔ برآمدے میں سے

گزرتی ہوئی ایک لڑکی میں اسے سریکھا کی جھلک نظر آئی، وہ ذرا آگے بڑھا، وہ کوئی اور لڑکی تھی۔ اس نے گھری پر نظر ڈالی۔ ابھی تین بجھنے میں بہت دری تھی۔ سارا دن باقی پڑا تھا۔ سریکھا ہی سے چل کر مل لوں۔ اس نے کاہنی سے سوچا۔ ”یہاں ڈانس اکیڈمی کا پتا بتاسکتے ہیں۔“ اس نے ایک آدمی سے پوچھا۔

”کون سی ڈانس اکیڈمی؟ یہاں بے شمار ڈانس کالج ہیں۔ آپ سنگیت اکادمی تشریف لے جائیں، وہاں سے آپ کو شریکتی سریکھادیوی کا پتا معلوم ہو جائے گا۔“ اس نے یہ ارادہ بھی ترک کیا۔ اپنے جانے پہچانے کنٹاٹ ٹپیس میں وہ اجنبیوں کی طرح گھومتا رہا۔ موڑ کاروں، خوشحال، مطمئن انسانوں، مصروف کارباریوں، عظیم الشان دکانوں کے وسط میں کھڑے ہوئے اسے بے حد ڈر لگا۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ جانے سے پہلے اسے سول لائنز کے تھانے میں جا کر اطلاع کرنی ہے کہ وہ ہندوستان سے جا رہا ہے۔

بھادوں کے مہینے کی دھوپ بڑی سخت تھی، وہ بہت مضطرب، بہت تھکا ہوا تھا، وہ چاہتا تھا کہ پر لگا کر کراچی والپس پہنچ جائے۔ اس نے طے کر لیا اب وہ ہندوستان کبھی نہیں آئے گا۔

”وہ دیکھو سامنے سے کون آتا ہے؟“ اس نے ڈاکٹر ہمیں کریم کو دیکھ کر مصنوعی بیٹاشت سے کہا۔ دل میں خوش بھی ہوا کہ پہاڑی دوپہر ان کی سنگت میں کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جائے گی۔

”ہلو۔ ہلو۔ مائی ڈیئر بوانے۔“ ڈاکٹر ہمیں کریم نے بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”کیا عجیب اتفاق ہے۔“

ان کے ساتھ انفرمیشن ڈویژن کی ایک لڑکی تھی۔ اس نے متنات سے مال کے سلام کا جواب دیا اور ایک پہلی سے پنکھا جھلتی رہی۔

”بڑی شدید گرمی ہے۔“ ڈاکٹر ہنس کریم نے خوشی سے باغ باغ ہوتے ہوئے کہا۔

”بالکل خاص شرطی موسم !!“

مال بھی تکلفاً نہسا۔

”میں ڈاکٹر کو قومی میوزیم لیے جا رہی ہوں۔ آپ بھی چلنے اگر آپ کو اور کوئی کام نہ ہو۔“ لڑکی نے، جس کا نام شاید نماری ارونا باجھی تھا، مال کو مخاطب کیا۔ مال نے آنکھیں بند کر لیں۔ اگر زمزماز نہ ہوتی تو آج وہ بھی اسی طرح کام میں مصروف ہوتی۔

”جی ہاں ضرور۔“ اس نے جواب دیا۔

برادی کاسٹنگ ہاؤس سے دو اور یورپین دانشوروں کو ہمراہ لیتے ہوئے وہ راشٹر پتی بھون روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر ہنس کریم اور ان کے ساتھی اسی دنیا کے باسی تھے جس میں مال کچھ عرصہ قبل خود شامل تھا۔ ان کا بھی زندگی سے وسیع تر آوث لک تھا۔ انہیں بھی چیزوں میں رمزیت نظر آتی تھی۔ ان کے پاس بھی علم کے علاوہ اور اک تھا، یہ بدھ جینتی کے لیے ہندوستان آئے ہوئے تھے اور سرینگرے کے ایک ہاؤس بوٹ میں رہ کر ہندوستانی فن سنتراشی پر ایک کتاب لکھ رہے تھے۔ ان سے ملنے کے لیے انہی کی طرح دوسرا ملکی اور غیر ملکی دانشوران کے یہاں جاتے، یہ ہاتھ ملتے جاتے اور فرش پر کشن اور چٹائیاں بچھاتے اور بزر چاء تیار

کرتے اور کپل کا تذکرہ ہوتا۔ ”ابھی میں رائل سکرائٹن سے ملنے کا موڑے گیا تھا۔“ ڈاکٹر کریم نے مال سے کہا۔

”خوب۔“

”مارگ میں میرانیا مضمون ضرور پڑھنا۔“

”ضرور۔“

”تم ملک راج سے واقف ہو۔“

”جی ہاں۔“

پھر انہوں نے دوسرے ناموں کا ذکر شروع کیا: ہمایوں کبیر۔ تارا علی بیگ۔ ڈاکٹر حسین۔ کارل کھنڈالا والا۔ مال موڑ کی کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔

راشٹر پتی بھومن کی بیٹھیوں پر پہنچ کر ڈاکٹر ہمیں کریم نے ہاتھ ملتے ہوئے نظریں اور اٹھائیں اور سونے کے شیروں کے نیچے لکھا ہوا ”سیستہ میوجیتے“ بآواز بلند پڑھا۔ ”بچ جیتے گا۔“ انہوں نے مال کی خاطر اس کا ترجیح کیا اور ذرا کی ذرا آنکھیں بند کر لیں پھر وہ سب ماری ارونا کی قیادت میں اندر داخل ہوئے۔

سابق و ائسر یگل لاج کے عظیم الشان مرمریں ایوانوں میں بے اندازہ خنکی تھی جو باہر کی کڑی دھوپ کے مقابلے میں بہت آرام دہ معلوم ہوئی۔ عہد عتیق اور قرون وسطی کے مجسموں نے مال کو اپنی بے نور آنکھوں سے گھورنا شروع کیا۔ ڈاکٹر ایک ایک مجسم کے سامنے ٹھہر کر فرانسیسی یا جرمیں میں تباہی خیالات کرتے۔ دربار ہال میں وائسرے ہند کے تخت کی جگہ مہا تما بده کا شامدار قدیم مجسمہ ایتادہ تھا۔ اس کے پس منظر میں عنابی رنگ کے مخلیں پر دوں کا آبشار ساگر رہا تھا۔ مال

تحت کی سیڑھیوں پر جا کر بیٹھ گیا۔ چاروں طرف پر لش میوزیم کا ساماحول طاری تھا۔

”یہ تو عارضی میوزیم ہے۔“ اس کے قریب آ کر ماری ارونا نے مذدرت خواہ انداز میں کہا۔ ”ہمارا زیر تعمیر قومی عجائب خانہ ہمارے ورثے کے شایان شان ہو گا۔“

”جی..... یقینا۔“ کمال نے جواب دیا۔ سال پہل قبل وہ خود اسی ولی میں ٹام سے اسی لمحے میں با تمیں کرتا رہا تھا۔ آپ نے ہماری تازہ ترین عمارت دیکھیں؟ ریز رو بنک آف انڈیا..... اور..... اخباروں کے دفاتر کی فلیٹ اسٹریٹ جو بننے والی ہے اور اس کا ہوٹل..... ماری ارونا نے بحثیت ایک فرض شناس انفارمیشن آفیسر اس سے پوچھا۔

”جی۔“ کمال نے اسے یہ بتانے کی ضرورت نہ سمجھی کہ وہ خود بھی یہیں کا رہنے والا تھا۔

”آئیں ادھر چلیں۔ آپ نے ہمارے موہن جوڑا رو کی قدیم تہذیب کی ”ڈانگ گرل“ دیکھی؟“

ماری ارونا سے سنگ مرمر کی گلریوں میں گھماتی پھری چن ہو دارو۔ موہن جوڑا رو وادی سوات۔ ہڑپ۔ تکشلا۔ روپڑ۔ اب ہم موجودہ زمانے کے قریب آتے جا رہے ہیں۔ اس نے ایک جگہ رک کر کہا۔ ”یہ پتھر دیکھیے، یہ اشو میدھ تیسری صدی قبل مسیح میں دہرا دون کے علاقے میں منعقد کیا گیا، یہ ابی چھتر کے مجسمے ہیں۔ ابی چھتر کو اب ضلع بریلی کہتے ہیں۔“ اس نے مذکورہ بھینس کریمر سے کہا

جو اس دوران ان کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

چلتے چلتے وہ ایک عورت کے بھائے کے سامنے آئے۔ archaic وضع کا تھا۔ ”یہ شروعاتی کی کھدائی سے اسی سال بکا ہے۔“ ایک لڑکی کدم کی ٹہنی جھکائے درخت کے تنے سے لگی کھڑی تھی۔ ”سرخ مٹی کی اس مورتی کا سندھ غالباً چوتھی صدی قبل مسح ہے۔“ ڈاکٹر ہمیں کریم نے اپنا مسودہ نکال کر پروفیشنل آرکیاوجشون کے انداز میں اپنے فرنچ ساتھی سے کہا۔

وہ ٹھنڈے فرش پر مورتی کے آگے بینھ گئے۔ مورتی کے نقوش میں قوت تھی، زندگی کی سرخی اور تپش۔ ماورائے حیات کے بجائے حیات۔ زمین کی اپنی تحلیق۔ اس کی بانییں بہت گداز تھیں۔ آنکھیں بہت بڑی بڑی، جسم مضبوط اور سڑوں، خطوط اور جنم اور توازن شامت اور لوچ اور حرکت کے احساس کا مکمل انتزاج، ایک لرزہ خیز حسن پتھروں سے تشکیل ہوا ہے: بھاری، محمد، خوفناک، موسیٰ پورا اول نے ایش کی مانند کہا۔

”فن سگنٹر اشی کے آئندہ نظریوں کی داغ بیل یہیں سے پڑی۔“ ڈاکٹر کریم نے کہا۔ ”متحرا سے پہلے کا نمونہ ہے۔ اب ہمیں اس فن کی تاریخ کے متعلق بہت سی تھیویریز کو بدلانا پڑے گا۔“

”اس عہد کے فن کاروں کے سامنے یہ مسئلہ رہا ہوگا کہ خیالِ محض علامت کے ذریعے دیکھنے والے تک پہنچایا جاستا ہے۔ اسی نظریے نے ویدوں کے عہد کے بعد اضام پرستی کی ترویج کی۔“ ارونا نے اظہارِ خیال کیا۔

روپ اور اروپ اور بھاؤ اور ابھاؤ کے متعلق وہ جو کچھ جانتا تھا اب وہ کس سے

کہنے جائے گا۔ اس سارے علم کا اسے اب کوئی فائدہ نہیں۔ مال نے سوچا۔ اس حیرت انگلیز مورتی کے پاس اس کے لیے کوئی پیغام نہیں۔

”ویدانت کے نزدیک خالق جمالیاتی تحریر غیر متعلق آندہ ہے۔“ ڈاکر راول نے کہا۔ ”بھل کی طرح اکھنڈ ہے۔ اسے تقسیم نہیں کیا جاستا۔ خود ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی سوپر کاش ہے۔ جس طرح فن کار کا اتصورو شوا کرمن کے اتصور میں شامل ہے اسی طرح دیکھنے والا آتمایا خود میں موجود ہے جو ہر وقت دیکھتا ہے اور جس کا سروپ ساری کائنات کا مظہر ہے۔ وشو ا روپ روپم روپم پرتی روپ۔ تمہارا کیا خیال ہے ویدانت کے اس نظریے کے متعلق؟ تمہیں یہ مجسمہ اچھا لگایا تم متحرک کے اشائل کو ترجیح دو گے؟“ ڈاکٹر موصوف نے مزکر مال سے پوچھا۔

”بیھو۔ شتم ناپرتو بھاتی کم چت۔ (بھو کے کو کوئی شے اچھی نہیں لگتی) میں جمالیات اور ماعبد الطیوریات کی موشنگا فیاں کرنے سے قاصر ہوں۔“ اس کی آواز کی بے پناہ تخلیٰ اور ادا سی نے سب کو چونکا دیا۔

”یہ کیونک ہے۔“ ڈاکٹر آئیورٹ نے طے کیا۔ اس کے فرثیریشن کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ ماری ارونا نے سوچا جو امریکہ سے نفیات میں ڈاکٹریٹ کر کے آئی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر مال کو دیکھا اور سوچا۔

پڑھا لکھا لڑکا ہے اور کتنا خوش شکل۔ ”آپ منسکرت بھی پڑھ چکے ہیں۔“ اس نے تو سیفا پوچھا۔

”پڑھی تھی ایک زمانے میں۔“ مال نے مختصر جواب دیا۔

پھر اس نے گھڑی دیکھی۔ کشوڈین سے ملنے کا وقت قریب آ رہا تھا۔

وہ مورتی کے چبوترے پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مورتی کا پھر خنک تھا۔ پھر جو timeless become کی علامت ہے۔ حال کا بہاؤ اس قدر تیز ہے کہ جو پتے پچھلے کاپوں سے بہتے ہوئے آ رہے ہیں، وہ اب ان کی دلدل میں پھنس گئے ہیں اس نے دل میں سوچا۔ جبھی سے تو میں کہتا ہوں، ایک ک DAL لے کر ان پتوں، اس کوڑے کر کٹ کی صفائی کرو۔ آج تک میں صفائی میں لگا ہوں: دماغ کی، دل کی، ذہن کی، عقل کی صفائی، اسپرنگ کلینگ۔ اس ماضی سے میں ناطہ توڑ چکا ہوں۔ اس نے ان یورپین ماہرین کو بتانا چاہا، پھر وہ مورتی کی طرف مڑا۔ اسی لیے، شرودستی کی سدرشن پیششی! جو کوئی بھی تیراہنا نے والا تھا وہ اپنا پیغام مجھ تک نہیں پہنچا سکتا۔ تیرا خالق اب مجھ سے کیوں کیٹ نہیں کرے گا۔ میں روپ اور اروپ کی بحث میں حصہ لینے سے انکار کرتا ہوں، یہ قومی عجائب خانہ مع سارے ماضی، سارے ہندوستان کے میں نے ماری ارونا کوسونپا، وہ وہاں سے آگے بڑھا اور آہستہ آہستہ آگے چلتا ہوا گلیری عبور کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے کانوں میں یورپین دانشوروں کی آواز آتی رہی۔

”کاش ہم جان سکتے کہ سگتر اش کا نام کیا تھا جس نے یہ مورتی بنائی۔ مگر اس عجیب و غریب ملک میں تاریخ کی کوئی حیثیت نہیں۔“ ڈاکٹر کریمہ کہہ رہے تھے۔ ”واقعات کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ حقیقت روایت ہے۔ وقت کا فاصلہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ لمحہ لا فانی ہے۔ انسان گمنام ہے، اس کی تخلیقات، فن پاروں، تصنیفات کی بھی ابدیت کے اس سمندر میں کوئی عیحدہ حیثیت نہیں سمجھی جاتی۔“

”ہاں۔“ موسیپوراول نے کہا۔ ”انسان مر جاتا ہے تو اس کو جلا دیا جاتا ہے کیونکہ اس کی تاریخی معنویت کچھ نہیں۔“

”کوئی کر اس ہندوستانی ذہن پر اثر انداز نہیں ہو سکتی کہ اس بھی وقت بھی شامل ہے، تاریخ نہیں ہے۔ ماضی، مستقبل، فنا، بقا..... کسی شے کا وجود نہیں لہذا اب اس جسم کو جلا دو کیونکہ یہ اب حال میں شامل نہیں رہا۔“ ڈاکٹر اسٹیوارٹ نے کہا۔

”ای لیے مشرق کے فن کارنے اپنا نام ثبت کرنے کی ہدودت کبھی نہ سمجھی۔ کاش ہم ان سنگتراشوں کے متعلق بھی کچھ جان سکتے۔“ ڈاکٹر کریمر نے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔ ”یہاں لتنے مانگل انجلو اطمینان سے بھی خوشی گناہ مر گئے؟؟“ مال گیلری سے باہر نکل آیا۔

”یہ احساس کہ ہم خود وقت ہیں۔“ موسیپوراول کہہ رہے تھے۔ ”وہ سوت کو محسوس کیا جاتا ہے۔ وقت کو صرف سوچا جاستا ہے۔“ ڈاکٹر کریمر کہہ رہے تھے۔

مال سیڑھیاں اتر کر باہر سرخ بھری کی چوڑی شرک پر آگیا اور پی بلاک کی طرف روانہ ہو گیا۔

کسٹوڈین سے دماغ کھپانے کے بعد وہ گوتم نیلمبر سے ملنے والیں نہیں گیا، وہ سید حالاج کے گھر پہنچا اور اس نے لاج سے کہا، اگر میرافون آئے تو کہہ دینا میں ابھی واپس نہیں آیا ہوں، پھر وہ کمرے کا دروازہ بند کر کے اسٹیشن جانے کے وقت تک پڑا سوتا رہا۔

گوتم ایک گھنٹے تک ریسُوران میں مال کا منتظر رہا۔ اس نے کئی جگہ سیلیفون کیے، جب مال کی طرف سے بالکل نا امید ہو گیا تو پھر اپنے فتر لوتا۔ بدھ جینیتی کے سلسلے میں حکومت بڑے زوروں کی پلٹی کر رہی تھی اور اسے چراغ جلتے تک فتر میں مصروف رہنا پڑتا تھا۔ ایک انتہائی ضروری اور فوری فائل کے سلسلے میں اس نے اپنی نمبر نوماری ارونا با جپی کوفون کیا۔

مگر معلوم ہوا کہ ماری ارونا با جپی ڈاکٹر کریم کو لے کر نیشنل میوزیم گئی ہوئی ہیں۔

لاحوال والا قوتہ! اس نے غصے سے کہا۔ مال سے نہل سکنے کی وجہ سے وہ بے حد مضھل تھا۔ اسے اس ملک پر اپنے آپ پر، مال پر، دنیا کی ہر چیز پر غصہ آ رہا تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو ڈاکٹر کریم اور ڈاکٹر اسٹیوارٹ اور ماری ارونا با جپی..... ان سب کو کجا جباڑا تھا۔

فائل بے حد ضروری تھی اور اسی جلد از جلد ملکے کے جوانیت سیکرٹری کو پہنچانا تھا، وہ کار میں بیٹھ کر راشٹر پتی بھون پہنچا۔ میوزیم کے اندر جا کر اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں مگر وہ لوگ وہاں سے جا چکے تھے۔ بے دھیانی سے وہ کمروں میں گھومتا رہا۔

ایک سورتی کے سامنے انفرمیشن ڈویژن کے پمفلٹ پڑے تھے جو شاید ڈاکٹر کریم پہاں بھول گئے تھے۔ گوتم نے جھک کر وہ اٹھائے، پھر اس نے بے دھیانی سے سورتی کو دیکھا۔ شراویتی کی سدر شن پکشنا۔

اس کی شکل بھیا کیسی تھی؟ اس نے دھناتا سوچنا شروع کیا، پھر اس نے غصے

سے چلتے چلتے مرمریں فرش پر ذرا زور سے پیر پڑے۔ تم بھتی کیا ہوا پنے آپ کو میں نے تمہیں بھی کچھ بھی نہیں سمجھا۔ میں تو تمہاری شکل بھی بھولتا جا رہا ہوں۔ شکل تو محض ہیولی ہوتا ہے۔ میرے دل کے اندر جو روپ محفوظ ہے اسے صرف وشو اکرمؑ ہی پہچان سستا ہے۔

مورتی، جو شراویتی کی کھدائی میں برآمد ہوئی تھی، کدم کی ثہنی جھکائے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اسے دیکھا کی۔ گوتم نے اس کے قریب جا کر اس کے چہرے کو چھووا۔ archaic سنتراشی کا اچھا نمونہ ہے، اس نے دل میں کہا۔ کلھرل پلٹی شی کے رسائل میں اس تازہ دریافت کے متعلق ایک مضمون ہو جانا چاہیے۔ اس نے ایک مستعد اور فرض شناس پلٹی شی ایکسپرٹ کی طرح سوچا، پھر باہر نکل آیا۔

شام پڑے مال لاج کے گھر سے اشیش کے لیے روانہ ہوا۔

”ابھی ٹرین میں دیر ہے۔ آؤ تمہیں گھملا کیں۔“ جیجا جی نے تجویز کیا۔ ”تم دن بھر گھام میں مارے مارے پھرے ہواب تازہ ہوا کھاؤ گے طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔“ وہ پیاری پر گئے۔ حد تلوٹک نہیں بستیوں کی روشنیاں تیزی سے جگدا رہی تھیں۔ پیلی نگر آزادگر، قرولباغ، رنج کے علاقے میں کالجوں کی دنیا میں چہل پہل تھی۔ یونیورسٹی، میر انڈا ہاؤس، سینٹ اسٹیونز، بے شمار نئے کالج بن گئے تھے۔ پروہاں میں بڑے غام علی خاں کا کونسرٹ ہو رہا تھا۔ ایک تھیز میں ہیر رانجھا کا اوپیرا دکھایا جا رہا تھا۔ آرت گیلریوں میں نمائشیں منعقد ہو رہی تھیں۔ بڑی بڑی دکانوں پر ساریاں پہنے، جوڑے باندھے سیلز گرل باوقار انداز میں سامان فروخت کر رہی تھیں۔ برلامندر کے سامنے ہجوم تھا۔ اوپر سنگ مرمر کے

فرش پر جگہ جگہ لوگ منہ کے بل پڑے ہوئے تھے۔

لکشمی نرائن کی بھدی، بد ذوق، خالص مڈل کلاس بنیا مورتیاں پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے کو دیکھ رہی تھیں۔ اور پر گیتا بھون میں ہار مونیم پر کیرتیں ہو رہا تھا، چاندنی کے فرش پر مڈل کلاس عورتوں اور مردوں کی بھیز تھی۔ جامع مسجد کے سامنے شکستہ حال مسلمان اپنی دکانیں لیے بیٹھے تھے۔

”دلی دنیا کے خوبصورت ترین دارالسلطنتوں میں سے ہے۔“ کار میں اس کے پاس بیٹھی ہوئی لاج خوشی سے کہہ رہی تھی۔ ”کل امریکن نیروں کی بیوی روشن آراء کلب میں مجھ سے کہہ رہی تھی کہ یہ تو واشنگٹن کی طرح خوبصورت ہے اور ٹوکو کی طرح ترقی یافت۔۔۔ اور پرانی دلی کو دیکھ کر لندن کی گلیاں یاد آتی ہیں۔ تم تو دنیا گھوم آئے ہو، ٹھیک ہے یہ بات؟“

راج گھاٹ میں لوگوں کے غول ہوا خوری کر رہے تھے۔ فوارے چل رہے تھے ایک بوڑھی عورت گاندھی جی کی سماڈھی کے سامنے بجدعے میں پڑی تھی۔

ٹرین کا وقت ہو گیا، وہ لاج اور جیجا جی کو خدا حافظ کہہ کر کمپارٹمنٹ میں بیٹھا۔ ٹرین آہستہ آہستہ اسٹیشن سے باہر نکلی۔ جتنا کاپل۔ لال قلعے کی دیواریں۔ بازار۔ سڑکیں۔ مکانات۔ وہ کھڑکی میں سے دیکھتا رہا۔ وہ جا رہا ہے۔

براؤ کا سٹنگ ہاؤس کے زینے پر رکھا ہوانٹ راج کا عظیم الشان مجسمہ۔ جامعہ نگر۔ نظام الدین اولیاء۔ متحرار وڈ۔ سب یہیں رہ جائے گا۔ زندگی جاری رہے گی۔ ایک آدمی کے نکل جانے سے کوہی فرق نہیں پڑتا، یہ لوگ اب مختلف تھے۔ دوسرے راستے پر جا رہے تھے، ان کے اور مال کے پاس اب کوئی موضوع

مشترک نہیں۔ اے اب ان سے کوئی غرض نہیں، وہ بھی اب مال کی غیر موجودگی کو محسوس نہیں کریں گے۔

پر لیس کلب میں دنیا بھر کے اخباروں کے نمائندے جمع تھے۔ اول سجا میں پنڈت نہر و تقریر کر رہے تھے۔ جامعہ نگر میں اردو ڈرامے پر لیسرج کی جا رہی تھی۔ للت کلامندر میں سریکھادیوی رقصان تھیں۔

موسیقی۔ تھیز۔ موویز۔ ڈوکومنٹری فلمز۔ بچوں کے تھیز اور ہسپتال۔ عورتوں کی یونیورسٹیاں۔ فیشن شوز۔ بیلے یونیورسٹیوں کی ایئر کنٹل یونیورسٹیاں۔ دوسرے پانچ سالہ پلاٹ کے بلیو پ رفت۔ بھاری ائٹشری۔ انلاس۔ سو شلسٹ ائٹش۔ نئی دلی کے انہائی پوش ریستوران۔ امپریل دلی۔ سو شلسٹ دلی۔ ضلعوں کی گلکھڑا اور ڈسٹرکٹ محکمہ ریٹ خواتین۔ سادھو اور بھکاری۔ بجلی کی روشنی سے جگدا تے ہوئے قبے اور گاؤں۔ بھوداں کی تحریک۔

قدیسہ باغ، روشن آراء باغ اور بیلا روڈ پر ٹھنڈی ہوا میں چلی رہی تھیں۔ اولڈ سول لائنز کی کوٹھیوں میں پھول کھلے تھے۔ ان کے گھاس کے قطعوں پر پرانے زمانے کے کامستھ خاندانوں کے چند افراد بیٹھے طبا طبا کی کی شاعری پر تادله خیالات کر رہے تھے۔

میشن فریکل لیبارٹریز کی عظیم الشان ایئر کنٹل یونیورسٹی میں سے سائنس دان اٹر کیاں سرعت کے ساتھ نکل کر امراء اماؤن سیلف سروس کیفے ٹیریا میں داخل ہو رہی تھیں۔ نئی دلی میں آں آں ائٹیا مشاعرہ ہو رہا تھا۔ روشن آراء کلب کے وسیع لان پر پنکھوں کے نیچے چند اعلیٰ عہدے داروں اور سینئھوں کی ڈیباں تاش کھیلے

میں مصروف تھیں۔

ٹرین اب کھیتوں میں آگئی ہر سفر میں بڑی معنویت ہے۔ ہمارا ادھر سے ادھر جانا۔ ایک مرتبہ گوم نے کہا تھا جب وہ بقول طاعت خلیل جبران کے المصطفیٰ کی طرح مکالے ادا کیا کرتا تھا۔

ہندوستان کا سارا اسی سفر ہے۔ چلتے رہنے، تلاش کرنے کی عادت شاید اپنے نگلو نے لکھا تھا۔ اس نے راواح کرشمن کی کتاب اخہانی:

”ہندوستانی فلسفے میں کوئی کسی کو حکم نہیں دتا: یہ ضرور کرو یا یوں تم کو کرنا پڑے گا۔

یہاں انسان اپنے فعل کو خود مختار ہے۔“

اس نے کتاب کھڑکی سے باہر پھینک دی اور سیٹ پر لیٹ گیا۔

پنجاب کے انشیش گزرتے رہے۔ انبالہ، لدھیانہ، امرتسر، دیواروں پر اردو میں فلموں کے اشتہار لگے تھے۔ پلیٹ فارم کے دھلے ہوئے فرش پر سکھ عورتوں کی رنگیں شلواریں رات کی روشنی میں جھلما رہی تھیں۔

صحح ہوئی۔ ٹرین امرتسر پہنچ رہی تھی۔ جگہ جگہ مسلمان پیروں کی زیارات تھیں جو سنسان پڑی تھیں۔ سکھ عورتوں کے غول پگڈا ڈیوں پر سے گزر رہے تھے۔ سکھ ہوا ہے کھیتوں میں پہنچ چکے تھے۔ جگہ جگہ اب بھی مکان جلے ہوئے پڑے تھے۔ امرتسر کے پلیٹ فارم پر شکستہ حال بر قعہ پوش عورتیں اور بوڑھے سلاخوں کے ادھر ویزا پر دستخط ہونے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ ایک موٹا سکھ افسر ایک غریب مسلمان عورت سے درشتی سے پوچھ رہا تھا: ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”ایمنہ، یہ میری بیٹی سکینہ ہے، یہ پاکستانی ہے۔ میں خورجے سے اسے لینے آئی ہوں۔ اس کا باپ مر رہا ہے۔“ پاکستانی سکینہ اپنی بھارتی ماں ایمنہ سے علیحدہ، سلاخوں کے اس پارکھڑی، سہمی نظروں سے افسر کو دیکھ رہی تھی۔ ”اس کا وی جا ٹھیک ہے نا۔“ ماں پر امید آواز سے پوچھ رہی تھی۔

ٹرین چلی۔ دونوں طرف کے سپاہی ڈبوں میں چڑھے۔

یا کا یک دہرا ملک شروع ہو گیا۔ دوسرا جی گھاس پر کھڑے پہرا دے رہے تھے۔

میں اب پاکستان میں ہوں۔ ہندوستان سے آیا ہوں۔ مهاجر۔ یو۔ پی کامسلمان۔

مهاجر..... پناہ گزین..... بے خانماں۔

جب ٹرین نے بارڈر کراس کیا تو وہ، جو اتنے ڈبوں سے اپنی ساری ہمت صرف کر کے اپنے آنسو ضبط کر رہا تھا، کھبے کے پاس ایک سردا جی کو کھیسیں نکالے، بندوق تا نے کھڑے دیکھ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کا ہم سفر، جو پولیس کا افسر تھا اور امرتر سے واپس جا رہا تھا، اسے غور دیکھ رہا ہے۔

مال بہت پشیمان ہوا اور اسے لگا جیسے پولیس افسر کہہ رہا ہے: تم اب تک دو مقضا دو فادار یوں کے دورا ہے پر کھڑے ہو، لعنت ہو تم پر۔

اسے محسوس ہوا جیسے ساری دنیا کی آنکھیں اس کی طرف لگی ہیں۔ تم ہندوستانی ہو، ہندوستانی جاسوس۔ ٹرین کے پہیوں میں سے بھی یہی آواز نکل رہی ہے،

جاسوس۔ غدار۔ جاسوس غدار۔ اس نے ہڑپڑا کر آنکھ کھولی۔ ٹرین آہستہ آہستہ
لاہور ائمپشن کے کشم کی سلاخوں والے حصے میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کا دل
دھڑک رہا تھا۔

لاہور سے وہ ہوائی جہاز میں بیٹھا۔ ہوائی جہاز نے کراچی کی طرف پرواز کرنا
شروع کر دیا۔

اب اس کی نئی زندگی اس کے سامنے تھی۔ اس نے ڈائری نکالی۔ کراچی واپس
پہنچ کر اسے کتنے ضروری کام کرنے تھے۔ چچا نلاں سے کلیم کے متعلق سفارش کرانا
تھی۔ کوئی کے لیے بلیک سے یہ نہ اور لوہے کا انتظام کرنا تھا۔ مسٹر ایکس کو جم
خانہ میں ایک پارٹی دینا تھی۔ بتاؤ میں کہاں جاؤں، اس نے خود سے سوال کیا۔
خراب، انحطاط پذیر سوسائٹی میں انسان کا شریف رہنا کہاں تک ممکن ہے؟ اس
مسئلے پر سوچنے کی ضرورت تھی۔ اس نے ائمپر ہوٹس سے پھر کافی منگوائی اور ڈان
اخبار اٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔

کابینہ میں کرنسس۔ وزیر اعظم کا استعفی۔ نئے وزیر اعظم کا جہانگیر پارک
میں ملت سے خطاب۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ آسمان پر بادل تیزی سے
چھلنے لگے۔ کوئی دم میں بارش شروع ہو جائے گی۔
اس نے کھڑکی کا پردہ برداشت کر دیا۔

میں ہی لاش ہوں اور میں ہی گور کن اور میں ہی نوحہ گر۔ اس نے دل میں کہا
اور سید کی پشت سے سر نکال کر آنکھیں بند کر لیں۔

کجی سڑک پر لڑکا نیل گاڑی ہائکتا ہوا جا رہا تھا۔ ایک آشیش ویگن دھوکا چھوڑتی، دھول اڑاتی ایک دھپکے کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ سامنے ایک نیل گاڑی اور آ رہی تھی۔ گاڑیاں نے نیل کی دم مردوڑ کر موڑ والوں کو ڈانٹا۔ ”دکھ کر نہیں چلات ہو موڑیا۔ ابھی جو ہمرا نیل چمک جائیت۔“ امریکن اخبارنویس نے فوراً کیسرہ نکال کر اس کی تصویر لے لی۔ پیچھے پیچھے ایک اور موڑ آ رہی تھی۔ اس میں بیٹھی ہوئی مسز راج واڑے نے منڈیا نکال کر جھانا کا اور پھر لیڈی مکلیش ورماءے باتوں میں لگ گئیں۔ شرواستی ابھی بہت دو رہتا۔ سورج با دلوں میں چھپا جا رہا تھا اور بارش سر پر کھڑی تھی۔ ڈاکٹر راول نے اگلی آشیش ویگن میں بیٹھے ہوئے ماری ارونا بانچی سے پھر کچھ پوچھنا چاہا۔ اس نے فوراً ڈبلیکیشنر ڈویژن کی کتابوں کا بندل ان کی تاک میں ٹھونس دیا اور سوالات سے بچنے کے لیے ٹنڈ میں جٹ گئی۔ تیسرا موڑ میں لانکا اور جاپان کے چند بھکشوں دے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ی فلز ڈویژن کا کیسرہ میں تھا۔ دو تین کسان لڑکیاں منڈی پر کھڑی اس قافلے کو دیکھتی رہیں پھر ارہر کے کھیت میں کو دکر کام میں لگ گئیں۔ دوسری طرف ڈیکٹر چل رہے تھے۔ سامنے کی موڑ میں بیٹھے ہوئے چند نوجوانوں نے جن گن من گانا شروع کر دیا پچھلی سیٹ پر زور سے با تین ہو رہی تھیں۔ اس سارے ہنگامے سے بے نیاز گوم نیلمبر نے، جواب تک موڑ چلا رہا تھا، مڑ کر ماری ارونا بانچی سے کہا:

”اگر وہیں تم لے لو تو میں یہاں سے اتر کر پیدل اپنے گھر چلا جاؤں۔“

”کیا بہت بور ہو گئے؟“ ماری ارونا نے پوچھا۔ اسے خود سفر کی تکان کی وجہ سے نیندا آ رہی تھی۔

”ہاں میں یہیں سے کھیتوں کھیتوں نکل کر چلا جاؤں گا، شارت کٹ سے۔ ذرا جا کر نہاد ہو کر آ رام کرلوں۔ صبح سے پھر یہ سارا سلسہ شروع ہو جائے گا۔ موسیبو راول اگر آپ اجازت دیں۔“ اس نے فرنچ مصنف کو میا طب کیا۔

اس نے موڑ روکی اور اتر کر منڈیر پر کھڑا ہو گیا۔ موڑیں ایک ایک کر کے دھول اڑاتی آگے نکل گئیں۔ وہ کچھ دیر و ہیں کھڑا رہا۔ بارش کا ایک قطرہ ٹپ سے اس کے بالوں پر آن گرا۔ اس نے ہاتھ پھیلا کر ہوا کوسونگھا اور ارہ کا ایک ڈھنڈل توڑ کر پگڈھڑی پر چلنے لگا۔

مینہ بر سنا شروع ہو گیا۔ اس نے پھوار سے بچنے کے لیے آم کے ایک گھنے جھنڈ میں پناہ لی۔ درخت کی جڑ پر بیٹھ کر وہ دیر تک ہوا اور پتوں کے سنگیت سنا کیا۔ آدھ گھنٹے بعد اس نے پھر اپنا راستہ طے کرنا شروع کیا۔ حد نظر تک کھیت لہلہہار ہے تھی۔ شہر ابھی بہت دور تھا۔

گومتم نیلمبر نے چلتے چلتے ٹھہر کر پیچھے دیکھا۔ راستے کی دھول بارش کی وجہ سے کم ہو چکی تھی گواں کے اپنے پاؤں مٹی سے اٹے تھے۔ بر سات کی وجہ سے گھاس اور درخت زمرد کے رنگ کے دھکلائی پڑ رہے تھے۔ اسوک کے نارنجی اور سرخ پھول گہری ہریاں میں تیزی سے جھملاتے تھے اور ہیرے کی ایسی جگمگاتی لڑیاں گھاس پر ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئی تھیں۔ گھاث پر کشتیاں کھڑی تھیں اور بر گد

کے نیچے کسی میں چلے ملاج نے زور زور سے ساون الابنا شروع کر دیا تھا۔ آم کے جھرمٹ میں ایک اکیلا مور پر پھیلائے کھڑا تھا۔ وہرے کنارے پر دریائی گھاس اور نیلے پھولوں کی گھنی بیلیں پانی کی سطح پر جھک آئی تھیں۔ بر گد کے سامنے تاریک ہو چلے تھے۔ سارس اور مور سمنے سمٹائے اوس کھڑے تھے۔ چار پانچ آدمی انگوچھے کندھے پر ڈالے جلدی گاؤں کی اور قدم بڑھتا رہے تھے۔

بہراج کے مضافات شروع ہو گئے۔ سول لائنز کی سایہ دار سڑک پر پہنچ کروہ اپنے باپ کی زرد رنگ کی دو منزلہ کوٹھی میں داخل ہوا۔

اس کے بابا سر دیپ نرائن لان پر ٹھیل رہے تھے۔

”ہلو بیٹے۔“ انہوں نے کہا۔ ”میں سمجھتا تھا۔ تم غیر ملکی مہمانوں کو لے کر سیدھے سہت مہت چلے گئے۔“

”بھی نہیں بابا۔“ اس نے جھک کر ان کے پیر چھوتے ہوئے کہا۔ ”پہلے راستے میں ان کو ہم فارم دکھانے لے گئے تھے۔ ان لوگوں کو سوائے فارم دیکھنے اور کافرنیسیں اٹینڈ کرنے کے اور کوئی کام نہیں۔ ایک مہینے سے مجھے سر کھجانے کی مہلت نہیں۔“

”تمہاری ڈاکٹر بانچی تو بڑی قابل بڑکی ہے۔ وہ ان کو سارا ڈوب دے رہی ہو گی۔“

”بھی۔“

پھر وہ اندر جا کر اپنی ماں سے ملا۔

”دینیتی بوآ کہاں ہیں؟“ اس نے غسل خانے میں نہاتے ہوئے آواز دی۔

”شہر میں، ان کے پاس بھی ہو آنا۔“

”بھی اچھا۔“

”تم اچھی طرح ہو بیٹھے۔“

”بھی ہاں، بچن کا بیاہ کب ہو رہا ہے؟“

”اگلے چھاگن میں۔“ ماں نے جواب دیا۔

”پر کاش چاچا کی کوئی بھی بیان گئی۔“

”نہیں۔ وہ خان بہادر محمد حسن، نہیں تھے، ریٹائرڈ نج۔ وہ پاکستان چلے گئے،
ان کی کوئی نیلام ہو رہی تھی۔ وہ پر کاش نے لے لی، بہت سستی مل گئی۔“

غسل خانے سے نکل کر کھانے کی میز پر بیٹھتے ہوئے اسی طرح کی دوچار اور
گھر بیویاں میں لیدی دیپ زائن سے اس نے کیس پاکستان کے نام پر اس کے
ذہن کے تاریخ پڑھنا شروع کیا۔ پاکستان کو تو وہ ہمیشہ بھلانے رکھتا تھا حالانکہ ابھی اسے
شراؤستی کے ان مغربی زائرین کو شیر کا مسئلہ بھی سمجھانا ہو گا۔

اس کا دم بے طور گھبرا نے لگا۔ اس پر وہی وحشت طاری ہو گئی جس نے چند
روز قبل اسے نئی دلی میں آنا دیا چاہا۔

”میں ذرا ہوا کھانے دریا تک جاتا ہوں۔“ اس نے اپنی ماں سے کہا۔

”ابھی تو اتنا میسا فرطے کر کے آ رہے ہو، اب پھر چل دیے۔ لیت کر آ رام
کرو۔“ ماں نے پریشان ہو کر کہا۔

وہ باہر نکل آیا اور اپنے باپ کی کار لے کر دریا کی طرف چل دیا۔ بارش ختم ہو
چکی تھی اور ہوا بند تھی۔ دریا کے کنارے پہنچ کر وہ ایک شکستہ مندر کی سیڑھیوں پر جا

بیٹھا۔ یہاں مکمل تہائی تھی اور وہ بالکل خالی الذہن ہو جانا چاہتا تھا۔ اس لمحے سے زندگی میں پہلی بار خیال آیا: کاش نروان ممکن ہوتا۔ خوف، تہائی کا احساس، رنج، نفرت، فرار کی خواہش، وسعت اور اضافیت کا تصور..... نروان..... جو زندگی سے، موت سے، سونے جانے، محبت، رحم اور لاقلقوں سے ماوراء ہے اور پھر بھی حقیقی ہے۔ معدومیت..... صفر..... صفر.....

کیا یہ غیر ملکی مثکرین سمجھ سکتے تھے کہ اس کے، ہندوستان کی روح کے دکھ کیا ہیں؟ اس نے سگریٹ سالگایا اور مندر کے فرش پر نیم دراز ہو گیا۔ برسات کا زمانہ ہے، یہاں سانپ اور کیڑے مکوڑے ضرور ہوں گے۔ اس نے اطمینان سے سوچا۔ اسے لگا گویا جنگل سے اس کی بہت پرانی دوستی ہے۔ آخر وہ انہی فضاؤں، انہی پودوں اور درختوں کی معیت میں پلا برہ حاصل۔
دفعہ اسے پیروں کی آہٹ اور کسی کی مدھم بھی کی آواز سنائی دی۔

”تم کون ہو بھائی۔“ نیچے سے کسی نے پوچھا۔

”میں ہوں۔“ گوتم نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔

دوسرا نوجوان مندر کی منڈپ کو دکر اندر آ گیا۔

”یہ کیا وحشت ہے؟ میں تم کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔ تمہارے گھر گیا۔ تمہارے اماں ابا نے بتایا کہ تم دریا پر برائج رہے ہو۔“

”ہاں یا ر۔ اس وقت غیر معمولی جس طاری ہے۔ ایک پتا تک نہیں بل رہا۔

تمہارا دن کیسا بیتا۔“

”بور ہو گئے میاں۔“ ہری شنکر نے قریب کی سیڑھی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”یہ

بدھا جنہی کچھ دن اور اسی طرح چا اور ہی تو استعفیٰ مرا با حسرت و یاس۔ دیکھو اسی چکر میں میں لکھنونہ جا سکا۔ بنگلور سے جے۔ ایس کا تاریخ ملتے ہی پہنچا دلی اور اب یہ یا تری لوگ، ارونا بانچئی کہہ رہی تھی کہ یہاں سے سیدھے کپل وستو اور گیا جانے پر تسلی بیٹھنے ہیں۔ راستے بھر ڈا کمپ نیمس کریم نے مجھے مہایانا اور زین کے فری پروہ وہ تکھر دیے ہیں کہ پڑا ہو گیا میرا۔ تمہاری موڑ میں تو صرف موسیبوراول ہی تھے۔“

پھر یک بیک وہ چپ ہو گیا۔ ندی پر شفق کی سرخی پھیل گئی تھی۔ وہ دونوں بے حد اداس ہو گئے۔

”یار گوتم۔“

”ہاں۔“

”یار مال ہمیں دغادے گیا۔“ ہری شنکر نے چند لمحوں بعد آہستہ سے کہا۔ ”تم کو پتا ہے سالا دلی ہوتا ہوا گیا۔ اگر مجھے تاریخے دیتا تو میں اس سے آکر وہیں مل لیتا۔“

”میں تو دلی میں موجود تھا اس کے باوجود وہ مجھ سے نہیں ملا۔“ گوتم نے آہستہ سے جواب دیا۔ وہ دونوں پھر چپ ہو گئے۔

”جانے اس وقت وہ کہاں ہو گا؟“ ہری شنکر نے تاسف سے کہا۔

”کراچی میں ہو گا اور کہاں ہو گا۔“ گوتم نے نیچی آواز میں جواب دیا۔ وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ سیڑھیاں اتر کر وہ ندی کے کنارے آئے اور پانی کو دیکھتے رہے۔ شاید وہ دونوں اسکٹھے سوچ رہے تھے کہ ابو المنصور مال الدین کس

طرح ہندوستان میں داخل ہوا تھا اور کس طرح ہندوستان سے نکل گیا۔

ندی روائی۔ وہ دونوں جھک کر اس میں اپنا عکس دیکھنے لگے۔ گوتم نے ایک کنکر پانی میں پچینکا اور لہروں کا دائرہ وسیع ہوتا گیا جس میں ان دونوں کے عکس پھیل سے گئے۔

گھاٹ سے کچھ فاصلے پر کمیونٹ پروجیکٹ کے سفتر میں روشنی ہو رہی تھی۔ لوک گیت منڈلی نے سالانہ یو تھ فیسول لیے کے اپنی پریکٹس شروع کر دی تھی۔ ان کی آوازیں تیرتی ہوئی ان دونوں تک آ رہی تھیں۔ دور گاؤں کی چوپال میں نوٹنگی ہو رہی تھی۔ آم کے جھنڈ کے باہر آ لہا اول گایا جا رہا تھا۔ کانگریس کمیٹی کے فائز میں ایکشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دور مسلمانوں کے محلے میں پنڈال لگے تھے اور گیس کے ہنڈے نصب تھے اور شاید میا اد شریف پڑھا جا رہا تھا۔ آگے سول لامبز میں ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی میں یورپین مہماں ڈنر کھار ہے تھے۔

گوتم نے ایک لشی ہوئی نا اور پیر ہنکار کر آنکھیں بند کر لیں پھر اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ ندی کے کنارے اکیلا کھڑا تھا۔ ہری شنکر کسی کسان سے باتمیں کرتا کمیونٹ پروجیکٹ سفتر کی طرف جا چکا تھا۔ بادل اب دریا پر بہت نیچے جھک آئے تھے۔

اس نے اپنے تھک ہوئے پاؤں کو دیکھا، بڑھتی ہوئی تاریکی پر نظر ڈالی لیکن ڈرنے کی کیا بات تھی! وہ زمین کے ساتھ تھا۔ زمین اس کی ماں تھی۔ زمین اس کا ساتھ دے گی۔

اس نے آگے چلنا شروع کیا۔

گھاس کی بھینی خوشبو، پھروں کی خنکی اور مٹی کی قوت اس نے اپنے تلووں کے
نیچے محسوس کی۔ اس نے بازو پھیلا کر ہوا کوچھوا اور آہستہ آہستہ دہرانا شروع کیا:
زمین، تیری پیماڑیاں، بر فانی پیماڑ اور جنگل مسکرار ہے ہیں۔ میں سالم ہوں۔ مجھے
کوئی ختم نہ کرسکا۔

طرح طرح کے پودے اور پھولوں کے ٹہنیاں اس کے راستے میں جھک
آئیں۔ پرندے اس کے ہمراہ یہیاں بجارتے تھے۔ ساون کی بومدیں کنوں کے
پتوں پر جل تر گنگ بجارتی تھیں۔

وہ ایک منڈیر پر کھڑا ہو گیا اور بھیگلی آنکھوں سے اس نے کھیتوں کو دیکھا۔
بڑھتی جاؤ۔ بڑھتی جاش اوجو کی بالیوتا کہ ہمارے گھرے بھر جائیں۔ طوفانوں
سے محفوظ رہو۔ جو کی الہی بالیو..... سمندر کی طرح اتحاہ رہو۔ وہ سب
امر رہیں جو تمہاری خدمت کرتے ہیں تمہارے کھلیان امٹ رہیں۔

وہ منڈیر پر سے اتر کر پلٹڈنڈی پر آ گیا اور دریا کے کنارے کنارے سڑک پر
چلنے لگا۔ افق پر سیاہ بادل گرج رہے تھے اس کے دل میں طوفانی دریا الہریں مار
رہے تھے۔ اس کے دماغ میں سریلے آبشار گیت گار ہے تھے۔ مو رجنکار رہے
تھے۔ پیسے چلاتے تھے بخنورے گونج رہے تھے۔ کدم کے بہت سے پھول ڈال
سے ٹوٹ کر اس کے قدموں میں آن گرے۔

گانے والوں کی آوازیں قریب آتی گئیں۔

منڈلی نے گایا۔

کھیتیں میں ناج بھرے رے
جیون آج سکھل رے
اچھی دھان اچھی فصل رے
وہ ٹہنیاں ہٹاتا اس طرف بڑھنے لگا جدھر سے آوازیں آ رہی تھیں:
ڈالوں کے پیچ پیچ پتوں کے پیچ پیچ
موتیں کی لام کی لڑیاں اگائے ہو
اوینیرے آئے ہو
وہ غور سے سنا کیا جب الفاظ اس کی سمجھ میں آئے اور تمہم اس کے ہونتوں پر
بکھر گیا۔

چٹا نیں، اوالاںش، گلیشیر، آندھیاں، طوفان، جھکڑ..... ان سب میں سے
گزرتا، سر کی لہروں پر بہتا وہ گوری شنکر کی اوپھی چوٹی پر چڑھ کر بادلوں میں چھپ
گیا۔ چوٹی پر وہ دوزانوں بیٹھ گیا اور اس نے دیکھا کہ چاروں اور خلاء ہے اور اس
میں ہمیشہ کی طرح وہ تنہام موجود ہے۔ دنیا کا ازالی اور ابدی انسان۔ تھا ہوا، شکست
خورده، بتشاش پر امید، انسان جو خدا میں ہے اور خود خدا ہے۔ وہ مسکرا کر نیچے اترा
اور اس نے آنکھیں کھولیں۔

جا گئے والوں کا جا گنا مبارک ہو
قانون کا پر چار مبارک ہو
سنگھ میں امن مبارک ہو
ان لوگوں کی ریاضت مبارک ہو

جنہیں شانقی میسر آگئی ہے

شاکینہ منی نے کہا

وہ منڈپ پر سے اتر، اس نے لمبا سانس لیا اور آہستہ آہستہ قدم رکھتا بستی کی
طرف واپس چلا گیا۔

ماری پور، کراچی

اگست ۱۹۵۶ء دسمبر ۱۹۵۷ء

The End----- ختم شد

ادبی ذوق